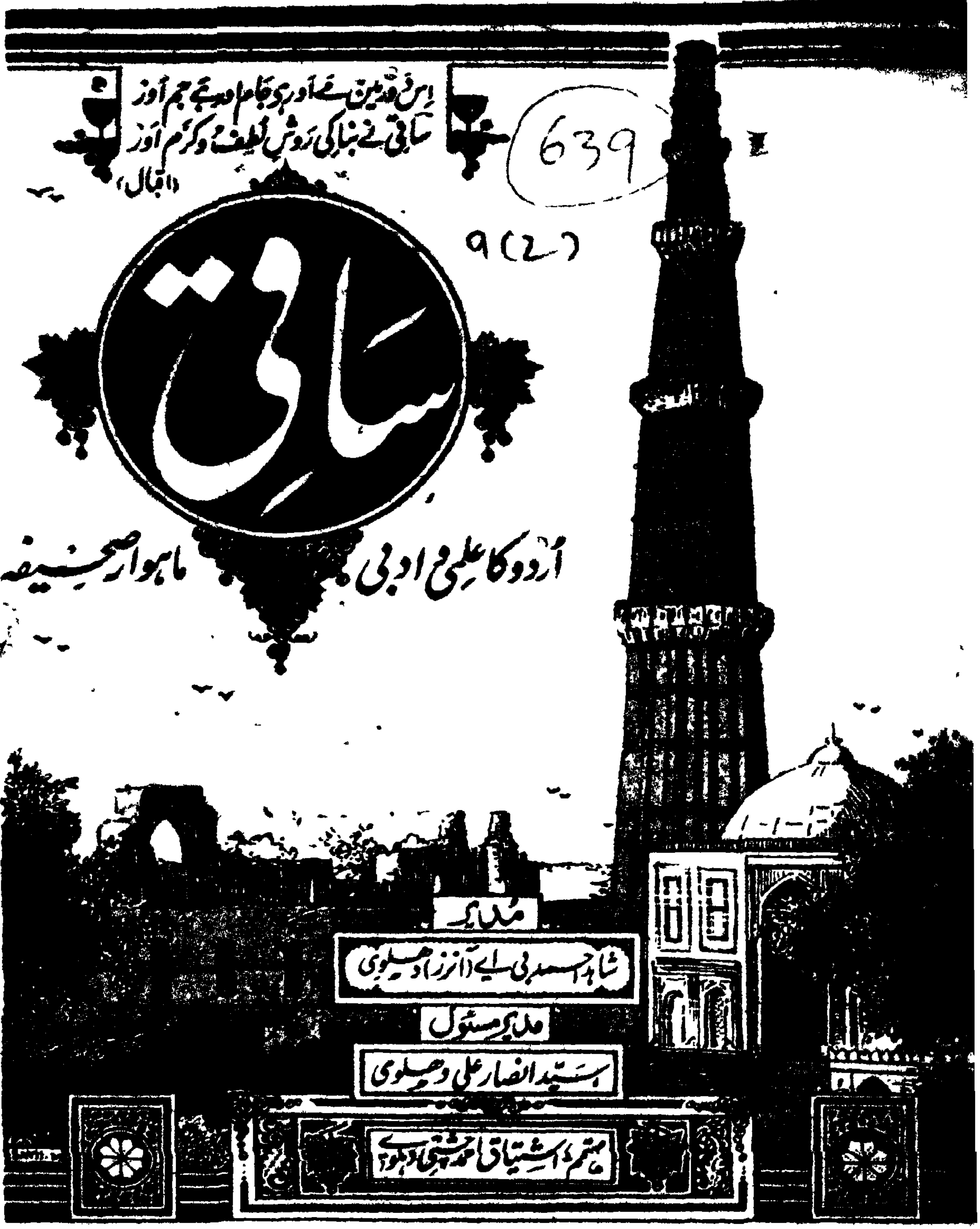
DUE DATE

Cl. No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

FUBRUARY 1934.



Annual Rs 4 8 0

Price Per Copy As. 5.

جُرعَات

جلد ۹ | ساقی دہلی - بابت فروری سنہ ۱۹۳۴ء | نمبر ۲

ساقی کا سالانہ چندہ چار روپے (للعہ) محصول ڈاک آٹھ آنے - کل للعہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سالنامہ ساقی کچھ تاخیر سے شائع ہوا مگر دلّی پرنٹنگ ورکس کی مہربانی سے فروری کا پرچہ بروقت شائع ہو رہا ہے اور آیندہ بھی انشاء اللہ پرچے وقت پر شائع ہوتے رہینگے۔

اِس سال بھی اچھے اچھے سالنامہ دیکھنے میں آئے۔ اِسے اپنی زبان کی ترقی سمجھئے کہ جیسے عمدہ سالنامے اُردو رسائل کے شائع ہوتے ہیں انگریزی رسائل کے بھی نہیں ہوتے۔ اِس کامیابی کا سہرا حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگِ خیال لاہور کے سر ہے۔ جنہوں نے اب سے سات آٹھ سال پہلے نیرنگِ خیال کا پہلا سالنامہ شائع کیا اور اسکے بعد ہر سال کے اختتام پر سالنامہ شائع کرتے رہے۔ جس طرح صحافتِ اُردو میں سالنامہ کی اشاعت سب سے پہلے حکیم صاحب موصوف نے کی اسی طرح (حق ناشناسی ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے) اوّلیت کا فخر ہمیشہ نیرنگِ خیال ہی کو حاصل رہتا ہے۔ پنجاب کے چند اور رسائل نیرنگِ خیال کے سالنامہ سے بازی لیجانا چاہتے ہیں مگر اب تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صحافتِ اُردو نے اتنے جلدی ترقی کی کہ شاید نصف صدی میں بھی ترقی کی اس منزل پہ ہم نہ پہونچ سکتے۔ اِس اظہارِ خیال سے اور رسائل کی تضحیک منظور نہیں ہے بلکہ اعترافِ حقیقت مقصود ہے اور سب سے یہ کہنا ہے کہ اگر اُردو جرائد و رسائل کی قدر اور مدیرین کی حوصلہ افزائی کی جائے تو آیندہ صحافتِ اُردو ان سے بھی بہتر نمونے پیش کر سکیگی۔

ساقی نے خاص نمبروں کی اشاعت پہ بہت زور نہیں دیا تاہم اس بات کا خیال ضرور رکھا کہ عمدہ سے عمدہ مضامین پیش کرے۔ مقابلہ و مجادلہ سے بھی ایسے اجتناب رہا۔ اِسلئے اپنے لئے چار خاص نمبر مخصوص کرکے اپنی روش الگ قائم کرلی۔ حسبِ معمول جنوری میں ساقی کا بھی سالنامہ شائع ہوتا ہے۔ اپریل میں "ظریف نمبر" جس کے مضامین نظم و نثر خوش مذاقی کے پاکیزہ نمونے ہوتے ہیں۔ جولائی میں "افسانہ نمبر" جس کا ہر افسانہ نہایت کاوش سے لکھا جاتا ہے۔ اکتوبر میں "دلّی نمبر" شائع ہوتا ہے مگر گذشتہ سال اسکے بجائے "ناصر نمبر" شائع ہوا جو سب خاص نمبروں سے زیادہ پسند کیا گیا۔

ساقی کے چندہ میں ایک روپیہ کا اضافہ کیا گیا ہے چنانچہ اب اس کا سالانہ چندہ للعہ ہے اور محصولڈاک سالانہ آٹھ آنے (۸ر) رجسٹری وغیرہ ملاکر للعہ۸ر وی۔پی بھیجا جاتا ہے۔ خاص نمبروں کی قیمت بھی اسی رقم میں شامل ہے۔ ایک سال سے کم کی خریداری منظور نہیں کی جائیگی۔

اگست ۱۹۳۳ء سے رسالہ "شاہجہان" دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ سید ولایت حسین صاحب کی ادارت میں اسکے دس پرچے بہت اچھے شائع ہوئے مگر اُن کی شدید علالت نے افسوس کہ انہیں اس لائق نہ رکھا کہ آیندہ "شاہجہان" کے ادارتی فرائض انجام دے سکیں۔ "شاہجہان" کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ دہلی کے عمدہ



اِلتجا

(عمل محمد ابراہیم ارمان)

Calcutta Art Press, Delhi.

علمی، ادبی، و تنقیدی پندرہ روزہ پرچہ کی اشاعت رُک جائے چنانچہ شاہجہاں بھی ساقی بُک ڈپو سے منتقل کر لیا گیا اور اس کا بارِ ادارت بھی مجھی پر رکھ دیا گیا۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے یہ پرچہ بھی دفترِ ساقی ہی سے شائع ہو رہا ہے اسکے بیشتر مضمون نگار وہی حضرات ہیں جو ساقی میں لکھتے رہتے ہیں۔ اگر آپ عمدہ اور سستا رسالہ خریدنا چاہتے ہیں تو شاہجہاں کے خریدار بن جائیے جو مہینہ میں دو دفعہ چھپتا ہے اور اپنے تنقیدی مضامین کے اعتبار سے خاص وقعت رکھتا ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے مع محصولڈاک۔ سال میں چوبیس پرچے شائع ہونگے۔ اور اختتامِ سال پر ایک سالنامہ بھی مستقل خریداروں کو اسی چندہ میں دیا جائیگا۔ نمونے کا پرچہ مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

ساقی بابت نومبر ۱۹۳۳ء میں ایک مضمون "شبابِ شعر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ دو دوستوں کی پرائیویٹ خط و کتابت تھی جو اپنی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے اس لائق تھی کہ منظرِ عام پر رکھدی جائے۔ جناب محمد ادریس صاحب تحصیلدار پنشنر نے ایک کھلی چٹھی میرے نام لکھی جو ۱۵ ر دسمبر ۱۹۳۳ء کے شاہجہاں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں آپنے "شبابِ شعر" کے چند فقروں پر اخلاقی نقطۂ نظر سے اعتراضات کئے ہیں۔ اُسی چٹھی میں تحصیلدار صاحب اپنے آپ کو پُرانے خیال کا مسلمان بھی ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں تک پُرانے خیال اور قدیم اخلاق کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے کسی حد تک صحیح اعتراضات کئے ہیں۔ مگر دو ایسے نوجوانوں کی خط کتابت جو نئے خیالات کے دلدادہ ہوں اور جدید مغربی لٹریچر سے شغف رکھتے ہوں، اس درجہ سخت تنقید کی مستحق نہیں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ تحصیلدار صاحب "شبابِ شعر" کی اور خوبیوں کے آگے اُن چند فقروں کو نظر انداز کر دیتے جن سے اُنکے پُرانے خیالات کو ٹھیس لگی۔ بجائے اس کے انہوں نے ان دو نوجوانوں کو اپنی کھلی چٹھی میں سختی سے ٹوکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بات نہ بڑھ جائے کیونکہ دونوں طرف سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

جناب شہاب مالیرکوٹلوی نے "شبابِ شعر" کے متعلق سخن گسترانہ رائے دی ہے۔ ادبیات کو مذہبیات کی کسوٹی پر کسنا مناسب نہیں۔ مضمون جس نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اُسی نظر سے اُسے جانچنا چاہیئے۔ جناب شہاب نے اس نکتہ کو خوب سمجھا اور سمجھایا ہے۔

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کی کتاب "کمزوری" کی قیمت دو روپے ہے مگر ساقی کے مستقل خریداروں کو نصف قیمت یعنی ایک روپے میں دی جا رہی ہے۔ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ یہ رعایت صرف ۲۰ فروری تک جاری رہیگی۔ اس کے بعد یہ کتاب پوری قیمت پر بھیجی جائیگی۔ جو حضرات اس رعایت سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں جلد توجہ فرمائیں۔

جناب فضل حق قریشی دہلوی کا مضمون "ہندوستانی صحافت کی ایک جھلک" طنز و مزاح کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ قریشی صاحب نے حد درجہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ناظرینِ ساقی اِسے ہندوستانی صحافت کی سچی تصویر نہ سمجھیں بلکہ خوش مذاق قریشی کی تخلیقی ذہنی تصور فرمائیں۔

شاہد

پُرانی یادگاریں

تو عقل کے دھوکے میں صرفِ تکمیلِ رہِ نادانی ہے — تا چند یہ جوشِ خوابِ گراں، اے دوست! کہ دُنیا فانی ہے
تاریک ہے شب، غم کی لہریں بیچین ہیں قلبِ ویراں میں — اک تو کہ رہینِ آسائش ہے، بیخبری کے ایواں میں
مصروف ہے تیری کاوشِ دل احساسِ غمِ انسانی میں — اور رات کا گہرا سناٹا ہے، قصرِ حیاتِ فانی میں
خوابیدہ ہے نبضِ موجِ صبا جنبش ہے نمایاں خاک میں ہے — تو لالہ و گل کا طالب ہے اور وہم خس و خاشاک میں ہے
تا چند امیدِ آسائش اس صبر شکن جانکاہی میں — ملتا ہے سکونِ منزل بھی اے دوست! کہیں گمراہی میں

ممکن ہو تو درسِ بینش لے، مجروح فریبِ بینائی!
کیا چیز ہے، عجزِ خاک نشینی ہو کہ غرور و سر آرائی!

یہ اُجڑے ہوئے بام و گنبد، یہ سقفِ کہن نہرائی ہوئی — ایامِ سلف کی عظمت ہے اسوقت بھی جنپر چھائی ہوئی
بکھرے ہوئے ملتے ہیں انمیں ذرّات مکمل ابتک — سینوں میں دھڑکتے ہیں، انکے کچھ حوصلہ پرور دل ابتک
اس رہگذرِ برباد سے گزرا قافلہ سُلطانی بھی — اس خاکِ پریشاں سے اُٹھے، ساوِنت بھی رشکِ مانی بھی
ڈوبی ہوئی نبضوں میں انکی ہیجان سا ہے اب بھی جوش وہی — نغمے نہ سہی جلوے نہ سہی احساس وہی ہے ہوش وہی
ہر چند کہ شب کے سائے میں ظلمت کے علم لہراتے ہیں — اس بزم کے بے قیمت ذرّے خورشید سے ٹکر کھاتے ہیں
کُھلتا ہے ضمیرِ انسان پر اس خاک کی دھیمی آہوں سے — اک قافلۂ اربابِ کرم گُزرا تھا کبھی اِن راہوں سے
غلطاں ہیں یہاں ذروں میں بہارِ رفتہ کے گرم آنسو ابتک — آتی ہے ہوا کی لہروں سے بھینی بھینی خوشبو اب تک
اک کیف سا ابتک پنہاں ہے اس روح شکن خاموشی میں — بے مثل تھی اس میخانہ کی صہبائے عمل سرجوشی میں

اللہ یہ کس مسرور کی یادِ حُسنِ تبسم آتی ہے
کچھ بات تو ہے اب تک جو یہاں اک برق سی لہراجاتی ہے

صدیوں سے چمکتا ہے سورج ان اوجِ نشاں دیواروں پر　　ہر سو سے لپٹتے ہیں نالے اِن سرِ بفلک میناروں پر
کڑکی ہے پرافشاں برق، ہوائیں تیز و پریشاں گزری ہیں　　اس عالمِ آب و خاک میں ان پر یوں ہی صدیاں گزری ہیں
دُنیا نے ہزاروں مرتبہ ان کے سامنے پہلو بدلا ہے　　اچھوں کو بگڑتے پایا ہے، بگڑوں کو سنورتے دیکھا ہے
پنہاں تھیں ان ویرانوں سے اسرارِ حیاتِ انسانی
اب بھی تو ہجومِ سوزِ دروں سے گرم ہے اُنکی پیشانی

آفاق میں اُنکی آنکھوں نے سو طرح کے منظر دیکھے ہیں　　ادبار کے نشتر کھائے ہیں، اقبال کے تیور دیکھے ہیں
کس درجہ فروتر ہیں یارب انسان کی خالی تدبیریں　　آئینہ ہیں کس شوق و ارماں کا آہ یہ اُجڑی تعمیریں
ہنتی ہی بناتے دشت و جبل، امواجِ ہوا بے پروا ہیں　　انسان کی ہستی کیا شے ہے انساں کی تمنائیں کیا ہیں
آ دیکھ مقامِ عبرت ہے اے بندۂ نفس و نادانی　　تاچند ملالِ ناکامی کب تک طلبِ عیشِ خالی
تاچند درونِ قلبِ غم، ایام کے نشتر کھائیگا　　آلام کی رو تھم جائیگی، عشرت کا سماں مٹ جائیگا
مقصود ہے گر تعمیرِ چمن، پروائے خس و خاشاک نہ کر
عرفاں کی بلندی کو ناداں! اوہام زبوں سے خاک نہ کر

علی اختر (حیدرآباد-دکن)

بھیڑ کا بچّہ

شبنم گرنی شروع ہوگئی تھی۔ آسمان پر تارے کچھ کچھ چمکنے لگے تھے۔ یکایک کان میں آواز آئی "پی پے پیارے پی پے" چلتے چلتے میں ٹھیرا۔ جھاڑی سے سر اونچا کرکے دیکھا تو کیا دیکھا کہ ایک برف سے بھی زیادہ اُجلا پہاڑی بھیڑ کا بچّہ ہے اور اُس کے پاس ایک بڑی موہنی صورت کی بھولی بھالی لڑکی کھڑی ہے۔

بھیڑ کا بچّہ بالکل تنہا ہے۔ نہ کوئی بھیڑ پاس ہے نہ گاے۔ ایک پتلی سی رسّی گردن میں پڑی ہے اور رسّی کے دوسرے سرے میں ایک پتھر بندھا ہے اور لڑکی ایک گھٹنا گھاس پر ٹیکے بچّے کے پاس جھکی ہوئی کٹوری میں دودھ لئے اُسے پلاتی ہے۔

بچّہ لڑکی کے ہاتھ سے دودھ پیتا جاتا ہے۔ خوش ہے۔ کبھی کان ہلاتا ہے۔ کبھی دُم جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی بھوک میں سیری کی لذّت محسوس کر رہا ہے۔ لڑکی بار بار یہی کہتی ہے "پی پے پیارے پی پے" اور یہ جملہ وہ کچھ ایسے لب و لہجہ میں کہتی ہے کہ اُس کا دل میرے دل میں اُترا چلا آتا ہے۔

اِس لڑکی کا نام باربرا تھا اور وہ ایسی حسین تھی کہ ایسا حُسن کم ہی دیکھنے میں آیا تھا۔ میں اِن دونوں بچّوں کو دیکھکر خوش ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ واہ کیا پیارا جوڑا ہے۔ لڑکی بچّے کو دودھ پلا کر گھر کی طرف چلی لیکن دس قدم بھی نہ گئی ہوگی کہ چلتے چلتے ٹھیر گئی۔ اور بھیڑ کے بچّے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے اُس کے چہرے کی کیفیت دیکھتا تھا کہ اتنی سی جان میں سچّی محبّت اور درد کے کیا کیا رنگ پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر فطرت نے اس معصوم کو اس وقت موزوں طبع کر دیا ہوتا تو شاید وہ اپنے بھیڑ کے بچّے سے نظم میں باتیں کرتی اور اُس نظم کا مضمون یہ ہوتا ہے۔

"پیارے بچّے۔ تجھے کس بات کی تکلیف ہے۔ کیوں اِس طرح بے صبر ہوکر گردن کی رسّی گھسیٹتا ہے۔ کیا تیرا جی اچھا نہیں ہے۔ یہاں تیرے کھانے اور آرام کے لئے سب چیزیں اچھی سے اچھی موجود ہیں۔ پھر کاہے کو بے قراری ہے۔ گھاس کا تختہ جہاں تو بندھا ہے اُس کی گھاس بہت نرم ہے اور ایسی ہری ہے کہ اس سے زیادہ کیا ہری ہوسکتی ہے۔ پیارے چین سے بیٹھ۔ آخر کچھ کہہ تو کہ کیا تکلیف ہے۔

کیا کسی چیز کو دل ڈھونڈ رہا ہے۔ کیا کسی بات کی دل میں آرزو ہے۔ ہاتھ پاؤں تیرے خوب مضبوط ہیں صورت شکل کا بھی بہت اچھا ہے۔ یہ گھاس بہت نرم ہے۔ یہ پھول جو تیرے پاس درختوں میں کھلے ہیں اِن میں کانٹے نہیں ہیں۔ اور تیرے پاس ہی اناج کا ہرا بھرا کھیت ہر وقت ہوا سے لہراتا رہتا ہے جس کی آواز تو سُنتا ہوگا۔

اگر دھوپ تیز ہوجائے تو رسّی اتنی بڑی ہے کہ اُسے گھسیٹ کر سایہ میں آرام کرسکتا ہے۔ یہاں مینہ بوندی پہاڑی آندھیوں سے بھی تجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیزیں تو یہاں آتی ہی نہیں۔

پیارے بچے۔ بس۔ اب چین سے ہو جا۔ اس طرح رسّی نہ گھسیٹ۔ گردن دُکھ جائیگی۔ وہ دن بھول گیا کہ میرے باپ کو تو یہاں سے بہت دُور ایک جگہ پڑا ملا تھا۔ پہاڑوں پر بہت سے گلے چر رہے تھے مگر تجھے کوئی نہ پوچھتا تھا۔ اور تیری ماں تجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں چل بسی تھی۔

میرے باپ نے تجھے گود میں اُٹھالیا۔ اور تجھ پر ترس کھا کر گھر لے آیا۔ جس دن وہ تجھے یہاں لایا وہ دن تیرے لئے مبارک تھا۔ نہیں تو خدا جانے تو کہاں بھٹکتا پھرتا۔ یہاں میں تیری کھلائی بنی ہوں۔ میری محبت تو اُس ماں سے کم نہیں ہے جو تجھے پہاڑوں پر اس دُنیا میں لائی تھی۔

دن میں دو دفعہ اس کٹوری میں تیرے لئے چشمہ سے تازہ پانی ایسا صاف لاتی ہوں کہ ایسا نہر میں بھی کہاں ملے گا۔ اور دن میں دو دفعہ جبکہ زمین شبنم سے تر ہوتی ہے اِس کٹوری میں دودھ لاتی ہوں، اور دودھ بھی تازہ اور گرم ہوتا ہے۔

جب تیرے ہاتھ پاؤں جتنے اب ہیں اس سے بھی زیادہ مضبوط اور توانا ہو جائینگے تو میں اپنی چھوٹی سی گاڑی میں تجھے اس طرح لگاؤنگی جیسے بڑی گاڑی میں گھوڑا جوتا جاتا ہے۔ پھر ہم تم دونوں خوب کھیلا کریں گے۔ اور جب ہوا تیز اور سرد ہوگی تو گھر میں آگ کے الاؤ کے پاس میں تیرا بستر لگاؤنگی اور ہمارا سارا گھر تیرا ہی گھر ہوگا۔

ہائے۔ ہائے۔ بچے۔ تجھے کسی طرح چین نہیں۔ کہیں تجھے تیری ماں تو نہیں یاد کرتی ہے جو تو ایسا بیقرار ہے۔ ممکن ہے جن چیزوں کو میں نہیں جانتی وہ تجھے عزیز ہوں اور تیرے خیال میں وہ باتیں آرہی ہوں جنہیں تو دیکھ سکتا ہے نہ سُن سکتا ہے۔

پیارے بچے! پہاڑوں کی چوٹیاں جو دیکھنے کو بڑی سرسبز اور خوشنما معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ وہاں بڑی تند ہوائیں چلتی ہیں۔ اور گھُپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چشمے جو بہتے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں اور بڑے کھیل تماشے کی جگہ ہوتے ہیں جب اُنکو غصّہ آتا ہے تو بھوکے شیروں کی طرح دھاڑنے لگتے ہیں۔

یہاں تجھے باز کا ڈر ہے نہ عقاب کا۔ دن ہو یا رات کوئی بات تیرے خوف کھانے کی نہیں ہے۔ ہمارا گھر پاس ہے۔ بچے! بچے! کیوں میں میں کرتا ہوا میرے پیچھے آتا ہے۔ کیوں رسّی کو گھسیٹے جاتا ہے۔ بس۔ سو رہ۔ اور دن نکلتے ہی میں تیرے پاس پھر آؤنگی"

جب میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا تو اس نظم کو بار بار دل میں پڑھتا تھا۔ ایک ایک شعر اس کا ذہن میں آتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ نظم آدھی اس لڑکی کی کہی ہوئی ہے اور آدھی میری۔ لیکن جب پھر اس نظم کو پڑھا اور غور کیا تو بے اختیار دل سے صدا نکلی کہ نہیں۔ آدھی سے بھی زیادہ نظم اس لڑکی کی کہی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ اس انداز سے دیکھتی اور باتیں کرتی تھی کہ اُس کا دل میرے دل میں آکر میں اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

عنایت اللہ

فسونِ شام

غروب، سلسلۂ کوہسار، ویرانہ
سُنا رہی ہے خموشی کو ریل افسانہ

اِدھر پہاڑ، اُدھر کھیتیوں کی پگڈنڈی
ہوائے شام کہیں گرم ہے کہیں ٹھنڈی

اِدھر اُدھر کچھ اندھیرے میں مرد و زن ہیں رواں
کہانیوں کے وہ جن ہیں، یہ خواب کی پریاں

دو رُویہ تار کے کھمبوں پہ ایک پرتوِ راز
ندی کی موڑ پہ خلوت نشیں دِیئے کا گداز

سیاہیوں میں چمکتی ہوئی جبینیں سی
نظر کے سامنے جادو کی سرزمینیں سی

اُفق کے رُخ پہ سیہ دھاریوں کی باریکی
پہاڑیوں پہ گھٹا، جھاڑیوں پہ تاریکی

شکستہ حال گِدوں کا مقام کھوروں پر
سیہ مشین کا بھورا دھواں کھجوروں پر

ندی اُداس، ہوا دردناک، بَن خاموش
زمیں فسوں بہ بغل، آسماں فسانہ بدوش

کبھی ہواؤں کا جھونکا جو چھیڑ کرتا ہے
دلِ شکستہ مرا سسکیاں سی بھرتا ہے

سیاہیوں میں جل اُٹھتی ہے پھر مرے آگے
وہ شمعِ سوز کہ گُل کر چکا ہے وقت جسے

پھر آب و تاب سے کرتی ہے کھیت وہ شبِ ماہ
پڑی ہے جس پہ مہ و سال کی نقابِ سیاہ

کبھی جو دُور کوئی شمع جھلملاتی ہے
فروغِ عمرِ گذشتہ کی یاد آتی ہے

جوش ملیح آبادی

رفیقِ زندگی

عابدہ خانم بڑی نیک اور غریب بیوہ بی بی تھیں۔ بیچاری چکّی پیس پیس کر زندگی بسر کرتی تھیں۔ اور اُن کا نام لئے امیر تھا۔ اُن کے عزیزوں نے ان کے افلاس کی وجہ سے اُن کے گھر آنا جانا، ملنا جلنا سب ترک کر دیا تھا، مگر بیچاری تنگ بندی ہر حال میں صابر و شاکر رہی چکّی پیسنے میں جو سیر آدھ سیر آٹا ملجاتا۔ اُس میں سے خود کھاتی لڑکی کو کھلاتی اور جتنی فقیر کو دیدیتی اور اُسی میں بشاش رہتی۔ اکثر ایسا ہوا کہ کھانا تیار ہے اور فقیر نے سوال کیا۔ فقیر اندھا، لنگڑا یا لولا ہے تو لڑکی کے واسطے دو چپاتیاں رہنے دیں، باقی سب کھانا خدا کی راہ پر دیدیا۔ اور آپ فاقے سے سو رہیں۔ عابدہ خانم نے اپنے وقتوں کو اس طرح تقسیم کیا تھا۔

صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت، وظیفہ وظائف اس کے بعد آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک چکّی پیسنا۔ گیارہ بجے اُٹھ کر صبح و شام دونوں وقت کی دال روٹی پکا رکھنا، اکثر روزہ رکھنا، رات کو دو بجے تہجد کی نماز پڑھتی تھی۔ اور اس کے بعد فجر کے وقت تک چکّی پیستی تھی۔

لڑکی کو چھ برس کی عمر سے قاعدہ پڑھا کر سال بھر میں قرآن شریف پڑھا کر نماز سکھادی، وہ بھی نماز کی پابند تھی۔ ۷ برس کے سن سے اُسے زنانہ اسکول میں تعلیم کے لئے داخل کر دیا تھا۔ ذہن اچھا تھا، جو کچھ پڑھ لیتی تھی یاد کر لیتی تھی۔ اور ہر امتحان میں اوّل پاس ہوتی تھی۔ اسکول سے اُس کی فیس معاف ہوگئی اور پانچ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تاکہ یہ ہونہار لڑکی تعلیم حاصل کرے۔ پانچ برس تک یہ پڑھتی رہی اور جب یہ بارہ سال کی ہوگئی تو ماں نے اسکول بھیجنا بند کر دیا۔ اور کہا کہ گھر پر کتابیں یاد کر کے امتحان دے لینا۔ لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی، عزیز تو ایسی غریب لڑکی کو کیا قبول کرتے اب خیال ہوا کہ غیروں میں اس کی شادی ہوجاتے تو بہتر ہے، ماں کو بہت جلدی تھی مگر بات کہیں سے نہیں آتی تھی۔ زمانے کی روش بدل گئی تھی۔ لڑکے پڑھی لکھی مالدار خوبصورت بیوی ڈھونڈھتے تھے، لڑکیاں خوبصورت نوجوان پڑھا لکھا دولت مند شوہر چاہتی تھیں، اور ان سب باتوں کو دولت مندی پر شرف دیا جاتا تھا۔ اگر دولت مند ہے تو اُس کی بدصورتی بھی ہزار خوبصورتوں سے بہتر معلوم ہوتی تھی، رذیل ہے تو ہزار شریفوں سے بہتر، جاہل ہے تو مفلس عالم پر اسے ترجیح دیجاتی تھی۔ اُس کے افعال قبیحہ پر پردہ ڈال کر غریب نیک مزاجوں سے بہتر تصور کیا جاتا تھا، شرافت نام تھا چار پیسوں کا۔

ایسی حالت میں بی عابدہ خانم کی لڑکی رضیہ خانم کو کون پوچھتا، اگرچہ رضیہ خانم صورت شکل کی بہت اچھی، اخلاق کی درست، بات چیت دانشمندانہ، پڑھی لکھی دست و قلم تھی۔ مگر مفلسی نے تمام اچھائیوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس لئے کہیں سے پیغام نہیں آتا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ اس پسنہاری کی لڑکی کو کون کرے

جس کے پاس ایک وقت کھانے کو بھی نہیں، بہتر تو یہ ہے کہ وہ کسی فقیر کو ہاتھ پکڑا دے نہیں تو جوان لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھے گی۔ عابدہ خانم کو یہ غم کھائے لیتا تھا۔

رفتہ رفتہ تمام محلے کے لوگوں سے کہا تو ایک خدا کے بندے نے پیام دیا کہ دال منڈی میں ایک غریب لڑکا رہتا ہے جس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور کنبے میں بھی کوئی نہیں ہے، انٹرنس میں تعلیم پاتا ہے۔ باپ کے ٹوٹے ہوئے مکان میں رہتا ہے۔ غریب اتنا ہے کہ روٹی کپڑا بھی مشکل سے میسر آئے گا۔ کہو تو اس کا رقعہ بھجوا دوں۔ عابدہ خانم نے کہا کہ رقعہ چٹھی کیسی، تم ہی محلے کے چار آدمی بیٹھکر لڑکی کا نکاح پڑھوا دو۔ ہمارے پاس کیا بیٹھے دینے کو ہے جو چھان بین کریں۔ اب تو اِس پہاڑ کو اپنے سر سے ٹالنا ہے۔

کچھ نرسس خدا لگا کے محلے والوں نے بات چیت کرکے نکاح کی تاریخ مقرر کر دی، اور ایک دن شام کو دو بول پڑھوا دئے اور لڑکی سچ مچ ناڑہ باندھکر رخصت کر دی گئی۔ بی بی نے دیکھا کہ ایک ٹوٹا سا مکان ہے جسمیں چمگادڑ بھی شریک ہیں، گھر میں تین من کوڑا ڈھیر ہے۔ میاں گھر کی کوئی چیز بیچتے ہیں تو بازار سے روٹی کباب مول لاتے ہیں، آپ بھی کھاتے ہیں اور اُن کو بھی دید یتے ہیں۔ دو چار دن صبر کیا، آخر اٹھی، گھر میں جھاڑو دی، میاں سے کوڑا باہر پھکوایا اور کہا کہ آج آٹا اور دال لانا ہم گھر میں کھانا پکائیں گے۔ میاں آٹا دال نمک مرچ گھی وغیرہ لے آئے، بی بی نے آٹا گوندھا دال دہوکر چولھے پر چڑھا دی جب اچھی طرح گل گئی تو گھونٹ کر پانی ڈال نمک چکھ اور پھر جوش دے کر گھی سے بگھار دی۔ آپ روٹی پکانے گئی میاں سے کہا کہ تم کھانے کو بیٹھ جاؤ کیونکہ تمہیں کالج کو دیر ہوتی ہوگی۔ میاں نے جو برسوں کے بعد ہاتھ کی چپاتیاں کھائیں تو نانِ نعمت کا مزا ملا، اس کے بعد میاں کو ایک پان دے کر رخصت کیا۔

جب میاں آئے تو بازار سے آٹا دال منگوا کر کھانا پکایا، پہلے اُن کو کِھلایا پھر آپ کھا کر خدا کا شکر بھیجا۔ میاں سے پوچھا۔ تمہارے امتحان میں کیا کیا کتابیں ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں نے فارسی لی ہے، باقی کتابیں انگریزی کی ہیں، رضیہ نے کہا کہ میں بھی آٹھویں کلاس میں امتحان دینے والی ہوں اور اپنی کتابیں میاں کو دکھائیں اور کچھ الفاظ اُس سے پوچھے، اُس نے سبق اچھی طرح سمجھا دیا۔

رضیہ خانم کے شوہر کا صابر علی نام تھا۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن اِس سال امتحان میں فیل ہو گیا تھا۔ اِس لئے اُسے بہت رنج تھا۔ فیل ہونے کا سبب یہ تھا کہ محلے میں شاعری کا بہت تذکرہ تھا، سب کی دیکھا دیکھی صابر بھی شعر گوئی کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور مہینے میں دو ایک دفعہ مصرع طرح پر غزل کہہ کر مشاعرے میں ضرور جاتے تھے۔ دوست احباب اُن کی خاطر سے مشاعرے کی طرح غالب کی طرح پر دیتے تھے۔ کیونکہ اُن کو غالب کا رنگ بہت پسند تھا۔ اور تاریخ کا دن جمعہ رکھتے تھے تاکہ مشاعرے کے دوسرے دن اتوار کو اُنکو سونے کا بھی وقت ملجائے۔ اِس طرح بھی اتوار کے دن اُن کے شاعر دوست آتے تھے اور اپنا کلام بہت پُرتکلف لہجہ میں گا گا کر اور مٹک مٹک کر سناتے تھے۔ صابر علی کے پڑھنے کا بھی یہی انداز تھا، یہ تو شعر کی

تصویر کھینچ دیتا تھا۔ کچھ ہاتھ سے بھاؤ بتاتا تھا کچھ گلا اچھا تھا کچھ علم موسیقی سے بھی واقف تھا۔ اس سے شاعروں کے علاوہ جاہل لوگ بھی سنکر خوش ہوتے تھے، اور کہتے تھے کہ آج لکھنؤ میں میاں صابر کے مقابلے کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ بالکل غالب کے رنگ میں کہتے ہیں۔ اور کلام بھی ایسا ہے کہ غزل کو مرثیہ بنا دیتے ہیں، جس مشاعرے میں جاتے ہیں پالا انہیں کے ہاتھ رہتا ہے۔ اس خبط نے صابر کی تعلیم میں خلل ڈالدیا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اسی کی بے انتہا کوشش کا یہ نتیجہ تھا کہ کالج میں بھی مشاعرے کی بنیاد پڑ گئی۔ بی بی نے جو یہ حال دیکھا تو کہا کہ غضب ہوا شاعری میں تو پھنس کر انسان کسی کام کا رہتا نہیں، ہمیشہ خودستائی کا طالب رہتا ہے، اور اسی لغویت میں مصروف رہکر اپنی زندگی کو خراب کر دیتا ہے، اس کا نشہ افیون سے کم نہیں ہے۔ دیکھئے یہ بلا ان سے کس طرح چھوٹتی ہے اور بہت تردد میں رہنے لگی۔ آخرکار ایک دن میاں بیوی میں اس طرح گفتگو شروع ہوئی۔

بی بی۔ یہ تمہارے یہاں اتوار کے اتوار گانا کیسا ہوتا ہے، کیا کہیں سے قوال آتے ہیں،

صابر۔ نہیں جی! یہ سب شاعر ہیں، اپنی اپنی غزلیں سناتے ہیں۔

بی بی۔ سناتے ہیں یا گاتے ہیں۔ مٹکتے ہیں، ناچتے ہیں اور وہ بھیرویں اڑاتے ہیں۔ وہ تانیں لگاتے ہیں کہ تان سین کی روح شرماتی ہوگی۔

صابر۔ ہاں لکھنؤ میں گانے کا طریقہ اُس وقت سے جاری ہوا ہے۔ جب سے دہلی کے ایک بہاری شاعر صاحب تشریف لائے تھے۔ اور اُنہوں نے گا کر پڑھا اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ شاعر تو شاعر جاہل لوگ بھی محو ہو گئے، اور سب واہ واہ کرنے لگے۔ ورنہ اِس سے پہلے لکھنؤ کی تہذیب مشاعرہ مشہور زمانہ تھی۔ ہر شخص تحت اللفظ شعر پڑھتا تھا۔ مشاعرے میں کھانسنا تک جرم تھا۔

بی بی۔ تم نے شاعری کہاں سے سیکھی۔

صابر۔ سیکھنے کی ایک ہی کہی۔ شاعری سیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ میں تو تلمیذ الرحمٰن ہوں اور ہر شاعر خدا کے یہاں سے موزوں طبیعت لے کر آتا ہے۔ ہاں غالب کا مقلد ضرور ہوں اور انہیں کی طرح میرا کلام بھی مشکل ہوتا ہے۔ عام لوگ اُسکے معنے مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

بی بی۔ تو میں جانتی ہوں۔ اسی طرح لوگ خدا کے یہاں سے انگریزی عربی اور فارسی پڑھے ہوئے پیدا ہوتے ہونگے اور لوگ انکو تلمیذ الرحمٰن کہتے ہونگے۔

صابر۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ شعر کہنا اثر صحبت سے آجاتا ہے اور فارسی عربی بغیر پڑھے ہوئے نہیں آسکتی ہے۔

بی بی۔ اچھا تم کو بھی کسی کا اثر صحبت نصیب ہوا۔

صابر۔ اجی اسکو نہ پوچھو ایام جہالت میں میں نے اپنی دو چار غزلیں میاں ذہم کو دکھلائیں تھیں، مگر اُنکا

رنگ کچھ ایسا ٹھس تھا کہ مجھے بالکل نہ پسند آیا کیونکہ ان سے اچھا میں خود کہہ لیتا تھا۔ اسی سے میں نے انکو دکھانا چھوڑ دیا۔ اور خود کہنے لگا۔ خود کسی سے مشورہ سخن نہیں کیا، اب خود میرے شاگردوں کی فہرست لمبی چوڑی ہے کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں دو چار میرے شاگرد نہ ہوں۔

بی بی۔ یہ کیا جب کہ تم کہتے ہو کہ شاعری سیکھنے کا فن نہیں ہے۔ اور تم نے کسی سے شاعری نہیں سیکھی تو پھر دوسروں کے سکھانے کا حق تمہیں کب ہے۔ سب کو جواب دیدیا کرو کہ شاعری سیکھنے کا فن نہیں ہے۔ اسی لئے میں شاگرد نہیں کرونگا۔

صابر۔ تم سچ کہتی ہو مگر سب لوگ میرے جیسے تو نہیں ہیں۔

بی بی۔ یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ تم ماں کے پیٹ سے شاعری سیکھکر پیدا ہوئے تو دوسرے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔

صابر۔ یہ میں کیونکر کہوں۔

بی بی۔ کہو گے کیا خاک، تمہارے کان میں تو شیطان نے کچھ اور ہی پھونک رکھا ہے کہ میں شاعر ہوں۔ میرے جیسا کوئی شاعر نہیں ہے۔

صابر۔ تم میرا کلام سنو گی تو تم کو آپ سے آپ اس بات کا اندازہ ہو جائیگا۔

بی بی۔ میں کلام سننا نہیں چاہتی، اتنا بتا دو کہ تم نے عروض کی کتابیں کس سے پڑھی ہیں۔ تم شعر کی تقطیع کر سکتے ہو، میں سنتی ہوں کہ شعر کا ایک وزن بھی ہوتا ہے۔

صابر۔ عروض تو میں نے نہیں پڑھا۔ نہ مجھکو اس کی ضرورت ہے۔ میں تو خود موزوں طبع ہوں اگر کوئی حرف وزن سے گرتا ہے۔ تو مجھے خود کھٹکتا ہے۔ اور معمولی شعروں کی تقطیع بھی ٹوٹی پھوٹی کر لیتا ہوں۔

بی بی۔ یہ بھی تمہاری جہالت ہے۔ کہ جس فن کو نہیں جانتے ہو اس کے جاننے کا دعوے کرتے ہو۔ اور اس فن کے استاد بنتے ہو۔ اور اپنے کو غالب ثانی سمجھتے ہو۔ کیا غالب بھی عروض و قافیہ میں جاہل تھا۔

صابر۔ یہ تو میں جانتا نہیں کہ غالب عروض قافیہ جانتا تھا یا نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ آج کل کے جتنے بڑے بڑے شاعر مشاعرے میں آتے ہیں ان میں دو چار ایسے ہوں جو ٹوٹی پھوٹی تقطیع کر لیتے ہوں باقی سب کورے ہیں۔

بی بی۔ میں ان کو بھی جاہل سمجھتی ہوں جو کسی فن کو جانتے نہ ہوں اور اس کے مدعی بنتے ہوں۔ یہ ان کی حماقت ہے۔

صابر۔ اچھا تو میں فارسی میں شعر کہا کروں۔

بی بی۔ یہ تمہارے خبیث نفس کی دوسری مکاری ہے۔ اُردو کے محاورات پر تو تم کو قدرت نہیں۔ تقطیع تم کر سکتے نہیں۔ فارسی میں اس واسطے کہنا چاہتے ہو کہ اس کے اعتراض کرنے والے کم ہیں لوگ واہ واہ کرینگے۔

صابر- تو تمہاری رائے یہ ہے۔ کہ میں عروض پڑھوں اور کسی کا شاگرد بن کر شاعر بنوں پھر جو میرے سینکڑوں شاگرد ہیں وہ اپنے دل میں کیا ہنسیں گے۔

بی بی- میری یہ غرض نہیں ہے کہ تم شاعر بنو، شاعری میں دھرا کیا ہے جس سے تم کچھ کما لوگے اور شاگرد تمہیں کیا دولت دیدیتے ہیں جو بند کر دیں گے۔ اب تم شاعری سے توبہ کرو اور جو شاعر آتے ہیں اُن سے کہدو کہ ہم کو یہ فن نہیں آتا- اِس سال ہم اسی سبب سے امتحان میں فیل ہوگئے، ہم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد شاعری کسی اُستاد سے حاصل کریں گے اور شاگردوں سے کہدو کہ تم کسی دوسرے شاعر سے اصلاح لو ہم کو معاف رکھو۔

صابر- یہ تو میں نہیں چاہتا کہ اپنے منہ سے اپنی توہین کروں مگر یہ کروں گا کہ شاعروں سے ملنا جلنا ترک کر دوں، مشاعرے میں نہ جاؤں، شاگردوں سے کہدوں کہ مجھکو فرصت نہیں ہے امتحان میں مصروف ہوں، تم کسی دوسرے سے اصلاح لیا کرو شاعروں کی تو آجکل کمی نہیں ہے۔

بی بی- اچھا ہے تم تو اس عذاب سے بچ جاؤ گے کسی کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ خود نہیں جانتے دوسروں کو سکھانے پر مرتے ہیں۔

صابر- تمہاری بات میرے ذہن نشین ہو گئی در حقیقت آجکل شاعری فن کی نہیں ہے خوش گلوئی کی ہے- یہ انگریزی کالجوں کے لڑکے اسی بلا میں مبتلا ہو جاتے ہیں- انہیں لوگوں نے انکو بھی اپنے دام میں پھانس لیا ہے ورنہ شاعری امر دشوار ہے۔

اب صابر کو بڑی مشکل پڑی- گھر پر جو لوگ آتے ہیں بیوی کہدیتی ہیں کہ نہیں ہیں، لیکن جو راہ گلی میں ملتے ہیں- صابر صاحب میرے مشاعرے کی تاریخ نہ بھولئے گا- صابر بیچارے کو صاف کہنا پڑتا ہے کہ میں نے شعر کہنا ترک کر دیا- بے اصول شاعری ہی دو تین سال تو ایک مصرعہ نہ کہوں گا اُس کے بعد اس فن کو سیکھکر آپ کے مشاعرے میں شریک ہونگا۔

دوست- اے واہی ہوا ہے- تو صاحب آج تک یہ شاعر نہ تھے، تمام مشاعرے تو انہیں کے ہاتھ رہتے تھے، آج شہر میں تو کوئی اِس ٹکر کا شاعر نہ تھا- میاں وہم نے اِنہی کے خوف سے مشاعرے میں آنا چھوڑ دیا- شہر میں تو اُن کی خوش گلوئی کی دھوم ہے- مشاعرے کی زینت اُنہی کے دم سے ہوتی ہے- اور یہ کہتے ہیں کہ میں نے شاعری چھوڑ دی، اے شاعری چھوڑ دیگا تو مر بھی جائے گا۔

صابر- اچھا تو کچھ ہو لیکن صابر سے ہاتھ دھو رکھو۔

دوست- تو کیا تم نہ آؤ گے تو مشاعرہ سُونا ہو جائیگا- میاں وہم سچ کہتے تھے کہ مجھ سے اصلاح لیتا تھا طبیعت ناموزوں تھی- اِسی سے نکال دیا۔

صابر- خدا خدا کرو میاں وہم مجھے کیا اصلاح دیں گے- ابھی برسوں انکو پڑھاؤں- مجھے تو مستشرق الہند کا خطاب انجمن الہند سے مل چکا ہے، رسالوں میں خاقان الہند خدائے سخن لکھا جاتا ہوں۔

دوست۔ اچھا آپ کے مشاعرے میں آؤ تو حقیقت کُھل جائے۔

صابر۔ اجی حقیقت کُھلے یا نہ کُھلے، میں نہ شعر سُنونگا نہ مشاعرے میں جاؤنگا نہ کسی شاعر سے ملونگا۔

دوست وہ تو ہمیں معلوم ہے۔ مولوی مدن ہم سے کہتے تھے کہ وہ شعر کہنا کیا جانے۔

صابر۔ اچھا یہی سہی کسی طرح جان چھوڑ دو، مولوی مدن کو تو میں برسوں پڑھاؤں۔ اُن کو آتا ہی کیا ہے۔ نرے دیہاتی کوّے ہیں، لب و لہجہ تک تو درست نہیں ہے۔

صابر علی کو اب معلوم ہوا کہ یہ یارانِ ملّت جو مشاعروں میں ہماری تعریف کرتے تھے۔ اُن کی غرض یہ تھی کہ صابر بھی ہماری تعریف کرے، حقیقت میں دشمن تھے کہ ہمارے عیب کو ہنر بتاتے تھے۔ ورنہ شاعری تو بہت مشکل فن ہے۔ جب اُن کو معلوم ہوگیا کہ ہمارے ساتھ سے الگ ہوگیا تو صاف صاف کہدیا کہ تم کچھ نہیں جانتے ایسوں سے تو ملنا حرام ہے۔

اب بدستور کالج جانے لگا اور کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہوا۔ کالج میں مشاعرہ ہوا تو صابر نے ایک پیسہ تک چندے کا نہیں دیا نہ شرکت کی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انٹرنس کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا اور چونکہ زیادہ تعلیم کو قایم نہیں رکھ سکتا تھا، اُس نے ہیڈ ماسٹر کی خوشامد کی کہ ٹیچری کی کوئی جگہ سکول میں مل جائے۔ ہیڈ ماسٹر نیک دل آدمی تھے، اُنہوں نے اُردو ٹیچری تیس روپے ماہوار کی دلوادی، اور اسی سال خدا نے صابر کو بیٹا عنایت کیا۔ ثابت علی نام رکھا گیا۔ ملازمت پاکے جب دال روٹی سے اطمینان ہوا تو کتابوں کو گھر پر یاد کرکے اُس نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، اب فکر ہوئی کہ کوئی ملازمت معقول مل جائے۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارتے آخرکار تھک کر بیٹھ رہے تو خدا نے ایک وسیلہ پیدا کردیا۔ یعنی کانپور کے کمشنر کو ایک پیشکار کی ضرورت تھی۔ ہزاروں عرضیاں آئیں۔ اُنہوں نے بھی اپنی عرضی پرنسپل کی سفارشی چٹھی کے ساتھ بھیج دی۔ قسمت یاور تھی، نوکر ہوکر کانپور چلے گئے۔ بی بی کے پاس ایک ماما رکھدی کچہری کی آمدنی تنخواہ سے جو گئی تھی، سال بھر میں گھر کا نقشہ بدل گیا اپنے پاس بھی ایک خدمتگار نوکر رکھ لیا۔ ڈپٹی کمشنر کو راضی رکھا، دو سال کے بعد لکھنؤ کے تحصیلدار ہوگئے۔ بی بی پڑھی لکھی تھی۔ گھر کا بندوبست اُس نے بہت اچھا کیا۔ روزانہ حساب لکھتی تھی، میاں کے نام جو دوست احباب کے خطوط آتے تھے اُن کا جواب خود لکھتی تھی۔ تحصیلدار صاحب کو گھر کی کچھ فکر نہیں تھی۔ دن رات کچہری کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ نماز روزے کے پابند رہتے تھے، رشوت لینے کے متعلق بی بی نے منع کردیا تھا کہ دو دن کی زندگی کے واسطے خدا رسولؐ کے گنا ہگار الگ ہو اور گورنمنٹ کے بدخواہ کہلاؤ۔ ایسے کام پر لعنت بھیجو۔ اس پر بھی جس کی غرض اٹکی ہوتی تحفہ تحائف کے بہانے سے بہت کچھ پیش کش کرتے تھے۔ انگریزی پوشاک سے اُن کو سخت نفرت تھی، کہتے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز تکلیف پہونچاتی ہے۔ اُسے دوسرے ملک کی نقل کرکے کیوں کرتے ہیں۔ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے، ہمارا لباس یہاں کی آب و ہوا کے موافق ہے۔

دوسرے اس میں خرچ بھی زیادہ ہے پھر کسی کو کُتّے نے کاٹا ہے۔ جو آسائش اور آرام بخش پوشاک چھوڑ کر تکلیف دہ لباس اختیار کرے۔ اس مُجزرسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثابت علی پر گھر پر ایک ماسٹر اور مولوی نوکر تعلیم دینے کے لئے رکھے گئے۔ ہر سال امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا تھا کبھی دفعہ فیل نہیں ہوا۔ ثابت علی اسکول سے کالج گیا اور وہاں بھی ایسی ہی محنت سے پاس کرتا رہا۔ ایل ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کردی۔ اب اُن کی آمدنی کا کیا پوچھنا۔ ثابت علی کی وکالت نے بھی ایسی ترقی پائی کہ بڑے بڑے وکیل مُنہ دیکھ کر رہ گئے۔ حاکم خوش، موکل خوش، اہلِ عمل خوش۔ اسپیچ کے وقت معلوم ہوتا تھا کہ طوطی چہک رہا ہے۔ لوگوں نے اُس کا نام بُلبلِ ہزار داستان رکھا تھا۔ دُور دُور سے لوگ محض ان کی تقریر سُننے کے لئے آتے تھے۔

عابدہ خانم بہت خوش قسمت تھیں جنہوں نے بیٹی کو اس عروج پر دیکھا، داماد کو منصب جلیلہ پر فائز پایا۔ نواسے کو وکیلوں میں سرنام سُنا اور سچ پوچھو تو یہ ترقی پر ترقی ان کے شادیٔ مرگ کا باعث ہوئی۔ غیرت دار تھیں، کہیں مہمان تک نہیں جاتی تھیں۔ حُسنِ اتفاق سے رضیہ خانم کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی چھٹی تک رات بھر بیٹھی رہیں اور اسی میں کچھ بیمار ہوگئیں، بہت کچھ دوا کی گئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر دس پندرہ دن کی بیماری اُٹھا کر انتقال کیا۔ رضیہ خانم کو ماں کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا بیچاری راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر چپکے چپکے رویا کرتی تھی۔ اور یہ غم سال دو برس تک اُس کے دل سے نہ گیا۔

وہ کہتی تھی کہ ماں کی تربیت نے مجھے اِس درجے پر پہونچایا کہ آج میں کاہل نہیں ہوں، گھر کے کپڑے سب آپ سیتی ہوں۔ حساب کتاب میں کسی کی محتاج نہیں ہوں، کھانے میں مجھے دخل ہے، گھر کی صفائی کا مجھے سلیقہ ہے۔ لوگوں سے میل محبت پیدا کرنے کا مجھ میں مادہ موجود ہے۔ شوہر کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ بچوں کی پرورش کا مجھے خیال رہتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع مجھے آتی ہے، خدا رسول کا مجھ کو خوف ہے۔ یہ وہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو اماں نے میرے دل میں کمسنی سے نقش کی تھیں اور اُٹھتے بیٹھتے سمجھایا کرتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسی بُڑھیا کی جوتیوں کا صدقہ ہے جس نے آج مجھے کُنبے میں ہر دلعزیز اور شوہر کی نگاہ میں باوقار بنا دیا۔

عشرت لکھنوی

میخانہ ادب

(از خیامِ عصر حضرت ریاض خیرآبادی)

یہ سیدھے جواب زلفوں والے ہوئے ہیں
ہمارے ہی سب بل نکالے ہوئے ہیں

سبب مسکرانے کا نالے ہوئے ہیں
ذرا شوخ اب شرم والے ہوئے ہیں

مرے ہاتھ پر کھیلے ہیں انکی زلف
یہ سانپ آستینوں کے پالے ہوئے ہیں

چھپا کر بہت پی ہے مسجد میں واعظ
یہ ظرفِ وضو سب کھنگالے ہوئے ہیں

اُلجھتے ہیں سوتے میں زلفوں سے کیا کیا
وبال ان کو کانوں کے بالے ہوئے ہیں

شبِ وصل بوسے نہ اب دل میں آئیں
جو ارمان میرے نکالے ہوئے ہیں

الگ ہی خدائی سے کچھ ساخت انکی
یہ بُت اور سانچے کے ڈھالے ہوئے ہیں

جو یاد آتے ہیں اہل چمن کو
قفس میں وہی نغمے نالے ہوئے ہیں

کسی پر دمِ حشر کیا آنکھ ڈالوں
حسیں سب مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں

جنوں رنگ لایا ہی کچھ فصلِ گل میں
یہ لالہ نہیں زخم آلے ہوئے ہیں

چراغِ شبِ وصل جلنے نہ دیں گے
وہ گیسو جو بل کھا کے کالے ہوئے ہیں

نزاکت نے تیری گرایا نظر سے
سبک کتنے بھاری دوشالے ہوئے ہیں

یہ اے شیخ گنبد نہیں مسجدوں کے
خُمِ مے ہمارے اُچھالے ہوئے ہیں

بھری بزم میں لطفِ خلوت ہے حاصل
وہ فتنے ہیں ہم سنبھالے ہوئے ہیں

یہ کہتی ہے مست آنکھ ان کی شبِ وصل
کئی آج خالی پیالے ہوئے ہیں

بہے ہیں جو فرقت میں آنکھوں سے میری
وہ دریا تو آنکھیں نکالے ہوئے ہیں

اسے کانٹو جو اشک مژگاں سے ٹپکے
وہی پاؤں پڑ پڑ کے چھالے ہوئے ہیں

سبو آبِ زمزم سے دھو کر بھری نے
اچھوتے ہیں جتنے کھنگالے ہوئے ہیں

جوانی میں سر کیوں اُٹھائیں نہ گیسو
کہ اب، ڈسنے والے یہ کالے ہوئے ہیں

وہ محشر میں کیا عیب کھولیں گے میرے
جو رحمت سے اب پردہ ڈالے ہوئے ہیں

سُنا ہے ریاض اپنی ڈاڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

جاپان اور منچوریا!

منچوریا میں جاپان کی روش پر لیگ اقوام نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار سنڈے ٹائمز رقمطراز ہے کہ "ہلڈے برانڈ کے زمانہ سے اور شاہانِ یورپ نے ساتھ پاپائے روم کے مناقشات کے زمانہ سے اب تک کسی گورنمنٹ کی پالیسی کو توانین بین الاقوامی کے آگے ایسا مطعون نہیں کیا گیا جیسا جنیوا میں جاپان کو کیا گیا ہے۔ جب عہدنامہ وارسیلز کی رو سے جرمنی پر جنگِ عظیم کی ابتدا کا اخلاقی جرم کلیتہً عائد کیا گیا ہے تو باوجود جرمنی نے حد درجہ ذلت کا احساس کیا تھا تاہم وہ اپنی تسکین اس خیال سے کرسکتی تھا کہ الزام کے عائد کرنے والے اس کے فاتحانہ حریف تھے جنہوں نے اسے سخت اور طویل جنگ میں شکست دی تھی۔ لیکن جاپان کے لئے کوئی ایسا تسکین دہ خیال نہیں ہے۔ جن قوتوں نے اسے ملزم ٹھیرایا ہے وہ حریف نہیں تھیں بلکہ لیگ کی ہمسر ممبر تھیں، وہ لیگ جس کی جاپان نے قابلِ قدر امداد کی ہے ... . درحقیقت لیگ نے منچوریہ کے معاملہ کو گڑبڑ کردیا ہے کیونکہ استحکام امن کی بجائے ایسے سامان پیدا کردئے ہیں جو کسی بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہوسکتے ہیں .... لیگ کے طرزِ عمل میں نقص یہ ہے کہ اس نے ایسے معاملات میں قانونی بحث کو دخل دیا ہے جو فی الاصل متضاد واقع ہوتے ہیں۔ پالٹیکس کا دائرہ عمل انسانی جذبات ہیں اور پولٹیکل کارروائی کی محرک وہ خواہش ہوتی ہے جو موجودہ قانون سے پوری نہیں ہوسکتی بلکہ وہ تبدیلی اور جدید قانون کا مطالبہ کرتی ہے۔ لیگ نے مدرسہ کے اُستاد کا سا طریقہ اختیار کیا ہے جو بید سے قانون نافذ کرتا ہے۔ اُس نے جاپان کا استقبال مصالحانہ جذبہ سے نہیں کیا، اُس نے کوئی مراعات نہیں برتیں، اور اُس نے جاپان کی مشکلات کا احساس بالکل ظاہر نہیں کیا۔"

دُنیا کی سلطنتیں منچوریا میں جاپان کے طرزِ عمل کو خلاف قانون قرار دینے میں متحد ہوگئی ہیں اور اُنہوں نے زمانۂ ماضی کے واقعات کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ منچوریا میں جاپان کی حیثیت کا انحصار چین کے موجودہ واقعات پر نہیں ہے بلکہ چین اور روس کے خلاف جاپان کی دو جنگوں کا تاریخی نتیجہ ہے۔ جاپان کا مطالبہ اس کے زندہ رہنے کے حق پر مبنی ہے جو انسان کا فطری حق ہے۔ تحفظِ نفس زندگی کا پہلا حق ہے جو صرف افرادِ انسانی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ قوموں کے لئے بھی عام ہے۔ زندہ رہنے کا فریضہ تمام اخلاق کی بنیاد ہے اور تحفظِ نفس ذات کی وسعت چاہتا ہے۔

جاپان کی وسعت کے مطالعہ کے لئے ہم کو جاپان کے پچھلے اسّی سال کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جبکہ جاپان نے گذشتہ صدی کے وسط میں اقوامِ دُنیا کے درمیان اپنی حیثیت کا احساس کرنا شروع کیا تھا۔ دو صدی سے زیادہ زمانہ سے جاپان ایک سنیاسی کی سی زندگی بسر کررہا تھا اور اپنے ملک کے دروازے

اجنبیوں کے لئے بند کر رکھے تھے۔ دُنیا کی تمام اقوام میں سے صرف اہلِ ہالینڈ اور چین کو تجارتی جہاز سال میں دو ایک مرتبہ جنوبی جزیرہ کی بندرگاہ ناگاساکی پر لانے کی اجازت تھی۔ تین صدیوں کے طویل عرصہ سے جاپان صلح و امن کی زندگی بسر کر رہا تھا، ہر قسم کی جنگ بند تھی۔ جاپانی فنونِ لطیفہ کی نشوونما میں مصروف تھے، اور اس شغل میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں نے خود زندگی کو ایک فنِ لطیف بنالیا ہے۔ اس طویل مدت میں مغربی اقوام ممالکِ دُنیا کی فتح میں مصروف تھیں، وہ دُنیا کے ہر حصّہ میں اپنی سلطنتیں قائم کر رہی تھیں اور اپنی فوجوں کی مدد سے اپنی تجارت کے فروغ کے لئے بازاروں اور حلقہ ہائے اثر کی بنیادیں ڈال رہی تھیں۔ یکایک ۱۸۵۳ء میں کمانڈر پیری ممالک متحدہ امریکہ کے بحری بیڑہ کی سرکردگی میں نمودار ہوئے اور جاپان اپنی خود عائد کردہ عزلت سے یکایک جاگا۔ امریکہ کے بحری بیڑہ نے جاپان کو مجبور کیا کہ ملک کے دروازے اجنبیوں کے لئے کھُولے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ایک عہدنامہ ممالک متحدہ امریکہ سے طے ہوگیا اور بعد ازاں ممالک یورپ سے عہدنامے ہوئے۔ امریکہ کی جانب سے یہ مداخلت جاپانیوں کو خواہ کیسی ہی ناگوار گزری ہو تاہم اس میں شک نہیں کہ یہی مداخلت انجام کار جاپان کی نجات کا باعث ہوئی۔

زمانۂ دراز گزرا کہ امریکہ کو یورپ کی جارحانہ کارروائی سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ممالک متحدہ امریکہ کو محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی اوائل اُنیسویں صدی میں "اصولِ منرو" کا اعلان کیا گیا۔ امریکہ کے مشرقی ساحل کے تحفظ کے بعد اُس نے مغرب کی طرف توجہ مبذول کی۔ مشرقِ بعید کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے ممالک متحدہ نے نوئی سپانہ کا علاقہ خریدا، ٹکساس کا الحاق کیا اور کلیفورنیا اور الاسکا کے علاقوں کا افتتاح کیا۔ مشرق کی جانب روس کی پیشقدمی نے ممالک متحدہ کو مجبور کیا کہ اپنے غربی ساحل کی حفاظت کی تدابیر اختیار کرے۔ اس کو اب مسئلہ بحرالکاہل سے سابقہ پڑا۔ اسی وجہ سے "اصولِ منرو" کے مفید اثرات کی توسیع ہوئی۔ امریکہ کی غرض جاپان کی قوت کے ساتھ وابستہ تھی۔

غفلت سے بیدار ہونے کے بعد جاپان نے اپنے تئیں شمال وجنوب دونوں جانب خطروں سے گھرا ہوا پایا۔ برطانیہ نے اپنا دائرۂ اثر ہانگ کانگ کے اطراف میں ۱۸۴۲ء کے عہدنامۂ نینکن سے بہت وسیع کرلیا تھا اور یہ ہمیشہ سے ہندوستان و ہانگ کانگ کو مستقر بناکر وسطِ چین میں پیشقدمی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روس نے چین کے ساتھ ۱۸۵۵ء میں عہدنامۂ آئیگون طے کرکے سائبیریا کا بحری صوبہ حاصل کرلیا تھا۔ فرانس نے ۱۸۵۹ء میں سیگون پر قبضہ کرکے انام میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی اور انام میں مستقر بناکر جنوبی چین میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جرمنی بعد میں آیا اور دوسری سلطنتوں کے ساتھ چینی بندرگاہوں میں مراعات حاصل کرنے میں ان کا شریک کار بنا۔ ہندوستان کی مغلوبیت جاپان کے سامنے تھی۔ تخریبِ چین کے ابتدائی مدارج اور ایران وسیام کی یورپین ممالک کے دائرۂ اثر میں تقسیم اس کے دیکھتے دیکھتے ہوئی۔ جاپانیوں نے اپنی نجات مغربی تمدن کے اختیار کرنے میں دیکھی اور وہ

بے غل وغش اس کے اختیار کرنے میں مشغول ہوگئے۔

جدید خیالات کی درآمد سے انقلاب کا ہونا لازمی تھا اور یک انقلاب حقیقی معنی میں جاپان میں واقع ہوا۔ سات سو برس سے شہنشاہ کے نام سے شوگن (وزیر) کے مختلف خاندان حکومت کرتے چلے آرہے تھے جیسے ہندوستان میں مرہٹوں کے زمانہ میں راجہ کے نام پر پیشوا حکومت کرتے تھے۔ وسط انیسویں صدی میں توکوگاوا شوگن کا خاندان برسرِ حکومت تھا جس کے ہاتھ میں دو سو ساٹھ برس سے عنانِ حکومت تھی۔ اس کے خلاف ایک شاہی پارٹی قائم ہوئی۔ اس خانہ جنگی میں دخل دینے کے لئے چند غیر سلطنتیں تیار بیٹھی تھیں۔ انگریز شاہی پارٹی کے طرفدار تھے، اور فرانسیسی شوگن کے۔ اگر انقلاب میں ان غیر سلطنتوں سے امداد حاصل کی جاتی تو جاپان کا حشر ہندوستان کا سا ہوتا۔ لیکن شوگن کی انتہائی وطن پرستی نے جاپان کو اس مصیبت سے بچا لیا جو غیر سلطنتوں کی مداخلت سے جاپان پر نازل ہونی یقینی تھی۔ شوگن نے جملہ اختیارات بلا کسی جنگ وجدل کے شہنشاہ کے حوالہ کر دئے اور خود حکومت سے کنارہ کش ہوگیا۔ ۱۸۶۸ء میں شہنشاہ میجی کو اختیارات حاصل ہوئے اور اسی سال سے جاپان میں دورِ جدید کا آغاز ہوا۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جاپان کا شاہی خاندان پونے تین ہزار برس سے برسرِ اقتدار ہے۔ بادشاہ کی عظمت کے لحاظ سے جاپانی نہایت قدامت پرست ہیں۔ اسے مثل دیوتا کے مانتے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ دورِ جدید کے آغاز سے امراء کی قوت کا استقبال نہیں ہوا بلکہ اور مستحکم ہوگئی ہے۔ شہنشاہ میجی غیر معمولی قابلیت کی شخصیت رکھتا تھا۔ دورِ جدید میں اُس نے تقریباً پینتالیس سال تک حکومت کی اور جب تک زندہ رہا تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اگرچہ پارلیمنٹ کا اجراء ۱۸۹۰ء میں ہوگیا تھا تاہم بادشاہ کی مرضی کے خلاف پارلیمنٹ کچھ نہ کرسکتی تھی۔ شہنشاہ میجی کی وفات کے بعد بھی حکومت کے اختیارات بجائے پارلیمنٹ کے گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہے۔ اب بھی اگرچہ پبلک کی آواز کو بہت قوت حاصل ہوگئی ہے تاہم وزارت کے خلاف تجاویز کرنے کی جرأت پارلیمنٹ میں نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ممبری پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے زرِ کثیر صرف کرنا پڑتا ہے۔ انتخاب پارلیمنٹ کے خرچ کا اوسط فی ممبر پچاس ہزار "ین" ہے اور بعض اُمیدوار دو دو لاکھ "ین" تک خرچ کر دیتے ہیں۔ اس کثیر المصارف انتخاب میں شرکت کرنے کا خیال مزدور پیشہ طبقہ کے خواب میں بھی نہیں آسکتا۔ متوسط طبقہ اُمیدواری کے لئے کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کرتا اور اگر کوئی جوشیلا آدمی اپنے ملک کی خدمت کے لئے احباب کی امداد پر کھڑا ہوتا ہے تو اُسے دیوالہ نکالنا پڑتا ہے۔ رہ گیا امراء و تجار کا طبقہ سو یہ عموماً قدامت پرست ہوتے ہیں۔ نیز پچاس ہزار "ین" صرف کر کے جو اعزاز یا جو موقع ملک و قوم کی خدمت کا حاصل ہوا ہے وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ پارلیمنٹ کوئی تجویز گورنمنٹ یعنی وزارتِ موجودہ کے خلاف منظور کرے تو اس کا نتیجہ پارلیمنٹ کی برخاستگی ہوتا ہے۔ جدید انتخاب کے لئے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنی ہر ممبر کو

ناگوار ہوتی ہیں۔ اِن حالات میں گورنمنٹ کو پبلک کی آواز کے خلاف بھی استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔ باوجود ان نقائص کے پبلک کو بہت کچھ اقتدار حاصل ہے اور یہ اقتدار بڑھتا جارہا ہے۔ یہ تمام تفصیل ایک جملہ معترضہ تھی۔ اب ہم نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

سنہ ۱۸۷۰ء و سنہ ۱۸۸۰ء کے درمیان جدید میجی گورنمنٹ نظام حکومت کی اصلاح میں منہمک تھی اور اس نے کوئی خارجی پالیسی مرتب نہیں کی تھی۔ غیر ملکوں کے لئے جاپان کے دروازے وا ہونے کے بعد سے اس ملک کی خارجی پالیسی کی ترتیب میں امریکہ کا بہت اثر پڑا ہے۔ جنرل لی ژندر ایک امریکن ہی تھا جس نے بالکل ابتداء میں اس پالیسی کی تشکیل کی تھی۔ وہ ممالک متحدہ کی جانب سے چین میں کونسل جنرل تھا۔ اپنی مدت ختم کر کے وطن واپس جاتے ہوئے جاپان سے گزرا۔ یہاں اُس نے جاپانی گورنمنٹ کے وزیر خارجہ کو یہ ضرورت جتائی کہ جاپان ایشیائی پالیسی مرتب کرے اور اسے عمل میں لائے، ورنہ وقت نکل جائیگا اور موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اُس نے شمال کی جانب سے روس کا خطرہ ظاہر کیا اور جنوب کی جانب سے برطانیہ اور فرانس کا۔ اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ جاپان اپنے علاقہ کی اس طرح توسیع کرے کہ ایشیا کے مشرق میں ایک ہلال بنائے جس کے شمالی سرے پر کوریا ہو اور جنوبی سرے پر فارموسا۔ جاپانی مدبرین پر لی ژندر کے مشورہ کا بہت اثر پڑا اور یہی سوال سنہ ۱۸۷۳ء میں خانہ جنگی کا باعث ہوا۔ جاپان میں امور داخلی کی اصلاح اشد ضروری تھی اور جب تک جاپانی گورنمنٹ نے اندرونی انتظام درست نہ کر لیا خارجی پالیسی کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی۔

جدید تمدن کی تبلیغ و اشاعت زور پر تھی۔ جاپان ہر مغربی بات اختیار کر رہا تھا خصوصاً امریکہ سے بہت استفادہ کر رہا تھا۔ صنعت و حرفت اور زراعت میں جدید آلات کے رواج سے روزی پیدا کرنے کا میدان بہت وسیع ہو گیا تھا۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ آبادی کے ساتھ ساتھ زمین کی پیداوار بھی بڑھتی رہی۔ قابل زراعت زمین کا ہر چپہ زیر کاشت آ گیا۔ چاول جاپانیوں کی اصل خوراک ہے۔ اسکی کاشت میں بھی نہایت اضافہ ہوا۔ لیکن اضافہ کی حد آ پہونچی اور زمین نے زیادہ اُگلنے سے انکار کر دیا۔ برخلاف اس کے آبادی برابر بڑھتی رہی اور زائد آبادی کے لئے چاول کی درآمد کرنی پڑی۔ جاپانیوں کو اب کثرتِ آبادی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اس کثرت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے ساٹھ سال میں جاپان خاص کی آبادی دُگنی ہو گئی ہے۔ گنجان آبادی کے لحاظ سے جاپان کا درجہ برطانیہ کے بعد ہی ہے۔ برطانیہ میں فی مربع میل ۴۶۸ شخص آباد ہیں اور جاپان میں ۴۳۷۔ چین خاص کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہاں آبادی بہت گنجان ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہاں فی مربع میل صرف ۲۶۸ شخص آباد ہیں۔ گویا جاپان کے مقابلے چین نصف گنجان ہے۔ آبادی کی رفتار ترقی کے لحاظ سے جاپان کے تمام ممالک دُنیا میں اوّل ہے۔ کل آبادی نو کروڑ ہے۔ جس پر سالانہ اضافہ کی اوسط نو لاکھ ہے۔

آبادی کے مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں جاپان میں کمانے والوں کا تناسب کم ہے۔ گویا جاپان میں بچوں اور بوڑھوں کو کھلانے میں کمانے والوں پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے آخری مردم شماری کے بموجب مختلف ممالک کے قابل کمائی اور ناقابل کسب عمر والوں کا تناسب ظاہر ہوگا:۔

ملک	عمر صفر تا ۱۴ سال	۱۵ تا ۵۹ سال	۶۰ سال سے اوپر	میزان
جاپان	۳۶۷	۵۵۹	۷۴	۱۰۰۰
ممالک متحدہ	۳۱۹	۶۰۶	۷۵	۱۰۰۰
انگلستان	۲۷۷	۶۲۹	۹۴	۱۰۰۰
فرانس	۲۲۵	۶۳۷	۱۳۸	۱۰۰۰
جرمنی	۲۵۸	۶۵۰	۹۲	۱۰۰۰

ان اعداد سے یہ ظاہر ہے کہ مغربی ممالک کے باشندوں کے مقابلہ میں ایک جاپانی کو زیادہ اشخاص کی پرورش کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان ممالک کے مقابلہ میں جاپان میں زراعت زیادہ حصہ آبادی کا ذریعہ معاش ہے جیسا نقشہ ذیل سے ظاہر ہے:۔

ملک	زراعت و ماہی گیری	صنعت و کان کنی	تجارت	دیگر	میزان
جاپان	۵۰٫۴	۱۸٫۹	۱۹٫۰	۱۱٫۷	۱۰۰
ممالک متحدہ	۲۲٫۰	۳۱٫۷	۲۴٫۶	۲۱٫۷	۱۰۰
انگلستان	۷٫۵	۴۶٫۸	۲۵٫۱	۱۷٫۲	۱۰۰
فرانس	۳۸٫۴	۳۴٫۵	۱۵٫۱	۱۲٫۰	۱۰۰
جرمنی	۳۰٫۵	۴۱٫۴	۱۶٫۵	۱۱٫۶	۱۰۰

یہ حالت ایسے ملک کی ہے جو زیادہ تر پہاڑی ہے، جاپان کی ۸۵ فیصدی زمین پہاڑی ہے۔ پھر اس نقص کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیئے کہ جاپان میں ایسی قدرتی پیداوار کی بہت کمی ہے جو ایک قوم کے لئے خصوصاً صناع قوم کی زندگی کے لئے نہایت اہم ہے۔

جاپان میں زائد آبادی کے لئے ذرائع معاش فراہم کرنے کا مسئلہ نہایت اہم ہوگیا ہے۔ جاپانیوں کے لئے یہ موت و زیست کا سوال ہے۔ اگر قوانینِ قدرت کو عمل پیرا ہونے دیا جاتا تو کسی ملک کی زائد آبادی کا مسئلہ اس طرح حل ہوسکتا تھا کہ زائد آبادی دُنیا کے دیگر ممالک میں چلی جائے۔ لیکن انسان نے قوانینِ قدرت کی مخالفت میں ملکی حدود قائم کرکے قوموں میں آئے دن کی جنگ کا دروازہ کھول دیا ہے، دُنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جو جاپان کی زائد آبادی کو جذب کرسکتے تھے۔ اس نے اپنی زمین کا بار ہلکا کرنے

کے لئے دیگر ممالک میں اپنے جوانوں کو بھیجا لیکن مغربی اقوام کا امتیاز رنگ حائل ہونے لگا۔ انہوں نے جاپان سے قبل ہی مقبوضات قائم کرلئے تھے، جن کو وہ اپنی ملکیت قرار دیتی ہیں اور جاپان کو ان سے استفادہ نہیں کرنے دیتیں۔ امریکہ میں جاپانیوں کو انتقالِ مکان کے اچھے مواقع تھے، لیکن وہاں بھی جلد ہی اس امتیاز نے ایک آہنی دیوار کھڑی کردی۔ مرحوم پریسیڈنٹ روزویلٹ نے اپنی قوت مشاہدہ سے یہ احساس کرلیا تھا کہ امریکہ میں جاپانیوں کے خلاف تحریک زور پکڑنے والی ہے۔ اُس نے جاپانی گورنمنٹ کے ساتھ ایک عہدنامہ بنام "اقرارنامہ شرفا" ۱۹۰۸ء میں طے کیا جس کی رو سے جاپانی گورنمنٹ نے اقرار کیا کہ ہم خود تمہارے ملک کی جانب جاپانیوں کی نقل مکانی بند کرتے ہیں۔ جاپانیوں کی انتقال مکان کی تحریک کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن انہیں احساس تھا کہ امریکہ ہمیشہ سے ہماری رہنمائی کرتا رہا ہے۔ انہوں نے موجودہ زمانہ کی اختراعات امریکہ سے حاصل کی تھیں اور امریکن مدبرین سے اپنی خارجی پالیسی کی تدوین میں مشورہ کرتے رہتے تھے۔ بعض مواقع پر جاپان کی خارجی پالیسی کا استحکام امریکہ کی امداد سے حاصل ہوا ہے۔

وائیکاؤنٹ کینتارو کا نیکو جو امپیریل پریوی کونسل کے ممبر ہیں جنگِ روس و جاپان کی ابتداء میں جاپان کی جانب سے نیویارک میں نیابت کرتے تھے۔ ان کو پریسیڈنٹ روزویلٹ کی دوستی کا شرف حاصل تھا۔ جب پریسیڈنٹ موصوف کی کوشش سے اس جنگ کا خاتمہ ہوا اور صلح کی بابت گفتگو شروع ہوئی تو ان کے مدعو کرنے پر یہ ۱۹۰۵ء میں دوبارہ امریکہ گئے۔ وائیکاؤنٹ موصوف نے پریسیڈنٹ کی گفتگو کی رپورٹ اپنی گورنمنٹ میں پیش کردی تھی۔ اب یہ گفتگو ایک کتاب مسمیٰ "موجودہ جاپان" میں ایسوسی ایشن معاملات خارجی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے اخبار سنڈے ٹائمز نیویارک رقمطراز ہے کہ تھیوڈور روزویلٹ ایسے زمانہ میں وائٹ ہاؤس میں متمکن تھے جو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے معاملاتِ مشرقِ بعید میں دخل درمعقولات دینے والے زمانہ سے بالکل مختلف تھا۔ اُس وقت انہوں نے جاپان پر زور ڈالا تھا کہ ایشیا میں "جاپانی منرو اصول" کا اعلان کردے۔ وہ معاملات ایشیا میں ہمارے دخل درمعقولات کے سخت خلاف تھے۔ منچوریا میں جاپانی حملہ (لفظ حملہ ہو وردآسن کی ایجاد ہے) ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا جب کہ اس کی تجویز پریسیڈنٹ روزویلٹ نے کلیفورنیا کو جاپانی حملہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کی تھی۔ پریسیڈنٹ موصوف چاہتے تھے کہ جاپان اپنے اصول منرو کا اعلان کردے جس کی رو سے جاپان اپنا اثر تمام ایشیا میں کام میں لاسکیگا کیونکہ ان کے نزدیک وہ دن دور نہیں تھا جب ممالک متحدہ مشرق بعید کے معاملات میں اُلجھ جائیگا۔ .... ایشیائی ممالک کی جانب جاپان کی مستقبل کی پالیسی ایسی ہونی چاہیئے جیسی ممالک متحدہ کی پالیسی اپنے امریکن پڑوسیوں کی جانب ہے۔ جاپانی اصول منرو کے اعلان سے یورپین اقوام کے لئے عذر دخل درمعقولات دور ہوجائیگا اور جاپان

ایشیائی اقوام کا رہنما مان لیا جائیگا اور اس کی قوت ان کے لئے سپر کا کام دیگی جس کی پناہ میں وہ قومی ضوابط کی ترتیب کر سکیں گی .... پریسیڈنٹ موصوف نے ان الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ "اگر جاپان صلح پورٹسمتھ کے بعد ایشیائی اصول منرو کا اعلان کر دے تو میں اپنی تمام قوت کے ساتھ اُس کی تائید کرونگا خواہ اس تائید کی ضرورت میرے عہد پریسیڈنٹی میں پڑے یا بعد میں" یہ الفاظ اور یہ جذبات ایک امریکن کے معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً ایک امریکن نے ہی انہیں ادا کیا ہے۔

پریسیڈنٹ موصوف نے یہ بھی کہا کہ "ایشیا میں جاپان ہی ایک ایسی قوم ہے جو مغربی تہذیب کے اصول اور طریقہ سے واقف ہے۔ اس نے ثابت کر دکھایا کہ وہ اپنی آبائی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے مغربی تہذیب کو جذب کر سکتا ہے"

"جملہ ایشیائی اقوام کے لئے یہ امر نہایت اہم ہے کہ وہ دورِ جدید کی موافقت کریں۔ اس کام میں جاپان کو قدرتاً ان کا رہنما بننا چاہیئے اور بالیدگی کے دوران میں جاپان کو ان کی حفاظت کرنی چاہیئے، ٹھیک اسی طرح جیسے ممالک متحدہ نے زمانہ ماضی میں براعظم امریکہ کی رہنمائی اختیار کر لی تھی اور اصول منرو کے ذریعہ سے امریکہ کی لیٹن اقوام کو یورپین اقوام کی دستبرد سے ان کی اپنی آزادی کی تکمیل کے زمانہ میں محفوظ رکھا ہے.... تھیوڈور روز ویلٹ کی دوربین نظر جاپانی اصول منرو کی تجویز تک محدود نہیں رہی۔ وہ اپنا دقیع اثر ایک ایسی تحریک کی تقویت میں کام میں لاتے جس سے جاپان کا مستقبل منچوریا میں محفوظ ہو گیا اور جو موجودہ قضیہ سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ صلح پورٹسمتھ کے بموجب روس نے جنوبی منچوریا ریلوے جاپان کے حوالہ کر دی تھی۔ مسٹر ہیری مین مرحوم نے جو امریکہ کے ریلوے کے امیر کا درجہ رکھتے تھے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جنگ میں زیر بار ہو جانے کی وجہ سے جاپان اس لائن کی مرمت اور انتظام میں روپیہ نہیں لگا سکتا۔ وہ سرعت سے عمل پیرا ہوئے۔ بیشتر اس کے کہ جاپان ان کی حکمت عملی کا احساس کرے انہوں نے متذکرہ بالا ریلوے لائن اپنے ہاتھ میں لینے کی تجویز پیش کر دی اور برائے نام منظوری بھی حاصل کر لی۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ چینی مشرقی ریلوے اور ٹرانس سائبیرین ریلوے بھی حاصل کر لیں اور تینوں کو ملا کر ماسکو سے ڈائرین تک ایک نظام قائم کر دیں۔

"ہیری مین کے خواب کی تعبیر سچی نکلتی اگر پریسیڈنٹ روز ویلٹ دُور اندیشی کو کام میں نہ لاتے۔ پریسیڈنٹ موصوف دیکھ چکے تھے کہ جاپان کو ماضی میں فتوحات کے ثمرہ سے محروم کیا جا چکا ہے۔ چین کی جنگ کے بعد یورپین سلطنتوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اب جاپان روپیہ کی جنگ میں اس اقتصادی اور فوجی تحفظ کو کھونے والا تھا جو اُس نے جنگِ روس میں حاصل کر لیا تھا۔ روز ویلٹ یہ جانتے تھے کہ جب تک چین میں غیر ملکی اثرات جاپان کے خلاف کام کرتے رہینگے، دُنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ زوال پذیر چین اپنے ملک میں امن قائم نہیں رکھ سکتا تو غیر ملکی دخل کی مدافعت کیسے کر سکتا ہے؟ اگر دُنیا کی سلطنتوں کو اپنی تجارت چین

میں جاری رکھنی ہے تو کچھ نہ کچھ دخل ضرور دینا پڑیگا۔ مگر امن قائم رکھنا ہے تو غالب اثر جاپان کا ہونا چاہیئے۔

"روز ویلٹ نے ہیری مین سے زیادہ تیزی سے کام کیا۔ اُنہوں نے اپنے رشتہ دار ایم روز ویلٹ کے ذریعہ سے نیویارک کے بنکوں سے وعدہ حاصل کر لیا کہ وہ جنوبی منچوریا ریلوے کی مرمت کے لئے روپیہ فراہم کر دینگے بشرطیکہ اس لائن کا انتظام جاپانی گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں رکھے۔ چال چل گئی۔ ٹوکیو نے فوراً ہیری مین سے مراسلت بند کر دی۔ جاپان کا مستقبل منچوریا میں محفوظ ہو گیا"

جاپان نے منچوریا کا ایک حصہ ۱۸۹۵ء میں حاصل کر لیا تھا جو چین نے اسے بطور تاوان جنگ کے دیا تھا۔ مگر ممالک مغرب کی نظروں میں جاپان کی یہ کامیابی خار گزری۔ روس، جرمنی اور فرانس نے متحد ہو کر جاپان کو مجبور کیا کہ وہ منچوریا کا علاقہ چین کو واپس کر دے اور اس کے معاوضہ میں مزید تاوان جنگ قبول کرے۔ یورپین ممالک نے نہ صرف جاپان کو مفتوحہ علاقہ سے محروم ہی کیا بلکہ روس نے فائدہ اُٹھایا۔ تین سال کے اندر اندر نہ صرف منچوریا کا متذکرہ بالا حصہ بلکہ کل منچوریا اجارہ کے طور پر حاصل کر لیا۔ جس میں روس کو اقتصادی نفوذ کے علاوہ مشرق سے مغرب تک ریلوے تعمیر کرنے اور کل ملک کو فوجی کارروائی کے لئے استعمال کرنے کے حقوق مل گئے۔ جاپان کی اس سے بڑھکر اور کیا تذلیل ہو سکتی ہے مزید براں چین نے جاپان کے خلاف روس کے ساتھ ایک خفیہ عہد نامہ بھی کر لیا جو اگر جاپان کو معلوم ہو جاتا تو فوراً ہی ایک اور جنگ کا باعث بن جاتا اور جاپان چین سے ایسی شرائط طے کراتا کہ مسئلہ منچوریا ہمیشہ کے لئے حل ہو جاتا۔ اس کا علم جاپان کو واشنگٹن کانفرنس میں ہوا جب کہ چین کو مجبوراً یہ عہد نامہ دوسری سلطنتوں کے ملاحظہ کے لئے پیش کرنا پڑا تھا۔

جاپان کی نہ صرف تذلیل ہی ہوئی تھی بلکہ اس کو اپنے ساحل سے روس کے اس قدر قریب آجانے سے خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ اب روس سے جنگ لازم ہو گئی جو آخر کار ۱۹۰۴-۱۹۰۵ء میں ہو کر رہی۔ روس کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ جاپان کے لئے موت و زیست کا مسئلہ تھا۔ جاپان کو ایک لاکھ بہادر قربان کرنے پڑے اور بیس لاکھ ین صرف کرنے پڑے۔ یہ جنگ منچوریا میں ہو رہی تھی مگر چین نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا جس سے گویا اس نے منچوریا میں حکومت کرنے کا حق جانبین کے حوالہ کر دیا۔ جاپان نے شاندار فتح پائی جس کا غلغلہ تمام ایشیا میں ہوا۔ اس فتح کے باعث تمام ایشیا جاپان کا ممنون ہے کہ اُس نے مغرب کا طلسم توڑ ڈالا اور مشرقی اقوام میں خودداری کا احساس پیدا کر دیا۔ پریسیڈنٹ روز ویلٹ کی مداخلت پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔

صلح نامہ پورٹسمتھ کی رو سے، جس پر ۱۹۰۵ء میں دستخط ہوتے تھے، منچوریا سے روس کا اخراج تو نہیں ہوا البتہ جنوبی منچوریا کے علاقہ میں جاپان کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہو گئے جو روس کو حاصل تھے۔ جاپان نے دوبارہ وہ علاقہ حاصل کر لیا جو دس سال پہلے اُس نے چین سے فتح کیا تھا مگر اس علاقہ پر مالکانہ قبضہ

حاصل نہ ہوا بلکہ چین کے ساتھ ایک علیحدہ عہدنامہ کی رو سے جاپان کو روس کی طرح اجارہ دیدیا گیا۔ اس علاقہ میں چند سو میل ریلوے لائن شامل تھی جو روس نے حال میں تعمیر کی تھی اور تجارتی بندرگاہ دائرین بھی شامل تھی۔ یہ علاقہ جاپان کے لئے اقتصادی اور فوجی نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھا۔ زمین بہت زرخیز تھی اور اس میں کوئلہ اور لوہے کی کانیں موجود تھیں جو جاپان کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ جزائر جاپان میں ان کانوں کی خاص کمی ہے۔ ریلوے کے حصول سے جاپان کو اس علاقہ پر اقتصادی اور حاکمانہ اقتدار حاصل ہوگیا کیونکہ اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی کہ چین اس کے مقابلہ میں متوازی لائن نہیں بنائیگا۔ ان جملہ حقوق کا اجارہ چین کی جانب سے صرف پچیس سال کے لئے دیا گیا تھا۔

مسٹر باڈلی جو لندن کے ہفتہ وار اخبار اسفیر کے نامہ نگار خصوصی ہیں اخبار جاپان ٹائمز کے لئے ایک خاص آرٹیکل میں خطرۂ روس اور حالات چین و منچوریا کی بابت لکھتے ہیں "اگر مشرق بعید میں کوئی ایسا خطرہ ہے جس سے انگلستان خائف ہے اور ہمیشہ سے خائف رہا ہے تو وہ روس کا خطرہ ہے۔ یہ خطرہ بولشویک اصولوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ روس ہمیشہ سے مشرقی اقوام کے علاقوں پر قبضہ کرتا چلا آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ سرخ پوشوں کے پیدا ہونے کے زمانہ دراز پہلے جاپانیوں کو سخت سے سخت پیش قدمی کرنے روس کا سامنا کرنا پڑا تھا جو استقلال کے ساتھ منچوریا میں قدم جماتا ہوا کوریا کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اب روسی خطرہ کی صورت بدل گئی ہے اور یہ اس وجہ سے زیادہ خوفناک ہوگیا ہے کہ اُس فاتحانہ جوش کے علاوہ جو زار کی فوجوں کو اُبھارتا رہتا تھا سرخ افواج کے لئے ایک اور محرک پیدا ہوگیا ہے کہ وہ دنیا میں کمیونسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہتی ہیں جہاں بولشویک اصولوں کے مطابق حکومت ہوگی۔ منچوریا اب بھی ایک مقصد ہے، لیکن راہ میں صرف منزل کی حیثیت رکھتا ہے کہ چین، ہند چینی، ہندوستان اور تمام اشتعال پذیر مشرق میں قدم جمانے کا کام دے۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر منچوریا پر روس کا قبضہ ہوگیا تو وہاں کے تین کروڑ باشندوں کو کمیونسٹ اصول کی تعلیم دینے میں زیادہ مدت صرف نہیں ہوگی، پھر روس کے یہ چیلے چین میں پھیل کر مزید پیشقدمی کے لئے میدان صاف کردینگے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر جاپان منچوریا میں قانون و امن کی تعلیم نہ دے تو روس وہاں بدامنی کی تعلیم دے گا۔ پھر بھی اقوام یورپ سبز بانات سے ڈھکی ہوئی میزوں کے گرد بیٹھ کر جاپان کی نکتہ چینی کرتی ہیں، جب کہ انہیں جاپان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے ایسے تلخ کام کو اپنے ذمہ لیا ہے جسے کوئی دوسری سلطنت چھونا گوارا نہیں کریگی۔

"میں بیس مہینے چین میں رہا ہوں۔ میں وہاں لٹن کمیشن کے ورود کے وقت موجود تھا۔ کمیشن کے ممبرں کو ارض چین میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک مسلح ریل گاڑیوں میں منتقل کیا جاتا تھا۔ چینی جو باتیں انہیں دکھانا اور سنانا چاہتے تھے وہی انہیں دیکھنے اور سننے کا موقع دیتے تھے، چینی انکے سامنے بڑے ہنس مکھ

بنے ہوئے تھے حالانکہ اگر وہ اپنی مرضی کام میں لا سکتے تو تمام ممبروں کو بستر بوریئے سمیت ملک سے نکال باہر کرتے۔ میں نے چینیوں کو غیر ملکیوں کے ساتھ پبلک میں بدسلوکی کرتے دیکھا ہے، میں نے چین میں سفر کے خطرات کا تجربہ کیا ہے اور کیا بتاؤں میں نے کیا کیا دیکھا ہے .... غرضیکہ میں جانتا ہوں کہ چینی حقیقت میں کیسا آدمی ہوتا ہے۔

"پھر میں جاپان میں آیا اور اپنے ملک جیسا قانون جاری اور امن ساری دیکھا۔ میں کسی کمزور نکتہ کی گرفت کرنا چاہتا تھا مگر مجھے نظر نہ آیا۔ بعد ازاں منچوریا گیا جو مجھے اوپری طور سے چین جیسا معلوم ہوا مجھے ہر وقت فسادوں اور ریل کے حادثات کا ڈر لگا رہتا تھا مگر میں نے ایک لٹیرا بھی نہیں دیکھا۔ ریلوں، ہوٹلوں اور طرز رہائش میں جاپان کی طرح تنظیم کی جا رہی ہے۔ پھر میں ہاربن گیا اور یہاں رہنا مجھے چین سے زیادہ پُرخطر معلوم ہونے لگا۔ میں نے روسی ہوٹلوں کا تجربہ کیا مگر مجھے ہمیشہ جاپانی سراؤں کی صفائی اور مالک سرائے کی مہمان نوازی یاد آئی ......"

"جب کبھی ممالک متحدہ کے باشندے جاپان کو شکنجہ میں کسنے کا اصلی مقصد ظاہر کر دینگے اور یورپ یہ احساس کریگا کہ قوی جاپان کے معنی مشرق بعید میں امن کے ہیں تب ہی اصلی امن اور اصلی خوشحالی حاصل ہوگی۔ لیکن جب تک ایشیا میں جاپان کا اقتدار قائم نہیں ہو جائیگا اُس وقت تک بدامنی اور دربدری کی بربادی کی ہی توقع کی جا سکتی ہے۔"

جاپان اپنے پچیس سالہ عہد اقتدار میں منچوریا کو خوشحال بنانے پر فخر کر سکتا ہے۔ چین جیسے جنگ سے خوار و خستہ ملک میں منچوریا ہی امن کی جگہ ہے۔ یہاں نہایت جانفشانی اور قابلیت سے زراعت کی نشوونما کی گئی ہے، کوئلے اور لوہے کی پیداوار نہایت کثیر ہوگئی ہے۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے وسائل کو نہایت خوبی سے ترقی دی گئی ہے۔ سویا کی پھلی کی تجارت تو اتنی بڑھ گئی ہے کہ اسے تجارت کا اعجاز کہا جا سکتا ہے۔ جنوبی منچوریا کے باشندوں کی اقتصادی حالت بہت ترقی کر گئی ہے، دوسرے ممالک کے مفاد کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اور جاپانی مفاد کی نشوونما کرنے میں ان کے خلاف کوئی بیجا حرکت نہیں کی گئی۔

جنگ روس و جاپان کے بعد ہی سے جاپان نے جنوبی منچوریا میں اپنی حالت کے استحکام کی کوشش کی اور خاص خاص ممالک سے جن کے مفاد مشرق بعید سے وابستہ ہیں اپنے حقوق منوانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس غرض کے حصول کے لئے اُس نے سب سے پہلا عہدنامہ روس سے کیا اور بعد میں فرانس و برطانیہ سے عہدنامے طے کئے۔ برطانیہ کے ساتھ جاپان کا اتحاد ۱۹۰۲ء میں قائم ہوگیا تھا اور یہی اتحاد تھا جس نے جنگ روس و جاپان میں دول مغرب کو دخل انداز ہونے سے باز رکھا۔ نیویارک کے چیمبر آف کامرس کے ایک جلسہ میں جاپانی سفیر دیبوچی نے جاپانیوں کے نقطۂ نظر کو اس طرح بیان کیا ہے "جاپانی منچوریا کو

اپنی لائف لائن، اس لئے قرار دیتے ہیں کہ یہ ملک جاپان کے تحفظ سے صرف اہم تعلق ہی نہیں رکھتا بلکہ ایسی قدرتی پیداوار کا ذخیرہ اور منبع ہونے کی وجہ سے جو حدود جاپان میں تقریبًا ناپید ہونے کے برابر ہیں جاپان کیلئے لازمۂ حیات بن گیا ہے۔ تاریخی، اقتصادی اور جغرافی حیثیت سے منچوریا میں جاپانی حقوق سے انکار نہیں کیا جا سکتا"

جاپان دس سال کے عرصہ میں دو لڑئیاں لڑا تھا، اور دوسری جنگ کے بعد تقریبًا دیوالیہ ہو گیا تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے قریب تھا کہ جاپان کے ہاتھ سے جنوبی منچوریا ریلوے کا اقتدار نکل جائے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جاپان کی امداد کی اور جنوبی منچوریا ریلوے کے انتظام کے لئے قرضہ دلوا دیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء تک ممالک متحدہ کی پالیسی جاپان کے موافق تھی۔ یہانتک کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جاپان کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ منچوریا میں اپنے پولٹیکل اقتدار کا اعلان کر دے۔ لیکن دوسرے ہی سال سکریٹری ناکس کی تحریک نے جاپان کو حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ منچوریا کی ریلوں پر بین الاقوامی انتظام قائم کر دیا جائے شاید اس خیال سے کہ منچوریا میں اقتصادی اور پولٹیکل اقتدار کے لئے جو کشمکش اقوام کے درمیان موجود تھی اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ سوائے جرمنی کے دیگر تمام دول نے اس تجویز کی مخالفت کی تاہم اس سے جاپان کو اس امر کا تلخ احساس ہوا کہ ابھی تک منچوریا میں اسے استحکام حاصل نہیں ہے باوجودیکہ وہ موجودہ اثر کے حصول کے لئے اتنا روپیہ برباد کر چکا تھا۔ اور اس قدر جانیں قربان کر چکا تھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء کے عہدنامہ کی رو سے جاپان کا اجارہ جنوبی منچوریا میں سنہ ۱۹۲۳ء میں اور جنوبی منچوریا ریلوے کا اجارہ سنہ ۱۹۲۹ء میں ختم ہونے والا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ جاپان اتحادِ ثلاثہ کی جانب سے جنگِ عظیم میں شریک ہوا۔ منچوریا میں اپنی حالت کے استحکام کے لئے جاپان نے چین سے سنہ ۱۹۱۵ء میں خواہش کی کہ منچوریا کے اجارہ کی توسیع ننانوے ۹۹ سال کے لئے کر دی جائے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں جاپان نے کوشش کی ممالک متحدہ منچوریا میں جاپان کے مخصوص حقوق تسلیم کرے جن کے تسلیم کرنے سے اس نے اب تک انکار کیا تھا۔ جاپان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ سنہ ۱۹۱۷ء میں ممالک متحدہ کے ساتھ ایک قسم کا سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے ممالک متحدہ نے جنوبی منچوریا میں جاپان کے مخصوص حقوق تسلیم کر لئے۔

جاپان کی ترقی کے ابتدائی زمانہ سے مغربی اقوام ہر طرف سے جاپان کو گھیرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔ انہوں نے وسیع سلطنتیں قائم کر لی ہیں یہانتک کہ ممالک متحدہ امریکہ نے بھی جزائر فلپائن اور جزائر ہوائی پر قابض ہو کر بحرالکاہل میں سلطنت کی توسیع کر لی ہے۔ لیکن جاپان کو اپنی روز افزوں آبادی کی نکاسی کے لئے کوئی راستہ نہیں دیا جاتا۔ جنگِ عظیم کے بعد ممالک متحدہ کی تجویز پر ایک نئی ترکیب نکالی گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں واشنگٹن کانفرنس کا انعقاد اور نو سلطنتوں کے عہدنامہ کی تکمیل وہی چیز ہے۔ اس عہدنامہ کی رو سے گویا کہ نو سلطنتوں نے جبرًا اپنے اوپر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ چین کی آزادی کا لحاظ

رکھیں گی اور اس کے حدود ارضی اور ملکی انتظام میں مداخلت نہیں کرینگی۔

چین جیسے کمزور اور ناقابلِ قیام امن ملک کے ساتھ اس ہمدردی کے اظہار کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ چین کے سامنے جاپان کو ایک بدخواہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منچوریا میں اپنے حقوق کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جاپان ہمیشہ سے چین کو مغربی اقوام کی دست درازیوں سے بچاتا رہا ہے۔ اگر جاپان نہ ہوتا تو دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح چین کے بھی حصّے بخرے ہو جاتے اور مغربی اقوام میں بٹ جاتے۔ نو سلطنتوں کے عہد نامہ کے باوجود ۱۹۲۴ء میں انہوں نے یہ تجویز کیا کہ چین کی ریلوں پر بین الاقوامی انتظام قائم کر دیا جائے۔ یہ جاپان ہی تھا جس نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اس وقت چین نے جاپان کے اس احسان کا احساس کیا۔ مگر چین کی پالیسی میں ہمیشہ تلوّن نمایاں رہا ہے۔ اگر چین کی کسی پالیسی میں استحکام ہے تو جاپان کی مخالفت میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ جنگ چین و جاپان کے بعد ہی تمام منچوریا کی روس کو حوالگی چین کی کجروی کی بیّن دلیل ہے۔ چین اس خیال میں مگن ہے کہ بین الاقوامی رشک و حسد کسی خاص سلطنت کو ملک چین میں قدم نہ جمانے دیگا۔ اسی وجہ سے چین کی پالیسی بہت غیر محتاط اور ناعاقبت اندیشانہ ہو گئی ہے۔ چند سال سے اس نے عہد نامہ جات کی شکست کو اپنا وتیرہ بنالیا ہے۔ انہی شکستہ عہد نامہ جات میں جاپان کے ساتھ دوستی اور تجارت کے بنیادی عہد نامے ہیں جن پر ۱۸۹۶ء میں اور ۱۹۰۳ء میں دستخط ہوئے تھے اور جن کی شکست کا چین نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا۔ وہ جاپان کے خلاف اقتصادی جنگ کر رہا ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ من حیث القوم چین کا کیا درجہ ہے۔ پریسیڈنٹ یوان شی کائی کی وفات کے بعد یعنی ۱۹۱۵ء سے چین کا ملک چند جنگی صوبہ داروں میں تقسیم ہو گیا ہے جو اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کر رہے ہیں اور آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ صوبہ کے صوبہ کمیونسٹ بن گئے ہیں اور چین کی زندگی بحیثیت ایک ایسے ملک کے جو روس کی اطاعت سے آزاد ہو خطرناک بن گئی ہے۔ درحقیقت نینکن کی موجودہ حکومت نے بولشوزم کے پیرو کی صورت میں جنم لیا تھا اور بعد میں اپنے رہنما سے بغاوت کی۔ لیکن بولشوزم کا اثر باقی ہے۔ کینٹن کی گورنمنٹ جو حکومت چین کی مساویانہ دعویدار ہے اپنی کمیونسٹ روش چھپانے کی کوشش نہیں کرتی۔ وسطی چین کی گورنمنٹ کھلم کھلا کمیونسٹ ہے۔ صرف شمالی چین کی گورنمنٹ کمیونزم سے محفوظ تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جنوبی منچوریا میں جاپان کو اقتدار حاصل تھا اور روس جاپان کا لحاظ کرتا ہے۔ شمالی چین کی گورنمنٹ نے ابھی دو سال ہوئے جاپان کی مخالفت میں نینکن گورنمنٹ کی متابعت اختیار کی تھی۔

ان حالات میں جاپان کو منچوریا میں اقدامِ عمل کرنا پڑا۔ جاپان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے نو سلطنتوں کے عہد نامہ کو توڑا ہے۔ لیکن الزام لگانے والے چین کی اسی قسم کی عہد شکنی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اولاً ملک کی بدامنی اور صوبہ داروں میں حکومت کی تقسیم سے چین کو ایک قوم یا گورنمنٹ کہلانے کا حق نہیں رہا۔ دوئم

چین کی جانب سے دوسری سلطنتوں کے عہدناموں کی شکستگی۔ اور سوئم جاپان کے خلاف چین کی اقتصادی جنگ، بہ امور چین کو بانیٔ فساد قرار دیتے ہیں، جاپان نے اپنے حقوق کی حفاظت میں مدافعات کارروائی اختیار کی ہے جن کو چین نے پامال کیا تھا۔ (باقی آئندہ)

(پروفیسر نورالحسن برلاس

حسنِ سخن

لاکھ میں تشنہ لب سہی اتنا تو پھر بھی ہوش ہے
کب میرے آنسوؤں سے تر دامنِ مے فروش ہے

تیغِ زباں دراز سے شکوے کا کسکو ہوش ہے
زخمِ دہن دریدہ بھی محوِ لبِ خموش ہے

سُننے چلا ہوں دیکھنا حُسن و وفا کو امتزاج
اللہ رے بے حسی مری نیشِ کمالِ نوش ہے

جاذبِ شوق تھا کبھی غارتِ ہوش تھا کبھی
نغمۂ سازِ زندگی۔ اب تو فریبِ گوش ہے

ضبط کا یہ صلہ ملا اے دلِ بے نوا سُنا
ایک خموشی پر تری تہمتِ صد خروش ہے

گردشِ چشمِ مست کیا بالا ہی بالا جائیگی
بیٹھا ہوا ادھر بھی ایک آپ کا بادہ نوش ہے

تیری وفا کے تذکرے غیر و نہیں ہیں بلا سے ہوں
مرنیکی یاں تو ٹھن گئی جینے کا کِس کو ہوش ہے

تھی وہ ستائشِ وفا مرنے کی داد یہ ملی
زندہ عذابِ جان تھا مُردہ وبالِ دوش ہے

جاتی ہے جس طرف نظر پاتے ہیں کفر کا اثر
جسکو حرم سمجھتے ہیں محفلِ بُت فروش ہے

آکے ہوائے شوق میں نغمہ سرا ہے بے خودی
رنگ پریدہ تپش جلوۂ رقصِ ہوش ہے

عبداللطیف تپش بی۔اے

عراق کے دلچسپ حالات

عراق کی سرزمین قدیم تمدن کا گہوارہ ہے۔ اور وہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی مستقل تاریخ ہے۔ امتدادِ زمانہ کے باوجود قلوب سے تمدنِ بابل کی تاریخی عظمت کے نقوش نہیں مٹے اور آج بھی جب دُنیا کے گذشتہ تمدن و تہذیب کی تاریخ پر نظر پڑتی ہے تو سب سے پہلے "تمدنِ بابل" کا عظیم الشان خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس کے مشاہدے سے نگاہ ٹھٹک کر رہ جاتی ہے۔ عراق کے آغوش میں تمدنِ بابل کی عظمتِ رفتہ محوِ خواب ہے اور حلّہ کے قریب بابلی کھنڈروں کو دیکھ کر سیاح کی نگاہ کے سامنے عبرتِ دُنیا اور انقلاباتِ عالم کا ایک ایسا منظر آجاتا ہے، جس کا مشاہدہ روح کو کپکپا دیتا ہے۔

مداین کی سطوت و جبروت کا غلغلہ کس نے نہیں سُنا۔ جب حکومت مداین کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر تھا تو دُنیا کی تمام حکومتیں اُس کے نام سے تھراتی تھیں اور مداین کے سفراء جس دربار میں پہنچ جاتے تھے، ایک تہلکہ بپا ہوجاتا تھا۔ نوشیرواں کی عدل گستری اور نیک نفسی کی داستانیں اگرچہ اوراقِ پارینہ کی حیثیت اختیار کرچکی ہیں، لیکن پھر بھی جس مجلس میں نوشیرواں کا ذکر آجاتا ہے، انسانی قلوب میں استحسان و ستائش کی لہر پیدا ہوجاتی ہے۔ مداین کی پُرشکوہ سلطنت کا مزار عراق ہی میں ہے اور بغداد پاک سے ۵ ا میل کے فاصلہ پر طاقِ کسریٰ کا شکستہ حصہ مداین کی عظمتِ گذشتہ پر نوحہ خوانی کر رہا ہے۔

اسلامی فتوحات

اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب کے ریگستان سے اُمنڈ کر دُنیا کے بڑے حصّہ پر چھا گیا۔ بڑی بڑی سلطنتیں اور عظیم الشان حکومتیں اِس سیلاب میں پرکاہ کی طرح بہ گئیں۔ اسلام کے جری مجاہد جس طرف بڑھے کامیاب و کامراں ہوئے۔ نُصرت نے اُن کے مبارک قدموں کو چوما۔ کامرانی نے اُن کا استقبال کیا اور قدرت نے فتحمندی کا جگمگاتا تاج اُن کے سروں پر رکھ دیا۔ دُنیا نے بہت جلد دیکھ لیا کہ "اللہ اکبر" کا نعرہ جو مدینہ کے تنگ و تاریک مقدس حجرے میں بلند کیا گیا تھا۔ اُس کے باطل شکن زور نے طاقِ کسریٰ کی بُنیادیں ہلادیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مبارک و مسعود عہدِ خلافت میں عراق فتح ہوگیا اور مداین کی عظمت و اجلال پر موت طاری ہوگئی۔ عراق نے اموی درباروں کے شان و شکوہ کو بھی دیکھا ہے۔ عباسیوں کے جاہ و عظمت کی بہاریں بھی دیکھی ہیں اور اِس کے ساتھ ہی بغداد کی سرزمین نے ہلاکو خاں کی تیغِ خوں آشام کی انسانیت سوز چمک کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ ہلاکو ایک خونخوار بھیڑیا تھا جس نے بے شمار انسانوں کو چبا کر رکھدیا۔ ظلم و طغیان کا عفریت تھا جس کے برقِ غضب نے سینکڑوں آبادیوں کو خاکستر بنادیا۔ ہلاکو کے ناخدا ترس سپاہیوں نے

اِس بیدردی کے ساتھ قتل کا بازار گرم کیا کہ بغداد کی گلیوں میں انسانی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور بہت دنوں تک دجلہ کا پانی سُرخ نظر آتا رہا۔ قتل و غارتگری کی اِس ہمگیر نوعیت نے عراق کی غیر معمولی تخریب کی اور عرصہ تک عراق نہ سنبھل سکے۔

تُرکوں کی شکست

عراق پر تُرکی حکومت کا چتر بھی مدتوں سایہ افگن رہا ہے۔ لیکن یہ ایسا زمانہ تھا کہ صلیبی جنگوں کے تسلسل اور پرستارانِ صلیب کی مُسلسل چھیڑ چھاڑ کے باعث ترکوں کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اُس کے بعد جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ترکوں نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور کئی مرتبہ برطانوی افواج کو پسپا کر دیا۔ مگر جنرل موڈ (General Maude) کی قیادت میں جو ہندوستانی سپاہیوں کی ٹڈی دَل فوج پہنچی اُس نے ترکوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ بات یہ ہوئی کہ ترک سپاہی لڑتے لڑتے تھک چکے تھے، اُس پر مستزاد کمک کا نہ پہنچنا۔ ہندوستانی سپاہی تازہ دم تھے اور وہ لڑے بھی اِس بے جگری سے کہ آخر کار ترکوں کو میدان چھوڑ دینا پڑا۔ برطانوی افواج بغداد میں داخل ہو گئیں اور صلیبی پرچم بغداد پر لہرانے لگا۔ بغداد کی فتح جنرل موڈ کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔ لیکن اِس فتح کے چند دن بعد ہی اُس پر موت نے فتح پالی اور جنرل مذکور زیادہ دنوں تک فتح و نصرت کے نشہ سے لذت اندوز نہ ہو سکا۔

فیصلی حکومت

”صلح کانفرنس“ کے بعد عراقیوں میں آزادی کا بے پناہ جوش پیدا ہو گیا۔ اور وہ برطانوی سیاست سے بیزار ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی مُنتشر طاقت کو ایک مرکز پر جمع کیا اور آخر خدا کا نام لیکر جنگِ آزادی شروع کر دی۔ حکومت نے اِس سیلابِ آزادی کی بہت کچھ روک تھام کی لیکن تدابیر و مصالح کی تمام دیواریں اور دسیسہ کاریوں کے سب پشتے بیکار ثابت ہوئے۔ آخر کار حکومت کو عراقیوں سے صلح کرنا پڑی۔ اور عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اسکے بعد تختِ عراق کیلئے اُمیدوار کھڑے ہوئے۔ جن میں سب سے زیادہ آراء امیر فیصل کو حاصل ہوئیں اور ملوکیتِ عراق کا تاج فیصل کے سر پر رکھدیا گیا۔ امیر فیصل نے عراق کی داخلی اور خارجی تعمیر کے لئے غیر معمولی سعی کی۔ چونکہ فیصل کا ضمیر، لوثِ خود غرضی سے پاک و صاف تھا اور اُس کی ہر کوشش کی اساس اخلاص تھی، لہذا بہت جلد اُس نے ”استقلالِ عراق“ کو برطانیہ سے تسلیم کرا کر چھوڑا۔ اور ”لیگ آف نیشن“ میں عراق کو ایک مستقل نشست مِل گئی۔ جلالتہ الملک فیصل کی داخلی تعمیر کا اب وقت آیا تھا لیکن افسوس کہ موت نے مُہلت نہ دی اور عراق کی سرزمین فیصل مرحوم کی برکات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ جلالتہ الملک فیصل سے نہ صرف عراق بلکہ تمام مشرق کی اُمیدیں وابستہ تھیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاہ مرحوم کے بعد آپ کے جواں بخت صاحبزادے

"امیر غازی" تخت نشین ہوئے۔ میں نے ہز مجسٹی غازی الاول سے بلاط الملک (قصر شاہی) میں جاکر ملاقات کی اور آپ کی شگفتہ خاطری اور سنجیدگی کا بیحد اثر ہوا۔ آپ کا سن ۲۱ سال کا ہے لیکن اس کمسنی میں آپ کے چہرہ سے تدبر و فرزانگی ٹپکتی ہے۔ قادرِ مطلق جلالۃ الملک کی نصرت و اعانت فرمائے۔ اور اغیار و اجانب کی فتنہ پردازیوں سے محفوظ و مصئون رکھے (آمین)

مغربی تمدن کی ہمہ گیری

مندرجہ بالا سطور میں انقلاباتِ عراق کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاچکا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں عراق کے تمدن و معاشرت سے ناظرینِ کرام کو روشناس کراؤں۔ تاکہ سفرِ عراق کی دلچسپیاں صرف میری ذات تک محدود نہ ہوں بلکہ اُن کیفیات و تاثرات کا ایک نظارہ آپ بھی کر سکیں۔

یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے کہ دورِ حاضر کا ہر تمدن "مغربی تمدن" سے متاثر ہو رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ "مغربی اقوام" تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔ اُن کے پاس روپیہ ہے، قوت ہے، عقل ہے اور سب سے زیادہ وزنی چیز "سیاسی کید و فریب"۔ اسی سبب سے تمام دنیا اُن کی وضع قطع کی گرویدہ ہوتی جارہی ہے اور مغربی تمدن پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔

ترکوں کے زمانہ میں عراق کا تمدن "خالص عربی تمدن" کے زیرِ اثر تھا۔ اور اس پر مغربی تمدن کا بہت کم سایہ پڑا تھا۔ لیکن جنگِ عظیم کے بعد سے جب انگریزوں کے قدم عراق میں آئے تو اُن کے نئے نئے لباسوں اور انواع و اقسام کے فیشنوں کا جادو عراقیوں پر بھی چل گیا۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں عراق کے نصرانی اور یہود بھی زیادہ آزادانہ تھے اور عربی تمدن سے ایک حد تک وہ بھی متاثر تھے۔ مگر برطانوی حکومت کے بعد مغربی تمدن کو سب سے زیادہ نصرانیوں اور یہودیوں نے قبول کیا۔ مسلمانوں اور نصاریٰ و یہود کا عراق میں چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا اُن کی مخالطت اور مجالست نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اور انگریزی تمدن کے جراثیم کا شیوع ہونے لگا اور آج عراق کی شہری زندگی بڑی حد تک مغربی تمدن سے متاثر نظر آتی ہے۔

بدوی زندگی

عراق کی بدوی زندگی صحیح معنوں میں عرب کے قدیم تمدن کا منظر پیش کرتی ہے۔ اُن کا کھانا۔ پینا۔ رہنا سہنا قریب قریب عربی وضع کا ہے۔ دیہاتی عورتیں برقعہ پہنتی ہیں بعض چادر استعمال کرتی ہیں، اور پردے کا بیحد خیال رکھتی ہیں، مرد لانبے کرتے، ڈھیلی عبائیں پہنتے ہیں۔ سر پر عقال باندھتے ہیں اور کمر سے پٹکا۔ بعض قبائل اب تک خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج ایک جگہ آباد ہیں اور کل دوسرے مقام کو منتقل ہو جاتے ہیں، غربا کے مکانات چٹائیوں کے ہوتے ہیں، بعض لوگ چٹائیوں کے مکانات کی چھت پر مٹی کی ہلکی سی تہ بھی جما لیتے ہیں

بڑے دیہات کے مکانات مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ راستے عموماً فراخ ہوتے ہیں اور ہندوستانی مواضعات کی طرح تنگ و تاریک گلیاں نہیں ہوتیں۔ آبادی عموماً ایسے مقام پر ہوتی ہے جہاں پانی کی فراوانی ہو۔ عراق کے بعض دیہاتی مناظر قابل دید ہیں۔ دریا کے کنارے دیہات آباد ہیں۔ دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اور کھجوروں کے باغات لطف دے رہے ہیں۔ عراق میں ریلیں اور موٹروں کے باوجود قافلوں کا طریقہ رائج ہے۔ لق ودق صحرا میں اونٹوں کی قطاریں جادہ پیمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں "کاروان" کا منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اونٹوں پر سوار ہیں۔ کچھ پیدل چل رہے ہیں۔ اور بعض من چلے "حدی خوانی" کر رہے ہیں۔ اور اُن کی آواز کی گونج سکوتِ صحرا کو توڑ رہی ہے۔ بدوی شیوخ عرب کے چہروں سے وقار ٹپکتا ہے۔ اُن کی چال ڈھال سے عربی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ عجاج (ریت) کے باعث اگرچہ اُن کے کپڑے گرد میں اٹے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ضمیر کی پاکیزگی، اور قلب کی لطافت، اُن کے ہر خطِ پیشانی سے ظاہر ہوتی ہے، اُن کا ہر انداز اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ بے شک یہ اُن نفوسِ قدسیہ کی اولاد میں ہیں جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے پرزے اُڑا دیئے تھے۔

بدوی خواتین غیرت و حیا کا مجسمہ ہوتی ہیں۔ کیا مجال ہے جو اُن کے برقعہ یا چادر کا ایک گوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ وہ سمٹی ہوئی چلتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصمت کا بارِ عظیم ان کے کاندھوں پر رکھا ہوا ہے جس کے باعث ان کی نظر نیچے سے اوپر نہیں ہوتی۔ بیباکی۔ شوخی۔ چھیڑ چھاڑ سے ان کا دامنِ معاشرت کلیتہً پاک و صاف ہوتا ہے۔ غرض یہی حوّا کی وہ سعیدہ بیٹیاں ہیں جن پر ارضِ مشرق ناز کر سکتی ہے اور اسی دور میں جبکہ تخریبِ اخلاق، سوسائٹی کا جزوِ اعظم بن گئی ہے، اِن خواتین کا وجود کائناتِ انسانیت کے لئے باعثِ صد فخر اور وجہ ہزار مباہات ہے۔

شہری زندگی

اوپر کہا جا چکا ہے کہ انگریزی تسلط کے بعد سے عراق کی شہری زندگی بڑی حد تک "مغرب زدہ" ہو گئی ہے اور اگر اس فتنہ کی روک تھام نہ کی گئی تو حالات کے بد سے بدتر ہو جانے کا امکان ہے۔

"مغربی تمدن" مشرق کے لئے کیوں تباہ کن ہے؟ اس کے متعلق مجھے بہت اجمال کے ساتھ عرض کرنا ہے۔ بات یہ ہے کہ اہلِ مشرق کی جسمانی ساخت۔ دماغی ہیئتِ ترکیبی۔ ہوا اور پانی۔ اسبابِ خور و نوش۔ ہر اعتبار اور ہر نوعیت سے ایک جُداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور "مغربی تمدن" اور "مشرقی تمدن" میں بُعد المشرقین ہے لہذا اہلِ مشرق کے لئے "مغربی تمدن" تباہ ناکی کے سوا اپنے دامن میں کوئی مفید چیز نہیں رکھتا۔ پھر اہلِ مشرق کی فلاکت زدگی اور افلاس کی یہ نوعیت ہے کہ تن کو کپڑا اور پیٹ کو روٹی میسر نہیں آتی "مغربی تمدن" قارون کے خزانے چاہتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس تمدن سے متاثر ہونے کے بعد روپیہ کمانے کی اس قدر بیجا حرص پیدا ہو جائے گی کہ انسان کو کذب بیانی، دروغ بافی اور فریب دہی کے ساتھ بھی پیسہ پیدا کرنے میں کچھ عار نہ ہوگا۔

اہلِ مغرب کی دسیسہ کاریاں اور حیلہ سازیاں اسی جذبہ کی رہینِ منت ہیں۔ پھر سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ "مغربی تمدن" نے آزادی کی حدود کچھ اس قدر وسیع کر دی ہیں کہ اِس منزل میں گامزن ہونے کے بعد انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں غیرت وحیا پھٹک بھی نہیں سکتیں۔ اگر اِن جملوں کی حقیقت کا مشاہدہ کرنا ہو تو لندن کی گلیوں اور پیرس کے ہوٹلوں کی جا کر سیر کرو جہاں کی فضا میں بوسوں کی آواز سے ہر وقت اہتزاز پیدا ہوتا رہتا ہے۔ میں نے یہ خیال سیاسی عقائد کی بنا پر قائم نہیں کیا۔ بلکہ واقعات وحالات نے میرے دل میں یہ بات جانشین کرا دی ہے۔

عراق کے ۹۹ فیصدی شہری باشندے سوٹ پہنتے ہیں۔ بعض غربا افلاس کے سبب پرانی وضع اختیار کئے ہوئے ہیں، لیکن اگر اُن کو روپیہ مل جائے تو وہ بھی "مغرب زدگی" میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ سوٹ پر ہیٹ کوئی نہیں پہنتا۔ بلکہ ایک خاص قسم کی ٹوپی ایجاد ہوئی ہے جو ہندوستان کی "کشتی نما" ٹوپی سے قدرے ملتی ہوئی ہے، اُس کا عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ٹوپی کو "سدارہ" کہتے ہیں، اس ٹوپی نے عراقیوں کی قومی ٹوپی کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گورے گورے چہروں پر یہ ٹوپی خوب پھبتی ہے۔ عیسائی اور یہود بھی یہی ٹوپی پہنتے ہیں۔ ترکی ٹوپی کو کوئی مسلمان نہیں پہنتا۔ البتہ بعض یہود استعمال کرتے ہیں۔ ترکی ٹوپی کو خاص ترکستان سے خارج کر دیا گیا۔ عراقیوں نے اس کو مردود قرار دیدیا۔ حجاز میں اِس کی کوئی پوچھ نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمان ہیں کہ اب تک اسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ترکی ٹوپی خرید کر حکومت اٹلی کو مالی امداد پہونچا رہے ہیں جس نے ہمیشہ مسلمانوں کا گلا گھونٹا ہے۔

بغداد شریف کے بعض ہوٹلوں اور مخصوص صحبتوں میں مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس شخص کو دیکھو ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے گھما رہا ہے۔ سگریٹ بھی پی رہا ہے۔ حقہ کے کش بھی لگائے جا رہے ہیں۔ باتیں بھی کر رہا ہے اور تسبیح کو پھرا بھی رہا ہے۔ بعد میں دریافت پر معلوم ہوا کہ موٹی موٹی تسبیحیں کہربا کی ہوتی ہیں۔ کہربا کی خاصیت ہے کہ اُس کے مس کرنے سے اعصاب میں قوت اور بیداری پیدا ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونیکے بعد مجھے ہنسی آئی، ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ کوئی خاص وظیفہ پڑھتے ہیں۔ اور صوفیہ کی اصطلاح میں شاید ان کا قلب جاری ہو گیا ہے۔

عراقی خواتین کا لباس

نصرانیوں کے یہاں تو پردے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ لندن کی گلیاں ہوں یا بمبئی کا ساحل۔ عراق کے مرغزار ہوں یا لبنان کی پہاڑیاں ان کی "نیم عریانیت" تو ہر جگہ یکساں ہیں۔ اب رہی یہودی عورتیں، وہ اگرچہ عیسائی عورتوں سے اِس منزل میں زیادہ پیچھے نہیں ہیں لیکن پھر بھی قدیم عربی تمدن کے اثرات کے باعث وہ ایک

قسم کا سیاہ برقعہ سا پہنتی ہیں۔ سامنے کا حصہ کھلا رہتا ہے۔ البتہ نصف سر اور کمر اور شانے ڈھکے رہتے ہیں۔ مسلمان عورتیں سیاہ برقعہ پہنتی ہیں۔ لیکن اُن کا برقعہ، ہندوستانی برقعہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ عراقی برقعہ نصف ٹانگوں تک ستر پوشی کرتا ہے۔ مسلمان عورتیں عام طور پر انگریزی لباس پہنتی ہیں۔ عراقی برقعہ میں ہلکا سا نقاب لگا ہوتا ہے۔ جس سے چہرہ نظر آتا رہتا ہے۔ بعض برقعوں کی نقاب ہلکی نہیں ہوتی لیکن پھر بھی حسن کی جھلکیاں قوتِ باصرہ کو نوازتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی طرح عراق میں موٹروں اور دوسری سواریوں میں جب عورتیں بیٹھتی ہیں تو پردے نہیں لگائے جاتے، بلکہ کھلے ہوئے موٹروں میں برقعہ پہن کر نکلتی ہیں۔ سیر و تفریح تو ان کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ شام ہوئی اور اُن کے غول کے غول سیر کے لئے نکلنا شروع ہوئے۔ کہیں باہر جاتے وقت اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گھر کے کسی آدمی کو ساتھ لے لیا جائے بلکہ آزادی کے ساتھ جب جی چاہتا ہے باہر چلی جاتی ہیں۔ میں نے بغداد کی گلیوں میں اکثر دیکھا ہے کہ مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھے ہوئے گھروں سے باہر نکل کر باغوں میں سیر کے لئے جا رہی ہیں اور گھر کے کسی مرد کے منہ سے یہ بھی نہیں نکلتا کہ "کس سمت جا رہے ہو ارادہ کدھر کا ہے"

عراقی قہوہ خانے

بغداد شریف میں قہوہ خانوں کی اس قدر کثرت ہو کہ عیاذاً باللہ! بغداد پاک پر ہی کیا منحصر ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے قریہ قہوہ خانوں سے خالی نہیں ہوتا۔ بغداد میں دجلہ کے کنارے بعض قہوہ خانے بہت بڑے ہیں۔ جن میں شام کے وقت میں نے دو دو ہزار آدمیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ قہوہ خانوں کی عمارتیں بہت ہی معمولی ہیں، البتہ صحن بہت فراخ ہوتا ہے اور اس میں ہی نشست رہتی ہے۔ قہوہ خانوں میں عام طور پر میز کرسیاں نہیں ہوتیں بلکہ تکیہ دار تخت ہوتے ہیں جن پر بیٹھکر قہوہ کے جام کے جام اڑائے جاتے ہیں۔

قہوہ اس قدر تلخ ہوتا ہے کہ اُس کے تصور سے میرا دماغ چکرانے لگتا ہے لیکن اس تلخی کے باوجود عراقیوں کو اس زہر کی کچھ ایسی چاٹ لگ گئی ہے کہ وہ ایک گھنٹہ بھی بغیر اس کے نہیں رہ سکتے۔ ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے یہاں آپ جائیے، قہوہ سے آپ کی تواضع کی جائے گی۔ کھانے کے بعد قہوہ پینا تو لازمات سے ہے، میں نے شروع شروع میں دو ایک جگہ ناواقفیت کے باعث ایک گھونٹ قہوہ پی لیا تھا جس کی تلخی کو میرے کام و دہن اب تک نہیں بھولے۔ چنانچہ میں ہز مجسٹی شریف علی سابق ملک الحجاز سے ملنے کے لئے گیا۔ جلالتہ الملک شریف علی کے نام سے اخبار بین طبقہ نابلد نہ ہوگا۔ جب نجدیوں نے حجاز پر چڑھائی کی تھی ملک شریف حسین شاہ حجاز تھے۔ نجدی برابر پیشقدمی کرتے رہے اور شریف حسین نے حجاز کو خیر باد کہہ کر شریف علی کو اپنا جانشین بنا دیا۔ چنانچہ جلالتہ الملک شریف علی کئی ماہ تک جدہ میں مقیم رہے۔ لیکن نجدیوں کے بے پناہ جوش نے ان کو وہاں سے چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ اور شاہِ موصوف

اپنے چھوٹے بھائی ہز مجسٹی امیر فیصل شاہ عراق مرحوم و مغفور کے پاس چلے آئے۔ شاہ مرحوم سیاسی معاملات میں اکثر آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ موجودہ شاہ عراق ہز مجسٹی غازی الاول سے آپ کی صاحبزادی کا عقد ہوا ہے۔ جلالتہ الملک شریف علی کا قصر دجلہ کے کنارے واقع ہے۔ جب میں آپ کے الحاق خاص میں پہونچا تو آپ نے بہت ہی خوش اخلاقی اور شگفتگی کے ساتھ کھڑے ہوکر مصافحہ کیا اور مزاج پرسی کی اور اپنے پاس کے کوچ پر بٹھالیا۔

جلالتہ الملک کے سامنے نصرانی بطریقوں اور مختلف حکومتوں کے سفرا بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر کچھ دیر کے بعد قہوہ آیا۔ ملازم نے میرے داہنے ہاتھ کے قریب کی میز پر پیالی رکھدی لیکن میں نے اُس طرف توجہ بھی نہ کی، مگر جلالتہ الملک نے مجھ سے پینے کے لئے فرمایا تو میں نے اخلاقاً پیالی ہاتھ میں اُٹھالی اور اُس کو لبوں سے لگاکر ملازم کو پکڑادی۔ لیکن دیگر حاضرین نے دو دو تین تین پیالیاں چڑھاکر دم لیا۔ ہاں تو میں قہوہ خانے کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ قہوہ خانوں میں حقہ نوشی بھی خوب ہوتی ہے۔ لیکن حقّہ کا پانی جس برتن میں رکھا جاتا ہے وہ شیشے کا ہوتا ہے۔ اور جب کش لگایا جاتا ہے تو پانی خوب اُچھلتا نظر آتا ہے۔

عراقی حمام

اب لگے ہاتھوں عراق کے ایک حمام کا بھی حال سُن لیجئے۔ عراق میں چونکہ اکثر گرد اُڑتی رہتی ہے لہذا ہفتہ میں ایک دن حمام جاکر نہانا ضروری ہے۔ لہذا میں بھی شومئ قسمت سے حمام جا پہونچا۔ پہلے ایک بڑے ہال میں داخل ہوا۔ اور مجھے دیکھتے ہی حمام کے مالک نے "اہلاً و سہلاً مرحبا" "تفضلوا" کی تکرار شروع کی۔ میں ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ اور میں نے کہا کہ میں صرف غسل ہی نہیں کرونگا، بلکہ جسم کی مالش بھی کراؤنگا۔ خیر تھوڑی دیر بعد مجھے ایک تولیہ باندھنے کے لئے دیا گیا۔ میں نے کپڑے اُتار کر تولیہ باندھ لیا۔ اُس کے بعد حمام کے ملازم نے مجھ سے پوچھا کہ مبال (پیشاب خانہ) تو جانا نہیں چاہتے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے پیشاب خانہ کا راستہ بتا دیا۔ لہذا جب میں اُس جگہ داخل ہوا تو دیکھا کہ متعدد عراقی بالکل برہنہ کھڑے ہوئے ہیں اور اُن کے جسموں پر ایک قسم کی دوا لگی ہوئی ہے، بعض ننگے کھڑے ہوئے بے تکلف بات چیت کر رہے ہیں۔ جیسے ان کو کوئی دیکھ ہی نہیں رہا۔ اس منظر کو دیکھکر مجھے ہنسی بھی آئی۔ غصہ بھی آیا۔ لیکن کیا کرتا۔ جلدی جلدی پیشاب سے فارغ ہوکر وہاں سے نکل آیا۔ اُس کے بعد حمام میں داخل ہوا۔ پہلے ایک کمرہ آیا جو قدرے گرم تھا اُس کے بعد دوسرا کمرہ جو بہت زیادہ گرم تھا۔ میرا بدن پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ یہاں پتھر کا ایک چبوترہ تھا جس پر میں لیٹ گیا۔ اور دلاک نے میرے جسم کی خوب مالش کی۔ جب بدن کی مالش ہوچکی تو اُس نے کہا کہ سامنے والے ہال میں جاکر خود نہا لیجئے میں اُس ہال میں پہنچا۔ چاروں طرف نل لگے ہوئے تھے اور لوگ نہا رہے تھے۔ لیکن یہاں بھی عریاں منظر سے سابقہ پڑا۔ میں نیچی آنکھیں کئے نہاتا رہا۔ لیکن پھر بھی جس طرف آنکھ اُٹھ جاتی تھی تو میدان صاف

نظر آتا تھا اور یہ مصرعہ زبان پر آکر رہ جاتا تھا۔ ع۔ "جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے"

غسل سے فارغ ہوکر جب میں باہر کے کمرہ میں آیا تو ملازم نے ایک تولیہ باندھنے کے لئے اور ایک جسم صاف کرنے کے لئے دیا۔ اُس کے بعد دوسرے کمرے میں پھر تولیہ بدلا گیا اور اُس کے بعد میں ہال میں آگیا۔ وہاں آکر میں تخت پر بیٹھا ہی تھا کہ بے دودھ کی چائے کی گرم گرم پیالی ملازم نے پیش کی۔ نہانے کے بعد مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑا بوجھ جسم سے اتر گیا۔ ایک روپیہ مالک حمام کی نذر کرکے میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اور پھر کبھی اُدھر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ میرے خیال میں ایرانیوں سے اختلاط کے باعث عُریانیت کی یہ وبا عراق میں پھیل گئی ہے۔ بغداد میں زنانے حمام بھی ہیں۔ جن میں عورتیں ملازم ہیں۔ زنانے حمام میں اُجرت زیادہ چارج کی جاتی ہے۔ بڑے بڑے گھروں میں تو خود حمام بنے ہوتے ہیں۔ لیکن عام طریقے پر تمام عورتیں حمام میں نہتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کی دعوت بھی کرتی ہیں۔ بغداد میں کم و بیش ستو حمام ہوں گے جو ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ بعض حمام جو نیچے درجے کے ہیں وہ زیادہ صاف نہیں ہیں۔

عراقی کھانے

اوپر کہا جا چکا ہے کہ عراقی مغربی تمدن کے دلدادہ ہیں۔ لہٰذا مرفہ الحال لوگ چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے عموماً عراقی ہوتے ہیں۔ جن میں ہندوستانی کھانوں کی طرح مسالہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ سُرخ مرچ کو تو یہ لوگ سمِ قاتل سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندوستانی تمام دُنیا کے لوگوں سے زیادہ چٹورے ہوتے ہیں۔ دیگر ممالک میں فیشن کی عیاشی اور دوسری قسم کی عیاشیوں کا دور دورہ ہے، اور ہندوستان میں زبان کی عیاشی کا رواج ہے۔ ہندوستان جیسے چٹ پٹے کھانے کہیں بھی نہیں ہوتے۔ لیکن میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ہندوستان کے مُرغن کھانوں کے مقابلہ میں عراق کے سادہ سے سادہ کھانے انسانی جسم کے لئے زیادہ فائدہ بخش ہوتے ہیں۔ اُن میں غذائیت ہوتی ہے۔ جو زود ہضم ہونیکے علاوہ جسم کو فائدہ پہونچاتی ہے۔ ہندوستانی کھانے ثقیل ہوتے ہیں اور ثقالت کے باعث جگر اور معدہ میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ہندوستانیوں کے اس چٹورپن کے خلاف جہاد کرنا بیکار ثابت ہوگا۔ کیونکہ قورمہ اور بریانی کا چسکا ایسا نہیں ہے جو آسانی سے چھوٹ جائے۔ طبی نقطۂ نظر سے ہندوستانی کھانوں کی عدم افادیت میرے پیشِ نظر ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب میں عراق سے واپس ہوکر بمبئی آیا اور وہاں قورمہ کھایا، تو ایسا معلوم ہوا کہ میری لعح پر بہت سے حجابات پڑے ہوئے تھے جو آنِ واحد میں اُٹھ گئے۔

عراق میں بھنڈی (بامیہ) کا کثرت سے رواج ہے۔ ٹماٹر اکثر کھانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ جب ٹماٹر کا موسم ختم ہونے لگتا ہے تو ٹماٹر کو سُکھا لیتے ہیں اور بعد میں کھانوں میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ نمکین چاولوں میں بادام

اور کشمش کا بھی قدرے استعمال ہوتا ہے۔ بینگن میں چاول اور قیمہ بھر کر پکاتے ہیں اُسکو "محشی" کہتے ہیں۔ نیز انگور، پیاز یا گوبھی کے پتوں میں چاول اور قیمہ کو تاگے سے باندھ کر پکاتے ہیں، جسکو "دولمہ" کہتے ہیں۔ دولمہ بہت لذیذ چیز ہے۔ بشرطیکہ ٹھیک ٹھیک پک جائے۔ اِس کھانے کے پکانے کے لئے تجربہ کار باورچی کی ضرورت ہے۔ اناڑی باورچی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اگر دو چار آنچ زیادہ ہو گئیں تو سالن کے ستیاناس ہو جانیکا امکان ہے۔ بڑی بڑی دعوتوں میں پانی کے بجائے دہی کی لسی دی جاتی ہے۔ خشکہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اور خشکہ کا آنا اِس امر کی دلیل ہے کہ اب کوئی کھانا نہیں آئیگا۔ کھانے کے بعد فواکہ کھائے جاتے ہیں۔ میں جس زمانہ میں عراق میں تھا تو خربوزہ اور تربوز کی خوب ریزتی۔ چنانچہ ہر کھانے کے بعد تربوز بلا ناغہ کھایا جاتا تھا۔

عراقی مکتب

میں نے عراق کے بچوں میں زندگی کی سرمدی روح کا مشاہدہ کیا۔ اُن کے چہروں سے بشاشت ظاہر ہوتی ہے۔ ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا ہے! افسردگی کی کوئی جھلک بھی اُن کے چہروں سے نظر نہیں آتی۔ یہاں کے مکتب بالکل اُسی وضع کے ہوتے ہیں جیسے مکاتب کہ ہمارے یہاں پہلے ہوا کرتے تھے، بچے چٹائیوں پر بیٹھتے ہیں۔ سامنے رحلیں رکھی ہوتی ہیں اور وہ خوب زور زور سے ہل ہل کر پڑھتے ہیں معلم کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے اور وہ گھومتا رہتا ہے۔ جہاں کوئی بچہ رُکا، اور اُس سے غیر ارادی طور پر اُس غریب کے ایک عدد چھڑی لبس رسید کر ہی تو دی۔ آستانہ عالیہ قادریہ میں بھی ایک مکتب ہے۔ میں اُس مکتب میں گیا۔ خوش قسمتی سے معلم صاحب اُس وقت موجود نہ تھے۔ مجھے دیکھ کر بچوں نے سلام کیا۔ ایک بچے نے جو ذرا تیز تھا میری صورت سے تاڑ لیا کہ میں عراقی نہیں ہوں، لہذا اُس نے فوراً فارسی کا یہ شعر ہنستے ہوئے پڑھا ؎

کریما بہ بخشائے برحال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ایک طالب علم نے قصیدہ بردہ شریف میرے سامنے رکھدیا۔ میں نے اَمِن تذکّرِ جیرانٍ بذی سلمٍ ترنم سے پڑھا جس کو سن کر بچے بہت خوش ہوئے۔

عراقی رقص و سرود

عراق میں ناچنے گانے سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ بغداد میں کئی ناچ گھر ہیں۔ کسی ناچ گھر کا ٹکٹ ایک روپیہ سے زائد نہیں ہے۔ ٹکٹ سستا ہونیکے باعث "ڈانسنگ ہال" تماشائیوں سے پٹے رہتے ہیں جہاں تک رقص و غنا کا تعلق ہے۔ ہندوستان کا مقابلہ کوئی دُنیا کا ملک نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی موسیقی ایک ایسا سمندر ہے جس کی تھاہ نہیں ہے۔ دوسرے ممالک کی موسیقی تو معمولی چشموں کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ہی حال ہندوستانی رقص کا ہے جو اپنے اندر غیر معمولی دلآویزی رکھتا ہے۔ عربی موسیقی اپنے اندر تنوع نہیں رکھتی۔

وہی مخصوص زیر و بم ہیں جو مختلف اصوات کے ذریعہ ادا کرتے ہیں۔ جن میں زیادہ لوچ نہیں ہوتا، عراق کی سب سے بہتر مغنیہ اُم کلثوم ہے۔ جس کے ریکارڈ میں نے سُنے ہیں مصر کے ملک الشعراء کے شرقی زبان کے بعض وجد انگیز قصائد اُم کلثوم خوب گاتی ہے، لیکن جانکی بائی والی بات کہاں آتی ہے۔ یہاں کے ناچ گھروں میں رقاصہ گاتی بھی ہیں اور رقص بھی کرتی ہیں۔ لیکن گانے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ رقاصہ زیادہ تر یہودی اور نصرانی عورتیں ہیں۔ ایک شب میں ایک اسٹیج پر باری باری سے ایک درجن عورتیں آ آکر رقص کرتی ہیں۔ رقص کا کمال سینہ اور کمر کا تھرکانا ہے جس کا نظارہ آتش جذبات پر پٹرول کا کام کرتا ہے۔ بعض رقاصہ عورتیں سینہ کو نصف کھلا رکھتی ہیں، اُن کا شہابی رنگ۔ زرق برق لباس اُس پر قمقموں کی ضیاباری! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ در و دیوار کو حال آرہا ہے۔ اور اب کچھ دیر میں ساری کائنات زیر و زبر ہوا چاہتی ہے۔

ہندوستان سے دلچسپی

عراقیوں کو ہندوستانی سیاسیات اور دیگر حالات سے بھی بیحد دلچسپی ہے۔ ہندوستان کے چار افراد کا عراقی اہلِ ہند سے تذکرہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مہاتما گاندھی کا نام آتا ہے، اُس کے بعد ٹیگور (طاغور) کا اور پھر مولانا شوکت علی اور سر اقبال کا۔ حضرت رئیس الاحرار مولانا محمد علی قدس سرہٗ کے کارناموں کو ہر شخص سراہتا ہے اور حضرت مرحوم کو عراق میں غیر فانی شہرت حاصل ہے۔ سر اقبال کا کلام عراق میں بہت کم پہنچا ہے۔ جو نوجوان بیروت اور مصر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاکر آتے ہیں، وہ سر اقبال کے بہت مداح ہیں۔ بغداد کے امراء اپنے بچّوں کو اُردو بھی سکھاتے ہیں۔ خصوصاً حضرت نقیب الاشراف صاحب کے خانوادہ کے لوگ خاص طور پر اس جانب توجہ کرتے ہیں۔ ہندوستانی معلمین جو عراقی بچّوں کو اُردو سکھاتے ہیں اُن کو "لالہ" کہتے ہیں۔ بعض اہلِ ذوق جو اُردو جانتے ہیں، اُنہوں نے مجھ سے کلام سُننے کی فرمائش کی، چنانچہ میں نے اُن کو اپنی چند نظمیں سُنائیں۔ بعض اشعار کا ترجمہ حضرت مولانا عبد القدیر بدایونی نے عربی میں کرکے اُن کو اصل مفہوم سے آگاہ کیا، اور وہ بہت محظوظ ہوئے۔

عراق کے زمیندار

عراق میں زمیندار کو ملاک اور کاشتکار کو فلاح کہتے ہیں۔ کاشت کا سلسلہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے مقابلے میں کھجوروں کے باغات کی تعداد کثیر ہے۔ اور جس شخص کے پاس کھجور کا ایک باغ ہو وہ بڑا زمیندار سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے مسلمان زمیندار، بنیوں کے مقروض ہیں، اسی طرح عراقی ملاکین، یہودی مہاجنوں سے قرض لیتے ہیں اور اُن کی مالی حالت تباہ ہے۔ اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ آمدنی محدود ہے۔ سُود بڑھتا رہتا ہے۔ اور اُن کی جائدادوں کی وہی حالت ہوتی ہے جو ہندوستان میں ہوتی ہے۔

کھجوروں کے باغات بڑے قرینہ سے لگائے جاتے ہیں۔ اور عراق کی پرورش کا سب سے بڑا ذریعہ یہی باغات ہیں۔

عراقی حسن

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی خطہ، عراقی حسن کا مدِمقابل نہیں ہو سکتا۔ عراقی حسن میں غیر معمولی صباحت کے علاوہ بہت ہی دیدہ زیب تازگی اور شادابی ہوتی ہے۔ میں نے حدیقۃ الامیر غازی (Queen Ghazi Park) میں حسن و جمال کے ایسے مجسموں کو دیکھا ہے جن کے تصور سے اب بھی میری روح انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ میں ان متبسم لبوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو اگرچہ گلاب کی پتی سے زیادہ رنگین اور نازک تھے، لیکن اُن کی ہر جنبش اپنے اندر سینکڑوں اصفہانی تلواروں کو چھپائے ہوئے تھی، ناممکن تھا کہ نگاہ اُن کا مشاہدہ کرے اور وہ ذبح و قتیل بن کر نہ رہ جائے، کیا اُن رس بھری آنکھوں کی یاد میرے دل سے محو ہو سکتی ہے جو میکدہ بردوش نہیں بلکہ "خالقِ میکدہ" تھیں۔ دجلہ کے کنارے شام کا وہ منظر اگر میں دل سے بھلانا بھی چاہوں تو بھی نہیں بھلا سکتا جبکہ پریوشوں کے جھرمٹ میں، میں آئس کریم کھا رہا تھا، شام کی خنکی۔ سبزہ کی طراوت اور آئس کریم کی پُرلطف برودت کے باوجود میری رگیں محسوس کر رہی تھیں کہ ایک شعلۂ جوالہ نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور میرا وجود آتشِ حسن سے جل اُٹھیگا۔

عراق جانے سے پہلے میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا کہ ؎

پئے تسکینِ دل جنت کے خالق
دہاں کا ایک نظارہ یہاں سے

میری یہ دعا شاید مقبول ہو گئی۔ اور خالقِ جنت نے عراق میں فردوس کا ایک منظر مجھے دکھا دیا۔

آؤ اے عراق کے رنگین نظارو آؤ اور مجھے ایک بار پھر اپنے آغوش میں لے کر ہنگامۂ کونین سے بے خبر بنا دو۔

ماہر القادری

نرگس

مشہور جرنلسٹ حضرت ایم۔ اسلم کا تازہ ترین شاہکار

تاثرات

ت کی رو میں خوشی کی سب امنگیں بہہ گئیں — نامرادی، بیدلی، اور سرد آہیں رہ گئیں
ے! اُن ناگفتنی باتوں کی رسوائی کا غم — گاہے گاہے جو مری غماز آنکھیں کہہ گئیں
شق کیا ہے؟ اُن غلط انداز نظروں کا نقب — اتفاقاً دل میں جو پیوست ہو کر رہ گئیں
ا رہی ہے کونسی شے دل کو اب میرے خدا — حسرتیں تو آنسوؤں میں جذب ہو کر بہہ گئیں

انجام

ح کی بے چینیوں میں ایک دن کھو جاؤنگا — ارتقائے فکر کی وسعت میں گم ہو جاؤں گا
ِ دل کی ابتدا سے ہی مجھے معلوم ہے — اک نہ اک دن میں سراپا دردِ دل ہو جاؤنگا
گیا ہے دِل کو پیکا غیر فانی سوز کا — ہلکی ہلکی آنچ میں جل کر فنا ہو جاؤنگا
گ لینے دے مجھے راتوں کو فکرِ شعر میں — نیند جب آئی ہمیشہ کے لئے سو جاؤنگا

نغمہ ہائے درد کا سازِ شکست انجام ہوں
اتفاقاً ٹوٹ کر اک روز چپ ہو جاؤنگا

عدم

یادِ ساقی

وہ شمع حرم زینتِ کاشانۂ دل — یادِ ساقئ ازل قسمتِ پیمانۂ دل
للہ اللہ اثرِ سوز و گداز الفت — غیرتِ شمعِ دل افروز ہے پروانۂ دل
ن طلبگارِ مئے عشرتِ فانی۔ توبہ — بادۂ عشق سے معمور ہے غمخانۂ دل
ہو کسی سے بھی نہ اٹھا تھا اٹھایا وہ بار — ہے وفا دارِ ازل ہمتِ مردانۂ دل
ٹھوکریں کھائیں بہت راہِ وفا میں۔ لیکن — نازشِ عشق تھی ہر لغزشِ مستانۂ دل
مٹنے والوں سے ہوئی گرمیِ بازارِ وجود — غازۂ حسن ہے خاکسترِ پروانۂ دل
ندگی ذوقِ تصوّر کی پرستش میں کٹی — حسنِ فطرت کا مرقع ہے صنم خانۂ دل

مدتوں راز رہا رازِ محبت، کوکب
اب تو ہر اشک پہ تحریر ہے افسانۂ دل!

کوکب (شاہجہانپوری)

شباب و شعر کے مبحث میں گفتگو استقامت و مذہب

بنام شاہد نازک خیالاں　　عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

"شباب و شعر"

"شباب و شعر" کے عنوان کا تقاضہ یہ تھا کہ مضمون صرف "شباب و شعر" ہی کے دائرہ میں محدود رہتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ "لغزش" بھی تو شباب ہی میں ہوا کرتی ہے۔ اور "بہکتے" بھی جوان ہی ہیں۔ اس لئے اگر کسی جوان یا دو نوجوانوں کے سرِ شباب قلم پر بوڑھی باتیں آگئیں تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے مقابلے میں راقم الحروف جو جوانی کے مرحلے کو طے کر چکا ہے۔ اُنکو معذور تصور فرمایا جائے۔ اگر وہ "شباب و شعر" کے دلکش اور شیریں نغموں کی بجائے زندگی کی دوسری اُن پر خار دیواروں میں آپ کو بھی اپنے ہمراہ لیجائے۔ جہاں گل و مل اور شباب و نشاط کے مناظرِ نشہ آور کی بجائے تلخ حقائق حیات سے قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔

شباب کتنا ہی دلکش سہی مگر اس کا زمانہ خواب کا سا ہوتا ہے اور شباب کے بعد پیری ہی پیری ہے۔ کہولت بھی پیری سے الگ نہیں کیونکہ یہ پیری کا مرحلۂ اول یا مقدمۃ الجیش یا نقیب ہوتی ہے۔ اس دور میں شباب کی شراب کا نشہ ہرن ہوجاتا ہے۔ اس میں حقائقِ حیات پر تامل و تفکر جوانی اور جوانوں کی خوش گپیوں کی بجائے زیادہ مناسب اور موزوں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ساری شوخیاں اور رنگینیاں شباب کا حصہ ہیں۔ اور ساری سنجیدگیاں اور فرزانگیاں بوڑھاپے کا بخرہ۔ جوانی میں پختہ کاری معجزہ اور کرامت اور جوانی کا خلعت ہے اور پیری میں ہرزہ کاری اور بچپن بوڑھاپے کے لئے داغ اور کلنک کا ٹیکہ۔ گو پیری سن و سال کی قید سے آزاد ہے۔ مگر شباب اور انسانی سن و سال کا غلام بلکہ سن و سال میں جوانی ہی کا نام شباب ہے۔ طبیعت کی جوانی (یہاں میر انیس کی شاعرانہ طبیعت مُراد نہیں جو زور کے گھٹنے سے شعر میں جوان ہوگئی تھی) سن و سال کی جوانی میں حسین نہ بھی ہو تو قابلِ توجہ اور دلکش ضرور ہوتی ہے اور علم و فن کی جوانی بوڑھاپے میں رنگ لاتی اور جوبن دکھاتی ہے۔ اسی عہد میں ہنر آشنا روح "شباب و شعر" کے تظاہر سے نکلکر حکمت و حقایق کی وسیع و عمیق سلطنت میں داخل ہوجاتی ہے۔

"شباب و شعر" کی قسم کی باتوں سے قولی و عملی دلچسپی کا بھی ایک عہد ہوتا ہے۔ اگر اس عہد میں کسی میں باتیں نہ ہوں۔ تو سمجھیئے کہ اُس پر وہ عہد آیا ہی نہیں۔ اور اس عہد کا کاروان نکل جانے کے بعد اگر ہم ایسی باتوں پر سر دھننے اور انگڑائیاں لینے لگیں تو اور تو اور ہمارا غماز آئینہ ہی ہماری اس نادانی و سبک سری پر ہمیں شرما دیتا ہے کسی جوان نے جسے بوڑھے کی جراتِ عاشقانہ پر رحم آتا تھا کہا ہے کہ "پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است"۔ غنیمت اسلیئے کہ اسے گوشت و پوست کے معشوق کا خیال باندازۂ عشق آیا۔ جبکہ اسے قبر سے لپٹ کر سونے کے لئے آمادہ ہونا

یئے تھا۔ لیکن اس جوانی کے مقابلہ میں ایک مایوس حیات غریب بوڑھا جو جوانی میں بھی بوڑھا ہی تھا۔ اپنی جوانی کو محض خواب بتاتا ہے۔ بھلا جس کی جوانی خواب ہو وہ پیری میں جوانی کا خواب کیسے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن جوانی خواہ خواب ہو شراب مگر دلفریب اتنی ضرور ہے کہ عموماً سفید بالوں کو مخضب و محنّٰی کر کے چھپایا جاتا ہے کہ ظالم جوانوں تم ہمیں ...ح نہیں ملتے تو جوان تما تو کہو۔ بوڑھوں کی یہ ہوس دیکھ کر خواجہ ستشیراز نشۂ عرفان سے سرمست ہو کر ڈانٹ ...ہے سہ

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون رو — رندی و ہوسناکی در عہد شباب اَولیٰ

بہرحال کہنا یہ ہے کہ نومبر اور دسمبر ۱۹۳۳ء کے ساقی دہلی کے دو نمبروں میں "شباب شعر" کے عنوان سے دو ...ستوں کے خطوط شائع ہوئے ہیں جن میں سے ایک دہلی میں ہیں اور دوسرے صاحب شملہ میں۔ نومبر کے ساقی میں تو ...ناموں کے کتمان پر اصرار ہے۔ اور دسمبر میں عملاً وہی اخفا موجود ہے۔ گو ہم جناب امتیاز الدین صاحب دہلوی کی طرح یہ تو ...یں کہہ سکتے کہ دونوں مراسلہ نگاروں کی اپنے اسمائے گرامی پردۂ اخفا میں رکھنے کی کوشش ناکام رہی۔ اس لئے ...نقاب دبیز نہیں جس سے ادبی خدوخال کی پردہ پوشی ہو سکی۔ مگر کم از کم "دہلوی" دوست کے مکاتیب کا طرز نگارش ...ہد ہے کہ اس پردہ میں کون بول رہا ہے۔ ہاں شملوی مکتوب نگار صاحب اگرچہ دہلوی ہیں مگر ابھی تک ہم انہیں ...یں پا سکے۔

ہمارے دہلوی دوست نے "نگار" یا حضرت مولانا نیاز کے ادبی و علمی ارتقاء پر جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی صحت و ...م پر بحث نہیں ہاں اگر میں صوفی صافی ہوتا تو کسی بزرگ سجادہ نشین کا فیض روحانی کہہ کر بتا دیتا کہ یہ کون بزرگ کا ...دانہ ارشاد ہے۔

میرے دونوں عزیز دوست (جن میں سے ایک کے متعلق میرا گمان ہے کہ میں انہیں پہچان گیا ہوں اور دوسرے ...ی کے نہ پہچان سکنے کا مجھے اعتراف ہی) مجھے معاف فرمائیں۔ اگر میں یہ عرض کروں کہ نومبر کے مکاتیب اپنے موضوع ...شباب و شعر) سے اس قدر مربوط تھے کہ اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ (یہاں بعض خیالات کے پیرایۂ بیان کے "اخلاقی" ...لو سے ہمیں بحث نہیں) لیکن دسمبر کے مکاتیب جس قدر اس عنوان سے لگا کھا سکتے ہیں اسکا اقرار محل احتیاط و تامل ہے۔

دہلوی دوست کی طرف سے تو عذر موجود ہے۔ مگر شملوی دوست اپنے مضمون کے "بے رنگ" اور بے کیف ...ونے کی کیا تاویل کرینگے۔ دہلوی دوست۔ جن حالات میں حیدرآباد گئے۔ اور اُن پر جو حالات وہاں گزر رہے ہیں۔ اور ...ن کا انہوں نے اپنے آخری خط میں نقشہ کھینچا ہے۔ ایسے ہیں کہ اگر ان میں بھی وہ "شعر و شباب" کے موضوع پر وہی اور ...یسی ہی باتیں لکھتے تو میں کہتا کہ ان کو اپنی "بیوی" سے "محبت" نہیں۔ لیکن شملوی دوست کے لئے تو ان کا شملہ دہلی ہی بہتر ...ا تھا۔ یہ نہیں معلوم کیوں ان کے سیلاب شباب کا زور شملہ کی بلندی سے دہلی میں آکر مزید پُر زور ہونے کی بجائے ...زور تر ہو گیا۔

"شباب و شعر" کے مضمون کے بعض حصّوں کو پڑھکر خود بخود سوال ہوتا ہے کہ چند نوجوانوں کا کسی ایسی مجلس ...ساجہاں بوڑھے بھی بیٹھے ہوں۔ یوں بے محابا کھل کھلا کر ہنسنا اور جوش شادمانی میں رازدروں پردہ کو بے تکلف افشا کر دینا

کہاں تک "مشرقی دائرۂ ادب" میں آسکتا یا قابلِ عفو ٹھہرایا جاسکتا ہو۔ مگر جب ہنستے ہوئے نوجوانوں کی جدید مغربی تربیت پر نظر جاتی ہے تو نوجوانوں کو "چشم نمائی" کرنے سے زیادہ بزرگوں ہی کو مشورہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات زمانہ بدل گیا، مشرق و مغرب کے ڈانڈے مل گئے۔ جو کچھ یورپ میں ہوتا ہے وہ مشرق کے تافہ گاہوں میں دن میں کئی کئی بار فلمی پردہ پر عملاً ہوتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ جن دماغوں میں یورپ کا "ادب" بھرا ہوا ہے اور جو آنکھیں شب و روز "پردہ" کی بات پردہ کے اوپر دیکھتی رہتی ہیں اگر انہی باتوں کو قلم لفظوں میں بند کردے تو مجرم کیسے ہوا۔

تاہم اگر آپ ایسی مجلس سے اُٹھنے کے لئے تیار نہیں تو وہاں بیٹھنے کے لئے لازمی ہے کہ کم از کم آپ جوانوں کی باتوں پر مُسکرا لیتے جاتے، اگر ایسے نہیں جیسے بچوں کی شوخی پر بزرگ مسکراتے ہیں تو تعریفاً ہی سہی۔ ورنہ سنی ان سنی کردینا زیادہ مناسب ہے۔ یہ جوان ہیں۔ آپ بھی جوان تھے۔ جوانوں کو نصیحت کرنے سے شیخ و واعظ کی گت بن گئی۔ اگر وہ بھولے بھالے لوگ ذرا دیر زبان پر قابو رکھتے۔ اور تھوڑے دن صبر کرتے تو دیکھ لیتے کہ شباب کا طوفان آن کی آن میں غائب ہوگیا۔ اور وہی شباب زدہ جوان جو عہدِ جوانی میں بوڑھوں کی پگڑی اُچھالتا پھرتا تھا۔ اِس طوفان کے گزرنے کے بعد نچلا ہوکر بوڑھوں کی صف پائیں میں باادب ہوکر آن بیٹھا۔ اور اُن کی پگڑی بھی نہ اُچھالی جاتی۔ مگر واعظ و ناصح میں صبر کہاں۔ وعظ فرمایا اور شرمائے۔ لیکن داغ نے اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا تھا۔ جب جوانی کو بے لگام دیکھا تو بے پروایانہ انداز میں چپکے سے تجربہ کاروں کی طرح کہا حضور! ؎

طبیعت کوئی دم میں بھر جائیگی — اُٹھی ہے یہ آندھی اتر جائیگی

گاندھی جی اور مسلمان

دہلوی دوست نے گاندھی جی کے متعلق کیا بے پناہ فقرہ کہا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے تو سوائے اپنے ٹوٹے ہوئے دانت نکوس دینے کے ان سے اور کچھ ہوتا نہیں"۔ میں جانتا ہوں کہ جب کسی سے حسنِ ظن نہ ہو تو اس کی ہر ادا بُری معلوم ہوا کرتی ہے۔ مگر اس نفرت کا اظہار ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہلوی دوست ادب کے اس شعبہ میں بھی ماہر اور قادر الکلام ہیں، ذرا غور تو کرو کہ چند الفاظ کے اس جملہ میں ظالم نے کتنی وسیع دُنیائے طعن و تعریض بند کردی ہے۔ گاندھی جی کا وہی تبسّم جو اُنہی کا حصّہ ہے۔ اور جس کے حسن پہ لاکھوں غش ہیں۔ اس کی یہ تعبیر ایسی تعریض ہو جسکے پڑھنے کے بعد ہندوستان کے اس بڑے لیڈر کی شخصیت ایک اور ہی رنگ میں نظر آنے لگتی ہے۔

جیسا کہ دہلوی دوست اپنے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ انہیں سیاست سے واسطہ نہیں کچھ ایسا ہی حال اپنا بھی ہے، بھلا جو شخص صبح کے چھ سے رات کے دس بجے تک درس و تدریس کے پھیر میں رہتا ہو۔ اس غریب کے پاس فرصت کہاں کہ شعلہ زارِ سیاست میں بھی کود پڑے۔ لیکن سیاست سے اس بے تعلقی کے یہ معنی نہیں کہ ہمارا ملک جن حالات میں سے گزر رہا ہے اس سے ہم بے خبر ہیں، ملک میں یا ملک کے باہر ہماری آیندہ قسمت کے

ن جو کھیل سیاست کے نام سے کھیلے جا رہے ہیں۔ ہم ان کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ گو خود کچھ کرنے
رد کھانے کی اہلیت نہیں مگر دوسروں کے اعمال و افعال پر نکتہ زنی تو کی جا سکتی ہے۔ اس موقعہ پر کہنا صرف
ہ کہ اگر گاندھی مسلمانوں کے لئے اپنے ٹوٹے دانت نکوس دیتے ہیں۔ تو نکوس دیا کریں غریب کے پاس ٹوٹے
نہ دانتوں کے سوا اور ہے کیا۔ لیکن اس سے مایوس وہ ہو اور اس کی شکایت وہ کرے جو دوسروں سے ملنگئے
سروں کی نگاہِ لطف کا امیدوار ہو۔ مگر وہ شخص یا قوم جو زندہ رہنا چاہتی ہے وہ اپنی زندگی کے بقا کے لئے
دوجہد کیا کرتی ہے۔ سوال کسی کے دانت نکوس دینے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم اور آپ میں اس قابل۔ انصافاً فرمائے
ہاں کتنے ہیں جو گاندھی جی کی طرح اوروں کے لئے نہ سہی اپنی ہی ملت کے لئے مخلصانہ طور پر مفید کام کر رہے ہیں
و اپنے اعمال و افعال میں اتنے ہی مخلص بنے رہے ہیں جتنے گاندھی جی سارے ہندوستان کے لئے نہ سہی
م اپنی قوم اور ملت یعنی ہندوؤں کے لئے مخلص اور وفادار ہیں۔ خدا لنگوٹی بند گاندھی کا بھلا کرے کہ وہ مسلمانوں
لئے ٹوٹے دانت تو نکوس دیتا ہی ہیں تو اسی ہندوستان میں اپنے ہی ایسے رہنماؤں کے اکثر نام یاد ہیں، جو
نوں کے درد سے بیتاب ہو کر میدانِ سیاست میں آئے۔ اور حکومتِ وقت سے اپنی ذات کے لئے کوئی عہدہ
اب پاتے ہی۔ قوم کا درد بھول کر سرکار کے "نمک خوار" دعا گوؤں میں شامل ہو کر غالب کی طرح وظیفہ دعائیہ پڑھنے لگے ۔

غالبِ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — مدت ہوئی کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہیں ہم

معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا قوم قوم پکارنا قوم کی دردمندی کے لئے نہیں تھا اپنی بگڑی ہوئی بنانا تھا۔ چلو خیر
ی تو مسکرا کر ٹوٹے دانت ہی دکھاتا ہے، ایسے بزرگوار تو مسلمانوں کے طفیل بڑے ہو کر مسلمانوں ہی کو آنکھیں
یا کرتے ہیں۔

"شبابِ شعر" کی دلچسپ اور رنگین بحث میں بطور جملہ معترضہ نومبر نمبر میں جو بات آگئی تھی۔ وہی بات دسمبر نمبر
اتنی نمایاں ہو گئی ہے کہ عنوان کی بجائے اسی کو اصل موضوع گفتگو کہا جا سکتا ہے۔

موضوع یہ ہے کہ ادعائے تجدید کے بعد استقامت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ میرا ابھی اس بارے میں وہی
ں ہے جو دہلوی دوست نے "استقامت" کے متعلق نومبر نمبر میں ظاہر کیا تھا۔ لیکن "عدم استقامت" کی تائید میں
ی دوست نے دسمبر نمبر میں جو کچھ جواباً یا جوازاً تحریر فرمایا ہے وہ محل نظر ہے اور اسی کے متعلق ذیل میں اظہار خیال
جائے گا۔

استقامت علی الامر پر تاریخی شواہد

میں نہیں کہنا چاہتا کہ ہمارے مکرم و مخدوم اور فاضل دوست جناب مولانا نیاز صاحب نے اپنے مذہبی تنقیدی مضامین
علق مختلف اثرات کے ماتحت جو اعلان اپنے رسالہ نگار میں فرمایا تھا۔ جسے کوئی موصوف کا توبہ نامہ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور،
ان کے شایانِ شان تھا یا نہیں اور نہ مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے ان کی حیثیت پر کیا اثر پڑا ہے۔ کیونکہ یہ وہ باتیں ہیں

جن کا فیصلہ اپنے خیالات کی اہمیت کو دیکھکر موصوف ہی کو کرنا چاہیئے۔ بلکہ مجھے کہنا صرف یہ ہی کہ شملوی دوست کا عدم استقامت کے کسی فعل کو قرینِ مصلحت ثابت کرنے کے لئے ہجرت محمدیہ کے واقعہ سے استدلال۔ یا لنین کے تین بار جیل سے فرار کر جانے سے استناد۔ قطعاً بے تعلق ہے۔

حضرت نیاز کا یہ فعل اپنی جگہ مناسب قرینِ مصلحت سہی۔ مگر ہجرت محمدیہ یا لنین کے جیل سے نکل بھاگنے کے واقعات پر اُس کا قیاس ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ان میں جو فرق ہے۔ میں یہ تو نہیں کہونگا کہ میرے عزیز نے اسے دانستہ نظرانداز کر دیا ہے اور یہ کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ دونوں واقعات کو سمجھے ہی نہیں۔ البتہ اتنا کہنے میں مضائقہ نہیں کہ اُنہوں نے ان امور پر غالباً سنجیدگی سے غور نہیں فرمایا۔

اگر کوئی صاحب محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکّہ سے ہجرت کرنے کو خدا کا حکم تسلیم نہ کریں تو میرے نزدیک کوئی لڑائی کی بات نہیں۔ چلو میں تسلیم کر لونگا کہ خدا کے حکم کے ماتحت نہ سہی۔ حالات کے ماتحت ضروری تھا کہ آپ اپنے چچازاد بھائی علی رضؓ کو اپنی جگہ لٹا کر اور اپنے دوست مخلص و جان نثار ابوبکرؓ کو ہمراہ لیکر رات کی تاریکی میں مکّہ سے "بھاگ جاتے اور اپنی جان بچاتے"!

اِس واقعہ پر مختلف عقائد کے ماتحت جو جو موشگافیاں ہو چکی ہیں اور چار پائی پر لٹائے جانے والے اور ساتھ لیجانے والے بزرگوں کے متعلق محبّت و دشمنی کی نگاہ نے جو حسنِ ظن یا بدظنی کی کیفیات ظاہر کی ہیں۔ اِن سے قطع نظر صرف اِس ایک ہی پہلو کو سامنے رکھیئے کہ کیا محمدؐ رسول اللہ کا مکّہ سے ہجرت کر جانا اور کسی کا اپنے عقائد سے بخوف جان و اندیشۂ فتنہ رجوع کر لینا کسی طرح ایک ہی بات قرار پا سکتے ہیں۔

سنو! "جان بچا کر" ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا ایک بات ہے اور "جان بچانے کے لئے" اپنے خیالات سے دست بردار ہو جانا قطعاً دوسرا امر۔ محمدؐ رسول اللہ کے سامنے بھی عقائد سے دست بردار ہو جانے کا سوال آیا تھا۔ تخویف و تطمیع کے تمام آلات کے ساتھ صنادیدِ عرب نے چاہا تھا کہ محمدؐ اپنے خیالات چھوڑ دیں۔ مگر اس مردِ خدا نے اس وقت جب وہ تنہا تھا۔ اور اس وقت جب عرب میں کوئی آئینی حکومت موجود نہ تھی۔ خوف کو بے پروائی سے ٹھکرا کر اور طمع کو پروقار نفرت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اور اپنے جوانمردانہ اور حق پرستانہ اقدام سے بتا دیا تھا کہ محمدؐ اس مٹی کا بنا ہوا نہیں جو جان کے خوف یا جسم و جان کی مادّی لذتوں کے حصول کے لئے اپنے خیالات کو چھوڑ دے۔

ہاں سچ ہے کہ آپنے مکّہ کی سرزمین کو چھوڑ دیا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے خیالات کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ آپ کا یہ ترکِ وطن بھی اسی لئے تھا کہ آپ کو اپنے خیالات و عقائد عزیز و محبوب تھے۔ اب بھی اگر کسی شخص کو اپنے خیالات و عقائد کی حفاظت و صیانت کے لئے ہندوستان کے ایک شہر کو نہیں سارے شہروں کو چھوڑنا پڑے تو اُس کی اِس ہجرت سے ثابت ہوگا کہ اسے اپنے خیالات اور اعتقادات خاکِ وطن سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور جو لوگ اس کے خیالات کو سنجیدگی سے مطالعہ کر رہے ہوں گے وہ اس کے اِس عزم و ترکِ وطن سے اور زیادہ متاثر ہونگے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ یہاں معاملہ اِس کے برعکس ہے۔

جان بچانا بُری چیز نہیں کیونکہ زندگی اگر عزت کی ہو تو اچھی چیز ہے۔ مگر خیالات جو کسی حقیقت و یقین پر مبنی ہوں خصوصاً مذہبی خیالات تو یقیناً مال و جان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عزیز اور محبوب ہوا کرتے ہیں۔ کسی کا ایک ہی دھمکی میں ان سے دست بردار ہو جانا کون کہتا ہے مستحسن یا اچھا کام ہے؟

ایک افسانہ نویس تھیئیٹر کے ایک ایکٹر حتی کہ شاعر اور پیشہ ور وکیل کی باتیں اور ہوتی ہیں۔ لیکن مذہبی مصلح اور مجدد کی حالت ان سب سے الگ ہوتی ہے۔ افسانہ نویس دوسروں کی زندگی کا چربہ اپنی زبان میں اپنے مذاق کی رعایتوں کے ساتھ اُتارتا ہے۔ اسے واقعات سے زیادہ اپنے مذاق کا تتبع کرنا ہوتا ہے۔ شاعر خیالات کی اس دنیا میں رہتا ہے جہاں سے بازگشت کے بعد کبھی کبھی اپنے کہے ہوئے کو "مجذوب کی بڑ" یا "پاگل کی بکواس" کہنا پڑتا ہے ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایک ایکٹر جس کے ماں باپ شریف ہونے کے علاوہ زندہ موجود ہوتے ہیں۔ کسی تمثیل میں ایکٹ کرنے کے لئے ایک بیسوا کے بطن سے نامعلوم الاسم باپ کا ناجائز بیٹا بننا پسند کر لیتا ہے۔ اُسکی حرکات و مکالمات دیکھکر اس کے ماں باپ پر کیا گذرتی ہوگی؟ اس سے بحث نہیں۔ مگر تھیئیٹر کے تماشائی وقتی پر اس تصنع کو حقیقت خیال کرکے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ اسی وقت تک جب تک وہ اس ماحول میں ہوتے ہیں۔ وکیل کو معاملہ یا اہل معاملہ کی سچائی اور جھوٹ سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ ذاتی علم و یقین و بصیرت سے الگ ہوکر مقدمہ کی پیروی ان بیانات و اسناد و دستاویزات کی بنا پر کرتا ہے۔ جو اس کے سامنے پیش کی گئی ہوتی ہیں۔ وہ اس کی فکر نہیں کرتا کہ وہ معلوم کرے کہ وہ دستاویزات خود کہاں تک اصلی یا جعلی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ غالباً اکثر وکیلوں کو تو اپنے موکل کے حق میں شہادت دینے کے لئے گواہوں کو "مناسب طریق" پر تربیت و تعلیم دینے کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مقابلہ میں ایک مصلح اور مجدد بھی ہوتا ہے۔ وہ متقدم الذکر لوگوں کے سراسر خلاف وہی کہتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے اور اُس کے دل میں وہی ہوتا ہے جو اُس کے لب پر ہوتا ہے اور اس کے لبوں سے وہی آواز بلند ہوتی ہے جو اُس کی زندگی کے تمام اعمال و افعال سے صادر و ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی کہتا ہے۔ اپنے دل کی کہتا ہے۔ وہ دوسروں کے مشاہدات کی بجائے اپنے مشاہدات پیش کرتا ہے۔ وہ روتا ہے تو اس لئے کہ کسی نہ کسی درد نے اُسے بے تاب کر دیا ہوتا ہے، وہ ہنستا ہے تو اس لئے کہ بشاشت اس کے رگ و پے میں سمائی ہوتی ہے۔ وہ کسی بات پر زور دیتا یا اصرار کرتا ہے تو اس لئے کہ اُسے اس بات کی حقیقت پر وثوق یا اعتماد ہوتا ہے۔ اسی حد تک جس حد تک کہ اسے اپنی ہستی پر اعتماد و یقین ہوتا ہے۔

ہم اس جماعتِ مجددین و مصلحین میں ان مدعیوں کو شمار نہیں کر رہے ہیں۔ جو سچوں کے نام کے جھوٹے دعویدار ہوتے ہیں۔ جو خلاف ہوتے اور دروغ گوئی کرتے ہیں، جن کا سرمایہ عوام فریب باتیں۔ اساطیر۔ اور بے اساس حکایات ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کے ثبوت میں کچھ نہ کچھ حوالہ دیتے ہیں اور جب ماخذ طلب کیا جاتا ہے تو آسمان کی طرف تکنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ انسانی بھیڑوں میں خوفناک انسانی بھیڑیئے ہوتے ہیں۔

غرض مصلح کا ہر قول و فعل۔ صداقت و خلوص۔ حقیقت و واقعیت کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ یا ہونا چاہیئے۔

لیکن اگر کسی مُدعیِ اصلاح وتجدد میں یہ باتیں نہ ہوں تو اس کی باتیں خواہ سچی بھی ہوں وہ عملاً جھوٹا قرار پاتا ہے ایسا کہ جو کہتا ہے مگر خود اپنے کہے ہوئے پر اُسکو یقین نہیں۔ اس کی تمام باتیں اسی قبیل کی سمجھی جاتی ہیں جیسی کسی فسانہ نویس کی خیالی باتیں یا کسی افسانہ نویس کا تاریخی فسانہ۔ جو تاریخی بُنیادوں پر قائم ہوتے ہوئے بھی تاریخ کا درجہ نہیں پاتا۔ غیر مخلص اور غیر مستقیم مجدد و مصلح کا وعظ اور پیغام بھی۔ وعظ اور پیغام صلاح و فلاح قرار نہیں پا سکتا جس طرح ایک ایکٹر جو کسی سٹیج پر بادشاہ کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ اِس پارٹ کے کھیل چکنے کے بعد ایک عامی آدمی ہوتا ہے۔ جب وہ بادشاہ کا پارٹ کر رہا تھا لوگ اس کے شاہانہ رُعب و داب سے مسحور تھے اور اب کسی کی گاڑی کا سائیس بھی اس کو پرے ہٹو کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح غیر مخلص واعظ و مصلح سب کچھ ہو کر کچھ نہیں ہوتا۔ اسی کی عدم استقامت اس کے جھوٹے ہونے پر گواہ ہو جاتی ہے، دیکھنے والے دیکھ لیتے ہیں کہ اُس کی تمام ہنگامہ آرائیاں احقاقِ حق و ابطال باطل کے لئے نہ تھیں، وہ اپنے دعاوی بلند بانگ کی حفاظت کے لئے ذرہ برابر نقصان برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ بلکہ ایک کھیل تھا۔ جو اُسے دکھانا تھا۔ جب تک واہ وا رہی وہ بُلبلِ ہزار داستان بنا رہا۔ جب دھمکی ملی تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یا منقار زیر پر ہی نہیں بلکہ "سرمہ در گلو" سے زیادہ ہو کر بحالت خضوع و خشوع "تائب بندہ" بن کر اپنے ان مخالفوں کے سامنے حاضر ہو گیا۔ اور جنہوں نے اس کا ساتھ دیا وہ مفت میں احمق بنے۔

لینن کا قید خانے سے تین بار نکل بھاگنا بھی اِس بارے میں کوئی دلیل اور کسی قِسم کی مفید سند نہیں ہو سکتا۔ لینن اپنے علم و یقین۔ مشاہدہ و بصیرت کی بنا پر روس کی شاہنشاہی کا دشمن تھا۔ اِسی لئے وہ اِس حکومت اور طرزِ حکومت کو بدل دینا چاہتا تھا سو وہ حکومت کی گرفتاری سے بچتا رہا۔ اور جب کبھی وہ اپنے مخالفوں کے پھندے میں پڑ گیا۔ تو موقع پاتے ہی نکل بھاگا۔ جن حالات میں وہ تھا اور جن خیالات و عقائد کے ماتحت وہ کام کر رہا تھا اُسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ وہ حکومت کے جیل خانوں سے تو بھاگ جاتا تھا۔ لیکن کم از کم مجھے یاد نہیں کہ اُس نے ایک بار بھی حکومتِ روس اور روس کے ظل اللہ زار یا اس کے نمائندوں کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کر لی ہو۔ پس ایسے آدمی کا ایسے مُلک و حکومت کے جیل سے بھاگ جانا اس کے لئے جُرم نہیں۔ جو اہلِ مُلک کی فلاح کی کوشش کر رہا ہو اور کسی جابر اور غیر آئینی حکومت کا مخالف ہو اور اسی لئے اِس استبداد کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہو۔ جس کا مطمحِ نظر اپنے مُلک کو اس بے آئین فرعونی حکومت سے نجات دلانا ہو جہاں "اسرائیل" کے فرزندوں سے کُتّوں سے بدتر سلوک ہو رہا ہو۔ لینن اِس وقت "گناہگار" ہوتا۔ جب روس کے انقلابیوں کو انقلاب پر آمادہ کرتا اور روس کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی انقلابی سرگرمیوں کو اپنی شخصی ترقی کا زینہ بنا کر زار کے سامنے جا کر سربسجود ہو جاتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ پھر یہی لینن۔ "روس کا خدا" ادنیٰ درجہ کے ذلیل غلاموں میں شمار ہوتا اگر زار کی حکومت میں معمولی نہیں وہ بڑے سے بڑا رتبہ اور عہدہ پا کر۔ جسکے بعد زار کے سوا کسی اور کا کوئی درجہ اور رتبہ نہ ہوتا۔ اپنے تمام انقلابی خیالات کو سلام کر کے زار کی ظل الٰہی کے محامد و مناقب پڑھنے لگتا۔ لیکن جب لینن نے اپنی زبان سے روس کے "فرعون" اور "آل فرعون" کی تعریف نہیں کی۔ کبھی کسی موافق و مخالف کے سامنے اپنے انقلابی

خیالات کو غلط تسلیم نہیں کیا۔ کبھی اُس کا سر جابرۂ روس کے آگے نہیں جُھکا۔ اور کبھی اُس نے کسی بڑے سے بڑے عہدے کی ٹھی پاکر روس کے کسانوں سے آنکھیں بند کر کے زار اور اہل زار کے طریق کار کی تحسین و تمجید نہیں کی۔ تو ایسے حالات میں تین بار نہیں تین لاکھ بار بھی اگر وہ روس کے شاہی جیلوں سے فرار ہو جاتا تو یہ اس کا کارنامہ ایسی کرامہ اور معجزہ قرار پاتا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتا اور رہے گا۔

پس تیتن کے تین بار جیل سے ایسے فرار کو نسبت نہیں دی جا سکتی کسی ایسے فعل سے جس میں سجدہ کیا گیا ہو اہی ذات و بیل" کو جو کل تک معتوب رہے ہوں۔ اور یوں اپنے خیالات تجدد کا "نیا کعبہ" تعمیر کرنے کو اپنی غلطی اور غلط فہمی کہکر اسی "بتکدۂ جاہلیت" کے پجاریوں اور ان کے متبعین کی گرمیٔ ہنگامہ سے جان بچا لیجائے۔

حقیقت یہی ہے کہ استقامت دکھانا معجزہ سے کم نہیں ہوتا۔ کم از کم استقامت سے کچھ اور نہیں تو اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ عوام خواص خواہ کبھی اولوالعزم کو جھٹلاتے ہی رہیں۔ مگر وہ ثابت کر دیتا ہے کہ اسے اپنی صداقت اور مقصد کی اہمیت میں شک نہیں۔ غالبًا ذیل کی مثالیں اس مدعا کو واضح کرنے کے لئے کافی ہوں گی۔

عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے مخالفوں نے آپ پر ہجوم کیا۔ آپ کے مخالفوں کو اصرار تھا کہ آپ اپنے خلافت کے دعویٰ سے دست بردار ہو جائیں۔ لیکن آپ کا آخر دم تک یہی جواب رہا کہ جو چادر خدا نے مجھے اوڑھائی ہے۔ وہ میں اُتارنے کے لئے تیار نہیں۔ اِس استقامت کا نتیجہ یہ تھا کہ جان گئی۔ جانے دو۔ کچھ پرواہ نہیں۔ لیکن اس سرفروشی کے بعد یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عثمانؓ اپنے مخالفوں سے مرعوب ہو کر خلافت سے دست بردار ہو گیا۔

علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) اور مدبر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی جنگ میں علی رضہ کا باہمی نزاع کے تصفیہ کے لئے حکم بنانا یا کسی وجہ سے سرپنچ کو تسلیم کر لینا۔ ان کی غلطی کہہ لو۔ مگر جب یہ ظاہر ہو گیا۔ کہ ان کا حکم فریق مقابل کے دم میں آگیا تو اس کے فیصلہ سے آپ کا اباد انکار اور پھر آخر دم تک اُسپر اصرار کیا علیؓ کی استقامت علی الامر کا شاہد نہیں۔

اگر اہل عراق کی روایات مبکیات سے واقعہ کربلا کو الگ کر کے دیکھا جائے۔ تو کیا کربلا میں استقامت حسینؓ تاریخ کے تابناک صفحات کا روشن صفحہ نہیں شمار ہو سکتی۔ لیکن اس کے مقابلے میں کبھی آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ ناہی امام شہید کربلا کے برادر اکبر حضرت حسنؓ بھی ہیں جن کی فضیلت کے شیعہ و سُنی روایات کے دفتر کے دفتر گواہ ہیں۔ آپ حضرت معاویہ سے صلح کر کے خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ غور کرو کہ حضرت حسینؓ کے مقابلہ میں عملًا کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اگر اِس لطیف فرق کو برای العین مشاہدہ کرنا ہو تو کم از کم ایک شیعہ مجالس و محافل واعظ و ماتم میں جاتے۔ وہاں آپ کو "حسین حسین" کے نعرہ ہائے ماتمی کا تو ایک ہنگامہ حشر نظر آئے گا۔ مگر حسنؓ کے ماتم کی یہ شان نظر نہیں آئے گی۔ ہاں اس ہنگامۂ رستخیز میں اگر حسنؓ کا نام کسی کی زبان پر آجائے تو سند نہیں۔ حالانکہ شہید آپ بھی ہیں۔

مسئلۂ خلق قرآن" کو آج کے وافر علم والے بچوں کی سی بات کہہ لیں۔ مگر جب یہ مسئلہ فتنۂ عالم اسلام بنا ہوا تھا۔

احمد بن حنبل کا اس کے خلاف نعرۂ حق اس حال میں کہ مشکیں آپ کی کسی ہوئی تھیں۔ اور اونٹ پر سوار کرا کر آپ کی تشہیر کرائی جا رہی تھی۔ دلیل ہے اس امر کی کہ اہل حق۔ حق کے لئے تمام رسوائیوں اور ذلتوں سے دوچار ہونے کو اپنی ذلت و رسوائی نہیں عزت و ناموری سمجھا کرتے ہیں۔ جب مادی طاقت چاہا کرتی ہے کہ وہ اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیں تو ان کا سینہ اور تن جاتا ہے اور سر بلند ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ نام و نمود کے بت کی سرنگونی کے خوف سے ان کے ماتھوں پر پسینہ نہیں آ جاتا بلکہ وہ اپنا نام و نشان اور اپنے جرم و گناہ کی تفصیل بھی آپ ہی بتا دیا کرتے ہیں۔ کہ ان کے نزدیک وہ بات جو گناہ قرار دی گئی ہوتی ہے بصواب اور نعم الصواب کا درجہ رکھا کرتی ہے۔

ان لوگوں کے واقعات سے قطع نظر۔ جن کی زندگی کے واقعات کو مذہبی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ریاست و سیاست میں بھی جس کے لئے جھوٹ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ ایسے مردان کار کے اسما موجود ہیں۔ کہ گو ان کی غلطیاں ہی غلطیاں رہیں، مگر ان کی اپنی غلطیوں پر استقامت قابل ستائش و پرستش ضرور نظر آتی ہے۔

انگلستان کا بادشاہ چارلس اوّل مدعی تھا کہ بادشاہ زمیں پر ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہوتا ہے ان معنوں میں کہ وہ من مانی کرنے کا مجاز ہے۔ اور کسی انسان کو حق نہیں جو اس سے باز پرس کرے۔ مشرقیوں کے لئے شاید یہ بات انوکھی نہ ہو کیونکہ ان کے ہاں پر تعلقہ دار خداوند۔ اور ہر راجہ مہاراجہ ظل اللہ ہوتا ہے۔ رہے بادشاہ تو ان کو بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا سبق تو بچپن ہی میں یوں پڑھایا جاتا ہے کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں ۔۔۔ بباید گفت اینک ماہ و پروین

مگر انگریز شاہ پرست انگریز اور (Gad save the King) کے نعروں کے خوگر ہونے ہوئے بھی اس دعویٰ سے برگشتہ ہو گئے، ملک میں بغاوت عام پھیل گئی۔ شاہی افواج باغیوں کے جھنڈوں کے نیچے جمع ہو گئیں، شاہی کے سب کل پرزے بگڑ گئے۔ بادشاہ کے تمام اعوان و انصار اس کے مخالفوں کا دم بھرنے لگے۔ اس کو قید کیا گیا۔ اور آخر اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ بادشاہ نے پہلے تو اس عدالت ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر جب اس کا انکار بیکار ثابت ہوا اور زبردستوں نے بزور قوت اپنی بات کو منوا کر فیصلہ کیا کہ بادشاہ کا سر قلم کر دیا جائے۔ تو اس حکم کی تعمیل کے وقت موافق و مخالف مورخ گواہ ہیں کہ چارلس قربان گاہ کی طرف یوں چلا جا رہا تھا جیسے کوئی سورما اپنی شجاعت کا تمغہ لینے کے لئے پُروقار قدموں سے بڑھ رہا ہو۔ جلاد نے اپنے تبر کے نیچے اس کا سر تو دیکھا مگر اس کے مخالفوں نے اس کی گردن کو اپنے سامنے خم نہیں پایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو آج بھی اس کے دعویٰ ظل اللہی پر ہنستے ہیں۔ اس کی اس استقامت پر سر دھنتے اور اس کی موت کو قرار دیتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

شہاب، مالیر کوٹلوی،

دو آتشہ

شہیدِ نازِ او بزمِ وجود است
نیاز اندر نہادِ ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب
بہ سیمائے سحر داغِ سجود است

شہیدِ نازِ صورت گر ہے دنیا
نیاز و بندگی کا گھر ہے دنیا
ہے پیشانیِ سحر پر سجدہ کا داغ
کہ زیبِ تاجِ خاور ہے دنیا

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اقبال

پھرے ہے طورِ سینا کے لیے کیا
نہاں سب کچھ ہے اپنی آگہی میں
ارے ناداں تلاشِ آدمی کر
خدا بھی ہے تلاشِ آدمی میں

نہال

"شکستِ سکوت"

یہ فیضِ نور یہ ہنگامِ طاعتِ معبود
شبِ بہار میں ہے خندۂ سحر کی نمود

خنک ہواؤں کے جھونکوں میں ارتعاشِ نظر
نمودِ حُسن سے مجروح الضرامِ جمود

ہر ایک قطرۂ شبنم ہے پارۂ الماس
ہے محو آئینے خانے میں شہر یارِ وجود

فضائیں بوئے گلستاں سے کشورِ مستی
ہوائیں زمزمہ پیرائے بربطِ داوَد

بساطِ شبنمِ سیمیں میں بجلیاں بیتاب
نگاہِ شوق کے دامن میں گوہرِ مقصود

اُٹھائے ساقیِٔ مہوش نے ساتگینِ شراب
خموش کرمکِ شب ہیں چراغِ سر بسجود

ہر ایک اشکِ جگر زاد اخترِ تاباں
ہر ایک ذرۂ ناچیز آفتابِ نمود

خموش اہلِ حرم ہیں نہ اہلِ بتکدہ نہ
کہیں نوائے ہری ہر کہیں صدائے درود

تڑپ رہے ہیں ہر اک شے میں جلوہ ہائے خلیل
جبینِ عشق و محبت ہے پائمالِ سجود

کُھلا ہوا ہے نظر پر دریچۂ فردوس
ہے متجلی مرا آئینۂ غبار آلود

ہجومِ جلوۂ عُریاں کی تابشیں، توبہ
بپا ہے چار طرف محشرِ قیام و قعود

بھنور میں گھوم رہا ہے سفینۂ ہجراں
جبینِ حُسن ہے اس بزم میں عرق آلود

اُٹھا رہے ہیں صنم زارِ زندگی سے حجاب
تخیلاتِ رفیع و نگاہِ لامحدود

چھڑا ہے محفلِ شیریں میں قصۂ فرہاد
ہے غزنوی کو تحیّر ایاز سر بسجود

ہر اک نگار میں اِک شانِ کبریائی ہے
اُٹھا ہوا ہے یہاں فرقِ شاہد و مشہود

مگر سحر کے ستارے مرے گواہ رہیں
نظر میں کیفِ صبوحی زباں پہ یا معبود

یہ بیخودی یہ تعیّش یہ عطر انگیزی
میں سجدہ ریز بصد غم بہ بارگاہِ ودود

(۲)

تُلے ہوئے ہیں مجھے پائمال کرنے پر
یہ خاکدانِ حریفاں یہ آسمانِ کبود

مرے حسین ارادوں کو کر نہ دیں زخمی
یہ قحطِ جنسِ خلوص اور یہ دورِ نامسعود

قدم قدم پہ بچھاتے ہیں دامہائے فریب
کہیں یہ میرے عزائم کو کر نہ دیں مسدود

ثنا کے مایہ ناموسِ فخرِ انسانی
تُلے ہیں اس پہ کہ احسان کیوں نہ ہو نابود

قدم زنی پہ قلم زن شکستہ پا اغیار
مرے کمال پہ خونبابہ ریز چشمِ حسود

یہ قصد ہے کہ بجھا دیں کسی طرح اسکو
نہاں جو ہے مرے سینہ میں شعلۂ بے دود

(۳)

تو ہے سمیع و بصیر و مسبب الاسباب
ہے تیرے قبضۂ قدرت میں کارگاہِ نمود

ترے کرم سے ہی جو کچھ ہے ورنہ میں کیا ہوں
مری زبان میں لکنت مری نظر میں جمود

مرا ندامتِ عصیاں سے سر نہیں اُٹھتا
مری جبیں کو نہیں نازشِ ادائے سجود

تبسمات سے کوسوں مرے لبِ خاموش
مرا شعار ہے توہینِ رسوم و قیود

نہ اہلِ زر سے تعلق نہ اہلِ سیف سے میل
مری اُمید ہے تیرے کرم تلک محدود

نہ خضرِ راہ سے واقف نہ ناخدا سے غرض
کہ تیرے در کو سمجھتا ہوں کعبۂ مقصود

نہیں پہ زعمِ تکلّم نہیں پہ نازِ خیال
وگرنہ یہ مری ہستی ہے ہستیٔ بے سود

میں رہزنانِ صداقت سے دب نہیں سکتا
سمجھ رہا ہوں کہ خود اک قبر ہے یہ وجود

اگر تری یہ رضا ہے مرا نشاں نہ رہے
تو پھر مری بھی دعا ہے یہی کہ ہاں نہ رہے

احسان بن دانش

تیتری

رات کی تاریکیاں ابھی پوری طرح سمٹی بھی نہیں تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور جھونکے ساکت تھے، سورج کی ترچھی شعاعیں آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھیں — جنگلوں و میدانوں پر۔ وادیوں اور پہاڑوں پر —

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

روئی کے گالوں جیسے بادلوں سے جن کا رنگ مرمری جیسا تھا ایک ہلکا سا معطر جھالا برس چکا تھا، جو صبح کی شبنم کے جواہر پاروں کی طرح ہر درخت اور ہر پھول پر ڈھلک رہا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اور کوئل کے سریلے گلے سے ایک ایسا طویل اور اونچا سر بلند ہوا جیسے کہ گونجا اور پھر اس کی صدائے بازگشت جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے اور سایہ دار وادیوں میں سنائی دے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مسرت انگیز موسم بہار کی حسین تخلیق، زندگی اور روشنی میں یکایک نمایاں ہوگئی۔ تیتری اپنے چمکدار پروں پر اڑتی ہوئی اپنی تمام و کمال رعنائیوں کے ساتھ دن کی روشنی میں آ گئی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ماں کی حفاظت سے بے پرواہ بچپن کی صعوبتوں سے وہ قطعاً نا آشنا تھی۔ جونہی اسے بہار کی ہوا لگی وہ ایک دم سے تکمیل کو پہونچ گئی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس کی نازک ہیئت نے روشنی سے ترکیب پائی تھی۔ اس کے اعضا میں مخمل کی سی نرمی تھی۔ دھنک کے سارے رنگ اس میں نمایاں تھے۔ اور چمکدار سونے کی افشاں چنی ہوئی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مسرت سے کانپتی ہوئی، تھوڑی دیر تک وہ کھڑی رہی، اور سورج کی جاں بخش شعاع کو محسوس کرتی رہی، آسمان سے امنڈے ہوئے طوفانِ زندگی میں سے اس نے گھونٹ لیا، اور اپنی خوش رنگی کو دیکھکر تعجب کرنے لگی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اپنے منقش پروں کو اس نے اکثر تولا۔ اور ہوا کے میدانوں میں تیرنے کے لئے تیار ہوئی، پھر اپنے مہمات سے بھرے ہوئے سفر میں سرگرم ہوگئی۔ اور بڑھتے ہوئے ہوا کے جھونکوں میں تیرنے لگی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جا دختر مسرت! کھیتوں کا جائزہ لے۔ بہار نے جتنی خوشیاں فراہم کی ہیں، ان سے لطف اندوز ہو۔ بہار کے مدبر ہاتھ جو کچھ دے رہے ہیں، تیرا جتنا جی چاہے لیلے، اور جبتک تیری زندگی ہے اپنی مسرتوں میں زندہ رہ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جا! گلاب کی معطر شبنم پی۔ چنبیلی کے شہد بھرے پیالے میں جھانک، ایک ایک پھول کو کھنگال ڈال اور جنگل کے سارے خزانوں کا معائنہ کر۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اور مجھے اپنی پروازِ آوارہ کا تعاقب کرنے دے، اور اپنے آرام کے خفیف لمحوں کا بھی! اور پھر ایک نئی خوشی کے ساتھ اپنے سُنہری پروں کا سمٹنا اور پھیلنا دیکھ۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

مگر سُنو! جب میں اپنے اِن خیالات میں گُم ہوتا ہوں تو ہوا میں ایک ہلکا سا ترنم سُنائی دیتا ہے۔ ایک نامعلوم گلے سے نکلکر نرم نقرئی صدائیں میرے چاروں طرف تیرنے لگتی ہیں۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

وہ رُک جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے ایک آواز سُنائی دیتی ہے، ایک سرگوشی! اُمید اور خوشی کی! تیرے آرام کا وقت قریب آ پہونچا۔ اے فانی! تیار ہوجا۔ تجھے مرنا ہے۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"مگر چونک مت۔ تیری بند ہونے والی آنکھوں پر ایک دن اور بھی روشن ہوگا۔ اِس سے ہلکی روشنی کا سُورج طلوع ہوگا۔ اور ایک اِس سے بھی زیادہ، بے شمار مسرّتوں کا زمانہ آئیگا۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"یہ غریب کیڑا جو اِس وقت تیرے لئے جنّتِ نگاہ ہے، جو قدرت کی کمترین مخلوق ہے، اور اِس طرح حسین و جمیل دوبارہ پیدا ہوا ہے، کیا یہ تجھے آئندہ زندگی کا درخشاں درس نہیں دیتا؟

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

... اُس کی یہ سُنہری آنکھیں پہلے کہاں تھیں؟ اِس کے چمکدار قرمزی پر جو اِس قدر خوشنما ہیں۔ بدنما بھیس میں چھپے ہوئے تھے۔ اور یہ بدرنگ مٹی میں رہتا تھا۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"تیری طرح یہ ناخوش و مجبور کیڑا بھی زندگی گذارتا تھا، تیری طرح یہ بھی محنت کرتا تھا، اور تیری طرح یہ بھی چکّر میں رہتا تھا۔ تیری طرح اسکا آخری وقت بھی آ پہونچا تھا، اس کی محنت ختم ہوگئی تھی اور جالا تن چکا تھا۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"تو کیا تجھے، جب تیرا شمار مُردوں کے ساتھ ہوگا کسی اِس سے بہتر حالت سے واسطہ نہ پڑیگا؟ اور کیا آئندہ آنے والی زندگی تجھ پر اِس سے روشن تر شعاعیں نہیں ڈالیگی؟

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"تو کیا قدرت کی وہ طاقت جو اِس کیڑے کے مُردہ جسم میں دوبارہ زندگی ڈالدیتی ہے تیرے جسم میں، جسکو کہ اُسی نے بنایا ہے، جب وہ چاہے زندگی کا شُعلہ نہیں بھڑکا سکتی؟

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

"جا فانی اِنسان! اِس کیڑے کی مثال سے تجھے جتنا جاننا چاہیئے بتا دیا گیا ہے۔ جا اِس مسرّت آفریں حقیقت کو بیان کر، زمین کے کمزور بچّے! فردوس کے بلند مرتبہ وارث!"

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

(ماخوذ)

شاہد

ہندوستانی صحافت کی ایک جھلک

اس ڈرامہ کا مطالعہ ۴ منٹ ½ ۲ سکنڈ کے قلیل عرصہ میں ختم ہو جانا چاہیئے۔

اراکینِ مجلس

سُہیل :- ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر
نسیم :- اخبار کا مالک و ناشر
انوار :- اخبار کا کاتب
اے. ایچ. فجی :- پاگل خانہ کا منتظم

منظر

ایک مختصر سے کمرے میں بوسیدہ میز کے قریب تین چار کرسیاں پڑی ہیں۔ درمیانی کرسی پر ایک دراز قامت شخص بیٹھا کاغذات کی دیکھ بھال میں مشغول ہے۔ دوسرا شخص جو بظاہر حجام معلوم ہوتا ہے' تیوری پر بل ڈالے بیٹھے ہوئے شخص کو گھور رہا ہے۔ میز پر نہایت بے ترتیبی کے ساتھ کاغذات اور دیگر اشیائے نوشت و خواند پھیلی ہوئی ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ردی کا ڈھیر لگا ہے۔ دوسری طرف انگیٹھی پر لئی پک رہی ہے۔ دھواں آہستہ آہستہ نکل کر کمرے کی فضا کو زیادہ تاریک بنا رہا ہے۔

نسیم۔ (ایستادہ شخص کو مخاطب کر کے) "ایڈیٹر صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ کس قسم کا کام کرتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار ہے اور پھر بھی وقت پر شائع نہیں ہو سکتا۔ اگر روزانہ ہوتا تو شاید اس سے بھی زیادہ بدانتظامی رہتی۔ مشکل سے سال بھر میں دو چار پرچے شائع ہوا کرتے۔ جب یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ اخبار ہر اتوار کی شام کو چھپ جایا کریگا تو آج منگل تک اس کی کتابت کا بھی نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟"

سہیل "بہت خوب! آپ ہمیشہ مجھ کو مورد الزام ٹھیراتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ قصور کس کا ہے۔ میں اس سے قبل کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ کام کی بہت زیادتی ہے۔ ایک آدمی ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہو کہ میں مضامین کو ترتیب بھی دوں۔ مقالہ افتتاحیہ بھی لکھوں مختلف تاجروں سے اشتہار جمع کروں۔ کاپیاں صحیح کروں۔ پروف دیکھوں، دفتر میں بیٹھکر حساب کتاب کروں۔ خریداروں کے پتے لکھ کر اخبار لپیٹوں۔ پارسل باندھوں۔ اُن کو ڈاکخانہ تک پہنچاؤں۔ عام انتظامی اُمور کی دیکھ بھال رکھوں' اور سب سے زیادہ یہ کہ آپ کے گھر کا سودا سُلف لاؤں۔ چھوٹے صاحبزادے کو صبح کے وقت مدرسے اور شام کو کھیل کے میدان لیکر جاؤں۔ مدیر نہ ہوا جناب کا زرخرید غلام ہو گیا۔ آپ اخبار کے مالک ہیں میرے مالک نہیں۔ بھاڑ کے کاٹھو بھی اتنا کام نہیں کرتا۔ باز آیا ایسی مُلازمت سے' آپ دوسرے آدمی کا انتظام کر لیں۔ روز کی کِل کِل اچھی معلوم نہیں ہوتی"

نسیم "آپ خواہ مخواہ شور مچانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ورنہ کام کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ ذرا جی لگا کر، شوق سے،

کیجیے صداقت سے، ایمانداری اور دیانتداری سے بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے کرتے چلے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی کم عرصے میں اور نہایت اچھے طریقہ پر پورا ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو ہی فرض شناسی کا احساس ہی نہیں تو اس کا کیا علاج ؟

سہیل: بس تو آج سے بندہ کا سلام ہے۔ چولہے میں جائے ایسی نوکری۔ پندرہ روپے مہینہ تو میں جنگل ڈھو کر بھی پیدا کر سکتا ہوں۔ آپ کون سے نوٹ کے ٹکے پنکھا دیتے ہیں۔ جو اسقدر اعتراض کرتے ہیں ؟

نسیم: او ہو! میاں سہیل! تم تو ذرا سی بات میں برا مان گئے۔ میرا مطلب تو صرف اسقدر تھا کہ وقت پر کام ہونے لگے۔ اچھا اب سناؤ کہ پرچہ شائع ہونے میں کیا دیر ہے ؟

سہیل: مجھے کچھ خبر نہیں۔ یہ سوال دوسرے ایڈیٹر سے کرنا۔ مجھ کو آج ہی کی تاریخ سے مستعفی سمجھو۔ غضب خدا کا اتنی قلیل تنخواہ اور اسقدر زیادہ کام۔ پھر روز کی لعنت و ملامت ؟

نسیم: بس اتنی سی بات پر بگڑ گئے۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ مجھے خود احساس ہے کہ کام بہت زیادہ ہے۔ اچھا اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ میں آٹھ آنے ماہوار کی ترقی کر دی جائے گی۔ ساڑھے پندرہ روپے لیا کرنا۔ بس اب تو خوش ہو۔ اتنی تنخواہ بی۔ اے۔ پاس کو بھی نہیں ملتی۔ اور تم تو مڈل فیل ہو ؟

سہیل: درست ارشاد ہوا۔ مگر خوشی میری قسمت میں نہیں ہے۔ ابھی جناب کی بیگم صاحبہ کا نزلہ گرنا باقی ہے۔ روپے کی بیل منگائی تھی میں بھول آیا۔ نہیں معلوم کیا کچھ کہیں گی ؟

نسیم: خیر! میں ان کو سمجھا دونگا۔ اب یہ بتاؤ کہ اخبار کب تک تیار ہو جائے گا ؟

سہیل: اس کے متعلق یہ ہے کہ ابھی صرف ڈیڑھ صفحے کی کتابت ہوئی ہے۔ باقی جملہ خبریں اور تمام مضامین اہم ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کس کو نظر انداز کیا جائے کیونکہ کل مسودات کے لئے تقریباً پچیس صفحات درکار ہیں۔ صرف ساڑھے دس صفحے لکھوانے باقی ہیں۔ جن میں سے آخری پانچ اشتہارات کیلئے مخصوص ہیں ؟

نسیم: بیشک اشتہارات نہایت ضروری ہیں۔ آمدنی کا دارومدار انہی کی اشاعت پر ہے۔ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ اہم چیزوں کو اس دفعہ درج کر دو۔ باقی آئندہ پرچہ میں شائع کر دینا ؟

سہیل: یہی تو مشکل ہے کہ تمام اہم ہیں اور طویل بھی۔ مثلاً اسمبلی کی روئداد جس کو پڑھنے کے لئے تمام پبلک بےچین ہے۔ کم و بیش چھ صفحات میں آئیگی ؟

نسیم: حذف و اختصار سے کام لیکر آدھے صفحے میں درج کر دو ؟

سہیل: یہ ناممکن ہے۔ صدر اسمبلی نے خود بلاکر کہا تھا کہ روئداد پوری شائع ہو ؟

نسیم: وہ اس کے مجاز نہیں۔ تم مختصر کر دو۔ اچھا اور کیا خبر ہے ؟؟

سہیل: پروفیسر گپتا نے نظریۂ ارتقاء پر دو صفحے کا مضمون لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ کالج کے طلباء کے لئے اخبار کی دو سو کاپیاں خرید لی جائینگی ؟

نسیم: بہت خوب! اس کو ضرور شامل کر لینا۔ بشرطیکہ وہ کل قیمت پیشگی ادا کر دیں ——— اور بتاؤ ؟؟

سہیل: ایک نہایت سنسنی خیز خبر ہے۔ چار روز ہوئے صدر بازار میں موزہ بنیان کی دوکان کے اندر آگ لگ گئی۔ ایک لڑکی جان بچانے کے لئے سہ منزلہ سے کود دی اور اتفاقاً موٹر کی جھپٹ میں آ گئی۔ رپورٹر کی اطلاع ہے کہ لڑکی کی دائیں ٹانگ میں موچ آگئی ہے۔ اور بازو میں معمولی خراش مگر ڈاکٹروں

کا بیان ہے کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔ پولیس تحقیق کر رہی ہے"

نسیم:۔ اس خبر کو شائع کرنے کی ضرورت نہیں جب پولیس کی تحقیق مکمل ہو جائے اس وقت دیکھا جائیگا۔ نیز یہ بھی معلوم نہیں کہ لڑکی زندہ بچے گی یا مر جائے گی۔ ہر چیز مکمل ہونی چاہیے۔ اور سناؤ"

سہیل:۔ دسویں جماعت کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ مگر تقریباً تین صفحوں میں لکھا جائیگا"

نسیم:۔ صرف یہ درج کر دو کہ فلاں مدرسہ کا نتیجہ اتنے فی صدی ہے"

سہیل:۔ نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔ طلبا اپنا نام اور امتحان کا نمبر دیکھکر اخبار خریدتے ہیں۔ اندازاً پانچ سو کاپیاں فروخت ہو جائیں گی"

نسیم:۔ بہت خوب! اسے ضرور شائع کیا جائے۔ اور بتاؤ"

سہیل:۔ نوروز کی خوشی میں حاجی کلّن اور چچا فیاض کو خان بہادر کے خطابات ملے ہیں۔ ان کو ضرور مبارکباد دیجائے"

نسیم:۔ حاجی کلّن کو مبارکباد نہ دی جائے۔ کیونکہ گذشتہ سال اُنہوں نے وارنٹ قرقی نکلوا کر میری بہت توہین کی تھی البتہ چچا فیاض اپنے رشتہ دار ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن سے روپیہ قرض لے رکھا ہے۔ اگر مبارکباد نہ دی گئی تو وہ کڑا تقاضہ کریں گے۔ اور پھر یہ کہ اُن کی صاحبزادی کے ساتھ میرا رشتہ بھی ہونے والا ہے"

(انوار کاتب وزٹنگ کارڈ لئے داخل ہوتا ہے)

انوار:۔ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ اُن کا کارڈ ہے"

نسیم:۔ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں؟ یا مضمون نگار ہیں؟"

انوار:۔ بظاہر شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ ہاتھ میں کاغذ کا ضخیم پیکٹ، کپڑوں پر سیاہی کے دھبے اور صورت سوال بھی یہ ثابت کر رہی ہے کہ وہ مضمون نگار ہیں"

نسیم:۔ (کارڈ پڑھتے ہوئے) "ایک فجی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ اوہ یہ تو لیجسلیٹو اسمبلی کے کوئی ممبر ہیں۔ اچھا بلالو"

(ایک نحیف الجثہ آدمی سیاہ سوٹ میں داخل ہوتا ہے)

نسیم:۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) "جناب کی تشریف آوری ہمارے لئے باعث عزت ہے، فرمائیے کیسے تکلیف فرمائی؟"

فجی:۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی نیاز حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہو گیا تھا ــــ میں نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے۔ جو ...."

نسیم:۔ (قطع کلام کر کے) "اچھا میں سمجھ گیا۔ تخفیف اسلحہ جات کے سلسلہ میں یا پھر ٹریڈ یونین بل کے متعلق لکھا ہوگا"

فجی:۔ نہیں جناب! میں سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں نہیں پڑتا"

نسیم:۔ پھر ایم۔ ایل۔ اے (M.L.A.) بننے سے کیا فائدہ؟"

فجی:۔ آپ جانیں، ہر شخص کا وسیلۂ معاش جدا ہوتا ہے۔ میں خود اس ملازمت کو اچھا نہیں سمجھتا۔ کیونکہ صرف ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں اور میرا خرچ زیادہ ہے"

نسیم:۔ ایں حضرت! آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیسی ملازمت کیا ایم۔ ایل۔ اے بھی تنخواہ پانے لگے ہیں؟"

فجی:۔ جی ہاں ہمیشہ سے۔ میرا خیال ہے کہ اس اسامی پر آج تک کسی کا تقرر اعزازی طور پر نہیں ہوا ــــ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ساٹھ روپے میں گذر اوقات مشکل ہے۔ اس لئے

...ہ اک دو کچھ مضمون نگاری شروع کریں.....

...یم: کلام معاف، کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ ایم۔ ...ے آپ کا مطلب کیا ہے؟

...جی صاحب یہی منیجر آف دی یونیک ایس ایم۔

(منتظر دارالمجانین)

...یم: ہوں! تو آپ پاگل خانے کے منتظم ہیں۔ اچھا فرمایئے اختصار سے کام لیجئے۔ ورنہ میرا دماغی توازن بگڑنے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے ہمراہ چلنا پڑ جائے۔

بہتر ہے، میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں چند ...کے صحیح واقعات ہیں۔ براہ کرم اسے اپنے بلند پایہ اخبار میں ...ئع کر دیں اور ساتھ ہی یہ استدعا ہے کہ اگر کچھ رقم بطور ...رانہ مرحمت فرما دیں تو بہتر ہے۔

...یم: بہت خوب! آپ کا مضمون خواہ کتنا ہی ذلیل ...شتہارات کے ضمن میں شائع ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ...ں روپے فی کالم کے حساب سے کل اجرت پیشگی ادا ...ا۔

: لیکن وہ کسی چیز کا اشتہار نہیں ہے۔

...یم: تو آپ تشریف لے جائیں۔ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ آپ جیسے ناکارہ لوگوں کے ساتھ گفتگو کر کے ...ئع کیا جا سکتا۔

(...چلا جاتا ہے)

: جناب نے مجھے طلب فرمایا تھا، کیا حکم ہے؟

...یم: ہاں بھائی انوار، ذرا دیکھنا مضامین کسی قدر زیادہ ...ہیں۔ اور سب ضروری ہیں۔ اسی نمبر میں شائع ہوں گے۔ ...اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تم ذرا باریک قلم سے ...ک کر لکھو۔ چاہے سطر میں دو چار سطریں بڑھا دو۔

...: آپ بھی کمال کر رہے ہیں، بیس تیس کی چوتھائی میں...

پانچ کالم اور پھر کالم میں چھتیس سطریں پہلے سے موجود ہیں۔ آپ اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں۔ رہا قلم کا سوال تو خود ملاحظہ فرما لیجئے کہ فی الوقت سوئی سے زیادہ باریک نوک کا قلم استعمال کیا جا رہا ہے۔ زیادہ خفی لکھا گیا تو یقیناً قارئین کو محدب شیشہ کی اور خود مجھے عینک کی ضرورت پڑے گی۔ اور میرا خیال ہے کہ اب بھی کمزور چشم لوگ بمشکل اس کا مطالعہ کرتے ہوں گے۔

نسیم: تم کو اس سے کیا غرض۔ ہم جس طرح کہتے ہیں اسی طرح کرو، اور بس۔

انوار: بہت بہتر، اچھا اب میری عرض بھی سن لیجئے۔ ایک ہفتہ سے بیوی بچے سب بیمار ہیں۔ عطاروں کا قرضہ سر ہو گیا۔ کھانے پینے کی الگ تنگی ہے۔ کئی ماہ سے ایک پائی نہیں ملی۔ ایڈیٹر صاحب سے کہا تو وہ آپ کا نام لیکر الگ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خود میری تنخواہ کئی ماہ سے نہیں ملی۔ میں کیا کر دوں۔ سو جناب اس طرح کام نہیں ہو سکتا۔ آج میرا حساب بیباق کر دیجئے۔ ورنہ ایمان کی بات ہے کہ بندہ قلم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

نسیم: نہیں بھئی، ایسا ظلم نہ کرنا۔ انشاء اللہ کل ہی بنک سے روپیہ نکلوا کر کوڑی کوڑی ادا کر دوں گا۔ مگر تم کام تو شروع کر دو۔

انوار: دیکھئے، آپ کی آج کل کب ختم ہوتی ہے۔ ہر روز بنک سے روپیہ نکالنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ خدا جانے کچھ صبح پہنچی ہے بھی یا نہیں۔

نسیم: لو اب جاؤ، بسم اللہ کر کے کام شروع کر دو۔

انوار: اچھا فی الحال چار پانچ آنے ہی دیدو۔ اس وقت کے لئے تو آٹا دال گھر پہنچا دوں۔ ورنہ سب بھوکے مر جائیں گے۔

نسیم: ذرا ٹھیرو، میں گھر میں دریافت کرتا ہوں، شاید کچھ باسی روٹی پڑی ہو۔ اس وقت اتفاق سے میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ ضرور دیدیتا ــــ اور ہاں لو، یہ رائل سینما کا پاس ہے میرے نام آیا تھا۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ تم اور ایڈیٹر صاحب چلے جانا۔ دو آدمی جاسکتے ہیں۔ تکلیف نہ ہو تو چھوٹے میاں کو ساتھ لے جانا۔ بچہ ہے، خوش ہوجائیگا۔"

(کاتب چلا جاتا ہے)

سہیل: پھر جلدی بتائیے۔ کیا کرنا چاہئے۔ آپ کی تجویز کے مطابق بھی دو صفحے بڑھ جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس چیز کو کم کردیں؟"

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

نسیم: ہلو ــــ جی ہاں ــــ کیا ــــ کیا فرمایا ــــ اسی دفعہ ــــ بہت بہتر ــــ جی ــــ ضرور ــــ مجھے خیال ہے ــــ جی ہاں ــــ (ایڈیٹر سے) بڑی مشکل ہے۔ چچا فیاض کہتے ہیں کہ خطاب کے سلسلہ میں میرا فوٹو بھی شائع کیا جائے۔ اور مختصر سوانح حیات بھی۔ اگر ان کے کہنے کے مطابق نہ کیا گیا تو بگڑ جائیں گے۔ مگر فوٹو اور پھر اُسکا بلاک۔ کئی دن لگ جائیں گے ــــــــ

ــــــــ عجب خر دماغ آدمی ہیں۔ ہرچند میں نے کہا کہ اگلے نمبر میں شائع کردیں گے مگر مصر ہیں کہ اس مرتبہ ہو۔ خواہ تاخیر ہو جائے۔ قرضداری کی دھونس بہت بُری ہے۔ ورنہ میں شذرات میں صاف لکھدیتا کہ قوم کیساتھ غداری کرنے کے صلے میں یہ خطاب ملا ہے۔"

سہیل: یہ درست ہے۔ مگر جو کام آپ کے بس کا نہیں، اس کا تذکرہ بھی فضول ہے۔ بہت جلد فیصلہ انقطاعی کیجئے کہ صورتِ حالات کیا رہے؟"

نسیم: (کچھ دیر سوچکر) "ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا ہے کہ دوگنی ضخامت کا پرچہ اس دفعہ شائع کردیا جائے اور اگلے ہفتہ معاملہ گول رہے؟"

سہیل: بیشک اگر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ مشترکہ اشاعت کی صورت میں ہر اشتہار صرف ایک ہی مرتبہ چھپے گا۔ اور اس لئے آمدنی کم ہوگی۔ درانحالیکہ منافع کا اصل دارومدار صرف اسی مد پر ہے"

نسیم: نہیں یہ معقول بات نہیں۔ ہم ہر اشتہار کو دو مختلف مقامات پر شائع کرکے دوگنی اُجرت وصول کرلیں گے۔ دوگنی نہ سہی، ڈیوڑھی ضرور مل جائیگی"

سہیل: اچھا اب یہ دیکھئے کہ کاغذ بحالت موجودہ بھی ناکافی ہے۔ بہت کچھ خوشامد کرانے کے بعد گلزاری مل کا غذی نے صرف سات ریم دئے ہیں۔ ہر مرتبہ آٹھ ریم کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیر ــــ معمولی کمی کو تو پورا کیا جاسکتا ہے۔ مگر آپ کی تجویز کے مطابق ضخامت کو دوگنا کر دیا جائے تو موجودہ ریم کی فراہمی مشکل ہے"

نسیم: آمدنی میں کسی عنوان اضافہ نہیں ہوتا۔ اب مستقل خریداروں کی تعداد کسقدر ہے؟"

سہیل: بالکل برائے نام بمشکل پچاس ساٹھ ہوں گے۔ جن میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنہیں نصف چندہ کی رعایت دے رکھی ہے۔ ایجنٹ صاحبان کا یہ حال ہے کہ بڑے تقاضوں کے بعد چھٹے چھ مہینے صرف حساب کرتے ہیں۔ رقم پھر بھی نہیں بھیجتے۔ کم و بیش ڈھائی سو کا پرچہ مفت خوروں کے نام جاتی ہیں اور اس طرح ڈیڑھ سو فی صدی کا نقصان رہتا ہے کیونکہ ٹکٹ بھی اپنی گرہ سے لگانے پڑتے ہیں"

نسیم: خیر صاحب! کچھ بھی ہو۔ اس دفعہ دوگنی ضخامت کا پرچہ شائع کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ واقعات مجبور کر رہے ہیں،

میں ابھی گھر جاکر بیگم صاحبہ کی طلائی چوڑیاں لاتا ہوں۔ کسی مہاجن کے پاس رہن رکھکر کچھ روپیہ نکلوا لیا جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔"

(اٹھکر جانے کی تیاری کرتا ہے کہ اتنے میں چپڑاسی تار لئے داخل ہوتا ہے۔)

نسیم۔ (تار کو لیتے ہوئے) "دیکھئے ایڈیٹر صاحب! اس دفعہ لاٹری میں اول انعام میرے نام نکلا ہے۔ یہ اسی کی خوشخبری ہے۔ بس اب روپے کی ریل پیل ہو جائے گی اور اخبار نہایت شان کیساتھ شائع ہوا کریگا۔"

سہیل۔ "تب تو مجھے بھی امید کرنی چاہیئے کہ گذشتہ تنخواہوں کی تمام رقم بہت جلد مل جائے گی۔"

نسیم۔ "یقیناً۔"

(تار کا لفافہ کھولکر پڑھتا ہے۔ چہرے کی رنگت تبدیل ہوتی ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔)

سہیل۔ "خیر تو ہے۔ آپ مغموم کیوں ہو گئے؟"

نسیم۔ "آہ ایڈیٹر صاحب! ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال۔ تار میرے گاؤں سے آیا ہے۔ قبلہ والد بزرگوار کے انتقال کی خبر درج ہے۔"

سہیل۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

نسیم۔ "مجھے آج ہی رات کی گاڑی سے روانہ ہو جانا چاہیئے تاکہ کم از کم فاتحہ میں ضرور شریک ہو جاؤں۔"

سہیل۔ "بہت مناسب ہے۔ لیکن روانگی سے قبل یہ بتا جایئے کہ اخبار کی ضخامت کتنی ہو۔ اور کون کون سے مضامین شائع کئے جائیں۔"

نسیم۔ (کچھ دیر سوچکر) "تمام مضامین کو نذر آتش کر دو۔ فاتحہ سے فارغ ہوکر واپس آنے کے بعد میں کچھ تدبیر سوچونگا کہ کسی طرح تھوڑے بہت روپے کا انتظام ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے والد مرحوم کی یادگار میں ایک خاص نمبر شائع کر دوں۔ اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اسے بند کر دوں۔ نقصان کی صورت میں اسے چلانا مشکل ہے۔ یہ سامنے کی دیوار پر میرے والد کے تین مختلف فوٹو آویزاں ہیں۔ فی الحال تم ان کے بلاک بنوانے شروع کر دو۔ مرحوم کی حیات سے متعلق مضامین بعد میں جمع ہوتے رہیں گے۔ خواہ ایک سال لگ جائے اور کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف ہو جائے مجھے پرواہ نہیں۔ ایک نوجوان جرنلسٹ بیٹے کی طرف سے مرحوم باپ کی روح کو آخری خراج صرف اسطرح دیا جاسکتا ہے کہ وہ اسکی یادگار میں اپنا آخری خاص نمبر شائع کر دے اور بس۔"

(پردہ)

فضل حق قریشی دہلوی

پروفیسر منصور

بیداری کا خواب

پروفیسر منصور اپنی سائنس کی معلومات کی بنا پر اوق سے اوق مسئلہ کو اس طرح حل کر دیتے ہیں کہ اس میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ گذشتہ سال ہم دونوں نے تینوں موسم مسٹر ارسلان نصرتی کی کوٹھی پر گذارے۔ موسم برشگال میں عجیب اتفاق ہوا یعنی بقول ملازمین کوٹھی پر بھوتوں کا قبضہ ہو گیا۔ جمن باورچی کا بیان تھا کہ وہ رات کو سویا اور بارہ بجے کے قریب اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سینہ پر سوار ہے اور اُس کا دم گھٹ رہا ہے، اس لئے آنکھ کھول کر دیکھا تو اُس کے سینہ پر ایک سیاہ فام لنگوٹ بند سوار ہے جس کے سفید سفید دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ جمن نے چلّانے کی کوشش کی تو بھوت نے گلا دبایا۔ دوسرے دن شبراتی بہشتی نے بھی تائید کی۔ اُسی سیاہ فام لنگوٹ بند نے اُس کا بھی گلا دبایا تھا۔ یکے بعد دیگرے بھوت نے ایک ایک رات میں دو دو اور تین تین کو دبانا شروع کیا۔ کلو خدمتگار، عبدل مشعلچی، سنتو مالی، غرضکہ کوئی بھی نہ بچ سکا۔ عملے کا عملہ یہی کہتا کہ کوٹھی پر جنات یا بھوتوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ لیکن ان بھوتوں کا عمل دخل ابھی صرف شاگرد پیشہ ہی تک محدود تھا۔ ہم سب ان واقعات کو نوکروں کی جہالت پر محمول کر رہے تھے کہ خود صاحب خانہ کی دختر نیک اختر مس ماہ طلعت آرسلان ایک تاریک شب میں ایک بجے کے قریب اس زور سے چیخیں کہ ہم سب بیدار ہو گئے اور مس ماہ طلعت کا کمرہ اچھا خاصہ انکوائری آفس بن گیا۔ ان کا بیان بھی نوکروں کے بیان سے موافقت رکھتا تھا۔ جمن اور شبراتی نے خوب خوب مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ مسٹر ارسلان نے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیوں منصور یہ کیا معاملہ ہے؟ ——— کچھ سمجھ میں بھی آتا ہے؟"

"آپ کے نوکروں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ———" منصور نے جواب دیا۔

مس ماہ طلعت، بال پریشان، شانوں پر بکھرے ہوئے، سر برہنہ، شب خوابی کے لباس میں توبہ شکن انداز سے سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ سب اُن کو دیکھ رہے تھے۔ منصور کے ڈر کی وجہ سے علانیہ نہیں تو کن انکھیوں سے میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ منصور صاحب بھی ماہ طلعت کے واسطے اپنے دل میں جذبات کا ایک دفینہ لئے ہوئے ان کو دیکھ رہے تھے۔ کہ مسٹر ارسلان آہستہ سے بولے۔

"لیکن ماہ طلعت تو ابھی تک لرز رہی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی خوفناک منظر دیکھا ہے۔ دیکھو زرد پڑ گئی۔ سانس رُک رُک کر آ رہی ہے۔" واقعی اُس کے تنفس کے اُتار چڑھاؤ نے سینہ کے تموج میں ایک خاص کشش پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس سے محظوظ ہونا بھائی منصور ہی کا حصہ تھا۔

ارسلان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"کیوں منصور ———؟" پھر میری طرف مخاطب ہو گئے "آخر اس کی اصلیت کیا ہے؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا "میں منصور صاحب کی تائید کرتا ہوں۔ واقعی یہ آپ کے نوکروں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے، انکا بیان کردہ قصہ مس ماہ طلعت کے ذہن نشیں ہو گیا اور نیند یا حالت غیر شعوری میں ایک مہیب خواب کی شکل میں ظاہر ہوا۔"

میرا جملہ ختم ہوتے پر پروفیسر منصور میری طرف لپکے میں تو یہی سمجھا کر شاید جذبہ رقابت میں دیا ایک ہاتھ لیکن آپ انگلی اُٹھا کر کہنے لگے "بالکل صحیح ــــــــ یہی میرا بھی خیال ہے"

جملہ کافی ہو چکا تھا۔ لہٰذا شبراتی کی ماں کے اس جملے پر "حضور ابھی چھوٹی بی بی کی عمر ہی کیا ہے مشکل سے چودہ پندرہ برس کی ہوں گی ــــ لیکن بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ اکیلے کمرے میں سوتی ہیں ــ" یہ ایمرجنسی کانفرنس ختم ہوئی۔

دوسرے دن ارسلان بیگم ارسلان اور ہم لوگوں کو بھی بقول ملازمین بھوت نے دبایا۔ ہم لوگوں نے بھوت تو دیکھا نہیں لیکن دم گھٹتا ہوا ضرور معلوم ہوا۔ صبح کو باغ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہم لوگوں کے علاوہ جمن، شبراتی، کلو، عبدل اور ستو مالی نے بھی شرکت کی۔ ملازمین کی طرف سے ریزولیوشن پیش ہوا کہ کوٹھی خالی کر دینا زیادہ انسب ہے۔ لیکن منصور صاحب، میں، ارسلان اور دیگر شرکا تحفی لعنت کر رہے تھے، لہٰذا قرارداد کثرت آراء سے نامنظور ہوئی اور مسترد کر دی گئی۔ بیگم ارسلان نے ایک تجویز پیش کی کہ پروفیسر منصور ماہر سائنس ہیں لہٰذا اپنے تجربوں سے اس کوٹھی کو ان بلایات سے پاک کریں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہ تھا لہٰذا تجویز منظور ہو گئی اور پروفیسر منصور کو حکم دیدیا گیا کہ اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ رپورٹ کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ ایک ہفتہ میں رپورٹ مرتب ہو گئی اور ایک خنک رات کو جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کھانے کے بعد رپورٹ سنا دی گئی اور سب کے شکوک رفع ہو گئے۔

واضح رہے کہ رپورٹ سنانے سے دو تین روز قبل ہی سے بھوتوں کی سرگرمیاں کم ہو چکی تھیں جس کے متعلق جمن اور شبراتی نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ سب کرامات سبز پوش شاہ صاحب کی ہے جو کوٹھی دیکھنے آئے تھے۔ اور کوٹھی کے ہر حصہ کو پڑھی ہوئی کیلیں ٹھونک کر پاک کر دیا تھا۔ ملازمین نے تعویذ لیکر کچھ نذرانہ بھی دیا تھا بلکہ خود بیگم ارسلان بھی ایک "حقیر رقم" بطور ہدیہ پیش کرنے والی تھیں، لیکن اُسی روز پروفیسر منصور نے شاہ صاحب کو پانچ چھ ہاتھ رسید کر دئے اور وہ بیچارے بغیر رقم لئے نو دو گیارہ ہو گئے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جمن اور شبراتی نے شاہ صاحب کو واقعات سے مطلع کیا، وہ آئے اور مس ماہ طلعت پر نظر پڑتے ہی سمجھ گئے کہ ضرور کوئی جن اس خوبصورت دوشیزہ پر عاشق ہو گیا ہے، اور یہ سب شرارت اُسی کی ہے۔ کوٹھی کیلنے کے بعد آپ نے تجویز کیا کہ جمعرات کے روز مس ماہ طلعت کو غسل دینے کے بعد صاف لباس پہنایا جائے اور خوشبو لگا کر مزار پر جہاں حضرت شاہ صاحب رہتے ہیں بھیجدیا جائے تاکہ وہ جن کو اُتار دیں۔ کیونکہ شاہ صاحب کے قبضہ میں جن اور موکل دونوں تھے اور غالباً اسی وجہ سے وہ پہلی ہی نظر میں تاڑ گئے تھے کہ جو کچھ قصہ ہے اُسی لڑکی کا ہے۔ لیکن مس ماہ طلعت نے شاید منصور صاحب سے کہدیا، حالانکہ وہ مجھے ایسی باتوں کی ہوا تک نہیں دیتے ہیں ــــ لیکن واقعہ یہی تھا ــــ خیر پروفیسر منصور کی رپورٹ پڑھکر سب کو سنائی گئی ملاحظہ ہو۔

"عجیب و غریب واقعات کے ظہور سے قبل مسٹر ارسلان کے باورچی خانہ میں جو آٹا استعمال ہوتا تھا وہ مقامی چکیوں کا پسا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ ہول مل (۹) کا آٹا آیا جو قدرتے ثقیل ہوتا ہے، اس تبدیلی کو معدہ قبول نہ کر سکا اور رفتہ رفتہ کھانے والوں نے پیٹ میں گرانی محسوس کی۔ لیکن اس کو کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی کیونکہ موسم برشکال میر

اکثر سوءِ ہضمی کی شکایت ہو جایا کرتی ہے۔ غذا تحلیل نہ ہونے کی وجہ سے معدے میں انجرات پیدا ہوتے ہیں اور گردشِ خون کے ساتھ دوسرے اعضا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھیپھڑے زیادہ عرصہ تک اس بار کو نہ برداشت کر سکے کچھ عرصہ بعد غیر معمولی محنت سے تھک گئے اور سانس رُکنے لگی —— دماغ کا کام ہر وقت خیالات کو وجود میں لانا ہے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ انسان کبھی خالی الذہن نہیں رہتا اور نیند کا غلبہ ہوتے ہی خوابوں کی دُنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ یہی قصّہ یہاں بھی ہوا تنفس میں رُکاوٹ پیدا ہوتے ہی دم گھٹنے لگا، اور دماغ نے فوراً کسی گذشتہ واقعہ کی تشکیل کر دی۔ واقعہ سے مُراد کوئی قصّہ، افسانہ، حادثہ یا خبر۔ اس کوٹھی میں بھوتوں کا چرچا شاگرد پیشہ سے شروع ہوا۔ ان جاہلوں کے نزدیک بھوت اور اسی قسم کی چیزیں مادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب معدے کی خرابی سے ان کے نظامِ تنفس میں فرق واقع ہوا اور دم گھٹا تو فوراً وہ خیال جو ایسے وقت میں ان لوگوں کے ذہن میں آنا چاہیئے خواب کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن یہ سب تبدیلیاں اور واقعات نیند یا حالتِ غیر شعوری میں واقع ہوئے ۔"

دلیل اس وجہ معقول تھی کہ ماسوا حسن و شبراتی سنتو مالی تک قائل ہو گیا کیونکہ اُس کو بھی باورچی خانہ سے اُٹھا تھا ایسا ہی ایک واقعہ ابھی حال میں پیش آیا۔ پروفیسر منصور حسبِ معمول تفریح کو گئے ہوئے تھے۔ میں کسی ضروری کام سے جامعہ کے دار الکتب تک گیا تھا۔ وہاں سے واپس آرہا تھا۔ دیکھا کہ آپ پُل پر کھڑے دریا کی لہروں پر نظریں جمائے کسی گہرے خیال میں مستغرق ہیں۔ انہماک کا یہ عالم تھا کہ میں پاس جا کر کھڑا ہو گیا لیکن آپ قطعی نہ متوجہ ہوئے۔ میں نے آہستہ سے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "مولانا! کس خواب کی تعبیر سوچ رہے ہو! ؟"

جب سے آپ نے خواب اور اسکی تعبیر کا نظریہ بیان کیا ہے اس وقت سے آج تک مس ماہ طلعت کم و بیش دو ہزار خوابوں کی تعبیر دریافت کر چکی ہیں اور آپ مس موصوفہ کو بتاتے بھی خوب ہیں۔ اگر میں اسقدر تعبیریں پوچھوں تو واللہ برس پڑیں۔ خیر، میرے یکایک آجانے سے پروفیسر منصور کچھ متحیر سے ہو گئے اور پھر مُسکرا کر بولے۔

"کیا لکچر سے واپس آ رہے ہو! ؟"

جب تک آپ زیرِ بحث مسئلہ کے کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچیں اسکو نظر انداز کر دینا آپ کی فطرت میں داخل ہے اور اسی لئے اس وقت خواب اور اس کی تعبیر کی بحث پسِ پشت ڈالنے کی ناکام کوشش کی لیکن میں کب موقع دینے والا۔ فوراً بول اُٹھا "کیا آپ دریا کی لہروں پر نظریں جما کر کسی مہیب خواب کو بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں —؟"

پروفیسر منصور نے اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"اس میں شک نہیں کہ دریا اور سمندر کی لہروں پر نظریں جمانا نسیان میں اضافہ کرتا ہے"

وہ پھر خواب اور تعبیر کی بحث سے کترا رہے تھے۔ میں نے کہا "بہر حال آپ اپنا خواب مجھ سے تو بیان کیجئے کم از کم میں بھی تو سُنوں کہ ایک ماہرِ خواب کے خواب کی کیا حقیقت ہوتی ہے، اور پھر آپ کے رپورٹ والے نظریہ پر غور کروں"

"اچھا تو کیا واقعی میرا خواب سُنو گے؟" منصور صاحب نے فہمائشانہ انداز میں کہا۔

میں نے زوردار لہجے میں کہا "ضرور ——"

کہنے لگے "آج شام کو ــــ آج ہمارے یہاں مس جمشیدہ افراسیاب بھی ہوں گی ــ"

"تمہاری مس جمشیدہ افراسیاب" ایک خاص انداز میں کہا۔ اور مجھے ترچھی نظروں سے دیکھ کر مسکرانے بیٹی نے گردن ہلا کر ابو بھائی ــ تم نہ کہو گے تو کیا تمہارے ہونے والے لڑکے یا ــ"

میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ آپ مطلب سمجھ گئے اور بات کاٹ دی "آج کھانے پر ماہ طلعت، مس افراسیاب اور مسز سلاں وغیرہ سب ہوں گی"

منصور صاحب کی عادت ہے کہ کسی لڑکی کا نام بغیر لفظ مس کا اضافہ کئے نہیں لیتے ہیں۔ لیکن مس ماہ طلعت ارسلاں پ صرف ماہ طلعت یا طلعت ہی کہتے ہیں۔ اور اس کا سبب بھی بس آپ ہی سمجھتے ہیں۔ میرے اعتراض کا اُن کے پاس صرف یہ جواب ہے "تم مس جمشیدہ افراسیاب کو صرف "جمشید" کیوں کہتے ہو؟"

رات کو کھانے کے کمرے میں شوربے کی پیالی اور پروفیسر منصور کے دلچسپ خواب سے کھانے کی ابتدا ہوئی۔ میز کے دون طرف مغربی تمدن کے دلدادہ مشرقی مہ جبینوں کو لئے بیٹھے تھے۔ میرے داہنی جانب جمشیدہ اور اُس کے بعد مسز ارسلاں یں۔ بائیں طرف پروفیسر منصور اور اُن کے برابر مس ماہ طلعت۔ سامنے خاقان، حارث اور ارسلاں بیٹھے ہوئے تھے، اور ہنے بائیں دو ایک جگری دوست، مزیدار کھانے کے ساتھ دلچسپ خواب عجب لطف دے رہا تھا میں نے گوشت کے بھنے تے سُرخ ٹکڑے کو کانٹے میں نتھی کیا اور پروفیسر منصور نے اپنے خواب کی تمہید شروع کی۔

"عروسِ فطرت سے ہم آغوشی کی تمنا نے مجھے ایک عالیشان عمارت میں پہونچا دیا۔ عمارت کی خستہ حالی اور خزاں دچمن کی تباہی سے پریشان ہو کر میں ایک وسیع ہال میں گھس گیا۔ جہاں ایک گروہ بیٹھا ہوا عظمت ماضی کی خوبصورت صویر سے اپنا دل بہلا رہا تھا۔ ان میں سے کوئی میری طرف نہ متوجہ ہوتا تھا۔ حالانکہ اسی وسیع ہال کے دوسرے گروہ ارتقائی ازل طے کرنے میں اُن سے سبقت لئے ہوئے تھے۔

جس وقت میں وسیع ہال میں داخل ہوا، رات کا وقت تھا لیکن کوئی بھیرویں گا رہا تھا تو کوئی آساوری اڑا رہا تھا، ئی کھماچ میں یکتا نظر آرہا تھا تو کوئی دادرہ اور ٹھمری پھاترا رہا تھا۔ یہ لوگ اسی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ایک ہی جگہ ہارمونیم اور لو کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ طبلہ اور ڈھولک بیلا اور سرنگی کے دوش بدوش بج رہے تھے۔ گروہ کا ہر فرد اپنی تان لے آگے دوسرے کی موسیقیت کو ہیچ سمجھ رہا تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ وہی نکل رہا تھا جو نکلنا چاہیئے۔ یعنی سب بے ہنگام تانیں ہ کانوں کو اچھی معلوم ہونے کے بجائے ناگوار معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک گوشہ میں کچھ لوگ سرگوشیوں میں منہمک تھے بعض وقت رگوشیاں ہوتے ہوتے ہاتھا پائی تک نوبت پہونچ جاتی تھی۔

اس وسیع ہال کی زبوں حالی اور خانہ جنگی نے وہ شور مچا رکھا تھا کہ کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی، اسی حالت میں ـ شخص بڑی آن بان سے داخل ہوا۔ وہ جوان تھا یا پیر یہ تو میں آج تک نہ سمجھ سکا، اور نہ اُس کے لباس سے اندازہ لگا سکا بس قوم کا فرد ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوا کہ اس کا نام "زمانہ" ہے۔ اُسکی گفتگو میں سحر تھا جس سے کلام کیا وہ بدل گیا لیکن اس والعزم گروہ نے جسکی پیشانی پر پریشان عظمت جھلک رہی تھی کچھ اثر نہ لیا۔ زمانہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اُس نے ایک

عجیب قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم سب خود اُس واقعہ کو بچشم خود دیکھ رہے ہیں۔

نجمہ کے پیدا ہوتے ہی اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے چچا کے گھر میں اپنے چچا کے لڑکے ممتاز کے ساتھ پرورش پائی جو اُس سے عمر میں تین سال بڑا تھا۔ بچپن میں دونوں مدرسے میں تعلیم پاتے رہے، کچھ دنوں بعد ممتاز اسکول میں داخل ہو گیا اور نجمہ زنانے مدرسے میں بھیجدی گئی۔ جماعتوں میں ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں محبت کے مدارج بھی طے کرتے رہے۔

اب ممتاز کالج پہونچ کر جوان ہو گیا تھا۔ بازوؤں کی گول اور ملائم مچھلیاں سخت اور سڈول ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں قوتِ جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور سفید ڈھیلوں میں سُرخی کی جھلک آگئی تھی۔ روئی کے گالوں کی طرح ملائم رُخساروں پر سبزہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ ممتاز اب ایک خوشرو جوان اور مردانہ حُسن کا بہترین نمونہ تھا اُس میں صنفِ لطیف کو خود میں جذب کرنے کی کشش پیدا ہو چکی تھی۔

نجمہ بھی انٹرنس کی جماعت میں تھی اور زندگی کی پندرہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ دُنیا کے گرم و سرد موسموں نے اسکا رنگ نکھار دیا تھا۔ معصوم آنکھوں میں شرم و حیا کی جھلک آگئی تھی اب وہ نشیلی تھیں۔ لبوں کا گلابی رنگ بالکل سُرخ ہو چکا تھا۔ نسائیت کے ساتھ ساتھ اس میں وہ لچک آگئی تھی جو تارک الدنیا عابد پر بھی جنّت کی حقیقت کا انکشاف کر دے۔ قد بھی ایسا تھا جو برسوں جوانوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتا رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا کی رنگینیاں سمٹ کر نجمہ کے پیکر میں آگئی ہیں۔ ممتاز نجمہ کو اور نجمہ ممتاز کو دیکھتے۔ لیکن ایک حجاب تھا۔ جو مانع تھا۔ نظریں ملتے ہی نیچی ہو جاتیں۔ بچپن کی اُلفت کے نقوش اُبھر کر محبت کے گل بُوٹے بن گئے تھے۔ جب گفتگو ہوتی دونوں پوشیدہ برقی لہروں سے متاثر ہو کر کسی خاص موضوع پر پہونچ کر خاموش ہو جاتے۔

نجمہ ایک زنانہ کالج میں داخل ہو گئی اور ممتاز حصولِ تعلیم کے لئے مغربی ممالک کی طرف بھیجدیا گیا۔ یہ چار سال کا عرصہ ممتاز اور نجمہ نے ایک دوسرے کی یاد میں خواہ کسی طرح بسر کیا ہو۔ لیکن دُنیا کے دیکھتے دیکھتے پلک جھپکتے گذر گیا اور ممتاز کامیاب واپس ہوا۔ وہ اب کچھ کا کچھ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے مستی ٹپک رہی تھی۔ چہرہ جوشِ شباب سے سُرخ و سپید ہو رہا تھا۔ مغربی ممالک کی سرد ہوا نے ہاتھ پیر قوی کر دئے تھے۔ چال میں عجیب متوالا پن تھا۔ عورت تو عورت مرد بھی اُس سے ہم کلام ہو کر ایک گونہ مسرت محسوس کرتے تھے۔

اوہر نجمہ کی بھی دُنیا بدل چکی تھی۔ بال بڑھ کر کمر تک آگئے تھے۔ کُشادہ پیشانی پر پسینہ کے قطرے کچھ اس طرح چمکتے تھے کہ گھر والے نگاہ بھر کر نہ دیکھتے تھے۔ آنکھوں میں ایک سحر تھا جو خود صنفِ لطیف کو موہ لینے کو کافی تھا۔ اس پر مستزاد دوشیزگی کی شان۔ اس کی ہر ہر جنبش میں مستی کچھ اس طرح نمایاں تھی کہ خود نجمہ اپنا سراپا گھنٹوں آئینہ میں دیکھا کرتی۔ اور اس محویت میں اسکا حُسن اور بھی دوبالا ہو جاتا۔

نجمہ اور ممتاز کی محبت سے سب واقف تھے۔ ممتاز کے والدین کے لئے بھی ممتاز کے لئے نجمہ اور نجمہ کے لئے ممتاز سے بڑھکر کوئی رشتہ نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا طے ہو گیا کہ دونوں ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دئے جائیں۔ شادی سے ایک

بل نجمہ کو موسمی بخار کی شکایت ہوئی اور وہ ایک روز میں رفع ہو گئی۔ اسی درمیان میں ممتاز کے والد کے مرشد بھی آ گئے۔ آپ کا
مریدان باستعداد وسیع تھا کہ دس سال بعد اس طرف کا رخ کیا تھا۔ شاہ صاحب سے پردہ کیسا۔ آپ دندناتے زنانخانے میں
آ گئے۔ نجمہ بالکل تندرست ہو چکی تھی صرف کمزوری کی شکایت تھی۔ شاہ صاحب کی نظر جو نجمہ پر پڑی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
پہنچے ہوئے بزرگ۔ اسوقت تو خاموش ہو رہے لیکن دوسرے وقت کہہ ہی دیا کہ نجمہ پر ایک سرکش جن کا سایہ ہے۔ تدارک
جلد ہونا چاہیئے اور اسکی بھی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حاضرات کی جائے۔

ممتاز کے والدین شاہ صاحب کے معتقد تھے۔ راضی ہو گئے۔ جمعرات کے روز دوپہر کے وقت نجمہ کو شاہ صاحب
مخصوص کمرہ میں نہلا دھلا کر اور صاف پوشاک پہنا کر بھیج دیا گیا۔

نجمہ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال تھی۔ وہ ایسی باتوں کی سخت مخالف تھی لیکن گھر والوں سے مجبور تھی۔ تاہم اس نے ارادہ کر لیا
شاہ صاحب مجھ پر سے جن اتار رہے ہیں تو میں بھی ان پر سے شیطان اتار دوں گی۔ نجمہ جس وقت شاہ صاحب کے کمرہ میں
ہی تو آپ تسبیح ہاتھ میں لئے چہل قدمی کر رہے تھے۔ نجمہ کے پہونچتے ہی آپ چٹائی پر بیٹھ گئے اور نجمہ کو پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اس نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا "آپ بزرگوں کے سامنے میں پلنگ پر نہ بیٹھوں گی"

شاہ صاحب نے تسبیح کا ہاتھ اپنی ریش مبارک پر پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی یہ سب درست ہے لیکن اللہ جمیل یحب الجمال ۔
ہماری کیا حقیقت ہے ـــــ خیر تمہارے کہنے سے میں بھی آیا جاتا ہوں ـــــ"

شاہ صاحب کا رویہ دیکھکر نجمہ کھڑی ہو گئی۔ لیکن شاہ صاحب بھی پہونچے ہوتے تھے پلنگ پر بیٹھنے کے بجائے تسبیح کے
دانے شمار کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے پھر دروازے پر آ کر نجمہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور
واپس چلے گئے۔ آپ کی پریڈ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہی اور جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا کہ مکان کے اس حصہ میں کوئی
نہیں ہے اور نہ کسی کے آنے کا امکان ہے تو کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن نجمہ کو شیشہ میں اتارنے کے لئے مزید کمرے کے اندر ٹہلتے
رہے پھر مخاطب ہو کر بولے "میں ابھی وظیفہ ختم کئے لیتا ہوں ـــــ بیٹی! تصوف کے رازوں کا سمجھنا آسان کام نہیں" آپ پلنگ
کے بالکل قریب آ گئے "بڑے بڑے بزرگ مخدوموں کے آستانوں پر ناک رگڑتے رگڑتے مر گئے لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا ـــــ مجھے
کچھ بھی دیکھتی ہو۔ یہ سب فیض بس ـــــ سرکار کا ہے ـــــ"

نجمہ نے کہا "لیکن آپ نے پردے کیوں کھینچ دئے میرا دم گھٹتا ہے" وہ کھڑی ہو گئی لیکن شاہ صاحب نے اسکے
شانے پکڑ کر پھر پلنگ پر بٹھا دیا۔ نجمہ کو شاہ صاحب کی آنکھوں میں شیطنت چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ پھر کھڑی ہوئی لیکن شاہ صاحب
نظریں ملتے ہی پیروں کو ارتعاش ہوا اور وہ بیٹھ گئی۔

شاہ صاحب نجمہ کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے اور پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ نجمہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ لیکن شاہ صاحب نے
ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے جھٹکا دیا اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس سے قبل شاہ صاحب اسکو اپنی آغوش میں لے چکے تھے۔ نجمہ نے
چیخنے کی کوشش کی تو شاہ صاحب نے اس کا منہ دبا دیا۔ اس دھینگا مشتی میں پانی سے بھری ہوئی بدھنی گری، حقہ کی چلم ٹوٹی اور اسی
کشمکش میں نجمہ ایک بار آزاد ہو گئی اور دروازے کی طرف بھاگی، وحشت کی وجہ سے اس کے منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی۔ شاہ صاحب

نے دوڑ کر اس کو پھر پکڑ لیا اور گود میں اُٹھا کر پلنگ پر گرا دیا۔ نجمہ کا دوپٹہ سر سے اُتر چکا تھا۔ گھبراہٹ میں شاہ صاحب کی ڈاڑھی اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ اُس نے پوری طاقت سے کھینچا اور شاہ صاحب کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی ایک ایسی لات رسید کی کہ آپ پلنگ سے نیچے گر پڑے۔ وہ پھر اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ شاہ صاحب بھی ان بزرگوں میں نہ تھے جو ایک ہی لات میں خاموش ہو جاتے اس کے پیچھے دوڑے اور قریب تھا کہ نجمہ کو پکڑ لیں یکایک پشت کی کھڑکی کھلی اور آنے والے کو پہچاننے سے قبل پستول کا فیر ہوا۔ اور گرنے کے ساتھ کسی کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔

نجمہ نے حواس دُرست کرتے ہوئے قاتل کی طرف دیکھا ممتاز ہاتھ میں پستول لئے کھڑا تھا جس کی نال سے اب تک دُھوئیں کے باریک لچھے نکل رہے تھے۔ وہ دوڑ کر ممتاز سے لپٹ گئی۔ پستول کی آواز سے گھر کا گھر جمع ہو گیا۔ اور واقعات معلوم ہوتے ہی ایک کہرام مچ گیا۔ دو گھنٹہ بعد پولیس نے ممتاز کو شاہ صاحب کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اور لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی گئی۔ تمام شہر میں شُہرہ ہو چکا تھا۔ کہ ممتاز نے نجمہ کی عصمت بچانے کے لئے ایک شاہ صاحب کو پستول کا نشانہ بنا دیا۔ مقدمہ ہوا اور ممتاز کو سزائے موت کا حکم سُنا دیا گیا ـــــــ نجمہ کی حالت ـــــــ"

پروفیسر منصور یہیں تک اپنا خواب بیان کرنے پائے تھے کہ مس ماہ طلعت سے نہ رہا گیا۔ اور بے چین ہو کر بول اُٹھیں "تو کیا ممتاز غریب کو پھانسی ہو گئی ـــــــ؟ ہاہ! بُرا ہوا ـــــــ اکیا یہی تھا وہ آپ کا خوفناک خواب؟"

میں نے جواب دیا "خوفناک خواب یا بیداری کا خواب ـــــــ کیوں منصور صاحب؟ اور یہ کیوں نہ بتا دیا کہ ممتاز اپنے شہر کے مشہور سوداگر چرم کا اکلوتا لڑکا تھا جس کو ایک معصوم دوشیزہ کی عصمت بچانے کے لئے ایک بوالہوس پیر کے قتل کی پاداش میں سزائے موت کا حکم ہوا۔ اور جس کے لئے ملک کے طول و عرض میں عورتوں نے صدہا احتجاجی جلسے منعقد کئے اور کھڑک سنگھ کے بعد یہ دوسرا ہندوستانی تھا جس نے کسی عورت کی عصمت بچانے کی خاطر ایک خون کیا اور "سپریم کورٹ" سے بری ہو گیا۔"

مس جمشید افراسیاب کا چہرہ کھل گیا اور پوچھنے لگیں "پھر کیا ہوا؟"

پروفیسر منصور نے کافی کا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے کہا "ہوتا کیا جو ہونا تھا وہی ہوا۔ نجمہ اب ممتاز کے اکلوتے بچے کی ماں ہے۔"

میں نے پروفیسر منصور کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا "حضرت! ساڑھے آٹھ ہو چکے ـــــــ کچھ خبر بھی ہے۔ ـــــــ آج یونیورسل تھیٹریکل کمپنی اپنے مشرقی اسٹیج پر ایک مغربی ڈرامہ نویس کے گرجتے ہوئے قلم کی محشر خیزیاں پیش کرے گی یعنی "انقلاب کابل" نامی تماشہ کھیلے گی ـــــــ چلئے اُٹھئے ـــــــ اس میں ملائے شور بازار اور ایک غیر ملکی شاہ صاحب کے پارٹ قابل دید ہیں۔"

محبوب طرزی

جذباتِ مُضطر

لاکھ فرقت میں پائمال ہوں میں ‖ وہ اگر دیکھ لے نہال ہوں میں
کسی گم گشتہ کی مثال ہوں میں ‖ دل سے اُترا ہوا خیال ہوں میں
میری ہستی و نیستی ہی کیا ‖ دل میں رکھیئے تو اک خیال ہوں میں
ان کو بھی ہے نکالنا مشکل ‖ دل میں بیٹھا ہوا خیال ہوں میں
فخرِ مے خانہ تھا کبھی پہلے ‖ اب تو رندِ خراب حال ہوں میں
کیوں زمانہ مٹا رہا ہے مجھے ‖ رفتگاں کی مگر مثال ہوں میں
دردِ دُشمن سے بھی ہے بیتابی ‖ ہر کسی کا شریکِ حال ہوں میں
میرے دم ہیں شُمار کرنیکو ‖ نہ کوئی ماہ ہوں نہ سال ہوں میں
جاں فروشانہ زندگی گذری ‖ مرنے والونکی اک مثال ہوں میں
ٹوٹ جاتا ہے بات بات میں دل ‖ دیکھ کیسا شکستہ حال ہوں میں

کیوں جیا اس کے ہجر میں مضطر
غرق دریائے انفعال ہوں میں

مضطر دہلوی

نقد و تبصرہ

کارواں۔ لاہور۔ گذشتہ سال کارواں پروفیسر محمد دین تاثیر کی ادارت میں شائع ہوا تھا اور امسال جناب مجید ملک کی۔ مضامین اور تصاویر ہر دو لحاظ سے اسد فعہ کارواں پہلے سے بھی اچھا نکلا۔ جناب مجید ملک نے اچھے لکھنے والے زیادہ جمع نہیں کئے ہیں بلکہ اچھے لکھنے والوں کے اچھے مضامین کی کثرت نظر آتی ہے۔ مضامین میں بھی تنوع ہے۔ علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ عمدہ افسانے، ڈرامے، مکالمے، نظمیں اور غزلیں سبھی کچھ کارواں میں شامل ہیں۔ ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جو غالباً ذاتی تعلقات کی بنا پر شائع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً نیاز مندانِ لاہور کا مضمون، جناب سید امتیاز علی تاج کا مضمون "ہسپتال" یا جناب پطرس کی فارسی غزل، جسے محض "فرمودۂ پطرس" ہونے کی وجہ سے کارواں کے پورے ایک صفحہ پر شائع کیا گیا ہے۔ عمدہ چیز کو آب و تاب سے شائع کرنے میں کوئی حرج نہیں علامہ اقبال کا ایک شعر ہی کارواں کے لئے بانگِ درا کی حیثیت رکھتا ہے اور یقیناً اس لائق ہے کہ اُسے اُسی شان سے پیش کیا جائے جس طرح کہ کارواں کے لائق ایڈیٹر نے پیش کیا ہے۔ "سخنہائے گفتنی" میں مجید ملک صاحب نے یہ بات بڑے کام کی کہی کہ "کارواں کے کارکن توصیف و تعریض سے بے نیاز ہیں، اور بہرحال اپنا کام کرتے چلے جائیں گے" مگر افسوس اس بات کا ہے کہ نیاز مندانِ لاہور کا مضمون "یو۔ پی۔ کے تنقید نگاروں کی خدمت میں" شائع کر کے اُنہوں نے اپنی صحیح رائے اور صدائے ضمیر کا پاس نہیں کیا۔ اس "اجتماعِ ضدین" پر میں نہیں جانتا کہ یو۔ پی کے تنقید نگار کیا کہیں گے؛ چند اچھے خاصے ادیبوں کے جی میں خدا جانے کیا سمائی کہ نیاز مندانِ لاہور کے نام سے تنقیدیں لکھنے لگے۔ جس طرح بگڑا شاعر مرثیہ گو بنتا ہے اسی طرح بگڑا ادیب نقاد بنتا ہے۔ جن سے اور کچھ نہیں ہوتا وہ تنقیدیں لکھا کرتے ہیں۔ اسی زمرہ میں نیاز مندانِ لاہور کا بھی شمار ہے۔ چڑچڑاپن، مربیانہ انداز، طفلانہ تنقید یہ سب اختلاط کی نشانیاں ہیں؛ مگر میں فاضل نقاد کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خود بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ "نقاد" میں نے اس لئے کہا کہ یقیناً یہ تنقید ایک ہی شخص نے لکھی ہے۔ آج تک یہ کہیں نہیں دیکھا گیا کہ چار پانچ آدمیوں نے وقتِ واحد میں ایک ہی قلم سے کچھ لکھا ہو۔ یا اگر فی الحقیقت ایک گروہ نے یہ تنقید لکھی ہے تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں اتنی لغزشیں کیوں ہیں۔ تنقید کا لہجہ بھی سنجیدگی سے گرا ہوا اور دل آزارانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیوانے کو کسی نے چھیڑ دیا ہے اور وہ غصہ میں چیخیں مار رہا ہے۔ یو۔ پی والے اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر مجھے یقین ہے کہ زندہ دلانِ پنجاب بھی اِس بھونڈی گلے بازی پر بجائے واہ! واہ! کے آہ! آہ! کریں گے۔ یو۔ پی والوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ صرف زبان کے اعتراضات لکھتے ہیں۔ یو۔ پی کو تنقید نگار نے بھی مرکزِ اُردو تسلیم کیا ہے اور میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ یو۔ پی والے زبان کے اختصاصی ہیں اور اُنہیں حق حاصل ہے کہ وہ زبان کی اغلاط پر اعتراض کریں۔ آپ اسے تنگ نظری کہہ لیجئے مگر انصاف پسند طبیعتیں، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا ساتھ نہ دیں گی۔ علی گڈھ میگزین اور رسالہ جامعہ کے اعتراضات کا الزامی جواب دیا گیا ہے۔ ان دو پرچوں نے آپکی غلطیاں دکھائیں تو آپ نے جل کر اُن کی غلطیاں دکھا دیں۔ اس کو غالباً آپ نے بڑا ہنر سمجھا۔ پنجابی محاوروں کی بحث بہت لطیف ہے۔ جس کا نتیجہ ان "پنجاب کے نمائندوں" نے یہ نکالا ہے کہ چونکہ ہم اُردو کی خدمت یو۔ پی سے زیادہ کر رہے ہیں اس لئے ہمیں اس کا بھی

حق ہے کہ تھوڑی بہت غلط اُردو بھی بول لیا کریں۔ بولنے تک تو خیر یہ بات نہ بھی سکتی تھی مگر اوب میں یہ بے ادبی کیسے روا رکھی جاسکتی ہے؟ اپنی غلطی کو پوپکلر لینا کہ ہمیں تو پنجابی ڈھنگوں ہی کی زبان پسند ہے اور ہم تو یہی لکھیں گے؟ ایک ایسی لغزشِ خیال ہے جس پر صرف "نیاز مندانِ لاہور" ہی ناز کر سکتے ہیں۔ رہے پروفیسر تاثیر تو ان کے ایک مصرعہ کو اس لغویت کی سند میں پیش کرنا عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی بہترین مثال ہے۔ "تو نے اُلفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے" کے بھدے عیب کو دیکھکر جب نیاز مندان نے اُن سے کہا اس مصرعہ میں "تونے" کی بجائے "تجھکو" رکھدیجیے تو پروفیسر صاحب نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تونے" میں ترنم زیادہ ہے" ماشاء اللہ۔ یہ ترنم کی آپ کو خوب سوجھی۔ آپ بھول گئے اس "تونے" میں ترنم بھی ہے اور تاثیر بھی کیونکہ اس بدعت کے واسکوڈی گاما آپ ہی ہیں۔ علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری اس سعادت سے محروم ہے۔ اور غالباً آئندہ بھی یہ ترنم اُن کے کلام میں پیدا نہ ہوگا۔ صاحب بانگِ درا اور فردوسیِ اسلام بھی یو۔پی والوں کی طرح "اس حق سے محروم ہیں" اور آپ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہے ہیں کہ "مصدر کے ساتھ نے" استعمال کرنا تو میرا پنجابی حق ہے۔ یو۔پی کے حضرات اس حق سے محروم ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں ہوں اس بیکسی اور بے بسی کا کیا کہنا کہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا پنجابی ادیب بھی پروفیسر صاحب کا ساتھ نہیں دیتا۔ کارواں کے (۲۰۰) صفحے کے چیدہ چیدہ مضامین میں یہ ترنم کہیں اور سنائی نہیں دیتا۔ کارواں صرف پنجاب ہی کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا وہ پرچہ ہے جس پر اہلِ ہند فخر اور صحافتِ اُردو ناز کرتی ہے۔ اگر اس قسم کی دل آزاری اور ہٹ دھرمی سے اسکے صفحات بھی پاک نہ رکھے جائیں گے تو اس کی امتیازی شان میں (خدانخواستہ) فرق آنے کا اندیشہ ہے۔ کارپردازانِ کارواں نے اُردو صحافت کی لاج رکھ لی۔ لیکن کیا پنجاب اور یو۔پی کی بحث چھیڑ کر وہ اوروں کے لئے ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرنا پسند کریں گے؟

"اُردو ڈرامہ کی مفاہمتیں" — "کہ عالم دوبارہ نیست" جناب امتیاز علی تاج کے دو نہایت پاکیزہ مضامین کارواں میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون اُردو لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا ایک دلکش افسانہ ہے جس میں فراعنۂ مصر کی معاشرت خصوصاً تعیش کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ مجید ملک صاحب نے اِسے "الفاظ کی جادوگری" بجا طور پر موسوم کیا۔ "ہسپتال" کو اس کے پہلو بہ پہلو جگہ دینا اور شاید یہ سمجھکر کہ ادبِ لطیف کا نمونہ ہے غلطی ہے۔ جناب پطرس نے لاہور کا جغرافیہ SERIO - COMIC اسٹائل میں بہت خوب لکھا۔ ایک عرصہ کے بعد پطرس کے قلم نے اپنی پوری پوری جولانی دکھائی۔ "سیب کا درخت" شستہ و رفتہ ترجمہ ہے اور اس میں جملہ ادبی خوبیاں برقرار رکھی گئی ہیں۔ پطرس کے فارسی اشعار بُرے نہیں تاہم اس لائق بھی نہیں کہ انہیں کارواں جیسے معیاری پرچہ میں شائع کیا جائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون "کارواں پیداست" روکھا پھیکا رہا۔ خود مضمون نگار کو اعتراف ہے کہ یہ مضمون مجبور کرکے لکھوایا گیا ہے۔ جو مضمون بددلی سے لکھا جائے گا اس میں شگفتگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ ایک ایکٹ کے ڈراموں میں جناب مجید ملک کا ڈرامہ "گورکھ دھندا" ایک خاصہ کی چیز ہے۔ عورت کی محبت کو ایک اچھوتے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔ طرزِ تحریر اور مکالمہ مؤثر ہے۔ ادبِ لطیف میں "مد و جزر" بھی جناب مجید ملک کا بہترین مضمون ہے۔ اس مضمون میں لفاظی نہیں کی گئی ہے بلکہ سیدھی سچی پتہ کی باتیں کہی گئی ہیں۔ انسانی فطرت کا تجزیہ بھی لائقِ داد ہے۔

حصۂ نظم میں علامہ اقبال سے لیکر میرزا یاس یگانہ چنگیزی علیہ السلام تک سب اچھے شاعر شامل ہیں۔ جناب حفیظ کا ایک گیت اور

پانچ نظمیں ہیں، چند طرحی غزلیات بھی ہیں۔

کل (۴۳) تصویریں ہیں جن میں سے تین جناب چغتائی کی ہیں۔ سات سہ رنگی ہیں۔ پانچ دو رنگی اور بقیہ ایک رنگ کی۔

کارواں کا ہر مضمون اور ہر تصویر لائق داد ہے مگر افسوس کہ نقد و تبصرہ کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں۔ یہ چند سطریں بھی بطور تعارف لکھی گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ کارپردازانِ کارواں بھی انہیں اسی نظر سے دیکھیں گے۔

ضخامت (۲۵۲) صفحات۔ کتابت طباعت بہترین۔ قیمت ع۲ علاوہ محصول ڈاک۔ کارواں۔ چابک سواراں، لاہور سے طلب کیجئے۔

ہمایوں لاہور۔ حسب دستور امسال بھی ہمایوں کا سالنامہ شائع ہوا۔ اِس رسالہ کی روش پنجاب کے اور پرچوں سے جُدا ہے۔ سال بھر میں صرف ایک خاص نمبر اس کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر پرچوں کی طرح صرف اس کے خاص نمبر ہی پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ ہر عام پرچہ میں عمدہ مضامین اور تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔ سالنامہ میں وہ تمام خوبیاں برقرار رکھی گئی ہیں جو ہمایوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ میاں بشیر احمد اور حامد علی خاں صاحب ہمایوں کی اس کامیاب اشاعت پر مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اور پنجاب کا یہ خاموش خدمتگذارِ ادب قدردانی و حوصلہ افزائی کا مستحق۔ قیمت عہ؍

عالمگیر لاہور۔ حافظ محمد عالم صاحب کی ادارت میں یہ پرچہ عرصہ سے جاری ہے اور خاص نمبروں کی اشاعت کے لئے مشہور ہے۔ حافظ صاحب مدت سے علیل چلے آتے ہیں مگر نہایت مستعدی سے فرائضِ ادارت انجام دے رہے ہیں۔ اس سال بھی خاص نمبر بڑی ہمت سے شائع کیا ہے اور مضامین اور تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے پرچہ مرتب کرنے میں کافی جد و جہد کی ہے۔ یہ خاص نمبر مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ میں مُفت دیا گیا ہے۔ قیمت عہ؍

ادبی دُنیا لاہور۔ جناب منصور احمد صاحب نے پنجاب کے اس پرچے کے ساتھ مسیحائی کی ہے۔ حضرتِ تاجور کی ادارت میں یہ پرچہ شروع شروع میں بہت اچھا شائع ہوتا تھا مگر مالی مشکلات نے مدیر موصوف کو مجبور کر دیا کہ "ادبی دُنیا" بند کر دیں مگر منصور احمد صاحب کی بروقت اعانت نے اس ڈوبتے ہوئے سفینۂ ادب کو پھر ترا دیا۔ دسمبر ۳۳ء ہی میں "ادبی دُنیا" کا سالنامہ بھی شائع ہوا اور اتنا سستا کہ آج تک کسی اچھے پرچے کا سالنامہ شائع نہ ہو سکا۔ سالنامہ کی ضخامت تقریباً (۱۵۰) صفحات ہے اور متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت صرف ۸ ؍ رہے۔

یادگار لاہور۔ جناب نیر بی۔ اے۔ جناب وحید بی۔ اے۔ جناب منظور احمد بی۔ اے۔ اور جناب فرید جعفری۔ ان چار نوجوانوں کی ادارت میں یادگار نے قابلِ فخر ترقی کی ہے۔ جنوری اور فروری کا مُشترکہ پرچہ سالنامہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مضامینِ نظم و نثر کے لحاظ سے یادگار کا سالنامہ اس سال کے خاص نمبروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے مُلک کے بیشتر ادیبوں نے یادگار کی قلمی اعانت کی ہے۔ چار رنگین اور متعدد سادہ تصاویر شامل ہیں۔ ٹائیٹل جاذبِ نظر۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ ضخامت (۲۰۰) صفحات قیمت عہ؍

حُسن کار۔ مجموعہ ہے جناب محمد صادق ضیا کے سات مختصر مضامین کا۔ طرز تحریر شگفتہ ہے۔ مصنف کی تصویر بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔ کتاب کا حجم (۱۱۲) صفحات ہے جس میں ایک انتساب، تین دیباچے اور ایک تقریظ بھی شامل ہے۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ: قصر الادب۔ نائی کی منڈی۔ آگرہ۔

"شاھد"

جُرعات

نمبر ۳	ساقی بابت ماہ مارچ ۱۹۳۴ء	جلد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ساقی میں ریویو کی غرض سے اکثر مطبوعات آتی رہتی ہیں اور ان پر وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال بھی کر دیا جاتا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اب کے اس کثرت سے کتابیں آئی ہیں کہ مجھے اندیشہ سا ہو چلا ہے کہ کہیں ساقی کا "نقد و تبصرہ نمبر" نہ شائع کرنا پڑ جائے۔ چنانچہ اکثر کتابیں واپس کر دی گئیں، اِس خیال سے کہ اگر کتابیں رکھ لی جائیں اور اُن پر ریویو نہ لکھا جائے تو ایک قسم کی خیانت ہوگی۔ کتابوں تک تو خیر ریویو کی اُمید بیجا نہیں تھی مگر افسوس اِس بات کا ہے کہ چند اشتہاری دوا فروشوں نے اپنی حیرت انگیز ایجادات بھی اِسی غرض سے بھیجدیں جو فوری شکریہ کے ساتھ واپس کر دی گئیں۔ جو رسالہ جس خصوصیت کا مُدعی ہو اُسے اُسی نوع کی چیزیں اگر بھیجی جائیں تو مُناسب ہے۔ ساقی پاکیزہ علم و ادب کا خدمت گذار ہے۔ دواؤں اور گندہ لٹریچر سے اُسے کیا سروکار؟ پبلشرز سے استدعا ہے کہ صرف وہی کتابیں ادارۂ ساقی کو بھیجیں جو علمی یا ادبی حیثیت رکھتی ہوں ورنہ محصول ڈاک بھی ناحق ضائع ہوگا۔

"شباب و شعر" گو خالِ رُخِ جاناں کی مانند مُختصر تھا مگر اس کا سلسلہ درازیٔ زُلفِ حسیناں کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مگر اب زُلف کی حسین حُدود سے گذر کر خوبصورت کالا ناگ بنا چاہتا ہے۔ پہلے ایک تحصیلدار صاحب نے شاہجہاں میں اپنی دو کھُلی چِٹھیاں اس کے خلاف شائع کرائیں اور پھر جناب شہاب نے اس پر اپنے خیالات ظاہر کئے۔ تحصیلدار صاحب کی پہلی چِٹھی کا جواب "شباب و شعر" کے ایک کاتبِ خطوط شباب کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ دوسری کھُلی چِٹھی اور جناب شہاب کے اعتراضات کا جواب دوسرے کاتبِ خطوط شعر نے لکھا ہے جو اِس اشاعت میں شامل ہے۔ ان مضامین کے بعد یہ بحث ساقی میں ختم کر دی جائے گی۔ اگر مُناسب سمجھا گیا تو یہ سلسلہ شاہجہاں میں جاری رکھا جائے گا کیونکہ شاہجہاں تنقیدی رسالہ ہے اور پندرہ روزہ ہونے کی وجہ سے اِس نوع کے طویل مباحث کے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔

ساقی کا آئندہ پرچہ بدستورِ سابق "ظریف نمبر" ہوگا۔ اس کے لئے مزاح نگاری کے اچھے اچھے نمونے جمع کئے جا رہے ہیں۔ ابتک جتنے مضامین موصول ہو چکے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس سال کا ظریف نمبر گذشتہ سب نمبروں سے بازی لے جائیگا۔ ساقی کے معاونِ خصوصی علامہ مضحک دہلوی کی ایک بے پناہ تنقید بھی اس میں شامل ہوگی جو علامہ موصوف کے مخصوص رنگِ طنز و مزاح کی بے مثل چیز ہوگی۔ تنقید کس پر ہوگی؟ یہ ظریف نمبر میں مُلاحظہ فرمایئے گا۔ اس کے علاوہ چغتائی صاحب، فضل حق صاحب، اور انصار ناصری صاحب کے ہنسانے والے مضامین پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ جناب ام۔ اسلم کے بانکے مزاحیہ "ظریف نمبر" میں بھی اور ہی شان سے نمایاں ہونگے۔

شاہد

نجم السحر

رب رع (یعنی سورج دیوتا) کا جہاز

طیبہ نے آنکھیں کھولیں۔ بڑی دیر سے کچھ سوتی کچھ جاگتی بچھونے پر پڑی تھی۔ کانوں میں آواز ایسی آ رہی تھی جیسے کسی کشتی کے چپو چلائے جاتے ہوں اور پانی کی لہریں کشتی کے پہلو سے ہلکے ہلکے ٹکراتی ہوں۔ دل میں کہنے لگی کہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ شاید طیبس کا شہر ہے اور وہاں کے شاہی محل میں اپنے ہی خوابگاہ میں آرام کرتی ہوں۔ جب صبح ہوگی تو خواصین حاضر ہو کر جگائیں گی۔

پھر یکایک خیال آیا کہ طیبس کہاں اور کہاں باد شاہی محل۔ وہاں سے نکلے ہوئے تو مہینوں ہوئے۔ وطن ہی سے نکل کر تو منوف کے شہر میں آنا ہوا تھا۔ وہی کمبخت سفید فصیلوں والا شہر جہاں رہکر دنیا بھر کی آفتیں اُٹھانی پڑیں۔ اب طیبہ کو اس شہر کی ایک ایک مصیبت یاد آنی شروع ہوئی۔ شہزادہ ثوران حاکم منوف کا سب کو دھوکا دیکر اپنے شہر میں بُلانا، اور وہاں فرعون کو جادو کے زور سے ہلاک کرنا۔ فرعون کے جنازے پر کشت و خون کا برپا ہونا جس میں شاہی فوج بالکل غارت ہوگئی۔ خود اپنا اور آشتی کا مجبور ہو کر بت خانہ کے برج میں مقید ہو جانا، اور وہاں فاقے کرنے۔ ایک طرف موت کا نظر آنا، دوسری طرف ثوران کا پیغام کہ اس سے شادی کرے۔ پھر عین حالتِ اضطراب میں اس نور کی صورت کا نمودار ہونا جو ہو بہو طیبہ کی شکل رکھتی تھی۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ وہ طیبہ کی قرین یعنی ہمزاد ہے جو طیبہ کی پیدائش کے وقت سے اس کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھنے کے لئے ساتھ کر دی گئی ہے۔ اسکے بعد اس صورت کا یہ مصمم قصد کہ جس جس نے طیبہ کو آزار پہونچائے ہیں اُس سے سخت انتقام لیا جائے۔ اور آخر میں طیبہ اور آشتی کا برج کے دریچے میں آکر کھڑا ہونا۔ سامنے سے ایک شعلہ کے گذرتے ہی دونوں کا نیچے گرنا۔ کانوں میں ہوا کا بھرنا اور پھر کچھ خبر نہ رہنی۔ یہ باتیں ایک ایک کر کے طیبہ کو یاد آنے لگیں۔

پھر سوچنے لگی یہ باتیں تو ٹھیک سب گذری ہیں لیکن اب میں زندہ نہیں ہوں۔ حقیقت میں مر چکی ہوں اور جو صورتیں یا پرانی باتیں اس وقت یاد آ رہی ہیں ایسی ہیں جنہیں مرنے والے دُنیا سے گذر کر عدم میں بیٹھے یاد کیا کرتے ہیں۔ مگر پھر یہ چپوؤں کے چلانے اور پانی کے ہلکوروں کی آواز کیوں آ رہی ہے؟

طیبہ نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں کیونکہ اب کسی چیز کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ڈرتی تھی۔ اس وقت چاند تاریک آسمان کی چھت سے سونے کی قندیل کی طرح لٹکا نظر آ رہا تھا۔ طیبہ پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں اپنے تئیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سر سے پاؤں تک نہایت پاکیزہ سفید لباس پہنے ایک نہایت پر تکلف کوچ پر لیٹی ہے۔ سر پر ایک شامیانے کا سایہ ہو رہا ہے

کے ستونوں پر قائم ہے۔ سامنے کے رُخ ریشمین پردے رنگ برنگ کے لٹکے ہیں۔ اور اُن کے پلو چُنٹ دے کر سونے کے ستونوں میں بندھے ہیں۔ کوچ کے قریب ہی کوئی اور سبز رنگ سے رنگ کا لباس پہنے لیٹی ہے۔ دیکھتے ہی سمجھی کہ آشتی ہوگی۔ مگر وہ بالکل بے حس وحرکت پڑی تھی۔ طیبہ کو یقین ہوگیا کہ آشتی تو ہے مگر زندہ نہیں ہے۔ اس کا مُردہ پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مُردہ بھی اس وقت ایسے ہی خواب دیکھ رہا ہو جیسے میں دیکھ رہی ہوں۔ پھر کہنے دیکھنا تو چاہیئے۔ اگر زندہ ہے تو بلا سے کچھ باتیں ہی کر کے دل بہلایا جائے۔

طیبہ نے آہستہ سے آواز دی "آشتی، آشتی، سُنتی ہو۔"

آشتی نے کروٹ بدل کر اپنا چہرہ طیبہ کی طرف کیا اور کہا "بلکہ میں سُنتی بھی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں۔ مگر یہ بتائیے کہ ہم اس وقت ہیں کہاں؟؟"

طیبہ "میں تو سمجھتی ہوں کہ ملک عدم میں ہیں۔ کھڑکی سے دریا میں کودنے کے وقت جو شعلہ چمکا تھا وہ درحقیقت ملک الموت تھا۔ اور اب مر کر ہم عالم ارواح میں وارد ہوگئے ہیں۔"

آشتی "اگر ایسا ہے تو تعجب ہے کہ یہ جسم، آنکھیں، آواز اور اور سب چیزیں ویسی ہی کیوں ہیں جیسے زندوں کی ہوتی ہیں۔ اٹھ کر اصلی حال معلوم کرنا چاہیئے۔"

دونوں اُٹھیں اور گلے میں باہیں ڈال کر پاس پاس ہو بیٹھیں۔ پردے جدھر سے کھلے تھے جب اُدھر نظر کی تو معلوم ہوا کہ دونوں ایک جہاز پر سوار ہیں اور جہاز ایسا خوبصورت اور پُر تکلف ہے کہ ایسا جہاز کبھی کسی کی نظر سے گذرا ہی نہ تھا۔ تمام در و دیوار پہ چاندی اور سونے کی چادریں چڑھی ہیں اور نیچے کے درجے سے پھولوں کی مہک آرہی ہے، شامیانہ جس کے نیچے یہ دونوں بیٹھی تھیں عرشے کے بالکل بیچ میں تھا۔ جہاز کے ایک سرے کی طرف بہت سے ملاح سفید وردیاں پہنے چپو چلا رہے تھے اور معلم جہاز بھی سفید کپڑے پہنے اُن کے قریب کھڑا تھا۔ جہاز سے آگے چاندنی میں نظر آیا کہ ایک بہت چوڑے پاٹ کا چمکتا ہوا دریا بہہ رہا ہے اور اُس کے کناروں پر جو بہت دور ہیں کھجوروں کی سرسبز درختیاں اور عالیشان بُت خانوں کے گنبد اور مینار نظر آرہے ہیں۔

طیبہ نے کہا "آشتی یہ تو رب الشمس کا جہاز معلوم ہوتا ہے اور جس دریا میں وہ چل رہا ہے وہ موت کا دریا ہے۔ تاکہ یہاں سے نکال کر ہم کو اس عالم میں پہونچا دے جو کرۂ آفتاب سے بھی ماوراء ہے۔"

اتنا کہہ کر طیبہ پھر تکیہ پر سر رکھ یا تو غافل سی ہوگئی یا واقعی اُسے نیند آگئی۔ جب پھر آنکھ کھلی تو دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ پاس ہی آشتی بیٹھی اُس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی ایک میز پر طرح طرح کے کھانے چنے تھے۔

طیبہ آشتی سے پوچھنے لگی "اچھی آشتی بتاؤ تو یہ کیا ہو رہا ہے۔ سخت حیرت میں ہوں۔ معلوم نہیں وہ کونسا عالم ہے جس میں ہم اس وقت سفر کر رہے ہیں۔"

آشتی "گھبراؤ نہیں۔ کوئی نیا عالم نہیں ہے۔ اپنی ہی دُنیا ہے مگر جن کے قبضے اور قابو میں ہم اس وقت ہیں وہ اس دُنیا کے نہیں ہیں۔ نہ یہ جہاز کسی آدم زاد کا بنایا ہوا ہے اور نہ اس جہاز کے چلانے والے آدم زاد ہیں۔ مگر اب اٹھو ان باتوں کو چھوڑ دو۔

[illegible]

دونوں اُٹھیں اور میز کے گرد بیٹھ کر خوب سیر ہو کر لذیذ کھانے کھائے اور پھر شامیانے سے باہر نکلیں تو معلوم ہوا کہ ایک بہت ہی بڑے جہاز کے گوشے پر کھڑی ہیں اور تمام جہاز کے گرد چاندی کے تاروں کا ایک ماہی جال کھچا ہے۔ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے۔ جال کے سوراخوں میں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ملاحوں نے چپّو چلانے کی جگہ جہاز پر ہر طرف سے بادبان چڑھا دئے ہیں۔ اور خود نیچے کے درجے میں چلے گئے ہیں اور مستول کی چھتری پر ناخدا ایک سفید براق لمبی قبا پہنے کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا نقاب سے ڈھکا ہے۔ نیچے اپنی جگہ پر معلّمِ جہاز بدستور موجود ہے۔ مگر چہرہ اس کا بھی نظر نہیں آتا۔ اب ان دونوں عورتوں کو ایسا معلوم ہوا کہ جہاز دریا سے نکل کر ایک بڑی نہر میں سے گذر رہا ہے اور اس نہر کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے ریت کے ٹیلے دور تک چلے گئے ہیں اور اُن کی پشت پر دونوں طرف ایک صحرائے لق و دق میلوں تک پھیلا ہے۔

آشتی اس ریگستان کو غور سے دیکھ کر کہنے لگی: "طیبہ میں نے اس نہر کو پہچان لیا۔ برسوں کا ذکر ہے جب میں بچہ سی تھی تو اس نہر میں سے ہمارا جہاز گذرا تھا۔ یہ وہی نہر ہے جسے مصر کے بہت پُرانے بادشاہوں نے کھُدوایا تھا۔ بیچ میں یہاں کچھ دن ایرانی بادشاہوں کی حکومت ہو گئی تھی۔ جب مصر کے لوگوں نے اُن کی سلطنت اُٹھا دی تو اس نہر کی مرمّت کی گئی۔ یہ بوباستیس کے شہر سے شروع ہوتی ہے اور اُن جھیلوں تک گئی ہے۔ جہاں مشرق کے جانے والے قافلے اپنی کشتیاں لے جایا کرتے ہیں"

طیبہ نے کہا "یہ جو کچھ ہو، غنیمت تو یہ ہے کہ یہ عالم وہی ہے جس میں ہم پیدا ہوئے تھے اور خدائے عمون کے فضل اور اپنے ارادے اور اُمید کی قوت سے ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ مرے نہیں جیسا کہ میں اب تک سمجھ رہی تھی۔ اچھا، اس ناخدا کو تو بلا کر پوچھو شاید وہ بتائے کہ اس طلسم کے جہاز میں وہ ہمیں کہاں لئے جاتا ہے"

آشتی نے ناخدا کو آواز دی۔ لیکن نہ تو ناخدا نے اُس کی طرف دیکھا اور نہ اس کی آواز سُنی۔ اس کے بعد آشتی نے معلّمِ جہاز کو پکارا اُس کی نقاب سے معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کا رُخ آشتی کی طرف ہے مگر اُس نے بھی کچھ جواب نہ دیا اور نہ آشتی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر آشتی اور طیبہ کو یقین ہو گیا کہ اس جہاز کے لوگ یا تو محض بے جسم رُوحیں ہیں یا اگر انسان ہیں تو سب گونگے اور بہرے ہیں۔ آخر کار جب جہاز کی خوشنمائی اور نہر کے دونوں طرف صحرا کی کیفیت دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں اور اس بات کو سوچتے سوچتے کہ ہم کہاں ہیں اور کیونکر یہاں پہونچے، طبیعت اُکتا گئی تو آشتی اور طیبہ شامیانے کے نیچے چلی آئیں۔ یہاں آکر کیا دیکھتی ہیں کہ کسی نے رات کا اُلٹا پلٹا بچھونا پھر درست کر دیا ہے۔ کھانے کی میز بھی صاف کر کے اس پر دوسرے کھانے چُن دئے ہیں۔

طیبہ نرم گدّوں کی کوچ پر جیسے کوئی تھک کر گر پڑے بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگی "یہاں ضرور کسی طلسم یا سحر کا اثر ہے"

آشتی بولی "اس میں کیا شبہ ہے۔ سحر ہی نے تو ہمارے جہاں پناہ فرعون کو ختم کیا اور سحر ہی نے ہماری جانیں بھی

بچائیں. گو یہ نہیں معلوم کہ کیا انجام سوچ کر ہم کو زندہ رکھا اور سچ پوچھو تو سحر یا جس چیز کو لوگ سحر سمجھتے ہیں اُسی کی بدولت یہ دُنیا چل رہی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ لگا ہوا ہو مگر اتنا قریب ہے کہ ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے ہ"

طیبہ تھوڑی دیر تک چُپ رہی پھر کہنے لگی۔

"خیر جو کچھ بھی ہو۔ یہ سونے اور چاندی کا جہاز اس نابکار ثوران کے سوٴر دڑبے سے تو بہتر ہے۔ اور یہ ہمارا یہ سفر بھی بغیر کسی حکمت اور مقصد کے ہے۔ معلوم نہیں آجکل مصر میں وہ میری ہمزاد مسندِ حکومت پر بیٹھی کیا کر رہی ہوگی۔ اور ہمیں اس جہاز پر کس نے سوار کرایا اور اب کہاں جا رہے ہیں؟"

آشتی بولی "گھبرائیے نہیں۔ اپنے اپنے وقت پر ہر ایک بات معلوم ہوتی جائیگی۔ مجھ سے پوچھئے تو اس ثوران کمبخت سے گو مجھے دلی نفرت ہے مگر اُس کے حال پر افسوس بھی ہوتا ہے؟"

اسی طرح کی باتیں کرتی اور ریگستان کو دیکھتی یہ دونوں عورتیں جا رہی تھیں۔ نہر تنگ ہو کر اُس کے کنارے اتنے قریب ہو گئے تھے کہ جہاز پر سے نظر نہ آتے تھے اور جہاز ریت پر چلتا معلوم ہوتا تھا۔ یہانتک کہ آفتاب مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہوا۔ دونوں عورتیں باتیں کرتی ہوئی جہاز کے عرشے پر ٹہلنے لگیں۔ جب بالکل شام ہو گئی تو شامیانے میں آکر کھانا کھایا اور جب رات ہو گئی تو اپنے اپنے بستروں پر لیٹیں اور لیٹتے ہی بیخبر سو گئیں۔

جب جاگیں تو خاصا دن نکل آیا تھا مگر سورج بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ جہاز اب ایک وسیع سمندر کی طوفانی سطح پر آگیا تھا۔ زمین کہیں نظر نہ آتی تھی۔ وہ خوبصورت شامیانہ جس میں ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے اب موجود نہ تھا۔ اس کی جگہ صنوبر کی مضبوط اور بھاری لکڑی کی ایک سہ دری سی تھی۔ آشتی اور طیبہ نے اس کا کچھ خیال بھی نہ کیا۔ ان کے لئے تو سب ہی چیزیں حیرت میں ڈالنے والی تھیں۔ کس کس بات کا خیال کرتیں۔ چونکہ اب تک کسی بڑے سمندر پر جہازی سفر کا اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے اُن کو چکر آنے لگے۔ اور تین شبانہ روز یہ حالت رہی کہ ہر وقت نیند کا خمار سا رہتا تھا۔ دماغ میں خیالات کم آتے تھے۔

آخرکار ایک دن شام کو آفتاب غروب ہونے کو تھا کہ اُن کو جہاز کی حرکت اور ہوا کی تیزی میں جس نے جہاز کی رفتار بہت بڑھا رکھی تھی، کمی معلوم ہوئی۔ اُٹھکر باہر آئیں تو دیکھا کہ سمندر پیچھے رہ گیا ہے اور جہاز ایک بڑے چوڑے دریا میں آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس دریا کے کنارے اونچے اونچے پُرانے درخت ہیں جن کی موٹی موٹی جڑیں اوپر کو اُٹھکر پیچ و خم کھاتی دریا میں دور تک پھیلی نظر آتی ہیں۔ اور ان جڑوں میں مگرمچھ اور گھڑیال اور پانی کے اور خونخوار جانور بیٹھے ہیں۔ سفید وردیوں والے ملاح جو غائب ہو گئے تھے پھر آن موجود ہوئے ہیں۔ ہوا چونکہ بند ہو گئی ہے بادبان بیکار ہیں۔ چپّو چلا کر دریا کے چڑھاؤ کے رُخ جہاز کو کھے رہے ہیں۔ چلتے چلتے دریا میں ریتیلی زمین کا ایک ٹکڑا دور تک پانی میں آگے کو بڑھا ہوا نظر آیا۔ یہاں پہونچتے ہی ملاحوں نے جہاز کا لنگر گرا دیا۔

طیبہ اور آشتی کو اشتہا غالب ہوئی تو وہ میز کے گرد کھانے بیٹھیں۔ جب کھانے سے فارغ ہوئیں تو دو آدمی مُنھ پر نقابیں ڈالے قریب آئے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں بانس کے ریشوں کی بنی ہوئی ایک ایک زنبیل تھی۔ آشتی نے ان سے بات کی مگر یہ دونوں بھی جہاز کے ناخدا اور معلم کی طرح بہرے اور گونگے تھے۔ جو کچھ اُن سے سوال کیا اس کا جواب نہ ملا۔ مگر سامنے آتے ہی دونوں نے نہایت ادب سے جُھک کر سلام کیا اور دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ طیبہ نے اس طرف دیکھا تو کنارے سے کچھ دور ایک ٹیلے

یہ کچھ معلوم نہ ہوا کہ اسے کس نے روشن کیا ہے۔

جب آشتی نے طیبہ سے کہا: "ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم جہاز سے اتر جائیں۔ ملکہ پیاری! اٹھو، تاکہ تقدیر میں جتنی باتیں اور لکھی ہیں وہ بھی پوری ہوں۔ شکر ہے کہ قسمت ابتک بری نہیں رہی!"

طیبہ نے جواب دیا: "جیسی مرضی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے اس میں خدا کی کوئی حکمت ضرور ہے جو اس صحرائے لق و دق میں ہم لائے گئے ہیں!"

آشتی اور طیبہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور ان دونوں آدمیوں کے ساتھ عرشے کے سرے پر آئیں۔ یہاں اب وہ چاندی کے تاروں کا جال جو جہاز کے گرد تنا ہوا تھا کہ کوئی باہر نہ نکل سکے، موجود نہ تھا۔ عرشہ سے اتر کر جب جہاز کے کنارے پر پہونچیں تو فوراً زینہ لگا دیا گیا۔ زینہ سے اتریں تو ان آدمیوں نے ایک زنبیل طیبہ کو اور ایک آشتی کو دی۔ اور جھک کر سلام کیا۔ سلام کرتے ہی جہاز کی طرف گئے اور اس پر چڑھتے ہی لنگر اٹھایا۔ ملاحوں نے چپو چلانے شروع کر دئے۔

جہاز نے پورا چکر کاٹ کر اپنا رخ ادھر کر لیا جدھر سے آیا تھا اور کچھ دیر تک بالکل بے حرکت منجدھار میں کھڑا رہا۔ مستول کی اونچی چھتری پر ناخدا اور سکان کے قریب معلم جہاز کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی میں دونوں کے دونوں سونے کے چمکتے ہوئے بت معلوم ہوتے تھے۔ اس حالت میں یکایک انہوں نے اپنے منہ کے نقاب اتار پھینکے۔ طیبہ اور آشتی کو ان کی صورتوں کی ایک جھلک سی نظر آئی۔ ناخدا کی شکل وہی تھی جو طیبہ کے باپ فرعون کی تھی اور معلم جہاز کی صورت آشتی کے خاوند مرمیس کی سی تھی۔

دونوں عورتوں کو یہ شکلیں یونہی سی نظر آئی تھیں کہ بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا چھپتے سورج پر آگیا۔ اور جب تک وہ ہٹے جہاز چلتا ہوا اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کدھر گیا۔

طیبہ اور آشتی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس سفر میں ان کو خوف محسوس ہوا۔

طیبہ نے کہا: "آشتی ہم ضرور کسی سحر کے عمل میں ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس جہاز پر جتنی صورتیں تھیں انسان نہ تھیں، مردوں کی روحیں تھیں!"

آشتی: "ملکہ عالم، بجا فرماتی ہیں۔ میں تو شروع ہی سے یہ سمجھ رہی تھی۔ مگر کچھ خوف نہ کیجئے کیونکہ اگر یہ روحیں تھیں تو ایسے لوگوں کی تھیں جو جیتے جی ہم کو دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور اب مرنے پر بھی ان کی محبت کم نہیں ہوئی۔ ثوران کے پنجہ غضب سے چھڑا کر ہم کو کسی بھلائی کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ اور آپ کے والد فرعون اور میرا شوہر مرمیس اس سفر میں ہماری رہبری کر رہے ہیں۔ دیکھو سامنے آگ جل رہی ہے، چلو وہیں چلیں اور جو کچھ اب گزرنے والا ہے ہمت کر کے اس کے بھی منتظر ہو جائیں اور دل میں اس کا یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف بھلائی کے لئے ہوگا!"

غرض یہ دونوں عورتیں اس ٹیلے کی طرف چلیں جہاں آگ روشن تھی۔ تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس لئے یہ وہیں روشنی کے پاس ہو بیٹھیں۔ قریب ہی لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا تھا کہ اگر کوئی وہاں بیٹھے تو آگ برابر جلاتا رہے۔ لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس ہی اونٹ کے نمدے لبادے رکھے تھے کہ اگر کسی کو سردی معلوم ہو تو انہیں پہن لے۔ طیبہ اور آشتی نے یہ لبادے جلدی سے پہن لئے اور آگ میں لکڑیاں ڈالنی شروع کیں۔ اب خیال آیا کہ بانس کی بنی ہوئی زنبیلیں جو جہاز والوں نے چلتے وقت ساتھ کر دی ہیں ذرا

انہیں کھول کر تو دیکھیں کہ ان میں کیا ہے۔ کھولی تو معلوم ہوا کہ جو زنبیل آشتی کو ملی تھی اس میں کھانے کی چیزیں خشک میوے بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور کھجوریں بھری ہیں۔ طیبہ کو جو زنبیل ملی تھی اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سب سے اوپر ایک ہاتھی دانت اور سونے کے تاروں کا چنگ رکھا تھا۔ طیبہ نے اُسے جلدی سے نکالا اور بہت غور سے دیکھ کر کہنے لگی:۔

"ہائیں یہ تو میرا چنگ ہے جو کوش کے شہزادے نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ وہی شہزادہ جسے رقیبوں نے مار ڈالا۔ اسی چنگ پر تو وہ عاشقوں والا گیت شہزادے کے قتل ہونے سے پہلے میں نے دربار میں سُنایا تھا۔ یقیناً یہ میرا ہی چنگ ہے جسے میں محل میں چھوڑ آئی تھی۔ آشتی اب کہو کہ یہ یہاں کیسے آیا!"

آشتی "پہلے آپ یہ بتائیں کہ ہم دونوں یہاں کیسے آئے۔ اس بات کا جواب آپ دیدیں تو میں آپ کی بات کا جواب دوں"

طیبہ نے چنگ ایک طرف رکھکر زنبیل میں دیکھنا شروع کیا کہ اور کیا ہے۔ اور اب خشک پتوں کی ایک تہ ہٹا دینے پر معلوم ہوا کہ ہزار ہا آبدار موتی ریشم کی لڑیوں میں پروئے ہوئے زنبیل میں بھرے ہیں۔ طیبہ نے ایسی آب و تاب والے موتی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر لڑی میں موتی برابر کے تھے۔ بہت سی لڑیاں بڑے موتیوں کی تھیں، بہت سی چھوٹے موتیوں کی۔ مگر دو چار موتی بہت بڑے انگور کے دانے کے برابر تھے وہ کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک طرف رکھے تھے۔

طیبہ نے حیرت سے کہا "ایسے دُرِ بے بہا اور تو دُنیا میں کسی بڑی سے بڑی ملکہ کو جہیز میں بھی نہ دیے گئے ہونگے۔ لیکن یہ چنگ اور یہ موتی بیابان میں کس کام آسکتے ہیں؟"

آشتی "اس کا حال تو آگے چل کر کھلے گا۔ اس وقت تو جس خُدا نے یہ دولت بخشی ہے اس کا منت گُذار ہونا چاہیئے۔ اور جو نعمتیں کھانے کیلئے دی ہیں اُنہیں کھانا چاہیئے"

اب دونوں نے جس زنبیل میں کھانے کی چیزیں تھیں اُنہیں نکال کر کھانا شروع کیا۔ اور کوئی کام تو اب کرنیکا تھا نہیں دونوں آگ کے پاس لیٹ کر سوگئیں۔

ذرا آنکھ لگی تھی کہ معلوم ہوا سارا جنگل جاگ پڑا ہے۔ پہلے تو دریا کی سمت سے بڑی ڈراؤنی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ دونوں سمجھ گئیں کہ یہ شیروں کے دھاڑنے کی آواز ہے کیونکہ اس قسم کے جانور طیبی کے ایک باغ میں پلے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ پھر بھیڑیوں اور گیدڑوں کے چیخنے اور غرانے کی آوازیں آئیں۔ اور کبھی کبھی دریائی گھوڑے اور گینڈوں کے پھنکارنے بھی کانوں میں آنے شروع ہوئے۔

درندوں کی یہ خوفناک آوازیں رفتہ رفتہ قریب سُنائی دینے لگیں۔ اتنی قریب کہ صحرا کے کنارے کسی کسی کے دیدہ ور روشن دیدے بھی اندھیرے میں چمکتے ہوئے نظر آئے۔ اور ٹیلے کے نیچے جو ریتلی زمین تھی اس میں سے دوڑتے ہوئے بعض جانوروں کی طرف آنے لگے۔ اور دریا کی طرف سے بھی خنزیر کی صورت کے درندے تیز چمکتی ہوئی کچھاروں سے نکلے جنگل کی اونچی گھاس اور جھاڑیوں کو روندتے اور کچلتے ٹیلے کی طرف آنے لگے۔ ان میں ایک بہت بڑا درندہ بھی تھا جس کی ناک پہ ایک سینگ تھا۔

طیہ نے خوف سے لرز کر کہا: "لو آشتی، اب ہمارا وقت آگیا۔ یہ جانور اب ہمیں کھا جائیں گے۔"

آشتی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور اس خیال سے کہ جنگل کے جانور آگ سے ڈرتے ہیں، کچھ لکڑیاں آگ میں اور جھونک دیں۔ ان ایک درندے بالخصوص شیر یا تو اس شوق میں کہ آدمی کبھی دیکھا نہ تھا اب دیکھیں کہ کیسا ہوتا ہے یا بھوک کی تیزی میں دُموں کو [illegible] کوڑوں کی طرح پھٹکارتے اتنے قریب چلے گئے کہ دونوں عورتوں تک پہونچنے کیلئے صرف ایک جست کافی تھی۔ شیروں کے پیچھے پیچھے بادشاہ کے ساتھ درباری ہوں بہت سے چیتے تیندوے اور چرغ بھی حاضر تھے۔

طیہ نے بالکل سہمی ہوئی آواز میں کہا: "بس اب کوئی دم میں یہ جست لگانے کو ہیں۔"

اِتنا سُنتے ہی آشتی نے آہستہ سے کہا: "کیا آپ کے والد فرعون اور میرے شوہر منتیں سورج دیوتا کی کشتی میں بٹھا کر ہم کو اس لئے لائے تھے کہ جنگل کے جانوروں کا پیٹ بھرا جائے اور بھوکی جنگلی بھیڑوں کی طرح ہم کو بھیڑیوں کا لُقمہ بنایا جائے۔"

اتنا کہہ کر آشتی نے اس طرح بے اختیار ہو کر جیسے غیب سے کوئی ہدایت ہوئی ہو کہا: "طیہ، اپنا چنگ اُٹھاؤ اور ملے بجا کر گانا شروع کرو۔"

طیہ نے فوراً چنگ اُٹھا اُس کے تاروں پر اُنگلیاں دوڑائیں اور نہایت شیریں آواز سے گانا شروع کیا۔ پہلے آواز میں خوف کی وجہ سے کسی قدر کمزوری اور رعشہ تھا لیکن جب گانے کی دُھن میں اور سب چیزیں خیال سے نکل گئیں تو طیہ کی آواز نے زمین و آسمان میں جان ڈال دی۔ صحرا کے جانوروں پر بھی اس کا اثر ہوا۔ سب غرفش بند ہوئی اور ایسی چُپ لگی کہ معلوم ہوتا تھا گانا سُن کر فی الواقع محظوظ ہو رہے ہیں۔ پتھروں میں سے ایک سانپ بھی رینگتا ہوا باہر نکلا اور پھن کو پھیلا لہرا لہرا کر گانا سُننے لگا۔

آخر کار جب طیہ نے گانا بند کیا تو جتنے جانور وہاں جمع ہوئے تھے اُن میں کوئی جنگل کی طرف اور کوئی دریا کی طرف غائب ہو گیا۔ سوائے سانپ کے کہ جہاں وہ تھا وہیں کنڈلی مارے سوتا رہا۔

اب طیہ اور آشتی اپنی جگہ سے اُٹھیں اور ٹیلے سے نیچے اُتر کر سامنے کی ریتیلی زمین پر آئیں جہاں جانوروں کے نقشِ قدم دریا کے کنارے تک بکثرت نظر آتے رہے۔ دریا پر پہونچکر دونوں نے مُنہ ہاتھ دھویا۔ چاروں طرف غبار سا چھایا تھا۔ بہت کوشش کی اس غُبار میں سے وہ سونے چاندی کا جہاز اور اُس کے نقابوں والے ملاح جو منوف کے شہر سے اُنہیں یہاں لائے تھے دریا پر نظر آئیں مگر کچھ نہ دکھائی دیا۔ خیال تھا کہ ممکن ہے ہمارے انتظار میں وہ ابتک موجود ہوں۔ مگر دریا پر کوئی کشتی یا جہاز نہ تھا۔ سوائے دریائی جانوروں کے جو کبھی سطح سے اُبھرتے اور کبھی غوطہ لگاتے تھے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یا کنارے پر کیچڑ اور پانی میں بڑے بڑے مگر مچھ اور گھڑیال کروٹیں بدل رہے تھے۔ یا بحری پرندے سمندر سے دریا کی طرف چارے کی تلاش میں اُڑتے ہوئے آتے تھے۔ ہاتھ مُنہ دھو کر طیہ اور آشتی ٹیلے پر پھر وہیں آبیٹھیں جہاں اب راکھ کا ایک ڈھیر لگا تھا جس زنبیل میں کھانا تھا اُسے کھول کر دونوں نے کچھ کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر یہ اس کا مُنہ دیکھتی تھی وہ اس کا۔ مگر سمجھ میں کسی کے نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔

طیہ کہنے لگی: "اُٹھو آشتی، یہاں سے کہیں آگے چلیں۔ دریا کی طرف جانا تو فضول ہے۔ وہاں گھانس اس قدر اونچی ہے کہ چلنا دُشوار ہوگا۔ البتہ اس جنگل سے کسی طرف باہر نکلنا اچھا ہوگا۔ اُٹھو، چلو، خُدا کو جدھر لے جانا منظور ہوگا اُدھر ہی جائینگے۔"

آشتی نے کہا: "اچھا" اور اب یہ دونوں عورتیں شتری رنگ کی نیچی عبائیں پہنے آگے بڑھیں۔ زنبیلیں دونوں نے اپنے سروں پر

اس طرح رکھ لیں جیسے مصری کسانوں کی عورتیں بوجھ سر پر رکھ کر چلتی ہیں۔ سونے اور ہاتھی دانت کا چنگ طیبہ نے اپنی پُشت پر لٹکالیا۔

گھنٹوں تک جنگل کے درختوں میں سے رستہ نکالتی جنوب کی سمت میں چلتی رہیں۔ کیونکہ جنگل کی گھاٹیاں اسی سمت میں پھیلی تھیں اور اُن سے آگے نیچی نیچی جھاڑیوں کی ہموار زمین تھی۔ درختوں کی چوٹیوں پر لنگور قلابازیوں میں مصروف بیحد شور مچا رہے تھے کبھی کبھی جنگل کا کوئی درندہ سامنے سے گذر کر درختوں میں غائب ہو جاتا۔ سوائے ان چیزوں کے اور کوئی چیز ان عورتوں نے نہ دیکھی۔ آخرکار دوپہر کے قریب پہاڑکی سی چڑھائی شروع ہوئی۔ درخت یہاں زیادہ اونچے نہ تھے اور جتنے تھے وہ بھی دُور دُور تھے۔ غرض چلتے چلتے جنگل اور جھاڑیوں کی زمین طے کر کے ریگستان کے کنارے پہونچیں اور یہاں سے گذرتی ہوئی ایک مقام پر آئیں جہاں کھجور کے درخت تھے اور کچھ سبزہ بھی تھا۔ سبزہ دیکھکر خیال ہوا کہ پانی بھی ہوگا۔ جب قریب پہونچیں تو معلوم ہوا کہ ایک چشمہ جاری ہے چشمے کے پاس آکر دونوں نے پانی پیا اور زنبیل کھول کر کچھ کھانا کھایا اور پھر دونوں لیٹ کر غافل سوگئیں۔

طیبہ کو نیند میں دفعتًا ایک آواز سی سُنائی دی۔ فورًا جاگی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایک آدمی ببول کی ایک موٹی اور لمبی سی لکڑی کا سہارا لئے اس کے پاس کھڑا غور سے اُسے دیکھتا ہے۔ یہ عجیب وغریب صورت کا آدمی تھا بڈھا اس قدر تھا کہ سر کے سفید بال شانوں سے نیچے تک بکھرے تھے اور سفید بگلا سی ڈاڑھی ناف تک پہونچی تھی۔ کسی زمانہ میں بہت دراز قد ہوگا مگر اب بُڑھاپے سے کُبڑا ہوگیا تھا اور دُبلا پتلا۔ ڈھچر میں ہڈیوں کے موٹے موٹے جوڑ پھٹے کپڑوں میں سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں مگر کچھ ایسی بے رونق اور پتھرائی ہوئی کہ بالکل نابینا معلوم ہوتا تھا۔

جب طیبہ اور آشتی جاگ اُٹھیں تو اس بُڈھے نے پاس آکر ان عورتوں کو بہت جُھک کر غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سینکڑوں جُھریاں پڑی ہوئی تھیں اور رنگ صحرا کی دُھوپ اور لوؤں سے بالکل کالا ہوگیا تھا مگر چہرہ کا نقشہ سُتواں تھا۔ طیبہ کو خیال ہوا کہ بُڑھاپے نے جو چاہے سو درجہ کیا ہو، مگر صورت پر ایک شان ضرور ہے۔ ملکہ کو اس بُڈھے کی صورت اپنے باپ فرعون کی شکل سے، جب اُس کا دم نکلنے کو تھا بہت مُشابہ معلوم ہوئی۔

طیبہ اُٹھی اور بے اختیار زبان سے نکلا: "بابا، آپ کہاں سے آئے ہیں اور ہم غریب مُسافروں سے آپ کو کیا کام ہے؟"

بُڈھے نے بڑی محبت کے لہجے میں کہا: "میری بیٹی، مَیں صحرا سے آیا ہوں اور صحرا ہی میرا وطن ہے۔ میرے زمانہ کے جتنے لوگ تھے بلکہ اُن کی اولاد تک اب زندہ نہیں ہے۔ عمر میری بہت ہے، سب چیزیں بدل گئیں، نہیں بدلا تو یہ صحرا، اور یہ صحرا ہی اب میرا ایسا دوست رہ گیا ہے جو کہہ سکتا ہے کہ "ہاں مَیں نے تمہاری جوانی دیکھی ہے"۔ بیٹی، مجھ پر رحم کرو۔ مَیں بہت مسکین ہوں۔ تین دن سے ایک دانہ مُنہ میں نہیں گیا ہے۔ تمہارے کھانے کی بو ناک میں آئی تو اِدھر چلا آیا۔ کچھ کھانے کو دو، مَیں بہت بھوکا ہوں"۔

طیبہ نے کہا: "بابا یہ کھانے کی زنبیل حاضر ہے، آپ کا نام کیا ہے؟"

بُڈھا: "مجھے کیفر کہتے ہیں"

طیبہ نے کیفر کیفر دو تین دفعہ زبان سے کہا اور سوچنے لگی کہ کیفر تو اس پر ولے نیا کیڑے کا نام ہے جس کی تصویر کو مصر کے

نیک لڑکیاں مسافر کے لئے اکثر گھر میں ڈھیلے رکھتے ہیں۔ پھر کہنے لگی "بابا کیفر، آپ اس زنبیل سے کھانا نکال کر کھائیں!" اور یہ کہہ کر اُس نے بانس کی پٹاری بُڈھے کے سامنے رکھدی، جو کچھ اس میں تھا اس کے سوا کھانے کو ان عورتوں کے پاس کچھ نہ تھا۔

بُڈھے نے زنبیل طَیبہ کے ہاتھ سے لے لی اور اس میں کھانے کی چیزیں دیکھ کر پہلے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر خُدا کا شکر کیا اور پھر بیٹھ بیٹھے نوالے کھانے شروع کئے۔

آشتی نے طَیبہ سے چُپکے سے کہا "یہ بُڈھا تو سارا کھانا ختم کر دیگا۔ پھر کیا ہم اس جنگل میں بھوکے مریں گے۔ یہ انسان نہیں ہے۔ شیطان ہے یا کون ہے؟"

آشتی نے اتنی بات کی تھی کہ بُڈھے نے دو چار روٹیاں اور صاف کر دیں۔

طَیبہ نے کہا "آشتی، یہ ہمارا مہمان ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ اسے کھانے دو"

تھوڑی دیر تک آشتی اور چُپ رہی۔ پھر گھبرا کر کہنے لگی "طَیبہ، کھانا تو سب ختم ہوا جاتا ہے"

طَیبہ نے کہا "دوا، چُپکی بھی رہو۔ جب وہ مہمان ٹھہرا تو مہمان نوازی کے قاعدے کیوں توڑے جائیں"

آشتی "مگر آپ کی مہمان نوازی کے یہ قاعدے آخر میں ہماری جان لینے کو تیار ہو جائیں گے"

طَیبہ "جان جاتی ہے تو یوں ہی سہی۔ کم سے کم ایک بھوکے کا پیٹ تو بھر جائے گا۔ اپنے باپ رب عَمُون کا بھی تو مجھکو بھروسہ ہے"

طَیبہ کہنے کو تو یہ کہہ رہی تھی مگر آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ آشتی کے کہنے کو وہ دل میں ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ اور جانتی تھی کہ جتنا کھانا اس بُڈھے نے اس وقت ختم کیا ہے وہ اُن کے گذارے کے لئے ابھی دو دن اور چلتا۔ مگر اب کچھ باقی نہ رہا اور کچھ دیر میں بھوک سے اُن پر غشی کی نوبت آنے والی ہے۔ اگر کہیں سے کوئی سبیل کھانے کی نہ ہوئی تو فاقوں سے مرجانے کے سوا اب کوئی صورت نہیں ہے۔ اس جنگل میں کون مدد کا دینے والا ہے۔ ابھی کتنے دن گذرے ہیں کہ فاقوں سے مرنے کی نوبت نہیں پہونچ گئی تھی۔ اُس وقت کی تکلیف یاد کر کے طَیبہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس عرصے میں کیفر نے کھانے کی زنبیل بالکل خالی کر دی۔ ایک کھجور کی گٹھلی تک اُس میں نہ چھوڑی۔ خالی ٹوکری طَیبہ کے حوالے کر بُڈھے نے سلام کیا اور کہا۔

"بیٹی میں تیرا بہت شکر گذار ہوں۔ مصر کی ملکہ بھی ہوتی تو میری ایسی خاطر و مدارت نہ کرتی جیسی تو نے کی" اتنا کہہ بُڈھے نے پھر طَیبہ کو غور سے دیکھکر کہا "میں کئی دن کا بھوکا تھا۔ اب میرا پیٹ خوب بھر گیا ہے اور بجز اس کے کہ خُداؤں سے تیرے حق میں بھلائی کی دُعا کروں اور کسی طرح میں تیرے احسان کا بدلہ نہیں کر سکتا۔ پیاری بیٹی۔ خُدا ایسا نہ کرے کہ کبھی تجھے بھوک کی تکلیف اُٹھانی پڑے"

یہ فقرہ سُن کر طَیبہ سے نہ رہا گیا۔ دونوں آنکھوں سے آنسو ٹپک کر کیفر کے ہاتھ پر گرے اور زبان سے یہ جُملے نکلے۔

"اس کی تو مجھے خوشی ہے کہ آپ نے سیر ہو کر کھا لیا۔ لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ پوچھئے۔ کیونکہ ہم غریب عورتیں اس صحرا میں گم کردہ راہ ہیں اور دونوں عنقریب فاقوں سے مر جائیں گی کیونکہ اب ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے"

بڈھے کیفر نے نہایت حیرت زدہ ہو کر کہا "بیٹی یہ تو نے کیا کیا! کیا جسقدر کھانا تیرے پاس تھا وہ سب تو نے جنگل کے اس فقیر کو کھلا دیا! وہ نگلتا رہا اور تو چپ بیٹھی دیکھا کی۔ کیا اس لئے تیری آنکھوں میں آنسو ہیں؟"

طلیہ "بابا! مجھے معاف کیجئے گا۔ جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہے۔ ان آنسوؤں پر البتہ مجھے شرم آتی ہے۔ تھوڑے دن ہوئے کہ ہم دونوں کو ——— سخت تکلیف پہونچ چکی ہے اور اس خیال سے کہ پھر وہی نوبت آئے گی میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آشتی اُٹھو، جب تک ہاتھ پاؤں میں کچھ دم باقی ہے تھوڑا سا رستہ اور طے کرلیں"

آشتی کا نام سُن کر کیفر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر طلیہ سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹی، تیری صورت پیاری اور تیری طینت پاک ہے، ورنہ میرے ساتھ ایسا اچھا سلوک نہ کرتی۔ لیکن ایک چیز کی تجھ میں اب بھی کمی معلوم ہوتی ہے یعنی خداؤں کی رحمت و برکت پر جیسا بھروسہ ہونا چاہیئے، نہیں رکھتی" اس کے ساتھ ہی کیفر نے دبی زبان سے کہا "گو یہ سچ ہے کہ اگر اُن کی رحمت پر بھروسہ نہ ہوتا تو اس سامنے والے پہاڑ سے زندہ بچکر آنا ممکن نہ تھا۔ اچھا اب بتاؤ کہ اس بیابان لق و دق میں تمہارا آنا کیونکر ہوا؟"

آشتی نے جواب دیا "ہم مصر کی شریف زادیاں ہیں۔ کم سے کم یہ لڑکی تو مصر کے ایک بہت بڑے گھرانے کی ہے۔ مَیں اس کی انّا اور کھلائی ہوں۔ رودِ نیل کے کنارے ہم رستہ بھول کر پریشان حال تھے کہ فنیقیہ کے بردہ فروش قزاقوں نے ہم کو گرفتار کرلیا اور اپنے جہاز میں بٹھا کر یہاں تک لائے۔ یہ نہیں معلوم کہ کونسے رستوں سے وہ یہاں پہونچے۔ آخر کار میٹھا پانی جہاز میں بھرنے کے لئے وہ سامنے والے دریا میں ٹھہرے۔ جب رات ہوئی تو ہم دونوں جہاز سے نکل کر بھاگے۔ غرض اب یہ سمجھیئے کہ ہم دریا کے قزاقوں کی باندیاں ہیں جو اُن کی حراست سے بھاگ نکلی ہیں۔ اس سے زیادہ اب ہماری عزت اور وقعت کچھ نہیں ہے"

کیفر نے کہا "واقعی اتنے بڑے نقصان پر تو قزاق ابتک ہاتھ ملتے ہوں گے۔ مَیں سمجھتا تھا کہ تم کوئی اور ہی لوگ ہو۔ کیونکہ کل رات کو مَیں ریت پر پڑا سوتا تھا کہ تحت الثریٰ سے ایک مرد کی رُوح اُٹھ کر میرے پاس آئی اور کہا کہ ایک عورت آشتی ہے اُس کو تلاش کرو اُس کے ساتھ ہی ایک جوان لڑکی ہے اس کو بھی ڈھونڈو۔ لڑکی کا نام جو اُس رُوح نے لیا تھا وہ مجھے یاد نہیں رہا مگر خود اُس رُوح کا نام جبکہ اس دُنیا میں وہ انسان کے قالب میں تھی، مرنیس تھا۔

آشتی نے یہ نام سُنتے ہی ایک آہ سرد بھری، اور کیفر کے قریب آکر اُس کی صورت کو بغور دیکھنے لگی۔ آشتی کی اس حرکت کا کیفر کے چہرہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔

آشتی نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھوکے فقیر ہی نہیں ہیں بلکہ غیب کی باتوں کا علم بھی رکھتے ہیں؟"

کیفر نے جواب دیا "یہ ممکن ہے، کیونکہ میری عمر بہت ہے اور مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض لوگ جتنے معلوم ہوتے ہیں اس سے بڑھکر نکلتے ہیں۔ یہی حال عورتوں کا بھی ہے۔ غالبًا تمہارا تجربہ بھی یہی بتاتا ہوگا۔ کیونکہ بڑے بڑے گھرانوں میں جو انّائیں اور بچوں کی پالنے والیاں ہوتی ہیں اگر اُن کو توجہ ہو تو وہ زمین تو زمین آسمان تک کی باتیں معلوم کرلیں۔ مگر اس قصّے کو جانے دو۔ یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے اس کا نام کیا ہے؟"

آشتی نے جواب دیا: "نفرطی"

کیفر: "نفرطی، یہ نام تو اُس رُوح نے نہیں لیا تھا۔ مگر اسی کے لگ بھگ کچھ کہا تھا۔ اچھا تو تم اور یہ لڑکی ان قزاقوں کی قید سے نکل بھاگیں، اور جہاز سے کچھ چیزیں بھی اپنے ساتھ لیکر نکلیں۔ مثلاً یہ خوبصورت سونے اور ہاتھی دانت کا چنگ جس پہ فرعون کا طغرہ بنا ہے۔ اور معلوم نہیں اس دوسری زنبیل میں کیا ہے!"

طیبہ نے جلدی سے کہا: "اس میں موتی ہیں"

کیفر: "زنبیل تو بہت بڑی ہے۔ کیا اس میں موتی ہی موتی بھرے ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ مجھ سے ڈرو نہیں میں ایسے لوگوں کی کوئی چیز نہیں لونگا جنہوں نے مجھے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا ہو۔ صحرائیوں کا یہ قاعدہ نہیں ہے"

طیبہ نے جواب دیا: "بابا، آپ شوق سے دیکھئے۔ مجھے تو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ آپ دوسرے کی چیز بے پوچھے لیلینگے، اگر چور ہوتے تو لٹتے محتاج و مفلس نہ ہوتے اور نہ اتنے بھوکے ہوتے۔ لیکن بابا کیفر میں تو سمجھتی تھی کہ آپ نابینا ہیں، آپ کی نظر میں موتی اور سنگ ریزے برابر ہوں گے"

کیفر نے کسی قدر ہنسکر کہا: "بیٹی نفرطی، سوجھتا نہیں ہے تو کیا موتی کی پہچان مجھے اور طرح بھی آتی ہے"

اتنا سنکر طیبہ نے موتیوں کی زنبیل کیفر کے سامنے رکھدی۔ کیفر نے موتیوں کی لڑیاں نکالنی شروع کیں۔ کبھی انکو انگلیوں سے ٹٹولا، کبھی سونگھا، کبھی اُن کو زبان لگا کر چکھا۔ خاص کر ان بڑے موتیوں کو جو کپڑے میں علیحدہ لپٹے ہوئے تھے۔ جب یہ موتی دیکھ لئے تو جہاں سے انہیں نکالا تھا پھر وہیں رکھدیا اور کہنے لگا۔

"خاتون آشتی، تعجب ہے کہ ان شامی قزاقوں اور بردہ فروشوں نے تمہارا پیچھا نہیں کیا کیونکہ یہ موتی چاہے اُن کے ہوں یا تمہارے اتنی قیمت کے ہیں کہ ایک سلطنت ان سے مول لی جاسکتی ہے"

آشتی بولی: "مگر ان کو کھا کر بھوک تو نہیں مٹے گی"

کیفر: "یہ ٹھیک ہے لیکن ان کو بیچ کر اتنی چیزیں خرید سکتی ہو کہ کھائی بھی نہ جائیں گی"

آشتی: "جنگل میں موتیوں کا خریدنے والا کون بیٹھا ہے؟"

کیفر: "یہ سچ ہے۔ مگر اتفاق سے اس صحرا میں ایک شہر ہے جو یہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے"

طیبہ نے بیقرار ہو کر پوچھا: "شہر کا نام نباطہ تو نہیں ہے؟"

کیفر: "نباطہ، نہیں یہ نام نہیں ہے۔ نباطہ کا نام تو میں نے بھی سُنا ہے۔ اسے زرین شہر بھی کہتے ہیں۔ کبھی جوانی میں جسے اب سو برس ہونے کو آتے ہیں وہاں ایک مرتبہ جانا ہوا تھا"

طیبہ: "سو برس، اب تو آپ وہاں کا رستہ بھی بھول گئے ہوں گے"

کیفر: "نہیں کچھ کچھ یاد ہے۔ اگر کوئی پیدل جائے تو سال بھر کا سفر ہے۔ رستے میں بڑے بڑے دشوار صحرا اور گھنے جنگل آتے ہیں۔ بیچ میں بڑی بڑی وحشی اور ظالم قومیں آباد ہیں۔ بہت کم مسافران میں سے زندہ بچ کر اس شہر تک پہونچتے ہیں"

طیبہ: لیکن بابا کیفر جو کچھ بھی ہو میں تو ضرور اس شہر کو جاؤں گی چاہے رستے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔"

کیفر: بیٹی مجھے یقین ہے کہ تو ضرور اس شہر تک پہنچے گی۔ ضرور پہنچے گی۔ مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ تیرے پاس یہ چنگ موجود ہے۔ تجھے اس کا بجانا اور گانا بھی ضرور آتا ہوگا۔ پھر تیرے پاس موتی بھی ہیں۔ اچھا یہ شہر جس کا میں نے ابھی ذکر کیا جو یہاں سے قریب ہے، وہاں کے لوگ گانے بجانے پر جان دیتے ہیں اور موتیوں کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ مگر تبلا کا سفر ابھی تین مہینہ تک ممکن نہیں۔ جب تک پہاڑوں پر بارش نہ ہو جائے رستہ میں کنوئیں بالکل خشک ملیں گے اور سفر کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ تم اس پاس کے شہر میں کچھ دنوں کو آباد ہو جاؤ۔ آشتی موتیوں کی تجارت کرے اور تم اس کی بیٹی بنکر چنگ بجانے والی بن جاؤ۔ اب بتاؤ کہ یہ صلاح کیسی ہے؟"

طیبہ نے کہا: "بابا کیفر، اس صحرا سے باہر تو جہاں آپ کہیں گے وہیں میں آباد ہو جاؤں گی۔ اگر آپ کو رستہ معلوم ہو تو آگے چلیئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

کیفر: "رستہ مجھے خوب معلوم ہے، اور پیٹ بھر کر کھانا جو تم نے کھلایا ہے اس کے بدلے رستہ بتانے کو تیار ہوں۔ اچھا، چلو، میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔" یہ کہہ کر بڈھے نے اپنی ببول کی لکڑی سنبھالی اور ایسی لمبی لمبی ڈگیں مار کر چلا کہ دونوں عورتوں کو حیرت ہو گئی۔ مگر پیچھے پیچھے برابر چلتی رہیں۔

طیبہ نے کہا: "آشتی، دیکھو تو اتنی بڑی عمر کے آدمی ہیں اور کیسے تیز چلتے ہیں۔ جب شروع میں آئے تھے تو کیسی مرد چال تھی۔"

آشتی: "آدمی، یہ آدمی کہاں ہیں۔ یہ تو کسی کی روح ہیں۔ بھلی یا بری فقیر کے بھیس میں ہم تک آئے۔ کھانے کی زنبیل پوری بھری کی بھری نوش جان کر گئے۔ کہیں آدمی کی خوراک اتنی ہوتی ہے۔ اور پھر کہیں آدمی کا یہ کام ہو کہ آج سے سو برس پہلے جوانی میں دیکھے ہوئے شہروں کا حال کہنے بیٹھ جائے۔ اور یہ بھی کہے کہ میرے مردہ شوہر کی روح خواب میں اس کے پاس باتیں کرنے آتی تھی بیٹی، بات یہ ہے کہ جس طرح جہاز کے وہ ملاح تھے اسی طرح کے یہ بھی کوئی ہیں۔"

طیبہ: "اگر یہ کسی کی روح ہیں تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ ہم کو تو روحوں ہی نے ہر طرح کے خطروں سے اب تک بچایا ہے۔ اگر وہ مہربان نہ ہوتیں تو میں تو اب تک کبھی کی مر چکی ہوتی یا بے عزتی اور بے شرمی کی زندگی کاٹتی ہوتی۔"

آشتی اس وقت تھک گئی تھی، کچھ دھوپ سے پریشان تھی۔ گھبرا کر بولی: "بیٹی یہ حال تو آخر میں کھلے گا۔ کیا معلوم آگے کیا ہونیوالا ہے۔ اس وقت تو کسی طرح یہ رستہ کٹ جائے۔ اس کے سوا اور کوئی آرزو نہیں۔"

گھنٹوں تک یہ عورتیں رستہ چلتی رہیں، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اب رستہ ریت اور پتھروں کے ایک اونچے ٹیلے پر سے گذرتا تھا۔ تھکی ہاری عورتیں بڑی مشکل سے ٹیلے کی چوٹی پر پہونچیں۔ دم لینے کو ٹھہریں تو دیکھا کہ نیچے ایک نہایت سر سبز و شاداب وادی ہے اور اس میں ایک بڑا شہر آباد ہے جس کے چاروں طرف شہر پناہ ہے اور جہاں یہ کھڑی ہیں وہاں سے کچھ بہت دور بھی نہیں ہے۔ کیفر جو آگے چل رہا تھا۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہونچکر ٹھہر گیا۔ جب یہ عورتیں بھی اس کے قریب پہونچیں تو ان کو اس جگہ لے گیا جہاں درخت بہت گھنے اور پاس پاس تھے۔ اور کہنے لگا: "بیٹی، اب تم اور آشتی منہ سے نقابیں اٹھا کر یہاں آرا

کہ اگر کوئی تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ ہم غریب لوگ ہیں، گانا بجانا ہمارا پیشہ ہے۔ سفر سے تھک کر یہاں کچھ دیر دم لینے کو بیٹھ گئے ہیں۔ اور اگر مرضی ہو تو موتیوں کی کسی لڑی میں سے ایک چھوٹا سا موتی مجھے نکال کر دو تاکہ شہر میں جاکر میں اسے بیچوں، اور کچھ کھانے پینے کا سامان لاؤں اور شہر میں تمہارے رہنے کے لئے کسی مکان کا بندوبست بھی کرتا آؤں۔ اس شہر کا نام تاستا ہے۔

طلیہ نے بڑی نقاہت سے کہا: پوری ہی لڑی لیجائیے؟

کیفر: نہیں، پوری لڑی درکار نہیں ہے۔ ایک موتی بالکل کافی ہوگا۔ کیونکہ اس شہر میں موتی بڑی قیمت میں بکتا ہے۔

طلیہ نے ایک لڑی نکالی اور ایک موتی اس میں سے نکال کر کیفر کو دیا۔ یا خود کیفر نے لڑی سے موتی نکال کر ڈورے کے دونوں سرے اس طرح باندھ دئے کہ سب کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی عمر کا بڈھا۔ پھر نظر میں اتنی قوت کہاں سے آئی۔ موتی لیتے ہی کیفر ڈگیں مارتا ہوا شہر کی طرف چل پڑا۔

آکشتی نے کہا: کس کو خبر ہے کہ یہ بڈھا خواہ آدمی ہو یا جن پھر بھی اپنی صورت دکھائیگا یا نہیں۔

طلیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بہت ہی تھک گئی تھی۔ ایک درخت کے تنے سے سہارا لیکر اونگھنے لگی۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ آفتاب غروب ہوچکا ہے اور سامنے کیفر کھڑا ہے، اور پاس ہی دو حبشی سائیس زین کسے کسائے دو گدھوں کی لگامیں پکڑے کھڑے ہیں۔

کیفر نے بآواز بلند کہا: مسافر بیویوں، سوار ہو جاؤ۔ آپ کے لئے مکان کا بندوبست بھی میں نے کر دیا ہے۔

دونوں عورتیں سوار ہو کر چلتے چلتے شہر کے دروازے پر پہونچیں۔ کیفر کی آواز سنتے ہی دربانوں نے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اور اب ایک لمبے تنگ سے بازار میں سے ہوتے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر پہونچے۔ مکان ایک باغ کی چار دیواری کے اندر واقع تھا۔ گدھوں کی پیٹھ سے دونوں عورتیں اتریں اور حبشی گدھوں کو ایک طرف کو لے گئے۔ جب مکان کے اندر آئیں تو معلوم ہوا کہ آرام و آسائش کا سامان جس قدر ہو سکتا ہے سب مہیا ہے اور ایک طرف کمرے میں میز پر طرح طرح کے کھانے چنے ہیں۔ سب سے پہلے دونوں عورتیں کھانے کی میز کے قریب گئیں اور وہاں بیٹھکر خوب کھانا کھایا اور جب فارغ ہوئیں تو کیفر نے ایک عورت سے جو یہاں کی خادمہ تھی کہا کہ ان دونوں بیویوں کو ان کی خوابگاہ دیتا دو کہ وہ آرام کریں۔ میں خود باغ میں سو رہوں گا۔

طلیہ اور آکشتی خوابگاہ میں پہونچیں۔ اتنی تھکی ہوئی تھیں کہ کچھ بات چیت نہیں کی پلنگ پر لیٹتے ہی غافل سو گئیں۔

عنایت اللہ۔ بی۔ اے

مندرجۂ بالا مضمون ایک باب ہے جناب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی ناظم دار الترجمہ حیدرآباد۔ دکن کی کتاب "نجم السحر" کا جو ساقی بکڈپو کے اہتمام سے زیر طبع ہے۔ یہ باب بجائے خود بھی مکمل ہے اس لئے ساقی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسے مشتے نمونہ از خروارے سمجھئے۔

شاھد

شیخ سے خطاب

پا چکا طاعت کی لذت، درد کی پہلو بھی دیکھ
شیخ! محراب سے باہر، خمِ ابرو بھی دیکھ

آدمی ہے تو، ادا کر کچھ تو حقِ چشم و گوش
نغمۂ مطرب بھی سُن، حُسنِ رُخِ نیکو بھی دیکھ

تا کجا طنبورۂ یزداں فریبِ خانقاہ؟
آ کسی دن میکدے کا رقصِ ہائے و ہو بھی دیکھ

سر جھکانے ہی کو سمجھا ہے مآلِ زندگی؟
جس سے سر جھکتا ہے، حق جوئی کا وہ پہلو بھی دیکھ

چونک، او دیوانۂ گلگشتِ حورانِ بہشت!
دو گھڑی میدان میں آ کر رمِ آہو بھی دیکھ

ضربتِ تیغِ مجاہد کے ثناخوانِ قدیم!
بے ستوں پر کوہکن کی قوتِ بازو بھی دیکھ

فرشِ مسجد سے اُٹھا بھی مکر سے لبریز سر
رکھ کے زیرِ سر کسی معشوق کا زانو بھی دیکھ

موشگافی تا کجا "واللیل" کی تفسیر میں؟
مہوشوں کے دوش پر بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ

عشقِ "مولیٰ" کیلئے ہے عشقِ "انساں" ناگزیر
درسِ بیرنگی بھی لے طوفانِ رنگ و بو بھی دیکھ

گیسوئے طاعت میں پیدا کر خمِ سوز و گداز
دانۂ تسبیح پر بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھ

اے ہلالِ عید کی رویت کے مشتاقِ کہن
خنجرِ بُرّاں کو شرماتے ہوئے ابرو بھی دیکھ

سحر، اوراد و وظائف کا مسلّم ہے، مگر
نرگسِ مستانہ کا چلتا ہوا جادو بھی دیکھ

حُسن ذرّوں سے اُبلتا ہے، کبھی تو جام اُٹھا
دیکھتی ہیں جوشؔ کی آنکھیں جو عالم، تو بھی دیکھ

جوش ملیح آبادی

عالمِ ارواح سے

میں حیات بعد ممات کا کچھ ایسا زیادہ قائل نہیں، لیکن بعض واقعات صریح اس خیال کی شہادت دیتے ہیں اور ہم انکار نہیں کر سکتے کہ مرنے کے بعد بھی روح کا اپنے زندہ عزیزوں کیساتھ کچھ نہ کچھ تعلق باقی رہتا ہے اور نہ صرف یہی بلکہ بعض اوقات وہ اپنے عزیزوں کی خاطر کسی پُراسرار طریقہ پر کوئی ایسا کام بھی کر گذرتی ہے جو ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

پانچ برس ہوئے محمد سلیمان کو رام نگر میں پھانسی دی گئی تھی۔ اُس نے ایک بنک میں چوری کی تھی اور ایک کلرک کو گولی سے مار دیا تھا۔ کچھ دن تک وہ روپوش رہا لیکن بالآخر گرفتار ہوا اور وکیلوں کی پُرزور کوششوں کے باوجود اُس نے فوراً اقبالِ جُرم کر لیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۳۰ء کو اُسے پھانسی ہوئی جسے آج پورے پانچ برس ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے اوائل میں وہ کچھ دن تک میری ایک دوکان پر منیجر کی حیثیت سے ملازم رہا تھا۔ ایسا محنتی، دیانتدار اور خاموش انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہرچند خادم و مخدوم کے تعلقات صرف کاروبارانہ قسم کے ہوتے ہیں لیکن سلیمان کی باوقار شخصیت نے پہلے ہی دن سے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی جس کا لازمی نتیجہ ہم دونوں کی دوستی تھا۔ وہ فطرتاً گوشہ نشین، بلند ہمت، جفاکش، ایماندار، راست گو اور ذہین واقع ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے قطعی بے تکلف ہو جائیں لیکن خادم و مخدوم کے ناخوشگوار رشتہ کے سبب اور کچھ اس وجہ سے کہ سلیمان انتہا درجہ کا فرض شناس اور باادب تھا ہمارے تعلقات معمولی دوستی سے زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

چھ ماہ بعد سلیمان اچانک غائب ہو گیا۔ مجھے اس کا علم تھا کہ اُس کی زندگی میں ایک حسین مگر بے ڈھنگی اور بدشعور لڑکی کو بہت کچھ دخل تھا۔ بعد میں مزید حالات بھی معلوم ہوئے ——— محبت ایک ایسا دخل انداز جذبہ ہے جو انسان کو سیدھے راستے سے ہٹا کر یا تو ایک دم بلندی پر لیجاتا ہے یا ایک دم پستی میں دھکیل دیتا ہے۔ خیر، اُس لڑکی کی شادی ہو گئی ایک ایسے شخص کیساتھ جو سلیمان کا رقیب تھا۔ بھلا سلیمان کو اس کی کہاں تاب۔ دُنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ انتقام لینے کی ٹھانی مگر روپیہ کا حاصل کرنا سب سے بڑا سوال تھا۔ شدید غم اور انتقام کے مستحکم ارادے نے ہوش و حواس کھو دئے۔ اُس نے رام نگر کے بنک پر چھاپا مارا اور ایک کلرک کو گولی کا نشانہ بنایا۔

میں اتفاق سے اُن دنوں رام نگر ہی میں تھا جبکہ سلیمان پھانسی کا حُکم سُننے کے بعد ایک اور متعفن کال کوٹھڑی میں آنے والے دن کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اتفاقیہ مجھے اس واقعہ کا علم ہوا اور میں نے فوراً اس سے ملنے کی اجازت حاصل کر لی۔

سلیمان کا چہرہ بشاش تھا۔ نام کو ہراسانی یا وحشت نہ تھی۔ وہی سنجیدگی، وہی متانت اور وہی خاموشی اُس کی عالی ہمتی پر دلالت کر رہی تھی۔ ایک معنی خیز مگر دہشت اثر مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ اپنی آنے والی موت کا اس اطمینان سے تذکرہ کر رہا تھا گویا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مجھ پر دہشت سی سوار ہونے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اُس کی

تو یہ متانت اور پُر رُعب سنجیدگی میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کر رہی ہے۔

"مجھے اپنی موت کا ذرا بھی رنج نہیں۔ قتل کا لازمی نتیجہ پھانسی ہے۔ ہے اور رہیگا۔ کیوں ــــ؟!!!! ــــ مگر مجھے خیال ہے کہ میری ماں کو اس کا بہت رنج ہوگا۔ لیکن جام پور (اُس کا وطن) تک اخباروں کی پہونچ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہاں پڑھے لکھے آدمی ہی کتنے ہیں۔ ایک بڈھے مولوی صاحب ہیں بس۔ اُن کو اخباروں سے دلچسپی نہیں۔ اس لئے میری ماں کو اس کا علم نہ ہو سکے گا۔ اخباروں میں بھی میرے متعلق شاید ہی کچھ ہو۔ ایک سیدھا سادا قتل۔ اور اُس کے بعد پھانسی۔ بس۔ کوئی دلچسپ رومان نہ کوئی حیرت انگیز انکشاف! کیوں؟ غنیمت ہے کہ جمیلہ (اُس کی محبوبہ) سے متعلق میری زبان سے کچھ نہ نکلا ورنہ اخبار والے پوری کہانی بنا کر چھاپتے ــــ جمیلہ کا قاتل عاشق! ہوں!! ــــ سگریٹ پیو دوست۔ تمہارے سگریٹ قیمتی ہوتے ہیں۔ دُنیا سے چلتے وقت ایسے ہی قیمتی سگریٹ پینے چاہئیں۔ آہاہاہا!!!"

قید خانے کی دیواریں اُس کے وحشتناک اور ہنگامہ آفریں قہقہوں سے گونج رہی تھیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اُس کی نظریں سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے پر جم گئیں۔ یکایک میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔ "دو برس سے یہ میرا معمول تھا کہ میں ہر مہینے اپنی ماں کو ایک خط لکھا کرتا تھا۔ اُسے مجھ سے بہت محبت تھی اور وہ بے چینی سے میرے خطوں کا انتظار کرتی تھی۔ میرے پاس بھی ہر مہینے اُس کا ایک خط آیا کرتا تھا۔ وہ خود لکھنا نہیں جانتی۔ مولوی صاحب سے لکھوا کر بھیجتی تھی ــــ اب، اب جب اُسے میرا کوئی خط نہیں ملے گا تو وہ کیا کرے گی۔ ہوں؟؟؟" مجھ میں جواب دینے کی طاقت نہیں تھی۔ "وہ پریشان ہو جائے گی۔ طرح طرح کے خیال اُس کے دل میں آئیں گے۔ پھر وہ مولوی صاحب کو بلائے گی۔ مولوی صاحب بھی پریشان ہو جائیں گے۔ یہاں کی پولیس کو لکھیں گے۔ پولیس جواب دیگی کہ جناب سلیمان کو قتل کرنے کی پاداش میں پھانسی دیدی گئی۔ مولوی صاحب خط لئے ہوئے میری ماں کے پاس جائیں گے۔ وہ بیہوش ہو جائے گی ــــ قاتل کی ماں!!! ــــ مولوی صاحب کے ہاتھ سے خط کو چھین کر چھپا دے گی۔ پھاڑ دے گی۔ جلا دے گی۔ اُسے کسی طرح یقین نہ آئے گا۔ پھر کیا ہوگا!!؟"

اُس کی دہشت ناک نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں دم بخود تھا۔ اچانک وہ اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے طاق کی طرف بڑھا جہاں کچھ کاغذ۔ لفافے اور قلم دوات وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ شاید اُسے لکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اُس نے کچھ لفافے اُٹھائے اور میرے سامنے ڈال دئے۔ سب لفافے بند تھے اور سب پر اُس کی ماں کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ تعداد میں بیس پچیس ہوں گے۔

"ان سب میں ایک ایک خط ہے جو میں نے ایک افسانہ نگار کے سے تخیل سے کام لیکر لکھا ہے۔ ہر ایک پر حساب سے تاریخ ڈالی ہے۔ اب تک میں صرف اِسی قدر لکھ سکا۔ شاید مرنے سے پہلے اتنے ہی اور لکھ لوں گا۔ گویا چالیس پچاس خط ہو جائیں گے۔ اس طرح میری ماں کو چار ساڑھے چار سال تک میرے مرنے کا علم نہ ہوگا۔ اب اُس کی عمر ۶۰ برس کی ہے۔ دمہ کا عارضہ اس کو پُرانا ہے ــــ بیچاری ماں!!! ــــ شاید وہ اتنے عرصے تک زندہ نہ رہ سکے۔ اور اگر رہی تو اُسے مجھ سے زیادہ میری موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑیگا۔ میں اس دُنیا میں اکیلا ہوں۔ تنہا۔ کوئی دوست نہیں سوائے

تمہارے ذمے اس سے اہم فرض تمہارے ذمہ ہے۔ ساڑھے چار سال تک ہر مہینہ پابندی سے ایک خط ڈاک میں ڈال دیا کرو۔ مجھے بتاؤ یہ کام معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایک مستقل عذاب ہے۔ چالیس مہینے تک سخت پابندی کرنا آسان نہیں۔ خیر، اگر تم اس کام کو اتنی اہم ذمہ داری یا دردِ سری کے متحمل نہ ہو سکو گے تو اسی وقت صاف صاف کہدو۔ میں ابھی ان خطوں کو جلا دیتا ہوں ـــ لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ اپنی ماں کی پریشانی سے میری رُوح مضطرب رہے ـــ اپنی موت کے متعلق تم نہیں جانتے یہی خیال سوہانِ رُوح ہو رہا ہے ـــ اُف، بے چارگی ـــ لاچاری ـــ بے بسی!!!

شدتِ کرب سے وہ ہونٹ چبانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ضمیر کی مسلسل ملامت نے اُسے خود اپنی نظر میں بہت گرا دیا ہے۔ میں خاموش رہا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ سلیمان! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں نہایت پابندی سے یہ خطوط روانہ کرتا رہوں گا۔ اُس کا رنج ایک دم سے بے پایاں مسرت کی ایک چیخ میں بدل گیا اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"شکریہ ہمدم شکریہ! مجھے یقین تھا دوست، کہ تم میری آخری آرزو کو ضرور پورا کرو گے۔ میں نے ان خطوں میں تمہارا ہی پتہ لکھا ہے۔ اس لئے اس کے جواب تمہارے ہی پاس آئیں گے۔ تم انہیں تلف کر دیا کرنا اور اگر چاہو تو پڑھ بھی سکتے ہو ـــ ہاں! میں چاہتا ہوں کہ اظہارِ ممنونیت میں تمہیں کچھ دوں۔ ہا ہا ہا۔ مگر ایک بہت جلد مر جانے والا قاتل کیا دے سکتا ہے؟" اس نے اپنے گردو پیش نظر کی۔ پھر اپنے لباس کو دیکھا۔ جلدی سے اپنے گلے میں سے ایک کثیف سا مفلر اُتارا۔ اُسے بار بار چوما اور پھر میرے گلے میں ڈال کر کہا "آج سے سات برس پہلے میری ماں نے اپنے ہاتھ سے یہ مفلر میرے لئے بُنا تھا۔ مجھے اُمید ہے تم اس کی اُتنی ہی قدر کرو گے جتنی میں کرتا رہا ـــ اچھا۔ دوست! اب تم ۱۹ تاریخ کی شام کو آنا میں تمہیں بقیہ خطوط دوں گا اور وہ ہماری آخری ملاقات بھی ہوگی ـــ خدا حافظ!!!"

۱۹ تاریخ کی شام کو اُس نے مجھ سے زیادہ باتیں نہ کیں اور بیس خط دے کر ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہا۔ میں پریشان و مبہوت فوراً ہی رام نگر سے روانہ ہو گیا۔ اس لئے کہ وہاں رہ کر میں اُس کی موت کا خوفناک منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے گھر آ کر بھی میں نے محسوس کیا کہ ۲۰ نومبر کے سورج کی اوّلین کرن کچھ خون آشام سی تھی۔ موت کے گھنٹے کی صدائے دردناک بھی میرے کان میں آئی۔ تمام دن میں کچھ کھویا کھویا سا رہا اور ایک غمناک دہشت سی مجھ پر طاری رہی۔ دوسرے دن میں نے اُس کا پہلا خط روانہ کر دیا اور نہایت پابندی سے ہر مہینے ایک خط روانہ کرتا رہا۔ اُس کی ماں کے جوابات بھی باقاعدہ آتے تھے۔ چونکہ مرحوم نے اس کے جوابات پڑھنے کی اجازت دیدی تھی اس لئے میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ غالباً مرحوم نے ہر خط میں یہی لکھا تھا کہ میں اچھا ہوں معقول تنخواہ مل رہی ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ فرصت کم ہوتی ہے وغیرہ۔ اُس کی ماں کے جوابات نہایت دلدوز ہوتے تھے اور اکثر میں بے اختیار رو دیا کرتا تھا۔ تمام خط دُعاؤں سے بھرے ہوتے تھے اور قریب قریب ہر خط میں اُس سے ملنے کا اشتیاق اور بُلانے کا اصرار ہوتا تھا۔ ایک خط خاص طور پر مؤثر تھا کہ اُسے میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ لیکن بطورِ تقریب اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ مرحوم کی ماں نے کچھ رقم خرچ کیلئے طلب کی تھی۔ میں نے ستر روپے بھیج دئے تھے۔ یہ خط گویا اُن روپوں کی رسید ہے۔

"بیٹا۔

جیو، خوش رہو، خدا صاحب اقبال کرے۔ تمہارے بھیجے ہوئے روپے ملے، کیا بتاؤں کتنی خوشی ہوئی۔ مگر میں سے تاکے روپے کب منگائے تھے۔ دس ہی بھیجدیتے میرے اکیلے دم کیلئے بہت تھے۔ خدا تمہیں بہت سا دے۔ لاکھوں کروڑوں تمہارے روپوں میں سے بیس مولوی صاحب کو دیئے۔ یہ جتانے کیلئے کہ میرا سلیمان اللہ رکھے ہزاروں برس زندہ رہے، کہ اب اتنا کمانے لگا کہ میں بیس بیس پچیس پچیس روپے یونہی دیدیتی ہوں۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور تمہیں بہت سی دعائیں دیں۔ اب اُن کا لڑکا خط لکھا کرتا ہے اور میں اُسے بھی کچھ نہ کچھ دیدیا کرتی ہوں۔

تمہارے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمہارے مالک بہت نیک اور رحمدل ہیں اور تم سے مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ خدا اللہ کو اس کا اجر دیگا۔ اُنکے لئے بھی میں ہر وقت دست بدعا ہوں۔ میں بڑھیا اپاہج سوائے دعا کے اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔

بیٹا۔ اب تو اتنے دن ہوگئے تمہاری شکل دیکھنے کو ترس گئی۔ جلدی آؤ میں نے تمہارے لئے ایک خوبصورت سی دلہن تلاش کر رکھی ہے۔ سچ کہتی ہوں جام پور بھر میں ایسی سلیقہ والی چاندسی لڑکی نہیں مل سکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی والے خود ندرسے رہے ہیں۔ اب صرف تمہارا انتظار ہے۔ تم آجاؤ تو بڑھیا ماں اپنے ارمان پورے کرے۔ سچ جاننا ہر وقت دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا رہتی ہے اور ذرا سی آہٹ پر یہ سمجھتی ہوں کہ میرا سلیمان آیا!!! ایسی بھی نوکری کس کام کی۔ ایک نہ دو اکٹھے تین برس گذر گئے اور میں تمہاری آواز تک کو ترس گئی۔ میرے تو کوئی جواب دے چکے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ وقت آپہنچا۔ آج کل کی دیر ہے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ مر بھی گئی تو تمہیں دیکھنے کو آنکھیں کھلی رہیں گی۔ زیادہ دعا۔

تمہاری ماں"

سلیمان کو پھانسی پائے چار برس گذر گئے اور میں اُس کے تمام خط روانہ کر چکا تھا۔ پرسوں اُس کے آخری خط کا جواب آگیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اُسکی ماں ابھی تک زندہ ہے۔ اب جو ایک دم سے سلیمان کے خط بند ہو جائینگے تو اُسے ضرور تشویش ہوگی اور ممکن ہے کسی طرح واقعہ کا علم ہو جائے۔ بغرض سارا مہینہ اسی پریشانی میں گذر گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب دوسرے مہینہ کے اوائل میں اُس کی ماں کا خط موصول ہوا۔ مضمون اُسی قسم کا تھا کہ تمہارا خط آیا، حال معلوم ہوا وغیرہ۔ دوسرے مہینہ پھر خط ملا اور دس مہینے تک برابر اسی طرح خط موصول ہوتے رہے۔ دسویں خط میں یہ لکھا تھا کہ "میرے جینے کی اب کوئی آس نہیں"۔ اسکے کچھ دن بعد مولوی صاحب کی طرف سے ایک تار موصول ہوا جسمیں سلیمان کی ماں کے انتقال کی خبر تھی۔ مجھے اسکا بہت صدمہ ہوا اور میں پہلی ٹرین سے جام پور پہنچا۔ تجہیز و تکفین ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ "مجھے سلیمان نے بھیجا ہے۔ مرحومہ کے سامان میں سے صرف کچھ کاغذات منگوائے ہیں اور باقی سارا سامان آپ کو دینے کو کہا ہے"۔ مولوی صاحب مجھے مرحومہ کے مکان پر لے گئے۔ سب سے پہلے میں نے سلیمان کے خطوں کو تلاش کیا۔ ایک الماری کی دراز میں سب خط باحتیاط رکھے تھے۔ تعداد میں ۵۰ تھے۔ میرے پاس اُسکے کل ۴۰ خط تھے۔ باقی کے دس خطوں کا بھید کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ طرز تحریر وہی، سیاہی وہی، حتیٰ کہ ٹکٹ پہ ڈاکخانہ کی مہر بھی موجود تھی۔ یہ سب خط اور ایک پرانا دقیانوسی سا سنگار دان بطور یادگار لیکر میں دوسری ٹرین سے واپس آگیا۔ سنگار دان میں سلیمان کا دیا ہوا مفلر اور وہ سب خط احتیاط سے رکھدئے۔ کچھ دن بعد دیکھا تو صرف ۴۰ خط تھے، باقی کے دس ندارد۔

(ماخوذ) ———— انصار ناصری۔ بی۔ اے

(سلسلہ پیوستہ)

جاپان اور منچوریا

اگر ہم ذرا عمیق نظر سے اس مسئلہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کو منچوریا پر حکومت کرنے کا ایسا ہی حق ہے جیسا چین کو۔ چین خاص اور منچوریا کے درمیان دیوار چین کی موجودگی سے چین کے اس دعوے کا بطلان ہوتا ہے کہ منچوریا چین کا ایک حصہ ہے۔ منچوریا اُسی وقت حدودِ چین میں شامل ہوا تھا۔ جب چودھویں صدی میں مغلوں کے زوال کے بعد خاندانِ منگ نے چین فتح کیا تھا۔ یہی حال منگولیا، تبت اور مشرقی ترکستان کا ہے کیونکہ یہ صوبے چین میں اس وقت شامل ہوئے تھے جب مغلوں نے چین فتح کیا تھا۔ اس مسئلہ پر اخبار مارننگ پوسٹ اس طرح رائے زنی کرتا ہے کہ "وہ احساس تاریخی جو ایشیائی معاملات کے سمجھنے میں نہایت اہمیت رکھتا ہے لٹن کمیشن کی رپورٹ سے مفقود ہے۔ یہ رپورٹ ایسی تاریخ کی عظمت سمجھنے سے قاصر ہے جو دیوار چین کی شکل میں پتھروں سے لکھی ہوئی ہے۔ یہ دیوار اگرچہ اپنا اصلی مقصد پورا نہیں کر سکی یعنی مغل اور منچو اقوام کو چین پر حملہ کرنے سے نہ روک سکی۔ تاہم چین خاص اور منچوریا کے درمیان جغرافی اور نسلی امتیاز کی لازوال یادگار ہے۔ منچوریا کبھی چین میں شامل نہیں ہوا وہ خاقان منچو اور خاندان شاہی کے لئے بمنزلہ علاقہ صرفِ خاص تھا۔ پھر ایک مدت کے بعد جب شمالی چین و جنوبی چین میں اتحاد ہوا تو جدید "آسمانی فرزند" کو یہ علاقہ بطور جہیز کے ملا۔ اس علاقہ میں چینیوں کا داخلہ سختی سے مسدود تھا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۲ء تک جیسا کہ شاہی فرمان نافذ ہوا، چینیوں اور منچوریا والوں میں مناکحت ناجائز تھی۔........ ٹھیک اسی طرح جیسے ہمیشہ سے انگلستان کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ممالک ہالینڈ و بلجیم کی آزادی بمنزلہ بفر اسٹیٹ کے قائم رکھی جائے جاپان کو اپنی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ کوریا اور منچوریا کو روسی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھے۔ نیز جاپان کی یہ پالیسی کہ چین کا ملک (جس کا علاقہ قوم منچو کوئی لازمی جزو نہیں ہے) غیر قوموں کی دستبرد سے محفوظ رکھا جائے اصولِ منرو کے مشابہ ہے کیونکہ اس اصول کی حفاظت میں ممالک متحدہ کبھی اعلانِ جنگ سے احتراز نہیں کریگا"

لٹن رپورٹ کے بموجب سنہ ۱۸۶۰ء میں بعض حصص منچوریا کے دروازے کھول دئے گئے تھے، اور باشندگانِ چین کو منچوریا میں نقل مکان کی ترغیب دی جاتی تھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ وہ شاہی اعلان جس کی رو سے چینیوں کو دیوارِ چین کے عبور کرنے کی ممانعت تھی سنہ ۱۹۰۵ء کے پہلے منسوخ نہیں ہوا۔ یہ تنسیخی اعلان سنہ ۱۹۱۱ء تک کچھ موثر ثابت نہیں ہوا اور اس کے بعد بھی دس برس تک منچوریا میں آباد ہونے والے چینیوں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چین میں خانہ جنگی کا شباب تھا اور چینیوں کو جاپان کے زیرِ اقتدار منچوریا میں امن نصیب ہوا۔ تاہم منچوریا کی ستر فیصدی آبادی منچو قوم کی ہے چینی

حکومت کے دوران میں منچوریا کو کوئی ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ جاپان نے جنوبی منچوریا میں نیم قبضہ کے دوران میں منچوریا کے وسائل کو نہایت ترقی دی ہے۔ تمام گذشتہ تاریخ اس امر کی کثیر شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ بغیر منچوریا کے چین زندہ اور خوش حال رہ سکتا ہے۔

چین میں مغلوں کا عہدِ حکومت چینی تاریخ کا ایک شاندار صفحہ ہے اور اس عہد میں سلطنت چین کی حدود نہایت وسیع ہوگئی تھیں۔ عہدِ مغلیہ کی حدودِ سلطنت چین میں زمانہ حال تک تقریباً ویسی ہی قائم رہیں لیکن زمانۂ حال کا چین، قدیم چین نہیں ہے۔ دُور افتادہ صوبوں میں چینی آباد نہیں ہیں۔ یہ صرف ماتحت صوبے تھے جو موجودہ بدامنی میں خود مختار ہوگئے ہیں۔ جب کہ چین خاص خانہ جنگی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے چینیوں کی یہ کوشش کہ ان دور افتادہ صوبوں کو پھر فتح کرکے چین کا ماتحت بنا لیا جائے بے سود ہے چین خاص کے اٹھارہ صوبے خود بہت وسیع ہیں اور اگر ان کو ایک گورنمنٹ کے ماتحت متحد کر لیا جائے تو چین کی سلطنت پھر بھی بہت وسیع سلطنت رہے گی۔ دور افتادہ صوبوں کو اپنے طریقہ پر نشوونما حاصل کرنے کی اجازت ملنی چاہیئے جیسے جنوبی امریکہ کی جمہورتیوں کو ممالک متحدہ نے بالیدگی کا موقع دیا ہے چین خاص کی آبادی اتنی گھنی نہیں ہے جتنی جاپان کی ہے بلکہ اس کی نصف ہے اور اگر ملک میں امن و امان ہو تو چین کی ترقی کے لئے وسیع میدان ہے۔ چینیوں کی قومیت پرستی دراصل شہنشاہیت پرستی ہے، کیونکہ وہ دوسری قوموں کو اپنا ماتحت بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ چین کے قائدین دوسرے ملکوں پر شہنشاہیت پرستی کا الزام لگاتے ہیں لیکن خود مغل اور منچو فاتحوں کے نقش قدم پر چل کر عملاً وہی کر رہے ہیں جو مغربی اقوام کرتی ہیں۔ مغربی اقوام کم از کم اپنے ملک میں امن اور اتحاد قایم کرکے فتح ممالک کا عزم کرتی ہیں لیکن چین میں یہ بھی میسر نہیں۔ اپنے گھر میں امن قائم کئے بغیر چینی قائدین ان عہدناموں کی تنسیخ کا مطالبہ کر رہے ہیں جن کی رو سے ہی ایسی بدامنی میں غیر دول اپنے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت کے ذرائع اختیار کرسکتے ہیں منچوریا میں جاپانی اثر کا قلع قمع کر دینے کی خواہش بھی اسی زمرہ میں داخل ہے۔

ایسے حوصلہ مندانہ پروگرام پر عمل کرنے کے لئے ان کو باہم متحد ہوجانا چاہیئے تھا مگر وہاں نااتفاقی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسٹر باڈلی جو اخبار اسفیر کے نامہ نگار خصوصی ہیں چین کی اندرونی حالت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ "قضیۂ منچوکوؤ کے دوران میں شروع سے آخر تک حادثہ شانگھائے کے دوران میں، اور موجودہ مرحلہ میں (یعنی جیہول میں جاپانی پیشقدمی کے دوران میں) جنرل سو سیانگ چن جیسے قائدین نے اپنے ملک والوں کی پیٹھ میں خنجر مار کر اپنی قوم پرستی کے اظہار کا کوئی موقع خالی نہیں جانے دیا۔ یہ چینی افواج، خواہ وہ گورنمنٹ کی ہوں یا باغیوں کی، اپنے اہلِ ملک کے لئے کوئی احساس ہمدردی نہیں رکھتیں اور جن علاقوں میں سے گذرتی ہیں اُن کو لوٹنے اور تباہ کرنے سے کبھی غافل نہیں ہوتیں، یہانتک کہ اوائل [illegible] ء میں جب وہ جاپانیوں کے خلاف بڑھکر شان ہائی کوان پہنچیں تو چینی آبادی بھاگ کر حفاظت کے لئے جاپانی افواج کی

چھٹان کی جھڑپ سے امن ملا اور چینیوں کی ملکی افواج نے ان کے گاؤں لوٹے۔

"ستمبر ۱۹۳۱ء میں کسی نے جنوبی منچوریا ریلوے کا ایک حصہ بارود سے اُڑا دیا تھا تو میں شمالی چین کی ایک چھوٹی بندرگاہ مسمی اتیاہیو نیچ تائی میں مقیم تھا۔ اول اول کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کیا واقعہ ہے اور ریل گاڑیوں کے رک جانے سے افواہیں پھیلنے لگیں...... جب آخرکار یہ معلوم ہوا کہ جاپانی چینیوں کے تشدد آمیز برتاؤ سے تنگ آکر فوج سے جواب دینے لگے ہیں تو عام وحشت طاری ہو گئی اور مزید حالات کا انتظار کئے بغیر ہر شخص بے تحاشا اصلی لائن کی طرف بھاگا (یہ بندرگاہ ایک شاخ ریلوے پر واقع تھی) کہ وہاں کسی نہ کسی قسم کی سواری مل جائیگی جس میں بیٹھ کر پیکن یا ٹینٹسن پہنچ کر وہاں غیر ملکی سفارتخانوں کی پناہ میں امن حاصل کر لیں۔ مگر ہم غیر ملکیوں کے لئے ایک جگہ سے ہلنا آسان کام نہ تھا۔ ریل گاڑی کا تو سوال ہی نہ تھا، کیونکہ پیکن مکڈن لائن پر تمام مسافر ڈبے، تمام مال کے ڈبے، غرضیکہ ہر قسم کی گاڑی پر چینی فوج کا قبضہ تھا جو مفروضہ جاپانی افواج کے آگے شاندار پسپائی پر اتنی سرعت سے عمل پیرا تھی جتنی گاڑی کے پہیوں پر میسر ہو سکتی ہے...... آخر دس روز کے انتظار کے بعد ہم کو ٹینٹسن جانے والی گاڑی پر جگہ ملی۔ جس نے چھ گھنٹے کا سفر چودہ گھنٹے میں طے کیا کیونکہ ہر اسٹیشن پر ہماری گاڑی شینٹ کر دی جاتی تھی کہ چین کی فکرمند افواج کی گاڑیاں جو دشمن کی جانب جانے کی بجائے مخالف سمت میں سفر کر رہی تھیں گزر جائیں۔

"پھر ایسے ملک میں لوگ کس منہ سے اتحاد اور وطن پرستی کے الفاظ منہ سے نکال سکتے ہیں جو نہ صرف پہلے فوجی مظاہرہ سے درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ ایسے موقع پر خانہ جنگی میں مبتلا رہتا ہے۔ جب قوم کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا رہا ہو؟ کوئی کس طرح ہمدردی کر سکتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ چین کے آئندہ حکمران غیر ملکی سفارتخانے کے ملحقہ علاقہ کینسشن میں پناہ لیتے ہیں جس کے مٹانے کی اُنہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے اور اُن لوگوں سے حفاظت کے طلبگار ہوتے ہیں جن کو قتل کرنے میں اِنہیں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اگر انہیں موقع مل جائے۔"

"مشرق بعید کی تشکیل میں جاپان کا منصب واضح ہے۔ اگر وہ چھوٹی سلطنتیں، جو منچوریا میں جاپان کے طرزِ عمل پر اتنا شور مچا رہی ہیں، اپنے نمائندوں کو چند ہفتے بسر کرنے کے لئے ہوتان یا شنسی میں بھیجیں۔ تو یہ یقینی ہے کہ اگر وہ زندہ سلامت واپس چلے آئیں تو کچھ اور ہی سُر الاپیں گے۔"

منچوریا میں جاپان کی حالت چین سے بالکل مختلف ہے۔ لندن کا اخبار ڈیلی میل رقمطراز ہے کہ "جاپان کی زندگی کا دارومدار منچوریا میں اقتدار حاصل کرنے پر ہے۔ اگر جاپان کے ہاتھ سے یہ اقتدار نکل جائے تو اس کی نو کروڑ کی روز افزوں آبادی کا ایک کثیر حصہ فاقوں مر جائیگا۔ اگر ہم تہ تک نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ جاپان چین کی حریفانہ کارروائیوں کی مدافعت کر رہا ہے۔ اِس فساد کا بانی لیگ اقوام ہے، اگر وہ چین کو شہ نہ دیتا تو چین ہرگز جاپان کو میدانِ عمل میں اُتر آنے پر مجبور نہ کرتا۔ ایک امریکن جس کی رائے سے

جاپانی معاملات میں استناد کیا جاتا ہے اور جس پر جاپان کی جانبداری کا ہرگز گمان نہیں کیا جاسکتا بیان کرتا ہے کہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ معمولی بین الاقوامی معیار کو ملحوظ رکھا جائے تو چین کی سخت اشتعال انگیز کارروائیوں کو جاپان نے نہایت صبر سے برداشت کیا ہے۔"

کلکتہ کا اخبار انگلشمین جاپان کو نہایت مشتعل کرنے کا الزام بجا طور سے لیگ اقوام کے سر تھوپتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "تقریباً اٹھارہ مہینے سے جنیوا میں چھوٹی دول مشرق بعید کے معاملات میں دخل در معقولات کر رہی ہیں۔ ان کی چالیں ٹوکیو میں سخت سے سخت اشتعال پیدا کرتی ہیں مگر عملی نتیجہ صفر ہوتا ہے ...... منچوریا اور منچوکوؤ کے مسائل تیس سال قبل کے مسئلۂ کوریا کی طرح جاپان کے لئے موت و زیست کے سوال ہیں۔ جنیوا کے اصولی بحث کرنے والے یہ فرض کرکے یا وہ گوئی کرتے رہے ہیں کہ چین اسی طرح ایک قوم ہے جیسے جاپان ہے۔ چونکہ چین نہایت کمزور اور غیر منتظم حالت میں ہے۔ چھوٹی سلطنتوں کے نمائندوں نے فرض کرلیا کہ چین راستی پر ہوگا اور جاپان غلطی پر .... برطانیہ میں ایک نہایت قوی اقلیت (جو شاید اکثریت ہو) جس کی ترجمانی ڈیلی میل کرتا ہے یہ یقین رکھتی ہے کہ اس فساد کے اصلی اسباب کی بنا پر جاپانی پیشقدمی حق بجانب ہے اور چین غلطی پر ہے .... جب تک لیگ ایسی انجمن کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چھوٹی دول کو اتنے ہی ووٹ اور وہی حقوق حاصل ہیں جو بڑی دول کو ہیں اور جیسا کہ موجودہ واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، جب تک اُن کو بہ نسبت بڑی دول کے فساد برپا کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں تب تک لیگ اقوام محض ایک ڈھچر ہے اور جس قدر جلد وہ فنا ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔"

وائیکونٹ اسنوڈن مشرق بعید میں جاپان کی حصول مندانہ پالیسی پر اعتراض کرتے ہیں لیکن وہ بھی دُنیا میں سفید قوموں کے غلبہ کو جاپان کے لئے ایک عذر مانتے ہیں۔ وہ مانچسٹر گارجین میں لکھتے ہیں کہ "جاپانیوں نے آنکھیں کھول کر وسیع سلطنتوں کو غیر قوموں پر بزور تلوار حکومت کرتے ہوئے دیکھا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایشیا کے بڑے بڑے ملک، تمام افریقہ، آسٹریلیا۔ بلیشیا، کناڈا اور دُنیا کے تمام جزائر سفید قوموں کے زیر اثر ہیں جن پر اُنہوں نے زیادہ تر بزور تلوار قبضہ حاصل کیا ہے۔ ان ممالک میں جاپان کی آبادی کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ اِن کے ساحل پر خون کے حروف میں یہ لکھا ہوا ہے "کوئی زرد آدمی داخل نہیں ہوسکتا" سفید قوموں نے اس طرز عمل سے جاپانیوں کو شودروں کے برابر بنا دیا ہے۔ جب وارسیلز کانفرنس میں جاپانیوں نے تمام اقوام و ملل کے لئے مساویانہ برتاؤ کی درخواست کی تھی تو کانفرنس نے اس درخواست کو رد کرنے کی ایسی فاش غلطی کی تھی جس کی تلافی ناممکن ہے۔ اگر جاپان اس کے جواب میں اپنی سلطنت میں ایسی ہی روش اختیار کرے تو حق بجانب ہے۔ چین میں اقدام عمل کے جواز میں جاپان مغربی اقوام کی گذشتہ پالیسی کو پیش کرسکتا ہے جس پر یہ قومیں ہمیشہ سے چین میں عمل پیرا رہی ہیں ان صناع قوموں نے ایک صدی پہلے چین میں تجارت کا نہایت وسیع میدان دیکھا۔ اُنہوں نے چین کے

ضرورت جو جنگیں لڑی ہیں وہ سب تجارتی اغراض کے لئے تھیں۔ بندرگاہوں پر قبضہ اور جابجا دوائر اثر کا حصول اسی مقصد کے لئے ظہور میں آیا ہے۔ لیکن باہمی رقابت نے مغربی اقوام سے متواتر ایسے فعل سرزد کرائے جن کو چین کی تقسیم سے کوئی امتیاز نہیں اگرچہ تمام اقوام عہد ناموں کی رُو سے پابند تھیں کہ چین کی حدود میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرینگے۔"

شکست عہد کی یہ پُرانی مثالیں ہیں مگر جدید مثالیں بھی موجود ہیں۔ زمانہ حال کی بہت سی مثالوں میں سے ہم صرف تین مثالیں بتاتے ہیں جن کا تاریخ عالم پر بڑا اثر پڑا ہے یا پڑنے والا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جنگ عظیم میں اتحادی افواج کا یونان میں جبراً داخلہ ہے۔ پھر تبت میں افواج برطانیہ کی پیشقدمی ہے۔ قریب ترین زمانہ کا یعنی پچھلے سال کا واقعہ ہے کہ اٹلی نے عہدنامہ وارسیلز کے خلاف ہنگری اور بلغاریہ کو اسلحہ بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن یہ سب جارحانہ کارروائیاں مغرب کی سفید قوموں سے ظہور میں آئی ہیں اور جاپان نہ تو سفید ہے نہ مغرب سے تعلق رکھتا ہے۔

مسٹر ولیم کاسل سابق انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ ممالک متحدہ اپنے عہدہ کا چارج دینے کے بعد ایک تقریر میں کہتے ہیں کہ "چین کی ملکی اور انتظامی حالت میں فوری خلل پڑنے کے اندیشہ پر ہم جاپان کے اس اشتعال کو بھول گئے ہیں جو منچوریا کی برسوں کی بدامنی میں جاپانی حقوق کی بے دردانہ پامالی سے اور جاپانیوں کی جانوں کی بیدریغ قربانی سے چینیوں نے پیدا کیا ہے۔ ہم منچوریا کو چین کا ایسا ہی ایک حصہ خیال کرتے تھے اور اس کا نینکن سے ایسا ہی قریبی تعلق سمجھتے تھے جیسا ممالک متحدہ میں اوہیو کا واشنگٹن سے ہے۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ چنگ سوئے لیانگ نے حال ہی میں نیشنلسٹ گورنمنٹ کی متابعت اختیار کی ہے اور اگر جاپان کا خوف جاتا رہے تو وہ پھر خود مختاری کا اعلان کر دے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہم نے اس امر کو نظر انداز کر دیا تھا جو جاپان نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ موجودہ حالات میں ایک عظیم تبدیلی ہی سے منچوریا میں جاپانی حقوق کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ لیگ اور ممالک متحدہ دونوں نے چین کا نقطۂ نظر بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ یہ نقطۂ نظر صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب گزری ہوئی اور آنے والی صدیوں سے ایک منٹ کا وقفہ علیحدہ کیا جا سکتا ہو۔"

نیویارک ٹائمز ۲ر مارچ ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں چین کو ایک قوم ماننے سے ان الفاظ میں انکار کرتا ہے کہ "جب ہم چین کا نام لیتے ہیں تو ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے؟ پچھلے چند دنوں کی فوجی کارروائیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس لفظ سے ہمارا مطلب ایک طاقتور اور متحدہ گورنمنٹ نہیں ہو سکتا جس کی تائید وہاں کی آبادی کرتی ہو۔ قدیم اختلافات اور رشک و رقابت جاپانی افواج کے حملہ آوری کے زمانہ میں بھی رُونما ہوئے ہیں۔ نینکن کی برائے نام چینی گورنمنٹ کے پریسیڈنٹ نے جاپانیوں کے خلاف جیہول کی حفاظت میں شرکت کرنے سے بڑی تمکنت سے انکار کر دیا۔ یہ چین کی پُرانی رسم ہے کہ ایک سپہ سالار دوسرے سپہ سالار سے

بدظن ہے اور اس کی قوت توڑنے یا اس کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک چین کی حالت ایسی رہے گی چین پر لفظ نیشن کی وہ تعریف صادق نہیں آسکتی جو لیگ اقوام کے قوانین میں درج ہے"

مسٹر رولینڈ مارس سابق سفیر ممالک متحدہ متعینہ ٹوکیو نے، جن کی رائے جاپانی معاملات میں مستند مانی جاتی ہے، بتاریخ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء فلاڈلفیا میں تقریر کرتے ہوئے اپنے اہلِ وطن کو جاپانیوں پر اعتراض کرنے سے ان الفاظ میں منع کیا ہے کہ "ایسی حالت میں، کہ جاپان چین سے تجارتی اور تہذیب و تمدن کے تعلقات میں وابستہ ہے چین میں کسی ذمہ دار گورنمنٹ کی عدم موجودگی، جس طرح دور دراز ممالک کے لئے ایسا پیچیدہ اور سنجیدہ مسئلہ بن گئی ہے ویسے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ جاپان کے لئے بنی ہوئی ہے، تو ہمیں جاپان کی مفروضہ غلطی پر یا موجودہ واقعات کی کیفیت پر فیصلہ صادر کرنے میں نہایت احتیاط برتنی چاہیئے" وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ گورنمنٹ جاپان کو مجبوراً لیگ اقوام سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی ہے۔ پروفیسر ٹائلر ڈینیٹ جو پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں بین الاقوامی تاریخ کے پروفیسر ہیں رسالہ کرنٹ ہسٹری میں ایک طویل مضمون میں منچوریا میں جاپان کے طرزِ عمل پر قانونی نقطۂ نظر سے سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن اسی مضمون کے آخر میں وہ اقرار کرتے ہیں کہ "جاپان نے منچوریا کے مسئلہ کا ایک تعمیری حل کر دیا ہے"

چونکہ جاپان سنتری کی طرح ساحل چین کے بالمقابل کھڑا ہوا ہے مغربی اقوام نے جس طرح سلطنت ترکی کے حصے کر کے آپس میں بانٹ لئے ہیں وہی عمل چین کی کمزور سلطنت کے ساتھ نہیں کر سکتیں۔ ایسا آسان شکار ان کے سامنے پڑا ہے اور وہ اپنی مجبوری پر دانت پیستی ہیں۔ وہ چینیوں کے کان میں جاپان کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں اور وقتاً فوقتاً چین کی کمر ٹھونکتی رہتی ہیں کہ جاپان کے خلاف تہتک آمیز برتاؤ کرے۔ وہ چین میں تجارتی مقابلہ سے باز نہیں رہ سکتیں۔ چین کی کثیر آبادی ایک پرمنفعت بازار کی صورت میں ان کو للچاتی ہے۔

لیکن چین کی بدامنی تجارت کے حق میں ہر ملک کے لئے بارگراں ثابت ہو رہی ہے۔ کوئی ملک ایسی تجارت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس کی حفاظت ہمیشہ فوج اور بیڑے سے کی جاتی ہو۔ صرف ممالک متحدہ امریکہ کو لیجئے تو نظر آئیگا کہ سن ۱۹۰۱ء کی شورش باکسر کے بعد سے اس ملک کو ہر کاروباری آدمی پر اوسطاً دو مسلح سپاہی یا ملاح چین میں رکھنے پڑتے ہیں۔ مغربی قوموں کی تجارت جاپان میں بھی بہت ہے، ممالک متحدہ کی تجارت تو اس قدر ہے کہ چینی تجارت جاپانی تجارت کا پاسنگ بھی نہیں ہے تاہم ان میں سے کسی قوم کو اپنی تجارت کی حفاظت کیلئے جاپان میں ایک سپاہی یا ملاح رکھنے کی ضرورت نہیں۔

سر ایرک ڈرامنڈ سکرٹری جنرل لیگ اقوام نے اپریل میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ "جاپان کی علیحدگی سے لیگ کمزور ہو گیا ہے ...... جاپان کا پہلو اس مقدمہ میں قوی تھا۔ اگر وہ متواعد لیگ

کی پابندی کرتا اور اپنی مشکلات لیگ کے سامنے پیش کرتا تو یقیناً اس کے مقدمہ کی ہمدردی کے ساتھ سماعت کی جاتی اور ایسے مناسب انتظامات کر دئے جاتے کہ منچوریا میں اس کے حقوق اور مفاد محفوظ ہو جاتے۔ لیکن جاپان نے اُن اصولوں کے خلاف پالیسی اختیار کی جن کا لیگ ضامن ہے۔"

مغربی اقوام کی کارگزاریاں سر ایرک ڈرامنڈ کے الفاظ کا بطلان کرتی ہیں۔ سفید اقوام ہمیشہ سے "زرد خطرہ" کی چیخ پکار کر رہی ہیں اور ایک مشرقی قوم کا ترقی کے مدارج اعلیٰ پر پہنچ جانا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ جاپان کی زائد آبادی کے لئے ان کی دُنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عہدنامہ وارسیلز طے ہونے کے موقع پر جاپان نے نسلی امتیاز مٹا دینے کی تحریک کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی جنگِ عظیم کے بعد سے جاپان ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ مسئلہ منچوریا طے کر دیا جائے مگر وہ ہمیشہ اسے ملتوی کرتی رہیں اور چین کو مشتعل کرتی رہیں کہ جاپان کے خلاف سخت روش اختیار کرے۔ واشنگٹن کانفرنس میں چین نے خود منچوریا کا سوال اُٹھایا جس کا حل جاپان بھی چاہتا تھا۔ مگر ان دونوں کو جواب دیا گیا کہ مسئلہ شا شونگ حل ہونے کے بعد یہ سوال لیا جائیگا۔ لیکن یہ سوال پھر کبھی نہیں چھیڑا گیا۔ اس کانفرنس کے دو سال بعد کانگریس نے ۱۹۲۴ء میں جاپانیوں کے داخلۂ ممالک متحدہ کا امتناعی قانون منظور کیا جو پریسیڈنٹ روزویلٹ مرحوم اور جاپان کے درمیان طے شُدہ معاہدۂ شرفا کی موجودگی میں ایک حد تک غیر ضروری تھا۔ اس قانون کا منشا محض جاپان کی ہتک معلوم ہوتا تھا جس نے ممالک متحدہ کو ہمیشہ دوست، محسن اور اُستاد سمجھا ہے۔ اب جاپانیوں کی آنکھیں کُھلیں اور اُنہیں محسوس ہوا کہ اس دوست کی ہمدردی بڑی دوربین پالیسی کے تابع تھی جس کے اہم عناصر یہ تھے کہ چین کا بازار اپنی تجارت کے لئے کُھلا رہے، یورپین اقوام چین کے حصے بخرے نہ کرنے پائیں اور روس کے روز افزوں سیلاب کو روک کر امریکہ کا مغربی ساحل محفوظ کر لیا جائے۔ جُوں جُوں جاپان قوت پکڑتا گیا اس دوست کی ہمدردی کم ہوتی گئی۔ جب ایسا قدیم دوست ساتھ چھوڑ دے تو جاپان دیگر دول سے کیا توقع رکھ سکتا تھا جو جاپان کو اس کے مفتوحہ علاقہ سے محروم کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔

جاپان مغربی اقوام کی چالوں سے عاجز آ گیا تھا۔ جینوا میں لیگ کے طویل مباحث میں تمام دول کے اور خصوصاً دول صغیرہ کے تہتک آمیز برتاؤ نے جاپان کو لیگ سے نا اُمید کر دیا۔ مسٹر یوسکے متسوؤکا نے جو لیگ اقوام میں جاپان کے خاص نمائندے تھے نامہ نگار اخبار نیویارک ٹائمز کے انٹرویو میں اس موقع پر جاپان کے اختیار کردہ طرزِ عمل کی تائید کرتے ہوئے جینوا میں کہا کہ "منچوریا میں حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی، ایک طرف چین کی بدامنی تھی اور دوسری طرف انقلابی روس تھا۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان ہمارے نزدیک منچوریا ایک آڑ تھا۔ چونکہ اس آڑ کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں دو جنگیں

کرنی پڑتی تھیں وہاں کی پولیٹکل حالت میں ذراسی تبدیلی اور ہمارے مادی مفاد کے حق میں ذراسے خطرے کا ظہور ہمارے لئے تشویش کا باعث ہوجاتا تھا۔ یکایک ایک حادثہ پیش آیا جس کی روک تھام کے لئے ہماری ریلوے کی محافظ سپاہ کو عملی کارروائی کرنی پڑی۔ یہ حادثہ ہماری گورنمنٹ کی توقع کے خلاف بالکل بےخبری میں واقع ہوا تھا مگر ہماری گورنمنٹ اس کا بندوبست کرسکتی تھی۔ نہ تو ہمارا یہ ارادہ تھا اور نہ خواہش تھی کہ منچوریا کا الحاق کیا جائے۔ ہم نے اس تحریک کی بھی مخالفت کی جو وہاں آزاد حکومت قائم کرنے کے لئے رُونما ہوئی تھی، لیکن جب لیگ اقوام نے ممالک متحدہ کی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی تائید سے ہم سے جواب طلب کرنا شروع کیا تو اس کا نتیجہ وہ نکلا جو نہ ہم چاہتے تھے اور نہ ہمیں اس کی توقع تھی اور جو نہ آپ کی گورنمنٹ نکالنا چاہتی تھی نہ لیگ۔ مغربی دول کے رویّہ نے چینیوں کو یہ یقین دلادیا کہ آپ میں سے بعض دول ڈپلومیٹک کارروائی کے علاوہ ہمارے خلاف ان کی امداد کرینگے۔ دوسری جانب ان کے رویّہ نے جاپانیوں کے دل میں یہ عزم راسخ پیدا کردیا کہ چاہے جو قیمت ادا کرنی پڑے ہم اس مسئلہ کو طے کرکے رہینگے۔ آپ جاپانیوں سے کام نکالنے کے لئے ان کے قوائے استدلال کو اور ان کے احساس دوستی و مروت کو تحریک میں لاسکتے ہیں مگر ان کو حکم دے کر کبھی کام نہیں نکال سکتے، اور مغرب جو کچھ کر رہا تھا وہ ہمیں حکم معلوم ہوتا تھا۔"

ڈاکٹر اِنازا نتوبے مُصنّف "بشیدو" نے حال میں امریکہ کے دورے سے واپس جاپان آکر ایک تقریر میں لیگ اقوام کے قواعد کی اُس ترجمانی پر جو ممبرانِ لیگ نے جینوا میں کی ہے اِن الفاظ میں رائے زنی کی ہے کہ "میرے خیال میں لیگ نے قواعد لیگ پر لفظی بحث کرنے میں غلطی کی ہے، بانیانِ لیگ خواہ وہ وِلسن ہوں یا کلی منشو یا لائڈ جارج، اِن میں سے کوئی لیگ کو ایک تنگ ظرف نہیں سمجھتا تھا۔ اِن تینوں اصحاب نے اس موضوع پر ایک ضابطہ کی چٹھی لکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قواعد لیگ تنگ نظری یا لفظی بحث کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ انہیں کسی مسئلہ پر عائد کرنے کے لئے وسیع مدبرانہ نقطۂ نظر سے ترجمانی کرنی چاہیئے۔ لیکن مسئلہ منچوریا پر جو استدلال ہوا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ دول نے قواعد لیگ کی ترجمانی مدبرانہ اور وسیع نقطۂ نظر سے نہیں کی ہے بلکہ عدالت کے وکیل بیرسٹروں کی طرح تنگ نظری سے کام لیا ہے، کیسے افسوس کی بات ہے! مگر ایک وقت آئے گا جب لیگ کو معلوم ہوجائے گا کہ اس نے فاش غلطی کی ہے۔"

لیگ سے جو توقع تھی وہی اس سے ظہور میں آیا۔ غلطی صرف قواعد کی ترجمانی میں نہیں ہوئی ہے بلکہ ان قواعد کی ترتیب میں بھی ہوئی ہے۔ لیگ کی ترکیب مغربی اقوام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے عمل میں آئی ہے اور جب اسے مشرقی اقوام کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائیگا تو ناکامی لازمی ہے۔ جنرل اِوانے ماتسوئی نے جو جاپان میں اعلیٰ فوجی مُشیر ہیں، اخبار جاپان ٹائمز میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے جس میں سے مندرجہ ذیل اقتباسات قابلِ غور ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "وہ قواعد اساسی"

جو لیگ اقوام اور عہدنامہ مانع جنگ، جیسی بین الاقوامی انجمنوں کی جڑ بنیاد ہیں، اصل میں پولیٹکل فلاسفی کے یورپین معیار سے ماخوذ ہیں اور انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ یورپین اقوام کے اصول نفسیات کے مطابق ٹھیرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں مشرقی یا ایشیائی اقوام کے باہمی تعصبوں میں عائد کرنا شروع ہی سے نہایت مختلف بات تھی کیونکہ یورپین اقوام سے نسل میں، تہذیب و تمدّن میں، سوشل ماحول میں، نسلی نفسیات میں اور بہت سے دیگر امور میں بیّن فرق رکھتی ہیں۔ شاید قصور لیگ کے مجوزوں یا بانیوں کا ہے جنہوں نے اظہر من الشمس واقعات کو نظر انداز کردیا یا ان سے چشم پوشی کی۔ کوئی شخص اس بدیہی واقعہ سے انکار نہیں کرسکتا کہ اب تک تمام بین الاقوامی مسائل پر بحث کرنے میں ممبران لیگ نے یورپین نقطۂ نظر سے کام لیا ہے اور یورپین نفسیات کے ماتحت ان پر غور کیا ہے، یورپین عینک سے دیکھا ہے اور یورپین ترازو میں تولا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ چینی جاپانی نزاع کی خیراد پر چڑھنے سے لیگ کی قلعی کھل گئی ہے اور اس کے بنیادی نقائص بالکل آشکارا ہو گئے ہیں۔ نقائص کے اظہار سے لیگ کے مقصد کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور بین الاقوامی مسائل کے طے کرنے والی اعلیٰ کونسل کی حیثیت جو لیگ کو حاصل تھی اس کی بقا خطرہ میں پڑ گئی ہے۔"

دُنیا اس وقت حالتِ سابقہ اور امن کا مطالبہ کر رہی ہے۔ لیکن حالت سابقہ کیا معنی رکھتی ہے؟ کیا قیامت تک یہی حالت قائم رہے گی؟ اگر ایسا ہونا ہے تو یہ وسیع سلطنتیں، یہ کالونیاں، یہ مقبوضات اور دائرۂ اثر کے رقبہ جات کیوں وجود میں آئے۔ سفید اقوام اس کے جواب میں بقائے اصلح کا اصول پیش کرتی ہیں۔ لیکن جب جاپان یہی اصول اپنے رویّہ کی حمایت میں پیش کرتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ چھینا جھپٹی کے دن گئے۔ کیا معقول دلیل ہے!

مغربی اقوام امن امن پکارنے سے کبھی نہیں تھکتیں۔ لیکن دُنیا میں امن قائم رکھنے کا طریقہ انوکھا ہے۔ وہ دوسری اقوام کے ملکوں پر قبضہ کرلیتی ہیں اور اسے حکومت قائم شدہ بذریعہ قانون کہتی ہیں۔ جبراً حاصل کردہ مقبوضات کو دوسری حوصلہ مند قوموں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک بین الاقوامی لیگ کی بنا ڈالتی ہیں۔ یہ لیگ اقوام سفید قوموں کی وسیع سلطنتوں کے اجزا پر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا۔ ممالک متحدہ یورپین اقوام کے آگے اصول منرو کے تحفظ کے لئے برہنہ تلوار لئے کھڑا ہے۔ برطانیہ اپنی دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی سلطنت میں ذراسی مداخلت کا روادار نہیں۔ فرانسیسیوں کا اصول منرو الگ ہے جس میں فرانسیسی سلطنت اور وسط یورپ کی دولِ صغیرہ شامل ہیں۔ پھر بھی یہ قومیں امن کا لفظ زبان پر لاتی ہیں۔ امن کا مسئلہ ایسا سہل نہیں ہے جیسا سفید قومیں دُنیا کو یقین دلانا چاہتی ہیں۔

ڈاکٹر ولیم ایکسلنگ نے، جو جاپانی نیشنل کرسچین کونسل کے سکرٹری ہیں اور جو تیس برس سے جاپان میں مقیم ہیں، بڑی قابلیت سے مسئلۂ امن پر بحث کی ہے۔ وہ ایک تقریر میں کہتے ہیں کہ حامیانِ

امن مسئلۂ امن پر بالکل اوپری نظر ڈالتے ہیں۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر لیگ او اقوام موجود ہو اور بین الاقوامی انصاف کے لئے ایک مستقل عدالت قائم ہو اور دُنیا میں ایسے مرد اور عورتیں موجود ہوں جو دل سے امن کے خواہاں ہوں تو دُنیا میں بہت جلد امن قائم ہو جائیگا۔ مگر بد قسمتی سے امن کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور بہت سے دیگر پیچیدہ مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔ مثلاً یہ ناممکن ہے کہ امنِ دُنیا کے مسئلہ کو دُنیا کی قابلِ کاشت زمین کی (اقوام کے درمیان) انصافانہ تقسیم کے مسئلہ سے جُدا کیا جا سکے، یہ ناممکن ہے کہ امن دُنیا کے مسئلہ کو نسلی امتیاز کے قوانین اور ذمہ داریوں کے مسئلہ سے جُدا کیا جا سکے۔ یہ ناممکن ہے کہ امن دُنیا کے مسئلہ کو موجودہ اقتصادی جنگ سے جُدا کیا جا سکے جو تمام دُنیا میں جاری ہے، یہ ناممکن ہے کہ امنِ دُنیا کے مسئلہ کو محصولی ناکہ بندیوں کے مسئلہ سے جُدا کیا جا سکے۔ جو دُنیا کی تجارت کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔

"یقیناً سفید اقوام کے لئے، جنہوں نے دُنیا کے اس حصّوں میں سے سات پر قبضہ کر لیا ہے اور اپنے مقبوضات کو قوانین مانع و اخلے سے محفوظ کر لیا ہے جن میں سے اکثر نسلی امتیاز پر مبنی ہیں اس امر پر اصرار کرنا نہ صحیح ہے نہ منصفانہ کہ دائمی امن کی بنیاد اس اصول پر رکھی جائے کہ قومی حدود کی حالت سابقہ برقرار رہے۔

"یہ بالکل صحیح ہے کہ عام طور سے حامیانِ امن صفحۂ ارض کی موجودہ تقسیم کو غیر منصفانہ سمجھتے ہیں، لیکن اکثر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مسئلہ امنِ دُنیا ان مسائل میں ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ ان پر یکجائی طور سے غور کر کے گتھی کو سُلجھانا لازمی ہے۔ قبل ازیں کہ ایسی حالت قائم ہو جس میں امنِ دنیا کا عنصر موجود ہو یہ ضروری ہے کہ دُنیا کی زمین اور آبادی کی تقسیم انصافانہ اور صحیح طریقہ پر کی جائے......... خواہ مغرب ہو یا مشرق ہم میں سے کوئی ایسا پاک نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر الزام لگا سکیں۔ ہم ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ دُنیا کی تمام قوموں کو، خواہ مشرق کی ہوں یا مغرب کی، اپنے دلوں کا جائزہ لینا چاہیئے اور ان مسائل پر جو ہماری پیچیدہ اور غمزدہ دُنیا کو کشمکش میں مبتلا کئے ہوئے ہیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ میرے خیال میں اس وقت تک مستقل امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک نہ صرف افراد بلکہ اقوام ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھانے کے لئے اور ایک دوسرے کے اقتصادی حقوق میں شرکت کے لئے تیار نہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان داموں امن بہت گراں ہے لیکن ایسا امن جو تمام دُنیا پر حاوی ہو اور جس میں استقلال کا عنصر موجود ہو۔ اُس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتا جب تک اقوامِ دُنیا اس اعلیٰ معیار پر پوری نہ اُتریں"

ڈاکٹر ایکنگ نے معیارِ امن کی تشخیص میں بہت بلند پرواز کی ہے۔ یہ معیار حاصل ہو جائے تو عظیم الشان کامیابی ہو گی۔

یورپ دُنیا میں امن قایم رکھنے میں ناکامیاب رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ دُنیا کی رہنمائی یورپ سے ممالک متحدہ امریکہ کو منتقل ہوگئی ہے۔ ایک منزل آگے بڑھ کر یہ رہنمائی جاپان کے حصہ میں آ جاتے گی۔ جاپان کے لئے مناسب ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں یورپین اخلاق سے بالاتر رہے۔ ایشیائی قوم ہونے کی حیثیت سے اُسے واجب ہے کہ مشرقی کمزور اقوام کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرے نہ کہ یورپین۔

نور الحسن برلاس

بچّے

کم سنوں کے قہقہے شاداب رُوحوں کا سرود
جانفزا گفتار ہیں صبحِ مسرّت کی نمُود

کلکِ قدرت کی لطافت کاریوں کا اِک عمل
چاندنی پہنے ہوئے، شفّاف، نورانی کنول

سازِ ہستی کی روپہلی لَے کا جسمِ مرمریں
یا فرشتوں کے پروں کا عکسِ طلعت آفریں

عرش کی قندیل سے ضوگیر ہیں ان کے دماغ
ان کی آنکھوں سے عدم! ملتا ہے نیکی کا سراغ

کھیل میں مشغول ہیں بچّے جو فرشِ خاک پر
ہالہ پیرا ہیں ملائک رفعتِ افلاک پر

حُسنِ سرِ راہ

ہوئی ہے آج یہ کس سے مری نگاہ دوچار
کہ خود بخود ہوئی جاتی ہے، سلبِ طاقتِ ہوش

یہ کس کے حُسن کا ہے اہتمامِ جلوہ گری
کیا ہے خاک کے ذرّوں کو جس نے آئینہ پوش

مچل رہی ہیں رگ و پے میں کیف کی موجیں
یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا سازِ خموش

ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت
وفورِ حُسن سے ہے موجِ خاک لالہ فروش

اُٹھا رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے
سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سروش

ندیم کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمد
نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فروش

خوشا! لطافتِ پنہاں کہ آج دل میں نہیں
خیالِ تلخیٔ فردا، غمِ مصائبِ دوش

گئی وہ تیرگیٔ شب وہ رسمِ بے خبری
جبینِ دہر پہ چمکا ستارۂ سحری

نگاہِ حُسن طلب چاہیئے کہ بزمِ حیات
نہیں کچھ اور بجز اہتمامِ جلوۂ ناز

کھُلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال
کوئی حجاب ہے، صبر آزما نہ پردۂ راز

جھلک رہا ہے پیالوں میں رنگِ بادۂ ناب
لرز رہی ہے سرِ دوشِ موجِ زلفِ دراز

سمجھ نہ شانِ تغافل کو درسِ محرومی
کہ ہے نیاز کے اجزا سے حُسنِ خلوتِ ناز

جُدا ہے عقل کی سرحد سے بے خودی کا مقام
نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز

درونِ ساغرِ دل چاہیئے، رہینِ طپش
وہ موجِ بادہ کہ ہو آتشِ پیالہ گداز

یہ مُشتِ خاک اور اتنی بصیرت افروزی
مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حُسنِ مجاز!!

نہاں ہے بے خبری میں نشاطِ منزل بھی
شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستیٔ دل بھی

سی اختر، حیدرآباد دکن

دفتر دیوانی کا ایک فارسی مخطوطہ

(یعنی)

تاج المآثر

سرکار نظام حیدرآباد کا ہسٹاریکل ریکارڈ آفس دفتر دیوانی و مال ملکی سے موسوم ہے۔ یہاں نہ صرف سلاطین آصفیہ کے قدیم لشکر دفتر کے کاغذات کا ذخیرہ ہے بلکہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے کاغذات اور اور دستاویزات بھی پائے جاتے ہیں۔

اس دفتر سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں تاریخ دکن اور تاریخ ہند کے متعلق عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے نایاب[1] مخطوطات ہیں جن کا کوئی نسخہ ہندوستان اور یورپ کے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے، بعض ایسے ہیں جن کے چند ہی[2] نسخے پائے جاتے ہیں۔ بعض اور کسی خاص[3] وجہ سے نایاب کہے جا سکتے ہیں۔ کتب خانہ کی فہرست زیر ترتیب ہے اس وقت یہاں ہم ایک مخطوطہ یعنی "تاج المآثر" کو پیش کرتے ہیں۔

تاریخ عربوں کا خاص فن رہا ہے اس میں ان کو جتنی دلچسپی تھی وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور قوم کو ہو۔ مسلمان جہاں کہیں گئے اس فن کو اپنے ساتھ لیتے گئے چنانچہ ہندوستان میں بھی وہ اسکو اپنے ساتھ لائے۔ مسلمان عربوں کا تعلق ہندوستان کے ساتھ پہلے سندھ اور سواحل کارومنڈل و ملیبار سے ہوا اسکے بعد شمال کی جانب سے افغانی۔ ایرانی۔ ترکمانی اور مغلوں کے حملے ہوئے اور انکی سلطنتیں قائم ہوئیں۔

ہمکو معلوم ہے کہ شمال کے حملوں کی ابتدا محمود غزنوی سے ہوئی اور اسکی اولاد برسوں پنجاب میں حکومت کرتی رہی اسکے بعد شہاب الدین غوری کا حملہ ہوا اجمیر اور دہلی فتح ہوکر خاندان ایبک کے سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی۔

قطب الدین ایبک وہ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کی حکومت ہندوستان میں رہ کر فرمائی اسی وقت سے مسلمانوں کا تعلق ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے ساتھ مستقل طور پر ہو گیا۔

---

[1] اس قسم کے بعض مخطوطات یہ ہیں (۱) شاہجہاں نامہ کلیم (۲) کلیات علی عادل شاہ (۳) مآثر نظامی (۴) فتح تشش جہت کوٹ کانگرہ (۵) تذکرہ ریاض حسینی (۶) تاریخ جہاں نما مصنفہ عبداللہ بن علی کاشانی (۷) بہارستان سخن مصنفہ صمصام الملک۔

[2] ان میں سے بعض یہ ہیں (۱) شاہجہاں نامہ عنایت خانی (۲) نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ (۳) قصر والاجاہی (۴) تذکرۃ البلاد (۵) سوانح دکن (۶) الوزنامہ (۷) تاریخ علی عادل شاہ (۸) شرف نامہ تاریخ ارکاٹ۔

[3] بعض مخطوطات شاہی کتب خانوں سے تعلق رکھتے ہیں بعض پر بادشاہ وقت کی مہر اور دستخط ثبت ہے بعض مصنف کی محررہ ہیں۔

زیر بحث کتاب تاج الماثر اُسی زمانہ کی تصنیف ہے یا دوسرے الفاظ میں مسلمانان ہند کی پہلی تاریخ ہے اس حیثیت سے
اس کتاب کی خاص اہمیت ہے۔ ہنوز یہ شائع نہیں ہوئی ہے بعض کتب خانوں میں اسکے چند نسخے پائے جاتے ہیں جنکی تفصیل
آخر میں درج کی گئی ہے۔

اس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی مصنف چہار مقالہ کا فرزند نظام الدین حسن ہے۔

افسوس ہے کہ کسی ذریعہ سے اسکے حالات پر تفصیلی روشنی نہیں پڑتی اس کتاب سے جو حالات معلوم ہوتے
ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ جب خراسان میں ہل چل ہوئی اور طوائف الملوکی پھیل گئی (۵۸۸ھ) تو اس نے اپنے وطن
سے باہر جانیکا ارادہ کیا مگر دوستوں کے اصرار پر ارادہ فسخ کر دیا اسکے بعد جب حالت درست ہوئی فتنہ و فساد کی آگ اور گرم ہوگئی
تو وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ اپنے شیخ مولانا محمد کوفی سے مشورہ کرکے غزنی گیا اور وہاں سے ہندوستان آیا دشوار گذار راستوں
کی تکلیفیں اٹھانے سے دہلی پہنچ کر علیل ہو گیا علالت سے صحتیاب ہو کر ایک جلیل القدر عہدہ دار شرف الملک سے ملا اسکے بعد
بعض دوستوں کی فرمائش پر فارسی میں تاریخ لکھی اس کو اس امر کا افسوس ہے کہ وہ عربی میں اپنے کمال کا اظہار نہیں کرسکتا
چونکہ لوگ بجائے عربی کے فارسی کی طرف مائل ہیں۔

اس کتاب سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حسن عربی اور فارسی کا پورا ماہر اور اعلیٰ درجہ کا ادیب اور باکمال شاعر تھا
دہلی کے سربرآوردہ ادیب امراء اور رؤسا سے اسکا میل جول تھا۔

جس طرح اسکے پیدائش کے صحیح سنہ سے ہم واقف نہیں اسی طرح اسکے انتقال کی تاریخ ہمکو معلوم نہیں ہے
قیاس ہے کہ ۶۲۳ھ سنہ ہجری یا اسکے بعد اسکا انتقال ہوا ہے۔

کشف الظنون اور روضۃ الصفا میں تاج الماثر کا ذکر ہے مگر غلطی سے اسکے مصنف کو صدر الدین لکھا گیا ہے البتہ تاریخ
گزیدہ کی آخری فصل سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی صاحب تاج الماثر مشہور عروضی نظامی سمرقندی کا فرزند تھا۔

یورپ میں مستشرقین سے ہمیر (جرمنی) نے اپنی کتاب گماں ڈسال میں تاج الماثر پر ایک نوٹ لکھا ہے مگر غلطی سے
وہ حسن نظامی کو لاہوری ظاہر کرتا ہے سرہنری الیٹ نے اپنی تاریخ ہند کی دوسری جلد میں اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے اس نے
خاص طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ عام طور سے اس کتاب میں ۶۱۴ھ سنہ ہجری تک واقعات پائے جاتے ہیں مگر اس نے
جو نسخہ نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے پاس دیکھا تھا اس میں ۶۲۶ھ سنہ ہجری یعنی شمس الدین التمش کی وفات کے دو سال قبل
تک کے حالات درج تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف ۶۰۲ھ سنہ ہجری میں شروع کر دی گئی تھی کیوں کہ اسکے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ اس زمانہ میں شہاب الدین غوری زندہ تھا۔

ہمارے زیر بحث مخطوطہ کا حجم (۲۵۵) ورق ہے (۱۹ تا ۲۰) سطر ہیں خط نسخ عمدہ ہے تاریخ کتابت ۲۹ رمضان ۱۰۱۷ھ
اور کاتب معز الدین بن کرم اللہ ہے۔

اس کتاب میں بھی اجمیر کی فتح (۵۸۸ھ) سنہ ہجری سے بیان شروع ہوا ہے اور ۶۱۴ھ سنہ ہجری تک حالات بیان کئے گئے ہیں

اس طرح گویا معز الدین محمد غوری کا کچھ حال اور قطب الدین کا پورا حال (۶۰۲ھ تا ۶۰۷ھ) اور شمس الدین التمش کے ابتدائی سات سال کا ذکر ہے آخری بیان ناصر الدین محمود کے گورنر لاہور مقرر ہونیکا ہے (۶۱۴ھ)

اس کتاب میں تاریخی واقعات سے قطع نظر انشا پردازی سے زیادہ کام لیا گیا ہے واقعات کے اظہار میں تشبیہ و استعارات کو جا بجا استعمال کیا گیا ہے۔ فارسی اور عربی اشعار سے کتاب مملو ہے ذیل میں ہم اس کتاب کے بعض خصوصیات کی صراحت کرتے ہیں۔

(۱) یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی تاریخ ہے۔

اگرچہ طبقاتِ ناصری (جو اس سے پچاس سال بعد تصنیف ہوئی ہے اور ہندوستان کی دوسری تاریخوں میں بھی ابتدائی حالات مذکور ہیں لیکن کسی کو ابتدائی تاریخ کے جزئیات پر تحقیق منظور ہو تو اسکے سوا کوئی اور مواد نہیں مل سکتا۔

(۲) ادبی حیثیت سے ممتاز ہے۔ واقعات کے اظہار میں تشبیہ و استعارات کو زیادہ کام میں لایا گیا ہے۔

چونکہ فارسی نثر کی کوئی کتاب سعدی کی گلستاں کے پہلے بلحاظ انشا پردازی نہیں ہے۔ اسی لئے اس کو خاص اہمیت دی جاسکتی ہے پانچویں صدی ہجری کی فارسی نثر ناصر خسرو کا سفرنامہ اور نظام الملک طوسی کا سیاست نامہ۔ بیہقی کی تاریخ زین الاخبار اور شیخ علی ہجویری کی تصنیف کشف المحجوب ہیں مگر ان سے فارسی انشا پردازی ظاہر نہیں ہوتی اس لئے تاج المآثر جو انشا پردازی کے لحاظ سے اعلیٰ نمونہ ہے قابل قدر ہے۔

اس کی عبارت فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ بیان کی ندرت عبارت آرائی میں جوش و خروش، فقرونکی چست بندش، الفاظ کی موزونی بیان کی تازگی اور جدت نئی نئی تشبیہات اور جدید ترکیبیں اپنی آپ نظیر ہیں۔

(۳) اس کتاب سے اس وقت کے رزم کے حالات آلات جنگ کی وضاحت ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے آلات حرب میں تیغ و سنان تیر و تبر و خنجر و گرز کا استعمال ہوتا تھا۔

(۴) جس طرح رزم کے حالات معلوم ہوتے ہیں اسی طرح بزم کے حالات منکشف ہوتے ہیں ساقی و شاہد صراحی و جام شراب و کباب۔ مطرب و مغنی کی تفصیل ہوتی ہے معشوق کے خد و خال زلف و گیسو چشم و دہان کی بیسیوں الفاظ میں تصویر کھینچی گئی ہے۔ آلات موسیقی بلبل و چنگ۔ بربط و نائے دف و کمانچہ وغیرہ کی صراحت ہے

(۵) شکار کے حالات شکاری جانور چیتے اور کتوں کی تفصیل ہے۔

(۶) ہندوستان کی طبعی حالات موسم۔ پیداوار کی وضاحت ہوتی ہے۔ تابستان خریف۔ ابر و باران برق و رعد۔ سرما یخ۔ برف حیوانات۔ میوہ جات کی تفصیل ملتی ہے۔

(۷) صبح و شام۔ کوہ و بیاباں۔ دشت و صحرا۔ دریا و آسمان۔ چاند ستاروں کی تشبیہیں اور استعارات اور بیسیوں اسلوب ان کا بیان ہوا ہے۔ ذیل میں کتاب کے چند عنوانات درج کئے جاتے ہیں جس سے اسکے بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فتح شہر اجمیر۔ گرفتن رائے و کول اجمیر۔ قتل رائے ہندو۔ نصب کردن پتورا بجائے پدر۔ فتح شہر دہلی۔ مطیع شدن رائے۔ مراجعت بجانب غزنی۔ تفویض ایالت بہ سلطان قطب الدین۔ عزیمت حرب برائے اجمیر گرگختن چتوان۔ عزیمت دہلی۔ نزول شہر دہلی

بکر عصیاں مترائج برادر رائے اجمیر وغیرہم۔

ان عنوانات کے تحت پھر ذیلی عنوانات بھی ہیں مثلاً تفویض ایالت بہ سلطان قطب الدین کے تحت جن ذیلی عنوانات کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ہیں۔

عقل وفہم سلطان۔ صفت عدل۔ صفت مغنیان مجلس۔ صفت ساقی۔ صفت زلف۔ صفت لب وچشم۔ صفت شراب۔ صفت جام۔ صفت پیالہ۔ صفت صراحی۔ صفت ندیم۔ صفت سکر۔ صفت یوز شکاری۔ صفت سگ۔ صفت اسلحہ۔ صفت اسپان۔ صفت تیر۔

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ کتاب کسقدر ہمہ گیر ہے جیساکہ ذکر کیا گیا ہے۔ ہنوز یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ جسقدر قلمی نسخوں کا پتہ ہمکو معلوم ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کتب خانہ برٹش میوزیم — دو نسخے
(۲) کتب خانہ انڈیا آفس — دو نسخے
(۳) رائل ایشیاٹک سوسائٹی — ایک نسخہ
(۴) کتب خانہ پیارس — ایک نسخہ
(۵) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد — ایک نسخہ ناقص
(۶) کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد — ایک نسخہ
(۷) کتب خانہ دفتر دیوانی حیدرآباد (زیر بحث) — ایک نسخہ

ذیل میں بطور نمونہ کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے

(۱) حمد وسپاس بیقیاس کہ قدم شہسوار عقل دوا سپہ بسر حد عدد احصائے آں نرسد۔ وچشم مردم دوربیں صورت حصر وشمار آں در آئینہ خیال بخواب نہ بیند۔ مر خدائے را جل جلالہ وعم نوالہ کہ وجوب وجود او از سمت بدایت منزہ است و کمال جود او از منقصت نہایت مقدس۔

(۲) فتح شہر دہلی۔ وچوں خاطر خطیر روحہ اللہ از مناظم امور ومہمات آن طرف فارغ شد در ضمان اقبال ودولت وظلائل تائید ونصرت مراجعت فرمود ومواکب منصور کہ چوں پروانہ حریص شمع وکردار سمندر شیفتۂ آتش بیجا بر سمت دہلی کہ از اجہات بلاد ہند است روان گشتند۔

وعصائب یتہافتون اذا ارتمی — بہم الوغا فی غمرۃ الہیجاء
مثل الیراع بدت لہ نار — وقد لفتہ ظلمۃ لیلۃ لیلاء
یمشون فی زغف کان متونہا — فی کل معرکۃ متون نہاء
ابناء موت یطرحون نفوسہم — تحت المنایا کل یوم لقاء

بیت

سپاہی بہیبت چو امواج دریا — گروہے بکثرت چو اعداد اختر
ہمہ نیزہ ہمہ حافظ عہد رستم — بخنجر ہمہ وارث اسم حیدر
بجویند در عمر از صعب ہیجا — جہانی جواہر ض لازم زجوہر

(۳) صفت شمشیر۔ واز ہول آتش شمشیر مغز در سر بہرو شیر آب می شد واز بیم خنجر آبگون دل بر سباع دوش خون میگشت۔ و بندگان خسرو چوں ابر بر باد سوار گشتہ بودند و در تاختن بسان ماہ فلک وقار بیقرار شدہ و تیر از خم تیر دیدہ دو دزد انگشت تعجب بدنداں گزیدہ و ناہید غزل سرائی بشکل سوفار دہاں بمدح وثنا برکشادہ۔

(۴) صفت اسپاں۔ وسم اسپاں آن دل سنگ چوں برق آتش می افروخت و نعل کہ گفتی قوس ہلال است بشرار ناوک می انداخت و فرش زمیں از وے نقش دیبائے چین میگرفت و بساط خاک آب از باد شکل زرہ می پذیرفت۔ و در جستن دست ہا و پایان چوگان وار گوئے خورشید می ربود و بدنعل ہلال کردار ہر ایک را بوسہ میداد۔

(۵) صفت تیر۔ و خدنگ چہار پر کہ عقاب جان شکن بود جگر شکافے میدوخت۔ و نوک پیکاں غنچہ شکل از چشم صد چشمہ خون میکشاد۔ و الماس تیغ نیلوفری از تن گور سیل ارغوانی میراند۔ و حد خنجر ضمیرانی بخط بنفشہ فام او رنگ لالہ وخیری میداد۔

بیت

خط عنبر صفت بر پشت ہر گور — بساں نقطۂ مار و خط مور

(۶) صفت میوہا۔ و حقۂ زرد ترنج وآبی از اوراق دینارے روی نمود۔

بیت

چو یک کیسۂ خز زر دست آبے — نہ پیدا در و تار و نہ ریسمانش
بساں سر شیر شد نار گفتہ — کہ باشد بیالودہ از خوں دہانش
چو گوئے است نارنج گوئی ز مرجاں — ز سر رستہ مینا صفت صولجانش
ز نخدان معشوق سیب است گوئی — بلے ماندہ از اشک عاشق نشانش
ترنج است چوں زرد رخسار امرود — کہ تبخال پیدا شود ہر کرانش
امامیست زنگی نگر خوشۂ زر — برافگندہ زنگار گوں طیلسانش

وگوئی سیمین سیب در سایہ برگ زریں پرورش یافت واز سر شاخ چو زنخدان محبوب در رخسار معشوق پیدا آمد۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد)
مؤلف "دکن میں اردو" وغیرہ

نئی پود کا تخیل

"پہلا اثر"

مثل مشہور ہے "جو ہاتھ جھولا جھلاتا ہے وہی حکومت کرتا ہے"

بچے کی پرورش اس طرح نہ کرو کہ آئندہ زندگی میں بے سہارا گذار نہ سکے۔ بچا لاڈ پیار سے اسکی زندگی اب تو بڑے مزے میں گذرتی ہے، وہ بھی تمہارے اپنے نقطۂ نظر سے۔ لیکن آئندہ زندگی اس کو جو تلخ تجربے دکھاتی ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں، اس کا ذمہ دار کون؟ تم خود یعنی والدین۔ تمہاری نادان دوستی سے سُبکدوش ہوتے ہی بچہ جن ذمہ داریوں سے دوچار ہوگا، اور اس وقت جن مشکلات کا اس کو سامنا کرنا پڑیگا اس کے ذمہ دار ماں باپ ہی ہیں۔ اس کی زندگی ناز نخروں میں تباہ نہ کرو۔ یہ پھر تو دُنیا کے لئے بیکار ہو جائے گا۔ اس کے خیالات کو ایک حد تک آزادی دو۔ بسم اللہ کے گنبد میں پلنے والے بچے دُنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے۔ بچوں کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات نہیں۔ پھر تم کیوں اپنے بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دو؟ ان کی پرستش کرو۔ ان کو معاذ اللہ خدا سمجھو۔ کہ دین ہے تو یہی دُنیا ہے تو یہی۔ ع:-

تجھ کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں

یہ کوئی عجیب المخلوقات تو نہیں۔ انسان کا بچہ ہے۔ تم کو کوئی ضرورت نہیں کہ تم اس کو دُنیا کا آٹھواں عجوبہ تصور کرو۔ نہ یہ کوئی غیر ذمہ دارانہ حیثیت کی ایک گڑیا ہے۔ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو غیر ذی رُوح نہیں۔ بلکہ اس میں روح ہے، جان ہے، احساس ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ تو کیا سب تمہاری طرح اس سے محبت ہی کرینگے؟ اسکا امکان ہے کہ لوگ اس سے کچھ نفرت بھی کریں۔ اس سے بیزار رہیں۔ اس کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ ہو۔ اس سے کچھ ہستیاں بیوفائی پر کمر باندھیں۔ بعض اسکی جان کے درپے ہو جائیں۔ اس نے دُنیا میں قدم رکھا ہے یا ایک ویرانہ میں جہاں انسان نہیں بستے؟ پس ــ تم اس کو دُنیا کے لئے تیار کرو۔ اپنے لئے نہیں۔ اپنے مکان اور خاندان کی حد تک اس کی ہستی کو محدود سمجھنا تمہاری سخت غلطی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہیں کہ بغیر جھڑکی کے کلام نہیں۔ بات کی اور طمانچہ رسید کر کے جواب دیا۔ اس سے کوئی اچھی حرکت ہوئی تو بھی خفا ہوتے۔ بُری حرکت پر تو آپے سے باہر ہو گئے کہ اس کی بات پہ زبان کٹنے لگی۔ یہ واقعات ہیں۔ بچہ اپنی کامیابی کی خبر سُناتا ہے تو آپ بڑی شان سے اکثر کہتے ہیں "کیا بڑی بات ہوئی تیرے بڑے بھائی نے بھی تو یہی امتحان دیا اور گذشتہ سال پاس ہو گیا"ــــ اس جواب نے بچہ پر جو اثر ڈالا وہ محتاجِ بیان نہیں یعنی یہی ہوا کہ آپ نے ایک نُمایاں کام کیا۔ اپنے حاکم سے داد چاہی اور اُس نے صاف کہدیا کہ "اُونہہ کیا کمال کیا۔ تمہارے جیسے تو سبھی کرتے ہیں" دل سے اُسوقت مزاج پوچھ لیا جائے تو مناسب ہے۔

بچے کے لئے مقررہ اوقات درشتی اور محبت کو تقسیم کر دینا بہتر ہے۔ جب اُس سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو تو سزا دینے میں کوتاہی کرنا حماقت اور پرلے سرے کی جہالت ہے۔ اور اسی کے برخلاف وہ کوئی اچھا کام کرے جس سے

آپ کا بھی دل خوش ہو جائے۔ تو اس وقت ستائش و محبت میں پس و پیش کرنا اُس سے بڑھکر ستم۔ ایک جذبے کی نیا دتی دوسرے کا نقصان ہے ایک سے قطع نظر دوسرے کی خرابی۔ بچہ کا کیرکٹر والدین یا سرپرست کے زیرِ عاطفت بنتا ہے۔ بچہ اگر بُرے اطوار کا ہے تو اس میں اسکا کیا قصور۔ والدین قصوروار ہیں۔

اس کو کسی ایک ہی چیز کی طرف متوجہ ہونے کے لئے جبر نہ کرو۔ یا اس کو اپنے سے مانوس کرنے کی حماقت تمہارے بیانا عاقبت اندیشی کی ایک مثال ہوگی۔ اس کا ذہن ترقی پر ہے۔ دُنیا نئی نئی چیزوں سے دن رات آراستہ ہو رہی ہے۔ اس کا چھوٹا سا دماغ نہایت سُرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ اس ننھے سے دماغ کو زیادہ کسی چیز کی طرف رُجوع کر کے مت تھکاؤ۔ اس کو آرام کی ضرورت ہے۔ اس کو آزاد چھوڑ دو۔ اس کو جبراً ہنسا کر اسکی خوشی کو حاصل کرنا نہ اس میں کوئی خوبی ہے۔ نہ اس میں عمدگی ہے کہ تم اسکی ہر ضد کا اتباع کرو۔ وہ جس پر مچل جائے اسکی تعمیل اپنا فرض سمجھو۔

ایک خوبصورت اونی گیند نوجوان کے دل کو بھی خوش کر سکتی ہے۔ بچے کو بھی وہ اپنی طرف کھینچنے کی مقناطیسی خاصیت رکھتی ہے۔ لیکن ـــ ہم کون ہیں بچہ کے مذاق کا اندازہ لگانے والے؟ ہماری یہ صریح غلطی ہے کہ ہم اپنی مذاق کی چیزیں، کھلونے قسم ہی کی سہی، بچوں کو لا کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض بچے ایسی ذہنیت کے ہوتے ہیں کہ وہ ہماری پسند اور مذاق کی چیزوں سے ملتفت نہیں ہوتے۔ ان کا مذاق اور ہے ہم کچھ اور سمجھے ہوتے ہیں۔

برنارڈ شا کی جاہی دماغوں کو حیرت میں ڈال دینے والی، صداقت سے بھری ہوئی تقریر کا اقتباس جو حسن کار کے سالگرہ نمبر کا اختراعِ فاتقہ ہے اس میں کی چند سطریں انہیں مواقع پر ایک ضرب المثل کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے لئے مضطرب ہیں اور میرا قلم اُن کی نقل پر مجبور ـــ "اگر میرے لڑکا ہوتا تو ـــ میں اس کو ایک جامع کو بھیجتے ہوئے کہتا "دیکھو بیٹا تم وہاں جا کر وہاں کے لوگوں کو یہ موقع نہ دو کہ تمہارے اپنے دماغ کی جگہ بناوٹی دماغ تمہارے سر میں ٹھوس دیں اور جو کتابیں وہ تم کو پڑھنے کے لئے کہیں تم ان کو ہرگز ہاتھ نہ لگاؤ" جو کتابیں نصاب کے لئے مقرر کی جاتی ہیں وہ پڑھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ میں جو ایک غیر تعلیم یافتہ تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہوں اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ میں کبھی نصابی کتابیں پڑھ نہیں سکا ـــ وغیرہ وغیرہ"

بیشک یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو اس کے جذبات اور ولولے کو آتش فشاں کی طرح پھوٹنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس کام کے کرنے سے منع کیا جاتا ہے دل فطری طریقے سے مجبور ہے کہ اُسی کی طرف مائل ہو۔ کیوں ایک طالب علم نصابی کتابوں کو رٹتے رٹتے اُکتا نہ جائے جبکہ اس کو انہیں مخصوص کتابوں کیلئے مغنون کر دیں۔ کہ تیر الجیا۔ وما واہے تو یہی۔ اس کے دل میں ایک ایسا بیزار کن تخیل بیٹھ جاتا ہے کہ وہ معلومات عامہ سے بھی فیض اُٹھا نہیں سکتا کہ کہاں ان دوسری باتوں کا خیال کروں اور ادھر امتحان میں ناکام رہ کر بدنامی کا ٹوکرا سر پر ہو جائے۔

بالعموم اکثر طلباء دارالمطالعہ سے نکلتے ہی پھر انہیں ان درسی و نصابی کتب کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ اور باتوں میں اُن کا دل بہلتا ہے۔ پھر اس غیر دلچسپ مطالعہ سے سوائے ایک اُکتا جانے والے انہماک کے کیا حاصل؟ ڈگریاں حاصل کیں تو کچھ ہوئے ورنہ کچھ نہ ہوئے۔ یہ عجوبہ سا معلوم ہوتا ہے۔ برنارڈ شا کی پُرمغز تقریر پڑھ کر تو دل نصابی کتابوں اور ان کے پابند مطالعہ سے

بچہ بہت سا جاتا ہے۔

— ۲ —

بچہ کا نعمت خانہ اُس کی ماں کی گود ہے۔ وہ اپنی ماں کی محبت اس کا خون پی پی کر حاصل کرتا ہے۔ بچہ جب تک سوتا رہے اس کو سونے دو۔ سونے میں بچوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس کو سوتا دیکھکر اب آپ کہیں مکان میں سب کو خاموش کر دیں گی۔ کہ بات نہ کریں، ہاتھ نہ ہلائیں۔ زبان سے کسی کے اُف نہ نکلے۔ کہ آپ کا سپوت محوِ خواب ہے۔ نہیں، بلکہ اس کو آوازوں میں سونے کا عادی بناؤ۔ تاکہ وہ آئندہ بزدل نہ بنے۔ ذرا سا دھماکا ہوا کہ وہ چونکا۔ جب وہ سو جائے آپ اپنے روزمرہ کے کام انجام دیں۔ خفیف سی آوازیں، رکابی کی جھنکار، گلاس یا کٹورے کا آپس میں ٹکرانا۔ دروازوں کا کھلنا یا بند ہونا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اس کی نیند میں خلل ڈال سکیں۔ یہ بھی نہیں کہ اس کو سوتا دیکھکر ڈھول پیٹنے لگے۔ اس کے سرپر اودھم مچا دی۔ غرض اعتدال کسی کام میں بُرا نہیں۔

اگر اس کے کھانے، سونے، نہانے کے اوقات مُقرر کر دئے جائیں تو پھر آئندہ چل کے اُس کی زندگی ایک نمونہ ہوگی ان ہستیوں کے لئے جن کے یہاں نہ سونے کا کوئی وقت مُقرر ہے نہ کھانے کا کوئی ٹھکانہ۔ نہ نہانے کی ضرورت کا احساس۔

ایک بچہ جب وہ اپنے دودھ کے وقت پر رونے لگے تو یہ نیچر ہے نہ کہ ہم اس کو لالچی یا بے صبرا کہیں گے ہاں جب وہ بڑا ہو کر کسی کھانے پینے کی چیز کو دیکھکر خواہش کا بیتابانہ اظہار کرے، ضد کرے، مچل جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تربیت اچھی نہ ہوئی۔ اس کو تمیز سے آشنا نہ کیا گیا بعض بچے فطرتاً تمیزدار ہوتے ہیں۔

جاہل مائیں ہر وقت اس پر تلی ہوئی رہتی ہیں کہ بچوں کو اناپ شناپ کھلاتی رہیں۔ اسی سے ان کے معدے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان میں ہضم کرنے کی سکت ہی نہیں رہتی۔ کسی وقت اتفاق سے کہیں پُرتکلف کھانا کھا لیا تو بس پھر دوسرا دن فاقہ یا فاقہ میں گذرا۔ بچوں کے لئے ہمیشہ ہلکی زود ہضم غذائیں ہونی چاہئیں ہم ان کے معدوں کو بھی ویسا ہی تصوّر کریں جیسے ہمارے معدے ہیں تو پھر نتیجہ معلوم۔ اس پر بھی آج کل کون ہے جو ہاضمہ کا رونا نہیں روتا۔ کس کو بدہضمی کی شکایت نہیں ——؟

ماں کو چاہیئے کہ خودداری کیساتھ رہے۔ نہ کہ اپنے بچے کے اشارہ کی غلام بنجائے، ایسا کہ بیٹے صاحب کی کوئی مہم بغیر اماں کی مدد کے سر نہیں ہوتی۔ بچوں کو فضول باتیں کہہ کر ڈرایا نہ جائے۔ اگر وہ یونہی رونے کا عادی ہے تو رونے دو۔ ہر بچہ غالب تو نہیں کہ اس کے رونے سے بستیاں ویران ہو جائیں —!

بچہ جب ذرا بھی اس قابل ہو جائے، اپنی مدد آپ کرنے کی اس کو تعلیم دو۔ وہ مدرسہ سے آئے تو کہیں آپ ہی صابن اور تولیہ لیکر دوڑیں گی کہ مُنہ دُھلا دوں۔ نہیں، بچے اسی سے آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ نکمے اور عیش پسند بننے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ کھانے پینے، نہانے، سونے غرض زندگی کے ہر قدم پر اس کو بغیر امداد کے چھوڑ دیا جائے۔ امداد کی حد تک امداد کی جائے۔ مثلاً کہیں آپ میری تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کرلیں کہ وہ خود ہی پکاتے، خود ہی بازار جاتے، خود ہی کھانا

[illegible] تعلیم بھی حاصل کرے۔ لیکن دُنیا میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے گھر پکانے والا تک میسر نہیں۔ پکا کے توشہ باندھا اور [illegible] سے ساتھ لیا۔ اکثر ہندوؤں میں ایسے اتفاقات ہوتے ہیں۔ بعض بچوں کی مثالیں سنیئے۔ مدرسہ سے آتے اور [illegible] بچے ہی پر روانہ ہو گئے۔ اب منہ دھونے کا پانی وہیں چلا آرہا ہے، چاء چلی آرہی ہے، غرض دُنیا دھین۔ کیوں کہ صاحبزادے یا صاحبزادی سے حرکت ناممکن ہو گئی۔ شیر مار کر آتے ہیں۔ مدرسے تھوڑی گئے تھے۔ اب اماں یا آتا۔ قاتی کھڑی سیر اور جاسے اشارے پر حاضر۔ بغیر ان کے ان کا پتہ نہ ہلے۔ ایسے بچے دُنیا کی ہر مہم پر سہارا ڈھونڈتے ہیں بلکہ بچے میں یہ عادت پیدا نہ ہی پڑ سکے۔ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل آپ خود کر لے۔ اس کی مختصر سی دُنیا میں ہر آنے والی معمولی سی مصیبت کے لئے تم سپر نہ بن جاؤ۔ بلکہ وہ خود اپنے پیر پر آپ کھڑا ہونے کا خوگر بنے۔ نہ کہ صاحبزادے کے منہ پر مچھر بھی بیٹھا تو آپ لگیں اُڑانے۔ وہ لڑکپن سے اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ یہ کیا کہ بچہ پروانے سے ڈرنے لگے۔ رسّی کو سانپ سمجھا اور چیخ مارے۔ ایسے بزدل سپوت زندگی کے مراحل کبھی طے نہیں کر سکتے۔

بچوں سے اپنے دُکھ درد کے قصے، زندگی کے جھمیلے مت بیان کرو۔ ان بکھیڑوں کو اپنے حد تک رکھو۔ کیونکہ معلوم ان کی زندگی میں کیا کیا قیامتیں برپا ہونے والی ہیں۔ اُن کے مدرسے و کالج کی پڑھائی سے تھکے ہوئے دماغ کو ضرورت سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ یہ کیا کہ وہ وہاں سے مغز پاشی کر کر کے آئے تو آپ اپنا دُکھڑا لے بیٹھیں! ان کے انمول نازک دماغ جن پر دُنیا کی مکاریوں نے ابھی قبضہ نہیں کیا ہے، اس سے دوری چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کی نشو و نما میں فرق آجاتا ہے۔ وہ بچے جو ایسی فضا میں پلتے ہیں جہاں بچوں کو بھی بڈھوں میں شمار کر لیا جاتا ہے، وہ بچے نہیں رہتے ان میں بھولا پن مفقود ہو جاتا ہے۔ اُن کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ چھوٹے منہ سے بڑی بڑی باتیں نکلتی ہیں۔ جو ثقلِ سماعت کا باعث بن جاتی ہیں۔ اُن کے منہ سے بھولی بھولی باتیں جب ہی نکل سکتی ہیں کہ اُن کے بڑے اُن کو اپنی پختہ کار، کہنہ مشق تقریر میں شریک نہ کریں۔ انہیں ان کی حد تک رکھو۔ اُن کے ساتھ بھدے اور بھونڈے مذاق مت کرو۔ اس طرح تم اپنی بزرگی کا وقار کھو دو گے۔ جب بڑے آپس میں محو کلام ہوں بچوں کو اس وقت کھیلنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ بچپن کی سیکھی و دیکھی باتیں تمام عمر یاد رہتی ہیں۔ وہ باتیں جو ہم نے اپنے لڑکپن میں سیکھی تھیں اب تک ذہن نشیں ہیں۔ "گذرا ہوا زمانہ" والی نظم جو لڑکپن کی لاابالی زندگی میں پڑھی تھی، اس کو اگرچہ کہ زمانہ گذر گیا۔ مگر اب تک یاد ہے "دال کی فریاد" بھولی نہیں جاتی۔ جب کبھی دال پک کر سامنے آئے کہ اُس کی فریاد نے گلے میں پھانسی ڈال دی۔

بچے کے گرنے پر اگر تم نے ان پتھروں کو پیٹنا شروع کر دیا جہاں وہ گرا ہے۔ یا کسی چیز سے اس کو چوٹ لگے اور تم نے اُس بے جان چیز کو دو گھونسے مارے، تو اُس کا بچہ پر کیا اثر ہوا؟ وہ یہ سمجھ لے گا کہ "واہ میں تو بالکل بے قصور ہوں۔ جب کبھی خطا ہوتی ہے اماں انہیں چیزوں کو مارتی ہیں۔ مجھے تو کچھ کہتی سنتی نہیں" تو اس پر یہ بالکل عیاں ہو گیا کہ دُنیا میں جتنی بھی غلطیاں ہیں اس کا ذمہ دار میں نہیں بلکہ اور ہوتے ہیں۔ یہ اثر اس کی آئندہ زندگی کے لئے ——— جو تجربوں اور دشوار گذار گھاٹیوں سے بھری ہوتی ہے۔ نہایت مخدوش و خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اُس سے جس سے چوٹ لگے یا جس سے تکلیف پہنچے بچنے کی ترکیب بتاؤ۔ اس پر واضح کر دو کہ سانپ میں صرف لہرا اور خوبصورتی نہیں بلکہ اس کی چال کے ہر پھیر میں زہر ہوتا ہے۔

ایک چار سالہ لڑکے سے کسی نے سوال کیا: "بابا تم خط لکھو گے؟" جواب ملتا ہے "ہاں لکھوں گا۔" پھر کسی نے پوچھا: "کیا لکھو گے؟" "بس ٹیڑھی لکیریں!"

ان لکیروں کی خوبیوں کو آپ سائنس اور فلسفہ میں تلاش کیجئے۔ منطق اور اخلاقیات میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جانا ہی ممکن ہے۔ آپ کو ان لکیروں کا کہیں پتہ نہ ملے گا۔ سوائے اس کے کہ ان سطور کو پاکر آپ کو غالب یاد آنا پڑے گا۔ ع

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں!

ج خ نقوی

ثمراتِ تخیّل

تجھ سے دو دن بھی وفا اے حیلہ گر ہوتی نہیں
دوستی کی بات اتنی مختصر ہوتی نہیں

ایک صورت پر ہے قائم اپنے کاشانے کا رنگ
شامِ غم شرمندۂ نورِ سحر ہوتی نہیں

دیکھ لے حالِ دلِ خوں گشتہ وہ بھی اک نظر
اتنی فرصت کیا تجھے بیدادگر ہوتی نہیں

کارفرما ہجر میں ہر چند ہے طوفانِ اشک
سرد پھر بھی آتشِ سوزِ جگر ہوتی نہیں

کیا نگہ فرمائیں سوئے عاشقاں اربابِ حسن
بادشاہوں کی فقیروں پر نظر ہوتی نہیں

ہو مبارک حضرتِ زاہد ہی کو یہ اتقا
بے مے و مینا تو یاروں کی بسر ہوتی نہیں

دردِ الفت نے بنادی جان پر میری نہال
یعنی مجھ سے التجائے چارہ گر ہوتی نہیں

نہال سیوہاروی

مسرت

افرادِ تمثیل

(۱) تارک الدُنیا پیر مرد — (۵) طوائفیں
(۲) سُورما — (۶) جوان عورتیں
(۳) تاجر — (۷) نوخیز لڑکیاں
(۴) شاعر — (۸) مسرت

مرد، عورتیں اور بچے۔ فوجی۔ چشمہ۔ جنگل۔ آب۔ باد اور خاک کی صدائیں

منظرِ تمثیل۔ سُنسان جنگل، ایک تارک الدُنیا کی جھونپڑی جو خودرو پودوں اور بیلوں سے ڈھنکی ہوئی ہے۔ جھونپڑی تک ایک پگڈنڈی نظر آتی ہے۔
وقفہ۔ پو پھٹنے سے دوسرے دن کی صبح تک۔

منظرِ اوّل

(پو پھٹتی ہے اور ایک معمّر ریشِ سفید پیر مرد جھونپڑی میں سے باہر آتا ہے)

پیر مرد۔ جنگل کی تاریکی خواب سے بیدار ہو رہی ہے اور خاموشی حمد و ثنا میں مصروف ہو رہی ہے۔ اے صنوبر کے درخت! شبنم نے تجھ میں تازگی بھر دی ہے۔ نسیمِ سحر کے جھونکے تجھ میں نئی رُوح پھونک رہے ہیں۔ تیری شاخیں سبز پتّوں کا تاج پہنے کس تمکنت سے آسمان تک پہونچنا چاہتی ہیں۔ ننھی ننھی سی خوشرنگ چڑیاں خوشی کے ترانے گا رہی ہیں۔ اور درختوں میں سے گذرنے والی ہوا کی سنسناہٹ ان کی سنگت میں کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے! زمرد و سونے کی جھلک، ارے! روشنی کے دھاگوں سے افق کی تہہ سے اُبھرتا جا رہا ہے۔ اے معبود! تیری تجلّی کے آگے ہر ایک کا سرِ نیاز سجدہ میں جھکا ہوا ہے۔

(پیر مرد عبادتگاہ میں سجدہ میں گر جاتا ہے یہانتک کہ صبح کی روشنی خوب پھیل جاتی ہے۔)

(سجدہ سے اُٹھکر) انسانی تکلیفوں اور غم کے بھنور، شوریدہ سر جذبات کے جنگل اور نفس کی کشمکش سے، دُنیاوی قیود اور پابندیوں سے، اے معبود! تو نے اِس جنگل کی تنہائی میں مجھے راہِ نجات دکھائی، جہاں سکون کی عملداری ہے اور راحت کا سکّہ جاری ہے۔ تو نے مجھ پر رحم کیا اور اِس سُنسان جنگل میں مجھے اطمینان کی دولت بخشی۔ کارزارِ دُنیا میں میری ہمت میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی، اُمید زخمی ہو کر دم توڑ رہی تھی اور میری رُوح مجروح ہو کر سسک رہی تھی۔ گناہ کی تنہائی

میں میری رُوح نے تجھ سے تقویت پائی۔ دُنیا کی خوشیاں بے بُنیاد ہیں۔ خواہشیں موہوم اور آرزوئیں مُہلک ہیں۔ اے معبود! میں تیرے اِس اِحسان کا شُکر کس طرح ادا کروں کہ تُو نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا جبکہ میری رُوح گُناہ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے ہی والی تھی۔ تُو نے مجھے معصیت کے مُہلک گرداب سے نکال کر حقیقی زندگی بخشی۔ میری مُضطرب رُوح کو سکون میسّر آیا۔ نفس کی خوفناک خواہشات مٹ گئیں، اور میرے بے چین دل نے صدا دی کہ تیری رضا پر راضی ہونے ہی میں سکونِ خاطر پنہاں ہے۔

منظر دوم

(مسرّت — ایک حسین پری درختوں اور جھاڑیوں میں سے پھڑپھڑاتی ہوئی آتی ہے اور پیرمرد کے قدموں میں گر جاتی ہے۔)

مسرّت۔ (گھبرا کر) بچاؤ۔ لِلّٰہ مجھے بچاؤ۔

پیرمرد۔ (چونک کر) لاحول ولاقوۃ الا باللہ! اے شیطان کی جائی! دفع ہو، یہاں سے اپنا مُنہ کالا کر۔

مسرّت۔ نہیں، نہیں، خُدا کیلئے مجھے بچاؤ۔ میری بپتا سُنو۔

پیرمرد۔ جہنّم میں جا جس کے شُعلے تیرے مُنتظر ہیں۔

مسرّت۔ ہائے نہ جانے تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ لِلّٰہ میری فریاد سُنو۔

پیرمرد۔ دُور دُور، اے خُدا کی لعین مخلوق! میرے سفید سر میں اپنے حُسن کا سودا سمانے کی کوشش نہ کر۔ میں تیرے فریب میں نہیں آؤنگا۔

مسرّت۔ آہ! میری التجا کو رد نہ کرو۔

پیرمرد۔ کیا تو یہاں سے دفع نہ ہوگی! (پیرمرد سجدہ میں گر پڑتا ہے) اے معبود! مجھے معصیت سے بچا۔ مجھے ہمّت دے کہ میں اِس گناہِ مجسّم کا مقابلہ کر سکوں۔ مجھے اس پر فتح دے۔ میری رُوح اذیت میں مُبتلا ہے۔ میں تجھ ہی سے امداد چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے بچا۔

مسرّت۔ (دستِ بدعا ہو کر) آمین۔

پیرمرد۔ اگر تو کوئی خبیث رُوح نہیں ہے تو قسم کھا کہ تیرے یہاں آنے کا مقصد گُناہ سے وابستہ نہیں ہے۔

مسرّت۔ میں خُدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میری نیت گُناہ سے پاک ہے اور میں خدا ہی کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھے پناہ دو۔ مجھے مُوذیوں سے بچاؤ۔

پیرمرد۔ تو نے ایسی کیا بات کی ہے جو پناہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے؟

مسرّت۔ میں نے کچھ نہیں کیا مگر پھر بھی......

پیرمرد۔ مگر پھر بھی تیرے گُناہ نے تجھے اس وحشتناک جنگل میں آنے پر مجبور کیا تاکہ مجھ سے پناہ کی طلبگار ہو!

مسرّت۔ ہائے کیا تم میری غمناک آنکھوں سے بھی میری بدنصیبی کا اندازہ نہیں لگا سکتے؟

پیرمرد۔ ہاں غمزدہ تو تُو معلوم ہوتی ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟

مسرّت۔ مجھے "مسرّت" کہتے ہیں۔

پیرمرد۔ غمزدہ مسرّت؟ تو ضرور تُو کوئی دیوانی ہے۔ بھلا جو اوروں کو خوشی سے سرفراز کرتی ہو وہ خود کیسے غمزدہ ہو سکتی ہے!

مسرّت۔ اے پیرمرد! تم مجھے حُسن کی چادر میں لپٹا ہوا دیکھ

[illegible] چھپ جاتی ہیں تم میرے حُسن پر نظر کرتے [illegible] تھک ہوتے اور شفقت سے چُور بدقسمتوں کو [illegible] اور انہیں سماوی مسرت کی راہ دکھانے کے [illegible] نے مجھے یہ خوشنما جوڑا بخشا ہے۔ مجھے اَوروں کی خوشی کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگر میرا دل آماجگاہِ غم ہے۔

پیر مرد۔ او گمراہ ہستی! بھلا جس کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہو کہ اوروں کو خوش کرے۔ جو خود سرچشمۂ مسرت ہو اس کا دل آماجگاہِ غم ہوگا یا گہوارۂ عیش؟۔

مسرت۔ نہیں، نہیں، ایک انبوہ کثیر مجھے گرفتار کرنے دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہا ہے میں اُس سے بچ کر اِس جنگل کی بھیانک تنہائیوں میں نکل آئی ہوں تا کہ یہاں مجھے پناہ اور سکون مل سکے۔ مگر سکون مجھے یہاں بھی میسر آتا نظر نہیں آتا۔ ہائے شکاری میرا کھوج نکال کر کوئی دم میں یہاں آتے ہی ہونگے۔ اور میں اب تھک کر جان سے بیزار ہو گئی ہوں۔

پیر مرد۔ محسن کُش ظالمو! بیوقوف اندھو! اپنے سرمایۂ مسرت کو بھی یوں تاراج کئے دیتے ہو!!۔

(مسرت کے مُتلاشی انبوہ کا شور دُور سے سُنائی دیتا ہے)

انبوہ کی آواز۔ کدھر گئی؟ کہاں گئی؟۔

مسرت۔ اے پیر مرد! آواز سُنی؟ بیرحم قریب آ پہونچے۔

پیر مرد۔ مجھے تجھ پر ترس آتا ہے۔ شکاری اپنے خوبصورت شکار کی تلاش میں قریب آ گئے۔ بھاگ، اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ۔

مسرت۔ رحم! رحم! خُدا کیلئے بچاؤ۔

پیر مرد۔ اچھا تو پھر ٹھہر جا۔ مگر تیرا لباس! یہ تو ہزاروں زبانوں سے تیری چُغلیاں کھائے گا! کیا اور کوئی کپڑا نہیں ہے جو تجھے چُھپا سکے؟۔

مسرت۔ میرے پاس تو اور کچھ نہیں ہے۔

پیر مرد۔ اور نہ میرے پاس ہی کچھ ہے۔ جھونپڑی میں میری ایک پُرانی گُدڑی پڑی ہے۔ اگر تو اُسے ـــــ

مسرت۔ ہاں، ہاں! میں ضرور اُسے پہن لونگی تم رحمت کے فرشتے ہو۔ گُدڑی میں وہ راحت پوشیدہ ہے جسکی تلاش بیوقوف انسان مصیبتوں بھری دُنیا میں کرتا ہے۔

انبوہ کی آواز۔ (قریب سے) ہمت نہ ہارو۔ اپنی تمام قوتیں حصولِ مسرت میں صرف کر دو۔ اور آج مسرت ہمارے پاؤں چُومے گی۔

پیر مرد۔ جلدی کر، میری جھونپڑی میں چھپ جا۔

مسرت۔ خُدا کرے تمہاری گُدڑی میں مجھے سکونِ خاطر نصیب ہو۔

(مسرت پیر مرد کی جھونپڑی میں چھپ جاتی ہے۔)

منظر سوم

(مسرت کا تعاقب کرنے والا گروہ جنگل میں آکر منتشر ہونے لگتا ہے)

سوداگر۔ کیا تم نے ایک منور شباب دیکھا ہے؟۔

سب۔ (ایک آواز) ہاں! مسرت!!

تاجر۔ کیا وہ یہاں سے گذری ہے؟

سب۔ (ایک آواز) لباسِ نور زیب تن کئے ہوئے۔

ایک عورت۔ تم تو یقیناً اُسے پہچانتے ہو گے!۔

سب۔ (ایک آواز) شیریں مسرت!۔

دوسری عورت۔ کس قدر [illegible] اور دلکش!۔

ایک مرد۔ وہ جانِ آرزو ہے۔ کدھر گئی؟۔

طوائفیں۔ تقاضا جواب دو۔
عورتیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم سے بہت دور نکل جائے۔ جھاڑ جھنکار میں سے وہ اس قدر سرعت سے گزر جاتی ہے کہ ہوا بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی ہمارے دل میں اس کی خواہش بیتاب ہے مگر ہم پیچھے ہی رہے جاتے ہیں اور فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہم اس کا پیچھا بہت دور سے کر رہے ہیں تاکہ وہ صرف اپنی ایک مسکراہٹ سے ہماری زندگی کو کامیاب کردے۔ اے پیر مرد! اگر تم نے مسرت کو یہاں سے گزرتے دیکھا ہو تو ہمیں بتا دو کدھر گئی ہے؟۔
پیر مرد۔ میں تم سے پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ تم مسرت کس کو سمجھتے ہو؟۔
سورما۔ شمشیر کی فتح!
تاجر۔ محفوظ سرمایہ!۔
پہلی عورت۔ یکجہتی شوہر!
دوسری عورت۔ رعنائی حسن!
شاعر۔ انعام واکرام!
تیسری عورت۔ جواہرات کی خیرہ کن چمک!
فوجی۔ اچھا شہرہ اور کثرت جنگ!
نوخیز لڑکی۔ جوانی اور محبت!
شاعر۔ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مسرت نہ ہو۔ سنہری دھوپ کا شامیانہ جو شعاعوں کی طنابوں سے تنا ہوا ہو۔ شام کے وقت ستاروں کی چمک۔ خوشی یا کسی کا فراق۔ اس کا تو کبھی ایک نام ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہر نام اس کے لئے باعث ننگ ہوگا۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ فتح، زر و جواہر، حسن، اولوالعزمی، محبت، فرض، ایثار، غرض ایک دو نہیں، اس کے تو سینکڑوں نام ہیں۔
پیر مرد۔ (گھبرا کر اور کچھ جھنجھلاتے ہوئے) پھر تو میں اُسے خوب جانتا ہوں جو میری جھونپڑی میں ہے۔
سب۔ کہاں ہے؟ ہمیں بتاؤ، ہمیں بتاؤ، ہماری قسمت ہو تم اُسے ہم سے نہیں چھپاؤ گے ہمیں کسی نہ کسی طرح مسرت کو حاصل کرنا ہے۔
پیر مرد۔ (اپنے دل میں) افسوس! میں نے ناحق اُسے روکا۔ اُف! میں نے کیسی بیوقوفی کی کہ اس کا راز فاش کر دیا! شیریں مسرت کا انہیں پتہ بتا دیا۔
سب۔ چلو جلدی چلو۔ اُسے ڈھونڈ نکالو اور پھر رسیوں سے اُسے اچھی طرح جکڑ لو۔
(ایک شخص پیر مرد کی جھونپڑی کا دروازہ کھولتا ہے اور مسرت کو گدڑی پہنے ہوئے دیکھ کر جھجکتا ہے۔)
سب۔ تو کیوں جھجک رہا ہے؟ آخر تو نے ایسی کیا عجوبہ بات دیکھی؟۔
وہ شخص۔ اس میں تو ایک اور پیر مرد معلوم ہوتا ہے۔
سب۔ (پیر مرد کو دھمکیاں دیتے ہوئے) تو کیا تو نے ہم سب کو دھوکا دیا؟ بیہودہ مذاق میں ہمیں اُٹھایا، ہماری بدبختی کی ہنسی اُڑائی؟۔
سورما۔ اس کی تجھے اچھی طرح سزا دی جائیگی۔
سب۔ خبردار! ہوش میں آ!۔
تاجر۔ ہم تیرے ساتھ بُری طرح پیش آئیں گے۔
طوائفیں۔ ہم تیری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔
عورتیں۔ خبردار! ہم تیرے سفید بالوں کا لحاظ نہیں کرینگے۔
مرد۔ بڈھے کیوں تیری شامت آئی ہے۔
عورتیں۔ ہم تیری آنکھیں نکال لیں گے۔
مرد۔ اور تیری خوب گت بنائیں گے۔
عورتیں۔ مار ڈالے۔ اس کی ضعیفی کا لحاظ مت کرو۔
مرد۔ اس کی ڈھٹائی تو دیکھو کہ تلاشِ مسرت پر سفید جھوٹ

بل کھ ۔۔۔ اٹھو۔
(سب کے سب پیر مرد پر برس پڑتے ہیں)
پیر مرد ۔۔۔ (کرتے ہوئے) ٹھہرو! ٹھہرو! میں نے غلطی کی! ۔۔۔ کو اس سے کیا کام! تم لوگ خوبصورت ۔۔۔ ہو۔ اور تم ہی جیسی وہ نوخیز حسینہ تھی جو زیورات ۔۔۔ میرے سامنے سے گذری تھی۔ خوبصورت اور ۔۔۔ چہرے والی حسینہ۔
سب ۔ ہاں ہاں وہی۔ جس کا حسن تڑپنے والی بجلی کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے اور جس کی صباحت تاریکی میں اُجالا پھیلاتی ہے۔ ضرور وہی دوشیزہ ہوگی۔ خوابِ رنگین، سیلابِ نور، بتا وہ کدھر گئی؟۔
پیر مرد۔ صبح کے وقت وہ یہاں سے گذری تھی۔ اُس تیر کی طرح جس کے پر آرزو کے بنے ہوئے ہوں۔ مشرق کی جانب وہ آگ کی سی سُرعت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔
سُورما۔ تو پھر تو نے ہمارا وقت ضائع کیوں کیا؟۔
تاجر۔ فضول باتوں میں ہمیں کیوں لگایا!
سب۔ مسّرت اب بہت دُور نکل گئی ہوگی۔
طوائفیں۔ تجھ پر لعنتیں برسیں۔
شاعر۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم اُسے پکڑ لیں گے۔
جلدی کرو، اُس کا پیچھا کرو۔ جلدی، جلدی۔
سب۔ محبت، نفرت، ہم سب کچھ چھوڑتے ہیں۔ ہمیں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے، اور نہ اس کا افسوس کرنا چاہیئے۔ حصولِ مسّرت کی خواہش نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے۔ جن سے ہمیں محبت ہے ہم اُن کا خیال بھی دل سے نکال دیتے ہیں۔ آگے بڑھو، آگے بڑھو۔ فریادوں کے لئے اپنے کان گنگ کر لو۔ مسّرت کے تعاقب میں مُردہ اور مرتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھو۔
(سب کے سب اُفتاں وخیزاں پھر جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔)

* * * * * * *

منظر چہارم

پیر مرد۔ (انبوہ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھکر) تمہارا شکار کامیاب ہو۔ مسّرت کا تعاقب کرو اور تعاقب میں مدہوش ہوکر مسّرت کو پیچھے چھوڑ جاؤ۔
انبوہ کی آواز۔ (دُور سے) مسّرت کو مُقید کرنے کی خواہش نے ہماری جُستجو کے پر لگا دئے ہیں اور ہم اُس کا پیچھا زیادہ تیزی سے کریں گے۔
مسّرت۔ (پیر مرد کی گُدڑی پہنے اور چہرہ چُھپائے جھونپڑی میں سے باہر نکلتی ہے) کیا وہ سب چلے گئے؟۔
پیر مرد۔ دُور نکل گئے۔ اُن کا شور اب سُنائی نہیں دیتا اور جنگل کا سناٹا پھر چھا گیا ہے۔
مسّرت۔ میں تمہاری بیحد ممنون ہوں۔
پیر مرد۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا مگر تو نے اپنے مُقدس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔
مسّرت۔ وہ کیسے؟۔
پیر مرد۔ تیرا فرض یہ ہے کہ تُو سب کو خوش رکھے مگر تو ہے کہ اُن سے پیچھا چُھڑا کر مُنہ چُھپاتی پھرتی ہے۔ دلگیر ہوکر وہ تیری جستجو کر رہے ہیں اور خاک بسر مارے مارے پھر رہے ہیں۔
مسّرت۔ آہ! اگر جب میں اُن کے قبضہ میں آجاتی ہوں تو وہ

میری عنایت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور اُن پر جو مجھ سے محروم ہیں طرح طرح کے ظلم توڑتے ہیں یہاں تک کہ اُن کا جینا اجیرن ہو جاتا ہے۔ نیکی کا بدلہ بدی اور ذلت و رسوائی میری قسمت میں لکھی ہے۔ میرے سایہ میں خود غرضی و ناشکری پروان چڑھتی ہے، مجھے یہیں رہنے دو۔

پیر مرد۔ اے بدنصیب ہستی! میں تجھے یہاں سے نہیں نکالوں گا۔

مسرت (گدڑی اتار کر) تو مجھے اب خوشی کے گیت گانے دو اور خوشیاں منانے دو۔ فطرت کے سُریلے بولوں کے ساتھ میں آواز ملاکر گاؤں گی۔ میں بھی آزادی اور خوشی کے راگوں میں اس کی ہمنوائی کروں گی۔

پیر مرد۔ اور سنو! بھیانک جنگل سینکڑوں چکدار پَر لگا کر تمہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے اور ہزاروں سُریلے گلے اس مترنم خیر مقدم کے ساتھ ساتھ اپنے مہمان کے آنے پر و فورِ مسرت سے الاپ رہے ہیں۔

مسرت۔ میں تمہارا شکریہ کس منہ سے ادا کروں! تم نے بغیر کسی لالچ کے مغموم مسرت کو غم سے نجات دلائی اور اُسے دشمنوں کے ہلاکت آفریں جنگل سے بچایا۔

"جنگل فردوس بنجا!"

(ہاتھ کا اشارہ کرتی ہے) درختو! پتوں اور پھلوں سے لد جاؤ۔ ہوا کو خوشبو سے بھر دو۔ جنگل کے پرندو! اپنے چہچہوں سے فضا کو گونجا دو۔

(کوئل کُوکنے لگتی ہے۔ گلاب کی جھاڑیوں پر بڑے بڑے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ درختوں پہ بیلیں چڑھنے لگتی ہیں سنہری دھوپ پھیل جاتی ہے اور جنگل میں منگل ہو جاتا ہے)

پیر مرد۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیسا خوشگوار دن ہے! بہار کی مکمل رعنائیاں جمع ہیں۔ میں نے آج تک دنیا میں اتنی خوشنما جنت نہیں دیکھی۔

مسرت۔ کیا تم بہار کی معطر ہوا نہیں سونگھتے ہو! اگرچہ بہار کا موسم نہیں ہے! موسیقی کا دلکش ترنم نہیں سُنتے ہو جو عہدِ شباب کی صدائے بازگشت کے مانند ہے!

پیر مرد۔ میں سُن رہا ہوں، میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا بوڑھا دل ایک دفعہ پھر خوشی سے دھڑک رہا ہے۔ تیرے حُسن کا جادو مجھ پر چل رہا ہے اور مجھ میں جذباتِ جوانی کی آگ بھڑکا رہا ہے اور ہر دفعہ ایک نئی حیرت کے ساتھ، اے ساحرہ! میں تیرے چہرے کو دیکھتا ہوں۔

مسرت۔ میرے حواس نسیان میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ اے عروسِ فطرت! اپنے عجیب و غریب اسرار کھول دے (وہ ایک سبزہ سے ڈھکے ہوئے پُشتے پر بیٹھ جاتی ہے اور پیر مرد کی گدڑی پھر لپیٹ لیتی ہے۔)

پیر مرد۔ کیسی خوبصورت مسرت کیسے بھدے لباس میں!

مسرت۔ اور خوش! میں، جس کی سب قدر کرتے ہیں، بالآخر میں بھی خوش ہوں۔ آہوں سے آزاد۔

پیر مرد۔ (اپنے آپ سے) میرے دل! لرز اور کسی آنے والے خطرہ سے ڈر۔ صبح کی پہلی نارنجی روشنی کی طرح حسین، بہار کی تر و تازگی کی طرح دلکش، اس خوبصورت پری کا جادو ہے۔

(مسرت سے) لیکن کیا اس سے تیرا دل نہیں گھبراتا کہ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر تو اپنی برکتیں نازل کرے!

مسرت۔ ہاں اگر میں یہ نہ کر سکوں تو میرا دن ضائع ہو جائیگا۔ مگر میں یہ تو اب بھی کر سکتی ہوں۔

پیر مرد۔ (مسکراتے ہوئے، اپنا سر ہلاتا ہے) تو کس کے لئے بیشمار خوشیاں فراہم کر سکتی ہے! اس جنگل میں دنیا کے عیش و راحت کا کون خواہاں ہو گا!

مسرت۔ کیا تم نہیں ہو؟ اچھا مجھے بتاؤ تمہیں کون سی خوشی

حسن ہو سکتی ہے! خوشی کا ایک دریا ابھی تمہارے سامنے بہنے لگا ہے چاہو تو دولت لیلو یا ایام گذشتہ کی مسرتیں چاہو اُس خوبصورت گدار ستارے کو پسند کر لو جو جنت کو دروازے پر سے اپنی روشنی میں پھیلا رہا ہے یا محبت — جسے فانی سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

پیر مرد۔ نہیں۔ میرا دل بُوڑھا ہو چکا ہے اور مسرتوں کے لئے سرد ہو گیا ہے۔ دُنیاوی شُہرت میرے لئے بے حقیقت چیز ہے۔ دولت سے مجھے نفرت ہے اور محبت مجھے گمراہ کر دیگی۔

مسرت۔ یہ مت کہو۔ یاد رکھو کہ بہار خزاں سے پہلے آتی ہے۔ تمہارا شباب دوبارہ واپس آسکتا ہے اور تمہاری زندگی برکتوں سے مملو ہوگی۔ تمہارا دل محبت سے لبریز ہو جائیگا۔ شُہرت تمہارے پاؤں چُومے گی اور اقبال قدم لیگا۔ تمہاری لئے کوئی فراز اونچا نہ ہوگا اور نہ کوئی نشیب نیچا۔ شاندار فتوحات تمہارا حصّہ ہوں گی اور بالآخر تم فاتح بن کر اپنی تلوار اُس ہستی کے قدموں میں ڈال دوگے جس کی پرستش تمہاری جوان محبت کرتی ہوگی۔

پیر مرد۔ آہ! جوانی کے سُنہرے دن! آہ، ماضی کا رنگین خواب! میرے دل میں اُس کے خیال ہی سے میٹھا میٹھا درد ہونیلگا۔ کیا یہ گزرنے والا زمانہ بدل سکتا ہے اور شباب دوبارہ مجھے مل سکتا ہے!۔

مسرت۔ کیا تمہیں اس کی آرزو ہے؟ ہاں تمہیں مل سکتا ہے۔

پیر مرد۔ نہیں، نہیں، یہ بیوقوفی ہے، نہیں میں اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا جس میں ماہ و سال ایک بار پھر میرے قلب کی مسرتوں میں کمی کرتے جائینگے، میری قوتوں کو مضمحل کرتے رہینگے یہانتک کہ پھر مجھے خاک میں ملا دیں گے۔

مسرت۔ اچھا تو پھر تم عقل و فراست کا تحفہ لے لو تاکہ تم اُس شاہراہ پر پڑ جاؤ جو مسرت اور سکون کی آماجگاہ پر ختم ہوتی ہے۔

پیر مرد۔ نہیں نہیں، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو خاموش ہو جا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

مسرت۔ اچھی طرح سوچ لو اور پھر کچھ پسند کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عجلت میں تم مسرت کو کھو بیٹھو! کم از کم ایک آرزو تو ظاہر کرو۔

پیر مرد۔ نہیں، ایک بھی نہیں، میں مطمئن ہوں۔

مسرت۔ اچھا تو خوش رہو، اتنے کہ تمہاری مسرت کبھی زائل نہ ہو۔

پیر مرد۔ ہاں یہ بتاؤ کہ یہ کیسا رہیگا اگر میں یہ آرزو کروں کہ مجھے زندگی کی کُل تکلیفوں سے نجات مل جائے، تمام شُبہات، خطرات، بیکار خیالات جاتے رہیں اور سب سے اچھی چیز مجھے میسّر آئے؟۔

مسرت۔ (چونک کر) سب سے اچھی چیز! آہ!۔

پیر مرد۔ آہ! میرا بُرا ہو۔ ابھی تو تیرا چہرہ نورِ حُسن سے پھٹا پڑتا تھا جس طرح کہ بہار کا آسمان سُنہری دُھوپ سے چمکتا ہے، مگر اب اس پر غم کی گھٹا چھا گئی اور افسوس کے سیاہ بادل تیری شفاف آنکھوں کی روشنی کو مدھم کر رہے ہیں۔ سب سے اچھی! میری استدعا عجلت آمیز تھی!۔

مسرت۔ بڑی اور چھوٹی سب چیزوں میں سے تم سب سے اچھی چیز کے خواہشمند ہو؟ تمہاری آرزو پوری ہو جائیگی مگر یہ صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ تم مجھے پیار کرو۔

پیر مرد۔ تجھے پیار کروں؟ — نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی عشرتوں سے علیحدہ رہنے کی میں نے نوعمری ہی میں قسم کھائی تھی۔ کیا تو میرے سینہ میں گناہ و جوانی کی ناپاک آگ بھڑکانی چاہتی ہے؟ — بوسہ! کبھی نہیں۔ میں اپنی قسم ہرگز نہیں توڑونگا۔

(ہوا دکھلا کے سامنے سجدہ میں گر پڑتا ہی)

اے خدا میں تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھی سے مدد چاہتا ہوں میرے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے اسے بجھا دے مجھے جہنم کی آگ سے بچا۔ مجھے میرے نفس کی سرکشی پر فتح دے۔ اور سیدھے رستے پر چلنے کی توفیق دے۔ اے معبود! مجھے ہمت دے کہ میں نفس کی دیوانگی پر غالب ہو سکوں۔ ایسی خوشی کی حرکت نہ کر بیٹھوں جس کا انجام روحی عقوبت ہو اور میں رنج و غم میں ہمیشہ کے لئے مبتلا ہو جاؤں۔

(ابھی سے آشنا ہوا لگو بیدار ہو کر آنکھ میں ہو)

میری دعا مانگنے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی ہے۔ ایک بگولے ہوا کی طرح جنات مضطرب ہو۔ میری دعا اٹھ کر ہوا میں گم ہو جاتی ہے۔ اے جنگل کے درختو! اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں میں مجھے چھپا لو۔ میرا مقام سکون میں ہے اور سکون تمہارے سائے میں ہے۔

(پھر مڑ کے جنگل میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے)

• • • • • •

منظر مجسم

مسرت۔ ہوا! آرام و سکون میں۔ اپنی روح کے دکھ کا مداوا کوشش کرتے ہیں تمہیں کامیابی ہوا! افسوس! میں دیکھتی ہوں کہ خالق نے میری تخلیق شانِ قہاری میں کی۔ میرا عدم و وجود مخلوق کے لئے باعثِ برکت نہیں ہے۔ شبہات میرے دماغ کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ کیا میرا نام سچ مچ مسرت ہی ہے؟ اس قدر اداس اور پریشان کن مسرت! اس درجہ واماندہ اور اس قدر غمزدہ!۔

(سبزے سے ڈھکے ہوئے پشتے پر بیٹھ جاتی ہے۔)

چشمہ کی آواز۔ اِدھر دیکھ اور سُن! میں کیسا چمک رہا ہوں اور ننھے ننھے پتھروں سے کس طرح سرگوشیاں کر رہا ہوں۔ بہار کی آمد پر کیسا میٹھا راگ گا رہا ہوں۔ اُچاٹ نیندیں میرے ننھے سے خواب کو سُن کر چلی آتی ہیں۔ میں تیرے کرب کو دُور کر دوں گا اور تجھے آہستہ آہستہ وادیٔ خواب میں لے جاؤں گا۔

مسرت۔ چشمہ کیا کہہ رہا ہے؟ جس کی روانی کبھی نہیں تھمتی اور جسے ثبات و قیام نہیں، اسے تو کبھی آرام میسر نہ آتا ہو اور ہمیشہ تڑپتا ہی رہتا ہو وہ اوروں کو سکون پہنچائیگا

تمنگی ہو؟

ہوا کی آواز۔ جنگل میرا ستار ہے اور میرے اشارے پر بجتا ہے۔ کبھی ہلکے ہلکے سُر چھڑتے ہیں، کبھی زور و شور سے نغمے گونجتے ہیں۔ میں جب درختوں میں سے گنگناتی ہوں تو ترنم بکھیرتی جاتی ہوں۔ یہ ترنم تیرا غم تجھ سے چھین لے گا۔ تیری مضطرب روح شگفتہ ہو جائے گی اور یہ میٹھی لوری تجھے میٹھی نیند میں گم کر دیگی۔

مسرت۔ کبھی تو گاتی ہوئی آتی ہے اور کبھی گنگناتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں سے گذرنے والی ہوا کی سرگوشیو! تم تو خود بے چین ہو اور بھاگ رہی ہو۔ مجھے کیا سلاؤ گی!۔

جنگل کی آواز۔ شام کا دھندلکا بڑھ رہا ہے۔ خاموشی کی حکومت ہوتی جا رہی ہے اور سناٹے کا سکہ جاری ہو رہا ہے۔ خوش و خرم دنیا اپنی آوازوں کو ختم کر چکی ہے اور محبت کی سرگوشیاں کر رہی ہے۔ میں تیری حفاظت کروں گا اور تیرا بال بھی بیکا نہ ہونے دوں گا۔ ہوا اور دنیا سے

بے چین ہو رہا ہے ... سے لطف اندوز ہو رہے ہیں گے
مسرت ... معلوم ہوتا ہے میرے پہلوئے

بوجھل ہو رہے ہیں۔ پہاڑ سا دن گزر گیا۔ رات اپنی سیاہ چادر پھیلا رہی ہے اور نیند چھائی جا رہی ہے
(سو جاتی ہے)

منظر ششم

(پیرمرد متفکر رک رک کر آہستہ آہستہ جنگل میں واپس آتا ہے)

پیرمرد — بڑھو ... میری روح کی بے چینی کسی طرح دور نہیں ہوتی۔ اپنے ناپاک خیالات سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں، میں نے جنگل کی تنہائی میں کی مگر میرے فاسد خیالات نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ فطرت کی پُرسکون آغوش میں سے مسرت مجھے کھینچ رہی ہے۔ میں پھر واپس آ رہا ہوں۔ ڈگمگاتے قدموں سے، ناخوشی سے، مگر قسمت مجھے کسی نہ معلوم سی ڈوریوں سے کٹھ پتلیوں کی طرح کھینچے لئے چلی آ رہی ہے۔ کیونکہ یہاں ——

(وہ چاروں طرف دیکھتا ہے اور سامنے پڑی ہوئی مسرت خوابیدہ نظر آتی ہے) اچھا یہاں سبزے پہ وہ آسودۂ خواب ہے۔ اُن پھولوں سے بھی زیادہ حسین جو اُس کے چاروں طرف اُگے ہوئے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ مسکرا رہی ہے اور اُس کا تبسم پھولوں کو شرما رہا ہے۔ اگر میں اُس کے لبوں کو اپنے لبوں سے چھو لوں تو کیا بہت بڑا گناہ ہو گا؟ ایک بوسہ؟ خیر تو پھر موت ہی کیوں نہ آ جائے۔ اس دنیا میں جہاں زندگی اُس ظلمت کی طرح ہے جو نور سے ناآشنا ہو۔ میں اس مسرت سے محروم نہیں رہوں گا خواہ اس کی پاداش میں مجھے موت کا منہ ہی کیوں نہ دیکھنا پڑے۔

(وہ ٹھٹک ٹھٹک کر اُس کی طرف چند قدم چلتا ہے جہاں مسرت سو رہی ہے پھر ٹھہر جاتا ہے اور چاروں طرف دیکھتا ہے گویا بڑے غور سے آوازیں سن رہا ہے)

سارا جنگل نیند میں سنسنا رہا ہے۔ چرند اور پرند بھی خاموش ہیں اور کوئی نہیں دیکھے گا۔ خود اُس کو بھی معلوم نہ ہو گا۔ اتنی نرمی سے، اتنے احترام سے میں بوسے کے لئے جھکوں گا۔

(وہ اور بھی قریب جاتا ہے مگر پھر ٹھٹک جاتا ہے)

کیا کانٹے میرا راستہ روک رہے ہیں؟ گڈریا کا دامن تھام رہے ہیں۔ مجھے ٹھہرا رہے ہیں اور اس ارادہ سے باز رکھنا چاہتے ہیں؟

(اپنا دامن کانٹوں سے چھڑاتا ہے)

کیا میں اپنی آنکھیں پھر پھیر لوں اور ایک بار اور تجھ سے کلام لوں، نفس پر قابو پانے کی کوشش پھر کروں؟ نہیں نہیں، میں نے بہت کڑی جھیلی ہے۔ سختیوں سے ایک مدت سے آشنا ہوں۔ مجھ پر اگر عذاب نازل ہو گا تو ہونے دو۔ میں اُس سے بچنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اس سے محروم نہیں رہ سکتا۔

(آہستہ آہستہ وہ مسرت کے قریب پہونچتا ہے۔ جھک کر اُسے پیار کرتا ہے۔ جب سیدھا کھڑا ہوتا ہے تو قدم ڈگمگاتے ہیں۔ لڑکھڑا کر عبادت گاہ کے قریب جا گرتا ہے اور گر کر مر جاتا ہے)

مسترت۔ (بیدار ہوکر) ہا! (وہ اُچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پیر مرد کو مُردہ دیکھتی ہے) تم کیا کر رہے ہو؟ جاگو! جاگو! (اُس پر جھکتی ہے)

تم خاموش پڑے ہو اور مُسکرا رہے ہو! اُسے حاصل کرنے میں جو مَیں نے خود نہیں پیش کیا تھا تم نے اپنی جان دیدی! تم نے میرے لبوں سے موت کا گھونٹ پیا۔ افسوس! میرے سُہانے خواب کتنے جلدی ختم ہو گئے۔ اب پھر مُنہ چھُپاتی، بچتی بچاتی، تھکی ہاری ماری ماری پھروں گی۔ تم آرام سے ہو گئے، قیدِ وجود سے آزاد ہو گئے۔ مُنّور شُعاعیں تم پر چھا رہوں اور تم اچھے اچھے خواب دیکھو۔ خُدا حافظ! خُدا نگہبان!۔

(دُور سے تعاقب کرنے والے گروہ کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔)

"آگے بڑھو، آگے بڑھو، ان کی چیخ پکار کی پروا مت کرو۔

مسترت کے تعاقب میں مُردہ اور مرنے والوں کو کچل ڈالو"

(مسترت خوفزدہ ہو کر بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے مگر پھر پلٹ کر وہاں آتی ہے جہاں مُردہ پیر مرد پڑا ہے۔ قریب کے پودوں کے پھول جلدی جلدی توڑ کر پیر مرد کی نعش پر ڈال دیتی ہے۔ پھر الوداعی اشارہ کر کے جنگل میں غائب ہو جاتی ہے۔

جنگل کا سحر آفریدہ حُسن یکلخت زائل ہو جاتا ہے۔ پھولوں میں صرف وہ پھول باقی رہ جاتے ہیں جو مسترت نے پیر مرد کی نعش پر ڈالے تھے۔ دن آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوتا ہے)

ہوا کی آوازیں۔ دُنیا کی رات تمام ہوئی۔ تیری پاک رُوح جنّت کی طرف پرواز کرے گی اور مسترت کا لازوال خزانہ اُسے میسّر آئے گا۔

"شاھد"

گلستانِ آرزو

ہے دردِ دل بہارِ گلستانِ آرزو
رُوحِ نشاطِ زندگی و جانِ آرزو

آخر یہ تنگیٔ دلِ ناکام تا کجا
اے جوشِ توڑ دے درِ زندانِ آرزو

گُستاخیٔ سوال ـــــ باندازۂ کرم
قسمت ـــــ بقدرِ وسعتِ دامانِ آرزو

اللہ! دردِ عشق و دلِ ناتواں کی خیر!
بڑھتا ہے اور ضبط سے طُوفانِ آرزو

اے محوِ نازِ دُشمنِ دلِ صبر آزما
کب چھوٹتا ہے ہاتھ سے دامانِ آرزو

میری طرح کہاں ہے کوئی اور غم نصیب
لذّت شناسِ کاوشِ پیکانِ آرزو

تکمیلِ ذوقِ عشق کا سودا ہے اور مَیں
دستِ جُنوں ہے اور گریبانِ آرزو

کیا رہ گیا ہے کس لئے اب آ گئی بہار
برباد ہو گیا چمنستانِ ... آرزو

پھر گُل سے ہو گی نکہتِ آوارہ ہمکنار
ہاتھ آ گیا اگر کبھی دامانِ آرزو

یہ آپ اپنی نیم نگاہی سے پوچھئے
دل ـــ اور شرحِ کاوشِ پیکانِ آرزو

کو کب چھُپاتے سے نہ چھُپا کوئی رازِ دل
گویا نگاہِ یاس ہے دیوانِ آرزو

[illegible]

ہولی

۱

پانی بھرن کو جاؤں کیسے چھیڑ کرے گردھاری
کیسر[1] رنگ بھرے گاگر میں ٹھاڑھ[2] لئے پچکاری
پانی بھرن کو جاؤں کیسے

۲

لئے عبیر گلال کی جھولی آیا کنج بہاری
جھانک جھانک گھونگھٹ مُسکراوے دیکھیں سب گلہاری
پانی بھرن کو جاؤں کیسے

۳

بازو پکڑ کے گیرو لگاوے بورے رنگ میں ساری
ٹھٹھا مار ہنسے نند للوا[1] دیوے موکو گارئی[5]
پانی بھرن کو جاؤں کیسے

۴

مورسکھی توہی جادوا رے رنگ نہ کوئی ماری
تورے منہ کوئی نہ لاگے تو سر بور کھلاری[6]
پانی بھرن کو جاؤں کیسے

سید مقبول حسین احمد پوری

---

[1] یہ سب نام ہیں جو رنگ پھاگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ [2] "نند للوا" نند لال کا اسم تحقیر ہے۔ [3] زعفران۔ [3] کھڑا۔ ایستادہ۔ [4] راہ چلنے والے۔ [5] گالی۔ دشنام جو ہولی کے وقت معاف ہیں۔ [6] یعنی سب سے زیادہ کھیلنے والی ؎

خمستان

عقیدت بنی ہے سب سے میری دردمندی
اے کاش دیکھ لیتے تم میری سربلندی
اے دوست دو جہاں تو آزاد ہو گیا ہوں
تیرے حضور میں ہے میری نیازمندی

جانے یہ کیا تمہاری جب سے آئی ہیں پیار ہو گیا
صبر و قرار دونوں یہیں دل و جاں سے کھو گیا
کیا کہیے سرگزشت دل ناصبوری
اثر تیرا پوچھے کہ ناچاری ہے

سینے میں آتش شوق آنکھوں کو اشکباری
فردوس زندگی سے عزیز مجھکو یہ بے قراری
کون و مکاں سے سارا جلوے کا اشارا ہے
سب دل سے آنکھ میں ہے تصویر یہ تمہاری

اہل وفا میں چرچے میرے پیار ہو رہے ہیں
اب راز عشق میرا افسانہ ہو گیا ہے
سمجھا کیے نہ ناداں اہل خرد کو لیکن
شہر میں اب اثر بھی دیوانہ ہو گیا ہے

اثر صہبائی

دل کی آگ

برشگال سے جذبات میں ایک تلاطم سا بپا رکھا تھا۔

اور حسین رنگین پاؤں سبزۂ خوابیدہ پر بکھرے ہوئے موتیوں کو نہایت بیدردانہ طریقے سے پامال کر رہے تھے!

سیاہ گھنگھور گھٹائیں ہر چہار طرف سے اُٹھ اُٹھ کر چھا رہی تھیں اور ——

کہیں دُور جامن کے پیڑ پر پپیہا "پی کہاں" کا دردناک گیت الاپ رہا تھا۔

پپیہے کی "پی" سبز اور دھانی درختوں کو چیرتی ہوئی سارے جنگل میں گونجتی اور کہیں پرے دامنِ کوہ سے ٹکرا کر پھر وہیں واپس آجاتی!

آم اور جامن کے موٹے موٹے تنوں پر جھولے پڑے ہوئے تھے اور گلابی اودی کاسنی، دھانی اور بسنتی ساڑھیوں میں ملبوس لڑکیاں بالیاں جھولنے اور گانے میں مشغول تھیں!

خوشیاں جھوم جھوم کر ان کا طواف کر رہی تھیں اور ——

بیچاری کوئل ان کے حسین قہقہے سُن رہی تھی!

—— کہیں اور محب و محبوب سرگوشی میں مصروف تھے اور محبت رہ رہ کر ان پر قربان ہو رہی تھی ——

سیاہ کوئل جامن کی سب سے بلند پھننگ پر بیٹھی دیکھتی رہی یہاں تک کہ یکبارگی اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور وہ بے چین ہو کر کوکنے لگی ——

کوئل کی کوک فضا کو چیرتی ہوئی انسانی دلوں تک پہونچی مگر ناکام واپس لوٹی ……

البتہ معصوم پتے لرزنے لگے!

——— (۲) ———

—— "مسرت میں غمزدہ یاد نہیں رہتے"

دُنیا اپنی خوشیوں میں منہمک تھی اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ایک حرماں نصیب کو بھول کر یاد ہی کر لے ——

دامنِ کوہ کے قریب چمکدار دریا آہستہ آہستہ بہ رہا تھا اور ——

اُودے اُودے بادل چاروں طرف رقصاں تھے!

برشگال جبکہ نوجوان دلوں میں ایک طوفان سا برپا کر رہا تھا ——

سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر سر رکھے ایک حسین دوشیزہ بے طرح مغموم پڑی ہوئی تھی —— کسی خیال میں غرق!۔

پانی سا قہ اسے سیمیں سے کھیل رہا تھا اور زلفِ سیاہ سنبلِ پیچاں کی طرح پیچ بناتی ہوئی ہوا سے راز و نیاز میں مصروف تھی۔

تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور طوفان چاروں طرف سے گھر گھر کر آ رہا تھا!

دوشیزہ جس کے رُخسارِ زمردیں آنکھوں سے نکلے ہوئے بیارِ محبت آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے، کچھ سوچکر اُٹھی؛ دریا تک پہونچی، مُنہ دھویا اور وہیں کسی کے خیال، کسی کی یاد اور کسی کے تصوّر میں محو ہوگئی ——

مجھے تو ایسا معلوم ہوا گویا آفتاب بادل کے چمکیلے آنسوؤں سے نہا کر اُٹھا ہے!

یکبارگی دھانی ٹہنیوں پر کوئل بھی کوکی ——

اور معصوم دوشیزہ جو پہلے ہی نیم مُردہ تھی بے تاب ہوگئی!

پربت کا دامن دفعتًہ "پی کہاں" کے دردناک نغمے سے تھرا اُٹھا اور دوشیزہ اپنے وجود سے بیخبر تڑپنے لگی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرغِ بہارستان اس کی ہم نوائی کر رہا ہے اور وہ اس پر فدا و نثار!

نرگس اُسے تک رہی تھی اور افسردہ —— شبنم، اس کی آنکھ کے آنسو کا آخری قطرہ، ہوا کے جھونکے سے نیچے بہ گیا!

…… اور لالہ جس کا دل پہلے ہی داغدار تھا، کیوپڈ کی بیرحمی پر ماتم کرنے لگا!

گمن دار وادی میں ققنس کی مادہ، دوشیزہ کے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنا دم توڑ رہی تھی ——

اور سامنے ہی بادامی پانی میں ہنس کا جوڑا اپنی مسرتوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا ——

اُن کی کُل کائنات "محبت" کی دُنیا تھی! ——

اس وقت اس پر ایک عجب کیفیت طاری ہوگئی ——

معًا اس کے حسرتناک دل میں یہ خیال پیدا ہوا "اے میرے محبوب! ایفاءِ وعدہ کیا اسی کا نام ہے؟"

عالمِ بالا میں ایک ہیجان سا مچ گیا اور پیشتر اس کے کہ اس کی یہ التجا ختم ہوتی "محبت" ہنسی اور مُسکراہٹ برق کی شُعلہ فگن تیزی میں نمودار ہو کر نیچے گری اور محبت کی دُنیا میں آگ لگا گئی۔

طوفان تیز ہوگیا، بادل پہاڑ کے سینہ سے ٹکرا ٹکرا کر برس رہے تھے اور بجلی "محبت" کے لبوں پر چمک چمک کر کھیل رہی تھی۔

گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا اور رعد و کڑک کے خوف سے وہ پرند بھی جو کسی کی یاد کے دعویدار تھے، کہیں کونے کُھدروں میں دبک گئے اور ان کی نغمہ سنجی انہی گوشوں میں معدوم ہوگئی ——

سب ہی کچھ ہوا مگر ——

دوشیزہ کا دل ——!؟

"محبت کی نذر" ہو چکا تھا!

صادق الخیری (دہلوی)

شباب و شعر کے مبحث میں گفتگوئے استقامتِ مذہب

(گذشتہ سے پیوستہ)

سلطان شہید ٹیپو اسی ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی اگر چاہتا تو اپنے بعض حلیفوں کی طرح اپنے مخالفوں سے صلح کر کے اپنی ریاست و سلطنت کو بچا سکتا تھا۔ مگر نہیں۔ جب ٹیپو کو شکست ہو گئی۔ تو انگریزوں نے ٹیپو کو عورتوں کے جھرمٹ اور خواجہ سراؤں کے نرغے اور نامردوں کے حلقہ میں نہیں پایا۔ بلکہ دیکھا تو اس حال میں کہ اس کا چہرہ خون سے گلگوں تھا اور سینہ زخموں سے رشکِ گلشن۔ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور زرہ اس کے جسم پر۔ رُوح گو اس کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ مگر اس مُردہ شیر کی لاش کے پاس جاتے ہوئے بھی برطانوی شیروں کے دل سینوں میں دہلتے اور پتے پانی ہوتے تھے۔

ابراہیم لودی کے لئے ممکن تھا کہ وہ بابر کے مقابلہ میں بھاگ جاتا یا بابر کا اسی طرح استقبال کرتا جس طرح فاتح بابر کے مفتوح پوتے محمد شاہ رنگیلے نے بہادر گرد سے بادشاہ نادر کا چند صدی بعد استقبال کیا تھا لیکن بابر کو ابراہیم فراریوں یا استقبالیوں کے مجمع کی بجائے لڑ کے مرنے والوں کے ڈھیر میں ملا۔

مروان الحمار (بنو امیہ کا آخری تاجدار) کی شکست کے بعد جب بقیۃ السیف اموی شہزادے تتر بتر ہو گئے۔ (اس سے زیادہ بُری طرح جس طرح ابوظفر بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے بعد تیموری شاہزادے اور شاہزادیاں ہندوستان میں مارے مارے پھرنے لگے تھے) تو انہی شاہزادوں میں عبدالرحمٰن نام کا ایک نوجوان بھی تھا۔ وہ چھُپ کر بھاگا۔ اور مدتوں عباسیوں کی تلوار کے ڈر سے جان بچاتا ہوا اِدھر اُدھر چھُپتا پھرتا رہا۔ آخر ہسپانیہ میں جانکلا۔ اور بعد میں یہی عبدالرحمٰنؒ الداخل کے لقب سے ملقب ہو کر تاریخ عالم میں مشہور ہوا۔ اس کی زندگی کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ یقیناً اس نے عباسیوں کی خونخوار نگاہوں سے اپنے جسم کو چھپایا اور جان کو بچایا۔ مگر اپنی شہزادگی یا وارثِ سلطنت ہونے سے دست برداری کا اعلان نہیں کیا۔ اُس نے اپنے تمام دورِ ابتلاء و محن میں کبھی ایک پل بھی عباسیوں کی شاہی کو تسلیم نہیں کیا۔ جب خود بادشاہ ہوا تو پھر کیوں عباسیوں کی سیادت کو مانتا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر وہ خود اور اس کے بعد اس کے جانشین جب تک ان میں اپنے بزرگوں کا جوہر رہا عباسیوں کے مقابلہ میں اپنے بازو کی قوت کے بل پر امیر المومنین کہلاتے رہے۔

عبدالرحمٰن الداخل (ہسپانیہ کے پہلے مستقل مسلمان بادشاہ) کے شام سے فرار کو جس کا اوپر ذکر ہوا ہسپانیہ کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ کے فرار یا جلاوطنی کو کوئی نسبت نہیں۔

عبدالرحمٰن جب جان بچانے کے لئے گلشنوں کے بل، جنگلوں، بیابانوں، آبادیوں اور ویرانوں کے کونوں کھدروں میں چھُپتا پھرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نام نہ تھا۔ اور اس کے عزم میں تزلزل کا نشان نہ تھا۔ مگر ہسپانیہ کا آخری بدقسمت بادشاہ جلاوطنی یا فرار کے وقت گھوڑے پر سوار تھا اور اپنی بے بسی کھویا نامرادی پر رو رہا تھا۔ دیکھو! عبدالرحمٰن پیٹ کے بل رینگتا ہوا، جبکہ اس کا جسم مصائب و آلام سے زار و نزار ہے، نہیں روتا۔ اور یہ گھوڑے پر سوار ہے اور جسم اس کا صحیح و سالم ہے،

اپنے آپ کو بے بس سمجھتا اور روتا ہے۔ تاریخ کو حق تھا کہ ابو عبداللہ کو بھلا دیتی اور اُس کی ماں کو دُنیا کی نامور عورتوں میں جگہ دیتی جس نے بھگوڑے بیٹے کو روتا دیکھ کر شرم دلاتے ہوئے کہا تھا اب کیوں روتا ہے میدان میں مر کیوں نہ گیا۔

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم والیٔ کابل بھی جان بچانے کے لئے چھپتا پھرتا تھا۔ مگر میں نے کسی دوست یا دشمن کی لکھی ہوئی کتاب میں نہیں پڑھا کہ مرحوم امیر عبدالرحمٰن نے فرار ہونے سے پہلے جان کی حفاظت کے لئے اپنے کسی مخالف یا خویش کے حق میں حکومت سے دست برداری کا اعلان کیا ہو۔ مگر دیکھا اسی امیر عبدالرحمٰن کا پوتا امان اللہ خاں بھی فرار ہوتا ہے۔ ہم امیر امان اللہ خاں کے فرار کو بھی اس کے دادا کی طرح کا فرار ہی سمجھ لیتے اگر وہ جان بچانے کے لئے اپنے اس بھائی کے حق میں تاج و تخت سے دست برداری کا اعلان نہ کر دیتا جس کو اپنے شہید باپ کی وصیت کے خلاف ولی عہدی سے معزول کر کے ۱۹۲۹ء میں اس نے اپنی امارتِ افغانستان کا دعویٰ کیا۔ اور افغانی تاج اپنے سر پر اور اپنا قدم افغانی تخت پر رکھا تھا۔

ہاں ترکی کی اہلِ قلم و سیف خاتون خالدہ مردوں کا لباس پہنکر قسطنطنیہ سے فرار ہوئی تھی کہ انگورا پہنچے۔ اور سلطان عبدالوحید عورت کا لباس پہن کر قسطنطنیہ سے فرار ہوا تھا کہ ایک یورپین طاقت کے جہاز میں پناہ لے۔ لیکن کیا ان دونوں کا فرار ایک ہی قسم کا قرار دیا جائیگا۔

آج کل کے ہندوستانی نوابوں، مرہٹوں یا یورپ کی بعض سلطنتوں کے آئینی تاجداروں سے قطع نظر، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس لئے تاج و تخت کا مالک ہوتا ہے کہ مرنے والے کی اولاد یا ہم نسبتی کا قدرتی شرف اس کو حاصل ہوتا ہے۔ اس طریقِ جانشینی میں قابلیت کا دخل نہیں۔ اہلیت کی پرسش نہیں جس کو جو ملتا ہے سلسلہ وراثہ میں ملتا ہے۔ رہا یورپ وہاں پر جن ملکوں میں آئینی بادشاہ ہیں، اُن کی حیثیت بقول مولانا محمد علی مرحوم کے "قانونی مغالطہ" سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

ہاں مشرق میں جب سیاست ایسی شترگربہ نہیں ہوئی تھی جیسی اب ہے، اگرچہ سلطنتیں شخصی ہوا کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی واقعہ یہ تھا کہ کسی نااہل و ناقابل کا تخت پر لمبی مدت تک قائم رہنا اور کسی لائق کا محروم ہو جانا یا رہنا امرِ محال کی حیثیت رکھتا تھا۔ (اگر وقت نظر سے دیکھا جائے تو مغلیہ خاندان میں ایک بھائی کا دوسرے بھائی سے برسرپیکار ہونا اور قابل کا غالب آنا اسی نظریہ کا مؤید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کی تاریخ آئے دن کی خانہ جنگیوں کا مرقع نظر آتی ہے۔)

پھر مشرق میں اب بھی جہاں مغربی برکات کا نزول کم ہوا ہے، قابل لوگوں کے لئے میدان ہمیشہ خالی ہے۔ نالائق اور نامرد "پیدائشی" شاہوں کے تاج قابل اور مرد غلاموں کے سر کی بلائیں لیتے ہیں۔ اور بزدل اور آرام طلب سلطانوں کے تخت اُن کے شجاع مدبر کارکن حلقہ بگوشوں کی قدمبوسی کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں۔

بہرحال مذہب ہو یا سیاست ہر جگہ انہی کا بول بالا رہتا ہے۔ جن کی کھوپڑی میں مغز ہوتا ہے گوبر نہیں۔ اور جن کا دل گوشت کا نرم لوتھڑا نہیں فولاد کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ جن کا ارادہ پہاڑوں سے زیادہ پائیدار اور سنگین تر ہوتا ہے۔ گو سیاست کیلئے جو باتیں جائز سمجھی جاتی ہیں وہ مذہب میں عالمگیر طور پر ناجائز ٹھہرائی گئی ہیں۔ مگر ہم نے جن بعض تاریخی واقعات و حوادث کی طرف اوپر کے صفحات میں اشارہ کیا ہے۔ ان سے ظاہر ہے کہ سیاست میں بھی ہر فرد ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ اپنے اُصول و عقائد پر

تاہم [illegible] ہوکر بھاگ جانے اور جان بچانے کے لئے ضمیر کے خلاف اعلان کر دینے میں بڑا فرق ہے۔ جس طرح مذہب میں [illegible] کے لئے استقامت ان کی دعوت کی اصلی رُوح ہے۔ یہی بات سیاست میں بھی ہے۔ یہاں بھی اپنے مقصد میں استقامت دکھانے سے اہلِ سیاست کا جوہر کھلتا ہے اور وہ اپنی اسی استقامت کی بدولت تاریخ میں زندۂ ہستی ہو جاتے ہیں۔

اہلِ مذہب کی اقسام

سیاست سے قطع نظر، یاد رکھنا چاہئیے کہ مذہب نہیں اہلِ مذہب کی چند قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً:-

اوّل۔ اہلِ مذہب وہ لوگ ہیں جو اس لئے کسی مذہبی جماعت میں شمار ہوتے ہیں کہ وہ اسی جماعت میں پیدا ہوئے ہیں۔ دُنیا میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ وہ کسی مذہب کو سچا اس لئے نہیں مانتے کہ اُنہوں نے خود اس مذہب کو جانچا ہے بلکہ اس لئے کہ ان کو وہی مذہب اپنے والدین سے اسی طرح ورثہ میں ملا ہے جس طرح اپنا جسم، اور والدین کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ۔ یہ غریب خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ہماری بحث و گفتگو سے خارج ہیں۔ یہ کسی سے بحث نہیں کرتے کسی سے اُلجھتے نہیں۔ یہ اپنے مذہب کی حفاظت اپنی آنکھ کی طرح کرتے ہیں، اسی لئے بحث و مباحثہ کے کانٹوں کے پاس نہیں پھٹکتے۔ بس ان کی حالت بقول حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم یہ ہوتی ہے ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

دوم:- اہلِ مذہب کا وہ طبقہ ہے، جو دین میں عقل کو دخل تو دیتے ہیں، مگر ان کی عقل وہ عقل ہوتی ہے جو اُن کے مفرقہ یا جماعت کی عقل، کہلائی جا سکتی ہے۔ یہ جماعتیں مشرق و مغرب سے خاص نہیں ہر ملک و ہر دیار میں ہوتی ہیں۔ اگر وہ مشرق میں ہوں تو ان میں مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور اگر مغرب میں ہوں تو اُن میں مغربی و مشرقی علوم کے فاضل بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی بحثوں میں عموماً عقل کا نام لیا کرتے ہیں۔ مگر ان کی تمام عقلی دلیلیں اپنے اپنے مذاہب کی نقلی روایات کے سچا ثابت کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ وہ یورپ کی آج کی عقلیات سے مشرق کی دو ہزار سال پہلے کی افسانوی گپتوں کو ثابت کرنے کی فکر میں سرگرم گفتار رہا کرتے ہیں۔ اُن کی زبان پر مغربی عقل جاری اور دل میں مشرقی اوہام طاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہ گروہ سب جماعتوں اور ملتوں کے افراد "اہلِ عقل" پر مشتمل ہے اگرچہ ان کی زبان پر ہر وقت عقل عقل ہی کی رٹ ہوتی ہو۔ مگر ان کی عقل ہوتی ایسی ہو کہ جس کے دربار میں ان کے مذہب کے عقائد و خیالات کے سوا باقی سب جماعتوں کے عقائد و خیالات محض باطل اور نامعقولیتِ خالص ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔

تیسری قسم کے اہلِ مذہب وہ ہوتے ہیں جن کا دھندا مذہب کے بل پر چلتا ہے۔ اس گروہ میں عموماً میونسپلٹیوں کی ممبری کے امیدواروں سے لیکر کونسلوں کی عضویت اور جمہوریہ امریکہ کی صدارت اور ملکوں کی بادشاہت کے تمنائی تک سب شامل ہیں۔ اسی جماعت میں پیشہ ور واعظ، پیشہ ور پیر و مرشد اور عموماً ہر قسم کے ناکام یا چالاک تجارت پیشہ لوگ موجود ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ مذہب کا نام لیکر اپنی دوکان چمکاتے ہیں۔ خواہ اسٹیشنوں پر ہندو چائے بیچنے والے ہوں یا مسلمان گوشت

روٹی۔ اسی جماعت کا ایک رکن فرقہ وارانہ اخبار نویس بھی ہیں۔ ان میں سے اکثر کا مذہب مذہب بیزار یا مذہب " سے زیادہ روٹی کے سلسلے ہوتا ہے۔ ان میں مکار بھی ہیں اور مخلص بھی۔ کیاد بھی ہیں اور سادہ لوح بھی۔ متعصب بھی ہیں اور غیر متعصب بھی۔ اس قسم کے لوگوں کی حالت دیکھنے کیلئے اکبر کا یہ شعر پڑھو سہ

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

ان میں ایسے بھی ہیں جو اسٹیج پر ہندو یا مسلمان ہیں اور خلوت میں مسلمان سے ہندو اور ہندو سے مسلمان۔ یہی لوگ ہیں جن کے ہاں نیکی و بدی کا فیصلہ نیکی و بدی کی ذات و صفات کی بنا پر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ان کے ہاں اشخاص اور افراد کی نیکیاں اور بدیاں ان افراد و جماعتوں کے اسی انتساب کے مطابق متعین ہوتی ہیں۔ خصوصاً ہندوستان میں آئے دن جو بحث مباحثہ، جھگڑے قضیئے ہوتے رہتے ہیں وہ حقیقت کی تلاش سے زیادہ اپنی اپنی پچ قائم رکھنے، جماعت بڑھانے، سیاسی اقتدار کو ترقی دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری نمبر دوم اور سوم کی اہلِ مذہب جماعتیں ہیں۔ ان کی آنکھیں اپنے عیبوں کے دیکھنے میں اندھی اور بیان کرنے میں گونگی ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کے نقائص دیکھنے میں بجلی کی روشنی اور بیان کرنے میں شمشیر براں کی مثال بن جاتی ہیں۔

چہارم وہ اہلِ مذہب ہیں جن کی نظر اصولی طور پر تمام مذاہب عالم پر ہوتی ہے۔ ان کو نہ کسی سے اندھی محبت ہے نہ مجنونانہ نفرت۔ یہ لوگ بھی سب مذہبی جماعتوں اور گروہوں میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد اتنی تھوڑی ہوتی ہے کہ ان کا شمار انگلیوں پر نہیں تو تسبیح کے دانوں پر ضرور ہو سکتا ہے۔

یہی لوگ ہیں جو جانتے بہت کچھ ہیں۔ مگر کہتے بہت کم ہیں۔ اُن کی زندگی عملی ہوتی ہے، نہ کہ قولی۔ جتنا ان کا علم وسیع اور نظر عمیق ہوتی ہے اتنی ہی اُن کی آواز صاف و شیریں اور مؤثر ہونے کے باوجود اُٹھتی کم ہے۔ اُن کا وعظ عملی زندگی میں دیکھا جاتا ہے کانوں سے سُنا نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی ہستی کا احساس بھی کم ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ سہ

آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

مگر اسی جماعت میں گنتی کے افراد اور بھی ہوتے ہیں جن کا حساس دل اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی قدح کی خیر نہ منائیں وہ چاہتے ہیں کہ جو خود جانتے ہیں دوسروں کو بھی اپنے فائدے کے لئے نہیں دوسروں کے فائدے کے لئے سُنا دیں۔ یہ لوگ گو منسوب کسی نہ کسی جماعت ہی کی طرف ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ سب جماعتوں سے بلند ہوتے ہیں۔ ان کا خطاب کسی خاص نام نہاد گروہ کی نسبت تمام جماعتِ انسانی سے یا خاص صفات و عادات کے تمام انسانوں جو مختلف جماعتوں میں پائے جاتے ہوں ہوتا ہے۔ اور وہ ایسی بات کہتے ہیں جو موقع اور وقت کے لحاظ سے جامعہ انسانی کے لئے عموماً مفید ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔

کہنے والے کو کہنے کا اور مخالف کو مخالفت کا حق ہے

ظاہر ہے کہ لوگ انہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی آواز میں جدت و ندرت ہوتی ہے اور انہی سے استقامت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ:-

"Every man has the right to utter what he thinks the truth, and every other has the right to knock him down for it."

اس قول سے یہاں تک تو ہم بھی متفق ہیں کہ جو شخص صداقت و خلوص سے کوئی بات محسوس کرتا ہے اسے کہنا ہی چاہیئے۔ **یہ بھی ظاہر ہے** کہ چونکہ وہ مذاق عام کے خلاف لب کشا ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ اس کی مخالفت شدید بھی ضرور ہی کریں گے۔ لیکن اگر وہ اس مخالفت کو برداشت نہیں کرسکتا تو اسے حق نہیں کہ وہ اپنے لب کھولے۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ایک شخص کو کہنے کا حق ہے اسی طرح دوسرے کو اس کی مخالفت کا بھی حق ہے۔ اگر وہ صرف کہنا ہی چاہتا ہے اور مخالفت دیکھنا نہیں چاہتا یا شدید مخالفت کے مقابلہ میں استقامت نہیں دکھاتا یا دکھا سکتا۔ تو وہ کسی بھی امر کی نہ دعوت دینے کا حق رکھتا ہے۔ ورنہ وہ اس مقام کا اہل ہے جہاں کا دعویدار خود کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

تاریخ میں ڈھونڈیئے ہر زمانہ اور عصر کے مدعیان اصلاح میں دونوں قسم کے لوگوں کی بکثرت مثالیں ملیں گی۔ ایک وہ جنہوں نے جان دی مگر آن نہ چھوڑی۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے اعلان تو بڑے ٹھاٹھ سے کیا۔ مگر جونہی مخالفت کے بادل اُمنڈتے دیکھے، توبہ کرلی۔ یا لگے تاویلات کے جنگل میں آنکھ مچولی کھیلنے۔ تاریخ نگار کراماً کاتبین کی طرح بلا کے تیز نظر ہوتے ہیں۔ انہوں نے دونوں کے ناموں اور کاموں کو جہاں تک امکان تھا زندہ رکھا۔ ہاں ان میں سے ایک جماعت کو بہادر اور شجاع اور اہل حق کہکر یاد کیا اور دوسروں کو بزدل اور ڈرپوک اور جھوٹے اور مکار کہکر پکارا ؎

قسمت کیا ہر شخص کو قسامِ ازل نے ۔۔۔ جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

وہ جنہوں نے مذہب کو سمجھا ہے

مذہبی خیال کے جو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے دماغ سے سوچتے ہیں، وہ جرح اور تعدیل کے وقت اپنی جماعتوں سے بھی وہی سلوک کرتے ہیں۔ جو سلوک اُن کی زبان و قلم سے غیروں کے لئے جائز سمجھا جاتا ہے۔ ان کی میزانِ عدل میں برابر کے دو پلڑے اور لینے دینے کے ایک ہی قسم کے باٹ اور پیمانے ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاں گناہ و صواب کی پرکھ کے وقت اپنے اور بیگانے کا امتیاز جرم ہوتا ہے۔ وہ اپنوں کی جھوٹی اور مہمل اور لغویات کا اظہار بھی اسی جرأت و جسارت سے کرتے ہیں جس جرأت سے "غیروں" کی جھوٹی مہمل اور لغویات کا خاکہ اُڑاتے ہیں۔ اُن کی دونوں آنکھوں میں برابر کی روشنی اور نور ہوتا ہے۔ وہ یمین و یسار کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ اپنے کالوں کو کالا اور دوسروں گوروں کو گورا ہی دیکھتی ہے۔

اگر وہ خاموش ہیں تو اُن کی خاموشی ایک حکیم کی خاموشی ہے۔ اگر وہ بولتے ہیں تو اس وقت جب اُن کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب مزید خاموشی خودکشی کی مرادف ہے۔ اُن کے آغازِ کلام کے لئے منبر کی بجائے پھانسی کا تختہ زیادہ مناسب

اور موزوں ہوتا ہے ؎

آں رازکہ درسینہ نہاں است نہ وعظ است　　　　بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

ان کی گفتار اس شفیق استاد کی گفتار حکمت آثار کا نمونہ ہوتی ہے جو شاگردوں کے دل و دماغ کو نورِ عرفان سے منور کرنے اور حقائق و علوم کے خزانوں سے اُن کے سینوں کو معمور کر دینے کا متمنی ہوتا ہے یا اس حکیم حنان باپ کے حکمات محبت و دلسوزی کے مطابق جو چاہتا ہے کہ اس کا نادان بیٹا ہلاکت کے غار میں نہ جا پڑے جس کے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔

یہ لوگ کسی کے دشمن نہیں ہوتے۔ لیکن جب نادانوں کی فوج ان پر ہجوم اور یورش کرتی ہے۔ تو وہ اپنے مقام پر اسی طرح قائم و ثابت رہتے ہیں جس طرح زمین و آسمان اپنے مستقر پر قائم اور ثابت ہیں ؎

بحرمتِ دو جہاں سر فرو نمی آرند　　　　دماغ کبر گدایانِ خوشہ چیناں بیں

جیسا کہ عرض ہوا شک نہیں کہ اکثر خود خواہ بھی لباس تجدد پہن کر آگے آتے ہیں۔ پھر خود خواہ ہی نہیں، ایسے لوگ بھی جن کو اپنی ذات سے غیر معمولی حسنِ ظن اس میدانِ امتحان میں لے آتا ہے۔ لیکن مخالفت کی ایک دھمکی سُن کر ہی وہ اس میدان سے باہر نکل جاتے ہیں اور ان کا نشۂ اصلاح و تجدد ہرن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ منصب بزرگ مردوں کا طلب گار ہے۔ جو دار پر چڑھنے کو معراج سمجھتے ہیں۔ اور سر کٹوا کر محبوب کے قدموں پر رکھ دینے کو سجدۂ خوبی یقین کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جو مصلحیت اور مجددیت کے دعویدار ایسے ہیں کہ جب تک دُنیا ان کی آواز کو گوشِ موافقت سے سُنتی رہتی ہے تو وہ مصلح اور مجدد رہیں اور جب مخالفت کی آندھی اُٹھتی ہے تو فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ یہ منصب ان کا منصب نہیں، یہ لباس اُن کے بدقوارہ جسموں پر سجتا نہیں۔ یہ غازۂ اصلاح اُن کے بدنُما چہروں کو اور بے رُوپ کر دیتا ہے۔ گو ان کی ہاؤ ہو سے اہلِ حق کا امر کچھ مشتبہ سا ہو جاتا ہے۔ محمدؐ و عیسیٰؑ، ابراہیمؑ و نوحؑ کے ساتھ ان کے نام بھی لئے جاتے ہیں ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی　　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مگر کب تک آخر زمانہ خود بتا دیتا ہے کہ پیتل کونسا ہے اور سونا کونسا۔ بلبل کونسی ہے اور بدّی کونسی۔ کوئل کہاں کوک رہی ہے اور کوا کہاں کائیں کائیں کر رہا ہے۔ بلبل کدھر ہے اور زاغ و زغن کی صدائے بے ہنگام کدھر۔

یہ وادی ابتلا اور محنت، ہلاکت اور تباہی سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں منصوروں کی ضرورت ہوتی ہے جو سولی پر چڑھ کر بھی "اناالحق" کا نعرہ بلند کرتے ہی رہیں۔ یہاں ان فرعونوں کی پرسش نہیں جو بستر راحت میں مستریح ہو کر تو انا ربکم الاعلیٰ کے ادعا کا دم خم رکھتے ہوں۔ مگر جب موت کے اژدہے کو منہ کھولے ہوئے اپنے سامنے پائیں تو فوراً خوفِ مرگ سے گھگیا کر موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لے آئیں۔ اور باوجود اس منت و زاری کے ٹھکرائے جائیں۔

یہ جھوٹ ہے کہ انسانی خیالات و اعتقادات میں کبھی تغیر نہیں آتا یا نہیں آنا چاہئے۔ بلکہ جو لوگ بے لاگ غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں ان کے خیالات و اعتقادات میں ہمیشہ ایک خاموش اضطراب اور کبھی کبھی پُر موج طوفان اُٹھتا رہتا ہے۔ اور ہر وہ شخص جس کے خیالات و عقائد میں تغیر آتا ہے اس کے لئے جیسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لالچ نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خوف کا شکار ہو گیا۔ ہاں ہر وہ فاقہ مست جو کسی کے دسترخوان پر روٹی کھاتے ہی پکار اُٹھے

"واللہ انک لرسول اللہ" اپنے قول میں جھوٹا بھی۔ اسی طرح ہر وہ آدمی جو مخالفت کے تیز تیز سے کی انی کو اپنے سینہ پر اور تیغ خونفشاں شمشیر کی دھار کو اپنی گردن پر محسوس کرتے ہی چلا اٹھے "الآن قد حصحص الحق" اپنے ادعائے ایمان میں سچا نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ تو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے کہ غور و فکر کے دوران میں ابراہیم خلیل اللہ کی طرح کبھی ستارے کو خدا، کبھی چاند اور سورج کو خدا مان لیا جائے۔ اور یکے بعد دیگرے اپنے اجتہاد کی غلطی کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ کیونکہ کتنے ہی انسان ہیں جو حاصل پر قانع نہیں۔ اہل سے پریشان ہیں حق کی جستجو ان کو دربدر پھراتی ہے کبھی وہ زید کے آستانہ پر جھکتے ہیں اور کبھی بکر کے سنگ دہلیز پر سر رکھتے ہیں۔ وہ ہر آواز پر لبیک کہتے ہیں اور ہر تیز رو کو "راہبر" حقیقی سمجھ کر اس کا اتباع کرتے ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ان میں ایسے بھی ہیں جن کی سعی نامشکور ہوتی ہے اور پکار اٹھتے ہیں ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ منزل ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہی رہتی ہے۔ لیکن آواز جرس کے پیچھے پیچھے قدم بڑھاتے رہتے ہیں ؎

کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجا است — ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

وہ حیران ہیں اور خاموش۔ لیکن ان کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں ہٹتا۔ تلاش و جستجو کی ان تمام گھاٹیوں اور منزلوں میں وہ ایک وادی سے دوسری وادی اور ایک گھاٹی سے دوسری گھاٹی پر اور ایک منزل سے دوسری منزل میں منتقل ہوتے نظر بھی آسکتے ہیں۔ اور نہیں بھی۔ اور ان کا یہ طے منازل خوشی اور شوق جستجوئے یار میں ہوتا ہے نہ کہ خوف تلوار سے۔ ان میں ایسے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جو ساری سیر روحانی کے بعد اپنے سفر کے ابتدائی نقطہ پر آکر دم لیتے ہیں اور آخر مذہبی بحث و مباحثوں سے الگ ہو کر خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ وہ دوسروں کا مذہب بدلنے کی مساعی کی بجائے اپنے نفس کی اصلاح کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کو دعوت دینے کی بجائے۔ اپنے نفس کو دعوت الی الخیر دیتے ہیں۔ وہ عموماً ہر قسم کے مذہبی مجادلات و مباحثات کو نادان بچوں یا سعدی کے زمانہ کے مغرور دو قاضیوں یا دو جنگی ہاتھیوں کی جنگ کا مرادف خیال کرتے ہیں جنکے کھانے کے دانت اور اور دکھانے اور لڑنے کے دانت اور ہوتے ہیں۔ وہ نادانوں کی نادانی پر مسکراتے اور مکاروں کی چرب زبانی پر حیران ہوتے ہیں۔ وہ ان ہنگاموں پر مہر بلب رہتے ہیں اور بولتے اس وقت ہیں جب دیکھتے ہیں کہ خطرہ بڑھ چلا تو موقع کے مناسب کوئی کلمۂ خیر کہہ بھی دیتے ہیں۔ ان کی یہ قلب ماہیت خود بخود ہوتی ہے۔ جس میں کسی خوف اور لالچ کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات ہمارے لئے قابلِ فہم نہیں۔ کہ مخالفت کی برہنہ تلوار دیکھ کر فوراً سجدہ کر دیا جائے۔ اور پھر اس کی دل کو تسلی دینے والی تاویل بھی ہو سکے۔

حضرت نیاز کی توبہ کی حقیقت اُن کے الفاظ میں

یہاں تک تو گفتگو اس باب میں تھی کہ استقامت کا دیانت میں کیا درجہ ہے۔ اب کہنا یہ ہے کہ جب تاویل و تعبیر کا باب

کھلا ہوا ہے تو پھر دنیا کا کونسا مسئلہ اور کونسا واقعہ ہے جس کی اس فن کی وساطت سے قلب ماہیت نہیں ہوئی یا نہیں ہو سکتی کیا مذاہب کا موجودہ اختلاف اسی فن شریف کا رہین منت نہیں۔ کیا اسی طریق سے ایک گروہ کا شیطان دوسرے گروہ کا امام اور ایک جماعت کا امام دوسری جماعت کا شیطان نہیں بنا کر دکھایا گیا۔

نگاہوں کے اختلاف نے افریقہ کی کتنی چڑیلوں کو قاف کی پریاں اور قاف کی پریوں کو وحشی افریقہ کی چڑیلیں بنا ڈالا۔ مزاجوں، مفادوں اور مذاقوں کے اختلاف نے کتنے اشخاص اور واقعات کی ہیئت کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ آئے دن ایک ہی واقعہ سے اچھے اور بُرے نتائج مختلف زاویہ ہائے نگاہ اور مقاصد متنوعہ کے ماتحت برآمد کر لئے گئے۔ کیا حقیقت یہ نہیں کہ واقعہ تو ایک ہوتا ہے مگر تاویل وتعبیر کے بل بوتے پر کچھ سے کچھ بن جاتا یا بنا دیا جاتا ہے۔

کس کو نہیں معلوم کہ قریب ہی کے زمانہ کے بعض مشہور مذہبی پیشواؤں نے اپنے اپنے ملکوں کے حاکموں کے سامنے کس کس طرح توبہ کی اور پھر وقت گذرنے کے ساتھ ہی اس توبہ کو توڑ ڈالا۔ اور اس توبہ اور شکست توبہ کو خود ان بزرگوں اور ان کے اتباع نے اوّل کیسے کیسے چھپانے کی کوشش کی اور پھر اپنی توجہ کی کس کس رنگ میں تاویلیں کی گئیں۔ لوگوں نے یہ سب شعبدے دیکھے اور حیران ہوئے لیکن ان کی طرف سے تاویل وتعبیر کا سلسلہ جاری ہے۔ اگرچہ ان کوششوں میں ممبروں اور مولویوں کے ماتھوں پر اکثر عرقِ ندامت بھی آیا۔ اور انہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو خشک کرنے کی کوشش بھی کی۔

جب لوگوں نے ایسے مذہبی پیشواؤں کی توبہ کو قبول کر لیا اور تاویل کے ذریعہ ان کو منصب پیشوائی پر بحال رکھا تو غریب نیاز (ہمارے فاضل دوست مولانا نیاز) نے کیا گناہ کیا ہے کہ اُن کو معاف نہ کیا جائے۔ یا اُن کے جرم کو بڑھایا جائے۔ حالانکہ آپ کو نہ نبوت کا دعویٰ ہے نہ امامت کا، نہ مہدیت کا نہ مسیحیت کا۔ نہ مصلحیت کا نہ ماموریت الٰہیہ کا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ :-

"مجھے پیرِ مغاں بننے کا شوق نہیں، صرف گدائے میکدہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے پیش پیش رہنا میرے بس کی بات نہیں "بعقبِ سرکار" چلنے کی ہمت ضرور ہے۔ سپاہی زادہ ہوں اس لئے سردار کے حکم پر جان دینے کا ڈھب بھی آتا ہے اور لینے کا بھی۔ لیکن یوں مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔ جاہل بھی ہوں کاہل بھی" (نگار دسمبر ۱۹۳۲ء۔ صفحہ ۲۶)

رہی آپ کی توبہ اس کی تاویل مجھے یا آپ کو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس توبہ کی تاویل کا ایک روشن پہلو اسی دسمبر ۱۹۳۲ء کے نگار کے صفحہ ۲۸ کی سطور ذیل سے سامنے آسکتا ہے۔ مولانا نیاز اپنے ایک دوست کو "قبلہ" کے لقب سے ملقب کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

"آپ نہ ان سے اچھی طرح واقف۔ نہ ان کے جذبات سے آگاہ ——— آپ اپنا سر بھی کاٹ کر سامنے رکھدیں گے تو ان کا خبثِ باطن کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ اور مجھ سے آپ واقف ہی ہیں کہ گردن تو کٹوا سکتا ہوں، لیکن سر نہیں جھکا سکتا۔

اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ میں ان کو خط لکھ کر سارا حال ظاہر کر دوں تو براہِ کرم خود اُن کے پاس جاکر

[illegible] کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی سے اصلاح کے لئے کیا اور میں ایک لمحے کے لئے بھی معذرت کیلئے [illegible]

آپ نے جس قدر تکلیف مجھ کو پہنچائی ہے۔ ہر چند اس کی تلافی تو کسی طرح بھی نہ ہو گی۔ لیکن خیر میرے سینہ مجروح کو ایک حد تک تسکین ہو جائے گی۔ اور مجھ کو اپنے پندار پر زیادہ مسرور ہونے کا موقع مل سکے گا۔"

(نگار، دسمبر [illegible])

مگر ہم [illegible] تعلیمات کو اس "توبہ نامہ" کی شرح و تاویل بھی لیں تو مولانا ہم حقیقت سے چنداں دور نہیں قرار پائیں گے۔
پس اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو صاف ظاہر ہے کہ نگار میں شائع ہونے والا "توبہ نامہ" ہمارے نیاز کا توبہ نامہ نہ تھا۔ بلکہ کسی "دانا دوست" کی ہمدردانہ نادانی تھی۔ اس کے باوجود ضرورت اس بات کی ہے کہ اب جب مولانا نیاز کسی نہ کسی وجہ سے پھر اسی بحث و مباحثہ ہی میں مشغول ہیں۔ تو ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس غلطی اور غلط فہمی کو بھی دور کر دیں جو ان کی زبردستی کی توبہ سے ان کے مداحوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے ؎

پیر مغاں ز توبۂ ما گر ملول شد — گو بادہ صاف کن کہ بعذر ایستادہ ایم

مذہب و لامذہب

آخر میں اپنے شملوی دوست سے (جن سے بدقسمتی سے خاکسار کو حاضرانہ یا غائبانہ شرف نیاز حاصل نہیں ہے) چند جملے کہکر رخصت ہوتا ہوں۔ کہ وہ مذہب سے اتنے بدظن نہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لامذہبیت کی حقیقت سے بھی اتنے ہی بے خبر معلوم ہوتے ہیں جس قدر ہمارے اکثر دیندار مذہبی خیال کے بزرگوار دین و مذہب کی حقیقت سے ناآگاہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے نام سے جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ان کا اکثر و بیشتر حصہ اسی طرح مذہب سے غیر متعلق ہے جس طرح لامذہبیت کا بہت سا حصہ لامذہبیت نہیں بلکہ مذہب کی جان ہے۔ اور یہ مذہب کے اجارہ داروں کی زبردستی ہے کہ وہ اسے لامذہبیت کہہ رہے ہیں۔ اور وہ لوگ جو مذہب سے گھبراتے ہیں اس "درازدستی کوتاہ آستیناں" کو دیکھ کر خواہ مخواہ مرعوب ہو کر ان حقائق کو لامذہبیت مان لیتے اور اپنے آپ کو مذہب کا دشمن یا بیچارے مذہب کو ترقی کا دشمن بے محابا قرار دینے لگتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ مسائل مناظروں سے حل نہیں ہوتے۔ ان کو سمجھنے کے لئے اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کے علاوہ اپنے آپ کو مطالعہ کرنے کی بھی حاجت ہے۔ یہاں کسی "خضر صورت" کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے کام نہیں چلتا یہاں اپنا مرشد آپ بننے اور خود محبوب حقیقی کی دستگیری سے منزلیں طے ہوتی ہیں ؎

ہستم بدرقہ راہ کن اے طائر قدس — کہ دراز است رہ مقصد و من نوسفرم

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

شباب و شعر کے مبحث میں گفتگوئے استقامتِ مذہب

اور

تحصیلدار صاحب کی دوسری کھلی چٹھی پر میرے خیالات

از "شعر" دہلوی

تمہید میں گذشتہ سال موسم سرما میں شملہ چلا گیا تھا۔ بھائی "شباب" سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے۔ اور میں دہلی آ گیا۔ سلسلۂ مراسلات بدستور جاری رہا۔ خطوط اپنے موضوع کے لحاظ سے اس قدر دلچسپ اور مفیدِ مطلب تھے کہ یہ مناسب سمجھا گیا کہ انہیں کسی رسالہ میں شائع کر دیا جائے۔ نظرِ انتخاب ساقی پر پڑی کیونکہ فی الوقت اسی کا نکھار سب سے زیادہ پُر شباب ہے پہلی قسط نومبر میں شائع ہوئی اور دوسری دسمبر میں۔ ابھی سلسلہ جاری رہتا مگر متعصب ذہنیتوں نے اسے گوارا نہ کیا۔ تعریفی خطوط میں دو خط قابلِ غور ہیں۔ جو دسمبر کے ساقی میں "ریزۂ مینا" کے زیرِ عنوان شائع ہوئے۔ تنقیدی ضمن میں سب سے پہلا خط جناب محمد ادریس صاحب تحصیلدار آگرہ کا ہے جو ۱۰ دسمبر کے شاہجہاں میں چھپا۔ اس کے بعد ۱۰ جنوری کا شاہجہاں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص چیز ہے۔ جس میں ادریس صاحب کا دوسرا خط اور ان کے پہلے خط کے جواب میں بھائی "شباب" اور محترمہ فرخندہ جمال عالمی کے بلند پایہ مضامین شامل ہیں۔ فروری کے ساقی میں جناب مہر محمد خاں صاحب شہاب کے مضمون کا نصف حصہ شائع ہوا۔ مناسب تو یہی تھا کہ اس کی تکمیل تک میں خاموش رہتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اپریل کا ساقی "ظریف نمبر" ہوگا اور مئی تک کافی تاخیر ہو جائے گی۔ ادریس صاحب کی پہلی کھلی چٹھی کا جواب دیا جا چکا ہے۔ لہٰذا میرے پیشِ نظر ان کی صرف دوسری کھلی چٹھی اور شہاب صاحب کا نا تمام مضمون ہے۔ فی الحال وقت کی کم تنگی اور طوالت کے خوف سے میں زیرِ بحث موضوع کے ہر پہلو پر صرف سرسری نظر ڈالوں گا۔

محمد ادریس صاحب تحصیلدار آگرہ بچپن میں معصومیت، جوانی میں جوش و ولولے اور بڑھاپے میں بے کیف و بد رنگ عرصۂ حیات مسلمات میں سے ہیں۔ بچے کی گفتگو میں سنجیدگی۔ عہدِ شباب میں معصیت سے احتراز اور پیری میں اظہارِ سرخوشی و سرمستی اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ایک شیر خوار معصوم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ آتش و یاقوت میں تمیز کر سکتا ہے غلطی ہے۔ اسی طرح ایک نوجوان سے یہ امید قائم کرنا کہ وہ جرم و خطا کی بجائے زہد و اتقاء کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ سراسر حمق ہے۔ اس منزل سے گذرتے وقت خون کی سیمابی کیفیت عذاب و ثواب کے خیالِ خام کو دل و دماغ میں پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ جس آنکھ کی قوتِ بینائی پر شباب کے ہاتھوں خانہ پھر چکا ہو وہ معصیت کو عبادت کے رنگ میں اور عبادت کو معصیت کے روپ میں جلوہ گر دیکھتی ہے۔ ایک نوجوان کو جب اپنے فرائض کا احساس

ہوتے ہوئے وہ بے اصول کھیل کرتا ہے۔ کیونکہ گناہ کرنے کی صلاحیت ہی فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ اور اسی لئے بعض حضرات گناہ کو محترم سمجھتے ہیں ؎

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت　　　پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو

علاوہ اس کے اگر ایک بوڑھا شخص طفلانہ حرکات کا مرتکب ہو تو اُسے سودائی کہیں گے، اور اگر اظہارِ مستی کرے تو بوالہوس۔ ہر شخص شباب کی منزل سے گذرتے وقت وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس عہد میں نہ صرف روا بلکہ جائز اور ایک مستحب ہوتا ہے۔ لیکن اس منزل سے گذر جانے کے بعد جب وہ اپنے افعالِ سابقہ پر نظرِ ثانی کرکے اور دوسرے لوگوں کو ان سے محترز رکھنے کے خیال سے "من نکردم شما حذر بکنید" کہتا ہے تو اس کی یہ زرّیں تلقین کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت وہ غریب یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ کہ جوانی کی بدعنوانیاں جن کے محض تصور ہی سے اب وہ شرمسار ہو رہا ہے کسی مجبوری یا لاعلمی کے عالم میں نہیں بلکہ باقتضائے شباب اس سے سرزد ہوئی تھیں۔ اور انسان کے لئے اُن سے بچ نکلنا ناگزیر ہے۔ یہ درست ہے کہ دوسروں کے انجامِ حیات سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور ایسا کیا بھی جاتا ہے لیکن زندگی کی ہر منزل اور معاشرت کے ہر شعبہ میں اس کا اطلاق ممکن نہیں۔ اور خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ اپنی ناکامیوں کو تجربہ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ بزرگوں کے بنائے ہوئے اُصول اسی وقت قابلِ وقعت ہو سکتے ہیں جبکہ نوامیسِ فطرت سے اُن کا تضاد نہ ہو۔ اسے لاتدبراتِ قدرت کہو یا خود انسان کی کج فہمی کہ دو مختلف ہستیاں ذاتی ماحول و افکار کے مطابق کائنات کے ایک ہی ذرے کو متضاد حالت میں دیکھتی ہیں۔ ایک شخص کے لئے جس کے دل پر نوجوان بیٹے کی موت کا صدمہ ہو، دُنیا کی لطیف ترین مزاحیہ تمثیل بھی کوئی سامانِ دلبستگی پیدا نہیں کر سکتی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز جو آج ہمارے لئے سرمایۂ انبساط ہے کل کسی دوسرے ماحول کے مطابق موجبِ انقباض بن جائے ؎

دُنیا حسین تھی مرے عہدِ شباب میں　　　ہر چیز پہ بہار تھی ہر شے میں حُسن تھا

مرد جوں جوں ضعیف العمر ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی عادات و خصائل میں وہ مہلک نسائیت پیدا ہوتی جاتی ہے، جس کو "حسد" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عورت کے پاس قیمتی زیورات اور شاندار ملبوس نہ ہوں، وہ حسین و جمیل نہ ہو۔ یا اُس کا شوہر اس سے محبت نہ کرے تو اُسے اتنا زیادہ رنج نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کی کسی سہیلی یا رشتہ کی بہن وغیرہ کے پاس اس کی نسبت زیادہ قیمتی زیورات زیادہ شاندار ملبوس ہوں، اس سے زیادہ حسین و جمیل ہو یا اس کا شوہر اپنی زوجہ سے زیادہ محبت کرتا ہو تو اُسے یقیناً بہت زیادہ رنج ہوگا۔ اور اس طرح وہ اپنی عزیز ترین سہیلی یا بہن سے حسد کرنے لگے گی۔ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ کسی نے ایک کُبڑی عورت سے پوچھا "کیا تو چاہتی ہے کہ خُدا تیرا کُب سیدھا کر دے" اس نے جواب دیا "ہاں یہ اچھی بات ہے لیکن اگر خُدا دُنیا کی تمام عورتوں کو کُبڑا کر دے تو زیادہ بہتر ہے" عہدِ پیری میں یہی ذہنیت مرد کی فطرت میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اس کو اس بات کا قلق نہیں ہوتا کہ اس کے جذبات میں ہیجان کیوں نہیں ہوتا یا اس کے جوش و ولولے سرد کیوں پڑ گئے۔ بلکہ یہ حقیقت اس کے لئے سوہانِ رُوح بن جاتی ہے کہ دُنیا میں نوجوان ہستیاں بادۂ شباب سے مخمور رہیں۔ اس کی انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح بے کیف و بدرنگ زندگی بسر کرنے لگیں۔ ہمارے مولانا محمد ادریس صاحب

[illegible] بھی قدرت نے اس منزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اور اس امر کے ثبوت میں کہ حسد کے جراثیم نے ان کی فطرت میں [illegible] کر دی ہے، وہ دو کھلی چٹھیاں ہیں جو رسالہ شاہجہاں میں بنام "ڈیرہ شاہد" شائع ہوئی ہیں۔ مولانا نے مجرم [illegible] اور اس کے نوجوان کاتبوں سے محض اس لئے بدظن ہیں کہ اس میں اُن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جن سے وہ ہر گز [illegible] لطف اندوز ہوئی تھی۔ مگر اب قوی کے مفلوج ہو جانے کے باعث مجبور رہے۔ وہ تیرہ دن کو مطمئن کرنے سے بہتر یہ تھا کہ ادریس صاحب خود ڈاکٹر اشرف الحق سے عمل تعلیم کے ذریعہ تجدید شباب کر لیتے تاکہ حُسن و شباب سے رُوح افزا [illegible] لطف اندوز ہونے کا انہیں ایک اور موقع ملتا جس کو دُنیا سے وقت کے ظالم ہاتھوں سے انہیں نکال دیا ہے۔ [illegible] آج جس سے لطیف کی تعریف میں چند شاعرانہ الفاظ لکھ کر آتش زیر پا ہو رہے ہیں ایک پادری [illegible] کی سب [illegible] سو متاثر ہونے کے قابل بن جاتے۔ بڑھاپے میں تقدس بن کر دوسروں کو نصیحت کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ تائب عشق [illegible] ذات کو بلکہ خدا کو بھی فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر موصوف جو انگریزی طرزِ تحریر کے مخالف ہوتے ہوئے بھی [illegible] تقلید کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں بُرا نہ مانیں تو میں ایک انگریزی جملہ درج ذیل کروں گا جو شیطان [illegible] وضع کیا گیا تھا۔

When men grow virtuous in their old age, they make a sacrifecs toGod of the Devil's leaning.

مولانا کی کھلی چٹھی کا جواب دینا اصولاً میرا فرض تھا۔ اور یقیناً میں جواب دیتا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ مولانا [illegible] یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات علوم فارسی و عربی سے ناواقف ہوتے ہیں، اور یہ کہ میں بذاتِ خود کلام کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا مگر ایک فارسی شعر نے جو انہوں نے اپنے خط میں درج کیا ہے مجھے میرے ارادوں سے باز رکھا۔ وہ مجھ سے یہ دریافت کرتے ہوئے کہ کیا سب مولوی یکساں ہوتے ہیں (جس کا میں نے دعویٰ کہیں نہیں کیا) لکھتے ہیں ؎

نہ ہر مرد مرد و نہ ہر زن زنست　　　خُدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اس شعر کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ جو شخص ایک ایسے شعر کو جو زبانِ اُردو میں ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکا صحت الفاظ کے ساتھ نہیں لکھ سکتا اس سے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ اس میں علمیت کا شائبہ تک بھی ہوگا۔ کاش! مصرع ثانی کو بھی توڑ مروڑ کر اس طرح لکھتے کہ لفظ "انگشت" آخر میں آجاتا۔ ہر چند قافیہ کی رعایت اس وقت بھی نہ پیدا ہوتی کم از کم آخری حرف تو مل جاتا اور بوجھوں مارنے کی رعایت ہو جاتی۔ اگر مولانا میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس حقیقت کا [illegible] کریں کہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص بھی فارسی اور عربی ادبیات سے واقف ہو سکتا ہے، تو میں ان کو بتاؤں کہ مصرعہ اس طرح ہے ؏

نہ ہر زن زنست و نہ ہر مرد مرد

خُدا کرے مولانا اس کو کاتب کی غلطی قرار دیں اور پھر میں "ڈیرہ شاہد" سے استدعا کروں کہ ان کے خط کا عکسی [illegible] قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ میری بلند ہمتی مجھے مجبور کر رہی تھی کہ مولانا کو چیلنج دوں کہ آئیے ہم دونوں فلسفۂ اسلام پر [illegible]

[illegible] اور فیصلہ علمائے کرام پر چھوڑ دیں مگر اب ان کے مقابلہ میں آنا اپنی سُبکی سمجھتا ہوں۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد [illegible] سے اس امر کا حوالہ بھی نکال کر پیش کر دیتا جو مولانا کو مطلوب ہے۔ مگر یہ کاوش کس کے لئے کی جائے۔ [illegible] جو مشہور ترین اشعار کو بھی صحت کیساتھ نہیں لکھ سکتا۔

مولانا اپنی تعریف و توصیف میں خوب رطب اللسان ہیں۔ اور دوسروں کو مطعون کرنے میں پیش پیش۔ مگر ٹھنڈے دل سے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے ضمیر میں بھی سہو و نسیان کا جُزو شامل ہے۔ اور غالباً اور لوگوں سے نسبتاً زیادہ۔ دوسروں کو کم فہم بتانے والے اکثر خود قیم العقل ہوتے ہیں مجھے پھر انگریزی زبان کا ایک جملہ یاد آرہا ہے اگر مولانا کو ناگوار نہ گذرے تو لکھوں کہ

The meanest way of praising ourselves is finding faults with others.

اب میرا روئے سخن حضرت مہر محمد خاں صاحب شہاب کی طرف ہوتا ہے جنہوں نے "شبابِ شعر" پر اپنے خیالات کا اظہار فروری کے ساقی میں کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا اور رئیس صاحب کے بھی بعض اعتراضات کا جواب آجائیگا۔

مہر محمد خاں صاحب شہاب۔ شہاب صاحب کے اسم گرامی میں صرف ایک حرف پر عمل تقلیم کرنے سے یعنی ہ کے غدود نکال کر ب کے غدود لگا دینے سے "تجدیدِ شباب" ممکن ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے موصوف نے زیرِ بحث خطوط کی شبابیت و شعریت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ چند جملوں کو مخرب الاخلاق بتایا ہے۔ سو اس کے جواب میں اوّل تو انہیں کے یہ دو جملے کافی ہیں کہ "لغزش بھی تو شباب ہی میں ہوا کرتی ہے اور بہکتے بھی جوان ہی ہیں"۔ لیکن اس کے علاوہ تحصیلدار صاحب کی چٹھی کے جواب میں "بھائی شباب" کے یہ جملے بھی قابلِ غور ہیں کہ "کاش! آپ سمجھ سکتے کہ لٹریچر بھی بجائے خود ایک چیز ہے۔ جس کے جوہر پرکھنے کے لئے مذہب و اخلاق کے دبیز پردوں میں بھٹکی ہوئی نگاہ اس کے حُسن تک نہیں پہنچ سکتی"۔

اس ضمن میں دوسری غلط فہمی شہاب صاحب کو یہ ہوئی کہ انھوں نے خطوط کو ایک مُستقل مضمون تصور کر لیا۔ حالانکہ نومبر کے ساقی میں نہایت واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ دو دوستوں کی پرائیویٹ خط و کتابت ہے۔ اور اصل دفتر میں موجود ہے۔ ایک مضمون میں تسلسلِ خیال جُزو لاینفک ہوتا ہے۔ مگر خطوط کے لئے یہ ضروری نہیں۔ خط لکھنے سے قبل جبکہ مراسلہ نگار کو یہ علم نہ ہو کہ کسی آئندہ زمانہ میں اس کی یہ "متاعِ خاص وقفِ عام" ہو جائے گی۔ تو کس طرح توقع رکھی جا سکتی ہے کہ عبارت مربوط ہونی چاہیئے۔ ذرا غالب ہی کے خطوط کو سامنے رکھکر فیصلہ کر لیجئے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں دُرست ہے یا نہیں۔ ہاں اگر اُن خطوط کی غرض و غایت یہی ہوتی کہ ساقی میں شائع ہوں تو یقیناً ربطِ مضمون کا خیال رکھا جاتا۔ آپ کو یہ بھی اعتراض ہے کہ دسمبر کے پرچے میں شملوی دوست کے خط بے رنگ اور بے کیف کیوں ہو گئے۔ یہاں بھی وہی حقیقت نگاری کا معاملہ آجاتا ہے۔ جب شملوی دوست کو اس امر کا علم تھا کہ اس کا دہلوی دوست اپنی زوجہ محترمہ کی علالت کے باعث ایک پریشان کن ماحول میں گھرا ہوا ہے تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس حالت میں بھی اپنے خط میں سابقہ رنگینی کو قائم رکھتا۔ اگر اس کی دوستی صداقت و خلوص پر

مبنی ہے تو یقیناً اپنے دوست کے درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیگا۔ کج فہم نقادوں کے اعتراض سے "شباب و شعر" کے سلسلہ کو قطع کر دیا۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ دہلوی دوست جب عارضی مصائب سے نکل کر سکون و طمانیت کی فضا میں سانس لیتا ہے تو دوبارہ وہی رنگینی پیدا ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اب بھی اگر قارئین کی طرف سے مطالبہ ہوا تو اُن باقی خطوط کو شائع کر دیا جائیگا جو فی الحال محفوظات میں شامل ہیں۔

اِن ضمنی باتوں کو اجمالاً بیان کرنے کے بعد اب میں اہم امور کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن میں حسب ذیل چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :۔

(۱) ہجرتِ نبوی اور نیاز (۲) لینن اور نیاز (۳) نیاز کا توبہ نامہ (۴) مذہب اور نیاز (۵) استقامت اور نیاز (۶) مخالفین اور نیاز (۷) نیاز ایک صدی بعد۔ وغیرہ۔ لہٰذا ان پر ایک سرسری نظر ڈال کر مضمون کو ختم کر دونگا۔

ہجرتِ نبوی اور نیاز۔ ہمارا قرآن شریف میں جو ہمیشہ خود میرے بھی مُطالعہ میں رہا کرتا ہے۔ ہجرت کا واقعہ ان الفاظ میں درج ہے۔ اور دیگر مفسرین بھی الفاظ کے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ اسی طرح بیان کرتے ہیں :۔

"......... رفتہ رفتہ مکّہ سے کل صحابی مدینہ میں چلے گئے اور آنحضرت خُدا کے حکم کا انتظار کرتے رہے۔ قریش نے آنحضرت کا دروازہ و مکان گھیر لیا۔ اللہ جلِ شانہ نے بذریعہ وحی آنحضرت کو مُطلع کر دیا۔ چُنانچہ علیؑ کو اپنے خوابگاہ میں سُلا کر مکان کے باہر آئے۔ اللہ نے اُن کی آنکھوں پر اس وقت پردے ڈال دئے۔ آنحضرت نے ایک مُشتِ خاک پر سورۂ یٰسین کی اوّل آیات فہم لایُبصرون تک پڑھ کر اُن کے سروں پر ڈالدی۔ اور آپ مع ابوبکر صدیقؓ کے مکان سے باہر تشریف لائے۔ عبداللہ بن اریقط کو اُجرت دے کر راہبر مُقرر کیا۔ اس سے یہ کہدیا کہ معمولی راستہ چھوڑ کر غیر معروف راہ سے مدینہ کو لیجائے۔ مکان سے نکل کر رات ہی کو ایک غار میں جو جبل ثور میں تھا چھپ گئے۔ قریش بھی ڈھونڈھتے ہوئے غار تک پہونچ گئے۔ چونکہ دہنِ غار پر مکڑیوں نے پہلے ہی سے جالا لگا رکھا تھا۔ اس وجہ سے مطمئن ہو کر واپس لوٹ گئے۔ تین روز کے بعد روانہ ہوئے اور ظہر کے وقت ایک میدان میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے۔ اسی اثنا میں سراقہ بن مالک بن جعشم آ پہونچا۔ آنحضرت نے اس کے حق میں بددُعا کی اُسی وقت اس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں زمین میں دھنس گئے ...... "

آئیے۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس بیان میں صداقت ہے یا نہیں۔ اور پھر ان واقعات کی روشنی میں نیاز کی حیاتِ موجودہ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ تو پھر آنحضرت نے سورۂ یٰسین پڑھکر ایک مشتِ خاک اُنکے سروں پر کیوں ڈالی ؟ کیا سماوی امداد کافی نہیں تھی ؟ قریش مکان کے چاروں طرف جمع تھے اور بظاہر آنحضرت نے ایک مٹھی خاک صرف اُن لوگوں پر ڈالی ہوگی جو دروازے کے مقابل تھے۔ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ دو چار مٹھیاں باقی لوگوں پر بھی ڈال دیتے ؟ کیا یہ بھی اللہ کا حُکم تھا کہ حضرت علیؓ کو پلنگ پر سُلایا جائے، اور آنحضرت ہجرت فرمائیں ؟ اگر خُدا کی قدرت

[illegible] آنحضرت اس امن وامان کے دائرے سے باہر رہتے؟ روانگی ہجرت کاذب کے وقت عمل میں آئی تھی۔ [illegible] حضرت علی کو سو جانے کا حکم دیا گیا۔ عبادت اور خدا کے حضور میں اظہار تشکر کی ہدایت کیوں نہیں کی گئی؟ جب خدا نے [illegible] اس دروازہ مکان کے سامنے قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اور آنحضرت اس خطرناک ماحول سے [illegible] نکل گئے تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ضرورتِ وقت کے لحاظ سے خدا ہر جگہ منافقوں کی بصارت زائل اور ان کے اعضا مفلوج کر دیتا؟ پھر کیا وجہ تھی کہ آنحضرت اصل راستہ چھوڑ کر غیر معروف راہ سے مدینہ تشریف لے گئے؟ کیا نعوذ باللہ ان کو خدا کی قدرت پر اعتماد نہیں تھا؟ آنحضرت نے ہمیشہ مسلمانوں کو ہدایت کی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرو۔ اور خود ان کی سوانح حیات شاہد ہے کہ ہمیشہ دشمنوں پر دعائے خیر فرماتے تھے۔ پھر کس خوف و دہشت سے مرعوب ہو کر سراقہ بن مالک کے حق میں بددعا کی جس کے اثر سے اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا؟ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ آنحضرت اپنی ذات کے لئے اس فعل کو روا رکھتے تھے جس کے نہ کرنے کی دوسروں کو تلقین کی؟ اور کیا اس غلط بیانی سے اس برگزیدہ ہستی پر (خاکم بدہن) کوئی بدنما داغ نہیں لگتا۔ میرا ایمان ہے کہ مندرجہ بالا تمام بیان خود مفسرین کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اصل واقعات اس سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اچھا تھوڑی دیر کیلئے اس کو درست تسلیم کر لیجئے اور پھر نیاز کی زندگی سے تقابل کیجئے۔

آنحضرت نبی تھے، اس لئے بارگاہ ایزدی سے دربارِ رسالت میں ہمیشہ وحی والہام ہوتا رہتا تھا۔ اور آنحضرت انہی احکام کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ نبوت ختم ہوگئی۔ الہام و وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس لئے نیاز اس نعمت سماوی سے محروم ہیں۔ (اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں) ان کی تمام تحریکات ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ ان کے کردار کو بھی وہی استقامت نصیب ہو جاتی۔ معجزات کا مظاہرہ صرف انبیاء کے لئے مخصوص تھا۔ نیاز نبی نہیں ہیں۔ اس لئے کسی معجزہ کے ذریعہ منافقوں (گرگ خصال مولویوں) پر غالب نہیں آسکتے۔ اور اگر مسمریزم کے عمل سے (جس کا مذہبی نام معجزہ ہی ہو سکتا ہے)، وہ کوئی شعبدے بازی کریں تو قانونی گرفت میں آجائیں گے۔ آنحضرت کے زمانے میں کوئی آئینی حکومت نہ تھی۔ اعلانِ نبوت کے بعد بہت جلد آنحضرت کو ایسے صحابہ مل گئے۔ جو ان کے پسینہ کی جگہ خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ نیاز کے طرفدار اور ہم نوا لاکھوں ہیں۔ مگر وقت پر حقیقی معنوں میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے والا شاید ایک بھی نہیں۔ واضح رہے کہ اس فقدان سے نیاز کی تحریکات باطل نہیں ہوتیں۔ جبکہ تاریخ شاہد ہے کہ بعض انبیاء و مرسلین سینکڑوں سال ہدایت و تلقین کرنے کے باوجود صرف چند افراد کو گمراہی سے بچا سکے۔ آنحضرت خاص اپنے چچا کو راہِ راست پر لانے سے عاجز رہ گئے۔ آنحضرت کو یقین واثق تھا کہ مدینہ گہوارۂ امن وامان بن جائیگا۔ نیاز کے لئے ہندوستان کا ہر گوشہ خطرات سے لبریز ہے۔

ان امور کا دقیق مطالعہ کر لینے کے بعد کہ آنحضرت کس ماحول میں تھے اور نیاز کن حوادث میں، اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیاز میں استقامت کی کمی ہے تو کیا وہ لائقِ معافی نہیں۔ درانحالیکہ آگے چل کر بتاؤں گا کہ نیاز میں بھی زبردست استقامت ہے۔

* * *

لینن اور نیاز: لینن اور نیاز کا تقابل کرنے سے قبل سرسری طور پر سقراط کے مختصر حالات پر نظر ڈال لینا بہت تو بہتر ہے۔ سقراط جیل میں بند ہے۔ اس کو یقین ہے کہ دوسرے دن اس کی زندگی کو ختم کر دیا جائیگا۔ تاریکی کے عالم میں اس کا ایک رفیق جیل کی کوٹھڑی میں پہونچ کر کہتا ہے "میں نے دروازہ کھول دیا ہے پہرے دار خوابیدہ ہیں۔ فرار کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ آؤ میرے ساتھ بھاگ چلو" سقراط جواب دیتا ہے "موت سے ڈر کر بھاگ جانا بزدلوں کا کام ہے۔ میں حکومت کے وضع کئے ہوئے قوانین کا احترام کرتا ہوں۔ عدالت کے حکم کے مطابق مجھے قید کیا گیا ہے۔ میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا" اور دوسرے دن خندہ پیشانی کے ساتھ زہر کا پیالہ پی لیتا ہے۔
تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں اور بھی ہیں۔

آئیے۔ اب تاریخ کے کئی ہزار اوراق پلٹ کر اس صفحہ کا مطالعہ کریں جہاں لینن کے حالات درج ہیں۔ لینن قید میں ہے۔ خفیہ تحریر کے ذریعہ اپنے رفقاء کو ہدایت کرتا ہے کہ کمند لیکر جیل کے عقب میں آئیں۔ وقت مقررہ پر وہ آگئے ہیں۔ اور لینن فرار ہو جاتا ہے۔ ایک بار نہیں تین بار۔

نیاز کے توبہ نامہ اور ہجرت نبوی یا لینن کے جیل سے بھاگ جانے کے ضمن میں شہاب صاحب مجھ کو کج فہم ثابت کرنے کے لئے لکھتے ہیں:۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرے عزیز نے اسے دانستہ نظرانداز کر دیا ہے۔ اور یہ کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ دونوں واقعات کو سمجھے ہی نہیں۔ البتہ اتنا کہنے میں مضائقہ نہیں کہ انہوں نے ان امور پر غالباً سنجیدگی سے غور نہیں فرمایا۔"

جہاں تک حسن بیان کا تعلق ہے۔ میں ان جملوں کی داد دوں گا کہ ایک عمدہ پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ گئے جس کے اظہار کو دل گوارا بھی نہیں کرتا۔ تاہم شہاب صاحب کی بجائے کوئی دوسرا شخص ہوتا تو میں بھی اتنا ضرور کہتا۔ کہ "حضرت! آپ ہی نے ان امور پر سنجیدگی سے غور فرما کر وضاحت کی روشنی کیوں نہ ڈالی۔ لینن کے جیل سے بھاگ جانے کے فعل کو مستحسن قرار دیکر آپ نے کس اصول کی بناء پر یہ فتویٰ صادر فرما دیا کہ جن خیالات و عقائد کے ماتحت وہ کام کر رہا تھا اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ کیا آپ کا نظریہ صرف ارضِ روس اور شخصیت لینن ہی تک محدود ہے۔ اور اس کا اطلاق ملکِ ہند اور غریب نیاز پر نہیں ہوتا؟ ممکن ہے۔ آپ یہ جواب دیں کہ تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی تو ہے مگر کسی قدر تغیر کیسا تھ۔ سقراط کے زمانہ میں جیل سے فرار ہو جانا بزدلی اور قوانین سلطنت کی خلاف ورزی معیوب تھی۔ اور کئی ہزار سال کے بعد لینن کے عہد میں یہ سب کچھ جائز ہو گیا۔ لیکن کیا تاریخ کا بھی یہ طرزِ عمل لینن کی وفات کے ساتھ فوت ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے آنحضرت پر نبوت ختم ہو گئی۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لینن کے زمانہ میں مخالفین کے سامنے سر جھکانا اور توبہ نامہ شائع کرنا معیوب تھا۔ لیکن نیاز کے عہد میں یہ سب کچھ جائز ہو گیا۔ درانحالیکہ ابھی یہ بھی تسلیم کرنا محال ہے کہ کیا نیاز نے دراصل کسی کے سامنے سر جھکایا تھا۔ اور یہ بھی فیصلہ نہیں ہوا کہ توبہ نامہ کی نوعیت و اصلیت کیا تھی۔ آگے چل کر ان امور پر بھی روشنی ڈالونگا۔

◆ ◆ ◆

نیاز کا توبہ نامہ

تمام بحث میں تقریباً یہی موضوع سب سے زیادہ اہم ہے اور ایک شخص اس کی حقیقت کو ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ تاوقتیکہ وہ تعصب کی مُذَہب عینک کو اپنی چشم مُروّت سے دور نہ کر دے۔ جس طرح یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حافظ شیرازی کی زندگی معصیت کی تھی یا زہد و اتقاء کی اہل ایران نے خود انہی کے کلام میں سے مطالعہ کیا ہے۔ ہم بھی نیاز کے ملاحظات کا مطالعہ کریں اور معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ علامہ موصوف نے خود اس ضمن میں کیا لکھا ہے۔

بیجا نہ ہو گا اگر اس بحث کو شروع کرنے سے قبل مصر کی اسلامی تاریخ پر سرسری نظر ڈال لیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ہے اور عیسائیوں کی اقلیت۔ عیسائی بطور حقوق چند مراعات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حکومت ابتداء میں کسی قدر تشدد سے کام لیتی ہے مگر جب فتنہ و فساد کا بازار سرد نہیں پڑتا تو زغلول پاشاہ کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ عیسائی اپنے حقوق کو محضر کی شکل میں لکھ کر لائیں۔ حکومت غور کرے گی۔ رعایا میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ حقوق کی فہرست تیار کر کے پیش کی جاتی ہے۔ اور شیر اسلام زغلول پاشاہ بغیر ایک لفظ پڑھے اس پر دستخط کر دیتے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ واقعات عیسائیوں کو خود محسوس کرا دیں گے کہ انکا مطالبہ حق بجانب نہیں تھا، اور نہ وہ ان مراعات کے اہل تھے۔ دنیا دیکھ لے گی کہ وہ تحفظ حقوق کے لئے کوشاں نہیں تھے۔ بلکہ فتنہ و فساد برپا کرنا ان کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔

آئیے۔ اب ملاحظات کا مطالعہ کریں۔ نگار بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۷ پر درج ہے :۔

"...... چونکہ میں قدرتاً ذہنی یا علمی جنگ کے علاوہ کسی ایسے ہنگامہ کو پسند نہیں کرتا۔ جو کسی فرد یا جماعت کی عمرانی زندگی میں اختلال پیدا کر دے۔ اور چونکہ موجودہ مظاہرے کھلے ہوئے دو محاذ بنا رہے تھے جن کی باہم دگر آویزش خطرناک نتائج پیدا کرنے والی تھی۔ اس لئے جس وقت میرے بعض مخلص احباب کا وفد مشاورت صلح کے لئے آیا تو چونکہ اس دوران میں مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں میں ہنوز اتنی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ موجودہ زمانہ کے حالات کو سامنے رکھ کر تبلیغ و اشاعت مذہب تو خیر بڑی چیز ہے۔ کم از کم لا اکراہ فی الدین ہی کا صحیح مفہوم عملی زندگی میں متعین کر سکیں۔ اس لئے میں نے اظہار رضامندی میں مطلق پس و پیش نہ کیا کیونکہ جب دوا کی تلخی ناقابل برداشت ہو تو طبیب کو اپنے نسخہ میں تبدیلی پیدا کرنا ضرور ہے۔ اس دوران میں بعض مضامین کی وجہ سے لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ کہ ان کے بعض معتقدات مذہب کو صدمہ پہونچا ہے۔ خود میں نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ میں جس نقطہ بلند سے اسلام و تعلیمات اسلام کی صداقت و حقانیت کو دیکھتا ہوں وہاں تک پہونچنا آسان نہیں۔ اس لئے میں نے پوری طرح محسوس کیا کہ یقیناً میرے بعض مضامین سے بہت سے حضرات کو تکلیف ہوئی ہو گی۔ اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ جس طریقہ کار کو میں نے خالصتاً اور محض مسلمانوں کے فائدے کے لئے اختیار کیا تھا ہنوز اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ یا یہ کہ اسی کو کسی دوسرے لب و لہجہ اسلوب تحریر کے ساتھ پیش کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا ۔۔۔ بہرحال ان حالات کے ماتحت میں ان تمام حضرات کو جن کو اس وقت تک میرے مذہبی مضامین سے کسی قسم کی تکلیف پہونچی ہے۔ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود ہمیشہ صرف خدمت

اسلام رہا۔ اور رہیگا۔"

کیا اس اعلان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ علامہ نیاز اپنی تحریکات پر منفعل نہیں تھے۔ بلکہ کفِ افسوس مل رہے تھے مسلمانوں کی پستی پر انہیں انتہائی رنج تھا اس امر کا کہ عوام اُن کی پُرخلوص و صداقت سے لبریز تعلیمات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ مولویوں کی جماعت نے اپنی مقناطیسی قوت کے زیرِ اثر اُن کے دل و دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اور وہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ اور اب بھی کیفیت بدستور ہے۔

اس کے بعد یہ سطور ملاحظہ ہوں :-

"میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے اور لکھنؤ پبلک کے درمیان جو گفتگوئے صلح ہو رہی ہے وہ پوری ہوگی بھی یا نہیں۔ اور اگر ہوئی تو کس نوع کا اعلان مجھ سے چاہا جائیگا۔"

کیا ان الفاظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نیاز کی طبیعت صلح پسند ہے۔ اور قرآن شریف کی آیتِ کریمہ "انما المومنین اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم" کو عملی جامہ پہنانا ان کا ایمان ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے قیافہ شناسی اور دیرینہ تجربہ کی بنا پر قبل از وقت معلوم کر لیا تھا کہ مولویوں کی ایک جماعت کسی مخصوص توبہ نامہ پر دستخط کرنے کے لیے ان کو مجبور کرے گی۔ نیاز سب کچھ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو گئے محض اس لئے کہ انہیں باہمی فتنہ و فساد گوارا نہیں تھا کیونکہ یہی سب سے زیادہ منافقانہ طرزِ عمل ہے۔ اس کے بعد وہ گھڑی آئی جس کا پتہ آثار و قرائن سے پہلے ہی لگ چکا تھا یعنی مولویوں کی ایک خاص جماعت نے (جس میں غالباً مولانا اشرف علی تھانوی یا ان کے کسی نمائندے کی بھی شرکت تھی) ایک توبہ نامہ مرتب کیا۔ اور جب اس کو نیاز کے سامنے پیش کیا تو اس مجاہدِ اسلام نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی کہ اس کی عبارت کس نوع کی ہے اور بالکل نافلول پاشا کی طرح ایک لفظ پڑھے بغیر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ اگر توبہ نامہ کی عبارت مرتب کرنے کی اجازت خود نیاز کو دیدی جاتی تو بیشک ہم ایک ایک لفظ کو تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ بصورتِ موجودہ جبکہ نیاز کا کوئی نمائندہ بھی توبہ نامہ کی تحریر کے وقت اس کافر گر جماعت میں شامل نہیں تھا۔ نیاز موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ بقول غالب ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اسی توبہ نامہ کے ساتھ یہ بھی باہمی فیصلہ ہوا تھا کہ آئندہ نگار میں کوئی مذہبی مضمون شائع نہ ہوگا۔ بشرطیکہ علماء کی جماعت کا کوئی رکن نیاز کے خلاف زہر نہ اُگلے۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات سے پتہ لگ جائیگا کہ سب سے پہلے نیاز نے شکستِ عہد کیا یا مولوی منافق ہو گئے۔ اس ضمن میں اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ملاحظات کی ابتدائی تین سطریں قابلِ غور ہیں :-

"آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا۔ اور انہوں نے بھی ستمبر کے معارف میں پانچ سطریں ایڈیٹر نگار کے ملحدانہ مضامین کے متعلق سپردِ قلم کر ہی دیں۔"

اس کے علاوہ نیاز کے خلاف جو عملی کارروائیاں کی گئیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خاص میرے ہی وطن مالوف کی

ایک شخص شیخ سلیمان سے نیاز کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ لکھنؤ کی چند سربرآوردہ ہستیوں سے بدمعاشوں کو لالچ دے کر ترغیب دی کہ کسی طرح نیاز کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مالی اعانت کی خاطر ایک والیٔ ریاست کی طرف رجوع کیا گیا۔ عائدین سلطنت کے آستانوں پر بھی جبیں سائی کی کہ کسی طرح حکومت اس معاملہ میں دخل اندازی کرے۔ لیکن قدرت نے یہ دکھا دیا کہ فرعون کی کوششوں کے باوجود موسیٰ کی پرورش میں رخنہ اندازی نہیں ہو سکتی۔ جس پر خدا کی رحمت سایہ فگن ہو اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ جس طرح ناظم پاشا کے یہ الفاظ کہ "تمام دنیا دیکھ لے گی کہ عیسائی تحفظِ حقوق کے لئے کوشاں نہیں تھے بلکہ فتنہ و فساد برپا کرنا ان کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا" پایۂ ثبوت کو پہونچ گئے۔ اسی طرح آج ہندوستان کے مسلمانوں پر روشن ہو گیا کہ نیاز کے خلاف مولویوں کا پروپگنڈا تحفظِ اسلام کی خاطر نہیں تھا بلکہ محض اس لئے کہ ان کے حلوے مانڈے میں فرق آ چلا تھا۔ اور عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ یہ تجارت پیشہ مولوی سبزی فروشوں کی طرح سر پر جھلی رکھ کر سرِ بازار آواز لگائیں گے مگر ان کے مذہبی فتوے خریدنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس وقت وہ کساد بازاری پر آنسو بہائیں گے مگر دنیا کا کوئی ماہرِ علم الاقتصاد ان کی حالتِ زار پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کریگا۔ کیونکہ مار پرستوں کی جماعت کو نظر انداز کرنیکے بعد شاید ہی کوئی ہستی ایسی ملے جس کو مصیبت زدہ سانپ پر ترس آتا ہو۔

مذہب اور نیاز:۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ نیاز کا مذہب کیا ہے۔ اور وہ اسلام سے جداگانہ کوئی چیز ہے یا اسی کی روح۔ اس تحقیق کے لئے نگار کے صفحات ہی بہترین ذریعہ ہیں۔ چنانچہ تھوڑی سی جستجو کے بعد جنوری ۱۹۳۱ء کے صفحہ ۱۰۵ پر یہ الفاظ نظر آتے ہیں:۔

"مذہب کا مقصد اصلاحِ اعمال، تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں"

میرا دعویٰ ہے کہ کورانہ ذہنیت والے ایک مولوی کے دماغ پر پچاس سال تک صیقل کر کے سو سال تک جلا کی جائے تب بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اتنے عمدہ الفاظ میں مقصدِ مذہب سمجھا دیگا۔ کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ "عبادت اور اخلاقِ حسنہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جن کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی۔"

اس کے بعد نیاز لکھتے ہیں:۔

"اخلاقِ حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظامِ تمدن میں عضوِ مفید کی حیثیت اختیار کرے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔ ابنائے جنس کے نظامِ عمرانی میں ایک فردِ معاون ہو کر زندگی بسر کرے۔ اور نفسانی و ذاتی اغراض کو شیرازۂ اخوتِ عامّہ کو درہم و برہم نہ ہونے دے۔"

ہمارے علمائے کرام کا فتویٰ ہے کہ وہ شخص مومن اور جنتی ہے جو ارکانِ اسلام کا عامل ہو۔ خواہ اس کے ذاتی افعال کتنے ہی مذموم ہوں۔ درانحالیکہ آنحضرت کا فرمان ہے:۔

"ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم و لکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم"

مجھے یقین ہے کہ اگر دارالعلوم ندوہ اور دیوبند کے طلبا اپنی اپنی کتابوں کے سرورق پر نیاز کے جملوں کو نقل کر لیں اور ہر صبح

مطالعہ سے قبل کم از کم ایک بار اس کا وِرد کر لیا کریں تو رفتہ رفتہ مفسدین کی تعداد قلیل ہونی شروع ہو جائیگی۔ اس کے بعد خدا اور بندے کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں۔

"نہ خدا میں جذبۂ انتقام کی پرورش ہوتی ہے۔ نہ جذبۂ احسان کی۔ کوئی عمر بھر اگر اس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اصول کو بدلنے والا نہیں۔ اور اگر کوئی ہر وقت اُسے گالیاں دے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ توحید سے مراد خدا کو ایک کہنا نہیں کیونکہ ایک کی نسبت بھی اس کی شان کے منافی ہے۔ بلکہ ایک سے مُراد اس کو کُل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو اس کُل کا جزو قرار دیکر تمام قواے عمل سے کام لیکر تمام ان مدارجِ ارتقار کو طے کرنا ہے، جو اس کُل یا قدرت نے سعی و عمل کے لئے مخصوص کر دئیے ہیں۔"

مگر مشکل یہ ہے کہ فلسفہ کے ان باریک نکات کو وہ جماعت کبھی سمجھ ہی نہیں سکتی جس کے ذہن میں یہ بات جاگزین ہو گئی ہو کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔

یہ خلاصہ ہے صرف ایک مضمون کا۔ اگر نگار کے تمام پرچوں پر نظر ڈالی جائے تو خدا جانے فلسفۂ مذہب کی کتنی جلدیں تیار ہو جائیں۔ بہرحال اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔ یہ محض ایک جملہ معترضہ تھا۔

استقامت اور نیاز:۔ اس موضوع پر مولانا شہاب نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اور پوری قوتِ تحریر سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ نیاز میں استقامت نہیں۔ ان کی طرح میں اتنا بھی نہیں کہوں گا کہ میرے مکرم اس مسئلہ کو سمجھے نہیں یا اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ بلکہ میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ نیاز کا ہر وہ فعل جس میں استقامت کا فقدان سمجھا جاتا ہے، بجائے خود ایک زبردست استقامت ہے۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے قبل غیر مناسب نہیں ہوگا اگر اٹلی کے ایک دور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈال لی جائے۔ آج مہذب دُنیا کا ہر نا شدہ مرہونِ منت ہے گلیلو کی سعی و کاوش کا جس نے فلکیات کے ضمن میں غیر فانی نظریے قائم کر کے دُنیائے سائنس پر ایک زبردست احسان کیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے تحقیق کیا کہ نظامِ شمسی کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ سُورج ساکن اور زمین گردش میں ہے۔ اس سے قبل تمام عُلمار کا ایمان تھا کہ زمین ساکن ہے اور سُورج گردش کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کے طلوع اور غروب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطنت و مذہب کی باگ ڈور ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ لہٰذا شورش پسند جماعت کو اپنی کامرانی کا موقع مل جانا لازمی تھا۔ حکومت کی طرف سے فرمان جاری ہوا کہ گلیلو بہت جلد اپنے اعتقادات سے دست بردار ہوتے ہوئے معافی طلب کرے اور اقرار کرے کہ اُس کے تمام نظریے غلط اور بے بُنیاد ہیں۔ ورنہ حبسِ دوام کی سزا بُھگتنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس وقت گلیلو کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ عارضی طور پر ہتھیار ڈالدے چنانچہ اس نے اعتراف کر لیا۔ لیکن اُبھرنے والی چیزیں کسی بیرونی اثر سے متاثر ہو کر دب نہیں جاتیں، بلکہ اور زیادہ سرفراز ہوتی ہیں۔ بند لگا کر دریا کی روانی کو روک دیا جاتا ہے، مگر جب پانی کا جوش حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو کوئی قوت اُس کی روک تھام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ہی سال بعد گلیلیو کو دوبارہ موقع

[illegible] سے پھر یہی کہنا شروع کر دیا جس کے کذب و بطل کا اعتراف کیا تھا۔ اس دفعہ دُنیا نے اس کے نظریوں کی قدر کی [illegible] کا طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ سُورج ساکن ہے اور زمین گردش میں۔ نہ صرف یہ بلکہ علمائے مذہب کی جماعت [illegible] کی کوشش کی کہ گلیلو کے نظریے الہامی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں ۔۔۔ مولانا شہاب خدا سنجیدگی سے [illegible] کہ کیا گلیلو میں استقامت نہیں تھی؟

فروری کے ثاقب میں مولانا شہاب کے یہ جُملے قابلِ غور ہیں :۔

"ریاست و سیاست میں بھی جس کے لئے جُھوٹ کو جائز قرار دیا گیا ہے ایسے مردانِ کار کے اسما موجود ہیں کہ گو ان کی غلطیاں غلطیاں ہی رہیں۔ مگر ان کی اپنی "غلطیوں" پر استقامت قابلِ ستائش و پرستش ضرور نظر آتی ہے"

ہر چند حیاتِ انسانی کی یہ وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر اس کی ذہنیت ناقابلِ اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور اس کی ادراک [illegible] کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب وہ غلطی کو سنگِ بُنیاد قرار دینے لگے۔ کاش! مولانا شہاب "سنجیدگی" سے غور کر کے سمجھ لیں کہ جس چیز کو وہ استقامت کے نام سے یاد کر رہے ہیں دراصل ضد اور ہٹ دھرمی کے لفظوں سے موسوم کئے جانے کے قابل ہے۔ استقامت میں اگر صداقت و حقیقت کا جزو شامل نہ ہو تو اُسے استقامت نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ امان اللہ کے مقابلہ میں بچہ سقہ کے اندر زیادہ استقامت تھی۔ لہٰذا مولانا کے مندرجہ بالا جملے اور وہ تمام مثالیں جو انہوں نے اپنے نظریوں کے ثبوت میں پیش کی ہیں بجائے خود رد بن جاتی ہیں اور مجھے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں رہتی۔

نگار جنوری [illegible] میں حسب ذیل سطور ملاحظہ فرمائیے :۔

"میرے کفر و الحاد کے افسانے اب اس حد سے گذر گئے ہیں کہ ان کے متعلق مجھے کوئی عذر پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ لیکن غالباً یہ سُن کر "کافر گر" جماعت کو حیرت ہوگی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ کیا اسلام کا صحیح مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے جو میں سمجھ رہا ہوں"

اِن جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نیاز نے اپنے اعتقادات کبھی تبدیل نہیں کئے۔ البتہ گلیلو کی طرح عارضی طور پر اپنی تحریکات اور اپنے نظریوں کو معرضِ التوا میں رکھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بالفاظِ دیگر ان کا توبہ نامہ بمنزلہ امتحان تانہ تھا جس کو سُن کر [illegible] مولویوں کے سامنے رکھ کر وہ علیحدہ کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آسودگی حاصل کرنے کے بعد وہ خاموش رہتے ہیں یا دوبارہ بھونکنے لگتے ہیں نتیجہ سب پر روشن ہے۔

اگر مولانا شہاب مجاہدہ اور مجادلہ میں امتیاز کر سکتے تو عثمانؓ۔ علیؓ اور حسینؓ کی مثالیں استقامت کے ضمن میں کبھی پیش نہ کرتے۔ ان بزرگانِ دین کی جنگ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ سریر آرائے سلطنت ہونے کی آرزو نے ان کو میدانِ کارزار میں کھینچا تھا۔ کیونکہ مذہب کی حقیقی خدمت اور نظامِ معاشرت کی صحیح اصلاح تختِ حکومت پر متمکن ہوئے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں کسی قسم کے اعتقادات زیرِ بحث نہیں تھے۔ بلکہ تمام نزاع جاہ و ثروت کی تفویض پر تھا۔ آپ مجھے کافر و ملحد کہیں یا بے دین مجھے [illegible] فکر نہیں، بلکہ خوشی ہوگی کہ جنت میں داخل ہونے کے لئے پروانۂ راہداری مل گیا ۔۔۔ جی ہاں یہ حقیقت ہے۔

مخالفین اور نیاز: اکثر حضرات کی رائے ہے کہ نیاز دشمنِ اسلام ہیں وہ تمسخر کرتے ہیں خدا اور رسول کے ساتھ اور مضحکہ اڑاتے ہیں احکامِ مذہب کا۔ لیکن یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور صرف وہ لوگ یہ رائے قائم کرسکتے ہیں جو متعصب ہیں یا نگار کا مطالعہ بذاتِ خود نہیں کرتے۔ ورنہ درحقیقت نیاز صرف ان علماء کے مخالف ہیں جو گندم نما جوفروشی کرتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے نگار میں یہ سطور قابلِ غور ہیں:۔

"جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہیں کہ میرا موضوعِ سخن ہمیشہ علماء سوٗ کا گروہ رہا ہے۔ اور میں نے ان کے حرکاتِ ناشائستہ، ان کے افعالِ ذمیمہ، ان کے افعالِ رکیکہ اور ان کے مشاغلِ سخیفہ کو بے نقاب کرکے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے، ان کی ہستی خدائی لعنت ہے۔ جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصودِ زندگی صرف مکر و ریا سے دولت کمانا ہے۔"

ان جملوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کی تردید کی جاسکے۔ خانقاہوں کی چار دیواری میں مساجد کے مقدس حجروں میں، محراب و منبر کے زیرِ سایہ۔ قرآن و حدیث کی قسم کھا کر، خدا اور رسول کا واسطہ دیکر ریش و بروت کی آڑ میں وہ سب کچھ کرلیا جاتا ہے جس کی توقع ایک بدکار کافر سے بھی نہیں ہوسکتی۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں علماء ہی کی جماعت نے حکومتِ برطانیہ کو دولت کی طمع میں تعویذ دئے تھے کہ سپاہیوں کے بازوؤں پر باندھ دئے جائیں۔ دشمن کی گولیاں اثر نہیں کریں گی۔ انہی نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ فوج میں داخل ہوکر ترکوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیں۔ کانگریسی تحریک کے ابتدائی دور میں اہلِ ہنود کے ساتھ اشتراکِ عمل ناجائز تھا۔ مگر اپنا الو سیدھا کرلینے کے بعد اتحادِ باہمی کے موضوع پر احادیث پیش کرکے اسی ناجائز فعل کو مسلمانوں کے لئے فرض قرار دیدیا۔ یہ وہ حوالے ہیں جن سے کوئی شخص لاعلم نہیں۔ اجتماعی زندگی کو نظر انداز کرکے اگر انفرادیت کے لحاظ سے مشاہدہ کیا جائے تو سینکڑوں ہزاروں ایسی ہستیاں ملیں گی۔ جو نصف شب عبادت کرکے رات کے بقیہ حصہ میں عصمت دری، بادہ نوشی، قمار بازی، ریاکاری اور خدا جانے کتنے افعالِ ذمیم کا ارتکاب کرتی ہیں۔ اور نمودِ سحر سے قبل پھر پیکرِ زہد و اتقاء بن جاتی ہیں۔ لہذا نیاز صرف ان بنیادوں کو متزلزل کردینا چاہتے ہیں جن پر علماء نے نفسانی خواہشات کے قصور تعمیر کئے ہیں۔ نگار بابت جون ۳۰ء کی حسبِ ذیل سطریں شاہد ہیں:۔

"اگر آج کوئی شخص مجھ سے دریافت کرے کہ اصلاحِ ملک و قوم کی بہترین تدبیر کیا ہے تو میں صرف یہی کہوں گا کہ بلاامتیاز و تفریق اس جماعت کے ایک ایک فرد کو منہدم کردینا چاہیئے۔ اور ان کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لینا چاہیئے جس کی بدولت یہ اپنے آپ کو خدا کے بندے کہنے والے اس وقت تک خدائی کرتے چلے آئے ہیں۔"

اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نیاز کی مخالفت درحقیقت کس سے ہے۔ نگار کی گذشتہ چھ جلدوں میں سے ایک جملہ بھی بطورِ حوالہ پیش نہیں کیا جاسکتا جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ نیاز خدا اور رسول کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قوتِ تفہیم سے کام لیکر وہ قرآن و حدیث کی شرح ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں جس سے اسلام کی ضعیفانہ حیثیت معدوم ہوجائے۔ اور یقیناً اس کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اب انسانی ذہنیت معراجِ کمال کو پہنچ جانے کے باعث یہ تسلیم کرلینے سے عاجز ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ اور اس مقصدِ بلند کی تحصیل ممکن نہیں تاوقتیکہ درمیانی رخنہ اندازیوں کو دور

[illegible] بابت ۱۹۲۹ء کی حسب ذیل سطور ملاحظہ ہوں:-

"آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو محض ایک لفظ قرار دے کر اس کو اخوتِ عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے۔ اور موجودہ ضروریاتِ تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصولِ معاشرت و حیات پر نظرِ ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرے کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں"

نیاز ایک صدی بعد:- ہر چیز کا فقدان اس کی اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔ سورج غروب نہ ہو تو اس کی روشنی کی قدر نہیں کی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ مردہ پرستی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ کسی شخص کی صحیح معنوں میں قدر و منزلت نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ اس جہانِ فانی کو خیرباد نہ کہہ دے۔ وہ زندہ شخصیت سے کما حقہ سبق نہیں لیتا بلکہ قبور و مدافن پر کھڑے ہو کر اسلاف کے کارناموں کو یاد کر کے آنسو بہانے کا عادی ہے۔ وہ اقوالِ زریں کو موجودہ ہستیوں کی زبان سے سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ متقدمین کے خیالات کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کا خوگر ہے۔ ہر عہد میں یہی کہا جاتا ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ اچھے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہرینِ فن، حامیانِ علم و ادب اور پیشوایانِ دین و مذہب اپنے دورِ حیات میں محرومِ التفات رہے۔ مگر مرنے کے بعد ان کا احترام کیا گیا۔ لہٰذا اگر آج نیاز کی مخالفت ہو رہی ہے، ان کو مطعون کیا جا رہا ہے ان کی تحریکات کو باطل قرار دے کر ان کی زندگی پر حملے کئے جا رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اہلِ دنیا کا یہی دستور رہا ہے۔ اور قدرت کے اٹل قانون نوعِ انسان کی اسی طرح ہمت افزائی کرتے ہیں۔ لیکن نیاز کی وفات کے بعد ایک زمانہ آئیگا اور ضرور آئیگا جبکہ دنیا اس بڑے کافر و ملحد کے دامانِ خیال پر نماز ادا کر کے اپنے ایمان و اعتقاد کو تشکیک و ارتیاب کی آلودگیوں سے پاک کریگی۔ دیوانِ حافظ کی طرح نگار کے مقدس صفحات فالنامہ کا رتبہ حاصل کر لیں گے۔ اور نیاز کا روضۂ اطہر کم سے کم ہندوستانیوں کے لئے قبلہ نما بن جائیگا۔

مختتمہ:- میرا ارادہ ہے کہ نیاز کی بلند پایہ شخصیت کو زیادہ واضح طور پر پیش کرتے ہوئے بتاؤں کہ علامہ موصوف کے دل میں اسلام کا کس قدر درد پنہاں ہے۔ اور یہ کہ ان کی تحریکات حقیقی صداقت اور خلوص کیساتھ خدمتِ مذہب کے ضمن میں کس قدر مفید اور غیر فانی ہیں۔ لہٰذا جیسا کہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں کہ چند سطور محض برسبیلِ تذکرہ ہیں۔ اور ان کو صرف عنوان سمجھنا چاہیئے اس مستقل مضمون کا جو بشرطِ فرصت کسی آئندہ صحبت میں سپردِ قلم کروں گا۔

شعر دہلوی

جُدائی کی سالگرہ

دیہات کی ایک مہجور سُہاگن کی زبان سے

پیارے ناظم! آج کا دن کس قدر منحوس تھا

اِک برس گُذرا تری فُرقت کے دُکھ سہتے ہوئے
زندگی ناشاد میری رات دن میرے اُداس
سردیوں کی لمبی راتیں کروٹیں لیتے کٹیں
چاندنی راتوں میں کھائے دل پہ تنہائی کے داغ
رنج کی کالی گھٹائیں دل پہ اُمڈیں بار بار
ضِد رہی بَیری پپیہے کو مرے حالات سے
کوئلوں نے مُنہ چِڑایا میری آہوں کا بہت

یہ دن آیا اُف مجھے مَن مار کر رہتے ہوئے
چُٹکیاں لیتی رہی ہر وقت میرے دل میں پاس
گرمیوں کی گرم گھڑیاں داغِ غم دیتے کٹیں
جھلملایا صبح کو اکثر اُمنگوں کا چراغ!
اب کے چَوماسے میں برسی درد و حسرت کی پھُوار
"پی کہاں" سے چوٹ کی ظالم نے پچھلی رات سے
ذکر جھولوں پر رہا میری نگاہوں کا بہت

جب کبھی چرخے پہ بیٹھی دل میں اِک اُلجھن رہی
صحن میں من مار کر بیٹھی جو اِکلانے اناج[1]
ہاتھ پیروں پر مرے افسُردگی طاری رہی
خود بخود آتے ہیں میرے لب پہ درد انگیز گیت

دل رہا بے کیف سا اور مَیں بروگن سی رہی
بے طرح ہنستا تھا میرے حال پر کمبخت چھاج
پیسنے بیٹھی تو چکی کس قدر بھاری رہی
رنج سے معمور یکسر، سوز سے لبریز گیت

آکہ بستی کی فضائیں تیرے بِن سُنسان ہیں
آکہ تیری مُنتظر ہوں مَیں بھی اور احباب بھی
پھر ہوا وٹ پڑ گئی، پھر دب گئی ندی کی ریت
آ پھر اِن رنگیں فضاؤں کو بسا دے پریت سے
پھر محبت سے بسا دے میرے صحن و بام کو

آکہ یہ گلیاں، یہ گھر، یہ صحن و در ویران ہیں
کھیت بھی، کھلیان بھی، چوپال بھی، تالاب بھی
لد گیا سونے کے پھولوں سے ہر اک سرسوں کا کھیت
آ سنا پھر بات کوئی من کی من کے میت سے
پھیر لا پھر ساتھ اپنے گردشِ ایام کو

آہ، اِسی موسم میں بچھڑا تھا، اِسی موسم میں مِل

[illegible] رضا بلوری

[1] اناجوں کو چھاج کے ذریعے الگ الگ کرنے کو "اِکلانا" کہتے ہیں۔

تحصیلدار صاحب کی پہلی کھلی چٹھی کا جواب

[illegible]

[illegible] آپ کی کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر صاحب ساقی جو تم آشنا ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں نے کس قدر شوق سے اسے پڑھنا شروع [illegible] پڑھنے کے بعد مجھے اپنی غلط فہمی کا اعتراف کرنا پڑا کہ جو بات میں آپ کی چٹھی میں دیکھنی چاہتا تھا وہ اس سے اتنی ہی دور تھی جتنی کہ زمین آسمان سے [illegible] چیز کی مجھے اس میں تلاش تھی وہ ہی قدر بے سود تھی جس قدر کہ نیم کے درخت میں انگور کی تلاش۔ میں سمجھتا تھا کہ "شباب و شعر" کے توصیفی [illegible] ہوا اگر معلوم ہوا کہ آپ نے اس بیچارے موضوع کو تنقید کے ٹیک نشتر سے نہیں چھیڑا ہے بلکہ تنقیص کے بھونڈے کلہاڑے سے [illegible] ابھی چٹھی کو پڑھکر مجھے بیک وقت ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ ہنسی تو اس پر کہ آپ نے "شباب و شعر" کی نزاکتِ خیال اور لطافتِ بیان [illegible] اور رونا اس عقل و دانش پر کہ سب کچھ بوجھتے آپ نے خواہ مخواہ اعتراضات کر کے اپنا بھرم کھول دیا۔ نہ جانے کبھی چٹھی پڑھنے کی آنکھ کہاں سے [illegible] ہنسانے کا اچھا سامان پیدا ہو جاتا ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی چٹھی کو ذرا تفصیل سے دیکھوں اور ناظرین کو بھی دکھاؤں کہ آپ نے محض [illegible] کی بنا پر کیسی کیسی لطیف غلطیاں ہوئی ہیں جن کی وجہ دینا صریح ناانصافی ہوگی۔

[illegible] مجھے یہ کہنا ہے کہ "شباب و شعر" دو دستوں کی پرائیویٹ خط و کتابت ہے جس کے متعلق رسالہ ساقی دہلی کے ایڈیٹر نہایت پاکیزہ بات کہی کہ "فنی حیثیت ادبی جواہر ریزوں کا ذخیرہ ہے" ڈی کوئنسی لکھتا ہو کہ کسی زبان کی خوبیاں بلا تصنع اور بیساختہ دیکھنی ہوں تو ڈاک چیز اکر دیکھ لیجئے ان چٹھیوں میں زبان کی خوبیاں بے تکلف معلوم ہو جائینگی۔ "شباب و شعر" میں بھی بیساختہ پن اور لطائف ادبیہ ہیں۔ یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ آپ نے بھی [illegible] اعتراض کیا ہے کہ "عبارت اور تخیل کے اعتبار سے کتنا ہی اچھا ہو۔۔۔" وغیرہ وغیرہ اور ہٹ دھرم نقادوں کی طرح آپ نے ایمان تحمل کر بات نہیں کی [illegible] جب آپ "ہم جیسے پرانے خیال کے مسلمانوں....." الخ کہہ کر خود کو ایک خاص طبقہ سے متعلق کر لیتے ہیں تو آپ کے اعتراف کی اتنی [illegible] نہیں رہتی کہ ذرہ پر سفیدی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں بھی ایڈیٹر ساقی کی طرح اس جملے کو دیکھ کر قلم نہ اٹھاتا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی کھلی چٹھی نے آپ جیسے "پرانے خیال" کے آدمیوں میں "شباب و شعر" کے متعلق ناقص خیالات پھیلائے ہونگے جنکا دور کرنا از بس ضروری ہے اور یہ کوئی خوبی کی بات نہیں ہے کہ کسی چیز کو غلط روشنی میں پیش کر کے اُس کے خلاف بدگمانی پھیلائی جائے۔ ایک چیز اگر آپ کو نہیں بھاتی تو یہ کیا ظلم ہے کہ اُسے آپ اوروں کے لئے بھی ناپسند کرتے ہیں آپ اپنے مذاق کے ذمہ دار ہیں نہ کہ اوروں کے بھی۔ اختلاف مذاق قانون فطرت ہے آپ اتفاقِ مذاق پر مُصر ہیں جو ایک ایسی شدید غلطی ہے جس کے لئے سنجیدہ طبقہ آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ پرانے خیال کے لوگ اگر ایک چیز کو پسند نہ کریں تو انہیں اختیار ہے۔ ترقی خواہ کسی [illegible] میں ہو "نئے خیال" کے لوگوں کی رہین منت ہے۔ زمانہ ہمیشہ نئے خیالات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور پرانے خیال والے صرف پرانی لکیر کے فقیر [illegible] ہیں ان سے اور کچھ بن ہی نہیں پڑتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو تاریخ کے صفحات اُلٹ کر دیکھ لیجئے اس سے آپ کو اسکے کئی ثبوت مل جائینگے کہ "پرانے خیال" ہی راہ ترقی میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوئے ہیں۔ آپ دور نہ جائیں، آپ تو خود "علیگ" ہیں اور غالباً سر سید احمد خاں کی باعظمت شخصیت کی جدید خیالی سے ناواقف نہ ہونگے اور یہ بھی شاید آپ جانتے ہونگے کہ ساری ترقی کے لئے اُن کے نئے نئے خیالوں نے کیا کیا؟ اور "پرانے خیال" کے مسلمان اُس وقت کیا کہہ رہے تھے اور کیا کر رہے تھے؟ اس بحث کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھئے اور پھر اپنی کھلی چٹھی کی طرف توجہ فرمائیے۔

[illegible] اور مسائلِ فلاحی سمجھنے کے لئے نہایت نیک طبیعت درکار جو تعصب اور ضد سے اس طرح خالی ہو جس طرح دلِ عاشق صبر سے۔ خیال [illegible] تعصب ہو کہ اپنے "پرانے خیال" کے آگے "نئے خیال" کی سمائی ہی نہ ہو اُس کا تو بس خدا ہی حافظ ہے ؎

[illegible] نہ ہو شورشِ وحشت سے جو مانوس ذرگی ۔۔۔ دیکھنا پھر بے عبث چشمِ غزالاں کی طرف

[illegible] ایسا گھبرایا کہ نرم دل بھی بھٹکنے لگے۔ نئے خیال سے اس قدر بیزاری کہ بجائے الفاظ کے منہ سے کف نکلنے لگیں [illegible] ایک مضحکہ خیز منظر ہے کہتا ہوں زمین کی آپ سنتے ہیں آسمان کی۔ کوئی بات اور حلقے سخن ہیجئے تو از روئے عقائد اُس پر رائے لگائی جاتی ہے [illegible] اُس کو اسی نگاہ سے دیکھنا اور رائے لگانا مناسب ہے آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ ادب و انشاء کے چند نقروں کو جانچنے [illegible]

پر اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اعتراضات کر کے اُصولی غلطی کی کاش آپ سمجھ سکتے کہ لٹریچر بجائے خود بھی ایک چیز ہے جسکے جوہر پرکھنے کے لئے سب سے پہلے تعصب کی عینک اُتار دینی پڑتی ہے، مذہب و اخلاق کے دبیز پردوں میں بھٹکی ہوئی نگاہ اس کے حُسن تک نہیں پہنچ سکتی۔ کاش اسے آپ کو سمجھا سکتا کہ جب آپ لٹریچر کو اُسکی مکمل عُریانی میں دیکھیں گے تو آپ کو کیا نظر آئیگا؟ یہ چیز بحث یا سمجھانے کی چیز نہیں بلکہ خود دیکھنے کی ہے۔

عوام کی نظر میں خیالاتِ غیر معمولی کا پیدا کرنا معیوب میں داخل ہے۔ ہُوا کرے عوام کو نئے خیالات سے سدا کا بیر ہے۔ لٹریچر میں کبھی اگر کوئی نیا خیال پیدا کیا جائے تو اُسکی طرح بعض حضرات ناراض ہو جاتے ہیں چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ یہ آپ نے کیوں سمجھ لیا کہ "شباب و شعر" میں جو نئے خیالات ہیں وہ آپ ہی کے لئے جمع کئے گئے ہیں؟ دُنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو خیالاتِ نو کے دلدادہ ہیں۔ کیا ایسے سب لوگ کُشتنی ہیں؟ آپ کے خیالات کے مطابق تو ان لوگوں کو زندہ رہنے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں۔

لٹریچر نام ہے نیچر کی صحیح نقاشی کا اور نیچر ہی کی طرح اسکے لاتعداد خوشنما پہلو ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انسان الفاظ میں صاف اور صحیح لکھنا چاہے تو نیچر کے سوا اور کس کی نقل اُتارے؟ نیچر میں حُسن بھی ہے اور قبح بھی بلکہ قبح زیادہ۔ حُسن کا تو ذکر ہی کیا۔ قبح دکھانیوالے کا کمال بھی عیب میں داخل نہیں۔ ولایت میں اچھے لکھنے والے قبح کو بھی بڑی خوبصورتی سے دکھاتے ہیں۔ آپ نے اگر سات سمندر پار کا لٹریچر دیکھا ہوتا۔ تو مجھے اُن کا پتہ بتانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بکیشیو اور رابیلاس سے پوست کندہ حالات لکھنے والے یورپ کی ہر زبان میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ایمل زولا، البسن، طالستائی، موپاساں، آسکر وائلڈ، بائیرن، شیلے اور بے شمار ایسے لکھنے والے گذرے ہیں جنکی دھاک ساری دُنیا میں ہو رہی ہے۔ اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو چیز یورپ میں اظہارِ کمال سمجھا جاتا ہو آپ اپنی زبان میں وہ بات پیدا کرنی عیب کیوں جانیں؟ شاید آپ کو یہ سُن کر بڑی مایوسی ہوگی کہ یورپ کے ناولوں میں جوان عورتوں کی گردن سے نیچے کا حصہ عموماً نہیں چھُپایا جاتا اور نقادانِ ادب (جو یقیناً آپ سے اور مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں) "ہم جیسے پُرانے خیال ۔۔ الخ" کہہ کر اعتراضات کی بوچھاڑ نہیں کر دیتے بلکہ سنجیدگی سے لٹریچر کو لٹریچر کی حیثیت سے دیکھ کر رائے زنی کرتے ہیں اور کمالِ فن کی داد دیتے ہیں۔

یونانیوں نے ہر طرح کے خیالات کی تصویر پتھر میں ایسی بنا کر دکھا دی جو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آسکتی۔ اس میں عُریانی عیب نہیں سمجھی گئی علم الاصنام سے اگر آپ کی طبیعت کو کچھ لگاؤ ہوتا تو یونانیوں کی لطافتِ خیال کی چند مثالیں بھی پیش کرتا اور آپ دیکھتے کہ عورت اور اُسکے متعلقات کو اُنہوں نے کس کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ میرے چند ڈھکے چھُپے فقروں پر آپ نے "صنفِ نازک کی توہین" کا فتویٰ دیدیا۔ اگر یونانیوں کی ان عُریاں مورتیوں کو آپ دیکھ لیں تو کیا کریں؟ مغربی مصوری کے اعلیٰ شاہکار تو "سچے مسلمان" دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ مغربی مصور کی نظر میں حُسن کا بہترین مظہر عورت ہے، اور وہ بھی دوشیزۂ عُریاں۔ یہاں یہ حال ہے کہ آپ کو میرے اِس فقرے پر اعتراض ہے کہ "میں ایک ایسی دوشیزہ دیکھنا چاہتا ہوں جو اپنی جوانی کے بوجھ سے دبی جا رہی ہو" ع:-

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ہماری زبان میں بھی غیر معمولی خیالات پیدا کرنے والے عنقا نہیں ہیں۔ اگر آپ نے اُردو ادبیات کا مطالعہ کیا ہے تو فیصلہ کر سکیں گے کہ بحرِ حقیقت کی مثنوی، داسوختِ امانت، بہارِ دانش، وغیرہ کس نوع کے لٹریچر میں شامل کی جائیں گی۔ ان حضرات کو اپنا اظہارِ کمال منظور تھا، نہ کہ شائستگی کے خلاف تعلیم دینی منظور تھی۔ شیخ سعدی، امیر خسرو، نعمت خاں عالی وغیرہ نہایت پاکیزہ اخلاق کے لوگ تھے مگر از راہِ تفنن اور ہر طرز کے بیان میں اظہارِ قدرت دکھانے کے لئے ایسے کلام بھی کہہ گئے ہیں جن کو معمولی سمجھ کے لوگ شاید اچھا نہ سمجھیں۔

شاعری میں تو آپ نے بہت کچھ اختیار دے رکھے ہیں کہ شیخ و زاہد کی بُرائی بُرائی نہیں سمجھی جاتی جس طرح شاعری میں اظہارِ کمال کے لئے آزادی ہے نثر میں وہی آزادی عیب کیوں ہو؟ اور نثر میں جو آزادی انگریزی زبان میں جائز ہے ہماری زبان میں کیوں ناجائز ہو؟ سب سے پہلے پوچھے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ کاتبِ خط کا اخلاق ایک حد تک گرا ہوا ہے! آپ کے "پُرانے خیال" کے "سچے مسلمان" ہونیکے علاوہ آپ کے کم نظر اور متعصب ہونے کی دلیل بھی ہے۔ حضرت جامیؒ نے اگر زلیخا کے سراپا میں زلیخا کے خط و خال کی تعریف کی تو اسکے یہ معنی نہیں کہ حضرت کسی کے خط و خال پر مرتے تھے، یا شراب کی تعریف میں ظہوری نے اتنا بڑا ساقی نامہ لکھدیا جسکا جواب آجتک نہ ہو سکا تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ظہوری نشۂ شراب میں مست رہتا تھا؎

بیساختہ خوناب جگر آنکھ سے ٹپکا

کم ظرفیٔ دل پر جو ہنسا جام ہمارا

[illegible] کے [illegible]ب

[illegible] ڈاکٹر [illegible] نے اس رسالے میں اُن حالات کا [illegible] کیا ہے جن سے [illegible] ہے۔ ڈاکٹر صاحب [illegible]
[illegible] ماہری [illegible] آپ نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ اگر [illegible] باتوں میں احتیاط کریں تو [illegible]
[illegible] کیا گیا ہے، یہ ہیں: شراب، بسیار خوری، [illegible]، کثرت مجامعت، کثافت، حرص و ہوس، طمع اور غصہ
[illegible] قیمت آٹھ آنے۔ ان سب کتابوں کے ملنے کا پتہ: ڈاکٹر [illegible] اشرف الحق۔ ایم۔ بی۔ سی۔ ایم۔ پی۔ ایڈنبرا۔ ایم۔ [illegible]
[illegible] کالج، حیدرآباد دکن۔

[illegible] کی آپ بیتی

شہرۂ آفاق جرنلسٹ ایم اسلم صاحب مصنف مرزا جی، نرگس وغیرہم کی تازہ ترین و کامیاب ترین تصنیف جو کہنے کو صرف ایک دلچسپ ناول ہے جس میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی خطوں کے ذریعہ اپنی زندگی کے حالات اور تاثرات بیان [illegible] ہے [illegible] ہندوستانی معاشرت سے متعلق کونسا ایسا مسئلہ ہے جس پر لائق مصنف نے پُر مغز بحث نہ کی ہو۔ پُرانی تہذیب و تمدن کی [illegible] روایتوں کو [illegible] کے ہندوستان کی نام نہاد جدید خیال سوسائٹی کا سراب مغرب کے پیچھے بے محل و بے ڈھنگ دوڑ نا کہاں تک عام اپنانے [illegible] منفعت بخش ہو سکتا ہے؟ قومی ترقی میں کون کونسی رکاوٹیں حائل ہیں؟ ہندوستانی لڑکیوں کا موجودہ طریقہ تعلیم اور "پردہ سکول" [illegible] تصحیح اور درستی کے محتاج ہیں؟ زن و شوہر کے تعلقات میں جدید معاشرت کی بدولت کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور اُن میں سے کون [illegible] ہیں؟ پردہ کی "فرسودہ" رسم ملی ترقی کے لئے کہاں تک ضروری ہے؟ جدید نظام معاشرت میں عورتوں کا نمایاں طور پر حصہ لینا کس حد تک [illegible] ہے؟ غرض اس قسم کے ہزاروں اہم مسائل ہیں جن پر عمدہ اور نتیجہ خیز بحثیں کی گئی ہیں اور یہ سب اتنے دلچسپ اور دلنشین انداز میں کہ ایک مرتبہ [illegible] ختم کئے بغیر کتاب کو ہاتھ سے چھوڑنا محال ہے۔ اور چونکہ واقعات خطوں کی صورت میں بیان کئے گئے ہیں اسلئے عام قسم کے قصوں کی [illegible] کامیابی سے قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔

ناظمہ ایک شریف خاندان کی لڑکی ہے، اور ایک ایسے اسکول میں پڑھتی ہے جس کا ماحول سرتاسر سم آلود ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک [illegible] ایک [illegible] ملازم کے چنگل میں پھنس کر اپنی عصمت کھو بیٹھتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی شادی ایک جدید خیال نوجوان سے ہو جاتی ہے جو اُسے [illegible] اپنے رنگ میں رنگ کر آزادی کی نئی راہوں پر چلاتا ہے۔ بعد ازاں خود ہی نئی سوسائٹی کی [illegible] پیچیدگیوں میں پھنس کر اپنی جان سے ہاتھ دھو [illegible]۔ ناظمہ پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ پُرانی تہذیب میں از سرِ نو شامل ہونا ناممکن نظر آتا ہے اور نئی سوسائٹی میں بے عزتی اختیار کئے بغیر [illegible] ہے۔ اُسکے لئے صرف ایک ہی طریقہ کار رہ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ایکٹریس بن جاتی ہے یہاں بھی اُسے چین نصیب نہیں ہوتا۔ بالآخر ہمدردی اور ایثار [illegible] میں اُسے صحیح انسانی جوہر نظر آتا ہے۔ اور وہ اُسکے دامن سے اپنا دامن باندھ لیتی ہے۔

یہ ہے اس دلچسپ اور نتیجہ خیز رُوداد کا پلاٹ جس کے کردار اتنے صحیح اور سچے ہیں کہ واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے [illegible] ہیں۔ ناظمہ کی عبرت انگیز سرگذشت ہر چند محض تخیلی ہے۔ لیکن حقیقت سے اس درجہ لبریز ہے کہ آج ہندوستان کی ہر اُس عورت [illegible] سرگذشت ہو سکتی ہے جس نے ناظمہ جیسے ماحول میں پرورش پائی ہو۔

ظاہری خوبی کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اپنا جواب آپ ہے۔ مجلد منقش۔ زرنگار ٹائیٹل۔ عمدہ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت نفیس۔ ضخامت [illegible]۔ مصنف کی تصویر اور شروع میں پروفیسر تاثیر کی معلومات سے لبریز اور پُر زور تقریب بھی شامل ہے۔
غرض یہ کتاب ہر لحاظ سے کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ خدا کرے لائق مصنف کو اپنے نیک مقصد میں اور اس بلند پایہ تصنیف کو تجارتی اعتبار سے [illegible] ہو۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ) ملنے کا پتہ:۔ پنجاب بک ڈپو۔ لاہور۔

[illegible] لاہور

گلشن علم و ادب کا یہ شگفتہ پھول چمنستانِ علم و فضل لاہور سے فضل حسین صاحب کی ادارت میں نظر افروز ہوتا شروع ہوا ہے۔ پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ مضامین کی بوقلمونی کے اعتبار سے "نرگس" دامنِ باغبان و کفِ گلفروش بنا [illegible] آرٹ کی تصاویر نے صورت نگاہ کا [illegible] بھی سامان بہم پہونچا دیا ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ضخامت [illegible] صفحات۔
[illegible]

ساقی

کا

ظریف نمبر

ایک ایسا زعفران زار ہوگا جسکے ملاحظہ سے آپکے پیٹ میں بل پڑ جائینگے ملک کے مشہور مزاح نگار حضرات کے بہترین مضامین سے اسکے اوراق سجائے جائینگے۔ ضخامت ۵۰ اصفحات قیمت ۱ر مستقل خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائیگا

دلہن کی [illegible] (ازمرزا [illegible])

آپ دولتمند [illegible] سکتے ہیں

ایک شوخ و طرار دلہن کی آپ بیتی [illegible] جس میں کچھ خوف، کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ [illegible] جس میں ہیبت، [illegible] عشرت کی [illegible] تکلی کے منہ پر سے پوشیدہ [illegible]

دنیا میں دولتمند بننے کی تمنا تو ہر شخص رکھتا ہے لیکن [illegible] سے لوگ نا آشنا ہیں۔ اگر آپ دولتمند بننے کے وہ سربستہ راز معلوم کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ ہر شخص دولتمند بن سکتا ہے تو مندرجہ ذیل [illegible] میں رکھیے۔ یہ کتابیں یورپ امریکہ کی صدہا کتابوں کا عطر ہیں۔

معلومات تجارت

اس کتاب میں تجارت کے ذریعہ روپیہ کمانے کی مکمل تعلیم ہے۔ بلا سرمایہ کے تجارت کرنے کے عملی طریقے ہیں۔ یورپ اور امریکہ سے تعلقات پیدا کرنے کے راز ہیں۔ اس کتاب کو خرید کر انسان ایک قلم اور دوات لیکر لاکھوں روپیہ پیدا کر سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

وسائل معاش

جو لوگ گھر بیٹھ کر یا ملازمت کی حالت میں ہزار ہا روپیہ بچے ہوئے وقت کو کار آمد بنا کر پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ اس کو خریدیں۔ یہ کتاب تین سال کی محنت اور تجربوں کا نتیجہ ہے اس کتاب کی تدابیر مصنف کی آزمودہ ہیں۔ اس میں صدہا معاش کے وسائل ہیں۔ قیمت [illegible]

فن اشتہار نویسی

یہ کتاب یورپ و امریکہ کی صدہا کتابوں کی روح ہے۔ اس میں اشتہار لکھنا، اشتہار دینا اور اشتہار کے وہ موثر طریقے درج ہیں جن کے ذریعہ سے لاکھوں روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

اسرار صنعت

یہ ہندوستانی ماہر فن کی تصنیف ہے جس نے اپنے پچاس سالہ تجربات اس کتاب میں درج کئے ہیں [illegible] کاروبار چلانے اور ترقی دینے کے لئے وہ وہ آسان طریقے اور راستے بتائے ہیں کہ غریب سے غریب آدمی بھی تھوڑی محنت اور مختصر سرمایہ سے بہت جلد ایک کامیاب کاروبار کا مالک بن سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

مجموع الصنائع جدید صنعت و حرفت میں لاجواب کتاب ہے قیمت صرف آٹھ آنہ [illegible]

(نوٹ) محصولڈاک ہر صورت بذمہ خریدار ہوگا۔

فن دکانداری

اس کتاب میں کامیاب دوکاندار [illegible] حاصل کرنے کے وہ باتیں بتائی گئی ہیں جن کی مدد سے ایک معمولی دوکاندار چند دن میں بڑا تاجر بن سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

جامع الفنون

ہر قسم کی روشنائی، روغنیات، رنگ، عطر، صابون، ربڑ کی مہریں، مصنوعی جواہرات، ولایتی برف، سوڈا واٹر وغیرہ بنانے اور ملمع کرنے کے طریقے درج ہیں۔ قیمت حصہ اول [illegible] حصہ دوئم [illegible]

مرقع الوان

اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں پورے طور پر رنگوں کی پیدائش، ماہیت اور ان کے بنانے کا پورا پورا حال لکھا گیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو سے زیادہ رنگ بنانے کے دیسی انگریزی یونانی اور جاپانی نسخے موجود ہیں اور شناخت کے [illegible] رنگوں کے نمونے چسپاں کئے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت [illegible]

مالی پریشانی کا علاج

جب تمام معاش کی راہیں بند ہوں نہ آپ کو ملازمت ملتی ہو اور نہ تجارت ہی کی کوئی صورت نظر آتی ہو تو ایسی حالت میں کتاب کو پڑھیے جس کے مطالعہ کے بعد اگر آپ ملازمت چاہیں گے تو ملازمت مل جائیگی تجارت کرنا چاہیں گے تو آپ تجارت کر سکیں گے۔ صنعت و حرفت کا اگر شوق آپ کو ہوگا تو آپ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے چند دنوں میں مالی پریشانیاں دور ہو جائیں گی جس شخص کے پاس یہ کتاب ہوگی انشاء اللہ وہ مالی پریشانی کا کبھی شکار نہ ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ [illegible]

(نوٹ) ایک کارڈ لکھ کر کتب خانہ کی فہرست ذیل کے پتے سے مفت طلب کریجیے۔

ایک ہفتہ میں موٹر چلانا سیکھ لیجیے

اگر آپ موٹروں کو درست کرنا اور چلانا سیکھنا چاہیں اور موٹر کے اس معاملہ میں درجہ کمال حاصل کرنا چاہیں کہ آپ ایک مکینیکل انجینیر سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوں تو **معلم موٹر** مطالعہ میں رکھیے۔ یہ کتاب نہ صرف آپ کو ایک قابل موٹر ڈرائیور بنا دیگی بلکہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے موٹر انجینیر بن جائیں گے۔ موٹر کے علاوہ پرزوں اور انجن کی تصویریں بھی درج ہیں۔ قیمت [illegible]

گھر بیٹھے انجینیری کی تعلیم

حاصل کرنے کے بعد اگر فن تعمیر کا ایک ماہر انجینیر بننا چاہتے ہیں تو آپ چند روز میں فن تعمیر کے کام میں اس قدر ماہر ہو سکتے ہیں کہ بڑے بڑے کامیاب انجینیر حیرت میں رہ جائیں۔ آپ ہر قسم کی بڑی بڑی عمارتوں کے اس فن کے جاننے کے بعد ٹھیکہ لیکر بھی لاکھوں روپیہ پیدا کر سکتے ہیں یہ سب کچھ آپ کو کتاب **فن انجینیری** کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ماہر فن تعمیرات کی رائے یہ ہے کہ آج تک اس سے بہتر کتاب اردو میں اس فن پر شائع نہیں ہوئی۔ اس میں عمارتوں کے ناپ لینے کے قاعدے ہیں اور فوٹوگرافی کی تعلیم بھی درج ہے۔ ہر رنگ و روغن بنانے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ [illegible]

اقسام الطعام شاہجہانی

(معروف) **بخوان نعمت کلاں** جس میں تقریباً سات سو ترکیب ہندوستانی، انگریزی، ترکی، ایرانی کھانے، مٹھائیاں، مربے، اچار، چٹنیاں وغیرہ بنانے کی درج ہیں جو خاص مطبخ شاہجہانی و دیگر بادشاہوں کے باورچی خانوں کے کھانوں کی ترکیب ہیں۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں بہت سے اطبائے یونان کے تیر بہدف مرکبات اور اصلی نسخہ جات صحیح کر دیئے ہیں جن کی خانہ داری میں ضرورت رہتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ [illegible]

[illegible]

جوانی اور شادی ... حاصل کرنی ہوں تو

تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیئے' ان کتابوں ... ادی کی مسرتیں بھی ہیں 'عورتوں کے ... مسخر کرنیکی تدابیر بھی ہیں' اور اس کے علاوہ صحت ا... ستی کے قیام کے اصول بھی ہیں جسکے پاس یہ کتابیں ہونگی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا۔

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد دولہا کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے مواقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجیے شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل نسائیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائیگا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی قیمت عہ جو اس کے منافع پر سو مرتبہ صدقہ ہے محصول ۵ ر

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اس کے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو- اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملک حسن کے باغ پر خزاں چھا جاتی ہے بلکہ غریب الدین کے لئے ان کی پرورش سوہان روح ہوتی ہے اور انسان ازدواجی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے- برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جس کو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کے ساتھ ولادت کی پیدائش تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی قیمت عہ محصول ۵ ر

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا وہ اب عام ہے اس کتاب میں رجوع الشیخ نے لذت شباب کا سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں ہوتی ہیں شاید وہ اس کے پاسنگ بھی نہ ہوں' ارباب مفتش نے عورتوں کے رومانی رنگ سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اس طرح مرد کی قوت پنہانی کو مزید طاقتور کرنے کے لئے نسخے لکھے اور ہزاروں گر بتلائے ہیں اس علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل بیان ہوئی ہیں وہ صد معجونوں لاکھوں مقویات مرکبات سے زیادہ مقوی ہیں قیمت عہ

عورت بالتصویر

پھولوں کی سیج پر حسن کی رعنائیاں دیکھنے سے پہلے محرم ہمز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائے' اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب آپ کتاب عورت پڑھ لیں اس کتاب میں یورپ امریکہ کی بہترین جنسی کتابوں کا عطر کھینچا گیا ہے عورت میں نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم' عورت کی فطرت' عورت کی زینت' عورت کے باغ حسن کی خوشہ چینی غرضکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی بھی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو وہ سو کے قریب عکسی و قلمی تصویریں ہیں قیمت عہ محصول ۶ ر

سہاگن کا سہاگ

سات سہیلیوں کی جو مست اسلامت شباب لذیذ راتوں کی لذیذ داستانیں ان میں سب کچھ ہے جو تخیل کی لذت میں ہو سکتا ہے- سہیلیوں کی پرلطف نوک جھونک محلات لکھنؤ کی خاص زبان سے شب عروسی کی داستان ازدواجی زندگی کے اہم ترین پوشیدہ راز غرضکہ کتاب سہاگن سہاگ دنیائے صنفیات میں اپنے طرز کی انوکھی کتاب ہے جو شادی کے جلسہ میں سات دلہنوں نے بیان کیا- بڑی نایاب اور پرلطف کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ محصول ۵ ر کل عہ

افشائے راز پنہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب وہ ایسی عجیب و غریب آپ نے اس دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب دیکھی نہ ہوگی۔ اس میں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کے حالات خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے امریکہ کی ایک من چلی عورت نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کئے' اور امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی- اب اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے معنا چاہئے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہونے کا خطرہ ہے اس لئے جلدی منگا لیجئے۔

قیمت سوا روپیہ محصول ۸ ر کل عہ

[illegible]

[illegible]

کیف مواصلت

یقیناً آپ شباب اور دنیائے لطف و مسرت اور لذت حیات [illegible] مرد کے لئے عورت سے مواصلت اور [illegible] سرور ہے جس پر دنیا کی بقا کا دارومدار ہے [illegible] دنیا میں ہزاروں [illegible] پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے [illegible] لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گزار لیتے ہیں [illegible] یہ ہے کہ اس لطف پر [illegible] حیات سے [illegible] حاصل کیا جائے جو [illegible] عالم ہے [illegible] یہ کتاب مواصلت کو اس درجہ پر [illegible] لطف [illegible] ہے۔ قیمت صرف [illegible] محصول [illegible]

شب نامچہ عروسی

ایک مست شباب دوشیزہ کا روزنامچہ ہے اور سہاگ کی چند راتوں کا [illegible] کیف انگیز الفاظ میں ذکر کیا ہے [illegible] بھرتے نکتے ہیں۔ یہ صرف چند الفاظ [illegible] کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ازدواجی مسرت کے پوشیدہ و راز اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں۔ اتنی دلچسپ [illegible] معلومات سے پُر شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو۔ شب نامچہ عروسی میں لٹریچر سے پُر کیف گھونٹوں کے ساتھ ساتھ گیارہ [illegible] فوٹو بھی ہیں تاکہ دل و دماغ کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی لطف اندوز ہوں۔ قیمت [illegible] محصول [illegible]

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے پیشتر کیا معلوم کرنا چاہتی ہے شادی کے بعد اس کے لئے کن باتوں کا علم ضروری ہے حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور دوشیزہ کی پُر کیف زندگی سے عیش و مسرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے ان تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملے گا۔ ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ [illegible] کی [illegible] حسین و جمیل تصویروں سے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا ہے۔ قیمت دو روپے [illegible]

دلہن کی ڈائری

ایک شوخ و طرار دلہن کی آپ بیتی، شب [illegible] سماں، کچھ خوف، کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ دولہا میاں کی ہیبت، باغبانِ عشرت کی کلیاں، بے صبری کے جذبات، بیتابی کے مظاہرے، پوشیدہ حالات کا انکشاف خوشگوار دلچسپیوں کا لاجواب مجموعہ۔ قیمت صرف [illegible]

لذت النکاح

زن و شوہر کے تعلقات پر نہایت دلچسپ کتاب ہے جس کو جوانی اور اس کے جذبات کا مکمل کورس کہنا چاہیئے اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دولہن کو کیا کرنا چاہیئے اور لطف ازدواجی تعلقات کا لطف کیونکر بڑھایا جائے۔ قیمت [illegible]

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی شبہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتی ہیں [illegible] کا بیڑہ اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حقوق نسواں پر زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگزشت ہے قیمت [illegible]

قانونِ مواصلت

عیش و نشاط کی زندگی کا رہبر اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آپ کی قوت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھائیں گے۔ اس میں مواصلت کی بابت تمام ضروری باتیں درج ہیں۔ قیمت [illegible]

عہد شباب

نوجوانوں کی رہبر کامل، ناعاقبت اندیشی کے نتائج، قوت رفتہ کی روک تھام، از سر نو اس کی واپسی کی تدبیریں، صنفی قوتیں اپنی حالت پر نہیں رہیں بلکہ اس میں اضافہ کی صورتیں نکالی گئی ہیں۔ طبی ہدایات اور تیر بہدف نسخوں کا لاجواب مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

بہار عروس

یہ وہ کتاب ہے جس کو کجیلہ دلہن نے اپنی [illegible] دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگزشت لکھ کر شائع کی ہے جو کیف چھاپ دی گئی ہیں بڑے بڑے پوشیدہ و دلچسپ آفات ہیں۔ بڑی ہی پُر لطف و مزیدار کتاب ہے ایسی کتابیں کم ہوں گی قیمت [illegible]

ثمرۂ وصال

اس میں خلوت صحیحہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں نہایت اچھا عمل کوک شاستر جو دوسرے کوک شاستروں سے بہت بلند ہے اولاد پیدا کرنے کے لئے بڑے بڑے عجیب طریقے بتائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی خلوت کے طریقے بھی سمجھائے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ [illegible]

دولہا دولہن

یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو اپنی بیوی سے حقیقی لذت حاصل کرنا سکھائے گی اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں ان سے بچائے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مواصلت میں غیر معمولی لذت پیدا ہو جائے گی اس کتاب کی مجرب و زود اثر تدابیر معلوم ہونے کے بعد تمام عمر ممسک اور غذا اور دوسری فضول دواؤں کی ضرورت نہ ہوگی یہ [illegible] جو آپ [illegible]

عیش و نشاط

اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کے لئے وہ تجارب ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد عیش و لطف، کیف، تندرستی، تندرست اولاد، عورت کی محبت اور شادی کی لذتیں چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کی جا سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے [illegible]

زن و شوہر

یہ طلسمی کتاب شادی شدہ نوجوانوں کی زندگی کو راحتوں سے لبریز کر دیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد عورت کی فطرت سے اس قدر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بھوکا نگار رکھ کر بھی خوش رکھ سکتے ہیں قیمت ایک روپیہ [illegible]

مرد و عورت

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آخر عمر تک زوجین تندرست رہیں گے اور انہیں وہ تجربے معلوم ہونگے جن سے شاید اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں۔ قیمت ایک روپیہ [illegible]

میاں بیوی

یہ کتاب دراصل بے تکلف احباب کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے لوگ بے وقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں قیمت [illegible]

نوٹ:۔ ان کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں ہمارے کتب خانہ [illegible] صرف ایک کارڈ آنے پر کفایت روانہ کی جاتی ہیں

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

آج کل مسلمان اپنے مذہب سے بالکل ناواقف ہیں

چونکہ اول تو مسلمانوں کو علوم عربیہ حاصل کرنے کا بہت کم موقعہ ملتا ہے جس سے مذہبی مسائل اور نکات سے واقفیت ہو سکے، دوئم اب تک اردو میں ایسا مذہبی لٹریچر موجود نہ تھا جو اس کمی کو کما حقہ پورا کرتا۔ اس غرض سے مندرجۂ ذیل کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنے مذہب کے نکات اور ارکان اسلام کے تمام مسائل سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکیں۔

عقائد الاسلام

مصنفہ علامہ محمد عبد الحق صاحب محدث دہلوی جس میں مسلمانوں کے عقائد کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور اس فن کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور زمانہ حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر مخالفوں کے شبہات کا محققانہ جواب دیا ہے۔ قیمت علاوہ محصولڈاک عہ

اسلامی تعلیم

فقہ اسلامی کی وہ مستند اور مقبول عام کتاب جو مفتی سید ... نوری نے کمال محنت سے مرتب فرمائی۔ فقہ اسلامی اور آسان طرز ادا میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ جن لوگوں کے پاس یہ کتاب موجود ہے انہوں نے کسی مولوی سے فتویٰ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں اس کا شہرہ ہو گیا۔ اپنی آسانی کے لئے علماء کرام بھی اسے زیر مطالعہ رکھتے ہیں آپ مسلمان ہیں تو مذہب سے واقفیت بھی ضروری ہے اور مذہب کی معلومات کے لئے یہ کتاب ازبس ضروری ہے۔ قیمت مجلد تین روپے محصول ۸؍

فلاح دین و دنیا

ہمارے اسلامی کتب خانہ کی برابر ایک زبردست اسلامی انسائیکلوپیڈیا جو ساٹھ اسلامی ضخیم کتابوں کی روح ہے اور جس میں دس ہزار سے زیادہ دینی اور دنیاوی مسائل ہیں جن میں ایک دنیا اور دین دار کی دنیاوی اور دینی ضروریات کی ایسی کوئی معلومات نہیں ہے جو موجود نہ ہو۔ یہ کتاب ہندوستان جیسے غریب ملک میں بھی بیس ہزار روپے سے زائد کی فروخت ہو چکی ہے اس میں نہایت مکمل دینی تعلیم ہے جس گھر میں یہ کتاب ہے وہاں ایک زبردست عالم، ایک زبردست دنیادار اور ایک دانشمند فلاسفر موجود ہے۔ قیمت مجلد چار روپے محصول دس آنہ ۱۰؍

مذہبی معلومات

نئی روشنی کے ایسے لامذہب درسگاہیں جو اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں، لیکن اسلامی تعلیم سے ناواقف ہیں اور جب ان سے مذہب کی ناواقفیت کا سبب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اردو میں ایسی کوئی کتاب ہی نہیں جو ہم کو مطمئن کر سکے اور کم سے کم وقت میں ہم زیادہ معلومات حاصل کر سکیں ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ مذہبی معلومات کا مطالعہ کریں جو تمام اسلامی تعلیم کی روح ہے جس میں صدہا مسائل درج ہیں جن کے معلوم کرنے کے لئے علماء کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اس کتاب کو تجارتی اغراض کے لئے خواہ مخواہ ضخیم نہیں بنایا گیا۔
قیمت صرف بارہ آنہ ۱۲؍

تفسیر سورہ یسین

یہ تفسیر اس زمانہ میں لکھی گئی ہے جو کہ بغاوت و طغیانی کا زمانہ ہے اور قدم قدم پر مذہب کے لئے عقلی دلائل مانگے گئے ہیں یہ تفسیر اس لحاظ سے بہت شاندار ہے کہ ہر بات کو معقول طریقہ پر سمجھایا ہے۔ یہ تفسیر علامہ عبدہ مصری کی تفسیر القرآن سے ماخوذ ہے اور ایسے عجیب و غریب پیرایہ میں مذہب کے اعمال کو ذہن نشین کیا گیا ہے کہ بالآخر ملحد بھی ایمان لے آتا ہے صرف تفسیر کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر بہت اہم ہے اور ایک ایک واقعہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے گویا بہت سی تفاسیر کا عطر ہے اس کتاب میں نفس رسالت پر بھی بہت ہی پر لطف بحث ہے قیمت

البیان فی علوم القرآن اردو

اس کتاب میں اسلام کے ہر مسئلہ کو مدلل پیرایہ اور فلسفیانہ رنگ میں لکھا ہے اور غیر مذاہب کے مسلّمہ شبہات اور فرقہ باطلہ کی مکمل تردید آپ اسی کتاب میں ملتی ہے مصنفہ مولانا عبد الحق صاحب حقانی دہلوی حجم ۴۶۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

تسخیر القلوب

کیا کوئی دل ہے جس پر آپ قابو چاہتے ہیں، وہ کسی کا دل ہو کسی کا ہو مرد کا ہو یا عورت کا ہو، خاوند کا ہو بیوی کا ہو حاکم کا ہو دوست کا ہو آشنا کا ہو چھوٹے کا ہو یا بڑے کا ہو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آپ اس پر قابو حاصل کر لیں گے اگر آپ تسخیر القلوب منگا کر جو اس میں لکھا ہے اس کے عامل بن جائیں احباب کا مسخر کرنا زن و شوہر کا میلاپ کرنا آقا و افسر پر قابو پانا مقدمات کا حسب منشاء فیصلہ کرانا اس کتاب کے عامل کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصول ۳؍

سیرت باقی

سالار نقشبندیہ حضرت خواجہ غریب نواز حضور خواجہ باقی باللہ رضی اللہ عنہ بخاری کی مفصل مشرح سوانح عمری حضرت خواجہ کے تمام خلفاء کا تذکرہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی روحانی تعلیم تزکیہ نفس کے سہل طریقے مجرب المجرب ورد و وظائف حضرت خواجہ غریب نواز کی صوفیانہ قرآن حکیم کی تفسیر پڑھنی چاہتے ہو تو سیرت باقی کا مطالعہ کرو جس کے مصنف جناب پیرزادہ سید عزیز حسن بقائی دہلوی ہیں قیمت ۸؍ محصول ۳؍

تذکرۃ الاولیائے ہند اردو

کفرستان ہند میں سات سو اولیائے ہند تو ایسے ہیں جن کا حال اس کتاب میں ہے جس میں حالات و کرامات کے ساتھ اقوال نادر کا وہ خزانہ بھی شامل ہے جو شائد کہیں اور نہ ملے یہ کتاب اپنی جگہ خود صاحب تصرف ہے کیونکہ ایک ہندو پریس نے اس کو پہلے پہل چھاپا اور اس کتاب کے ذریعہ مالا مال ہو گیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے مطالعہ گذرے گی تو ان کے دل و دماغ معرفت الٰہی سے منور ہوں گے قیمت للعہ

فالنامہ ناصری

ہر کام شروع کرنے سے پہلے احسن طریقہ ہے کہ استخارہ کر لیا کریں تاکہ اس کا انجام اگر شکست ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے اس میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب استخارہ قرآنی کا ترجمہ ہے اور اس کے علاوہ قرآۃ الانبیا فالنامہ پیغمبران فالنامہ اولیائے کرام، فالنامہ غوث الاعظم، فالنامہ دیوان حافظ فالنامہ مثنوی شریف شامل کر دیا ہے، یہ فالنامہ بہت ہی قابل ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصولڈاک ۳؍

ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

تفسیر حقانی اُردو کامل آٹھ جلد

(مصنفہ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی ابو محمد عبد الحق صاحب حقانی محدث دہلوی)

یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں چھپی ہوئی ہے جس میں مذاہب کے حالات اور عالم آخرت کے اسرار اور قرآن شریف کی مصطلحات کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ تفسیر مع اصل متن مستند و معرکۃ الآرا مشہور تفسیر ہے پچاس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خلائق ہے۔ اس تفسیر کی مختصر خوبیاں یہ ہیں کہ مخالفین اسلام کے جملہ اعتراضوں کا محققانہ مدلل پیرایہ میں جواب دیا گیا ہے۔ اس تفسیر سے معمولی اُردو داں سے لیکر متبحر عالم تک مستفید ہوتے اور بچے بوڑھے جوان مرد و عورت سب لوگ پڑھ سکتے ہیں، طلباء اور علماء کے لئے اس تفسیر میں علمی مباحث کے وہ دریا بہائے گئے ہیں جن کی شناوری ہر مباحث و مناظر کے لئے ضروری ہے علم تصوف و مسائل روحانیت کو ایسا کشف فرمایا ہے کہ ذوق سلیم رکھنے والا صوفی منش انسان مستفید ہو جاتا ہے۔ اصل کا اصلی متن جلی قلم اور صحیح تفسیر اردو عام فہم نہایت سلیس با محاورہ روایات صحیح ربط آیات ترتیب شان نزول ساتھ ساتھ قصص و واقعات جملہ مسائل وغیرہ سب باتیں اس تفسیر میں درج ہیں۔ اگر آپ فی الحقیقت عالم، واعظ، محقق، مناظر و صوفی بننا چاہتے ہیں تو تفسیر حقانی ملاحظہ فرمائیے جس کی مجموعی قیمت چوبیس روپے علاوہ محصول ہے، اور ہر جلد کی علیحدہ علیحدہ قیمت یہ ہے پہلی جلد دو روپے باقی دو سے آٹھ جلد تک فی جلد چار روپے علاوہ محصول ڈاک کے۔ اگر ڈاک کے ذریعہ منگاتے ہیں تو فقط محصول ڈاک خرچ ہوتا ہے اس لئے ریل کے ذریعہ منگائیے۔ پانچ روپے پیشگی آنے پر روانہ کی جائیگی۔

معلومات نماز

اس مختصر رسالہ کے ساتھ بالکل نئے انداز میں نماز کو بہترین عبادت ثابت کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں نماز پڑھی جائے تو وہ انسان کو بہترین انسان بنا دیتی ہے۔ عنوان چند یہ ہیں۔ مذہب اسلام، عبادت، حکمت الکلام عبادت کے منافع، ثمرات عبادت، ثمرات دنیا، ثمرات آخرت، تارک نماز، فضیلت نماز، نماز کے طبی فائدے امتیازی عبادت، مقصد نماز، نفلی عبادت، نماز کے وقتوں کا قرآن سے ثبوت، بے نمازیوں کی کہانیاں، نماز قرآن میں، اس کے بعد تمام نمازوں کا بیان ۶۰ صفحات قیمت صرف آٹھ آنہ ۸/

اسلام کے سو سپاہی

یہ مفید اور اہم کتاب مصنف کی تاریخ بینی کا نتیجہ ہے کہ جس وقت وہ اپنے سحر طراز قلم سے اسلام کے بہادر سپاہیوں کے محیر العقول فیاضانہ کارنامہ کو بیان کرتے ہیں تو بزدلوں کے دل میں بھی اسلامی بہادری کا بھولا ہوا سبق رسم بن جاتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں میں اتحاد کی ایک غیر فانی لہر پیدا پیدا ہو جائیگی وہ خانہ جنگی کے طوق لعنت کو گلے سے اتار کر پھینک دیں گے قیمت آٹھ آنہ ۸/

پیام خیام

خمکدۂ تصوف کے چھلکتے ہوئے ساغر آج ہی نہیں چھ برس سے بادہ کشان تصوف کے لئے کیف اندوز ہیں آج وہ نئے ساقی کے ہاتھ سے تقسیم ہو رہے ہیں۔ یہ خیام کی رباعیاں اور ان کی دلنواز شرح ہے، مشرق کے اس سب سے بڑے فلسفی نے ایک ایک رباعی میں پوری کائنات تصوف بھر دی ہے اور صحیح معنوں میں کوزہ میں دریا بند ہیں۔ خیام کی رباعیاں وہ رباعیاں ہیں جن کی ہر ولایت میں شوق کی نگاہوں نے تاکا اور وہ متوکا نیا ہوئیں کہ ہر زبان میں فن کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ یہ کتاب اُردو کی سب سے پایہ شرح اور سب سے زیادہ تصاویر میں قیمت ۴/

عملیات

اس وقت تک عملیات کو غیر مستند کتابوں نے بدنام کر رکھا تھا، اس کتاب میں سو سے زیادہ ایسے مستند اعمال، اشغال اور عملیات ہیں جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے زیر عمل رہے ہیں۔ اس میں فن کی حیثیت سے عمل پڑھنا نقش لکھنا اور تمام اعمال کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں قیمت تین روپے

حکایات الصالحین اُردو

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی عمدہ عمدہ حکایتیں ہیں۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

خواب نامہ صدیقی

آپکے خواب کی تعبیر کیا ہے، یہ بات دریافت کرنے کیلئے آپ کس قدر مشوش رہتے ہیں۔ جب آپکے گرد و پیش کوئی صحیح تعبیر بتانے والا نہیں ملتا اول تو لاکھوں میں کوئی ایک آدھ ایسا کامل ہوتا ہے جو صحیح تعبیر کر سکے اس لئے اگر آپ خواب کے مضر و مفید اثرات معلوم کرنا چاہیں تو خواب نامہ صدیقی پاس رکھئے اس میں خواب کی قسمیں تالی خواب تعبیر خواب دنوں کے اثرات پیٹ کی خرابی فلسفہ خواب اور خواب کے متعلق صدہا مضامین ہیں قیمت چھ آنہ

درس معاشرت

یہ ناز انشاء پرداز کے زیر سیت عبرت خیز دلچسپ اور سبق آموز افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے ہر ایک افسانہ اسلامی طرز معاشرت کی بولتی تصویر ہے افسانہ کے پیرایہ میں مسلمانوں کی نہایت موثر الفاظ میں اصلاح رسوم کی اصلی تعلیم دی گئی ہے کسی مسلمان کا گھر اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت صفحات قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے صرف آٹھ آنہ رکھی گئی ہے۔

سیّدہ کا لال

اس شاہ ٹریجڈی علامہ راشد الخیری کا لکھا ہوا شہادت نامہ جس کے فرضی اصلاحی قصے پڑھنے سے دل ہل جاتے ہیں اور سیدنا امام حسین علیہ السلام کا واقعہ شہادت تو اپنی جگہ خود ہی بیحد الم انگیز ہے اب تصور کیجئے کہ یہ درد انگیز حالات جب مولانا کے قلم سے لکھے گئے ہوں تو ہے کوئی سخت سے سخت دل انسان جو اس کا دعویٰ کرے اس کتاب کا ایک ہی باب بلا روئے پڑھ لیگا۔ یقین فرمائیے کہ خونریزی کربلا پر یہ کتاب پہلی اور آخری ہے جو شخص بلا روئے کتاب ختم کرے وہ دام واپس لے لے قیمت ڈیڑھ روپیہ محصول ۷/

یُوسف و ناہید

اسلامی تاریخ کا ایک درد انگیز واقعہ جس میں مسلمانوں کی سرفروشی کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی بھی داستان ہے اس سے دلچسپ ناول شاید ہی آپ کی نظر سے گذرا ہو قیمت

کلید مراد

دُعائیں مانگنے اور مرادیں حاصل کرنے کے طریقے، کلام اللہ اور احادیث سے اخذ کر کے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

ملنے کا پتہ: مکتبہ خانہ علم و ادب بازار چتلی قبر والان دہلی

آپ کی دعائیں قبول نہیں ہوتی

اس لئے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقے اور آداب سے ناواقف ہیں اگر آپ دعا مانگنے کے طریقے سے واقف ہوجائیں تو آپ کی دعا قبول ہوگی اور ضرور ہوگی اس لئے کہ قرآنی دعائیں پڑھئے اس کتاب کے پڑھنے اور عمل کرنے کے بعد بے اولاد صاحب اولاد بن جاتے ہیں غریبوں کو افلاس سے نجات مل جاتی ہے مقروض قرضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں۔ ہدیہ آٹھ آنہ ۸/

آپ سے کون خفا ہے؟

کون منانے سے نہیں منتا! آپ کسے اپنا مطیع اپنا فریفتہ اپنا دیوانہ بنانا چاہتے ہیں، وہ کوئی عورت ہو مرد ہو کوئی بوڑھا ہو کوئی آقا ہو کوئی حاکم ہو آپ کا مطیع و مسخر ہوسکتا ہے اگر آپ اس عجیب و غریب طلسمی کتاب عمل تسخیر کو ملاحظہ کریں، اور اس کی ہدایتوں پر عمل نمایئں اس عمل کی ترکیب نہایت آسان ہے قیمت آٹھ آنہ

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آتا ہے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے ... میں صرف تین چھوٹے چھوٹے لفظ یاد کر کے شعر میں ... جس بحر کی تقطیع کرلو۔ بس اگر آپ شاعر بننا چاہتے ہیں تو

فن شاعری منگائیے قیمت ۸/

بیاض ... علم مجلسی کے پانچویں حصہ میں غزلیں ہیں یہ وہ غزلیں جو ہزاروں لاکھوں میں انتخاب کی گئی ہیں۔ قیمت ۸/

تسخیر ... دلوں کو مسخر کرنے والے اخلاق و آداب سکھانے والی کتاب قیمت آٹھ آنہ ۸/

... تقریر اور گفتگو کرنے کے مفید اصول ۸/

تربیت ... بچوں کو بُری عادتوں سے بچانے اور اُن کے اخلاق و عادات پر ایک عمدہ کتاب۔ قیمت ایک روپیہ

فرض ... عورت پر بیوی بننے کے بعد جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا بیان۔ قیمت ۸/

... کرسی کے فضائل و اعمال ۸/

... مفید و دلچسپ

صدائے مومن

مسلمانوں کو خدا ترس، پابند مذہب بہادر طاقتور، تعلیم یافتہ، باکار اور باعمل مسلمان بنانے والی اصلاحی کتب۔ قیمت ۸/

تصویر معاشرت دو نہایت مفید عبرت خیز اخلاقی افسانے قیمت ایک روپیہ ۱/

زندگی کی صبح و شام دس دلدوز انگیز اخلاقی داستانیں قیمت ایک روپیہ ۱/

پتھر سے ہیرا قصہ کے پیرایہ میں تبلیغ قیمت ۸/

قتل بہرام۔ ایک پُر اسرار قتل کے حیرت انگیز حالات ۹/

لیلائے نجد۔ ایک نہایت دلچسپ رنگین افسانہ ۸/

دو درویش۔ دو فقیر درویشوں کی نہایت دلچسپ سرگذشت ۸/

تصانیف مصور غم علامہ راشد الخیری!

آمنہ کا لال۔ اُردو زبان میں سیرت شریف کی مستند کتاب ۸/

سیدہ کا لال۔ شہادت کی مفصل و مکمل تاریخ اور مراثی کربلا ...

صالحات۔ ایک لڑکی کے حالات بطرز ناول اُردو ...

شب زندگی۔ اصلاح نسواں کے سلسلہ میں مشہور و مستند کتاب قیمت ...

نسوانی زندگی۔ چار سبق آموز و نتیجہ خیز افسانے قیمت ۸/

جواہر قدامت دو بہنوں کی جگر خراش کہانی قیمت ۸/

طوفان حیات شرک قبر پرستی پیر پرستی رسوم کی پابندی کے خلاف معرکۃ الآرا تصنیف قیمت ایک روپیہ ۱/

تمغہ شیطانی سلت نہایت دلچسپ کیرکٹر صدرہ دلآویز نتیجہ خیز ...

ستونتی ایک شریف بیوی کا قصہ جو اپنے کارناموں سے حیرت میں ڈالیگی

مودوہ محروم وراثت لڑکی کا درد و غم بھرا سبق آموز قصہ ۸/

انگوٹھی کا راز۔ دو مختلف الخیال لڑکیوں کی دلچسپ کہانی ۸/

تفسیر عصمت خلع وارتداد پر مثل فسانہ پُر مذاق نصیحت خیز ۵/

منازل ترقی۔ ترقی کی دھن، لیڈری کے شوق اور دولت کی نشہ میں انسان کیا کر بیٹھتا ہے قیمت ۲/

بیچہ کا کرتہ ایک عاشق زار بدنصیب ماں کی ناکام محبت ۲/

ڈیڈیا کی سرگذشت یورپین میاں بیوی کے تعلقات کا ہو بہو فوٹو کھینچ دیا ہے۔ قیمت ۲/

بیلا میں میلہ غدر کی ماری شہزادیوں کے جگر دوز نالے با تصویر

جوہر عصمت۔ ۱۳ سبق آموز درد انگیز نتیجہ خیز افسانے ۸/

سیلاب اشک۔ ۵ نہایت دلدوز سبق آموز عبرتناک فسانے ہر افسانہ باتصویر۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲/

طوفان اشک۔ ۱۲ دل ہلا دینے والے موثر افسانے ۸/

روداد قفس۔ ۵۵ درد انگیز نظمیں جن کا ایک ایک شعر کلیجہ پارہ کرتا ہے

گرفتار قفس۔ اس وقت تک کی نظموں کا مجموعہ ۲/

نوبت پنج روزہ۔ یادگار ظفر بہادر شاہ دہلی کے پانچ دن اور غدر کے حالات۔ قیمت ۸/

ولایتی نخمی۔ نہایت ہی پُر لطف قصہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ قیمت صرف چھ آنہ ۶/

نانی عشو۔ اس قدر دلچسپ افسانہ کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہ چاہے

الامین کا دم واپسیں۔ زبیدہ خاتون کے تخت جگر شہزادہ امین الرشید کا دردناک قتل قیمت ۲/

قلب حزیں۔ ۳۰ دلآویز مختصر مضامین نظم کا نثر ۸/

وداع خاتون۔ محترمہ خاتون اکرم کی جوانمرگی پر ... ۵/

گلدستہ عید سبق آموز افسانوں اور مضامین کا مجموعہ خاص رمضان اور عید کی کتاب قیمت ۸/

شہید مغرب۔ طرابلس، مراکش اور ہندوستان میں مسلمانوں کی خون کی ندیاں۔ قیمت ۸/

عروس کربلا میدان کربلا کے دردناک حالات ناول کے پیرایہ میں

در شہوار۔ ایران سیستان اور زندران کی لڑائیوں کا ہولناک مجموعہ ... خیز طرابلس کے مسلمانوں کا جوش ایمانی

راہب کی سیاہ کاریاں قیمت دو آنہ ۲/

منظر طرابلس۔ مذہبی پیشوا کے سیاہ اعمالنامے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں مسلمانوں کی فتوحات ۸/

شہنشاہ کا فیصلہ۔ عہد عباسیہ بغداد کا دلگداز فسانہ ۲/

سودائے نقد۔ جوان لڑکی کی شادی کر دینے کے دردناک نتائج ۵/

[illegible]

تصانیف قاری سرفراز حسین عزمی

طوائفوں کی پراسرار زندگی کے زیر سے خبردار کرنیوالے نہایت دلچسپ اخلاقی ناول جن کو پڑھ کر نوجوان لڑکے سمجھنے ہو جاتے ہیں، بزرگ اپنی بے راہ رو اولادوں کی اصلاح کر سکتے ہیں، بیویاں خاوندوں کی بے ترجہی کے اسباب سمجھ جاتی ہیں اور رنڈیاں نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں یہ آٹھ ناول ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

شاہد رعنا - ایک ڈیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱۸/
سعید ایک مسلمان اور پاتر کے حسن و عشق کی داستان ۸/
سعادت - دہلی کی ایک مشہور تعلیم یافتہ طوائف کے نہایت دلچسپ حالات - قیمت آٹھ آنہ ۸/
سراب عیش - طوائف سے نکاح کرنیکے عبرتناک نتائج ۸/
سزائے عیش - ایک شریف گھرانے اور ایک طوائف کے گھر کا موازنہ ۸/
انجام عیش - پاکیزہ زندگی اور آوارگی کے مختلف پہلو ۱۱/
بہار عیش - ایک ڈیرہ دار طوائف کی توبہ ۸/
خمار عیش - قیمت آٹھ آنہ ۸/

تصانیف ضیاء الملک ملا رموزی

شفاخانہ - ملا رموزی صاحب کے ان دلکش مضامین کا مجموعہ ہے جس میں بخار، کھانسی، زکام، مراق، آپریشن، غنودگی اور درد دل کے عنوانات سے ان امراض پر وہ ہنسانے والے مضامین ہیں جو اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتے - گلابی اردو کا دیباچہ خاص چیز ہے صفحات ۲۰۰ ۱۴/

عورت ذات - یہ کتاب ملا رموزی کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ محققانہ اور علمی ظرافت کا نمونہ ہے اس میں تمام دنیا کی بیویوں کے مقابل ہندوستان کے کل طبقات کے میاں بیوی کے مکمل حالات اس انداز سے لکھے ہیں کہ پڑھیے اور حقیقی ظرافت پر وجد کیجیے صفحات ۳۰۴ قیمت ۱۸/

لاٹھی اور بھینس غم افسردگی رنج اور پریشانی کو دور کرکے مسرت خوشی اور لطف سے بھر دینے والی کتاب - ملا رموزی نے جو بھینس خریدی ہے اس کا تفصیلی قصہ ہے جس میں عورتوں کی عجیب و غریب زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے صفحات ۱۴۲ - قیمت ۱۲/

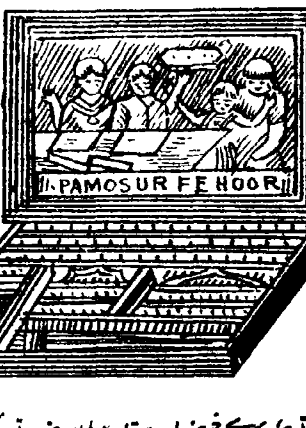
زندگی رنج و غم دور کرنے مسرت و شادمانی پیدا کرنیوالی کتاب ۱۲/

ان کے علاوہ

جملہ تصانیف - سر سید، مولوی ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ سر اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مرزا سجاد بیگ دہلوی، مولوی نذیر احمد، مولوی بشیرالدین احمد، خلیق دہلوی، فراق دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، ملا رموزی، نیاز فتحپوری، منشی پریم چند، سید غنی، عظیم بیگ چغتائی، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، سید ظہور احمد، علامہ مضحک دہلوی، شوکت تھانوی، انصار ناصری ایم اے، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مولوی عبدالحلیم شرر اور **جملہ مطبوعات** انجمن ترقی اردو، دار المصنفین، مکتبہ جامعہ ملیہ، ساقی بک ڈپو، کتبخانہ رحیمیہ، مطبع مجتبائی دہلی، لکھنو، کانپور، لاہور، مصر وغیرہ غرضیکہ مشہور مصنفین کی تمام مستند، عربی، اردو، فارسی وغیرہ کتابیں ہم سے بکفایت مل سکتی ہیں - ہمارے کتب کی فہرست مفت طلب کیجیے -

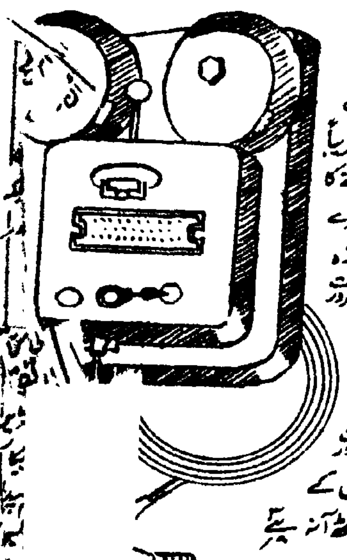
منیجر کتب خانہ علم و ادب دہلی

انگریزی حروف کا پاکٹ پریس



فی زمانہ خواہ کوئی کاروباری ہو یا شوقین ہر شخص کا خیال ہوتا ہے کہ اپنے نام کی مہر ضروری ہونی چاہیے، لفافہ کارڈ بھی چھپا ہوا ہونا چاہیے مگر یہ سب سامان چھپوانے میں دقت ہوتی ہے اور خرچ زیادہ ہوتا ہے، ان ضرورتوں کو یہ پاکٹ پریس پورا ہو سکتا ہے اس کے حروف خوبصورت اور صاف ربڑ کے بنے ہوئے ہیں جو برسوں کام دیتے ہیں - پریس نمبر ا جس میں چھوٹے بڑے حروف مع ہندسے کے ساڑھے تین سو ہوتے ہیں - مع ضروری سامان کے ۱۲/

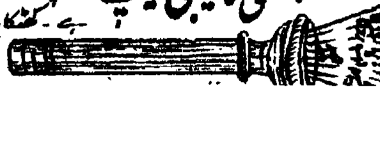
نو ایجاد گھنٹی



یہ خوشنما، پائیدار گھنٹی حال ہی میں آئی ہے، جس میں تقریباً دس گز لمبا تار اور گھنٹی بجانے کا ربڑ کا آلہ لگا ہوا - گھنٹی اپنے کمرے میں لگا دیجیے اور آکر باہر دروازہ پر آنیوالے کو چیخنے پیٹنے کی ضرورت نہیں صرف ربڑ کا آلہ دبانے سے گھنٹی زور سے بجنے لگیگی - یہ ہر شخص کے لئے کارآمد چیز ہے اور اس گھنٹی میں نہ بجلی کی ضرورت نہ بیٹری کی باوجود اتنی خوبیوں کے قیمت صرف تین روپے آٹھ آنہ ۱۳/

بجلی کا جیبی لیمپ

- یہ نہایت خوبصورت اور بڑا اچھی لیمپ ہے - کھٹکا دباتے ہی فوراً بجلی کی روشنی پیدا ہو جاتی



ڈیٹ پرنٹر یعنی تاریخ چھاپنے کی مہر

اس مہر میں تاریخ، مہینہ اور سنہ وغیرہ تراشہ

"SAQI"



بیکار لمحات

Calcutta Art Press, Delhi

جُرعات

جلد ۹ — ساقی دہلی - بابت مئی سنہ ۱۹۳۴ء — نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"نگاہِ اولیں"

ساقی کی زیرِ نظر اشاعت میں نواب نصیر حسین خاں صاحب خیالؔ کی کتاب "داستانِ اردو" کا ایک ورق اس لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے کہ انشا پردازی کے ایسے عمدہ نمونے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ حضرت خیالؔ صاحب طرز ہیں اور آپکی تحریر اسقدر دلاویز ہوتی ہے کہ خشک سے خشک موضوع میں بھی داستان کا لطف آتا ہے۔ جناب مظفر حسین شمیم کے ہم شکر گذار ہیں کہ آپکی وساطت سے یہ انمول موتی ساقی کے صفحات کو مزیّن کر رہے ہیں۔

اکثر ناظرینِ ساقی کو اصرار ہے کہ علم و ادب کے ساتھ ساتھ اگر مذہب کا بھی کچھ سلسلہ ساقی میں رہے تو دنیا کے پہلو بہ پہلو دین کا چرچا بھی ہوتا رہیگا۔ ہم ساقی کو مذہبیات سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اسکے پڑھنے والوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ مذہبی مناقشات سے اب تک ساقی کو بچایا گیا ہے اور آئندہ بھی ہماری کوشش اسی باب میں ہوگی۔ تاہم اگر کوئی معقول و ناقابلِ اعتراض مضمون بغرض اشاعت موصول ہوگا تو شائع کر دیا جائیگا۔ بیدینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے عمدہ مذہبی مضامین کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے مضامین شاہجہاں کے لئے فراہم کئے جاتے ہیں۔ شاہجہاں تنقیدی پرچہ ہے اس لئے علم و ادب کی تنقیدوں کے ساتھ مذہبیات پر بھی اس میں تنقیدیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جن حضرات کو مذہبی مضامین کا شوق ہو شاہجہاں کا نمونہ منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔ نمونہ مفت بھیجا جائیگا۔ زیرِ نظر اشاعت میں "صدائے حق" کا مضمون لائقِ غور ہے۔ پیرایۂ بیان سلجھا ہوا ہے اس لئے اس میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں اُن کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جناب محمود مورخ کا مضمون مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کا دردناک مرقع ہے۔

اس پرچہ میں جناب میرزا یگانہ کا مکتوب اور چند رباعیات شائع کی جارہی ہیں۔ اسے اُن اعتراضات کا جواب سمجھیے جو علامہ مضحک دہلوی نے ساقی کی گذشتہ اشاعت میں کئے ہیں۔ ناظرینِ ساقی خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میرزا صاحب کی نظم و نثر میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔ "ترانۂ یگانہ" پر جناب منظور حسین ماہر القادری کی تنقید بھی اسی اشاعت میں شامل ہے ہم اس سلسلۂ تنقید کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے اس لئے ساقی میں مخالف و موافق مضامین آئندہ شائع نہیں کئے جائینگے اگر ضروری سمجھا گیا تو شاہجہاں میں یہ بحث چھیڑی جائیگی۔

"سالنامہ" اور "ظریف نمبر" کے بعد ساقی کا تیسرا خاص نمبر "افسانہ نمبر" ہوگا۔ صحافتِ اردو میں افسانہ نمبر اسقدر عام ہوگیا ہے کہ اس میں اب کوئی جدّت باقی نہیں رہی۔ رسالوں تک تو خیر غنیمت تھا لیکن چند منچلے ایڈیٹروں نے اپنے اخباروں کے ایک ہی سال میں آٹھ آٹھ اور دس دس افسانہ نمبر شائع کرکے اسکا کھوجڑا ہی کھو دیا۔ ساقی کے افسانہ نمبر کے لئے ایک نئی تجویز سوچی گئی ہے جسے ابھی ہم ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ ناظرینِ ساقی منتظر رہیں آئندہ اشاعت میں اسکا تفصیلی اعلان شائع کیا جائیگا۔ فی الحال صرف اسقدر کہا جاسکتا ہے کہ ساقی کا افسانہ نمبر صحافتِ اردو میں اپنی طرز کا پہلا پرچہ ہوگا۔

شاہد

"SAQI"



جل پریاں

"داستانِ اُردو کا ایک ورق"

(از ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی)

نواب خیال جس دودمانِ عالی کے چشم و چراغ ہیں وہ دو سو برس سے گیسوئے اُردو کی شانہ کشی میں مصروف ہے، یہ خانوادہ بجائے خود اُردو کی ٹکسال ہے، اور اس ٹکسال کے ڈھلے ہوئے سکّے آج اُردو بازار میں بے لاگ چل رہے اور مُنہ مانگے دام پا رہے ہیں۔ نواب صاحب جن محفلوں کو دیکھ اور برت چکے ہیں اُنہیں دیکھنے والی آنکھیں بھی اب مشکل ہی سے دکھائی دیتی ہیں اور وہ بھی آج کل میں بند ہونے والی ہیں، یہ جناب جو اُردو لکھ رہے ہیں وہ محض اُردو نہیں بلکہ اردوئے معلّیٰ ہے، ہر لفظ ایک نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر جڑا ہوا ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند کا عالم پیدا کر رہا ہے نواب صاحب جن موتیوں کو رول رہے ہیں اُن کے پرکھنے والے جوہری بھی اب خال خال ہی نظر آتے ہیں چنانچہ اُمید نہیں کہ خاکدانِ ہند سے آئندہ کوئی ایسا آسمان جاہ ادیب اُٹھے گا یا اِس ہنو سواد میں پھر کوئی ایسا مینا نگار پیدا ہوگا۔ حق یہ ہے کہ یہ مینا نگاری اور مرصع کاری اسی کی ذات پر ختم ہوئی۔ وجہ اس کی ظاہر ہے جس چمن کا یہ طائر چمن زاد ہے اُس کی بہار گردشِ روزگار کے ہاتھوں خزاں ہوگئی، اور جس بازار کا یہ بے بہا گوہر ہے وہ فلکِ کج رفتار کے ہاتھوں تاراج ہوا۔ جس کارواں کا یہ کارواں سالار ہے وہ مغربی تہذیب کے طوفانِ بدتمیزی کی لپیٹ میں آکر کب کا لٹ چکا اور اب یہ یوسفِ بے کارواں محض کاروانِ شوق سے منزل کی طرف قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے۔

اِس افراتفری کے زمانہ میں جبکہ ہر تُک بند گویا شاعرِ شہیر اور ہر دو چار سطر غلط سلط اُردو لکھنے والا ادیبِ لبیب ہے نہیں کہا جا سکتا کہ "داستانِ اُردو" ایسی متاعِ گراں مایہ کی کیا قیمت لگائی جائیگی؟ تاہم اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ نواب خیال جس رنگ کو نبھا رہے ہیں اُسے نبھانے والا اب پورے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا، اس وقت جو اُردو کی اُجڑی ہوئی محفل میں کچھ رونق سی نظر آتی ہے وہ نواب خیال کے دم سے ہے اور خیال کے بعد یہ بات بھی خواب و خیال ہے! ع

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

مظفر حسین شمیم (رائے پوری) از دہلی۔

بنام خدائے زباں آفریں

عجائبات عالم میں سے عجیب تر اُس کا وہ حصّہ ارضی ہے جسے ہم آریاورت[1] یا مُلک ہند کہتے ہیں! اس زمین کی ہمیشہ سے یہ شان رہی کہ اس کا کوئی خطّہ کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل سے کبھی بھر پُر نظر نہ آیا۔ سارے جہان کی نیرنگی و رنگینی سی ایک باغ کے اندر سمٹ کر چلی آئی، دُور دراز زمینوں کے بیج لا لا کر یہاں ڈالے گئے، اور سات سمندر پار کے تازہ قلم یہاں لگائے گئے۔ بھانت بھانت کا جانور اِس وحش خانہ[2] ورمنہ میں بولا اور چہکا۔ اُن کے زمزموں نے دُنیا کے کان کھڑے کر دیئے، اور اُن آوازوں پر بے چین دل اِدھر متوجّہ ہو گئے۔ اِس باغ کی اسی روش نے اُسے ایسا سدا بہار بنا دیا کہ بیرونی دُنیا آج تک اُس پر مٹی ہوئی، اور یہاں کی خاک سُرمہ کشِ دیدۂ شوق بنی ہوئی ہے!

غیر آریا

Non-Aryans

غیر آریا۔ باغِ ہند، چمنستانِ عالم کا ایک نمونہ[3] ہے، مگر کھُلتا نہیں کہ اول کس آدم نے اس زمین پر قدم رکھا، جس کی برکت سے ہندوستان، جنّت نشان مانا گیا؟ یہ بہت بعد کی حکایتیں ہیں کہ اس ارضِ پاک کی عالمگیر شُہرت نے دُنیا کو اس طرف کھینچا اور یہاں کی خاک پر اُن کے سروں کو جھکوا دیا!

اُن خوش نصیب اقوام میں سے اوّل اوّل جن قوموں نے اِدھر آجانے کا شرف حاصل کیا وہ تین مختلف نسلوں کی یادگار تھیں جو یہاں کے تین مشہور دروازوں سے اندر داخل ہوئیں۔

اوّل۔ تبّتی برمی (Tibeto-Burman) شمال و مشرق سے ہمالہ[4] کی سفید چوٹیاں پھاندتے ہوئے اِدھر آئے اور اب بھی اُس کے دامن میں پھیلے ہوئے، اور ہماری مشرقی حد سے بھی کچھ آگے نکل گئے ہیں۔

دوم۔ کولاری (Kolarians) یہ بھی پُوربی کونہ سے آئے اُسی لیک پر چلے، بنگالہ پہونچے اور پھر (مشرقی) دکھن کی طرف اُتر گئے۔

سوم۔ دراویدی[5] (Dravidians) اُنھوں نے شمال و مغرب (بابُ الہند) سے سر نکالا، پنجاب میں ڈیرا ڈالا۔

---

[1] آریا۔ بزرگ، ورت۔ مسکن۔ یعنی آریوں کا گھر۔ آریاورت۔ ہندوستان کے شمالی حصّہ کو۔ پنجاب سے لیکر مگدھ دیس (موجودہ بہار) تک کہتے تھے۔ پھر بنگالہ فتح ہوکر آریاورت میں مِل گیا۔ اور اٹک (انڈس) سے برہم پُتر تک سب ایک تھا۔ [2] وحش خانہ۔ وہ جگہ جہاں قسم قسم کے جانور رکھے جاتے ہیں۔ انگریزی میں اُسے زُو کہتے ہیں۔

[3] دُنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس عالم میں الگ الگ جو کچھ ہے وہ سب اِس وسیع زمین میں موجود ہے۔

[4] ہمالہ، سنسکرت میں برف کے ڈھیر (تُودہ) کو کہتے ہیں۔

[5] دراویدیوں اور ان کی زبان کا ذکر دوسرے دور یعنی دکھن اور مہاراشٹری کے حال میں آئیگا۔

اور بعد کو کنارِ سمندر کی ہوا کھاتے اِٹھلاتے، (مغربی) دکھن پہونچے۔ اور آخر اُس کی انتہا یعنی راس کماری (کیپ کومرن) تک پھیل گئے۔ یہ قومیں یہاں کے دیسیوں[1] (Aborigines) سے ملیں اور پھر اُن پر کچھ اس طرح چھائیں کہ دیسیوں اور پردیسیوں کی پہچان نہ رہی۔ اور آخر اُن کُل قوموں کا ایک ہی نام یعنی غیر آریا پڑ گیا۔ اور وہ آج تک اسی نام سے مشہور ہیں۔

غیر آریا زبان۔ زبانیں انسان کے اور حرکات وسکنات کی طرح خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ اندرونی تحریکوں سے اُبھر[2] کر مُنہ سے کچھ نکل جانا فطرت ہے۔ اور اسی کچھ نکل جانے کا نام بولی ہے۔ اسی فطرت کو پراکرت کہتے ہیں۔ اس لئے ایسی بولیوں کو بھی پراکرت یعنی فطری بات کہنے لگے۔

پراکرت، انسان کا جوہر ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ فطرت نے یہاں کے دیسیوں یا اُن غیر آریوں کو ایسی نعمت سے محروم رکھا ہو۔ نہ ایسا ہوا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا۔

غیر آریا انسان بھی نطق سے خالی اور اظہارِ مطالب سے عاری نہ تھا۔ وہ مسافر جب اِدھر آیا تو اپنی پراکرت کا توشہ[3] بھی ساتھ لایا، جسے یہاں کے دیسیوں کے آگے بھی رکھا۔ اور اُن کی جھولیوں سے جو کچھ نکلا وہ اُن پردیسیوں کے نذر ہوا۔ اس طرح دونوں کا پیٹ بھرتا اور کام چلتا رہا۔

جن ایامِ جاہلیت کا یہ ذکر ہے اُس وقت کی دُنیا ہی اور تھی۔ ایک اس زمین پر منحصر نہیں، سارے جہان کا یہی نقشہ تھا کہ جس جتھے اور جس خیل کو جہاں جو جگہ بھا گئی اُتر پڑا اور ڈیرے ڈال دئے اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا کر رہنے لگا۔ غیر آریا بھی یہاں اسی طرح بسے۔ اس تقسیم نے اُنہیں توڑ دیا، اور پھر اُن کی زبان کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔ اور آخر ایک بولی سے رنگا رنگ بولیاں پیدا ہو کر یہ باغ ایک اچھا خاصہ وحشی خانہ بن گیا!

یہی بولیاں اُن کی بھاکھا[4] کہلائیں، اور یہاں اکاس بیل کی طرح چھائیں۔ آریوں کی سی زبردست قوم اور اُنکی دیوبانی[5] زبان (سنسکرت) بھی ان بیلوں کو چھانٹ نہ سکی۔ وہ اس زمین پر پھیلتی جڑ پکڑتی اور قسم قسم کے پیوند کے سہارے چڑھتی اور پھولتی پھلتی رہیں!

غیر آریوں کا تمدّن۔ یہ زمین ایک مُدّت تک ان غیر آریوں کا گھر بنی رہی۔ ممکن نہیں کہ اپنی آسائش کے رستے اُنھوں نے نکالے نہ ہوں۔ مگر زمانہ اور حکمران قوم (آریا) کی سختیوں نے اُن کے تمدّن کے آثار مٹا ڈالے۔

---

[1] دیسی، اس عام لفظ کو ہمنے خاص معنوں (یعنی یہاں کے اصلی وقدیم باشندے) میں لے لیا ہے۔

[2] اُبھرنا، ہندی ہے۔ یعنی سخت مجبور ہو کر۔

[3] مسافر گھر سے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی جو چیزیں لیکر نکلتا ہے اُسے توشہ کہتے ہیں۔

[4] اُن کی بھاکھا (بولی) کو شروع میں، پہاڑی، کولاری، تبتی وغیرہ کا لقب دیا گیا۔ مگر زمانہ کے ساتھ نام اور ان بھاکھا کے حالات بدلتے رہے۔

[5] دیوبانی۔ زبانِ الٰہی، کلامِ ربّانی۔

خمیازہ

بڑی اُمنگ سے چھیڑا تھا تم نے ساز مرا
بڑے مزے سے سُنا نغمۂ نیاز مرا

عجیب شے تھی مگر سادگی محبت کی
کہاں ہے، آہ! وہ ناآگہی محبت کی

خبر نہ تھی تمہیں انجامِ کار کیا ہوگا
مآلِ جراتِ بے اختیار کیا ہوگا

اب اجتناب ہے تمکو مری محبت سے
گریز کرتے ہو تم میرے دل کی وحشت سے

ہوا ہے یوں بھی کبھی جانِ من زمانے میں
یہ رنگ بھی ہی وفا کے کسی فسانے میں

یہ ربط ہائے دلِ آویز جاودانی ہیں
تعلقات محبت کے غیر فانی ہیں

فنا پذیر نہیں التہابِ عشق مرا
خموش ہو نہیں سکتا ربابِ عشق مرا

یہ ساز چھیڑ دیا ہے تو اب سنو اسکو
نہیں طلب نہ سہی، بے سبب سنو اسکو

تمسخرِ حیات

پیاری تسلیمہ! تمہارا محبت نامہ بالکل غیر متوقع طور پر ملا۔ میں سمجھتی تھی کہ جس طرح تمام دنیا نے مجھ کو فراموش کر دیا تم بھی مجھے بھول گئی ہو۔ مگر نہیں میرا خیال غلط نکلا۔ ابھی تمہارے دل میں میری یاد باقی ہے۔ جب سے میری زندگی کے المناک ڈرامہ کا آخری پردہ گرا ہے۔ روزانہ اس قدر خطوط آتے ہیں کہ میں ان کو پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہوں۔ جواب کسی کو نہیں دیتی۔ اور جواب دوں بھی تو کیا۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی درد بھری داستان سے دوسروں کا دل دکھاؤں۔ تم نے بھی اپنے خط میں وہی استفسار کیا ہے جو اس سے قبل دوسرے لوگ کر چکے ہیں۔ تم میری رفیق نہیں ہو میری شریکِ غم ہو۔ اس لئے میرا حق ہے۔ کہ اپنے دکھے ہوئے دل کے تاروں میں لرزش پیدا کر کے تمہیں وہ نغمہ سناؤں کہ ایک دفعہ تم بھی دل تھام کر بے چین ہو جاؤ۔ میرے ساتھ تم بھی تڑپنے لگو۔ شاید اس ہم آہنگی سے میرے قلبِ حزیں کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔

تم اظہارِ تعجب کرتی ہو کہ میں نے اپنے خاوند سے طلاق کیوں طلب کی؟ وہ کونسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں نے اس سے علیحدگی اختیار کرنی گوارا کر لی؟ ہاں بے شک تمہارا اور دوسری ناواقف ہستیوں کا استعجاب حق بجانب ہے۔ تمہارے پیشِ نظر تصویر کا صرف ایک رُخ رہا ہے۔ جہاں تک تمہارے علم کا تعلق ہے۔ میرا شوہر نہایت نیک شریف اور خوش خو تھا۔ اور بحالتِ موجودہ میں خود ہی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ جدائی اس کے لئے بہت شاق گذری ہے۔ اس فراق سے جو صدمۂ عظیم اُسکو پہونچا اور پہونچ رہا ہے مجھے اس کا بخوبی احساس ہے۔ مگر ساتھ ہی میں اس درد میں ایک لذت محسوس کر رہی ہوں۔ بظاہر میں خوش ہوں۔ میرے چہرے سے رنج والم نمایاں نہیں ہوتا اور شاید اسی لئے میرے خویش و اقارب میرے طریقۂ کار کو مذموم قرار دیکر مجھے مطعون کر رہے ہیں۔ لیکن کون جانتا ہے کہ میرے لبوں سے بلند ہونے والا ہر قہقہہ گرم آنسوؤں کے آغوش میں تخلیق پاتا ہے۔ میں ہنستی ہوں مگر میرا دل روتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے سکون کی زندگی بسر کرنیکے لئے طلاق حاصل کی ہے حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ میں ایک اضطرابِ مسلسل کی متمنی تھی جس کی تحصیل صرف اسی طرح ممکن تھی۔ میرا طریقۂ کار خواہ کتنا ہی قابلِ ملامت کیوں نہ ہو۔ مگر میری نگاہ میں اس کا درجہ عبادت کی حد سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کر کے میں نے اپنے جذبۂ انتقام کو سرد کیا ہے۔

تم حیران ہوگی کہ یہ کیا اسرار ہے۔ مگر یہ عقدۂ لاینحل نہیں۔ میں ابھی اس راز کو منکشف کئے دیتی ہوں، لیکن اس کو اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہر چند میں اپنے شوہر کو چھوڑ چکی ہوں، مگر اس کی شخصیت کا احترام میرے دل میں باقی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ میری روح کے علاوہ میرے جسم کا بھی مالک رہ چکا ہے۔ میں نے سینکڑوں راتیں اُس کی آغوش میں بسر کی ہیں۔ مجھے ان امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

وہ بُرا ہے تو ہوا کرے۔ میں اُسے بدنام کرنا نہیں چاہتی۔

بہن! میری المناک داستان کو سُننے سے قبل میری سابقہ پنج سالہ زندگی پر نظر ڈالو۔ تم کو معلوم ہے کہ ہماری شادی بہ تقاضائے محبت تھی۔ ارشد غیر نہیں بلکہ خالہ زاد بھائی تھا۔ ہم دونوں ساتھ کھیلے، ایک ہی فضا میں پل کر جوان ہوئے۔ محبت کا ہو جانا ممکن بلکہ ایک حد تک یقینی تھا۔ ہماری شادی ہوئی اور خوشی کی زندگی ہم ایک دوسرے کے آغوش میں بسر کرنے لگے، میری بعض سہیلیاں رشک کرتی تھیں۔ مگر مسرت کے لمحے سریع الزوال ہوتے ہیں جوانی کی تیز اور تند شراب جب تک پُر جوش رہتی ہے۔ انسان اُس سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ مگر دُنیائے شباب کے ایک مخصوص حصۂ چمن سے کافی عرصہ گلچینی کر لینے کے بعد مرد کی طبیعت بھر جاتی ہے، پھر وہ اپنی زندگی میں ایک زبردست انقلاب چاہتا ہے۔ اُس کی آرزو ہوتی ہے کہ کائنات کا ہر ذرّہ ویسا ہی نظر آئے جیسا ابتدا میں نظر آتا ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ دوبارہ وہی ماحول پیدا ہو جائے۔ وہ ایک بار پھر اسی فضا میں سانس لینے کا متمنی نظر آتا ہے۔ اِس جدوجہد میں وہ ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اُس کی سابقہ زندگی میں وجہِ مسرّت بنی تھیں۔ وہ اُن سے مُنہ موڑ کر دوسری طرف دل لگا لیتا ہے۔

اب سے پانچ سال قبل میرا عالمِ شباب تھا اور میں ارشد کی نگاہ میں رعنائیِ نسائیت کی جمیل ترین تصویر تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر جیتا تھا۔ مجھ سے ایک لمحہ کی جُدائی اس کے لئے ہزار سال کے برابر تھی۔ شادی کے ایک سال بعد گُلِ مراد کھلا اور اُس کے ساتھ ہی میری تمام جاذبیت جسنے ارشد کے دل کو موہ رکھا تھا مائل بہ تنزّل ہو گئی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بقائے نسل کا عملی پہلو صنفِ نازک کے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ اور میں کامل وثوق کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر قدرت اس فرض کی انجام دہی عورت کی طرح مردوں پر بھی عائد کرتی تو یقیناً ان کی تمام رعنائیاں بھی انحطاط پذیر ہو جاتیں، تاہم میرا دعویٰ ہے کہ اُس صورت میں عورت ذات کبھی مرد کو اپنی نظر سے نہ گراتی، عورت ضعیف العقل سہی مگر ضعیف القلب نہیں ہوتی۔ اس کے جذبات میں دریا کی روانی تو ہوتی ہے مگر وہ ہر ڈھلان کی طرف اپنا رُخ نہیں بدلتے۔ برخلاف اس کے مرد کے جذبات ہر نشیب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اُس کی خبیث ذہنیت قدم قدم پر اس کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ اور شاید یہ صنف خدا نے بھی جس کی عظمت کو "الرّجال قوّامون علیٰ النساء" کہہ کر بڑھا دیا ہے — اس طریقۂ کار کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ارشد کی عادت میں ایک انقلاب رُونما ہو رہا ہے۔ اُسکی آنکھیں بدل چکی تھیں، وہ مجھے رفیقِ حیات نہیں بلکہ محض شریک خانہ تصوّر کرنے لگا تھا۔ میری ذمہ داری صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ میں ایک انّا کی طرح اُسکے بچّوں کو پالوں — مرد — ناانصاف مرد — عورت کے جذبات کا خون کر کے اپنی نسل کو بڑھاتا ہے۔ سوسائٹی کے بنائے ہوئے ناقص قوانین باپ کی موجودگی میں ماں کو اولاد کا وارث قرار نہیں دیتے، کیا یہ حق تلفی نہیں ہے۔ جبکہ افزائش نسل کے سلسلہ میں عورت زیادہ خدمات پیش کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان آئے دن ناچاقی رہنے لگی، اُن کے یار دوست سلامت رہیں وہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر اپنا جی

بہلا لیتے تھے۔ مجھ دُکھیاری کیلئے کوئی ٹھکانا ایسا نہیں تھا جہاں دو گھڑی ہنس بول کر اپنا دل ٹھنڈا کر لوں۔ شریف عورت کے لئے دُنیا کی تمام وسعتیں گھر کی چار دیواری میں محدود ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی آڑ لے کر اُسے ایک قید خانہ میں محبوس کر دیا جاتا ہے ـــــ یہ ہے دُنیا اور اُس کے معاشرتی اصول ـــــ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ارشد کی توجہ اب کسی اور ہستی کی طرف مبذول ہونے لگی ہے۔ اس کا دل ـــــ پتھر کا بنا ہوا غیر حساس دل ـــــ ہمیشہ اپنے اندر ایک تغیر پذ نما دیکھنے والا ہرجائی دل ـــــ کسی دوسرے معبود کی پرستش میں محو ہو چلا ہے۔ میں نے کوشش کی، اور پتہ لگا لیا۔ دل میں صحیح تجسس ہو تو ہر چیز کا سراغ مل جانا یقینی ہے۔ میں نے اس ضمن میں چند گناہوں کا ارتکاب بھی کیا۔ خدا مجھے معاف کرے، میں نے اپنے خاوند کے پوشیدہ خطوط کا مطالعہ کر لیا۔ اُس ہستی کو بھی تصویری مرقع میں دیکھ لیا جو میری رقیب بن رہی تھی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ عذرا ـــــ ارشد کی خالہ زاد بہن۔ مجھ سے زیادہ حسین۔ تعلیم یافتہ اور فنونِ لطیفہ کی ماہر تھی۔ اپنے خاندان میں وہ پہلی لڑکی تھی جس نے موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ نہایت کامیابی کے ساتھ انٹرنس تک تعلیم پائی۔ تاش۔ چوسر۔ شطرنج اور دیگر گھریلو کھیلوں میں اُسے کافی ملکہ تھا، اور انہی بساطوں پر فرصت کے لمحات گذارتے ہوئے اُس نے تعشق کی ابتدائی منزلوں میں قدم رکھا۔ ارشد گانے کا دلدادہ تھا۔ شطرنج کی وحشت تھی پھر کیوں نہ اُس کا دل وہاں لگ جاتا۔ دفتر کے اوقات کے علاوہ اُسکے بیشتر لمحات عذرا کی صحبت میں گذرنے لگے۔ وہ آزاد تھی۔ آزاد خیال تھی، والدین کے احکام کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے ہر اُس فعل کو جائز رکھتی تھی جسے اُس کا دل گوارا کرے۔ اس کے پندار میں والدین کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اولاد کے طریقۂ کار پر حرف گیری کریں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ دونوں مل کر سینما بھی جانے لگے عشق و محبت کی اُس رنگین فضا میں سانس لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی ایک ایسے لائحۂ عمل کی آرزو کرنے لگے جس کے مطابق اُن کی زندگی یکسر رومان بن جائے جس میں ان کی ہستیاں ہیرو اور ہیروئن کے روپ میں جلوہ گر ہوں۔ سو یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جب دو دل راضی ہوں تو دُنیا کی بڑی سے بڑی رُکاوٹ درمیان میں حائل نہیں ہو سکتی۔ محبت کے رشتے جوڑ لئے گئے۔ ان واقعات کو مدِنظر رکھکر کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ عذرا حسین تھی۔ حسین وہ ہے جس کے افعال حسین ہوں۔ ظاہری صورت کی زیبائشیں اور خدوخال کی رعنائیاں غیر حقیقی اور بے بنیاد ہوتی ہیں۔ ان نقوش کو ایک مصوّر اپنے موئے قلم سے صفحۂ قرطاس پر ایک بُت ساز آہنی نشتروں سے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں پر پیش کر سکتا ہے، اگر خوبصورت بلوری جام میں زہر بھرا ہو تو اُس جام کی وقعت بھی کم ہو جاتی ہے۔ دور اندیش ہستیاں اس کو ہاتھ لگانے سے احتراز کرینگی اسی طرح اگر عورت کے جذبات میں اندازِ انسانیت کا فقدان ہے تو اُس کا حسن و جمال جاذبِ نظر ہو تو ہو مگر قابلِ وقعت نہیں۔ وہ ٹھکرا دینے کے لائق ہے۔ عذرا ـــــ گرگ خصال عذرا ـــــ اپنے پیکرِ جمیل میں سمِ قاتل لئے ہوتے تھی مگر ارشد اس چیز کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے اُس کی منت سماجت کی۔ اُس کے آگے ہاتھ تک جوڑے کہ کسی طرح وہ اپنی روش کو تبدیل کر دے۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ میری نصیحتوں کا اُس کے دل پر الٹا اثر ہوا۔ بسا اوقات اُس نے رات کو بھی گھر آنا

ترک کر دیا۔ میں تھی، میرے بچے اور گھر کی تنہائی۔ دُنیا کی موجودہ تہذیب صفحۂ عالم سے مٹا دینے کے قابل ہے جس کی رُو سے ہر مرد کو اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہے اور جس عورت سے چاہے دل لگائے۔ اُسے بُرا کہنے والا کوئی نہیں۔ برخلاف اس کے عورت کی نگاہ اگر غلطی سے بھی کسی غیر مرد پر پڑ جائے تو سب اُسکو مطعون کرنے لگتے ہیں۔ اُسے ننگِ خاندان تصوّر کیا جاتا ہے۔ مرد ایک وقت میں چار شادیاں کر سکتا ہے۔ لیکن عورت بیوہ ہونیکے بعد دوسری شادی کرے تو اُس کے فعل کو جائز قرار دینے کے باوجود معیوب سمجھا جاتا ہے آخر کیوں؟ مرد کس لحاظ سے عورت سے افضل ہے؟ میں نے ارشد کی خوشامد طرح طرح سے سمجھایا۔ اپنے گذشتہ عہد و پیمان کی یاد دلائی۔ دیرینہ محبّت کا واسطہ دیا۔ مگر بے سود۔ بعض دفعہ وہ جھنجھلا کر بے تحاشا زدوکوب کرنے لگتا تھا۔ میں روتے روتے بے ہوش ہوجاتی اور اُس کے دل پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ یوں میرے لئے ہر طرح کا آرام تھا۔ خدمت کے لئے نوکر چاکر تھے۔ اچھے سے اچھا لباس عمدہ سے عمدہ کھانا۔ روپے پیسے کی تنگی نہیں تھی، مگر یہ دنیوی چیزیں قلبِ حزیں کو سکون عطا نہیں کر سکتیں۔ عورت کسی اور ہی چیز کی متلاشی ہوتی ہے۔ وہ آرزومند ہے کہ مرد کا محبّت بھرا ہاتھ اُس کے دل کو سہارا دے۔ میری عزیز ترین چیز مجھ سے چھینی جا رہی تھی۔ دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی۔ عورت دُنیا کے تمام مصائب و آلام برداشت کر سکتی ہے مگر اُسے یہ گوارا نہیں کہ کوئی دوسری ہستی اُس کے خاوند کی محبّت میں شریک ہوجائے۔ سوکن کا جلاپا مشہور ہے۔

اسی رنج و غم نے مجھے بیمار کر دیا۔ پہلے معمولی بخار ہوا۔ پھر بڑھتے بڑھتے مستقل عذابِ جان بن گیا۔ میں چاہتی تو بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلا کر مشورہ لے سکتی تھی۔ قیمتی دوائیں علاج کے لئے خرید سکتی تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ میں اپنی بیماری کا سبب سمجھتی تھی۔ طبیبوں کا علم حشر جذبات سے پیدا ہونے والے سوز کا علاج نہیں کر سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے۔ مگر باتوں کا زخم نہیں بھرتا۔ میں نے کسی طبیب سے مشورہ نہیں لیا۔ کوئی دوا طلب نہیں کی۔ اپنے غم میں اندر ہی اندر گھلتی چلی گئی۔ میں خدا سے دعا کرتی تھی کہ ایک دن صرف ایک دفعہ ارشد اپنی زبان سے محض اتنا پوچھ لے کہ "تمہاری طبیعت کس طرح ہے؟" اُس کے لبوں سے نکلا ہوا ایک لفظ میرے مرض کی مسیحائی کرتا۔ اُس کا استفسار باعثِ شفا بن جاتا۔ مگر نہیں۔ خدا نے ——— ظالم خدا نے ——— میری آرزو پوری نہیں کی۔ سلیمہ پیاری سلیمہ! تم مجھے گمراہ کہوگی۔ میں خدا کی جناب میں ایسے سخت لفظ استعمال کر رہی ہوں۔ لیکن اگر تم میری جگہ ہوتیں تو تمہاری زبان سے بھی یہی کلمات نکلتے، اس افسردگی کے ماحول میں رہ کر ہر شخص مرتد ہوجائیگا۔ وہ مذہبی معتقدات ٹھکرا دینے کے قابل ہیں۔ جو عملی زندگی میں ہمارے کام نہیں آتے۔ ارشد رات کو دس گیارہ بجے آتا۔ گھر کی ملازمہ میرے مرض کی کیفیت اس کے سامنے بیان کرتی۔ وہ نہایت لاپرواہی سے ایک کان گونگا اور ایک بہرا کرکے واقعات کو سُنتا مگر کچھ اثر نہ لیتا۔ وہ ایک رات بھی میرے کمرے میں نہ آیا۔ اُس کا ایک نظر مجھے دیکھ لینا کافی تھا۔ کاش وہ یہی اندازہ لگانے کے لئے دیکھ لیتا کہ یہ کتنے عرصہ میں مرجائیگی۔ یقیناً میری زندگی ایک خار بن کر اُس کی نگاہ میں کھٹک رہی تھی۔ سمندر کی موجوں کے مانند مرد کی فطرت میں نشیب و فراز ہوتا رہتا ہے۔ مشترکہ دورِ حیات کی ابتدا میں میری اُنگلی کے اندر چبھنے والی پھانس اُسکے دل کو بے چین کر دیتی تھی، اور اب میرے مسلسل بہنے والے

آنسوؤں سے وہ کوئی اثر نہ لیتا تھا۔

میری بعض سہیلیوں اور رشتہ کی بہنوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ارشد سے طلاق حاصل کرلوں۔ ایسی ہستی کے ساتھ زندگی وابستہ رکھنا بیکار ہے جسے اپنی شریک حیات کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ اور یقیناً یہ امر ارشد کے لئے بھی باعثِ مسرّت تھا۔ وہ بخوشی مجھ سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے تیار ہوجاتا۔ اُس کو میرے وجود سے کوئی تکلیف تھی یا نہیں۔ مگر مجھ سے وابستگی اُس کے لئے بارِ خاطر ضرور تھی۔ میری طبیعت بھی اُس سے اُکتا گئی تھی۔ مگر میں نے یہ منظور نہ کیا کہ اُس سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس طرح اس کی وہ پریشانیاں بھی دور ہو جاتیں جو میری موجودگی سے اُسکو پہونچ رہی تھیں۔ برخلاف اسکے خود میری ہستی یکسر مصائب و آلام ہو جاتی۔ وہ آزاد بھی مگر پھر بھی مقیّد تھا، میری بیڑی اُس کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ سے قطع تعلق ہوتے ہی وہ عذرا کو قانوناً اپنی شریکِ حیات بنالیگا۔ اور میں اس صورت کو کسی عنوان گوارا نہ کرتی۔

ایک دن غیر معمولی طور پر وہ ذرا سویرے آگیا۔ میری طبیعت کو کسی قدر سکون تھا۔ میں بستر سے اُٹھی، اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے اُس کے کمرے تک گئی۔ ابھی دہلیز ہی پر قدم رکھا تھا کہ اُس نے اندر داخل ہونے سے منع کردیا۔ میں اپنا سا مُنہ لے کر واپس آگئی۔ وہ تمام رات روتے روتے گذری۔ اس وقت سے میرے دل میں نفرت و حقارت کا مادّہ پیدا ہونے لگا۔ میں نے اپنے رویّہ میں تبدیلی شروع کردی۔ اپنی بے چارگی پر آنسو بہانے کی بجائے میں یہ سوچنے لگی کہ اس بے وفا ہستی سے کس طرح انتقام لیا جائے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا۔ کہ ضرور خدا ایسی صورت پیدا کردیگا کہ میں اُس کے جذبات کو اسی طرح پامال کرسکوں جس طرح اُس نے میری آرزوؤں کو ٹھکرایا ہے۔ تاہم میرا ظاہری طرزِ عمل بدستور رہا۔ یعنی میرے ہر فعل سے ہمدردی کا اظہار ہوتا تھا۔ گویا میں اُسکی تمام جفاؤں سے چشم پوش ہوکر وفاشعاری پر کاربند ہوں۔ میں بہت احتیاط سے کام لیتی رہی کہ کہیں رنگِ رخ تاثراتِ قلب کی غمّازی نہ کرنے لگے۔ مگر ارشد کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی، کہ وہ میری بدلی ہوئی ذہنیت کا دقیق مطالعہ کرتا۔ میں روز نت نیا لائحہ عمل مرتّب کرتی اور کسی نہ کسی نقص پر خود اُس کو رد کردیتی۔ میں چاہتی تھی کہ میرا حربہ کارگر رہے۔ عورت جب انتقام لینے کا تہیّہ کرلیتی ہے تو اُس کے جذبات کا جوش بے پناہ ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے دل کو اسقدر سخت اور خالی از رحم کرلیتی ہے گویا وہ تخلیق کی ساعتوں ہی سے مرکزِ قہر و عتاب رہا ہے۔ اُس کا غصّہ اُس شیرنی سے بھی زیادہ پُرغضب ہوتا ہے جس کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو شکاری نے مار ڈالا ہو۔ اس وقت وہ چاہتی ہے کہ کائنات کے ہر ذرّہ کو کچل ڈالے۔ تمام دُنیا کو آگ لگا کر خاک سیاہ کردے۔ طبقاتِ زمین کو اُلٹ دے۔ نظامِ قدرت کو درہم برہم کردے، میں ارشد کو دیکھتی تو آنکھوں میں خون اُترنے لگتا۔ جی چاہتا کہ اُس کے تمام جسم سے گوشت نوچ کر چیل کوّوں کے سامنے پھینک دوں۔ اور آہ تک نہ کروں۔ گود پھیلا کر کوستی کہ وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جو لاعلاج ہو۔ مرے نہیں مگر مرنے سے بدتر ہوجائے۔ وہ کس مپرسی کی حالت میں ایک کمرے میں دن بھر پڑا رہے اور میں مسکراتی ہوئی اُس کے قریب سے گذر جایا کروں۔ وہ مجھ سے رحم کا طالب ہو اور میں نفرت

حقارت کی نظر ڈال کر اُس کی تکلیفوں میں اضافہ کر دوں۔

میں اسی انتظار میں تھی کہ اتفاقاً ایک عجیب حادثہ رُونما ہوا یعنی عذرا کی موت ـــــ اچانک موت۔ وہ کسی بیماری سے نہیں مری بلکہ اُس نے خودکشی کر لی۔ جس کی وجہ آج تک معلوم نہیں ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ اُس نے کسی آیندہ ظہور پذیر ہونے والی بدنامی کے خوف سے اپنی جان کو ہلاک کر لیا۔ لیکن وہ بدنامی کیا تھی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اُسے اپنی نسائیت کا احساس ہو گیا ہو گا۔ عصمت اور نسائیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

عذرا کی موت سے ارشد کی فطرت میں ایسا زبردست انقلاب ہوا کہ خود میں بھی حیران رہ گئی چند یوم اظہارِ تاسف میں گذارنے کے بعد وہ میری طرف رجوع ہوا۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے تمام سابقہ طرزِ عمل کی معافی مانگی۔ وہ بچوں کی طرح میرے سامنے بیٹھکر رویا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ وہ غلطی پر تھا۔ میرے برتاؤ کی تعریف کی کہ میں ظلم و ستم سہنے کے باوجود وفا شعار رہی۔ بے شک اُس وقت اس کے چہرے سے عرقِ ندامت ٹپک رہا تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر روتی رہی۔ اور ممکن تھا کہ اس افسانۂ ماضی کو فراموش کر دیتی کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ہتھیار چھن جانے کے بعد اعترافِ شکست صحیح جذبات کے ماتحت نہیں ہوتا۔ ارشد کی آرزوؤں کی دُنیا مٹ چکی تھی۔ اس لئے سوائے سرِ تسلیم خم کر لینے کے دوسرا چارہ کار ہی کیا تھا۔ اُس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا ہیجان سرد پڑ چکا تھا۔ شباب کے پُرکیف اثرات زائل ہو گئے تھے۔ اب اُسے ایک سچے رفیق کی ضرورت تھی۔ جس کے پاس چاہے دل لگی کے سامان نہ ہوں مگر دل کی لگی ضرور بجھا دے۔ وہ میرے دامن سے آنسوؤں کو خشک کرنا چاہتا تھا۔ اس امر کا احساس ہوتے ہی میرے مُرجھائے ہوئے دل میں فرطِ مسرت سے دوبارہ تازگی پیدا ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اِسے بے یار و مددگار تنہا چھوڑ دوں۔ وہ بھی تو محسوس کرے کہ جُدائی کے صدمے کسقدر المناک ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز عین اُس وقت جبکہ وہ مجھ سے عفو کا طالب تھا۔ میں نے کرخت لہجہ میں طلاق طلب کی۔ اور اُسکو بتا دیا کہ اگر وہ علیحدگی کے لئے تیار نہ ہوا تو عدالت کی رُو سے اس مقصد کی تکمیل کی جائیگی۔ میرے الفاظ نے اُس پر بجلی کا سا اثر کیا۔ وہ حیران ہو کر میرے مُنہ کو تک رہا تھا۔ اُس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ میں مذاق تو نہیں کر رہی۔ وہ منت سماجت کرنے لگا کہ کسی طرح میں اپنے فیصلہ کو تبدیل کر دوں۔ مگر میں نے ایک نہ مانی۔ عورت کی ضد مشہور ہے۔ میرے ارادوں میں تبدیلی غیر ممکن تھی میں نے اُس سے صاف کہدیا کہ جس طرح تم نے میری آرزوؤں کو ٹھکرایا ہے۔ میں بھی تمہاری حسرتوں کو خاک میں ملاؤنگی۔ یہ درست ہے کہ عذرا سے تعلقات رکھنے کے دوران میں اُس نے طلاق کا نام نہیں لیا تھا۔ جواب میں دائمی فراق کے لئے آمادہ ہو گئی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کی طرح میرے لئے ناممکن تھا کہ کسی دوسرے شخص سے آشنائی کر لیتی سب سے پہلے میری نسائیت مانع تھی۔ پھر میرا ضمیر اکس طرح گوارا کر لیتا۔ میں ننگِ خاندان بننا نہیں چاہتی تھی۔ ہرچند اب بھی جگ ہنسائی ہو رہی ہے مگر دُنیا کو کسی عنوان خوش نہیں کیا جا سکتا۔ مجبور ہو کر ارشد نے مجھے طلاق دیدی۔

سلیمہ! کیا تم سمجھتی ہو کہ اس "جائز جرم" سے مجھے سکون نصیب ہو گیا ہو گا۔ ہرگز نہیں۔ میری روح دوگونہ عذاب میں مبتلا ہے۔ اس صدمے سے ارشد کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ میں پوشیدہ طریقہ پر اُس کی خیریت معلوم کرتی رہتی ہوں۔ جب سنتی ہوں کہ اُس کی طبیعت زیادہ ناساز ہے تو میری بے چینیاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ جسمانی تعلقات منقطع ہو گئے ہیں مگر روحانی اتصال کو کون الگ کر سکتا ہے۔ وہ اب بھی میرا ہے اور میں اُس کی ہوں۔ میں جتنا صدمہ اُس کو پہونچانا چاہتی تھی پہونچا چکی۔ میں دعا کرتی ہوں کہ آئندہ وہ خوشی کی زندگی بسر کرے۔ یہ ضرور ہے کہ اب بھی اگر وہ میری نظر کے سامنے آ جائے تو میری آنکھوں سے خون ٹپکے گا۔ یاں تم نے کہیں گی مجھے اُس سے نفرت ہے، مگر میرا دل اُسے پیار کرتا ہے۔ تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اپنے فعل پر نادم ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا درست کیا۔ مجھے یہی کرنا چاہیئے تھا۔ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ چیز خود میرے لئے بھی سوہانِ روح بن جائیگی۔ چونکہ جوشِ انتقام میرے تمام جذبات پر حاوی تھا اس لئے میں نے اس کو سرد کر لیا۔ اس ضمن میں مجھے تسکین حاصل ہے۔ میری مثال اُس شخص سے سمجھو جو روزگار کے سلسلہ میں وطنِ مالوف کو چھوڑ کر پردیس جاتا ہے۔ اُسے سفر کی خوشی بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

بہن! مجھے معاف کرنا۔ میں نے اپنی داستانِ غم سُنا کر تمہارے دل کو صدمہ پہنچایا ہے۔ خدا کرے تم مسرت کی فضا میں سانس لو۔ تمہارے نغماتِ زندگی جب کبھی ایک لمحے کی فرصت دیں، تو مجھ دُکھیاری کو یاد کر لیا کرنا۔ اچھا خدا حافظ!

دلفگار

شمیم

فضلِ حق قریشی دہلوی

رُباعیات

غم کوش ہیں یا الم رُبا ہیں آنسو
کچھ اس سے غرض نہیں کہ کیا ہیں آنسو
روتا ہوں کہ ہو تیری محبت شاداب
سُنتا ہوں محبت کی غذا ہیں آنسو

ہاں عشق میں تدبیر بگڑ جاتی ہے
اِنسان کی تقدیر بگڑ جاتی ہے
نقّاش کے دل پہ کیا گزرتی ہو گی
بن بن کے یہ تصویر بگڑ جاتی ہے

وقار انبالوی

کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر صاحب ساقی

"بڑے بڑے بہ گئے بھیڑ کہے کتنا پانی"

میرے پیارے شاہد سلامت رہو۔ ساقی کا "ظرایف نمبر" شاید آپ نے میرا دماغی توازن برابر کرنے کی غرض سے بھیجا ہے مگر آپ کی اِس نیت کا انجام بخیر ہونا معلوم، اب تک تو محض مزاحیہ انداز میں چچا جان کے ساتھ طفلانہ شوخیاں ہوتی رہی ہیں، مگر اب چچا جان کے کیرکٹر اور اُن کے طرزِ زندگی پر روشنی ڈالنی پڑے گی۔ جانِ برادر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے آپ لوگ میرا جس قدر مذاق اڑائیں یا کھسیانی ہنسی ہنسکر دل کو جھوٹی تسلّی دے لیں حق بجانب ہیں، میں بھی آپ حضرات کے اس جذبۂ انتقام سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ مگر جناب مضحک دہلوی نے جوشِ انتقام میں یگانہ آرٹ پر نکتہ چینی کی جو ہمت کی ہے وہ اتنی مضحک ہے کہ کوئی صاحب فن ہنسی روک نہیں سکتا۔ میرزا یگانہ علیہ السلام کی ذات پر جا و بیجا جتنے بھی حملے کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ ایک گنوار آدمی بھی اُلٹی سیدھی پھبتیاں کہہ کر اپنا دل خوش کر سکتا ہے، مگر ایسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا جو یگانہ آرٹ کے خلاف فن کے اعتبار سے جائز نکتہ چینی کر سکے۔ بڑے بڑوں کے دل میں یہ ہوس رہ گئی کچھ بناتے نہ بنی، جناب مضحک نے ماشاء اللہ یگانہ آرٹ کے خلاف بھی قلم فرسائی کی جرأت کی ہے بقول شخصے۔ بڑے بڑے بہ گئے بھیڑ کہے کتنا پانی۔ !معنوی اعتبار سے کلامِ یگانہ میں اگر دو ایک مصرع قابلِ اعتراض ثابت ہو تو یہ مقتضائے بشریت ہے کسی انسان کا ہنر اتنا کامل نہیں ہو سکتا کہ کسی پہلو سے کوئی اعتراض ممکن ہی نہ ہو مگر اب تک کوئی ایسا اعتراض میری نظر سے نہیں گذرا جسے میں اپنے مقررہ اصول کے تحت تسلیم کر سکتا۔ جناب مضحک نے یگانہ آرٹ کا مضحکہ اُڑانے کی ہوس میں خود اپنی زباندانی کا پردہ بھی فاش کر دیا یعنی میرزا یگانہ علیہ السلام کی زبان پر بھی بعض اعتراضات کئے ہیں سبحان اللہ۔ میرزا یگانہ سے زبان کی غلطی ہو۔ اسکے کیا معنی؟

زبان کی غلطی یا معنوی سقم تلاش کرنا چاہتے ہو دیوانِ غالب میں بڑی آسانی سے پا سکتے ہو۔ شاعر کے کلام اور اُس کے طرزِ زندگی کا جائز مضحکہ اُڑانا چاہتے ہو تو اسکے لئے غالب خاص توجہ کا مستحق ہے۔

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

اسمعوا۔ افہموا

(۱)

غالبؔ کے سوا کوئی بشر ہی کہ نہیں
اوروں کے بھی حصہ میں ہنر ہی کہ نہیں
مردہ بھیڑوں کو پوجتا ہی نادان
زندہ شیروں کی کچھ خبر ہی کہ نہیں

(۲)

اتنا بھی سمجھتے نہیں ہونگے کیوں کھل
آخر آخر ہے اور اوّل اوّل
اکمل متاخر، متقدم افضل
غالبؔ افضل۔ مگر یگانہ اکمل!

(۳)

ہاں میرے اعجاز بیانی سیکھی
گویا تلوار کی روانی سیکھی
اور قاطع برہان سے کیا فیض ملا
غالبؔ کی طرح بدزبانی سیکھی!

(۴)

کیوں کیا ہوئے وہ بہادری کے جوہر
سو پشتوں کی سپہگری کے جوہر
پنشن کیلئے دلّی سے کلکتہ تک
دکھلانے چلے ہو شاعری کے جوہر

(۵)

انگریز چھپّڑ میں کہیں آتے ہیں جناب
کیا دور تھا آجاتا کوئی اور عتاب
کیا عہدِ وفادار بنے تھے مرزا
کیسا سوکھا ملا قصیدے[1] کا جواب

(۶)

خاصہ نہ سہی بلا سے کھڑ حق ہی بہت
تن ڈھکنے کو صاحب کا اُتارن ہی بہت
دلّی کا تخت اُلٹ گیا ٹھینگے سے
نوشہ کیلئے خلعتِ پنشن ہی بہت

(۷)

اِک شاعرِ کہنہ سال کہہ سکتے ہو
پیسے کا شریکِ حال کہہ سکتے ہو
جو چاہو کہو یار مگر یہ تو کہو
غالبؔ کو نمک حلال کہہ سکتے ہو؟

(۸)

غالبؔ بھی ہے واللہ انوکھا صوفی
کیا ہی کوئی صوفیوں میں ایسا صوفی
پنشن جو ہوئی بند تو بھوک اور کھلی
ہی ایسا کوئی پیٹ کا بندہ صوفی؟

(۹)

تلوار سے مطلب ہے نہ کھانڈے سے غرض
مومن سے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہ ظفر
غالبؔ کو ہی اپنے حلوے مانڈے سے غرض

---

[1] انگریزوں کے عہدِ وفادار بنے تھے قصیدہ پیش کیا تھا مگر وبسرائے کے ہاں سے ٹکا سا جواب ملا کہ ہم لوگوں کو شاعری کی ضرورت نہیں ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کا نمکخوار اور اُس کے یہ کردار! افسوس ؛

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

دوآتشہ

اے دوست دریں دیدہ نکوکاری کن
پیش از نفسے کہ عمر آزاری کن
خوشنودی اہل دل غنیمت بشمار
ہر جا کہ بود خلوتے یاری کن

پی کب سے پپیہا کا پیا پیا پیارے
دم ہے تو آئیں پاس تمہارے
دل نہ دکھاؤ مل مل بیٹھو
دل والوں سے بھاؤ نہ بنا رے

زیں طول امل آہ چہ خواہی کردن
زیں خواہش جایگاہ چہ خواہی کردن
سر رشتۂ عمر ہا نفس در تاب است
زیں ہمت کوتاہ چہ خواہی کردن

سرمدؒ

ارے یہ کھینچا تانی کیسی؟
لوبھ بنا جب بیراگی کیسی؟
دور سنسار کی لوٹ نہ جائے
اتنے پہ نادانی کیسی؟

مقبول

جزیرہ

سلیم نے کشتی میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا، غالباً میرا خیال درست تھا کہ ہمیں اس وقت ساحل پر نہ اترنا چاہیئے تھا۔ وطن کی واپسی تک اس کی تحقیق کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

فرید۔ نہیں ہمارے لئے یہ موقعہ غنیمت ہے کہ ہم اس جزیرے کی تحقیقات کر کے دنیا کے نقشے میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ کریں۔

سلیم جو فرید کی ضد اور منطقی بحثوں سے تنگ رہا کرتا تھا اس وقت بھی اس نے موضوع کو طویل بنانا پسند نہ کیا اور فرید کی رائے سے مجبوراً متفق ہو کر کشتی پر سوار ہو گیا اور دونوں ساحل کی طرف چل دئے۔

ساحل پر پہونچکر سلیم نے ملاحوں سے کہا کہ اس وقت وہ کشتی کو واپس لے جائیں جزیرے کی تحقیق کر کے ہم لوگ مغرب سے پہلے یہاں پر آجائینگے، اس وقت کشتی واپس آجانی چاہیئے، فرید نے کہا نہیں، کشتی کا شام کو واپس آنا بیکار ہے، شاید رات ہمیں اسی جزیرہ میں گذارنا پڑے۔

سلیم نے کہا نہیں، کشتی کا شام کو واپس آنا ضروری ہے، اگر ہم اس وقت تک جزیرہ سے واپس نہ آئے تو یہ ہمارا تھوڑی دیر انتظار کر کے چلے جائینگے۔ اور اگر فارغ ہو کر آگئے تو پھر ہمیں ساحل پر رات نہ گذارنی پڑے گی۔

سلیم اور فرید دونوں جزیرے کی طرف چل دئے، تھوڑی دور چلکر وہ ایک نہایت ہی ڈھالو اور خطرناک پتھریلے پہاڑ پر چڑھنے لگے، فرید نے پہاڑ کی ساخت اور اس کی ریت دیکھکر کہا کہ یہ آتش فشاں پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔

سلیم نے کہا کہ اس طرف کے تمام پہاڑ آتش فشاں ہیں، ہمیں ایسے گرم پہاڑوں پر زیادہ اونچا نہ چڑھنا چاہیئے.... نہیں جب ہم کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائینگے تو ان ساری تکالیف کی تلافی ہو جائے گی، وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے پہاڑ پر چڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ اسکی چوٹی پر پہونچ گئے جو مختلف قسم کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

سلیم نے بیٹھتے ہوئے کہا، یہاں سے پورے جزیرے کا عام نظارہ نہیں کیا جا سکتا، دوسرے پہاڑوں کی چوٹیاں کچھ اس طرح حائل ہو گئی ہیں کہ ہم اچھی طرح ہر طرف نہیں دیکھ سکتے۔

پہاڑ کی چٹانیں، سورج کی بے پناہ تپش سے جل رہی تھیں، آسمان بادلوں سے خالی تھا، سمندر کے نیلے پانی میں کوئی حرکت نہ تھی، فضا جھاڑیوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور آس پاس کی ہر چیز پر ایک گہری خاموشی طاری تھی۔

سلیم، مجھے یقین نہیں کہ اس میں کسی قسم کی آبادی ہوگی، غالباً آتش فشاں کے پھٹنے سے سمندر کی پہاڑیاں باہر نکل آئی ہیں اور اس طرح یہ جزیرہ بن گیا ہے، اس نے دور ایک جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرید سے کہا کہ دیکھو وہ کیا ہے، فرید اس طرف دیکھنے لگا، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، اس نے سلیم سے پوچھا، آخر تمہارا اس سے

مطلب کیا ہے مجھے تو سوائے شاہ بلوط کے درختوں کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

سلیم نے کہا تم جانتے ہو کہ میں توہم پرست نہیں ہوں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جس وقت میں کشتی سے اُتر رہا تھا میں نے صاف طور پر سُنا تھا کہ جیسے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ خبردار ساحل پر قدم نہ رکھنا۔

فرید بے ساختہ ہنسنے لگا، اُس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر تو ہمارے لئے اس جزیرے کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔

وہ دونوں جنگل کی طرف بڑھنے لگے، وہ جس قدر اس جنگل سے قریب ہوتے جاتے تھے، اُن کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، وہ شاہ بلوط کے درختوں کے قریب پہونچکر خاموش کھڑے ہوگئے۔

سلیم نے کہا، جنگل میں گھسنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر پہاڑ پر چڑھ کر اس جنگل کو اچھی طرح دیکھ لیں، یہ عجیب بات ہے کہ اس جنگل میں کوئی چڑیا نہیں دکھائی دیتی۔...... ہاں میں نے بھی کسی پرند کو اُڑتے ہوئے نہیں دیکھا، جزیرہ غیر معمولی طور پر خاموش ہے۔

وہ پہاڑ سے اُتر کر جزیرے میں دُور تک چلتے رہے، اب ہوا گرم و ناگوار ہوگئی تھی، اتنی ناگوار کہ فرید کی سبک و متحمل روح بھی پژمردہ و دزنی ہو رہی تھی، وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھکر سگریٹ پینے لگا اور اس جزیرے کی فوری تحقیقات کا اصرار چھوڑ دیا۔

سلیم نے کہا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جزیرہ آباد ہے اور مکانات اس پہاڑی کے دوسری جانب واقع ہیں،

فرید نے کہا مستقل آبادی تو نہیں معلوم ہوتی، البتہ کچھ خانہ بدوش ہوں تو ہوں...... ابھی یہ الفاظ پورے طور پر اس کے مُنہ سے نکلے بھی نہ تھے کہ وہ کسی اثر سے متاثر ہو کر زمین سے تقریباً ایک فٹ اوپر اُچھل گیا اور سلیم کو وہ پیچ دار دُھواں دکھانے لگا جو جنگل کے درمیانی حصّے سے بلند ہو رہا تھا، دُھواں دیکھتے ہی دونوں میں اس بلا کی چستی و چالاکی آگئی جیسے ان کو نقاہت و کمزوری تھی ہی نہیں، سلیم اور فرید سگریٹ پیتے ہوئے پہاڑ سے اُتر کر جنگل کی طرف دوڑے، جنگل میں داخل ہو کر دونوں اُس دھوئیں کو تلاش کرنے لگے، جسے اُنہوں نے پہاڑ سے دیکھا تھا، ابھی وہ اسی جستجو میں تھے کہ جنگلی سوروں کا ایک غول غرّاتا ہوا اُن کے قریب ہی سے گذر گیا، سلیم کسی قدر خوفزدہ ہو کر فرید کی طرف دیکھنے لگا، مگر —— کہ اُس کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار ظاہر نہ تھے۔

فرید نے کہا، یہ سور جنگلی نہ تھے، کیونکہ ہماری طرف توجّہ کئے بغیر خاموشی سے گذر گئے، فضا پر اس قدر خاموشی طاری تھی کہ خود ان لوگوں کو آپس میں گفتگو کرنا ناگوار ہوتا تھا ضرورت کے وقت صرف اشاروں یا دھیمی آواز سے کام لیتے تھے۔

سلیم بار بار یہی سوچتا تھا کہ کاش ہم اس جزیرے میں نہ اُترے ہوتے، لیکن اس کے پاس ایسے دلائل نہ تھے جن سے وہ فرید کی خواہش کے خلاف اُسے باز رکھ سکتا۔

بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کھلے میدان میں آ گئے جس کے وسط میں ایک مکان بنا ہوا تھا، تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، مکان ایک منزلہ تھا، جس میں جا بجا کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں، فرید بغیر کسی تامل کے سلیم کو ساتھ لئے مکان میں داخل ہو گیا جس کی دیواریں جنگلی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں، مکان میں داخل ہو کر وہ ایک بڑے کمرے میں آئے، جس میں نہ کسی قسم کی آرائش تھی اور نہ کوئی سامان، کمرے کی ایک جانب دو کوٹھریاں تھیں، ایک کوٹھری میں زمین سے اُٹھا ہوا چبوترہ بنا تھا اور دوسری کوٹھری میں حوض تھا جس کے بیچ میں ایک خنیر کھڑا ہوا تھا جس کے مُنہ سے فوّارہ چھوٹ رہا تھا۔

فرید نے کہا، یہ تو مجھے کوئی مصری مقبرہ معلوم ہوتا ہے، تمام گھر میں ایک اداسی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، تھوڑی دیر تک دونوں گھر کا خاموش جائزہ لیتے رہے۔ فرید نے یکایک سلیم سے کہا، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت بجا کیا ہوگا، سورج اُفق میں ڈوب گیا ہے، اور تاریکی بڑھ رہی ہے۔

تسلیم نے کہا، ہمیں فوراً ساحل کی طرف روانہ ہو جانا چاہیئے، کل صبح آ کر ہم پھر اسے دیکھیں گے،

دونوں خاموشی میں مکان سے نکل کر آگے بڑھنے لگے۔ جنگل خاموش اور اُداس تھا، گرم ہوا پتّوں میں سرسراہٹ پیدا کرکے بدن کے رونگٹے کھڑے کئے دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے آدمی انتہائی غم و حسرت سے ایک ساتھ مگر فریادیں کر رہے ہیں۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد فرید نے کہا، "شاید ہم نے راستہ غلط اختیار کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ساحل سے قریب ہونے کی بجائے اُس سے دُور ہو رہے ہیں"، مگر سلیم نے کہا "نہیں میں اس سامنے والے جھکے ہوئے شاہ بلوط کو اچھی طرح پہچانتا ہوں، وہاں پہونچکر ہمیں بائیں طرف مڑ جانا چاہیئے"

وہ دس منٹ تک اُسی طرف چلتے رہے، لیکن اس کی بجائے کہ وہ ساحل پر پہونچتے وہ پھر اُسی مکان کی پشت پر کھڑے ہوئے تھے، اب اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔

سلیم نے کہا۔ راستہ ملنا بہت دشوار ہے بہتر ہے کہ آج کی رات ہم اسی مکان میں بسر کریں، وہ دونوں مکان میں داخل ہو گئے اور اُس انتہائی کمرے میں جس میں چبوترہ بنا ہوا تھا جا کر لیٹ گئے۔

رات خوفناک طریقے سے خاموش اور گرم تھی، سارے مکان میں موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا، البتہ کبھی کبھی حوض میں پانی کے گھنگھولنے کی آواز ضرور آ جاتی تھی،

سلیم، خوف کی وجہ سے سونے کی کوشش کرتا تھا مگر بھوک کی وجہ سے نیند نہ آتی تھی، بخلاف اسکے فرید کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور وہ بے فکری کی غنودگی میں غوطے کھا رہا تھا، فرید کے سو جانے کے بعد سلیم کی بیچینی اور بڑھ گئی، واہمے کی خلّاقی اُس کے سامنے ایسی ایسی وحشت ناک صورتیں پیش کر رہی تھی کہ لمحہ بہ لمحہ اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اُس نے اس خوف کو کم کرنے کے لئے سگریٹ جلایا اور لیٹ کر آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اب اُسے محسوس ہوا جیسے اِن کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی یہاں موجود ہے جو اُس کی ہر حرکت کی نگرانی کر رہا ہے،

ابھی اسی خیال میں غرق تھا کہ قریب ہی سے چرخہ کاتنے کی سی آواز آنے لگی، اُس نے دیکھا کہ ایک دُھندلی سی انسانی شکل تمام جسم کو چادر میں لپیٹے ہوئے اندر داخل ہوئی، وہ پورے طور پر تو یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کون ہے، تاہم اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین عورت ہے، وہ کمرے میں داخل ہوئی، بڑھی اور بڑھکر فرید پر جو بے خبر سو رہا تھا، گھٹنے ٹیک کر جھک گئی اور وہ پیالہ جو اُس کے ہاتھ میں تھا بڑہا کر اس کے پینے کا اصرار کرنے لگی، اُس کی یہ آواز جو گنبد دار کوٹھری میں گونج رہی تھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ سلیم نے ساحل پر اُترتے ہوئے سُنی تھی، اُس نے اپنی طاقتوں کو یکجا کر کے فرید کے جگانے کے لئے چیخنے کی کوشش کی مگر بے سُود، صرف ایک ہیبن سی آواز لبوں سے مس ہو کر رہ گئی۔ رفتہ رفتہ اُسے معلوم ہوا جیسے وہ ایک نہایت ہی سرد سمندر میں غرق ہو رہا ہے۔

جب اُس کی آنکھ کھُلی تو صبح کا سورج تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا، اُس نے فرید کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کچھ اس طرح غرّایا کہ سلیم کی رگوں میں خون خوف سے خشک ہو گیا، وہ مکان سے نکل کر ساحل کی طرف بھاگا اور ملاحوں سے سارا واقعہ بیان کر کے اُنہیں اُس مکان میں لایا، لیکن اُس میں سوائے خاموشی اور سنّاٹے کے فرید کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ثاقب کانپوری

حسنِ سخن

غیر پہ جب بیداد کرو گے | میری وفائیں یاد کرو گے
بعدِ فنا کیا یاد کرو گے | مٹی بھی برباد کرو گے
بن کر ارماں آئے ہو یعنی | اُجڑا گھر آباد کرو گے
دل ہتھیا کر جان کی خواہش | یہ بھی لو۔ کیا یاد کرو گے
سمٹ رہا ہے دامِ گیسو | شاید اب آزاد کرو گے
اپنی اپنی کہہ گزرے سب | تم بھی کچھ ارشاد کرو گے
ساری خدائی دادطلب ہے | کس کس پر بیداد کرو گے
چھیڑ لو تمہیں ختم ہو قصہ | بن کر کیا جلاد کرو گے

شکووں سے تپش یہ کیسی توبہ
کیا شکرِ ستم ایجاد کرو گے

عبداللطیف تپش

وادیٔ گنگا میں ایک چاندنی رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے مستانہ نظارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بیتاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ہیں بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم فرشتوں کے سے کاشانے ہیں آباد
مخمور ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں رقصاں ہیں شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
اک موتی کی دیوی ہے کہ منزل میں دھری ہے
مرمر کی صراحی ہے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
تارے ہیں گہر ریز، گہر بار ہوائیں
یہ نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستی و نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی مدہوش بہاروں کے شبستاں
یا کھوئے ہوئے خواب کی دنیا کے نظارے
کرتے ہیں مسافر سے محبت کے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے مستانہ نظارے

[illegible]

"ڈاکٹر فاسٹ"

"کرسٹوفر مارلو" کی ٹریجڈی

افرادِ ڈرامہ

(۱) ڈاکٹر فاسٹ۔
(۲) ویگنر، فاسٹ کا خادم۔
(۳) بنولیو، مارٹنو، فریڈرک، شہنشاہ کے درباری
(۴) میفسٹوفلیس
(۵) اہرمنِ اعظم۔
(۶) اسقفِ اعظم برنو۔
(۷) شہنشاہ۔
(۸) تین عالم۔
(۹) نیکی اور بدی کے فرشتے،
(۱۰) اُمراء۔
(۱۱) شیطان۔
(۱۲) کورس، وغیرہ۔

پہلا ایکٹ

پہلا سین

(ڈاکٹر فاسٹ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا ہوا سحریات کی ایک کتاب پڑھ رہا ہے)

فاسٹ۔ خاموش قطبوں میں گردش کرنے والی تمام شیاء میری مُطیع ہو جائیں گی، جلیل القدر شہنشاہوں اور عظیم المرتبت بادشاہوں کو اپنا سرِ افتخار میرے احکام کے آگے جھکانا ہوگا، ایک مکمل ساحر، جس کی حیثیت نیم دیوتا سے کم نہیں اِنسانی تصوّرات کی سی وسیع دُنیا پر حکمراں ہے ــــ!

(نیکی اور بدی کے فرشتے ظاہر ہوتے ہیں)

نیکی کا فرشتہ۔ فاسٹ! اِس ملعون کتاب کو ایک طرف پھینک دو۔ اور اس کے اوراق پر نظر نہ جما وٴ مبادا یہ تمہاری روح کو ورغلا کر خدا کے ہیبتناک وعظیم عذاب کو تمہارے سر پر لانے کا باعث ہو۔

بدی کا فرشتہ۔ فاسٹ خبردار، اِس عظیم الشان علم کو جس میں اسرارِ فطرت کے بے بہا خزانے پوشیدہ ہیں مت چھوڑو، اور جس طرح آسمانی کائنات پر لیو وع حکومت کرتا ہے اسی طرح تم زمین پر موالیدِ ثلاثہ کے حکمراں بن جاوٴ!

(فرشتے غائب ہو جاتے ہیں)

فاسٹ۔ یہ علم میرے لئے کس درجہ مایۂ فخر و ناز ہے، .... فاسٹ! اسکو حاصل کر کے شیطانوں کو اپنی اطاعت میں لانے کی کوشش کر۔

(زور کا دھماکا، فاسٹ بلند آواز میں طلسم پڑھتا ہے، میفسٹوفلیس ظاہر ہوتا ہے۔)

میفسٹوفلیس۔ فاسٹ! تمہیں میری کیوں ضرورت ہے؟

فاسٹ۔ تم میرے قبضے میں ہو، اور تمام عمر کے لئے میرے خادم، تمہیں میرے ہر ایک حکم کی تعمیل کرنی ہوگی!

میفسٹوفلیس۔ میں اہرمنِ اعظم کا خادم ہوں، اور اسکی اجازت حاصل کئے بغیر تمہارے احکام کو ماننے سے مجھے انکار ہے!

فاسٹ۔ تمہارا مخدوم اہرمنِ اعظم کون ہے؟

میفسٹوفلیس۔ شیطانوں کا سردار، جو تمام بدکار و معصیت زدہ روحوں پر حکمرانی کرتا ہے!

فاسٹ۔ کیا اہرمنِ اعظم کبھی فرشتہ بھی رہ چکا ہے؟

میفسٹوفلیس۔ ہاں، وہ خدا کا محبوب ترین فرشتہ رہ چکا ہے!

فاسٹ۔ تو پھر وہ شیطان الشیاطین کیسے بن گیا؟

میفسٹوفلیس۔ اُس نے خدا سے گستاخی کی اور متکبر ہوگیا، اسپر خدا نے اُسے جنت سے باہر نکال دیا۔

فاسٹ۔ تم اہرمنِ اعظم کے ساتھ کیوں رہتے ہو؟

میفسٹوفلیس۔ وہ گنہگار روحیں جنہوں نے اہرمنِ اعظم کی تحریصات و ترغیبات کے دام میں گرفتار ہوکر خدا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، وہ بھی اسکے ساتھ ہمیشہ کیلئے مقہور و مردود ہوگئیں!

فاسٹ۔ اس صورت میں تم دوزخ سے باہر کیوں ہو؟

میفسٹوفلیس۔ دوزخ؟ فاسٹ! میں دوزخ سے باہر نہیں ہوں، خیال کرو اس روح کیلئے جو خدا کے دیدار کی سی نعمت عظمیٰ اور بہشت کی جاودانی مسرات سے محروم ہوگئی ہو، کیا یہ دنیا دس ہزار دوزخوں کے عذاب کی حامل نہیں ہے؟

فاسٹ۔ اچھا تم جاؤ اور اہرمنِ اعظم کے پاس یہ خبر لے جاؤ کہ فاسٹ خدا کی ربانیت کے خلاف بغاوت کرکے ابدی موت کا سزاوار بن گیا ہے اور اپنی روح تمہارے حوالے کرتا ہے، چوبیس سال تک آزاد رہیگی، لیکن اس مدت کے دوران میں تمہیں اسکے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی اسکے بعد تم اُس پر قبضہ کرلینا اور یہ بھی کہدینا کہ آج آدھی رات کے وقت وہ مجھسے مطالعہ کے کمرے میں ملے ——!

دوسرا سین

(نصف شب کا وقت، ہر طرف خاموشی، فاسٹ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا ہے، میفسٹوفلیس آتا ہے)

فاسٹ۔ کہو، تمہارا آقا کیا کہتا ہے؟

میفسٹوفلیس۔ تمہیں اپنی روح بیچکر میری خدمات حاصل کرنا اور اپنے خون سے اس کا عہد نامہ لکھنا ہوگا!

(فاسٹ اپنے بازو میں خنجر گھونپ کر خون سے عہد نامہ لکھتا ہے، میفسٹوفلیس کی طلب پر دو شیطان ظاہر ہوتے ہیں، جو انمول جواہرات سے مرصع تاج اس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، فاسٹ عہدنامے کو جسکے مطابق میفسٹوفلیس کو اس کی خدمت چوبیس سال کی مدت تک کرنی ہوتی ہے اور جس کے اختتام پر روح اہرمنِ اعظم کے قبضے میں چلی جائیگی پڑھتا ہے)

میفسٹوفلیس۔ فاسٹ! کہو اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

فاسٹ۔ مجھے بتاؤ وہ جگہ کہاں ہے جسے لوگ دوزخ کے نام سے پکارتے ہیں۔

میفسٹوفلیس۔ نہ تو دوزخ کی کوئی جگہ متعین ہے اور نہ اُس کی حدود مقرر! جہاں ہم ہیں وہی دوزخ ہے اور جہاں دوزخ ہے وہیں ہمیں ہونا چاہیئے، مختصر یہ کہ جب تمام دُنیا فنا ہوجائیگی اور ہر ایک ذی روح چیز پاک کیجائیگی اس وقت وہ تمام مقامات جو جنت نہیں ہونگے

دوزخ بن جائیں گے!

فاسٹ۔ میرا خیال ہے دوزخ محض افسانوی حیثیت رکھتا ہے، اصلیت اسکی کچھ بھی نہیں۔

میفسٹوفلیس۔ اوہو ابھی تک یہی خیال ہ! خیر تجربات تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔

(میفسٹوفلیس غائب ہوجاتا ہے)

فاسٹ۔ اگر بہشت کی تخلیق انسانوں کیلئے ہوئی ہے تو میں بھی بحیثیت ایک انسان کے تجربات پر لعنت بھیجتا ہوا توبہ کرلونگا!

(نیکی اور بدی کے فرشتے آتے ہیں)

نیکی کا فرشتہ۔ فاسٹ توبہ کرلو اب بھی خدا تمہیں معاف کردیگا۔

بدی کا فرشتہ۔ تم اپنی روح بیچ چکے ہو، اس لئے خدا تم پر رحم نہیں کریگا!

فاسٹ۔ میرا دل بہت سخت ہوگیا ہے، میں توبہ نہیں کرسکتا۔

بدی کا فرشتہ۔ ہاں اب بہت دیر ہوچکی ہے۔

نیکی کا فرشتہ۔ فاسٹ اب بھی توبہ کرلو، کچھ نہیں بگڑا!

(دونوں فرشتے غائب ہوجاتے ہیں)

فاسٹ۔ او یسوع مسیح! او میرے نجات دہندہ! او میرے مددگار! فاسٹ کی غمگین روح کو گناہگار ہونے سے بچا ــــ!

(اہرمن اعظم آتا ہے)

اہرمن اعظم۔ یسوع تمہاری مدد نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ منصف مزاج ہے اور تم اپنے عہد و پیمان کے خلاف اُس کی مدد طلب کررہے ہو! تمہیں ہرگز ہرگز خدا کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ تم شیطانی خیالوں کیلئے ہو اور شیطانی خیال تمہارے لئے۔!

فاسٹ۔ اہرمن اعظم! مجھے معاف کرو آیندہ ایسا نہ ہوگا۔

(فاسٹ وعدہ کرتا ہے کہ وہ بہشت، یسوع اور خدا کا خیال ہرگز ہرگز نہیں کریگا)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(کورس آتا ہے)

کورس۔ عالم فاسٹ ستاروں کے اسرار نہفتہ کے انکشاف کے لئے اولمپس کی فلک پیما چوٹی پر، ایک رتھ میں بیٹھکر جس میں دو اژدہے جُتے ہوئے تھے، بلند آسمان کی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ خوفناک اژدہے اُسے لیکر مشرق سے مغرب تک اُڑتے پھرے، اور آٹھویں دن تک وہ گھر آگیا۔ اب ایک اژدہے کی پُشت پر سوار ہوکر میرا خیال ہے سب سے پہلے اسقف اعظم اور اس کے دربار کو دیکھنے اور پیٹر کی مذہبی دعوت میں حصہ لینے کو جچکے لئے یہ دن مقرر ہے۔ وہ روم آئیگا!

(فاسٹ اور میفسٹوفلیس آتے ہیں)

فاسٹ۔ کیا میرے حکم کے مطابق تم مجھے روم لے آئے ہو؟

میفسٹوفلیس۔ ہاں، یہ استقفِ اعظم کا محل ہے۔
فاسٹ۔ اچھے میفسٹوفلیس! تم نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میرے لئے ان تمام اشیاء کو مہیا کرو۔ جو انسانی تمناؤں کا مرکز ہو سکتی ہیں، یہ چوبیس سال جو مجھے تمہاری طرف سے ملے ہیں، میں تعیش میں گذارونگا۔ اور یہاں ایک ایکٹر بن کر مجھے متکبر استقفِ اعظم پر اپنی غیر معقول چالاکی ظاہر کرنی ہے۔
(استقفِ اعظم پرند اور اسکے مقربین ایک جلوس کی صورت میں آتے ہیں)
(استقفِ اعظم شہنشاہ کا باغی ہونے کے باعث زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ فاسٹ اور میفسٹوفلیس کارڈنلوں" کی شکل میں تبدیل ہوکر زنجیریں پکڑے ہوئے ہیں، اس کے بعد استقفِ اعظم کو آزاد کرکے، جادو کے زیر اثر شہنشاہ کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ پھر اپنے آپکو انسانی نگاہوں سے غائب کرکے دیگر مہمانوں کے ساتھ محل میں خوب عیش اڑاتے ہیں، بعد ازاں شہنشاہ کے دربار کی جانب خود بھی چلے جاتے ہیں)

دوسرا سین

(شہنشاہ کا دربار، نبولیو دروازے پر کھڑا ہے، شہنشاہ ارکین دربار کے ساتھ بہت کرّ و فر سے داخل ہوتا ہے، ایک طرف سے فاسٹ، میفسٹوفلیس اور برلو آتے ہیں)
شہنشاہ۔ (فاسٹ سے) انسانی حیرت کے مظہرِ اعظم! مشہور و معروف جادوگر!! جیّد عالم فاسٹ!!! خوش آمدید تم نے پچھلے دنوں وعدہ کیا تھا کہ فاتحِ اعظم سکندر اور اسکے مشہور عالم افسروں کو اسی عظمت و ہیبت، سطوت و استبداد کے ساتھ دکھاؤ گے، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔
فاسٹ۔ شہنشاہ اس صداقت کے ابھی قائل ہو جائینگے!
نبولیو۔ (فاسٹ سے) اگر تم سکندرِ اعظم اور اس کے افسروں کو شہنشاہ کے سامنے لے آؤ تو میں دعوے سے کہتا ہوں، اپنے آپکو بارہ سنگے کی شکل میں تبدیل کر لونگا!
فاسٹ۔ اور میں "ڈائنا" بن کر تمہارے سر پر سینگ لگا دونگا۔
نبولیو۔ دیکھا جائیگا ——!
(دارا اسکندرِ اعظم سایوں کی صورت میں حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں)
فاسٹ۔ دیکھئے! دیکھئے! اے میرے عالی قدر شہنشاہ! دیکھئے!!!
شہنشاہ۔ اُف کس قدر تحیر خیز منظر ہے —— آہ کس حیرت افزا طریقے سے نبولیو کے سر پر دو سینگ نظر آرہے ہیں!
نبولیو۔ فاسٹ! یہ تمہاری بدمعاشی ہے!
فاسٹ۔ ایسا نہ کہو، جنگجو اور جلیل القدر شہنشاہ سکندر اعظم کو شہنشاہ کے دربار میں لانا فاسٹ کی طاقت سے بہت بعید ہے، اور اگر فاسٹ ایسا کر سکتا ہے تو تمہیں بھی یقیناً بارہ سنگے کی صورت میں تبدیل کرکے شہنشاہ کو خوش کرنیکے لئے شکاری کتے تمہارے پیچھے چھوڑ سکتا ہے، تاکہ وہ تمہیں شکار کریں —— بیلی موتھ! آرگس! اسٹورتو!!!
نبولیو۔ ٹھہرو ٹھہرو میرے اچھے آقا! مجھے معاف کر دو میں اتنی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔
شہنشاہ۔ فاسٹ! اسکے سینگ الگ کر دو تمہارے تجربات فن کا مظاہرہ کافی ہو چکا ہے۔
فاسٹ۔ شہنشاہ کی خوشنودی کا حصول عین تمنا ہے میں اسکے سینگ الگ کر دیتا ہوں، (میفسٹوفلیس اسکے سینگ دور کر دیتا ہے) نبولیو آئندہ عالموں کی عزت کا خیال رکھا کرو ——!

تیسرا سین

(ایک ہیبت ناک جنگل، نبولیو، مارتنو اور فریڈرک باتیں کر رہے ہیں)

مارتنو۔ میرے عزیز نبولیو! جادوگر فاسٹ کو قتل کرنے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو،

نبولیو۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے کیا میں آج ہر ایک کمینے شخص کا تختۂ تضحیک بنتے ہوئے یہ الفاظ سنوں "دربار میں شہنشاہ کے سامنے نبولیو کے سر پہ دو سینگ لگ گئے تھے": نہیں نہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، اگر اس سازش میں تم میری معاونت میں حصّہ لینا چاہتے ہو تو ہتھیار اٹھا کر تیار ہو جاؤ، فاسٹ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا!

فریڈرک۔ نہیں نہیں، نبولیو جو ہو سو ہو، ہم تمہارے ساتھ رہیں گے اور اگر جادوگر اس راہ سے آئے تو ہم اُسے تیغ کے گھاٹ اُتار دینے میں ذرہ بھر تامل نہیں کریں گے! ہشیار! ہشیار!! وہ آگیا ہے، اکیلا ہمارے بالکل قریب آگیا ہے، تیار ہو جاؤ، اور اس گنوار کو مار ڈالو۔

نبولیو۔ یہ شرف میں حاصل کرونگا، میری تلوار سنبھل! اسنے میرے سر پر سینگ لگائے تھے، میں اس کا سر اُتارتا ہوں ——!

(نبولیو فاسٹ پر حملہ آور ہوتا ہے، فاسٹ گر پڑتا ہے نبولیو اس کا سر اُتار لیتا ہے)

فریڈرک۔ کیا یہی وہ خوفناک ہستی ہے جسکی ہیبت سے دوزخی روحیں کانپ اُٹھتی ہیں، کیا یہی وہ خوفناک انسان ہے جس کے احکام کے آگے اُنہیں سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا تھا ——؟

مارتنو۔ کیا یہی وہ ملعون جادوگر ہے جس نے شہنشاہ کے سامنے نبولیو کو شرمندہ کیا تھا؟

نبولیو۔ ہاں، یہی! یہ اُسی ملعون کا سر ہے اور وہ جسم! مردود کو اپنی بدمعاشی کی پوری پوری سزا مل چکی ہے، (فاسٹ کی نعش کھڑی ہو جاتی ہے) اُف، اُف شیطان پھر زندہ ہو گیا ——!

فریڈرک۔ بہرِ خدا اسے سر دیدو۔

فاسٹ (بغیر سر کے بولتے ہوتے) نہیں اسے اپنے پاس رکھو، فاسٹ اور سر اور ہاتھ حاصل کر لیگا۔ مگر اب انتقام کے لئے تیار ہو جاؤ —— اوہ انتقام میں بے تاخیر، اسٹورنو! بیلی موتھ!! میفسٹوفلیس!!!

(میفسٹوفلیس اور دیگر شیطان آتے ہیں)

انہیں اپنی شعلہ ریز پشتوں پر بٹھا کر اتنے اونچا اُڑ جاؤ کہ سطحِ آسمان تم سے مس کرنے لگے۔ وہاں سے انہیں سر کے بل زمین کی انتہائی گہرائیوں میں گرا دو۔ مگر نہیں دُنیا کو ان کی بدقسمتی دیکھنی چاہیئے، انہیں ایسی سزا دینی چاہیئے کہ دوزخ کا عذاب بھی اس کے سامنے ہیچ ہو۔ اس لئے بیلی موتھ! تم اس بدمعاش کو لے جاؤ، اور ایک کیچڑ سے لبریز تالاب میں گرا دو۔ اسٹورنو، تم اسے نکیلے کانٹوں والی جھاڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں چھوڑ دو۔ اچھے میفسٹوفلیس اس بدمعاش کو کسی پہاڑ کی بلندی سے گرا کر اس کی ہڈیاں چُور چُور کر دو، جاؤ، جلدی میرے احکام کی تعمیل کرو۔

(شیطان اپنے شکار لے کر غائب ہو جاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

(ٖفاسٹ کے مطالعہ کا کمرہ، وگنیر داخل ہوتا ہے)

ر۔ میرا خیال ہے میرے آقا کو بہت جلد مر جانے کا
نا ہو گیا ہے، اُس نے وصیت نامہ میں اپنی تمام
ت، اپنا مکان، مال و اسباب، سنہری طشتریاں
ر دو ہزار کی تعداد کے سکے میرے نام کر دیئے ہیں اگر
ت عنقریب آنے والی ہے تو اس طرح وہ عیش و عشرت
ے کیوں اپنی زندگی کے آخری دن بسر کر رہا ہے!! وہ
وت میں عالموں کے ساتھ بیٹھا ہوا ایسے عیش میں
ستغرق ہے جس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی،
—— اوہ وہ آ رہا ہے، شاید دعوت ختم ہو گئی ہے۔

(فاسٹ آتا ہے اور اُسکے پیچھے میفسٹوفلیس ظاہر ہوتا ہے)

اسٹ۔ ملعون و مردود فاسٹ! آہ یہ تو نے کیا کر دیا؟
یں توبہ کرتا ہوں لیکن مایوس ہوں، دوزخ کے عذاب
سے بچنے کے لئے کیا تجویز کروں؟

میفسٹوفلیس۔ پیماں شکن فاسٹ! میں تیری روح کو اپنے
آقا کے خلاف بغاوت کرنے کے باعث گرفتار کرلونگا۔
جلدی اپنے خیالات تبدیل کرو ورنہ میں تیرے گوشت
کے ٹکڑے اُڑاتا ہوں۔

فاسٹ۔ افسوس میں نے اُس کی نافرمانی کی، عزیز
میفسٹوفلیس اپنے آقا سے کہو مجھے معاف کر دے، میں
آئندہ کبھی باغیانہ خیال کا اظہار نہیں کرونگا، اور اب بھی
عہد جو پہلے اہرمن اعظم کے ساتھ کیا تھا اپنے خون سے
لکھے دیتا ہوں۔

میفسٹوفلیس۔ اپنے بے ریا دل کے ساتھ اُسے فوراً لکھدو
مبادا کوئی سخت عذاب تم پر ٹوٹ پڑے۔

فاسٹ، میرے اچھے خادم ایک چیز کی مجھے خواہش
ہے، تو خوبصورت ہیلنا جس کی خوبصورتی نے یونانیوں
کو ٹرائے کے ساکنوں کے ساتھ برسرِ پیکار رکھا اور
دن کے ساتھ رنگین لطف انگیز ہم آغوشیاں اہرمنِ اعظم
کے برخلاف خیالات میرے دل سے نکال کر مجھے
اس کی طاعت کی زنجیروں میں جکڑ دیں، لے آ۔

میفسٹوفلیس میں یہ کرونگا اور جو کچھ میرا فاسٹ آیندہ
طلب کریگا چشم زدن میں حاضر کر دونگا۔

(ہیلنا دو کیوپڈ کے درمیاں ظاہر ہوتی ہے)

فاسٹ۔ کیا یہ وہی ہے جسنے ہزاروں کشتیوں کو غرق
کر دیا۔ اور الیم کے فلک پیما میناروں کو جلا کر راکھ کی
صورت میں تبدیل کر دیا، پیاری ہیلنا! مجھے اپنے لبِ لعلیں کا
بوسہ دیتے ہوئے حیاتِ جاودانی بخش دو، (بوسہ لیتا ہے)
اُسکے لبوں نے میری روح چھین لی ہے۔ ہیلنا! ہیلنا! میری
روح واپس کر دو، ہیلنا! تم نسیم سحری سے بھی زیادہ
دلکش ہو۔ تم میں ہزاروں روشن ستاروں کی
ضیا جلوہ گستر ہے، تم شعلہ ریز مشتری سے بھی
جبکہ وہ بے کس سیمیل کے پاس گیا، درخشاں ہو، تم
آسمانوں کے دیوتا جواری تھوسا کے کبودی بازوں
میں ہے، سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہو،
میں تمہارے لبوں ہی میں رہونگا کیونکہ جنت حقیقتاً یہی ہے۔

دوسرا سین

(فاسٹ اپنے مُطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہے، عالموں کا ایک گروہ داخل ہوتا ہے)

پہلا عالم۔ عاقل و فاضل فاسٹ! میں تمہارے چہرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھ رہا ہوں!

فاسٹ۔ آہ! شریف انسانو!

دوسرا عالم۔ تمہیں کیا تکلیف ہے؟

فاسٹ۔ میرے پیارے دوستو! میں تمہارے ساتھ زندہ رہا ہوں، اور اب بھی زندہ ہوں، لیکن کچھ دیر کے بعد ہمیشہ کے لئے مرجاؤنگا۔ دیکھو، دیکھو وہ آرہا ہے، ظالم اہرمنِ اعظم آرہا ہے!!

پہلا عالم۔ میرے عزیز فاسٹ! کون آرہا ہے کیا خوف ہے تمہیں؟

تیسرا عالم۔ یہ صرف توہم ہے خوف وغیرہ کچھ نہیں،

فاسٹ۔ یہ نہ توہم ہیں اور نہ خوف، بلکہ خوفناک گناہ ہے جسنے میرے جسم کو جہنم کدۂ عذاب، میری جان کو شرارستانِ اضطراب، میرے دل کو آتشکدۂ بیقراری بنا رکھا ہے——!!!

دوسرا عالم۔ فاسٹ! توبہ کرلو، خدا کے رحم کی کوئی انتہا نہیں۔!

فاسٹ۔ لیکن فاسٹ کا گناہ کبھی معاف نہیں ہوسکتا، وہ سانپ جسنے حوّا کو ورغلایا، دوزخ کے شعلوں سے نجات حاصل کرسکتا ہے، مگر فاسٹ نہیں، وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہیگا، دوزخ میں، آہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں۔ پیارے دوستو! دائمی دوزخ میں رہنے سے فاسٹ کی کیا حالت ہوگی!

دوسرا عالم۔ ابھی وقت ہے، خدا کی درگاہ میں توبہ کرلو۔

فاسٹ۔ خدا! خدا جس کی الوہیت سے فاسٹ نے انکار کیا، خدا جس کی ربانیت کا فاسٹ منکر ہوگیا——!! ہاں میں توبہ کرتا ہوں اُس کی درگاہ میں توبہ کرتا ہوں، اور خدا میں روتا ہوں، لیکن اہرمنِ اعظم میرے آنسوؤں میں چھپا ہوا ہے، نہیں میں آنسوؤں کی بجائے خون بہاتا ہوں، مگر آہ! اہرمنِ اعظم، ظالم اہرمنِ اعظم نے میری زندگی، میری روح، میری زبان پر قبضہ کرلیا ہے، میں اپنے ہاتھ اوپر اُٹھانا چاہتا ہوں، لیکن نہیں اُٹھا سکتا۔ شیطانوں نے میرے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے!

تمام عالم۔ (بیک بار) یہ کون ہیں فاسٹ؟

فاسٹ۔ تم انہیں نہیں جانتے؟ تو سُن لو، یہ اہرمنِ اعظم اور میفسٹوفلیس ہیں، میں نے ان کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں اپنی روح بیچ دی ہے!

دوسرا عالم، فاسٹ! تمہیں بچانے کے لئے ہم کیا کرسکتے ہیں؟

فاسٹ۔ میرے بچانے کی کوشش نا مشکور نہ کرو، اپنے آپکو بچاؤ اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ!

تیسرا عالم۔ نہیں میں تمہارے پاس رہونگا۔ خدا مجھے تمہیں بچانے کی قوت دیگا!

پہلا عالم۔ خدا کے غصّے سے ڈرو، اور چلو ہم دوسرے کمرے میں جاکر فاسٹ کے لئے دعا کریں!

فاسٹ۔ دُعا اور میرے لئے؟ میں کیا یونہی کہہ رہا ہوں، شریف انسانو! جاؤ میرے لئے کچھ نہ کرو، کوئی چیز مجھے جہنم کے عذاب سے نہیں بچا سکتی!

حضرتِ عالم۔ یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔ اُٹھو اور خدا کی درگاہ میں دعا کرو، ہم تمہارے لئے رحم کی درخواست کرتے ہیں،

فاسٹ۔ عزیز دوستو! الوداع، اگر میں زندہ رہا تو صبح ہو گی۔ اور اگر نہ بچ سکا تو سمجھ لینا میں جہنم کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں ——!

عالم۔ فاسٹ! الوداع!

(عالم چلے جاتے ہیں، نیکی اور بدی کے فرشتے آتے ہیں)

نیکی کا فرشتہ۔ آہ! تم بہشت کی جاودانی مسرت سے محروم ہو گئے ہو، بہشت کی جاودانی مسرت جو انسانی تصور میں بھی نہیں آسکتی! اگر تم نے خدا کی ربانیت سے انکار نہ کیا ہوتا تو دوزخ اور شیطانوں کی کیا مجال تھی کہ تمہیں عذاب میں مبتلا کرتے۔ کاش تم نے اُس وقت جبکہ روح کو گناہوں کے غار کی انتہائی گہرائیوں میں، شیطانوں کے دامِ مخادعات و مکائد میں گرفتار ہو کر بغیر سوچے سمجھے دھکیل رہے تھے، میری باتوں کا یقین کیا ہوتا ——————!

(خوش آیند نغموں کی آواز کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت زرین تخت آسمان سے اُترتا ہے) ——————

فاسٹ! اگر تو نے اُس دن میری باتوں پر عمل کیا ہوتا تو آج نیک پارسا انسانوں کی طرح، تو کتنی مسرت کس درجہ عظمت کے ساتھ اس تخت پر بیٹھتا اور دوزخ پر فتح حاصل کرتا جس کے عذاب نے آج تجھے مفتوح کر رکھا ہے۔ مردود ہستی! اب تیرے نیک فرشتے کو تجھ سے رُخصت ہو جانا چاہیئے، دوزخ کا خوفناک مُنہ کھلا ہے، جا اُس میں داخل ہو جا!

(نیکی کا فرشتہ رُخصت ہو جاتا ہے، تخت اُڑ جاتا ہے، فاسٹ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دوزخ کا نقشہ نظر آتا ہے)

بدی کا فرشتہ۔ اب، فاسٹ! اپنی آنکھوں کو دہشت انگیز مناظر دیکھنے کے لئے تیار کر لو۔ دیکھو! اس دائمی عذاب کدہ کی لامحدود وسعتوں میں عذاب کے ہیبت ناک فرشتے گنہگار روحوں کو آگ کے لرزہ خیز شعلوں میں پھینک رہے ہیں، اُن کے جسم دہکتے ہوئے کوئلوں پر جل جل کر کباب ہو جائیں گے، لیکن نہ تو وہ مریں گے اور نہ یہ آگ ٹھنڈی ہو گی، یہ مردود نافرمانبردار روحوں کا جاودانی مسکن ہے، وہ روحیں جو تیرے سامنے آگ کے شعلے نگل رہی ہیں وہ روحیں ہیں جو عیش پرستی میں حرامخوری کرتے ہوئے، غریبوں کو اپنے دروازے پر بھوک سے مرتے دیکھ کر قہقہے لگاتی تھیں، اور خوش ہوتی تھیں، آج آگ کے شعلے ان پر خندہ زن ہیں۔ فاسٹ! صرف یہی عذاب ان کے لئے کافی نہیں، تم انہیں اس سے ہزار گنا زیادہ اور خوفناک عذاب میں مبتلا دیکھو گے۔

فاسٹ۔ بس، میں نے دہشت انگیز عذاب کا منظر دیکھ لیا ہے۔

بدی کا فرشتہ۔ ابھی سے گھبرانے لگے ؟ نہیں تو اس کا مزہ چکھنا ہے، وہ شخص جو عیش و عشرت میں غرق رہا اب عذابِ الیم میں مبتلا ہو گا، فاسٹ! اب میں جاتا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد دوزخ کی عقوبتیں ہوں گی اور تم ——!

(بدی کا فرشتہ چلا جاتا ہے، گھڑیال گیارہ بجاتا ہے)

فاسٹ، او فاسٹ! تیری زندگی کے خاتمہ میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے اور اسکے بعد تو جاودانی عذاب

میں گرفتار ہوجائیگا۔ آسمان کی سطح پر ہمیشہ گردش کرنے والے قرصِ زرّیں! ٹھہر جا، تاکہ وقت گزرنے سے رُک جائے، اور نصف شب کبھی نہ آئے، فطرت کی خوبصورت آنکھو! چمکو، چمکو، اس گھڑی کو ایک سال ایک مہینہ، ایک ہفتہ یا کم ازکم ایک دن کے برابر طویل بنادو، تاکہ فاسٹ توبہ کرکے اپنی روح کو بچالے ــــ آہ ستارے گردش کررہے ہیں، چاند گردش کررہا ہے، وقت برابر گذرتا جارہا ہے۔ ابھی گھڑیال بجے گا، اہرمنِ اعظم، خوفناک، ہیبت ناک اہرمنِ اعظم مجھے جہنّم میں لے جائیگا ــــ نہیں میں آسمان کے اس حصّے میں اُڑکر چلا جاؤنگا، جہاں مسیح کا خون بہ رہا ہے، اُس کا ایک قطرہ مجھے عذاب سے بچا سکتا ہے ــــ اور اہرمنِ اعظم! مجھے اپنے مسیح کا نام لینے سے نہ روک، مجھے آزاد کردے، پہاڑو! آؤ مجھ پر گر پڑو۔ مجھے اپنے میں چھپا کر دوزخ کے عذاب سے بچا لو! آہ کیا یہ نہیں ہوسکتا، میں دوزخ میں سر کے بل گر پڑونگا! نہیں، یہ نہیں ہونا چاہیئے ــــ اے چمکتے ہوئے ستارو! تمہاری معمولی سی گردش کے باعث میری تخلیق بروئے کار آئی، اور تمہارے تغیرات کے زیرِ اثر میری قسمت میں موت اور جہنّم کا عذاب لکھا گیا، اب قطراتِ شبنم کی طرح مجھے اُٹھا کر بارش برسانے والے بادلوں کے جوف میں پنہاں کردو، تاکہ جب وہ دھوئیں کی صورت میں تمہارے مُنہ سے نکل کر ہوا کی لہروں کے دوش پر اُڑیں، میں بارش کے قطروں میں تحلیل ہوکر زمین کی سطح پر بہنے والی کسی ندّی کے پانی میں مل جاؤں ــــ لیکن میری روح ــــ میری روح کو جنّت میں پہنچا دو (گھڑیال ساڑھے گیارہ بجاتا ہے) اُف آدھ گھنٹہ ختم ہوچکا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد بقیہ وقت بھی ختم ہوجائیگا۔ او میرے خدا! اگر میری روح کو گناہوں کے باعث عذاب ضرور اُٹھانا ہے تو اُسکے لئے مدّت مقرر کردے مجھے ہزاروں لاکھوں برس جہنم میں رکھ لیکن اسی مدّت کے اختتام پر مجھے یہاں سے رہائی بخش ــــ کیا مردود روحوں کے عذاب کی کوئی میعاد معین نہیں؟ کیوں ــــ؟؟ کیا میں کسی جوان کی روح بن جاؤں؟؟؟ فیثاغورث! اگر تیرا مسئلہ تناسخ درست ہے تو کاش میری روح کسی جوان کی روح میں تبدیل ہوجائے۔ کیونکہ تمام جوان خوش قسمت ہیں۔ اس لئے کہ مرنے کے بعد ان کی روحیں عناصرِ اربعہ میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ لیکن میری روح کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، اِسے دائمی عذابِ جہنّم میں مُبتلا رکھا جائیگا!

ــــ لعنت ہو ان والدین پر جنہوں نے مجھے جنا ــ! نہیں نہیں!! فاسٹ! لعنت بھیج اپنے اوپر لعنت بھیج شیطانوں پر جنہوں نے تجھے بہشت کی مسرّتوں سے محروم کردیا!

(گھڑیال بارہ بجاتا ہے)

گھڑیال نے بارہ بجادئے۔ میرے جسم! ہوا میں تبدیل ہوجا! ورنہ شیطان تجھے عنقریب دوزخ میں لے جائینگے۔ او روح! پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے بن کر سمندر کے پانی میں مل جا۔

(زور کا دھماکا، شیطان نازل ہوتے ہیں)

رحم، رحم، شیطانو! رحم، اس طرح خوفناک نگاہوں سے میری طرف مت دیکھو۔ سانپو! اژدہو!! ٹھہرو۔ مجھے سانس لینے دو، دوزخ ــــ دوزخ، اُف خدا بچا!

ہرمن اعظم! میری جانب مت بڑھو، میں اپنی جادو کی کتابوں کو جلا کر راکھ کر دونگا ——————

میفسٹوفیلس! اپنی خوفناک شکل میری نگاہوں سے چھپالے ——— چھپالے، اُف خوفناک شکل آہ ———!

(شیطان فاسٹ کو لیکر غائب ہو جاتے ہیں، کورس ظاہر ہوتا ہے)

کورس - فاسٹ دوزخ میں داخل ہو گیا ہے اُس کا ہیبت ناک انجام، یاد رکھو! اس کی قسمت کا جہنمی انجام عقلمند انسان کے لئے نصیحت دمو عظت سے کم نہیں - اُسنے قدرت کے اصولوں کی پرواہ نہ کی اور وہ طاقت حاصل کرنیکی کوشش کی جسکی قدرت نے اجازت نہیں دی تھی!

(پردہ)

میرزا ادیب

ثمراتِ تخیل

عیشِ دو روزہ پہ قربان ہی ساری دُنیا
کس قدر دیکھئے نادان ہی ساری دُنیا

جلوۂ دوست ہی حالانکہ ابھی زیرِ نقاب
وہ تجلّی ہے کہ حیران ہے ساری دُنیا

انہیں آنکھوں پہ تو صدقے ہوئی دُنیا ساری
انہیں آنکھوں پہ تو قربان ہی ساری دُنیا

آنکھ جھپکی کہ ہوا خاتمۂ بزمِ خیال
جاگتی جوت کی مہمان ہی ساری دُنیا

ہے بجا آپ کا اے حضرتِ واعظ ارشاد
میں ہی کافر ہوں مسلمان ہی ساری دُنیا

تیری آنکھوں نے کیا ایک جہاں پر جادُو
تیری زلفوں سے پریشان ہی ساری دُنیا

کوئی دل نقشِ تمنا سے نہ ہوگا خالی
دیکھئے کتنی پُر ارمان ہے ساری دُنیا

عہدِ حاضر کی حقیقت ہیں موقوف نہیں
کینۂ و جہل کا طوفان ہی ساری دُنیا

وہ صلہ رحمتِ حق نے مجھے عصیاں کا دیا
بے گناہی سے پشیمان ہی ساری دُنیا

بے حجابی میں بھی ہی اُنکی وہی شانِ حجاب
یعنی کھوئے ہوئے اوسان ہی ساری دُنیا

جادۂ نظم کوئی خاص نہیں میرا نہال
تو سنِ فکر کا میدان ہے ساری دُنیا

نہال سیوہاروی

مسلمان اور شوقِ تعمیر

دُنیا کی تاریخ کا زرّین دورِ حق و باطل کی نتیجہ خیز جنگ میں روحانیت کی فتح اور ظلمت پر نور کے غلبہ کی ناقابلِ انکار حقیقت، یعنی وہ عہدِ جاہلیت جو کفر، بدعت، بدامنی اور جنگ و جدل کی سنگین بندشوں میں اسیر تھا۔ یقیناً تاریخ عرب میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو زبانِ حال سے اس امر کی شاہد ہے کہ قائدِ اعظم پیغمبرِ برحق محمدؐ عربی کی ولادت سے قبل اہلِ عرب میں دُخترکشی۔ شراب خواری۔ قمار بازی وغیرہ بدعتیں عام تھیں۔ اور وہ جہالت و گمراہی اور بُت پرستی و شرک کی تاریک فضا میں وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے کان اخوت و مساوات کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ اور بات بات پر تلواریں میانوں سے نکل آتی تھیں۔ جنگ و جدل اور کُشت و خون کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں خاندان برباد ہو جاتے تھے۔ مگر دینِ حنیف کے اس سچے قائد نے صداقت اور حق پرستی کی ایسی بانسری بجائی کہ چشمِ زدن میں قوم کی کایا پلٹ دی۔ اخوت اور خلوص کا وہ نغمہ چھیڑا جس کے اثر سے پُشتہا پُشت کے دشمن دینی بھائی بن گئے۔ دل کی کدورتیں اور عداوتیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔ کسی قسم کا دُنیاوی امتیاز باقی نہ رہا۔ اور آزاد اور غلام دونوں ایک صف میں آ گئے۔ اسلام ایک معجزہ تھا جس نے اپنے حلقہ بگوشوں کی ذہنی و دماغی حالتوں میں ایک ناقابلِ فہم انقلاب پیدا کر دیا۔ خداشناسی اور حق پرستی سے مغلوب ہو کر مسلمان کرۂ عالم کے ایک بڑے حصّہ پر غالب آ گئے۔ مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب کی عظیم الشان سلطنتوں کو مسخر کر کے رذالت و سفاہت کے مستحکم قصور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ھو اللہ الواحد القہار کے نعروں سے سلطنتِ اسلام کی داغ بیل ڈال دی۔

آج کل کے متعصب مسیحی مورخین مسلمانوں کی کسی قدر تضحیک کیوں نہ کریں، لیکن حقیقت بین اور انصاف پسند نگاہوں سے یہ پوشیدہ نہیں کہ اُنہیں "وحشی عربوں" نے علوم و فنون کے ہر شعبہ میں تدریجی ترقی کر کے وہ کمال حاصل کیا تھا جو ابتدائے آفرینش سے آج تک دُنیا کی اور کسی قوم کو نصیب نہیں ہو سکا۔ دورِ موجودہ کی ترقیاں مسلمانوں کی ہی نیک نیتی اور دماغ سوزیوں کے لازمی پھل ہیں۔ اگر مسلمان علوم و فنون کو اپنی عاطفت میں پناہ نہ دیتے تو یقیناً آج حکماء قدیم کا نام تک دُنیا کو معلوم نہ ہوتا۔

اہلِ عرب میں یہ خوبی تھی کہ جہاں جاتے اپنی سیرت، اپنی معاشرت اور اپنا تمدّن ساتھ لے جاتے۔ اور جس سرزمین پر پرچمِ اسلام لہراتا وہاں کوئی نہ کوئی ایسی یادگار ضرور قائم کر دیتے۔ جسے زمانے کی دستبرد کبھی نہ مٹا سکے۔ چنانچہ اسلام شریعت کے ساتھ جیسے جیسے دُنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتا گیا علوم فنون کے مخفی خزانے رواج پا کر عام نظروں کے سامنے آتے آ گئے اور دُنیا کے جس ملک پر اُنھوں نے حکومت کی اس کو عالی شان اور سربہ فلک عمارتوں سے مزیّن و آراستہ کر کے عروس البلاد بنا دیا۔

ایک مورخ کو غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔ لیکن مسیحی مورخین میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جس طرح وہ لغو اور مہمل داستانوں کو صحیفۂ آسمانی بناکر شاہانِ سلف کو بدنام اور رسوا کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی ہر ایجاد کا افتخار اپنے ہم مذہبوں کو تفویض کرنے کے لئے داستان طرازیوں اور کذب بیانیوں میں بھی بلا تامل لگ جاتے ہیں۔ ان کی ذلیل حرکتوں سے عوام تو غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن حقیقت آشنا نگاہوں سے پوشیدہ نہیں کہ جس طرح علوم و سائنس میں دُنیا مسلمانوں کی رہینِ منت ہے بعینہٖ فنِ تعمیر بھی اس نے مسلمانوں ہی سے حاصل کیا ہے۔ جس کی ابتدا چھٹی صدی ہجری یا بارہویں صدی عیسوی سے ہوئی۔ جبکہ پرچم اسلام کرۂ عالم کے ایک وسیع حصہ پر لہر رہا تھا۔ یوروپ کی خاص خاص عمارتوں پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہ آج تک اسلام کا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔ مسلمانوں نے کچھ ایسی نفیس خوش وضع خوش قطع عمارتیں یادگاریں چھوڑیں کہ آج بھی دُنیا ان کو دیکھکر محو حیرت ہوکر رہ جاتی ہے۔ اُن کا نظریۂ تعمیر اتنا مکمل تھا کہ مسیحی دُنیا نے اپنے زبردست تعصب کے باوجود بھی قرونِ وسطیٰ میں اپنے کلیسا اور دیگر عمارتیں اسلامی طرز وضع پر تعمیر کرائیں اور اس حد تک تقلید کی کہ مسجدوں کے خوشخط کتبے بھی ان کے مشہور کلیساؤں میں نظر آنے لگے۔ جن کے متعلق ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی مشہور عالم کتاب "تمدنِ عرب" میں لکھا ہے کہ:۔

" خود عربی حروف اس درجہ خوبصورت ہیں کہ قرونِ وسطیٰ سے ان نمونوں کو جو ان کے ہاتھ لگے محض آرائش سمجھ کر نقل کر دیا ہے"۔ موسیو لاک پیریر اور موسیو لا ڈوا اور دوسرے مصنفین نے اُن کی مثالیں اکثر اطالیہ میں دیکھی ہیں۔ اس آخرالذکر مصنف نے تو میلان کے بڑے کلیسا کے بیت الخدمت میں ایک نوکیلا محرابدار دروازہ دیکھا ہے۔ جس کے گرد پتھر کی کگر تھی۔ اور اس پر ایک عربی لفظ متعدد بار لکھا ہوا تھا۔ کلیسا سینٹ پیٹر کے اُس دروازہ پر جہاں پوپ شورمیں چہارم کی مورت ہے حضرت عیسیٰ کے سر کے گرد عربی حرفوں کا ہالہ ہے اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے کپڑوں پر بھی ایک ایک سطر عربی لکھی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مصنف نے ان کتبوں کا ترجمہ نہیں دیا۔ گو مسیحی دُنیا نے ہسپانیہ اور اُندلس سے سلطنت اسلامی کے معدوم ہوجانے کے بعد عالیشان اسلامی عمارتوں کو اپنا بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور یہاں تک بے حیائی کی کہ ان عمارتوں کی تعمیر کے افتخار کی اپنی طرف نسبت کرکے دُنیا کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کی سعی کی مگر اس کے باوجود بھی ان عمارتوں نے زبانِ حال سے اصلیت کا راز طشت از بام کر ہی دیا۔ چنانچہ ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند مسیحی مورخ مسٹر جیمس فرگسن نے اپنی کتاب "تاریخ عمارات" میں لکھا ہے کہ صقلیہ کی عمارتیں اگرچہ آج کل مسیحی دُنیا میں نظر آتی ہیں لیکن ان کی وضع قطع نہایت باریک نقش و نگار اور نوک دار محرابیں (گوتھک طرز کے خلاف) زبانِ حال سے شاہد ہیں کہ وہ یا تو اسلامی عہد میں تعمیر ہوئیں یا سلطنت جانے کے بعد مسلمان معماروں نے اپنی آبائی صنعت کو ظاہر کیا"۔

گو فی زمانہ مسلمان تاج و تخت، دولت و ثروت، علم و فضل سب کچھ کھو بیٹھے ہیں مگر وہ دور بھلایا نہیں جا سکتا جب علوم و فنون کو اس معراجِ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اُس کی روشنی سے چاردانگ عالم منور و تابان ہوگیا

تھا۔ مگر آج اس کے خلاف زبون حالی و پستی کے عمیق غار میں گرے ہوئے ہیں۔ اور نکبت و مفلسی جہالت و بدعت و ہوس پرستی اور جھوٹی خوشامد میں دُنیا کی ہر قوم سے آگے ہیں۔ اور بادۂ جمود و غفلت سے اس قدر مخمور و بدمست ہیں کہ انھیں اپنی خبر بھی نہیں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ دُنیا کس منزل پر پہونچ چکی ہے اور اغیار کہاں تک ترقی کر گئے بہر حال مجھے مسلمانوں کے زوال اور رکیک و نازک حالت کا اس جگہ رونا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اسلاف کی عظمت و شان، جاہ و جلال اور ان کے ان زرّین کارناموں کی ایک جھلک دکھانا ہے، جو اب تک طالبانِ رفعت کے لئے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی دُنیا کے ہر گوشے میں بے شمار ایسی دلفریب اور عالیشان عمارتوں کے اثرات باقی رہ گئے ہیں۔ جو ان کے اسلاف کی ذہانت، جودتِ طبع، حُسنِ مذاق اور خیالاتِ عالیہ کے زندہ ثبوت اور ان کے کمالِ صناعی کے آئینہ دار ہیں، جن کو دیکھکر ماہرینِ تعمیر حیرت و استعجاب سے "انگشت حیرت در دہاں" رہ جاتے ہیں۔ آج بھی آگرہ۔ دہلی۔ دمشق۔ بغداد۔ اصفہان۔ قاہرہ۔ صقلیہ۔ غرناطہ و اشبیلیہ کے میدانوں اور جنگلوں میں اسلامی عمارتوں کے بوسیدہ کھنڈرات شاہانِ اسلام کی گذشتہ شوکت و صولت، دولت و ثروت اور عزت و وقار کی پُر درد داستانیں زبانِ حال سے سُنا کر راستہ چلنے والوں کو رُلا دیتی ہیں۔

مورخین عالم نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ "پہلی صدی ہجری ترقی و عروج اسلام کے اعتبار سے تاریخ عالم میں ضرب المثل ہے" اس زمانہ میں مسلمانوں نے شام۔ دمشق۔ بغداد۔ مصر اور قاہرہ میں عجیب و غریب صناعی کے بیشمار نمونے تعمیر کئے۔ جن میں سے بیت المقدس میں مسجد عمر رض۔ دمشق میں جامع دمشق جسے حضرت خالد رض نے تعمیر کرایا۔ اور مصر میں تاج الجوامع جس کو حضرت عمرو بن العاص رض نے تعمیر کرایا، اب تک موجود ہیں،

مسٹر جیمس فرگسن نے مسجد عمر رض پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اندرونی آرائش و زیبائش اور پچیکاری کے باریک کام اور اعلیٰ درجہ کی صنعت و نفاست کو دیکھتے ہوئے یہ درست ہی کہ یہ مسجد مجموعی اعتبار سے اس مرتبہ پر پہنچ گئی ہے کہ شاید ہی کوئی عمارت اسکے مقابل پیش ہو سکے" جامع دمشق کی دیواروں میں چار ہ تک گرانبہا سنگِ مرمر لگا ہوا تھا، اوپر کی طرف اور گنبد میں پتھر کی پچیکاری تھی، چھت سُنہری تختوں کی تھی جسمیں چھ سو طلائی چراغ آویزاں تھے مینارونمیں خوشنما پتھر جڑے ہوئے تھے تاج الجوامع شروع میں بالکل سادہ تھی لیکن اسکی زینت و وسعت، رفعت و منزلت اور صنعت و نفاست مختلف خلفاء کے عہد میں بتدریج ترقی کرتی رہی جسکے نتیجے میں اب جو شرف اُسے حاصل ہی وہ یہ سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے کہ اسکے بانی نے تاج الجوامع اسکا نام نہیں رکھا تھا بلکہ اسکی شہرتِ غیر فانی کی اشارۃً پیشگوئی کی تھی۔

یہی نہیں بلکہ مصر و قاہرہ کی اور اسلامی عمارتیں بھی ہیں۔ جن میں مسجد برقوق۔ مسجد قایتبائی۔ زجن کے مینار خوش وضعی کے اعتبار سے اسلامی عمارتوں میں عدیم النظیر تسلیم کئے گئے ہیں) مسجد ابن طولون۔ مسجد ازہر۔ مسجد قلاؤن مسجد حسن۔ مسجد المویٔد وغیرہ اپنی صنعت و نفاست اور خوش قطعی کے اعتبار سے خاص طور پر مشہور زمانہ ہیں۔ مصر کی اسلامی عمارتوں کو دیکھکر مسٹر جیمس فرگسن نے تو یہاں تک کہدیا کہ "مسلمانوں نے جو طرزِ تعمیر مصر میں اختیار کیا وہ اب عدیم النظیر ہے اور باوجود کوشش کے زمانہ اُن کا ثانی نہیں پیدا کر سکتا۔ یعنی فنِ تعمیر کو انھوں نے بامِ عروج پر پہونچا دیا" یہ جیمس فرگسن کی رائے ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ مصر و بغداد وغیرہ ایسی بے مثل عمارتوں کا

[illegible] جس کی بنا کے وقت مسلمانوں نے قدیم عمارتوں کے باقی ماندہ آثار سے موازنہ و مقابلہ کرنیکی سعی نہیں کی لیکن [illegible] طرف متوجہ ہوئے تو اسکو اپنے طرز ساخت میں معراج کمال تک پہونچا دیا۔ اور ایسی ایسی نفیس اور [illegible] تعمیر کیں کہ یک نظر محسوس نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے یہ فن کس طرح حاصل کر لیا۔۔۔۔ خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں بغداد نہ صرف گہوارہ علم و تمدن ہی تھا بلکہ اپنی نفیس ترین اور نادر زمانہ عمارتوں کے لئے بھی مشہور تھا۔ قبۃ الخضراء، قصر الخلد، قصر الذہب ایسی عظیم الشان عمارتوں نے بغداد کو عروس البلاد بنا دیا تھا۔ الف لیلیٰ کی مشہور ہیروئن اور خلیفہ ہارون رشید کی محبوبہ ملکہ زبیدہ خاتون کا روضہ بغداد کی فصیل سے باہر زائرین سے خراج تحسین حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کا بالائی حصہ جس صنعت و کمال کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا وہ اپنی آپ مثال ہے۔

خلیفہ المقتدر باللہ عباسی نے ایک نہایت عجیب و غریب عمارت تعمیر کروائی تھی جو دار الشجرہ کے نام سے مشہور تھی اس کے صحن کے وسط میں ایک حوض تھا۔ جس میں طلاء احمر کا ایک درخت تھا۔ جس کی اٹھارہ ڈالیاں سونے اور چاندی کی تھیں ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں تھیں۔ اور ہر شاخ میں رنگا رنگ کے جواہرات اس حسن و خوبی سے آویزاں کئے گئے تھے کہ قدرتی اور مصنوعی پھولوں اور پھلوں میں فرق محسوس کرنا مشکل ہو گیا۔ ڈالیوں و شاخوں پر گنگا جمنی پرند بٹھائے گئے تھے۔ جن کی ساخت میں یہ کمال دکھایا گیا تھا کہ ہوا چلنے پر وہ خوش الحانی سے نغمہ سرائی کرتے تھے۔

تاریخ عالم زبان حال سے شاہد ہے کہ ہسپانیہ کے مسلمان تاجدار نظم و نسق، تزک و احتشام، کر و فر اور صولت و دبدبہ میں بڑے سے بڑے ذی حشم بادشاہ سے بھی سبقت لے گئے تھے، بعینہٖ اسی طرح ان کی عمارتیں بھی اپنی صنعت نفاست کے اعتبار سے عجائبات عالم میں شمار کئے جانیکی مستحق ہیں۔ سلطان عبد الرحمٰن نے ۱۷۰ھ میں قرطبہ کی مسجد جامع تعمیر کرائی تھی۔ جو صنعت کے لحاظ سے قرطبہ کی بہترین عمارت مانی گئی۔ اس مسجد کے خاص درجہ میں چاندی کا فرش تھا جس پر اس کمال سے پچیکاری کی گئی تھی کہ انسان حیرت و استعجاب کے دریا میں غوطے کھانے لگتا۔ تمام ستون جواہرات سے مرصع تھے خطیب کا خاص ممبر ہاتھی دانت اور عود کے چھتیس ہزار ٹکڑوں سے تیار ہوا تھا۔ یہ بھی جواہرات سے مرصع تھا۔ چار وسیع اور خوشنما حوض مسجد کے صحن میں تھے۔ جو ہر وقت پانی سے لبریز رہتے تھے۔ لیکن افسوس متعصب مسیحیوں نے اسلامی سلطنت کا چراغ گل ہوتے ہی ۱۲۳۶ء میں اس مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر لیا۔ جو آج کلیسائے ولا ویسیوسا (Chapel of Villa Viciosa) کے نام سے مشہور ہے۔

غرناطہ میں قصر الحمراء، قطلطا تر، قصر السرور، قصر التاج وغیرہ بھی نہایت عجیب و غریب عمارتیں تھیں۔ لیکن اس شہر کی سب سے زیادہ عجیب و غریب عمارت مدینۃ الزہرا یا قصر الزہرا تھی۔ جو چالیس برس میں تیار ہوئی تھی کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں دس ہزار معمار اور بارہ سو نجار روزانہ کام کرتے تھے، اس عدیم النظیر عمارت کی چھتیں چار ہزار تین سو مطلاء و مذہب ستونوں پر قائم تھیں۔ جو ساخت میں بے نظیر اور باریک کاموں کے اعتبار سے عجائب روزگار تھے، ان میں سے ایک ہزار تیرہ سو افریقہ اور انیس روم سے آئے تھے اور ایک سو چالیس

سلطان ترکی نے شاہ عبدالرحمٰن کو بطور تحفہ دیئے تھے۔ سلطان کے خاص کمرہ کی چھت اور دیواریں بالکل مطلا و مذہب تھیں۔ کمرہ کے وسط میں ایک حوض سیماب لرزاں سے لبریز تھا جب سورج کی کرنیں دروازوں کے شگاف میں داخل ہو کر سیماب کو متحرک کرتی تھیں تو برق لامع کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اور تجلیات کا منظر نظر کو خیرہ کر دیتا تھا۔ مامون بن ذوالنون خلیفہ اندلس نے علوم طبیعیات اور ہندسہ کی مدد سے ایک عجیب و غریب عمارت تعمیر کروائی تھی۔ جس کے وسط میں ایک نہر تھی۔ نہر میں شیشہ کا ایک قبہ تھا جس کی چوٹی سے ایک فوارہ جاری تھا اور پانی چاروں طرف کچھ اس طرح گرتا تھا کہ قبہ کے رنگین شیشہ پر ایک غلاف معلوم ہوتا تھا۔ اس گنبد میں تخت شاہی تھا۔ جس پر بیٹھ کر مامون دربار کیا کرتا تھا اور گو چاروں طرف پانی کی بوچھاڑ ہوا کرتی تھی مگر کیا مجال کہ قبائے شاہی کا کونہ تک بھیگ جائے۔

ٹیونس کے جنوب میں بارہ میل کے فاصلہ پر خلیفہ دمشق کے نائب السلطنت کا دارالحکومت قیروان ایک شہر تھا جہاں ۶۷۰ء میں نفیس اور عالیشان عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک نہایت وسیع اور عالیشان مسجد اسلامی شان و شوکت کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس کا طول ۲۵۰ گز اور عرض ۱۵۰ گز تھا۔ اس مسجد کا گنبد جو اعلیٰ درجہ کے سنگ مرمر سے تراشا گیا تھا۔ تینتیس ستونوں پر قائم تھا۔ اس مسجد کے دیگر ستونوں کی تعداد مورخین نے چار سو چودہ لکھی ہے۔ ٹیونس میں اکثر اسلامی عمارتوں کے بوسیدہ کھنڈرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سیویل۔ ٹولیڈو اور غرناطہ میں بے شمار نایاب مسجدیں تھیں۔ جو نفاست اور اعلیٰ نقش و نگار میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں مگر گردش لیل و نہار نے تقریباً ان تمام کی تمام مسجدوں کو کچھ اس طرح مٹا دیا کہ تجسس کے باوجود ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اور جو دو چار باقی رہ گئی ہیں وہ کلیساؤں کی صورت میں تبدیل کی جا چکی ہیں چنانچہ اہم کلیسا (Christo De la Luz) سینٹ کرسٹو ڈیلا لوز بھی ابتدا میں ایک مسجد ہی تھی۔

ایران مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں ہی فتح کر لیا تھا۔ اور وہاں ہزاروں عدیم النظیر عمارتیں تعمیر کروائی تھیں، لیکن وہ تقریباً تمام کی تمام بیک گردش چرخ نیلوفری اس طرح فنا ہو گئیں کہ اب ان کا نام تک بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ان عمارتوں میں سے تبریز میں غازان کی مسجد شہر سلطانیہ میں محمد خدا بندہ کا روضہ اور اصفہان میں شاہ عباس کی مسجد آرائش و زیبائش۔ خوش رنگی اور مرصع کاری کے اعتبار سے رشک زمانہ تھیں۔ ایرانی عمارتوں کی خصوصی صنعت ان کی میناکاری استرکاری۔ شلغم نما گنبد۔ عالیشان پھاٹک جن پر نیم گنبد ہوتے تھے اور نوکدار محراب تھی۔

سلطان محمود غزنوی کا نام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ گو اس نے اپنی حیات کا ایک بڑا حصہ جنگ و جدل میں بسر کیا۔ اور ہندوستان میں جم کر کبھی حکومت نہیں کی۔ اور جو وقت اس نے اس ملک میں گزارا وہ اہل ہند کے ساتھ جنگ کرنے ہی میں تمام ہوا۔ لیکن اس پر بھی اس نے متھرا میں سنگ مرمر اور سنگ رخام کی ایک نفیس ترین مسجد تعمیر کروائی اور اپنے دارالحکومت غزنی کو بھی ان عالیشان عمارتوں۔ مسجدوں۔ چشموں اور باغات سے آراستہ کر کے رشک جناں بنا دیا۔ جن میں سے اکثر اب پردۂ عدم میں مستور ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے بوسیدہ کھنڈرات اور شکستہ مینار اب بھی فاعتبروا یا اولی الابصار کا درس اور اس شہر کی قدامت و عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ ہم مینار کی

بلندی ایک سو چالیس فٹ ہے۔ اور اوپر کا حصہ مدور ہے سلطان محمود کا روضہ بھی ایک نہایت عالی شان عمارت تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ بے رحم کج رفتار نے اُسے بھی صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ البتہ اس روضہ کا ایک صندل کا پھاٹک جس کو لارڈ ایلنبرا غزنی سے لائے تھے اب تک قلعہ آگرہ میں موجود ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی سومنات سے لایا تھا۔ لیکن یہ روایت لغو اور مہمل ہے۔ کیونکہ اس پر خط کوفی جو کتبہ اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں وہ زبانِ حال سے اسلام کا کلمہ پڑھ رہے ہیں اور بالکل ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں جیسے قاہرہ کی مسجد ابن طولون اور دیگر مصری عمارتوں میں پائے جاتے ہیں —— مذکورہ بالا بیان سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں نے دُنیا کے جس ملک پر بھی حکومت کی وہاں مذہبی رواداری کی ایک نہایت اعلیٰ مثال قائم کرنے کے علاوہ ملی علوم وفنون کو بھی ترقی دی۔ اور علماء حکماء کی سرپرستی کرنے کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر کو بھی معراج پر پہونچایا۔ اور ایسی ایسی نفیس خوش وضع اور عالیشان عمارتیں تعمیر کیں اور ان کی صناعی میں وہ جوہر دکھلائے کہ دُنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ اور متعصب مسیحیوں نے بھی ان کی تقلید کرنا باعث فخر خیال کیا۔ گو اس وقت اہل یوروپ ہمیں یہ یقین دلانے کی سعی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی عالیشان عمارتیں اہل یوروپ کے ہی کمال کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی عدیم النظیر عمارت روضۂ تاج محل کا نقشہ اٹلی کے ایک کاریگر نے تجویز کیا تھا۔ لیکن روضۂ تاج محل کی ساخت و طرزِ ہیئت زبانِ حال سے شاہد ہے کہ وہ مغربی نہیں بلکہ سراپا عربی و ایشیائی ہے۔ اور اس کا نقشہ ایک بڑی حد تک مقبرہ ہمایوں سے مشابہت رکھتا ہے اسکے علاوہ اور بھی بہت سی بے سروپا داستانیں یوروپین مورخین نے مسلمانوں کے تعمیری کمال کو پست دکھانے کے لئے تراشی ہیں مگر اُن کی یہ کوشش سعی لاحاصل سے زائد نہیں۔ یوروپین اس فن میں مسلمانوں کو تو کیا سکھا سکتے۔ جبکہ وہ خود مسلمانوں کے شاگرد ہیں اور ان کی عمارتیں مسلمانوں کی صناعی و کاریگری کی مثال ہیں چنانچہ مسٹر جیمس فرگسن نے لکھا ہے کہ صقلیہ کے اکثر کلیسا مثلاً مارٹورانا (Martorana) کلیسائی لاپلاٹینا (Capella Palatina) اور کیتھیڈرل آف سفالو (Cathedral of Cefalu) مونریل وغیرہ جو بارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کئے گئے تھے اسلامی شان رکھتے ہیں آخر الذکر کلیسا ۱۱۷۴ء میں تعمیر ہوا تھا اِس کا کوئی حصہ یا جزو ایسا نہیں جو گوتھک کہے جانے کا مستحق ہو۔ اس کی محرابیں نوکدار ہیں جو ایک مخصوص اسلامی طرز ہے اس کی چھتوں پر اسلامی مذاق کے مطابق نقش و نگار ہیں۔ اس میں پچیکاری کا کام جس سے اندرونی حصہ مرصع ہے ایسا نفیس ہے کہ اس نے کل عمارت کو شان دار بنا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ کلیسا قرون وسطیٰ کا بہترین اور نفیس ترین کلیسا خیال کیا جاتا ہے —— مسلمانوں نے یوروپ، افریقہ اور ایشیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں عالیشان عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ لیکن اُن میں سے کچھ تو حوادث زمانہ کا شکار ہو کر اور کچھ متعصب مسیحیوں کی قسم آرائیوں کی بدولت صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹ گئی ہیں کہ آج سوائے اُن کی داستانوں کے اور کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ صقلیہ اور اشبیلیہ کی عالیشان عمارتیں کلیساؤں کی شکل اختیار کر چکی ہیں اور الجیریا کی اسلامی عمارتیں پردۂ عدم

میں پنہاں ہو چکی ہیں اور اسی طرح ہندوستان کی اسلامی عمارتیں زیادہ تر منزلِ فنا تک پہنچ چکی ہیں لیکن یہاں اب بھی ملک کے ہر گوشے میں سینکڑوں عمارتیں اپنے بنانے والوں کی یاد تازہ کرنے کیلئے موجود ہیں۔

ہندوستان کی اسلامی عمارتوں کو مورخین نے دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔ یعنی دورِ افغانی کی عمارتیں اور دوئم عہدِ مغلیہ کی تعمیریں۔ ان میں سے آخر الذکر کے متعلق مجملاً کچھ لکھنا ہے۔

دورِ اوّل کی اسلامی عمارتیں زیادہ تر فنا ہو چکیں، اور جو موجود ہیں وہ صنعت و ندرت کے اعتبار سے مغلیہ عمارتوں کے مقابلے میں بہت پست ہیں۔ ان عمارتوں میں قطب مینار اپنی بلندی کی وجہ سے علاؤ الدین کا دروازہ اپنی صنعت کے اعتبار سے سلطان سکندر لودھی اور شیر شاہ سُوری کے مقبرے اپنی خوش وضعی اور شان و عظمت کے باعث خاص طور پر مشہور ہیں۔ لیکن اس دور کی عمارتوں میں بیجاپور کی عمارتیں اپنی جدت و ندرت کے اعتبار سے کچھ اور ہی مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان میں محمد عادل شاہ کا مقبرہ جو گول گنبد کہلاتا ہے اپنے عالیشان مینار اور دلفریب عربی کتبوں کی وجہ سے دیگر اسلامی عمارات پر فضیلت رکھتا ہے۔ اس مقبرہ کی محرابیں بھی ٹوکدار ہیں۔ اس عالیشان مقبرہ کی دوسری منزل پر جانے کا راستہ کمال صناعی سے ایک بے مثل مدور برآمدہ بنایا گیا ہے جو سراسر مرقعِ حیرت ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہر آواز جو اس برآمدہ میں آکر انسان کے مُنہ سے نکلتی ہے صدائے بازگشت بن کر کسی ورناطق کی موجودگی کا دھوکا دیتی ہے۔ بیجاپور کی جامع مسجد بھی ایک نہایت وسیع خوشنما عمارت ہے۔ جس کے صحن کا رقبہ ۵۷۲۵۰ مربع فٹ ہے۔

مُتعدد بڑے بڑے ستون ہیں جن کی وجہ سے مسجد کے طول میں نو اور عرض میں پانچ حصے ہو گئے ہیں اس حساب سے پینتالیس ۴۵ حصے ہونے چاہئیں۔ لیکن وسط میں نو در بغیر ستونوں کے ہیں یعنی بارہ ستون گویا نکال لئے ہیں۔ جس سے وسط میں ایک نہایت خوشنما مربع قطعہ نکل آیا ہے۔ یہ وضع صرف اسی مسجد کی خصوصیت میں سے ہے۔ بیجاپور میں امین الملک کا مقبرہ بھی ایک قابلِ دید عمارت ہے، جو اپنے گنبد کے سبب خاص طور پر مشہور ہے،

سید محمود مورخ

مطبوعاتِ ساقی!

"نعرۂ مستانہ"

اے شورشِ مستانہ اے شورشِ مستانہ
ساقی کی امانت ہے رازِ مئے و میخانہ

دُنیا کی حقیقت کیا دُنیا تو ہے افسانہ
دیوانہ کسی کا ہے عقبیٰ سے بھی بیگانہ

مرجانے کی باتیں ہیں اے ہمتِ مردانہ
اپنوں کی خوشامد ہو یا منتِ بیگانہ

نیرنگیٔ واعظ بھی ہمرنگِ زمانہ ہے
اقوالِ حکیمانہ افعالِ سفیہانہ

احباب کی بے دردی اغیار کی ہمدردی
رُودادِ مصیبت ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرۂ خاکستر اک شمعِ بصیرت ہے
اللہ رے اعجازِ جاں بازیٔ پروانہ

جس مئے سے یہ ٹوٹا تھا کیا جانے وہ کیا ہوگی
ہر شعلۂ جوّالہ ہر ذرّۂ پیمانہ

کونین کے قصے ہیں اک میری حکایت میں
افسانۂ ہستی ہے افسانہ در افسانہ

پھر روحِ فسردہ میں ہیجان بپا کردے
اے نرگسِ مستانہ اے نرگسِ مستانہ

وہ جوہرِ عرفاں دے اس آئینۂ دل کو
کونین پہ حاوی ہو اک گوشۂ غمخانہ

اللہ رے معراجِ وارفتگیٔ کوکب
ہمرازِ حقیقت ہے ہر نعرۂ مستانہ

کوکب (شاہجہانپوری)

مسلمانوں میں جمود فکری کا سبب اور اسکا علاج

جب ایران، روم الکبری اور شمالی افریقہ وغیرہ اسلامی سلطنت میں شامل ہو گئے تو ان ممالک کی رعایا نے شاہی نظام اور مذہبی پیشواؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے محض اسلامی سلطنت ہی کو ترجیح نہیں دی بلکہ خوب اسلام میں بھی داخل ہوتے گئے۔ مگر ان نومسلموں کی جماعت نے جن کے دماغوں میں اپنے پرانے مذاہب کے عجیب و غریب و پُراسرار عقائد و روایات اور مصنوعی دینیات کی بوُ بسی ہوئی تھی مذہب اسلام میں اسی قسم کے پُراسرار عقائد اور مصنوعی قیود و روایات شامل کرنی شروع کر دیں مثلاً پیری مُریدی، کرامات، قبر پرستی، تعویذ گنڈے وغیرہ وغیرہ اور اسی زمانہ سے اسلامی عقائد میں اختلاف اور ضعف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ جب مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کے عقائد میں اور بھی تلاطم پیدا ہوا۔ خاص عرب کے مسلمان بھی ان خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، کیونکہ اوّل تو عرب کے مقابلہ میں ان نومسلموں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور دوسرے یہ لوگ پہلے سے تعلیم یافتہ تھے لہذا عرب کے مسلمانوں کا ان نومسلموں کے خیالات سے متاثر ہونا بالکل قدرتی بات تھی جس طرح سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو زیادہ تر نومسلم ہیں ان کے پرانے ہندو مذہب کے اکثر عقائد و خیالات اب تک رائج ہیں جیسے شادی اور غمی کی رسوم وغیرہ،

بہرحال بیرونی خیالات کے اثرات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جہاں مسلمانوں میں علوم و فنون رائج ہوئے تو ان کے ساتھ ہی مختلف مذہبی فرقے بھی پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ایک فرقہ جو کہ ابتک محض ایک سیاسی فرقہ تھا ایران میں شیعہ کے نام سے بقیہ مسلمانوں سے بالکل ہی علیحدہ ہو گیا اور چونکہ ایران کے لوگ اسلام اختیار کرنے سے پہلے آتش پرست تھے جو زرتشتی مذہب کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہیں اور جن کے دماغوں پر موروثی شخصی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی امامت کا خیال عرصہ دراز سے حاوی تھا، اس لئے انھوں نے اپنی دینیات روایات اور اعتقادات اپنے پرانے آبائی مذہب سے ملتے جلتے بنا لئے اور ساسانی نسل کے بادشاہ یزدگرد کی دختر شاہ بانو کے ساتھ حضرت امام حسین ع کی شادی ہو جانے سے اُن کو اپنی موروثی شخصی حکومت اور امامت کے خیال میں اور بھی تقویت پیدا ہو گئی کیونکہ حضرت امام حسین ع کی اولاد میں پیغمبر خدا صلعم اور شاہ ایران دونوں کا خون شامل ہو گیا لہذا یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ برادران اہل تشیع کے اعتقادات و روایات اور دینیات میں اسلام کے دوسرے فرقوں سے کیوں اس قدر زیادہ فرق ہے اور کیوں یہ فرقہ خلفائے اولین سے انکار کر کے حضرت علیؓ کو خلافت کا موروثی حقدار بتلاتا ہے اور ان کی اولاد کی خلافت و امامت پر اعتقاد رکھتا ہے جب کہ خالص اسلام ایسے توہمات سے مبرّا ہے بلکہ انہی توہمات کو دور کرنے کے لئے آیا ہے۔

دوسرا فرقہ وہ تھا جو مسیحی اور بربری نومسلموں کے پرانے خیالات سے متاثر ہو کر قائم ہوا جنہے مسیحیت کے اسرار

[…] طاقت روایات اور مصنوعی دینیات کے مطابق اسلام میں بھی یہی تمام باتیں شامل کردیں اور جس طرح سے مسیحیت
[…] کی جماعت علیحدہ قائم تھی اور مقدس سمجھی جاتی تھی اور عام لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت کرتی تھی اسی
[…] ایک تنگ خیال اور قدامت پسند مذہبی پیشواؤں کی جماعت علیحدہ بن گئی جس کی طاقت مسیحی مذہبی
[…] کی طاقت کی طرح قائم ہوگئی اور جیسے مسیحی دینیات سے ملتی جلتی اسلامی دینیات تیار کرلی جس میں رسمی قیود اور
مصنوعی نیکیاں معیارِ مذہب بن گئیں اور حقیقی وحدانیت، مساوات اور قدرتی نیکیوں کی تعلیم نظر انداز کردی گئی۔

تیسرا فرقہ جو کہ دین الفطرت کو ان مصنوعی نیکیوں، رسموں، رازہائے سربستہ اور توہمات سے پاک صاف رکھنا چاہتا تھا، توحید و مساوات کا حامی تھا اور مذہب کو معقولات پر منحصر اور قدرتی نیکیوں کو اس کا شعبا سمجھتا تھا۔ چنانچہ ان فرقوں میں اختلافِ خیالات کی بنا پر سخت مخالفت رہی جو تقریباً دو صدیوں تک جاری رہی۔ خود ان فرقوں میں بھی مختلف شاخیں پیدا ہوگئیں جن میں بسا اوقات تصادم واقع ہوتا رہا لیکن آخر کار چونکہ قدامت پسند اور تنگ خیال فرقہ شخصی اور موروثی حکومت کے موافق تھا اس لئے جب حکومت نے اس کا ساتھ دیا تو اس نے آزاد خیال فرقہ کو تہ تیغ کرکے اس کے تمام علمی مصالحہ کو بالکل اسی طرح جلا دیا جس طرح مسیحی مذہبی پیشواؤں نے مسیحی آزاد خیال فرقہ کو معہ ان کی کتابوں کے نذرِ آتش کردیا تھا۔ اور تنگ خیال فرقہ کے غالب ہونے کا نتیجہ نکلا کہ دین الفطرت منقولات کی مصنوعی قیود اور رسم و رواج کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور اسلامی دینیات کا ویسا ہی اور اسیقدر ذخیرہ جمع ہوگیا جیسا کہ مسیحی دینیات کا ہوا تھا اور جس طرح سے کہ اسلام کے آغاز میں مسیحی مذہبی پیشواؤں نے پیروانِ مسیحیت کی خیالی اور عملی آزادی کو منقولات کی مصنوعی قیود میں محدود کردیا تھا جس سے اسلام نے ان کو رہائی دلائی تھی اب خود اسلامی تنگ خیال فرقہ کے مذہبی پیشواؤں نے پیروانِ اسلام کے خیال و عمل کی آزادی کو منقولات کی مصنوعی قیود میں محدود کردیا جس سے اب انکو کوئی رہائی دلانیوالا ہی نہ تھا۔ اسلام کا آخری اور سب سے بڑا عالم اور فلسفی ابن رشد گزرا ہے جس کے ساتھ تنگ خیال فرقہ نے جو کچھ سلوک کیا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ابن رشد کے بعد پھر کوئی مشہور عالم مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا کیونکہ معقولات، سائنس اور فلسفہ وغیرہ کا حاصل کرنا تنگ خیال فرقہ کے مذہبی پیشواؤں نے خلاف مذہب قرار دیدیا اور جس کی سزا موت مقرر کی گئی۔ بہرحال جب تنگ خیال فرقہ کے مذہبی پیشواؤں نے علوم کو مصنوعی دینیات و منقولات کے اندر محدود کردیا اور تحقیق و تفتیش کرنا خلاف مذہب اور مستوجب سزائے موت قرار دیدیا اسی وقت سے مسلمانوں میں زوال شروع ہوگیا۔ اور جو کچھ بیچارے مسلمانوں پر گذری اس پر تاریخ کے اوراق اشکبار ہیں اور ہندوستان میں تو اس تنگ خیال فرقہ کے مذہبی پیشواؤں کی کوتاہ نظری اور توہم اس قدر ترقی کرگئے تھے کہ انھوں نے انگریزی زبان پڑھنا ہی خلاف مذہب قرار دیدیا تھا اور بیچارے سرسید پر جو اس جماعت نے کفر و ارتداد کی گولہ باری کی تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ صرف اسی ایک واقعہ سے ہندوستان کے مسلمان […] جماعت کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مسٹر جون ولیم ڈریپر اپنی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" کے صفحہ

پر لکھتے ہیں کہ تمام ایشیا افریقہ اور ہسپانیہ کی اسلامی حکومتوں میں مسلمانوں کا ادنیٰ طبقہ علم سے سخت متنفر تھا اور یہ متعصب جماعت تو خلیفہ اعظم المامون کی نجات پر بھی شک کرتی تھی جسکو اس نے ملحد کا خطاب دے رکھا تھا کیونکہ اس نے نہ صرف ارسطو اور دوسرے یونانی مشرکین کی تحریرات کو رائج کر کے لوگوں کے خیالات میں تلاطم پیدا کیا بلکہ زمین کو گول بتلا کر اور اس کی پیمائش کرا کر بہشت و دوزخ کی ہستی ہی کو ناپید کر دیا۔ یہ جماعت اپنی اکثریت کی وجہ سے اس وقت سب سے زیادہ طاقتور سیاسی جماعت تھی۔

"المنصور نے جس نے خلیفہ الحاکم کے پسر کے خلاف تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تھا، یہ خیال کیا کہ وہ اپنا قبضہ مخالفانہ اسی حالت میں قائم رکھ سکتا ہے جب وہ اس متعصب جماعت کی سرپرستی کرے اس لئے اس نے خلیفہ الحاکم کے کتب خانہ کی تلاشی لی اور تمام سائنس اور فلسفہ کی کتابیں منظرِ عام پر لیجا کر جلوا دیں یا محل کے حوضوں میں پھنکوا دیں۔ ایسے ہی احکام کے ماتحت ابن رشد کو عالمِ ضعیفی میں ہسپانیہ سے نکلوا دیا گیا۔ مذہبی پیشواؤں کی جماعت عالموں کی جماعت پر غالب آگئی اور ابن رشد کو بیدین کا خطاب دیدیا، تمام اسلامی دنیا میں علم و فلسفہ کے خلاف ایک باقاعدہ تنظیم قائم ہو گی اور مشکل ہی سے کوئی عالم بچا ہو گا جسکو سزا نہ دی گئی ہو بعض قتل کر دئیے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام منافقوں سے بھر گیا"

اب اس عصبیت کے تاریخی نتائج پر بھی ایک نظر ڈالیئے۔ خلفائے راشدین اور تابعین کے زمانہ میں جبکہ اسلام مصنوعی دینیات کی قیود سے بالکل آزاد تھا یہاں تک کہ کلام مجید کے بعض وہ احکام جنکا تعلق سیاست اور تمدن سے تھا بذریعہ اجماع کے ساقط کر دئیے جاتے تھے اور اس کے علاوہ چونکہ کلام مجید کے احکام عمل ان کے قریب ترین زمانہ اور مقامی حالات کے بہت کچھ مطابق تھے اس لئے جس حیرت انگیزی کے ساتھ اسلام کو اس زمانہ میں ترقی ہوئی اس سے آج تاریخ داں حیرت میں آ رہے ہیں۔ پھر خلیفہ ہارون رشید اور خاص کر مامون رشید اور ان کے قریب کے زمانہ میں خلیفہ وقت کی آزاد خیالی اور علم دوستی کے باعث جب آزاد خیال فرقہ برسرِ اقتدار ہوا تو میدانِ علم و ہنر میں مسلمانوں نے وہ کمالات دکھلائے جن پر آج تمام دنیا کے مسلمان فخر کر رہے ہیں۔ لیکن جس وقت سے تنگ خیال فرقہ نے تحصیل علوم کو خلاف مذہب قرار دیدیا اسی وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔ اوّل اوّل مغلوں نے بغداد کی عظمت کو مٹایا، اور پھر ترکوں نے تو بالکل ہی خاک میں ملا دیا اور یہ سب کچھ محض اس وجہ سے ہوا کہ مذہب کے مصنوعی دینیات کے اندر محدود ہو جانیکے باعث اس میں مقامی ضروریات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنیکی صلاحیت نہیں رہی، مسلمانوں کی ترقی یک بیک مسدود ہو گی اور اگرچہ ان دونوں حملہ آور قوموں نے اسلام کے زرین اصول اور اسکی اس شاندار تہذیب کے سامنے جو آزاد خیال فرقہ کا ترکہ تھی سرِ تسلیم خم کر دیا، لیکن اس زمانہ کے اسلام کے منقولات اور مصنوعی دینیات کی زنجیروں میں مقید ہو جانیکے باعث چونکہ تحقیقات اور ترقی کا دروازہ بند ہو چکا تھا اس لئے اگرچہ مغلوں اور ترکوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی اپنی بعض قومی خصوصیات کے باعث ایک بڑی سلطنت قائم کر کے ایک عرصہ تک حکومت کی لیکن جو علمی

اور معاشی ترقی خلیفہ مامون رشید اور اُن کے قریبی زمانہ میں جبکہ اسلام میں خیال و عمل کی آزادی قطعی سلب نہیں ہوئی تھی بعد اسلام چاروں طرف سے منقولات کی قیود میں محصور نہیں ہوا تھا، اسلامی دُنیا کو نصیب ہوئی مغلوں اور ترکوں کو اُس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوا، البتہ مغل بادشاہوں کا ہندوستان میں وہ زمانہ سب سے زیادہ شاندار گذرا۔ جبکہ شہنشاہ اکبر اعظم نے مذہبی منقولات کی مصنوعی قیود کو توڑ دیا۔ مگر چونکہ بادشاہ کی آزاد خیالی ایک انفرادی حیثیت سے تھی اس لئے وہ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔

اب مُسلمانوں کی موجودہ تنزلی کی حالت پر بھی غور کیجئے اور اسباب تلاش کیجئے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا منقولات کی مصنوعی قیود کے اندر محدود ہو جانا ہی اُس کے موجودہ انحطاط کا سبب ہے۔ جس حصّہ زمین پر آپ جائیے مُسلمانوں کی عام طور پر کم و بیش یہی حالت نظر آئیگی جو ہندوستان میں ہے۔ آخر مُسلمانوں میں کوئی خاص سبب ایسا ضرور ہے جو تمام دُنیا کے مُسلمانوں میں یکساں موجود ہے اور جس نے سب پر یکساں اثر ڈالا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تمام دُنیا کے مُسلمانوں میں سوائے ان کے مذہب کے اور کوئی مشترکہ چیز نہیں ہے لہذا یہ بات کسی اور مزید ثبوت کی محتاج نہیں کہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کے موجودہ تنزل کا سبب سوائے ان کے مشترکہ مذہب کے اور کوئی چیز نہیں لیکن تاریخ ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ زمانۂ سابقہ کے مُسلمانوں نے اسی مذہب اسلام کے ذریعہ سے ایسی حیرت انگیز ترقی کی جس کی مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں لہذا یہ لازمی بات ہے کہ مذہبِ اسلام میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوئی جو اُس کے اثر میں فرق ہو گیا۔ اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اسلام میں سوائے مصنوعی دینیات اور منقولات کی قیود کے اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ کلام مجید ہمارے پاس ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ پیغمبر خدا صلعم کے ذریعہ سے صحابۂ کرام کو ملا تھا، لہذا معلوم ہوا کہ مُسلمانوں کے موجودہ انحطاط کا سبب مذہبِ اسلام نہیں، بلکہ مصنوعی دینیات ہے جسکو خوش اعتقادی یا غلطی سے جزو اسلام سمجھ لیا گیا ہے، اور مُسلمانوں کی یہ غلطی قانون تاریخ کے بالکل مطابق ہے۔ تاریخ اپنے آپکو دُہراتی رہتی ہے اور انسان کو سبق سکھاتی رہتی ہے اور جو جماعت انسانی اُس سے سبق حاصل نہیں کرتی وہ صفحۂ دُنیا سے مِٹ جاتی ہے۔ اِس سے قبل دیگر مذاہب یا اقوام پر اسی قسم کے واقعات گذر چکے ہیں اور آخر میں مسیحی دُنیا پر بھی یہی واقعات گذرے، رومنوں میں جب بیچارے غریبوں اور غلاموں پر سخت جور و تشدّد ہونے لگا، اور دولتمند طبقہ میں فسق و فجور اور عیش و عشرت حد سے تجاوز کر گئے اور یہودیت چند ظاہری رسوم اور مصنوعی دینیات کے اندر محصور ہو گئی تو خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو اُنکی رہنمائی کے واسطے بھیجا۔ جن کی تعلیم نے ایک نئی روح پھونکدی اور رومنوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوا اور تقریباً چند سو برس تک رومن قوم اور زندہ رہنے کے قابل ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ مسیحیت میں اختلاف پھیلا اور مرورِ زمانہ سے حضرت عیسیٰ اور نیز ان کے شاگردوں کی شخصیت کے متعلق حُسنِ عقیدت اس قدر بڑھتا گیا کہ حضرت عیسیٰ کو تو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا ہی بنا دیا اور خدا کے پاس آسمان پر بٹھا دیا اور ان کے شاگردوں اور دوسرے بزرگان دین کو بھی کرامات کی طاقت بخشدی گئی لہذا اُن کے اقوال اور فیصلے دائمی تصوّر کئے جانے لگے جن کے

اندر انسانی زندگی کو محدود کر دیا گیا۔ مصنوعی دینیات کا ایک انبار جمع ہو گیا جس میں سوائے جھوٹی روایتوں کو بیہودہ اور بے معنی رسموں کے اور کچھ نہ تھا اور جو لوگ اس خرافیات پر اعتراض کرتے تھے وہ کافر اور ملحد کہلاتے تھے اور قتل کر دئے جاتے تھے۔ جب خیال و عمل کی آزادی اس طرح سلب کر دی گئی، اور مذہبی پیشواؤں کی جماعت کا ایسا اقتدار قائم ہو گیا کہ لوگ عملی طور پر اُن کے غلام ہو گئے تو ترقی کا دروازہ مسدود ہو گیا اور تنزل شروع ہو گیا۔ چاروں طرف جہالت و توہمات کی تاریکی چھا گئی اور ظلم و استبداد، فسق و فجور اور عیش و عشرت کا بازار گرم ہونے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت روما کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور دوسری آزاد خیال قوم یعنی مسلمان اُن پر غالب آ گئے اور تقریباً اُن کی نصف سلطنت مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی اور اگر خلیفۂ ولید نے اپنے جنرل موسیٰ اور اُن کے لفٹیننٹ طارق کو اُندلس سے واپس نہ بلایا ہوتا تو دُنیا کی تاریخ دوسرے طریقہ سے لکھی گئی ہوتی۔ تاہم مسیحی دُنیا نے اس قانون تاریخ سے سبق حاصل کیا اور جب اُنھوں نے مُسلمانوں کی شاگردی میں رہکر اُن کی آزاد خیالی سے فائدہ اُٹھایا اور علم و ہُنر میں ترقی شروع کی اور مصنوعی دینیات کی زنجیروں کو توڑ کر پھینکدیا تو آج اُن کو پہلے سے بھی زیادہ عروج حاصل ہو گیا۔ اسی طرح سے اوّل اوّل جب مُسلمانوں نے جبکہ اُن کا مذہب مصنوعی دینیات کی قیود سے آزاد تھا اور اُن کو خیال و عمل کی آزادی حاصل تھی، اسقدر تیزی کے ساتھ نصف دُنیا کو فتح کیا کہ ایک عالم حیرت میں رہگیا اور علم و سائنس میں ایسی تعجب خیز ترقی کی کہ آج دُنیا اُس سے بے اندازہ فائدے اُٹھا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ اُس میں صحابۂ کرام، ائمہ سلف اور مجتہدین اولیٰ کے متعلق اس قدر خوش اعتقادی بڑھ گئی کہ اُنکے اقوال اور فیصلے مذہب کا جزو لازمی بن گئے اور مصنوعی دینیات کا اُس سے بھی زیادہ ذخیرہ جمع ہو گیا جتنا مسیحیت میں ہوا تھا۔ ہزارہا بیکار اور بے معنی رسوم کے مجموعہ کا نام مذہب ہو گیا، تعلیم محض مصنوعی دینیات کے اندر محدود ہو گئی اور خیال و عمل کی آزادی سلب ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ توہم اور جہالت ظلم و تشدد اور عیش و عشرت ہر چہار طرف پھیل گئے۔ ترقی مسدود ہو گئی اور تنزل شروع ہو گیا۔ مسیحی آزاد خیال قومیں مُسلمانوں پر غالب ہوتی چلی گئیں۔ مسٹر جے۔ بی۔ ایس ہیلڈن موجودہ زمانہ کے ایک مشہور سائنس داں اور محقق اپنے مضمون "سائنس اینڈ تھیولوجی ایز آرٹ فارمس" میں جوکہ اسی مُصنّف کی کتاب "پوسبل ورلڈز" میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ "خلیفہ المتوکل باللہ جس نے غالباً تمام دوسرے لوگوں سے مذہبی عصبیت کو زیادہ کامیاب بنایا اور خیال و عمل کی آزادی کو سلب کیا اسلامی دُنیا پر مسیحی دُنیا کے فتحیاب ہونے کا ذمہ دار تھا، جبکہ مسیحی دُنیا کو اسقدر آزاد خیالی میسر ہو گئی تھی کہ وہ مادّہ کی حقیقت پر غور کرنے لگی اور بھاپ کی طاقت کے انجن اور طاقتور آتشگیر مادے تیار کرنے کے قابل ہو گئی۔" قانون تاریخ نے اپنا پورا عمل کیا اور اب مُسلمانوں کو اس قانون تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور جس طرح سے مسیحی دُنیا نے مُسلمانوں سے آزاد خیالی کا سبق حاصل کر کے اپنے یہاں اصلاح کر لی ہے مُسلمانوں کو خود اپنے پُرانے شاگردوں سے آزاد خیالی کا سبق حاصل کر کے اپنے یہاں اصلاح کرنی چاہیئے اور یہ کوئی عجیب کی بات نہیں ہے، دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب ایک قانون کے ماتحت ہو رہا ہے۔ اگر مُسلمان آج اپنے یہاں

[illegible] ترقی ضرور کرینگے کیونکہ یہ قانون قدرت ہے جس کے خلاف انسان نہیں جاسکتا البتہ جس قدر دیر ہوگی اُسی قدر [illegible] نقصان ہے۔

جب تاریخ اور تجربہ سے ہم کو یہ معلوم ہوگیا کہ جس وقت تک مسلمانوں میں تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رہا اُس وقت تک [illegible] دنیاوی ترقی اُن کی قدمبوس رہی لیکن جب سے اُنھوں نے تحقیق و تنقید کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا اور تقلید و اسلاف پرستی کو اپنا اصول بنالیا، اسیوقت سے اُن کا زوال شروع ہوگیا، لہذا یہ بات اب کسی مزید تحقیق کی محتاج نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف اسی ایک بات میں مضمر ہے کہ وہ تقلید و اسلاف پرستی کی قید سے اپنے آپکو آزاد کرکے خود تحقیق و تنقید میں اسی طرح سے حصہ لیں جس طرح سے اُن کے اسلاف نے حصہ لیا۔ انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے وہ محض اس وجہ سے کہ اُس میں ادراک شعور ہے لیکن اگر وہ ان سے کام نہ لے اور اسلاف کی کورانہ تقلید کرے تو پھر اُس میں اور دوسرے جانوروں میں کیا فرق رہجاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ عوام الناس تحقیق و تفتیش سے معذور ہیں اور اُن کے لئے سوائے تقلید کے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسی مہلک مرض میں مبتلا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قسم کی فضا میں پرورش پاتا ہے اور جیسی تعلیم و تربیت اسکو بچپن سے ملتی ہے ویسے ہی اُسکے خیالات اور اعتقادات ہوجاتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں اُن کے بچوں کو بچپن سے یہی تعلیم ملتی ہے کہ جو کچھ متقدمین تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کے متعلق لکھ گئے ہیں اس میں کسی قسم کی تحقیق و تنقید کی گنجائش نہیں بلکہ اُن پر تنقید کرنا کفر میں داخل ہے۔ وہی اسلام کے قوانین ہیں اور انہی کی پابندی مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے فرض ہے۔ اس قسم کی فضا میں پرورش پاکر قدرتی طور پر ہمارے قوائے فکری مضمحل ہوجاتے ہیں اور ہمارے اندر غور و تدبر اور نقد و تبصرہ کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کورانہ تقلید پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ ہمیں اپنے مدرسوں کا نصاب تعلیم جتنی جلد ممکن ہو بدل دینا چاہیئے۔ اور درس میں وہ کتابیں داخل کرنی چاہئیں جن میں بزرگان پیشین کی تحریرات پر آزادانہ نقد و تبصرہ ہو۔ مسلمانوں کا یہ اعتقاد کہ تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کے متعلق جو کچھ متقدمین نے لکھا ہے وہ غلطی سے مبرا ہے اور جزو ایمان ہے کسی مستحکم دلیل پر قائم نہیں ہے متقدمین نے جو کچھ لکھا ہے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے اور اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق لکھا ہے، یہ محض ہماری خوش اعتقادی اور اسلاف پرستی ہے جو ہم نے اُن کی تحریرات کو غلطی سے مبرا اور ہر زمانہ کے واسطے لازمی تصور کرلیا ہے ورنہ اگر خود ان متقدمین کے اقوال پر نظر ڈالی جائے اور اس اختلاف پر غور کیا جائے جو اُن میں پایا جاتا ہے تو یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ یہ تمام ذخیرہ اپنے زمانہ کے ماحول کی پیداوار ہے بس اس سے زیادہ اُس کی اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔

سب سے پہلے تفسیر پر نظر ڈالیئے۔ غالباً جتنی تفسیریں قرآن کی لکھی گئیں دُنیا میں کسی صحیفہ آسمانی کی نہیں لکھی گئیں کیا قرآن واقعی ان تمام تفسیروں کا محتاج ہے، اگر واقعی قرآن اُن کا محتاج ہے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ

قرآن کی روشنی چاند کی روشنی کے مانند ہے جو آفتاب کی محتاج ہے حالانکہ قرآن خود آفتاب ہے اس پر کیا کوئی روشنی ڈال سکتا ہے، اس لئے ان تمام تفاسیر کا ذخیرہ قطعی بیکار بلکہ مُضر ہے کیونکہ اس سے اوّل تو اسلام میں اختلافات پیدا ہوتا ہے اور دوسرے قرآن پر یہ حرف آتا ہے کہ باوجود کلام ربّانی ہونیکے وہ اتنا ناقص ہے کہ اُس کا جو مطلب چاہو نکال لو قرآن کو تفاسیر کی مدد سے سمجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تفاسیر ہر مفسر کی ذاتی بلکہ رجحان طبیعت اور اپنے ماحول کے تاثرات پر مبنی ہیں۔ قرآن تو خود یہ کہتا ہے کہ "ولقد یسّرنا القرآن" یعنی ہم نے قرآن کو آسان کیا، لہذا قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہیئے۔ تفاسیر میں تو خود اس قدر اختلاف اور رطب و یابس بھرا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص اُن کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنا چاہے کہ کونسا مطلب صحیح ہے تو یہ اُس کے لئے ناممکن ہو جائیگا۔ امام غزالی صاحب لکھتے ہیں کہ "بہت سی آیتیں ایسی ہیں کہ اُن کے پانچ پانچ چھ چھ اور سات سات معنی صحابہ اور مفسرین سے نقل ہوتے ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی رسول خدا صلعم سے نہیں سُنا اور وہ معنی آپس میں ایک دوسرے کے برعکس ہی ہوتے ہیں اور سب کے سب صحیح نہیں ہو سکتے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے غور اور اپنی اپنی سمجھ سے نکالے گئے"۔ تفسیر امام فخر الدین رازی کے متعلق ابو حیان وغیرہ محققین نے کہا "فیہ کل شئ الا التفسیر" یعنی اس میں سوائے تفسیر کے سب کچھ ہے۔ جب تفاسیر کے متعلق خود متقدمین کی یہ رائے ہے تو اُن کو قرآن کے صحیح معنی سمجھنے کا ذریعہ خیال کرنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے، نہ کہ اُن کو جزو ایمان سمجھنا اور اُن کی کورانہ تقلید کرنا۔ انسانی کلام چونکہ ناقص ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی میں اختلاف ہونا لازمی ہے، حکومت کے قوانین بہت سے اعلیٰ انسانی دماغ مل کر بناتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایسے الفاظ میں تحریر کئے جائیں کہ اُن سے سوائے اسی ایک معنی کے جو مقنن کے ذہن میں ہے، دوسرے معنی نہ نکل سکیں لیکن پھر بھی بعض عالی دماغ وکیل اور بیرسٹر اُن سے اپنے مفید مطلب معنی نکال لیتے ہیں، لیکن خدا کا کلام مکمل ہے، اس کے سوائے ایک معنی کے دوسرے معنی نکل ہی نہیں سکتے اور وہ ایک معنی قرآن ہی کے ذریعہ سے نکل سکتے ہیں اور وہی معنی صحیح ہیں۔ تفاسیر کے ذریعہ سے قرآن کے معنی سمجھنا قرآن کو انسانی کلام تصوّر کرنے کے مترادف ہے۔

حدیث:۔ اس موضوع پر جس قدر بحث ہوئی ہے اُس پر تنقید کرنے کے لئے تو دفتر چاہیئں، لیکن اس تمام بحث و تمحیص کا جو نتیجہ اب تک نکلا ہے وہ یہ ہے مولانا اسلم صاحب جیراجپوری مدیر رسالہ "جامعہ" دہلی اپنے مضمون "منع حدیث" مطبوعہ رسالہ مذکور مورخہ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ اوّل ہی کے عہد میں لوگ روایتوں میں اختلاف کرنے لگے اور جب اُنھوں نے دیکھا تو لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم روایات میں اختلاف کرتے ہو ایک زمانہ آئیگا کہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کرینگے اس لئے رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت نہ کرو۔ (تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ذکر ابی بکر)"

"حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعۂ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانسو حدیثیں تھیں مگر آخیر میں اسکو حضرت عائشہؓ سے لیکر جلا دیا کیونکہ اُنکو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ میں نے کسیکو معتبر سمجھکر کوئی روایت اُس سے لکھ لی ہو اور وہ حقیقت

و نحوه بحديث تذكرة الحفاظ)"

"ملا علی قاری موضوعات میں لکھتے ہیں "یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جسکو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو"

"چنانچہ علمائے اصولیین اور ائمہ محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کو بھی ظنی مانا ہے یقینی نہیں کہا ہے بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے (شیخ طاہر جزائری لکھتے ہیں کہ وہ حدیثیں جن کو متواتر کہا گیا ہے درحقیقت ان میں تواتر معنوی ہے کیونکہ صحیح یہ ہے کہ کوئی حدیث متواتر نہیں ہے) انہوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، موضوع، منکر اور مردود ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہونچ سکتے تھے ورنہ روایت کی تو صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں صحیح یا غلط"

"غرض حدیث کی جو تنقید ہوئی ہے اس میں ابھی بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔ علامہ ابن جوزی نے جو حدیث میں کسی قدر متشدد تھے اپنی کتاب الموضوعات الکبریٰ سنن اربعہ کی بہت سی حدیثوں بلکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم کی بھی متعدد حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے۔ علماء رفع امان کے خیال سے ان کی تردید کی لیکن دلیل بجز اس کے اور کچھ نہ دی کہ مسلم چلی آتی ہیں" (رسالہ جامعہ کا اقتباس ختم ہوا)

جناب مولوی چراغ الدین صاحب اپنی کتاب "دی پروپوزڈ پولیٹیکل، لیگل اینڈ سوشل ریفارمز انڈر مسلم رول" میں جس کا اردو ترجمہ "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے علیگ نے کیا ہے، لکھتے ہیں کہ "جن محققین نے احادیث کو جمع کیا اور ان کی چھان بین کی ہے ان کا یہ قول ہے کہ عموماً کیسی ہی مضبوط اور مستحکم اسناد کیوں نہ ہوں احادیث پر اعتبار نہیں ہو سکتا اور نہ جو شے اس میں بیان کی گئی ہے اس کا یقینی علم ان سے حاصل ہو سکتا ہے"

جب حدیث کی صحت کا یہ حال ہو کہ کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یقینی طور پر صحیح ہے تو انکو تحقیقات کی غرض سے پڑھنا ضرور ایک حد تک مفید شغل ہو سکتا ہے لیکن انکو قرآن کے سمجھنے یا مسائل زندگی کے حل کرنے میں بطور اسناد کے پیش کرنا اور ان پر اپنی موجودہ زندگی کے اہم مسائل کو منحصر کر دینا کہاں تک قرین صواب ہو سکتا ہے۔

اب رہا فقہ تو اس کے متعلق کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ جب تفاسیر و احادیث کا یہ حال ہے تو فقہ کس شمار میں ہے جو نہ تو پیغمبر خدا صلعم نے لکھا یا نہ آپ کے وقت میں لکھا گیا اور نہ صحابۂ کرام کے زمانہ میں مدون کیا گیا۔ اس میں صرف فقیہوں کی رائیں درج ہیں جن کا تعلق آئین جہانبانی اور معاشیات سے ہے۔ قرآن و حدیث سے اگر اس کا کچھ تعلق ہے، تو وہ صرف اتنا ہے کہ ان فقیہوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اور ضروریات زمانہ کے موافق استدلال کیا ہے جس میں غیر مستند اقوال و روایات کو زیادہ دخل ہے۔

یہ ہے حقیقت اُن تمام ذخائر و دفاتر کی جو اسلامی دینیات کے نام سے موسوم ہے جن کی تعلیم ہمارے مدرسوں میں دینی تعلیم کے نام سے دیجاتی ہے اور طلبا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تمام علوم ان کے اندر موجود ہیں، جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ آمنا و صدقنا کہہ کر مان لو، اس میں نہ تو کسی نقد و تبصرہ کی ضرورت ہے نہ مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش ہے اور بس یہی اعتقاد ہمارے طلباء کے دماغوں پر نسل بعد نسل مسلط ہوتا چلا آیا ہے۔ اعتقاد ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے خلاف کسی قسم کی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی۔ برکلے کا قول ہے کہ کوئی شے کتنی ہی تیز اور صاف روشنی میں رکھی ہوئی ہو لیکن اگر بصارت میں نقص ہے یا آنکھ دوسری طرف متوجہ ہے تو وہ ہرگز پوری طرح نظر نہیں آسکتی۔ یہی حال ذہن بشری کا ہے، کسی حقیقت کے ثبوت میں کتنے ہی مضبوط و مستحکم دلائل و شواہد موجود ہوں، لیکن اگر دل میں پہلے سے اس کے خلاف تعصب موجود ہے تو کیا اسے طبیعت قبول کرے گی؟"

(از مکالمات برکلے ترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

ایک اور بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اچھی چیزیں محض اپنی اچھائی کی وجہ سے قائم رہتی ہیں لہذا کسی چیز کو مصنوعی ذرائع سے قائم رکھنا اس چیز کی خرابی کی دلیل ہے اگر ہماری مصنوعی دینیات (تفسیر حدیث اور فقہ وغیرہ) اچھی چیزیں ہیں یعنی انسانیت کے لئے مفید ہیں تو وہ خود قائم رہینگی اُن کے متعلق تنقید اور نکتہ چینی سے لوگوں کو زبردستی باز رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ جو لوگ اُسے قائم رکھنا چاہتے ہیں انہیں خود اس کی اچھائی پر پورا یقین نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس کھرا سکّہ ہے تو اُسے نقاد سے کیا خوف ہو سکتا ہے، ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بات کا بغیر سمجھے یقین کرنے کی اور غیر رواداری کی عادتیں انسانی دماغ کے لئے زہر قاتل ہیں اور اگر ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو حقیقی معنی میں انسان بنانا ہے اور زندگی کی دشوار گذار منازل طے کرنیکے لئے تیار کرنا ہے، تو ہمیں سب سے پہلے ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیئے کہ ہمارے طلباء میں تحقیق و تفتیش رواداری اور قدرتی نیکیوں کی عادتیں پیدا ہوں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم جن اصولوں پر کہ آجکل ہمارے مدرسوں میں دیجاتی ہے وہ تو محض انسانوں کو ایک ایسی مشین بنا دیتی ہے جس کا شعور و ادراک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جس سے وہی پرانے نمونہ کے یکساں خیالات تیار ہوتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں ایسے جدید علوم کی تعلیم دیجائے جن سے دماغ میں وسعت اور تحقیق و تنقید کی صلاحیت پیدا ہو اور اس ذخیرۂ دینیات پر آزادی کے ساتھ نقد و تبصرہ کیا جاسکے اگر واقعی یہ ذخیرہ کھرا اور سچا ہے تو اس نقادی سے اُس کا کھرا پن اور سچائی اور زیادہ روشن ہو جائیگی اور اگر اس میں کچھ کھوٹ اور رطب و یابس بھرا ہے تو وہ صاف ہو کر کھرا سونا باقی رہ جائیگا۔ اور اگر یہ کُل کا کُل کھوٹ ہے تو ہم کو ایک دھوکے سے رہائی حاصل ہو جائیگی لہذا نقادی ہر حالت میں ہمارے لئے مفید ہی ثابت ہوگی لیکن اگر اسکو بغیر پرکھے ہوئے اعتقاداً کھرا اور سچا مانا جائیگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغ ایسے تنگ اور تاریک ہو جائینگے کہ اُن میں پھر کسی چیز کی تحقیق و تفتیش کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اور چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ مسلمانوں کا تنزل اسی روز سے شروع ہوتا ہے جس روز سے ان کی تعلیم مصنوعی دینیات کے اندر محدود کر دی

اور اسے پر تقید تبصرہ کفر قرار دیدیا گیا۔ بس مسلمانوں کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ رواداری اور فکری آزادی کے اصول کو اپنا نصب العین بنائیں۔

ہمارے اس مضمون اور اس تجویز پر پرانی قسم کے عربی مدرسوں کی تعلیم پایا ہوا طبقہ ضرور چراغپا ہوگا اور ہونا چاہیئے کیونکہ اس کی نشوونما ہی ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ وہ کسی پرانی چیز کے متعلق نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرسکتا اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے ان خیالات کو کفر و ارتداد سے تعبیر کیا جائے کیونکہ اپنے ذخیرہ کی حفاظت کے لئے اُن کے پاس بس یہی ایک حربہ موجود ہے۔ لیکن اگر ہمارے اس کفر و ارتداد سے قانون کے بعض خوشحال طبقوں میں اس کورانہ تقلید اور اسلاف پرستی کے مضر نتائج کا محض احساس ہی پیدا ہو جائے، تو ایسا کفر ہمارے لئے مروجہ اسلام کے مفہوم سے بدرجہا بہتر ہوگا۔

(صدائے حق)

"پھر یاد سی تیری آتی ہے"

جب پچھلے پہر کی کوئل اُٹھ کر پیت کے گیت سناتی ہے

جب شب کے محل سے صبح کی دُلہن آنکھیں ملتے آتی ہے

جب سرد ہوا ہر پگ ڈنڈی پر لہراتی۔ بل کھاتی ہے

جب بات صبا سے کرنے میں اِک ایک کلی شرماتی ہے

جب پہلی کرن سورج کی اُٹھ کر سیر چمن کو آتی ہے

آکاش سے لے پاتال تلک جب سنی سی چھا جاتی ہے

تب کیا جانے کمبخت صبا چپکے سے کیا کہہ جاتی ہے

پھر درد سا دل میں ہوتا ہے پھر یاد سی تیری آتی ہے

مظفر حسین شمیم،

"کیوپڈ کی شرارت"

کائنات کا ذرہ ذرہ بہار کی سبز دیوی کے استقبال میں محو و منہمک تھا ــــــ

اور فضاءِ آسمانی پر قوس و قزح کے دلفریب رنگ عجب سماں پیدا کر رہے تھے!

بارش ہو کے رُک چکی تھی اور رقاصۂ فلک نے زمزمہ لگانا شروع کر دیا تھا ــــــ

موسیقی کی دلکش تانیں بلند ہو رہی تھیں اور اندھا کیوپڈ اپنے شکار کی تلاش میں مسکراتا ہوا شاہراہِ عشق پر گامزن ہوا!

مشتری دریائے موسیقی میں غرق ہو رہی تھی اور نازک اندام دیوتا اُچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا ـــــ شباب کے شہزادے نے حسن کی دیوی کی طرف دیکھا اور ــــــ

کیوپڈ نے سان پر ہاتھ رکھا!

یکبارگی حسن کی دیوی کی معصوم نگاہیں شباب کے شہزادے پر پڑ گئیں اور ـــــ ترکش سے دو تیر نکال کر اندھے دیوتا نے اُس طرف چھوڑ دیئے!

وہ بہت خوش تھا۔

تیر ٹھیک کتے، کمان سنبھالی اور خوش و خرم واپس لوٹا ــــــ

رقاصۂ فلک تھک چکی تھی اور تانیں آہستہ ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں ....

زہرہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کیوں! اپنی شرارت نہ چھوڑے گا؟"

کیوپڈ نے اندازِ طفلانہ میں جواب دیا۔ "اَمّاں کیا میری تیر اندازی اچھی نہیں ہوتی؟"

(۲)

شباب کے شہزادے کی بینائی حسن کی دیوی پر قربان ہو چکی تھی ــــــ

وہ دیوانہ وار اُس کی محبت میں اُسکو ڈھونڈنے کے لئے سنسان لق و دق میدانوں کی طرف نکل گیا جہاں ہنستے ہوئے پھولوں نے اُس کا خیر مقدم کیا!

ــــــ حسن کی دیوی کا دل مضطرب، مجروح ہو چکا تھا۔ اور وہ شباب کے شہزادے کی یاد میں تڑپ تڑپ کر اپنا حسن کھو چکی تھی ....

آخر کار وہ اپنے محب کی تلاش میں ایسی جگہ جا پہونچی جہاں خارِ مغیلاں نے اُس کا استقبال کیا!

ــــــ کوئی بھی کسی کو نہ پا سکا .... وہ ایک دوسرے کی یاد میں روتے اور تڑپتے لیکن عشق کا دیوتا

اسکو محض ایک کھیل سمجھ کر ہنستا اور خوش ہونا!

"ہر ایک چیز فنا ہونے والی ہے!" کے مصداق دونوں نے ایک دوسرے کے کارن کیوپڈ کے تیر سے اپنی جانیں دے کر اجسام فانی اور اُن کی تکالیف سے نجات حاصل کی ——

اب تو معصوم وینا کی مسکراہٹ بھی کم ہوگئی ——

اُس نے ہار سنگھار کے ڈنٹھلوں، کنول کے پھولوں اور موگرا و موتیا کی پنکھڑیوں سے دونوں کی روحوں کو آراستہ کیا اور اُن کے گرد کئی چکر لگائے!

—— "شباب" اور "حُسن" ایک جگہ! ——

چنچل کیوپڈ نے اُن کی طرف دیکھا اور بھویں اُن پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف چلدیا ——

"نمسکار کا متلاشی!

مشتری نے ساز چھیڑا اور زہرہ اُس کی ماں! اُس کا انتظار کرنے لگی ——

صادق الخیری،

احسن الکلام

ہر گُل ہی شکلِ جام، کفِ شاخسار میں
ساقی کا فیض عام ہی جاری بہار میں

عاشق کا داغدار جگر لالہ زار میں
گل ہے مگر کھلا ہی خزاں کی بہار میں

ہے کوئی عاشقوں میں! جو اتنا بتا سکے
دل کیا بلا ہے پہلوئے اُمیدوار میں

ڈالے نظر وہ گوشہ نشینِ فراق پر
زندوں کو جو نہ دیکھ سکا ہو مزار میں

کیا اِک جگہ قرار، شبِ وعدہ ہو مجھے
اِک شوخ ہی نظر میں، نظر انتظار میں

جھکتی ہی وہ، تو اور بھی سمجھتے ہیں دل اُدھر
پنہاں ہیں شوخیاں نگہ شرمسار میں

اب کس سے کچھ کہوں کہ وہ کہتے ہیں برملا
ہے انتظامِ حشر مرے اختیار میں

دل بے قرار، عمر گریزاں، نفس رواں
ہم کیا جمیں کسی نظرِ اعتبار میں

ایسے چمن سے عاشقِ گل کیا نہال ہو
پھولوں کی ڈالیاں ہوں جہاں دستِ خار میں

پھیلا ہوا ہی سب سر و سامانِ جنوں
دامن کی دھجیوں میں گریباں کے تار میں

عاشق توجہاتِ نظر کا ہے منتظر
اب وہ کرم میں ہوں کہ ستم ہے یار میں

احسن بلاکشانِ محبت کی خیر ہو
حلقے پڑے ہیں آج سوا زلفِ یار میں

احسن مارہروی،

”بے کس!“

مَیں اوورجن کے مقام پر، فرانس کی دلفریب پہاڑیوں میں، جو نہ زیادہ اونچی ہیں، نہ زیادہ وحشت خیز، بلکہ دل خوشکن اور مانوس معلوم ہوتی ہیں، پیدل سفر کر رہا تھا۔ اب میں سینسی پہاڑی پر پہنچ چکا تھا اور مسافروں کے معبد نوٹرڈام کے قریب ایک مختصر سی سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک بوڑھی عورت پر پڑی، جس کی صورت بڑی عجیب وغریب اور حیرت انگیز تھی۔ وہ ایک میز پر دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھی!

اس کی عمر کم ازکم ستّر سال کی ہوگی ——— دراز قد، لاغر، پژمردہ جسم، اور سفید بال، پرانے فیشن کے مطابق پیچ وخم کھاتے ہوئے کانوں کی لوؤں تک لٹک رہے تھے! وہ خانہ بدوش انگریز عورتوں کی طرح بھدّا اور عجیب سا لباس پہنے ہوئے تھی ——— اس آدمی کی طرح جو لباس سے بالکل لاپرواہ ہو۔

اس کے اوضاع واطوار کچھ عجیب سے تھے ——— بے قرار آنکھیں، اور چہرہ اس انسان کا سا جس کی زندگی بہت تلخ گذری ہو! میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور دِل میں کہا۔ ”یہ کون ہے؟ اُس کی زندگی کس قسم کی ہوگی؟ اور یہ کیوں اِن پہاڑیوں میں تن تنہا پھر رہی ہے؟“

اُس نے بِل کی رقم ادا کی۔ اور ایک عجیب وضع کا کمبل کندھوں پر متوازن کرکے چلنے کے لئے اُٹھی۔ اُس نے کونے میں سے ایک بڑا صندوق لیا جس کے زنگ آلودہ لوہے پر بہت سے نام کُھدے ہوئے تھے۔ اور اکڑ کر اس حبشی رساں کی طرح لمبے لمبے قدم اُٹھاتی چل پڑی، جو اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے جا رہا ہو!

دروازے پر گائیڈ اُس کا انتظار کر رہا تھا، دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ میں نے اُسے اس راستے پر چلتے دیکھا جو جنگل کو کاٹتا ہوا ایک وادی میں چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے قد میں لمبی تھی۔ اور اس سے تیز رفتار معلوم ہوتی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد میں اس نشیب والی پہاڑی زمین کے کنارے پر چل رہا تھا جس کے مرکز میں ایک سرسبز وادی پر جہاں درخت، جھاڑیاں، چٹانیں اور پھول اُگ رہے تھے۔ ایک مدوّر جھیل بہیون واقع تھی۔ اس کا پانی اس قدر شفاف اور آسمانی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ نیلگوں آسمان سے اُتر کر ابھی جھیل میں گرا ہوگا۔ اور نظر فریب اس قدر کہ جی چاہتا تھا کہ اس ڈھلان پر ایک جھونپڑی میں زندگی کو تمام کر دیا جائے جہاں سے جھیل کا ساکن اور ٹھنڈا پانی محوِ خواب معلوم ہوتا تھا۔

وہ وہاں ساکن وجامد کھڑی تھی۔ اور اس شفاف پانی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، جو ایک ٹھنڈے آتش فشاں پہاڑ کی تہ میں جمع تھا۔ اُس کی نگاہ پانی کی اتھاہ گہرائیوں پر مرکوز تھی۔ جس میں ایک عظیم الجثہ مچھلی رہتی تھی۔ اس مچھلی کے متعلق مشہور تھا کہ بہت سے انسان اس کی خوراک بن چکے ہیں۔ جب

میں اُس کے پاس گیا۔ تو دیکھا کہ اُس کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو نکل رہے تھے۔ مگر وہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتی گائیڈ کے ساتھ جانے کے لئے چل پڑی، جو کسی سرائے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اُس دن اُسے دوبارہ نہیں دیکھا۔

دوسرے دن رات کے قریب میں موروَل کے قلعے میں پہونچا۔ موروَل ایک چھوٹا سا پُرانا قلعہ ہے جو اس وسیع و عریض وادی کی مرکزی چوٹی پر واقع ہے، جہاں سے تین جھیلوں کو راستے جاتے ہیں، قلعے کے مینار آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقار، قدیم مضبوطی، اور شان و شکوہ کے لحاظ سے اپنی موجودہ شکستہ حالت میں بھی دیگر کھنڈروں سے زیادہ دلکش اور ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہاں تن تنہا اونچی پہاڑی کی طرح کھڑا ہے، زائرین، برف سے ڈھکے ہوئے ڈھلواں راستے کے ذریعے ایک پست دروازے میں داخل ہوکر ان دیواروں کے دامن میں ٹھہرتے ہیں جو اردگرد کے تمام پہاڑی علاقوں سے اونچی ہیں۔

قلعہ، شکستہ کمروں، سیڑھیوں، غیر آباد راستوں، تہ خانوں، شکستہ دیواروں ——— جو درمیان سے مسمار ہوچکی ہیں صحیح و سلامت محرابوں، اور غیر مسقف زمینوں پر مشتمل ہے .... میں اکیلا اس کھنڈر میں پھر رہا تھا۔

اچانک ایک چھوٹی سی دیوار کے پیچھے، مجھے مبہم انسانی شکل دکھائی دی، میں مارے خوف کے تھرا گیا۔ مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی عورت ہے جو میں نے اس سے قبل پہاڑ پر دیکھی تھی، وہ رو رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں رومال تھا۔

میں جانے کے لئے مُڑا، مگر اُس نے مجھے اس انداز میں آواز دی جیسے اس بے خبری کی حالت میں پائے جانے پر نادم ہے۔

"ہاں، موسیو! میں رو رہی ہوں .... اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے!"

"مادام! مجھے معاف کرو کہ میں تمہارے سلسلۂ خیالات میں مُزاحم ہوا" یہ کہکر میں گھبرا گیا۔ پھر بولا۔ "ہاں تم بلاشبہ کسی ناخوشگوار واقع کا شکار معلوم ہوتی ہو!"

اُس نے پست آواز میں کہا "ہاں، میں اس کتے کی طرح ہوں جو اپنا راستہ بھول چکا ہو" اور وہ اپنا رومال آنکھوں پر رکھکر سرد آہیں بھرنے لگی۔

میں اُس کی رقت انگیز آہوں سے بہت متاثر ہوا اور اس کا ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹا کر اُسے تسلی دی، اس نے فوراً مجھے اپنی آپ بیتی داستان سُنانی شروع کردی۔ گویا وہ دیر تک رنج والم کو چھپانا برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

"آہ ——— آہ ——— ! موسیو! اگر تم کو معلوم ہوجائے کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں، تو.......!"

"میں خوشگوار زندگی بسر کیا کرتی تھی .... میرا گھر بھی ہے .... اپنے دور اُفتادہ وطن میں جہاں میں نہ جا سکتی۔ اور نہ ہی کبھی جاؤں گی۔ آہ! وہ مجھے کھانے کو دوڑتا ہے۔

"میرا ایک لڑکا تھا .... وہ ابھی تک زندہ ہے .... اگر اب مجھے اس سے ملنے کا موقع مل جائے۔ تو میں اُسے پہچان بھی نہ سکوں .... آہ اس سے میں کس قدر محبت کیا کرتی تھی ــــ اُس کی پیدائش سے پہلے بھی جب وہ میرے پیٹ میں متحرک معلوم ہوتا تھا اور اب بھی ــــ! میں جوشِ اُلفت میں اُسکو گلے سے لگایا کرتی تھی۔ اور بے حد بے اندازہ پیار کیا کرتی تھی۔ آہ آپ کو کیا معلوم کہ کتنی راتیں میں اس کی نگہبانی کرتے بے خواب گزار دیا کرتی تھی اُس کی اُلفت میں دیوانی سی ہو گئی تھی .... وہ آٹھ سال کا تھا جب اُس کے باپ نے اُسے بورڈنگ سکول میں بھیجا۔ اُسی دن سے میرے اور اُسکے تعلقات تقریباً ختم ہو چکے تھے .... آہ اس دن سے وہ میرا نہیں رہا تھا وہ تو کے اتوار گھر آیا کرتا تھا۔

"اُس کے بعد وہ پیرس کے کسی سکول میں بھیجا گیا۔ پھر وہ سال بھر میں صرف چار مرتبہ گھر آتا تھا۔ اور ہر بار میں اس میں نئی نئی باتیں پاتی تھی۔ وہ اب بڑا ہو گیا تھا، گو اُس نے اپنی نشو کو محسوس نہ کیا ہوگا .... اس کی اُلفت بھرا بچپن اس کا لگاؤ، اس کی محبت، اور وہ خوشی جو مجھے اس کی پرداخت میں حاصل ہوا کرتی تھی۔ تمام کے تمام مجھ سے جاتے رہے۔

"میں اُسے سال میں چار دفعہ دیکھ لیا کرتی تھی .... اس پر ذرا غور کرو سال میں صرف چار دفعہ! اور ہر بار اُس کی ہنسی، اس کی آنکھیں، اس کی چال ڈھال، اُس کی آواز، اور اس کا جسم پہلے سے بہت مختلف اور میری ہدایات سے مستغنی معلوم ہوتا تھا .... آہ بچے کتنی جلدی اپنی حالت بدل لیتے ہیں اور یہ چیز کس قدر رنج پہنچاتی ہے؟

"ایک سال وہ اس حالت میں آیا کہ اس کے گالوں پر سبزہ نمودار تھا وہی میرا بیٹا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی، اتنی کہ اُسے چومتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی! کیا یہ میرا ہی لڑکا تھا، جس کے بال گھنگھریالے اور اتنے دلفریب تھے؟ کیا یہ وہی بچہ تھا جو اتنے برس پہلے پیدا ہوا اور جسے میں فراخ، ڈھانپ لینے والے کپڑوں میں لپیٹ کر اپنی آغوش میں لٹایا کرتی تھی! جس نے میرا دودھ پیا تھا! ــــ اپنے ننھے ننھے تشنہ ہونٹوں کے ساتھ ــــ! جو محبت بھرے لہجہ میں مجھے "ماں" کہہ کر پکارا کرتا تھا! جو محبت کو فرضِ اولین سمجھ کر مجھ سے محبت کیا کرتا تھا! اور جب میں محبت کے جوش میں اُسے باہوں میں لے کر دبایا کرتی تھی تو وہ میری پیشانی پر شیریں بوسہ دیا کرتا تھا! .... آہ! اب بڑا ہو کر وہ یہ بھول گیا ہے کہ بچے کس طرح فرطِ اُلفت میں ماں سے لپٹ جاتے ہیں!

"میرا شوہر مر گیا۔ اس کے بعد میرے والدین کی باری آئی .... میری دونوں بہنیں چل بسیں۔ آہ! جب موت کسی گھر میں داخل ہوتی ہے تو وہ جلد از جلد، اور جتنا بھی ہو سکے گھر کا صفایا کرتی چلی جاتی ہے تاکہ

عرصہ دراز تک اُسے اُس گھر میں آنے کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ وہ ایک یادگار باقی چھوڑ جاتی ہے تاکہ زندہ مُردوں کی آہ وزاری میں اپنی جان کھویا کریں!

"میں اکیلی رہ گئی........ اُن دنوں میرا بڑا لڑکا بہت فرمانبردار تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اسی کے پاس رہوں اور اسی کے پاس مروں!

میں اُس کے پاس چلی گئی۔ تاکہ ہم باقی زندگی اکٹھی گذاریں۔ اُسکے عادات میں جوان آدمیوں کی طرح استغنا اور بے پروائی کی بُو آتی تھی۔ اس نے مجھے کسی نہ کسی طرح سمجھا دیا کہ میں اس کے پاس رہکر اس کے لئے وبال جان بنی ہوئی ہوں۔ میں واپس گھر آگئی مگر ایسا کرنے میں میں نے سخت غلطی کی!

میں نے بمشکل اُسے دوبارہ دیکھا ہوگا۔

اُس نے شادی کر لی۔ مجھے یہ سُنکر حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ ہم پھر اکٹھے مل کر رہیں۔ میں بہتوں کی بڑی خواہشمند تھی.......!

اُس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی تھی جو مجھے سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی۔ یہ کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں اس سے بے حد محبت کیا کرتی تھی!

میں دوبارہ نکال دی گئی۔ اب میں تن تنہا رہ گئی....... ہاں موسیو! بالکل اکیلی! وہ انگلینڈ چلا گیا۔ کیونکہ وہ اپنے سسرال میں رہنا چاہتا تھا.......... تم نے سمجھ لیا موسیو! انہوں نے خندہ پیشانی سے اُسے رہنے کی اجازت دی۔ کیونکہ وہ اُسے بمنزلہ اپنے بیٹوں کے سمجھتے تھے۔ آہ اُنھوں نے اُس کو مجھ عاجز سے چھین لیا.....

وہ مجھے ہر ماہ خط بھیجا کرتا تھا....... پہلے وہ مجھے دیکھنے کی خاطر بھی آیا کرتا تھا۔ مگر اب وہ نہیں آتا۔

"آج سے چار سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا...... اُسکے چہرے پر جھُرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اُسکے بال سفید ہو رہے تھے........ کیا یہ ممکن تھا کہ میرا ننّھا سا بچّہ اتنی جلدی بُوڑھا ہو جائے گا.... آہ اب میں اُسے کہیں نہیں دیکھ سکتی!

"میں تمام سال سفر کرتی رہتی ہوں ــــ کبھی دائیں طرف، کبھی بائیں طرف جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو!

"میں بھُولے ہوئے کُتّے کی طرح ہوں...... لو موسیو! اب خدا حافظ میرے پاس سے چلے جاؤ.... میرے دل کو یہ بات مجروح کر رہی ہے کہ میں نے کیوں اپنی غم انگیز داستان تمہیں سُنادی!"

جونہی کہ میں پہاڑ کے نچلے حصہ پر گیا۔ اور اوپر نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ بُوڑھی عورت ایک شکستہ حال دیوار پر کھڑی پہاڑیوں، وسیع وادیوں، اور جھیل کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔

اُس کے کپڑوں کے سرے، اور وہ عجیب غریب کمبل، جو اس کے دُبلے کندھوں پر پڑا تھا، ہوا میں جھنڈے کی طرح لہرا رہے تھے!

(موپساں) ــــــــ ٭٭٭ ــــــــ طاہر قریشی

بادۂ حافظ

دردِ ہمدوش رضا ہو کے نمایاں ہو جائے
آج "راحت گہِ تسلیم" کا عرفاں ہو جائے

عشق پہلو سے اگر مضطر و گریاں ہو جائے
حسن ہر حال میں گلزار بداماں ہو جائے

شکوہ ہر دم کا اگر رنج کا عنواں ہو جائے
عشرتِ قرب ابھی تلخیِ حرماں ہو جائے

حسنِ فطرت کا ہر اک راز نمایاں ہو جائے
خود صنم خانہ اگر محرمِ ایماں ہو جائے

نورِ خورشیدِ سحر بھی عرق افشاں ہو جائے
اس کو محسوس اگر شامِ غریباں ہو جائے

دو نوں عالم میں یہی غیرتِ عرفاں ہو جائے
دل اگر درد سے حاصلِ درماں ہو جائے

وجہِ غم بن گئی اُن کے لئے مرگِ دشمن
میرے افسانے کا اے کاش یہ عنواں ہو جائے

ہوں کسی وجہ سے پابندِ سلاسل ورنہ
ایک نالہ میں ابھی وا درِ زنداں ہو جائے

حسن دیکھے جو کہیں دل کی تجلی کی بہار
اور کچھ ہو نہ سکے سر بہ گریباں ہو جائے

دیکھئے ہوش مجھے اور اثر پاشس زباں
میرا ذمہ ہے جو پھر زلف پریشاں ہو جائے

عشرتِ دوش غلط حسرتِ فردا بیکار
آج ہونا ہے جسے دردِ سرِ رقصاں ہو جائے

نزہتِ زیست یہی ہے کہ باندازِ لطیفت
نکہتِ گل کی طرح جانِ گلستاں ہو جائے

چھیڑ دیں اصغر و ہادی جو ربابِ فطرت
کیا عجب حافظ مضطر بھی غزل خواں ہو جائے!

حافظ بنارسی

بیگانۂ شاعری

اہلِ بصیرت نے شاعری کی مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن میرے نزدیک وہ تمام کی تمام ادھوری اور ناقص ہیں، بعض لوگوں کے سمجھانے کے لئے منطق، فلسفہ، اور دیگر علوم کی طرح شاعری کی رسمی تعریف کی جا سکتی ہو لیکن حقیقتِ شعر اور اس کے مظاہر کو تعریف و تشکیل کے اس محدود قفس میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ اگر دریا کوزے میں بند ہو سکتا ہے، اگر آفتاب کی شعاعیں بوتل میں اکٹھی کی جا سکتی ہیں۔ اگر صحرا کی خاک مٹھی میں [illegible] جا سکتی ہے، تو پھر شاعری کی تعریف بھی چند الفاظ میں ہو سکتی ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اس فنِ لطیف کی تعریف و تشریح کے لئے بھی دفتر درکار ہے۔

اس یقین و اعتراف کے بعد میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں چند سطور میں "شاعری" کی مکمل تعریف کر سکوں، مگر ہاں میں ایک ایسے نقطے سے آپ کے وجدان کو روشناس کرانا چاہتا ہوں جس کو صحیح معنے میں لفظ "شعر" کا مرادف کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ مرادف لفظ "الہام" ہے۔ الہام کی اجمالی تعریف یہ ہو کہ جو "شے انسان کے دل و دماغ پر بغیر کسی تفحص و سعی کے القا ہو جائے" وہ الہام ہے۔ کوئی چیز اپنی خصوصیات کے اعتبار سے خواہ کسی قدر مہتم بالشان کیوں نہ ہو، اگر اس کا ظہور مندرجۂ بالا تعریف کے تحت نہیں ہوا تو اس کو کسی اعتبار سے "الہام" نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا سائنس کے نظریئے، فلسفہ کے اصول، منطق کے قضیئے، اور اقلیدس کی اشکال، انسانی ذہن کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور "الہام" نہیں ہیں۔ اہلِ فلسفہ کائنات کے جسم سے سروکار رکھتے ہیں، اور مادیات کی تہوں سے خزف ریزے چنتے ہیں لیکن شاعر کی نظر روحِ کائنات پر ہوتی ہے اور چونکہ یہ مسلّم اور ناقابلِ ابطال حقیقت ہو کہ روح کبھی فنا ہوتی ہو اور نہ تبدیل، لہٰذا شاعر کے پیغام بھی انقلاب و حوادث کی دستبرد سے مصؤن و محفوظ رہتے ہیں۔ یہی سبب تو تھا کہ ارسطو اور بطلیموس کے نظریوں کی اہلِ علم نے دھجیاں بکھیر دیں، مگر رودکی اور خیام کے ایک پیغام کا بھی ابطال نہ ہو سکا۔ اور آج صدہا سال گذر جانے کے بعد بھی ان سرمدی پیغاموں پر روح جھومنے لگتی ہے۔ الہام کی ایسی شراب سے مست ہو کر مولانائے رومی نے بے اختیار پکارا تھا کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔

شاعر کی خصوصیت

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہو کہ دنیا کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں "شاعر" کو قدرت نے چند ایسی خصوصیات سے نوازا ہے کہ اس کا وجود عام انسانوں سے ممتاز نظر آتا ہو۔ خبر آتی ہے کہ "بحرِ قلزم میں جاپانی جہاز غرق ہو گیا۔ اتنے ملاح، اتنے مسافر سمندر کے آغوش میں موت کی نیند سو گئے"۔ دنیا میں کتنے لوگ ایسے نکلیں گے جن کی آنکھیں اس خبر کا مطالعہ کرنے کے بعد اشکبار ہو جائیں گی، اور کتنے دل ایسے ہونگے جن کی رگیں اس وحشت اثر خبر سے تڑپ اٹھیں گی؟ لیکن شاعر کا یہ حال ہو کہ انسانی ہلاکت تو کجا، اس سے بے جان اشیاء کی ہلاکت و بربادی کا نظارہ نہیں دیکھا جاتا۔ پھولوں کی پژمردگی پر اُس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہو۔ سبزے کی پامالی پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، پھول کی نرم و نازک پتی پر جب شبنم کے قطرے سورج کی کرنوں کی زد میں کانپتے ہوتے ہیں تو شاعر کا دل بیقرار ہو جاتا ہے۔ بلبل کی آہ و زاری پر اس کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے، پپیہے کی فریاد پر اُس کے دل میں ٹیس اٹھتی ہے۔ غرض کائنات کے ہر شے کی بربادی و تباہی پر وہ متالم و متأسف ہوتا ہو۔ دور دور… اس فلسفہ پر ایک گہری نظر ڈال لئے اس کے بعد نتیجہ اخذ کیجئے اور پھر شاعر اور عام انسانوں کے مابین ایک امتیازی خط کھینچ دیجئے ———— یہ تصویر کا ایک رخ تھا، اب دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے

فضائے نور میں جب ننھے انگڑائیاں لیتے ہوتے ہیں تو آپ اُن کو پامال کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا ہو رہا ہے، لیکن شاعر اس سکوت کو ایک مستقل ہنگامہ سمجھتا ہے اور اسکے کان بے جان اور جامدوں کی زبان سے فطرت کی کہانی سنتے ہیں۔ شمع کو آپ نے بارہا جلتا ہوا دیکھا ہے، یہ بھی دیکھا ہے کہ چند پتنگے اُسکی تپش سے جل مرتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی شمع و پروانہ آویزش پر غور و تدبر کیا ہے؟ اور اُس وقت جب کہ چند بے زبان ہستیاں، مردانہ وار جان دے رہی تھیں، آپ کے تفریحی قہقہے چیخوں مُبدل ہو گئے؟ آہ و بکا کو جانے دیجئے۔ یہ تو دُور کی بات ہے، کیا آپ کی زبان سے اُف بھی نکلا؟ مگر شاعر کی نظر میں شمع اور پروانہ کا وجود دُنیا، اور ایک مکمل عالم ہے۔ وہ شمع کی لَو کو کائنات کی زبان کہتا ہے، اور پروانے کی راکھ میں اس کو محبت کا آتش کدہ نظر آتا ہے۔ جب ہمت کر کے بڑھتا ہے، تو اسکے مستحکم عزم پر "شاعر" کی زبان سے "واہ" نکلتی ہے، اور جب وہ ننھی سی جان موت کی آغوش میں آخری ہچکی لیتی ہوتی ہے، تو شاعر کا ایک ایک رونگٹا کانپ اُٹھتا ہے۔

قوسِ قزح کی رنگینیوں سے آپکی نظر اکثر لطف اندوز ہوتی ہے۔ لیکن کیا آپ نے اس سے گفتگو کی ہے؟ مگر شاعر نے تو اسے خطاب کیا ہے۔ اور اپنے وجدان کے کانوں سے جواب بھی سنا ہے۔ اور آگے چلئے، فردوس کی حوروں سے اُسکا راز و نیاز ہوتا ہے۔ ما عرش سے اسکی بات چیت ہوتی ہے۔ چاند، سورج، کو اُس سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہے، وہ ہر ذرہ کائنات کو فطرت کی زبان سمجھتا دُنیا کے ہر سکوت سے اسکو قدرت کی صدائے بازگشت آتی ہے۔ تاریکی میں اسکو نورِ سرمدی کے خزانے نظر آتے ہیں، وہ اس معصوم دُ میں رہتا ہے جہاں محبت کے چشمے بہتے ہیں، وفا کی کرنیں پھوٹتی ہیں، قناعت کے پودے اُگتے ہیں، سوز و گداز کے فانوس روشن ہو اور آزادی کا حسین فرشتہ اپنے نورانی پروں کا ہر وقت اس پر سایہ کئے رہتا ہے۔ یہ ہے شاعر کی ذکاوتِ احساس کی مجمل داستان، ا تاثرات کی اجمالی تفسیر اور اسکی دُنیائے تخیل کا دُھندلا سا خاکہ۔

قوم، خوابِ غفلت میں ڈوبی ہوئی ہے، دردمند مصلحین سوتے ہوؤں کو جھنجھوڑتے ہیں، لیکن یہ نیند کے مارے کروٹ تک بدلتے۔ شعلہ بیان خطیب سونے والوں کے کانوں پر خطابت کا نقارہ بجاتے ہیں لیکن کوئی نہیں چونکتا۔ جب تمام کوششیں ناکام ہیں، تو شاعر اُٹھتا ہے۔ اور خوابیدہ قوم کی رگوں میں شعر کے نشتر چبھو دیتا ہے۔ جن کے اثر سے قوم صرف بیدار ہی نہیں ہو جاتی۔ بلکہ وہ عمل و حرکت کا بے پناہ جوش لے کر اُٹھتی ہے اور فلاح و کامرانی کی چوٹی پر پہنچکر دم لیتی ہے۔

شعر کا معیار

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اُسکا مقصد صرف یہ ہے کہ "شعر" کا ایک خاکہ آپکی نگاہوں کے سامنے آجائے اور شعر کے صحیح آپ کا وجدان باخبر ہو جائے۔ نیز شاعر کی فطرت، اُسکی ذہنیت اور اُسکے ماحول کا بھی ایک حد تک آپ اندازہ کر سک اور ہر اُس شخص کو جو زبان و ادب کی بدقسمتی سے چند جملے موزوں کر لیتا ہے غلطی سے "شاعر" نہ سمجھ لیں۔ کیونکہ شعر کے ذریعہ حقائق ا ادراک ہوتا ہے۔ نبضِ کونین کی جنبش و حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ قدرت کے اسرار بے نقاب ہو جاتے ہیں، مجاز و باطل کے بادل چھٹ کر حقیقت سوا ہوتا ہے، اور وہ رموز و اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں جنکے انکشاف کیلئے سائنس کے عقاب کا شہپر بارہا مجروح ہو چکا ہے، اور فلسفہ کے توسن کو ہر بار ٹھوکر لگی ہے۔ لہذا اگر کوئی موزوں جملہ "عروض" کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، مگر اس میں وہ تاثرات اور خصوصیات نہیں پائی جاتیں جن کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، تو اسکو کسی طرح بھی شعر نہیں کہا جا سکتا۔ اس نکتے کو مثال کے طور پر سمجھئے، تاکہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس سے آپ اچھی طرح واقف ہو جائیں، اور آگے چل کر جو کچھ میں کہونگا اُسکے سمجھنے میں آپ کو کسی دقت کا مقابلہ نہ کرنا پڑے۔

اکھتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر

یہ الفاظ کے موزوں الفاظ کی ایک مثال ہے جسکے اوزان درست ہیں، اور کوئی بڑے سے بڑا "عروضی" بھی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا مگر اس مجموعہ پر بھی "شعر" کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان موزوں الفاظ کے مطالعہ کے بعد آپکے دل و دماغ پر کسی قسم کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اور آپ کی نظر حقیقت کے کسی حجاب کو بھی اُٹھتا ہوا نہیں دیکھتیں۔ بس اس نوعیت کے یا ان سے ملتے جلتے، جتنے موزوں الفاظ ہیں آپکی نظر سے گذریں، اُن کو بھولے سے بھی شعر نہ سمجھئے ورنہ ارض شعر کا ہر ذرہ، آپ کے شعور ادراک پر ماتم کریگا۔

رباعی کی خصوصیات

شعری دُنیا میں سب سے مشکل صنف "رباعی" ہے۔ قصیدہ میں ایک مفہوم کے ادا کرنے کے لئے، سینکڑوں اشعار سے کام لیا جاسکتا ہے، مسدس کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے جسکے اظہار کیلئے زیادہ سے زیادہ اشعار کہے جاسکتے ہیں، اسی طرح غزل کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، اور غزل کے کسی شعر میں کسی خاص حقیقت کی تشریح نہ بھی کیجاسکے، تو بھی تغزل کی رنگ آرائی اس نقش سادہ کو کسی نہ کسی حد تک جاذب نظر بنا ہی دیتی ہے۔ اس کے ماسوا دو چار اشعار میں اس قسم کی بے کیفی موجود ہے، تو باقی اشعار اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں اور مطالعہ کرنے والی نگاہ پوری غزل سے مجموعی طور پر کیف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتی، لیکن برخلاف اسکے، رباعی میں خیالات کے قصر کی بنیاد صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اور اسی مختصر بنیاد پر ساری عمارت بنائی جاتی ہے۔ اور تغزل، فلسفہ، تخیل، بندش، اور اسلوب کے تمام مناظر اُسی کلبۂ تنگ میں پیش کرنے ہوتے ہیں، رباعی کا موضوع ایک خاص فلسفہ ہونا چاہیے، جو ندرت و قبولیت کے عام اعتبار سے وقیع ہو اور نفسیاتی نیز اجتماعی نقطۂ نظر سے اُسکو اہمیت حاصل ہو۔ موضوع کی جامعیت اور عظمت کے بعد بندش، اسلوب اور طرز ادا کا درجہ ہے۔ موضوع خواہ کسی قدر بھی عظیم بالشان اور تخیل کتنی ہی ارفع و اعلےٰ کیوں نہ ہو، اگر اسلوب، نگارش، اور طرز ادا میں دلآویزی نہیں ہے تو پھر موضوع کا سارا حسن خاک میں مل جاتا ہے نیز رفعت تخیل اور عظمت موضوع کیساتھ طرز ادا اور بندش میں کمی رہ گئی تو "رباعی" کا سارا لطف جاتا رہا۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے، جیسے آپ کثیف پیالے میں کسی کو بہترین شربت پیش کریں یقین جانیئے کہ شربت کی نظر افروز رنگت کے باوجود، وہ اُس پیالے کو قبول کرتے ہوئے تامل کریگا۔ لیکن اگر آپ اُس شربت کو کھنگالے ہوئے آبخورے میں بھرکر پیش کریں، اور آپ کے پیش کرنیکا انداز بھی نفیس و حسین ہو، تو اندازہ لگایئے کہ وہی بات جو پہلی بار بیچارے تھے، اب کس شوق کیساتھ اُس کے پینے کے لئے بڑھیں گے۔

یہی سبب ہے کہ عموماً شعراء دیگر اصناف سخن میں کافی مشق و مہارت کے بعد "رباعی" کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ ان تمام امتیازات و خصوصیات کے علاوہ، غزل، قصیدہ، مسدس، "ترجیع بند" مستزاد، واسوخت اور رباعی وغیرہ کے لئے مخصوص طرز ادا، اسلوب بیان اور طرز نگارش سے کام لینا ہوتا ہے۔ قصیدہ کا حسن پُر شکوہ الفاظ ہیں لیکن غزل کے لئے، یہی حسن بدنمائی کا باعث ہے۔ جو اسلوب نگارش واسوخت کی بنیاد ہے اسکا تتبع اگر رباعی میں کیا جائے، تو اُس شاعرانہ قلابازی کا جسقدر بھی مضحکہ اڑایا جائے کم ہے، بات یہ ہے کہ ہر موضوع مخصوص الفاظ چاہتا ہے اور وہی شخص کامیاب شاعر بن سکتا ہے جسکو محاکات و واردات کی تصویر کھینچنے کیلئے موزوں اور حسب حال الفاظ میسر آسکیں۔ غم کا بیان ہو تو ایسے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں جن کو پڑھکر غم و اندوہ کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ رندی و سرمستی کا ذکر ہو تو سرور و انبساط کی ایسی بزم مرتب کرنی چاہیئے جہاں افکار و آلام پھٹک بھی نہ سکیں۔ شجاعت کی تشریح کے لئے ایسے الفاظ کا لانا ضروری ہے جو موضوع کی تمام خصوصیات کے حامل ہو سکیں، فردوسی، سعدی، حافظ، عمر خیام اور غالب کے کلام کو پڑھو تو معلوم ہوگا کہ ان افراد کی نگاہیں اس لطیف نکتہ سے کس حد تک شناسا

تمہید

تنقید کے اسباب

اس طویل تمہید کے بعد مجھے چنگیزی نسل کے ایک رکن کے موزوں جملوں پر تنقید کرنا ہے، جن کو ملک "مرزا یگانہ چنگیزی" کے نام سے جانتا ہے، اور جو خود کو دنیا کے سامنے "سب سے بڑا" کی حیثیت میں پیش فرماتے ہیں۔

میرے متعدد مضامین نظم و نثر اخبارات اور رسائل کے ذریعہ ملک و قوم کے سامنے آچکے ہیں، لیکن میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے آج تک اپنا قلم تنقید سے آلودہ نہیں کیا۔ مگر میں کیا کروں، ادب کی تخریب، اور زبان کی تباہی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ... کے مجموعہ رباعیات پر نقد و تبصرہ کیلئے قلم اٹھانا پڑا جسکو اردو بک اسٹال لاہور نے بڑی آب و تاب کیساتھ شائع کیا ہو، اور جسکا نام ... کے وزن پر "ترانہ" رکھا گیا ہے۔

ہر زبان کی تعمیر کا ایک وقت ہوتا ہے، موجودہ دور اُردو زبان کی تعمیر و تشکیل کا دور ہے۔ یعنی کسی تشریح کا محتاج نہیں ... مسالہ (بعض حضرات مصالحہ لکھتے ہیں) لگا دیا جائے تو آئندہ چل کر عمارت کی شکست و ریخت کا امکان قوی ہو۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہو، کہ تعمیر کے وقت ہی مسالہ کے تمام اجزا کی تحلیل کر لیجائے تاکہ عمارت استوار، اور مستحکم ثابت ہو۔ تصنیفات زبان کی عمارت میں مسالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پس اگر کوئی تصنیف ادبی نقطۂ نگاہ سے ناقص ثابت ہوئی تو زبان کی عمارت کا استحکام معرض خطر میں رہیگا۔ لہذا ہر بہی خواہ ادب کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس قسم کی تصانیف پر آزادانہ تنقید کرے تاکہ اہل ملک گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں، اور آئندہ نسلیں ہمارے ادبی ذوق کا احترام کریں۔

"ترانہ" پر تنقید کرنے سے میرا منشا صاحب رباعیات کی ذاتی تنقیص نہیں ہے۔ بلکہ میں جرح و تنقید کی روشنی سے گمراہی کے اُن بادلوں کو سپیدۂ سحر بنا دینا چاہتا ہوں، جو حقیقت کے آفتاب کو چھپائے ہوئے ہیں، اگر میں ایسا نہ کرتا تو ایک عظیم الشان ادبی معصیت کا مرتکب ہوتا اور میرا ضمیر ہمیشہ مجھ پر ملامت کرتا۔

مصنف ترانہ کی بعض خصوصیات

رباعیات پر تنقید کرنے سے پہلے مجھے "مرزا یگانہ" کی بعض خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے، جنکو فخر و ناز کیساتھ آپ اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں۔ ترانہ کے سرورق پر مرقوم ہے "مرزا یگانہ چنگیزی" میں حیران ہوں کہ چنگیز جیسے ظالم اور شقی انسان سے خود کو منسوب کرتے ہیں، یگانہ صاحب کیا تفوق و عظمت محسوس کرتے ہیں؟ اہل عرب جو نسبی فخر کے معاملہ میں تمام دنیا پر بھاری ہیں، اور جن کے یہاں آدمی تو آدمی گھوڑوں اور گھوڑیوں کے نسب نامے بھی محفوظ رہتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی ابو جہل اور یزید کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ رحم و کرم شاعر کی فطرت کا خمیر ہے۔ ظلم و طغیان کے خلاف جہاد کرنے کیلئے ہی شاعر کو پیدا کیا جاتا ہے۔ مظلوموں کی تڑپ، اور ستم رسیدوں کی چیخوں پر لبیک کہنے کیلئے ہی شاعر دنیا میں آتا ہے۔ ان جملوں کی حقیقت پر غور کرنیکے بعد آپ فیصلہ کیجئے کہ مرزا یگانہ "چنگیزی" اور شاعر کی فطرت میں کس قدر بُعد ہے؟ اور اس ذہنیت کی صحیح تشریح کیلئے اُردو و لغت میں کوئی لفظ آیا پہلے سے موجود ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو واضعین لغت کو اس طرف جلد سے جلد توجہ کرنی چاہیئے۔!

ایک طرف تو آپ کے جوش نسلی اور تفاخر خاندانی کا یہ حال ہے کہ چنگیز سے خود کو منسوب کیا جاتا ہے، اور دوسری طرف اپنے نام کے آگے "علیہ السلام" ارقام فرمایا جاتا ہے، جو لوگ حفظ مراتب کے فلسفہ سے واقف ہیں، اور جنکو اسلامی لٹریچر سے کچھ بھی واقفیت ہے، وہ اس چیز کو کیا

طرح جانتے ہیں کہ "علیہ السلام" صرف انبیائے کرام (علیہم السلام) کے لئے کہا جاتا ہے البتہ اہل تشیع اور بعض صوفیا حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر ائمہ اہل بیت کے اسمائے گرامی کیساتھ بھی "علیہ السلام" استعمال کرتے ہیں لیکن کبھی اور بڑے سے بڑے ولی اور صاحب علم و فضل کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی کیساتھ بھی "رضی اللہ عنہ" کہا جاتا ہے۔ مگر حضرت یگانہ صاحب سے جب سے شعرا ہوئے ہیں اس وقت سے نہ معلوم کیسی کیفیات آپ پر طاری ہوتی رہی ہیں۔ جنہوں نے "علیہ السلام" کہلوانے پر مجبور کردیا۔

میں "علیہ السلام" صاحب (علیہ ما علیہ) کو دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بریلی اور آگرہ کی سرزمین کو بہت جلد قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمائیں۔ جہاں کے ذرے ذرے آپ کے استقبال کے لئے اسی وقت سے چشم براہ ہیں جب سے آپ نے شاعری شروع کی ہے اور یگانہ آرٹ کی جلوہ پاشیوں کے بعد سے تو انتظار قریب حد آخر تک پہنچ چکا ہے۔

خودستائی کی بدترین مثال

ترانہ کے دیباچہ میں "یگانہ چنگیزی" رقم فرماتے ہیں: "اہل نظر کے دل و دماغ پر جس نے اپنے آرٹ کا سکہ بٹھا دیا" "اپنے طرز زندگی اور اپنے ترانہ وجدانی سے برادران وطن خصوصاً طبقہ شعراء کو غلامانہ ذہنیت سے آزادی کا سبق دیکر" "بہتیروں کو اپنی زندگی میں زنجیر تقلید سے آزاد ہوتے ہوئے دیکھا۔"

خودستائی کے اس "ابوالہول" سے کوئی پوچھے کہ وہ کون بدنصیب صاحب نظر ہے جس نے آپکے "آرٹ" کی تاریکی سے اپنی بصارت کا خرابہ کرلیا۔ آخری دعوے بہت ہی پرلطف ہیں کہ آپ کے درس آزادی کی بدولت بعض شعراء غلامانہ ذہنیت سے آزاد ہوچکے ہیں۔ سبحان اللہ چشم بد دور! آپ اور "درس آزادی"! یہ تو ایسا ہی دعویٰ ہے کہ ایک بیمار مسیحا کی نبض ٹٹولنے لگے، تپتی ہوئی زمین کی طرف سے بادل کے ٹکڑوں کو سیرابی کی دعوت دیجائے اور ایک کودک نادان ایک مشاق قدر انداز سے کہے کہ "تم کو نشانہ لگانا میں نے سکھایا ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ خودستائی کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ یقین جانیئے کہ آپ کے ادعا کا جواب ہر شاعر کی طرف سے سوائے اسکے اور کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ:-

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

بازاری عنوانات

جس طرح ایک آدمی کی فراست و ذہانت کا پتہ اُس کی لوح پیشانی سے چل جاتا ہے، اسی طرح ایک ناظم و ناشر کے نہج نگارش اور اسلوب بیان کا اندازہ اُس کے عنوانات مضامین سے کیا جا سکتا ہے۔ عنوان کیلئے سب سے پہلی خصوصیت، جامعیت ہے کہ وہ مضمون کی معنویت پر حاوی ہو۔ عنوانات عموماً مرکب ہوا کرتے ہیں لہٰذا عنوان کی عظمت قائم کرنے کے لئے ترکیب لفظی کو بہت ہی نفیس و حسین ہونا چاہیئے۔ اور معنوی اعتبار سے بھی "عنوان" میں دلکشی کا پایا جانا ضروری ہے۔ ذیل میں "حضرت چنگیزی" کی رباعیات کے چند عنوانات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپ ہندوستان کے اس عجیب الخلقت شاعر کی ذہنیت کا ایک خاکہ آسانی سے مرتب کرسکتے ہیں۔

وَ ہُو ہٰذا

دھوکہ تو نہیں۔ عید پیچھے تیرہ۔ دل کی ستائی سن کر۔ کیا چال چلے ہیں۔ پیٹ کا ہلکا منصو۔ میں ہی میں ہوں۔

راستا دسے کاگا۔ پاورتی یا دن تو رے۔ اللہ رے میں۔ دہرانے والا تو کون لنگوٹی ہی سہی۔ دھمیال بندرا۔ شیرشے مرنا۔ اسے واہ رے شن!

جب سے انگریزی زبان کے تراجم اردو میں ہو رہے ہیں، جدید الفاظ اور نئی ترکیبوں کا ہماری زبان میں اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ "ادب لطیف" کی ترکیب بھی اسی سیلاب کا ایک قطرہ ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہو "ادب لطیف" کی مقابل ترکیب اردو ادب میں موجود نہیں ہے۔ مندرجہ بالا عنوانات کے مطالعہ کے بعد میرے ذہن میں معاً ایک ترکیب آگئی، جو "ادب لطیف" کی ہر اعتبار اور ہر نوع سے مقابل ہے۔ اور وہ ترکیب ہے "ادب کثیف"۔ ان عنوانات کو غور سے پڑھیئے۔ میرے اختراع کی داد دیجئے اور پھر انصاف کی نظر سے فیصلہ کیجئے کہ ان کو "ادب کثیف" کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟

گھریلو محاورات یگانہ صاحب نے جس طرح عنوانات کی تراکیب میں انتہائی بدمذاقی کا ثبوت دیا ہو، اسی طرح آپ نے رباعیات میں گھریلو محاورات بھی بڑے فخر کیساتھ استعمال کئے ہیں۔ اور از راہ کرم اُنکی شرح بھی فرمادی ہے، ارشاد ہوتا ہو کہ "یہ دلیسی ہزار رنگ دُنیا تو ہئی" فٹ نوٹ میں "ہئی" کی شرح۔ یہ ایں الفاظ فرمائی جاتی ہو "ہئی مخفف ہے" ہے ہی" کا۔ فصحا کے روزمرہ میں "ہئی" مستعمل ہے اور "ہے ہی" غیر فصیح و متروک ہے" اسی طرح "ہم ہی" کی جگہ "ہمیں" بولتے ہیں، اور یہی فصیح ہے"

مرزا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ گفتگو اور تحریر کی زبان میں بڑا اختلاف ہوتا ہو۔ بہت سے ایسے الفاظ اور محاورات جنکو ہم بات چیت میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں ان کو تحریر میں نہیں لا سکتے۔ اسی طرح نثر اور نظم کی لسانی حدود بھی مختلف ہیں۔ بعض وہ الفاظ جو ہم نثر میں بے تکان لکھ جاتے ہیں، ان کو منظوم نہیں کر سکتے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر گفتگو نظم اور نثر میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے۔ "ہے ہی" کا مخفف "ہئی" ضرور ہے لیکن یہ مخفف اب تو عام گفتگو میں بھی لفظ "متروک" کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب سے سو سال پہلے ممکن ہے کہ فصحا کے حلقہ میں اس مخفف کو قبول عام حاصل ہو، مگر موجودہ دور کے فصحا اور لکھے پڑھے اشخاص کی زبانیں ان ثقالت سے آلودہ نظر نہیں آتیں — میرے خیال میں مرزا صاحب کی فصحا سے مراد جوار لکھنؤ کے وہ دیہاتی "پوربیئے" ہیں، جنکی ہر بات مصری کی ڈلی سے کم نہیں ہوتی۔ بفرضِ محال فصحا "ہے ہی" کی جگہ "ہئی" بولتے ہیں۔ تو عوام کی "بول چال" سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ شعر کے لطیف و حسین دامن کو بھی، ان ادبی معصیتوں سے آلودہ کیا جائے۔

ایک رُباعی کا آخری مصرع ہے کہ "تازہ کوئی ڈگن لگی ہے شاید" "ڈگن" کی تشریح کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہو کہ مچھلی کے شکار کے لئے ڈور میں جو کانٹا باندھا جاتا ہے اُسے ڈگن کہتے ہیں"۔

ایک رباعی جسکا عنوان "بے وفا دُنیا" ہے۔ اُس کے آخری مصرع میں ارشاد فرماتے ہیں کہ —

ایک ایک کو کیا دہرا دہرا کر مارا

حضرت چنگیزی نے اس سلسلہ میں بڑی پُر لطف رباعی ارشاد فرمائی ہے جو درج ذیل ہے۔

دیوانہ کیوں تیری نظر پہ چڑھے ہے　　　پروانہ وہ کیا جو شمع کے سر نہ چڑھے

کس کام کا وہ خار جو دل میں نہ گڑے   وہ پھول ہی کیا ہے جو سر نہ چڑھے

سبحان اللہ ایک ایک مصرع محاورہ کی جان، روزمرہ کی روح، اور بے ساختگی کا دل ہے۔ "نظر پر چڑھنا" "سر چڑھنا"۔ "دل میں گڑنا"۔ کس حسن و خوبی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، کہ ہر مصرع "رتن ناتھ سرشار" کا قلم "آزاد صاحب" کی زبان بن کر رہ گیا ہے۔ مصرع ثانی کی شرح میں کمال خلّاقی ملاحظہ ہو "پھول وہی ہے جو سر چڑھے" ایک مثل ہے "یعنی پھول کی معراج یہی ہے کہ دیوتا پر چڑھایا جائے یا بتوں پر چڑھایا جائے، گیا وہ پھول کس کام کا؟ میں جناب چنگیزی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس مثل کو فصحا کے حلقہ میں قبول حاصل ہے اور کیا شعر کی زبان میں اس مثل کو استعمال کیا جاتا ہو؟ اور آپ شعرائے اردو زبان میں کہہ رہے ہیں یا "برج بھاشا" اور "پراکرت" میں!

بعض رباعیات کے مصرعے مع شرح درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"کیا گردش تقدیر کا چرخا نادھا" [1] ناندھنا یعنی شروع کر دینا۔ چلانا۔ مگر محاورہ میں چرخا ناندھنا، بہ معنے ڈکھڑے رونا، گلے، شکوے کرنا"

"پھرتے ہیں ترے کوچے میں اپلے گہلے"   [2] اپلے گہلے پھرتے ہیں یعنی اینڈے بینڈے پھرتے ہیں۔

"موا آئی تو آئی پہ گئی کیوں کرتا"   "آئی پہ گئی کیوں کرتا" یعنی آئی پر کیوں چوکتا۔؟

"کانٹوں میں تُلا کوئی نگاہوں میں ترُا"   [3] ترُا یعنی تُلا۔

جن حضرات نے مولوی محمد حسین آزاد۔ علامہ شبلی۔ مولانا حالی۔ علامہ ابوالکلام آزاد۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سلیمان ندوی وغیرہ اساطینِ اردو کی نثر، اور میر۔ غالب۔ مومن۔ داغ۔ اقبال وغیرہ شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا ہے کیا وہ ذمہ داری کے ساتھ بتا سکتے ہیں، کہ مندرجہ بالا محاورات کسی شاعر یا ناثر نے استعمال کئے ہیں؟ اور کیا آجکل ان محاورات کا اہل زبان میں رواج ہے؟ اگر بفرضِ محال "مرزا یگانہ" کے نزدیک ان مردہ محاورات اور قدیم امثال کے احیاء کی ضرورت نے ناگزیر صورت اختیار کر لی تھی اور ان کا وجود اردو ادب کے لئے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا تھا، تو ان کو "لغت" کی صورت میں محفوظ کیا جا سکتا تھا، کہ وہ جگہ ان شمیکریوں کی حفاظت کیلئے مناسب و موزوں ہے، شعر کی لطیف و حسین فضا کو گراں بار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟

مرزا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "ترنم" شعر کی جان ہے جو شعر "ترنم" سے خالی ہے وہ دراصل "شعر" نہیں ہے۔ کوئی ترکیب نفسیاتی، لسانی حکمت، ادبی اہمیت اور معنوی ضرورت کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو، اگر اس میں "نغمہ" کا فقدان ہے، تو وہ تریاق شعر کے حق میں زہر کی خاصیت رکھتا ہے۔ مرزا صاحب کے مستعملہ محاورات تو معنوی حیثیت سے بھی کچھ وقیع نہیں ہیں اور ساتھ ہی اس درجہ ثقیل و رکیک ہیں کہ نثر بھی اُن کے بار کو گوارا نہیں کر سکتی۔ پھر جس طرح ان کو رباعیات میں استعمال کیا گیا ہے اس سے قوت وجدان اور قوت سامعہ مجروح ہوئی جاتی ہیں۔ اور ایک ایک محاورہ بجائے خود شاعر کی بدمذاقی کا افسانہ سنا رہا ہے۔

مذہبی تعصب یگانہ صاحب نے جہاں رباعیات میں اپنی انتہائی بدمذاقی اور پست ذہنیت کا مختلف طریقوں سے ثبوت دیا ہے وہاں آپ نے "مذہبی تعصب" اور "فطری جہالت" کے بھی نفرت انگیز اور دل شکن مناظر پیش کئے ہیں ایک

رُباعی جسکا عنوان "علی سے بیعت طلبی" ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ

یاروں کی وہ سازش کہ خلافت طلبی ۔ اسلام کے پردے میں حکومت طلبی
افسوس ید اللہ سے یہ بے ادبی ۔ کس دن کے لئے علی سے بیعت طلبی

یاروں سے کون حضرات مُراد ہیں؟ سازش کا کیا مفہوم ہے؟ علی شؓ سے "بیعت طلبی" کا اشارہ کس طرف ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب یہی ہے کہ یگانہ صاحب نے کھلے الفاظ میں خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر طعن کیا ہے اور اجماعِ اُمت کو سازش، خلافتِ راشدہ کو "حکومت طلبی" اور "بے ادبی" بتایا ہے۔ معاذ اللہ میں یہاں "استحقاقِ خلافت" کی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں اپنے موضوع سے ہٹ جاؤنگا بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور میں جب کہ مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کیجارہی ہے اور ہر طرف سے صلح و اتحاد کی آواز اُٹھ رہی ہے، افتراق و انشقاق کی مہموں کو مسالمت و رواداری سے پامال کیا جارہا ہے۔ حضرت چنگیزی کا اس طرح پر دِل آزاری کرنا کہاں تک صحیح و درست ہے؟ مانا کہ یگانہ صاحب شیعہ ہیں، لیکن عہد کے زمانے سے ابتک متعدد شیعہ شعراء گذرے ہیں کیا اُن میں کسی نے بھی اتنی کھُلی ہوئی دِل آزاری کی ہے؟ شاعر کا کام ہے دُنیا کو پیغام دینا۔ اُس پیغام کی نوعیت اس قدر ہمہ گیر اور جامع ہونی چاہیئے کہ ہر مذہب و ملت کا پیرو اس سے مستفید ہو سکے۔ شاعر کسی خاص فرقہ اور جماعت کا ترجمان نہیں ہوتا، بلکہ "انسانیت" اُسکی مخاطب ہوتی ہے اور تمام دُنیا کو وہ پیغام دیتا ہے۔ شاعر درس دیتا ہے مسالمت و رواداری کا، وہ روح پھونکتا ہے محبت و مصالحت کی، اُسکی دُنیا منافرت و مناقشت کی مسموم فضا سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ فانوس کلیسا، اور چراغ کعبہ دونوں اسکی نظر میں عزیز ہیں۔ چونکہ وہ روشنی کی مختلف شکلوں کا مظہر ایک ہی ذات کو سمجھتا ہے۔ وہ کسی کا دِل نہیں دُکھاتا۔ بلکہ اُسکو قدرت دُنیا میں اس لئے بھیجتی ہے کہ زخمی دلوں پر مرہم رکھے اور دُکھے ہوئے دلوں اور تڑپتی روحوں کو سکون کی سرمدی دولت کا گنجینہ بنادے۔ شاعر کے ہاتھ میں ظلم کے خنجر اور منافرت کے نشتر نہیں ہوتے، بلکہ اُسکی مٹھیاں محبت کے پھولوں سے بھری ہوتی ہیں جس راستہ سے اُسکا توسنِ خیال گذرجاتا ہے، اُس طرف مدت تک عطرِ محبت کی لپٹیں مشامِ جان کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ یہ ہے شاعر کا کام اور اسکی فطرت کی اجمالی تفسیر۔ دوسری طرف یگانہ صاحب کے نفرت انگیز پیغام اور گھناؤنی فطرت کو ملاحظہ فرمایئے۔ کہ کروڑوں انسانوں کے دل دُکھائے جاتے ہیں، اور اُن مقدس افراد کو سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا ہے جنکے بارِ احسانات سے انسانیت کی گردن آجتک خم ہے۔ اور جن کا انسانیت کا ہر ذرہ اُنکی شرافت و عظمت، اور تقدیس و تنزیہہ کے افسانے سنارہا ہے۔ کیا یگانہ صاحب۔ کا مغرور دماغ قانون کی گرفت اور اسکے شدید احتساب سے بھی بے پرواہ ہے، اور اُنکو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ اس قسم کی توہین قانون کی نگاہ میں جرم ہے۔

اس چنگیزی صیاد کے ترکش کا ایک اور دلدوز تیر ملاحظہ ہو۔

"بلال حبشیؓ"

عاشق ہوں ترا کالا کلوٹا ہی سہی ۔ پیمانہ سہی بلا سے چھوٹا ہی سہی
صد پارۂ دِل میں ہیں یہ جلوے کسکے ۔ آئینہ پھر آئینہ ہے ٹوٹا ہی سہی

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو "کالا کلوٹا" کہہ کر مخاطب کرنا اور "چھوٹا" کہنا، اس مقدس انسان عظیم عاشقِ رسولؐ کی کتنی بڑی توہین ہے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روحانی عظمت کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ حبش کی سرزمین کا یہ فرزند [illegible]

تاہم بلال بن رباح حضرت بلالؓ ان چند خوش قسمت غیر عرب افراد میں سے تھے جو باہر سے آکر سرکار دو عالم صلعم کے غلام بن گئے تھے حضرت بلالؓ کی مقدس زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو گا کہ اس راست باز انسان نے اپنی حیات کا ہر لمحہ اسلام اور صرف اسلام کی خدمت کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اُس نے سرکار دو عالم کی رسالت کی اُس وقت تصدیق کی جب کہ خود اہل قریش اس "اصدق الصادقین" کو نعوذ باللہ "ساحر" و "کاذب" اور "مجنوں" کہتے تھے۔

اقرار رسالت کی پاداش میں حضرت بلالؓ کو اُمیہ بن خلف کے بے پناہ مظالم کا نشانہ بننا پڑا لیکن ان تمام مظالم و مصائب کے باوجود بلالؓ نے اسلام کی راہ سے منہ نہ موڑا۔ حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے موذن اور کاشانہ نبوت کے منتظم تھے۔ رنگ رنگت سیاہ تھی لیکن اُن کا دل فرشتوں کی پیشانیوں سے زیادہ اُجلا اور نورانی تھا یہی سبب تو تھا کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جنکے نام کی ہیبت سے بادشاہ لرزتے تھے، حضرت بلالؓ کو "سیدی" (میرا آقا) کہکر پکارا۔ ایسے مقدس انسان کی شان میں ایسی شدید گستاخی کرنا، انسانیت کی کتنی بڑی توہین ہے لیکن اُس شخص کو انسانیت کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے کب رنج ہو سکتا ہے جسکے قلم نے سینکڑوں انسانوں کو چباڈالا ہو۔

حیرت ہے کہ "اردو بک اسٹال لاہور" کے ارکان دستشار نے ان رباعیات کو کس طرح شائع کر دیا؟ جہاں انہوں نے ترانہ کو شائع کرکے ادبی گناہ کیا ہے وہاں انسانیت کا بھی ایک ایسا عظیم الشان گناہ کیا ہے جسکی تلافی نہیں ہو سکتی: تعجب ہے کہ لاہور جیسے ادبی مرکز میں ایسا غیر ذمہ دار ادارہ موجود ہے!

غالبؒ مرحوم کو گالیاں ترانہ کی آخری رباعیوں میں شاعر مجہول الحال نے غالب کے متعلق ہرزہ سرائی کی ہے اور ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کی توہین میں سارا زور صرف کر دیا۔ ان ہذیانات کے چند ٹکڑے درج ذیل کئے جاتے ہیں

۱
چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں رچا
مجھسے جو تنے تو منہ کی کھاؤ گے بچا
غالب کو چپ بنا کے چھوڑا میں نے
غالب میرے چپا ہیں غالب کا چچا

۲
بھونڈاپن ہے مذاق غالب میں رچا
مرزا کا کمال اپنی نظر میں نہ جچا
محفل میں ہوا اب رنگ یگانہ غالب
وہ کون یگانہ وہی غالب کے چچا

۳
کس نے کہوں کیا ہوں میں اے واہ رے میں
آفت ہوں بلا ہوں میں اے واہ رے میں
بھاری ہے بڑے بڑوں پہ مُردہ اپنا
غالب کا چچا ہوں میں اے واہ رے میں

۴
اُستاد یگانہ بے گُرے کیوں ہوتے
آپ اپنی نگاہوں میں بُرے کیوں ہوتے
اُستاد ازل کے ہیں جو شاگرد رشید
غالب کی طرح بے سُرے کیوں ہوتے

شاعری کے نقطۂ نظر سے ان رباعیات کی کیا حیثیت ہے؟ اس پر میں ایک لفظ بھی لکھنا نہیں چاہتا۔ اہل نظر خود ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ یہ شعر ہے کیا بلا؟ یگانہ صاحب نے جس انداز میں حضرت غالب پر تنقید کی ہے کیا کوئی سنجیدہ آدمی اور معقول شخص انسان اس طرح زبان کھول سکتا ہے۔

کسی کے کلام پر نقد و تبصرہ کرنا برا نہیں ہے، اختلاف رائے معیوب بات نہیں ہے، ہر انسان کو آزادی کے ساتھ تنقید و اختلاف کا حق حاصل ہے۔ لیکن تنقید و اختلاف کی کچھ حدود ہوتی ہیں، یہ کونسی شرافت ہے کہ اگر ہم کسی شخص سے اختلاف رکھتے ہیں، اور عیب اسکے عیب گِنانا شروع کریں تو "تار، چادر" پر اُتر آئیں۔ یہ تو کمینوں، لفنگوں اور بازاری لوگوں کا کام ہے۔ شرفا اور صاحبان فہم حدود شرافت سے تجاوز نہیں کرتے۔ مندرجہ بالا رباعیوں کو پڑھیے، اور اندازہ لگائیے کہ کس بُری طرح غالب کی مٹی پلید کی گئی ہے۔ کہیں اُسکو چمار بنایا گیا ہے، کہیں بیچارے کو بے سُرا کہا گیا ہے۔ تنقید کے معنی تو یہ تھے، کہ غالب کے کلام پر تنقید کیجاتی، اُسکی شاعرانہ لغزشوں کو ظاہر کیا جاتا۔

چوٹ تھی تیری سخن پر جا پڑی اخلاق پر
تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہنچا دیا

جس انداز میں یگانہ نے تنقید کی ہے، اُس سے تو ذاتی بغض اور شخصی عداوت کی بُو آتی ہے۔

حیرت ہے کہ ہندوستان میں ایسے سادہ لوح اب تک موجود ہیں، جو اُس شخص کو شاعر سمجھتے ہیں جو ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر پر اس انداز میں تنقید کرتا ہے۔ اور جسکی پست ذہنیت، شاعر کی ذہنیت کی ضد ہے۔

غالب فرشتہ صفت اور قدسی الاصل نہ تھے، اُن سے لغزش بھی ہوتی ہوگی، لیکن اُنکی کبھی لغزش اور بھول چوک سے اُنکے سارے کمالات پر تو پانی نہیں پھر جاتا۔ میرا یہ ایقان ہے کہ جو شخص غالب کو شاعر نہیں تسلیم کرتا اس کو شاعری سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے اور اُسکو شعر پڑھنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ غالب کون تھا؟ تخیلات کا موجد، اسلوب نگارش کا بادشاہ، اور سلاست و فصاحت کی اقلیم کا غیر فانی تاجدار۔ اردو شاعری کا پودا پیاس سے مرجھا رہا تھا۔ غالب نے اس پر کوثر کا چشمہ اُنڈیل دیا۔ اردو ادب کا دامن خالی تھا غالب کو اسکی تہی مائگی پر رحم آیا، اور اُس نے خالی دامن کو سرمدی جواہر سے بھر دیا۔ اُردو شاعری شیر خوار بچوں کی حیثیت میں تھی، غالب کی آغوشِ تربیت میں یہ بچہ جوان ہو گیا اور اسکے شباب کی ہر ترنگ پر غالب کے فیض تربیت کا احسان ہے۔

اُردو شاعری کے معشوق کی آنکھوں اور دانتوں کیلئے سُرمہ اور مِسّی کی ضرورت تھی۔ شام کو کوٹھے پر سیر کیلئے اس کا آنا ضروری تھا، ایسی فضا میں غالب پیدا ہوا لیکن شریعت شاعری کے اس پیغمبر کی معجز نمائی نے سارا ماحول بدل ڈالا، اور شاعری کی قدیم بساط کو اُلٹ دیا۔ اگرچہ ناقدر شناس دُنیا نے اسکی حسب حیثیت قدر نہ کی، "ملک الشعرائی" کا تاج کسی دوسرے سر کو پہنا دیا گیا اور قلعہ معلّٰے کے در و دیوار کسی اور کی آمد کے منتظر رہتے تھے، لیکن شہرتِ دوام اور قبول عام کا تاج قدرت نے اسکو پہنایا اور ارض ادب کے ہر ذرہ پر اسکی قبولیت کے تخت بچھائے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بجنوری کا یہ جملہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس، اور دیوان غالب"

حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو شاعری کا سر غالب کے گراں بار احسان سے اُٹھ نہیں سکتا کس قدر حیرت کی اور افسوس کی بات ہے کہ اردو ادب کے اس محسن اعظم پر اس بُری طرح تنقید کیجائے اور اسکو گالیاں سُنائی جائیں۔ اگر غالب بے خطا تھا [illegible]

...میں بلکہ دنیا کا کوئی شخص شاعر کہلانیکا مستحق نہیں ہے۔ اگر غالب کا دیوان قابل اعتنا نہیں ہے تو شیکسپیر کے ... منظومات کو تباہ کرڈالو، فردوسی کے شاہنامے کو پرزے پرزے کرڈالو، حافظ شیرازی کے دیوان کو برباد کرو ... کی کلیات کو آگ لگا دو۔

طوفان ہذیانات | منا یگانہ ارشاد فرماتے ہیں :- اندھوں کی طرح ٹٹولنا کیا معنی گونگے کی بولی بولنا کیا معنے
فردا معلوم راز فردا معلوم پھر پردۂ غیب کھولنا کیا معنے

شاعر کا بظاہر مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل جو کچھ ہونیوالا ہے، اسکی ابھی سے خبر ہے۔ اور جب راز فردا معلوم ہے تو پردۂ غیب کا اٹھانا کیا معنی رکھتا ہے یعنی کوئی چیز غیب نہیں ہے، ہر چیز معلوم ہے۔ اس رباعی کا تیسرا مصرع کچھ جاندار ہے، لیکن آخری مصرع مہمل محض ہے، اور شروع کے دو مصرعے تو بھونڈے پن میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ غرض اظہار مقصد کیلئے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ اس درجہ بھونڈا سا ہے، کہ رباعی میں کوئی لطف باقی نہیں رہا۔

ایک رباعی کا عنوان ہے۔ (بو نہ تو ہو تو رنگ کیا) اس ضمن میں گوہر افشانی فرمائی جاتی ہے۔

سنتا ہوں کہ ہر رنگ میں تو ہو موجود ہر بو میں ہے معرفت کا پہلو موجود
وہ رنگ بھی کیا رنگ ہے ماشاء اللہ جس میں کوئی خوشبو ہو نہ بدبو موجود

"وجود باری" ایک ایسا جامع اور لطیف موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جن شعراء نے اس سلسلہ میں خیال آرائی کی ہے انہوں نے اشارات و کنایات میں دفتر کے دفتر کہہ دئے ہیں اسی موضوع کو مرزا یگانہ نے ہات لگایا ہے، اور سارے فلسفہ کو ایک بھونڈا گھروندا بنا دیا ہے، کس قدر بے کیف رباعی ہے جسکو پڑھکر وجدان ذرا بھی حظ حاصل نہیں کرتا۔

دل میں آ بیٹھو درد پہلو ہو کر پھر اپنے تئیں دکھادوں میں تو ہو کر
آئینہ میں کیا دیکھتا ہے رنگ اپنا مجھ میں تو سما دیکھ ذرا بو ہو کر

اس طرز ادا کے قربان جائیے۔ کتنا پاکیزہ مفہوم ہے، کس قدر گہری تلاش ہے "پھر اپنے تئیں دکھادوں میں تو ہو کر" کس بیساختگی کیساتھ فرمایا ہے کہ "من و تو" کے سارے حجابات اُٹھے جاتے ہیں "آئینہ میں رنگ دیکھنا" اور "مجھ میں بو ہو کے سما جانا" ہر ٹکڑا اپنی جگہ ایک مستقل تخیلات اور مجسم اجمال ہے "بو" سے مراد شاید "روح" ہے اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس تشبیہ کی جسقدر داد دیجائے، کم ہے۔

نشہ نہ سہی یہ دردِ سر کیا کم ہے نظارۂ حسن رہگذر کیا کم ہے
اب تک تازہ ہے یادِ ایام شباب اپنے لئے عید پیچھے تر کیا کم ہے

... ایام شباب کو نظارۂ حسن رہگذر سے تشبیہ دینا، بالکل ان چھوتے جذبات ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مشاہدہ ... کے فرق سے نابلد ہے۔ دوسرے مصرعے کا ایک مفہوم بعید شاید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا شباب تو گذر گیا، البتہ جو لوگ شباب

کی منزل سے گذرتے ہیں۔ ان کا نظارہ ہی کیا تھوڑا ہے؟ خیر اسکو بھی جانے دیجئے۔ آخری مصرعہ کو جو رباعی کی جان ہوتا ہے ذرا پڑھیے، اور اردو ادب کی لاش پر خوب ہی کھول کر ماتم کیجئے "عید پیچھے ٹر" سبحان اللہ! یاد ایام شباب کے فلسفہ کیلئے اسی محاورہ کی ضرورت تھی۔ ہاں یہ تو فرمائیے کہ آپ شعر کہہ رہے ہیں یا "ٹر" ارہے ہیں"۔

ہنگامۂ عیش جاں جو کم ہی سہی — آخر میں بلا سے تلخی غم ہی سہی
عید اپنی منا لیتے محرم ہی سہی — جل جاتے کہیں آپ جہنم ہی سہی

جناب یگانہ صاحب! خدا کیلئے یہ تو فرمائیے کہ وہ کون آبرو باختہ دلبر ہے جس سے جہنم میں ملنے کی تمنا ہے اور تمہید میں آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اور پھر ہنگامۂ عیش، تلخی غم اور عید و محرم سے گذرتے ہوئے آپ جہنم میں کس طرح پہنچ گئے۔

پھر جوشِ غضب کو تھام لیتے ہی بنی — پھر چشم کرم سے کام لیتے ہی بنی
منہ سے تو نہ پھوٹے آپ ماشاءاللہ — آنکھوں سے مگر سلام لیتے ہی بنی

قسم خدا کی ایک لفظ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر آپ کس فلسفہ کی تشریح فرما رہے ہیں؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "منہ سے پھوٹنا" "اور آنکھوں سے سلام لینا" ان دونوں محاورات کے استعمال کیخاطر یہ مصرعے جوڑے گئے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر یہ شاعری نہیں ہے، بلا غنڈہ ہے بلا غنڈہ۔

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید — ہاں چاند کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
اے حسن دو روزہ پہ اکڑنے والو — یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

حسنِ دو روزہ پر غرور کرنے والوں کو کس "چغادرانہ انداز" میں متنبہ کیا گیا ہے، کہ بخدا بعض بعض کا تو پتا پانی ہوجائے گا اور بعض دل پکڑے ہوئے، یگانہ صاحب کے پاس بھاگے چلے آئیں گے، کہ پہلے یوسف کو کفن میں دکھا دیجئے جب کہیں جا کر آپ کی بات کا اعتبار ہوگا۔ پہلے دو مصرعے تو "شکر پارے" ہیں۔ "شکر پارے"۔

منزل کی خبر کسے ہے منزل کی نہ پوچھ — منجدھار میں بہتا چل ساحل کی نہ پوچھ
کیا جانیے کس گھاٹ لئے جاتا ہے — آنکھیں جو دکھائیں دیکھ لے دل کی نہ پوچھ

یہ رباعی ہے کہ گورکھ دھندا؟ کون لئے جاتا ہے؟ آنکھیں جو دکھائیں دیکھ لے، دل کی نہ پوچھ! اس کیا مطلب ہے؟ فعل، فاعل، مبتدا، اور خبر میں آخر کیا مناسبت ہے؟ پھر یہ دیدے دکھانیوالا کون ذاتِ شریف ہے، برائے خدا اسکی جیتے جی شرح فرما جائیے ورنہ اردو ادب کے شیدائیوں کی ساری عمر اس عقدے کی گرہ کشائی میں صرف ہوجائے گی۔

بوسہ نہیں بوسہ کا مزا لیتا ہوں　　جھوٹی ہی سہی ہوس بجھا لیتا ہوں
چلتا نہیں زور اُن سے پلٹے کیونکر　　منہ دیکھ کے بس ہونٹ چبا لیتا ہوں

کیا ہی مخرب اخلاق شاعری کا نام "یگانہ آرٹ" رکھا گیا ہے: بوالہوسی کا کس قدر بھونڈے پن سے اظہار کیا گیا ہے؟ ہونٹ چبا لینے سے کیا جھوٹی ہی سہی ہوس کا بجھنا ممکن بھی ہے؟ میرے خیال میں ہونٹ چبانے کے بجائے کسی دیوار سے سر ٹکرا دیجئے تو بوالہوسی کی اور زیادہ تسکین ہو جائے گی۔ مولانا حالی نے غالباً ایسی شاعری کے لئے ہی فرمایا تھا کہ :-

"عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر"

دیوانے ترے غضب کی رفتار چلے　　آئینہ بغل میں مار بازار چلے
اللہ نگہبان ہے خود بینوں کا　　ایسا نہ ہو کہ آنکھوں میں تلوار چلے

"آئینہ بغل میں مار" واہ کیا حکیمانہ ترکیب ہے اور کتنا لطیف نکتہ ہے کہ وجدان کو امتلا ہوا جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ آنکھوں میں تلوار چلنے کی نوبت آئے۔ آپ جیسے مصالحت پسند حضرات موجود ہوتے تو دو چار جوتیوں سے آگے معاملہ طول نہ کھینچے گا۔

دُکھ درد کے ماروں کا نصیب جاگا　　گھر بولتا ہے آج دلدر بھاگا
دن کاٹے ہیں گن گن کے اسی دن کیلئے　　ساجن آتے ہیں راستہ دے کاگا

قدیم زمانہ کے لوگ گھر پر کوے کے بولنے سے شگون لیا کرتے تھے کہ کوئی مہمان گھر میں آنے والا ہے، اسی نادر خیال کو شاعر نے اس رباعی میں ادا کیا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ساجن آ رہے ہیں، تو کاگا سے راستہ چھوڑنے کی کیوں درخواست کی جا رہی ہے۔ کیا وہ راستہ روکے ہوئے کھڑا ہے؟ رُباعی کا دوسرا مصرع کتنا بیساختہ فرمایا ہے کہ چنگیز کی قبر بھی فرط خوشی سے شق ہو گئی ہوگی۔

ہر سانس ہے بازیچۂ امواج فنا　　ہر ذات ہے آمادۂ معراج فنا
کیا شوکت شاہانہ ہے ماشاء اللہ　　ہے تاج کے اوپر اِک تاج فنا

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے فانی ہے، اور ہر ذرّہ فنا کی طرف دوڑ رہا ہے۔ بادشاہ اپنی عظمت کے باوجود فنا کے سایہ میں اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہے، اور وہ کسی طرح دستبرد فنا سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ دوسرے مصرع میں "معراج فنا" کتنا مہمل لفظ استعمال کیا ہے، چوتھا مصرع کیسا بے ترکیب اور پھسپھسا ہے، شاہی تاج کے اوپر تاج فنا کا ہونا ایک نہایت روکھی پھیکی بات ہے۔

ہیں خاک برابر مگر اکسیر ہیں ہم　　غالب کے پیر، ثانیٔ پیر ہیں ہم
دُنیائے ادب تھی منتظر مدت سے　　معلوم ہے کس خواب کی تعبیر ہیں ہم

آپ خواب کی تعبیر نہیں ہیں، بلکہ جو صورت اہل ادب نے خواب میں دیکھی تھی آپ سچ مچ وہی ہیں۔ غالبؔ کے پیر او رناتی بیری کو کسی نے خواب میں دیکھ کر کہا تھا:۔

رات شیطاں کو خواب میں دیکھا ۔۔۔۔ ساری صورت جناب کی سی ہے

اگر گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ شعر پڑھنے کے بعد، ایک بار چہرۂ عالمتاب کو، میں نے غلط کہا۔ مکھڑے شریف کو آئینہ میں تو دیکھ لیجیے۔ شاید کچھ اتا پتا مل جائے۔

اقلیم سخن نام مرا جپتا ہے ۔۔۔۔ کیوں لکھنؤ اپنے بھاڑ میں تپتا ہے
تصویر یگانہ آپ بول اٹھے گی ۔۔۔۔ ہاں ایسے ہی منہ پر بانکپن کھپتا ہے

یہ آپ شعر کہہ رہے ہیں یا بھاڑ میں چنے بھون رہے ہیں۔ اگر آپ کی غلط شہرت اور نا مزا نمود کے باعث لکھنؤ کو قلق ہے تو بجا ہے۔ چوتھے مصرع میں بھونڈے محاورہ کی کتنی بے موقع کھپت کی ہے۔

کیوں شرح کا دفتر کوئی احمق کھولے ۔۔۔۔ ہے یہ وہ سخن کہ اپنے منہ سے بولے
کانٹوں میں تلا ہوا نگا ہوں میں چپا ۔۔۔۔ ہے تول لے پاؤرتی پاؤں تولے

سبحان اللہ! کیا "چپا، تلا" شعر فرمایا ہے۔ چوتھا مصرع تو بلاغت کی جان، زرگردں کا ایمان ہے، آپ بجائے شعر کہنے کے "پرچونی" کی دُکان کیوں نہیں کھول لیتے۔

زندان بلا سے خاک اڑاکر چھوٹے ۔۔۔۔ یاران ہوس کا جی چھڑا کر چھوٹے
دیوانوں سے کچھ بس نہ چلا یار لنگا ۔۔۔۔ دل توڑ کے زنجیر تڑا کر چھوٹے

زندانِ بلا پر ہی کیا منحصر ہے، آپ جہاں بھی جائیں گے خاک اُڑا کر دم لیں گے، اور ہر بوالہوس کے آپ یقیناً چھکے چھڑا دینگے کیونکہ آپ ہیں بھی تو چنگیز خاں کے خاندان کے چشم و چراغ۔ آپ کو تو محاورہ دانی پر بہت ناز ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ خبر نہیں کہ اصل محاورہ " " سے تڑانا" ہے۔

دلّی سے اُدھر وہ غیرت حور چلا ۔۔۔۔ میں نشۂ شوق میں اِدھر چور چلا
چلتی گاڑی میں منہ چڑھانا اسکا ۔۔۔۔ میں دور سے دانت پیستا گھور چلا

کبھی آپ ہونٹ چباتے ہیں کبھی دانت پیستے ہیں، یہ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے، آپ کی شکل کو دیکھ کر اگر اُس نے منہ چڑھا دیا تو ایسی دانت پیسنے کی کیا بات ہو، میرے خیال میں تو اُس کو اپنے نازک سلیپر سے آپ کی تواضع کرنی چاہیئے تھی کہ آپ کو گھورنے کا مزا مل جاتا۔

قربانی کا حکم ہے چلو یوں ہی سہی — گردن پہ کسی غریب کا خوں ہی سہی
نیت ہے بخیر اپنی تو پروا کیا ہے — بکرا نہ سہی موٹی سی اک جوں ہی سہی

غور سے دیکھئے، جوں نہ ہوگی، کوئی کھٹمل ہوگا۔

نازک باہیں مروڑ ڈالوں نہ کہیں — قابو پا کر جھنجھوڑ ڈالوں نہ کہیں
ترسا ہوا میں یوں تمہیں ڈر لگتا ہو — منہ چومتے ہی بھنبھوڑ ڈالوں نہ کہیں

پردیس میں بہت دن رہنے کے بعد جب آپ گھر پہنچے ہونگے، اُس وقت غالباً یہ رباعی آپ نے کہی ہوگی لیکن اِن کو اگر خبر ہوجائے کہ آپ مخفی صحبتوں کے اسرار اس طرح فاش کرتے پھرتے ہیں تو عجب نہیں کہ وہ ضابطہ کو بات میں لے لیں اور عدالت کو بیچ میں ڈالکر ہمیشہ کیلئے قصہ ختم کرالیں ۔

کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی نے ایک قطعہ پر خوش ہوکر عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا تھا، میں چاہتا ہوں کہ سلطان غزنوی زندہ ہو جائے اور اس عجیب و غریب چنگیزی شاعری کی بھی منہ بھرائی ہو۔ ناظرین ساقی براہ کرم مجھے مشورہ دیں، یگانہ صاحب کا منہ کس چیز سے بھرا جائے؟

ناظرین اور ایڈیٹروں سے

میں نے رباعیات یگانہ پر جس انداز میں تنقید کی ہے اس پر ممکن ہے کہ بعض حضرات نکتہ چینی فرمائیں کہ فن و معنی کے اعتبار سے تنقید کرنی تھی میں نے کہیں کہیں کس چیز سے بھی کام لیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی تک کی بات ہو تو اس پر نقد و تبصرہ کیا جائے۔ ہذیانات و لغویات پر آخر کن الفاظ میں تنقید ہو؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مندرجہ بالا رباعیات میں سے کیا ایک "رباعی" ایک شعر، اور ایک مصرع بھی ایسا ہے جس پر صحیح معنوں میں "شعر" کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ ۔

میں نے مضمون کا عنوان "بیگانہ شاعری" رکھا ہے۔ مندرجہ بالا رباعیات کا بغور مطالعہ کیجئے اور پھر فیصلہ کرکے مجھے بتائیے کہ یگانہ صاحب کو شاعری سے کوئی ادنیٰ مناسبت اور خفیف سا بھی لگاؤ ہے؟ کیا اُن کا ایک شعر بھی قوم و ملک کیلئے پیغام ہو سکتا ہے؟ شاعر کی اتنی پست ذہنیت کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور وہ ایسی بے کیف باتیں دُنیا کے سامنے کبھی بیان کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ شاعر تو کیف و سرور کے بادل برساتا ہے، سطحی دماغوں اور پست ذہنیتوں کو ارفع و اعلیٰ بناتا ہے، وہ جب روتا ہے تو ساری دُنیا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں، اور جب مسکراتا ہے، تو ارض کائنات کا ایک ایک ذرہ متبسم ہو جاتا ہے۔

آخر میں مجھکو اُردو رسالوں کے فاضل ایڈیٹروں کی خدمات میں یہ عرض کرنا ہے کہ وہ خدا کیلئے اردو ادب پر رحم فرمائیں، اور وہ خود ہی اس نکتے پر لمحات فرصت میں غور کریں کہ اس قسم کے کلام کو شائع کرنا اردو ادب کی خدمت ہے، یا تخریب!

ماہر القادری

پاکیزہ لٹریچر کی کتابیں

کولتار:- اس کے بعض حصے ہنسانے والے، بعض رُلانے والے اور بعض نہایت پُر اسرار ہیں۔ قیمت عاعہ

ویمپائر:- ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب و غریب دردانگیز و مضحکہ خیز قصّہ۔ قیمت صرف عاعہ

شریر بیوی:- ایک شوخ و شنگ لڑکی کی داستان جس کو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ قیمت عہر

فل بوٹ:- حسن و عشق کا بے حد دلچسپ مختصر ناول۔ جذبات و تاثرات کا دلآویز مُرقع۔ قیمت عہر

روحِ ظرافت:- صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے۔ آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت - مجلد عہر

روحِ لطافت:- جذباتِ لطیف کی روح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ و عبرت انگیز افسانے۔ قیمت عہر

مرزا جنگی:- لکھنو کی پُرانی تہذیب اس دلاویز ڈرامے میں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جایئے۔ قیمت صرف ۱۲ ار

چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز۔ ایک صاحب کی ہنسانے والی سرگذشت اور ایک خاتون کی دردانگیز سوانح حیات کا پُر لطف افسانہ قیمت دیکھا جائیگا۔ شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ خوبصورت مضبوط جلد۔ قیمت صرف عہ

جنت کا بھوت:- یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے۔ قیمت ۱۲ ار

تفویض:- ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک مسجد کے مُلّا سے ہوجاتی ہے اُسکے عجیب و غریب نتائج۔ قیمت ۵ ر

قرآن اور پردہ:- آیاتِ قرآنی کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ صحیح پردہ کیا ہے اور رسمی پردہ کیا بن گیا ہے۔ قیمت عہر

حدیث اور پردہ۔ صحیح احادیث کے حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ نہایت ضروری کتاب۔ قیمت عہ

رقص و سرود:- مسلمان لڑکیوں کیلئے رقص و سرود کی تعلیم کس قدر ضروری ہے؟ مذہبی رُو سے اس کا جواز۔ قیمت ۴ر

نجمہ نوری:- ماں کی مامتا سے متعلق ایک دلدوز تمثیل جسکو پڑھکر آپ اپنے آنسو نہ روک سکیں گے۔ قیمت ۴ ار

چندرا موہنی:- حسن و عشق کی داستانِ جگر پاش۔ محبّت کے لطیف جذبات کا حسرتناک انجام۔ قیمت عہ

سلومی:- شہرۂ آفاق ادیب آسکر وائلڈ کی مشہور تمثیل "سالومی" کا لاجواب و کامیاب ترجمہ۔ قیمت ۵ ر

چار چاند:- حضرت ناصر نذیر فراق مرحوم کا مجموعہ مضامین۔ دلّی کی نتھری ستھری بول چال کا اعلیٰ نمونہ۔ قیمت ۸ ر

اخوان الشیاطین:- سات سائنٹفک افسانوں کا بیحد دلکش مجموعہ۔ اسکے مطالعہ پر آپکے رونگٹے کھڑے ہوجائینگے قیمت ۴ر

تعلیم زدہ بیوی:- اس ڈرامہ کو پڑھکر آپ اپنی ہنسی نہ روک سکیں گے، عبرت انگیز انجام۔ قیمت ۸ ر

[illegible]

آپ دولتمند کس طرح بن سکتے ہیں

دنیا میں دولتمند بننے کی تمنا تو ہر شخص رکھتا ہے لیکن دولتمند بننے کے طریقوں سے لوگ ناآشنا ہیں۔ اگر آپ دولتمند بننے کے وہ سربستہ راز معلوم کرنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ ہر شخص دولتمند بن سکتا ہے تو مندرجہ ذیل کتابیں مطالعہ میں رکھیے۔ یہ کتابیں یورپ امریکہ کی صدہا کتابوں کا عطر ہیں۔

معلومات تجارت

اس کتاب میں تجارت کے ذریعہ روپیہ کمانیکی مکمل تعلیم ہے۔ بلا سرمایہ کے تجارت کرنے کے طریقے ہیں۔ یورپ و امریکہ سے تعلقات پیدا کرنے کے طریقے ہیں۔ اس کتاب کو خرید کر انسان ایک قلم اور دوات سے ہزاروں روپیہ پیدا کر سکتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ۲؎

وسائل معاش

جو لوگ گھر بیٹھ کر یا ملازمت کی حالت میں ہزاروں روپیہ بچے ہوئے وقت کو کارآمد بنا کر پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ اس کو خریدیں۔ یہ کتاب تیس سال کی محنت اور تجربوں کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کی تدابیر مصنف کی آزمودہ ہیں۔ اس میں صدہا معاش کے وسائل ہیں۔ قیمت صرف ۱؎

فن اشتہار نویسی

یہ کتاب یورپ و امریکہ کی صدہا کتابوں کی روح ہے۔ اس میں اشتہار لکھنا، اشتہار دینا اور اشتہار کے وہ مؤثر طریقے درج ہیں جن کے ذریعہ سے لاکھوں روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ قیمت عہ

اسرار صنعت

یہ ہندوستانی ماہر فن کی تصنیف ہے جس نے پچاس سالہ تجربات اس کتاب میں درج کئے ہیں۔ کارخانہ چلانے اور ترقی دینے کے لئے وہ وہ آسان طریقے اور راستے بتائے ہیں کہ غریب سے غریب آدمی بھی تھوڑی محنت اور مختصر سرمایہ سے بہت جلد ایک کامیاب کارخانہ کا مالک بن سکتا ہے۔ قیمت عہ

مجمع الصنائع جدید صنعت و حرفت میں لاجواب کتاب ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍
رفقائے رسالہ آکاش ہر کتاب پر نصف محصول بذمہ خریدار ہوگا۔

فن دوکانداری

اس کتاب میں کامیاب دوکاندار بننے اور تجارت حاصل کرنے کے وہ باتیں بتائی گئی ہیں جن کی مدد سے ایک معمولی دوکاندار چند دن میں بڑا تاجر بن سکتا ہے۔ قیمت ۱؎

جامع الفنون

ہر قسم کی روشنائی، روغنیات، رنگ، عطر، صابون، ربڑ کی مہریں، مصنوعی جواہرات، دیا سلائی، برف، سوڈا واٹر وغیرہ بنانے اور ملمع کرنے کے طریقے درج ہیں۔ قیمت حصہ اول ۱۲؍ حصہ دوم ۱؍

مرقع الوان

اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں پورے طور پر رنگوں کی پیدائش، ماہیت اور ان کے بنانیکا پورا پورا حال لکھا گیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو سے زیادہ رنگ بنانے کے دیسی، انگریزی، یونانی اور جاپانی نسخے موجود ہیں، اور شناخت کے لئے رنگوں کے نمونے چسپاں کئے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت عہ

مالی پریشانی کا علاج

جب تمام معاش کی راہیں بند ہوں نہ آپ کو ملازمت ملتی ہو اور نہ تجارت ہی کی کوئی صورت نظر آتی ہو تو ایسی حالت میں کتاب کو پڑھیے جس کے مطالعہ کے بعد اگر آپ ملازمت چاہیں گے تو ملازمت مل جائیگی، تجارت کرنا چاہیں گے تو آپ تجارت کر سکیں گے۔ صنعت و حرفت کا اگر شوق آپ کو ہوگا تو آپ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ چند دنوں میں مالی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ جس شخص کے پاس یہ کتاب ہوگی انشاء اللہ وہ مالی پریشانی کا کبھی شکار نہ ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ عہ

(نوٹ) ایک کارڈ لکھ کر کتب خانہ کی فہرست ذیل کے پتے سے مفت طلب کریں۔

ایک ہفتہ میں موٹر چلانا سیکھ لیجئے

اگر آپ موٹروں کو درست کرنا اور چلانا سیکھنا چاہتے ہیں اور موٹر کے اس معاملہ میں درجہ کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک مکینیکل انجینیر سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوں تو **معلم موٹر** مطالعہ میں رکھئے۔ یہ کتاب صرف آپ کو ایک قابل موٹر ڈرائیور بنا دیگی بلکہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے موٹر انجینیر بن جائیں گے۔ موٹر کے علاوہ پرزوں اور انجنوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ قیمت ۱؎

گھر بیٹھے انجینیری کی تعلیم

حاصل کیجئے۔ اگر فن تعمیر کا ایک ماہر انجینیر بننا چاہتے ہیں تو آپ چند روز میں فن تعمیر کے کام میں اس قدر ماہر ہو سکتے ہیں کہ بڑے بڑے کامیاب انجینیر حیرت میں رہ جائیں۔ آپ ہر قسم کی نقشہ کشی کے اس فن کے جاننے کے بعد ٹھیکہ لیکر بھی لاکھوں روپیہ پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کو کتاب **فن انجینیری** کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ماہر فن تعمیرات کی رائے ہے کہ آجتک اس سے بہتر کتاب اردو میں اس فن پر شائع نہیں ہوئی۔ اس میں عمارتوں کے نقشے بنانے کے قاعدے ہیں اور فوٹوگرافی کی تعلیم بھی درج ہے۔ ... روغن بنانے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

اقسام الطعام شاہجہانی

(معروف) **بخوان نعمت کلاں** جس میں تقریباً سات سو ترکیب ہندوستانی، انگریزی، ترکی، ایرانی کھانے، مٹھائیاں، مربے، اچار، چٹنیاں وغیرہ بنانے کی درج ہیں جو خاص مطبخ شاہجہانی و دیگر بادشاہوں کے باورچی خانوں کے کھانوں کی ترکیب ہیں۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں بہت سے اطبائے یونان کے تیر بہدف مرکبات اور اصلی نسخہ جات درج کر دیئے ہیں جن کی خانہ داری میں ضرورت رہتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

جوانی اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنی ہوں

تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیئے' ان کتابوں میں جوانی اور شادی کی مسرتیں بھی ہیں' عورتوں کے دلوں کو مسخر کرنیکی تدابیر بھی ہیں' اور اس کے علاوہ صحت اور تندرستی کے قیام کے اصول بھی ہیں جس کے پاس کتابیں ہونگی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا۔

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے مواقع میں کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجئے شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائیگا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی قیمت عہ/ ہے جو اس کے منافع پر سو مرتبہ صدقہ ہے محصول ۵ر

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اس کے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو۔ اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملک حسن کے باغ جمال پر خزاں چھا جاتی ہے بلکہ غریب الدین کے لئے ان کی پرورش سوہان روح ہوتی ہے اور انسان ازدواجی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جس کو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کے ساتھ اولاد کی پیدائش تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی قیمت عہ محصول ۵ر

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا وہ اب عام ہے اس کتاب میں رجوع الشیخ نے لذت شباب کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں تو ہوتی ہیں شاید وہ اس کے پلنگ بھی نہ ہوں' ارباب معشق نے عورتوں کے رؤیں رؤیں سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اس طرح مرد کی قوت شہوانی کو مزید طاقتور کرنے کے لئے نسخے ٹوٹکے اور ہزاروں گر بتلائے ہیں اس علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل بیان ہوئی ہیں وہ صدہا معجونوں لاکھوں مقویات سے زیادہ مقوی ہیں قیمت عہ

عورت باتصویر

پھولوں کی سیج پر حسن کی رعنائیاں دیکھنے سے پہلے عشوہ ناز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائے' اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب آپ کتاب عورت پڑھ لیں اس کتاب میں یورپ امریکہ کی بہترین صنفی کتابوں کا عطر کھینچا گیا ہے عورت میں نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم' عورت کی فطرت' عورت کی زینت' عورت کے باغ حسن کی خوشہ چینی غرضکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی بھی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو دو سو کے قریب عکسی و قلمی تصویریں ہیں قیمت ۲ محصول ۔۔ر

سہاگن کا سہاگ

سات سہیلیوں کا جھرمٹ' سات مست شباب لذید راتوں کی لذید داستانیں ان میں سب کچھ ہے جو تخیل کی لذت میں ہو سکتا ہے۔ سہیلیوں کی پُرلطف نوک جھونک محلات لکھنؤ کی خاص زبان سے شب عروسی کی داستانیں ازدواجی زندگی کے اہم ترین پوشیدہ راز غرضکہ کتاب سہاگن سہاگ دنیا کے صفحات میں اپنے طرز کی انوکھی کتاب ہے جس کو شادی کے جلسے میں سات دلہنوں نے بیان کیا۔ بڑی لذت یاب اور پُرلطف کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ محصول ۵ر کل بعہ

افشائے راز پنہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے ایسی عجیب و غریب آپ نے اس دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب سنی نہ ہوگی۔ اس میں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کے حالات خود ان کے قلم کے لکھے ہیں۔ امریکہ کی ایک من چلی عورت نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کئے اور امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی۔ اب اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ خدا جانے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہونیکا خطرہ ہے اس لئے جلدی منگا لیجئے۔

قیمت سوا روپیہ محصول ۶ر کل ۱ عہ

[illegible]

[illegible]

ملنے کا پتہ: مکتبہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

کیف مواصلت

لطف شباب زندگی کے لطف و مسرت اور لذت کیف میں ایک مرد اور جوان مرد کے لئے عورت سے مواصلت ہی ایک کیف افزا امر ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے۔ یوں تو فطرت کی سبھی دنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو صرف قانونی طریق پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گذار دیتے ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ اس کیف پر شعبہ حیات سے اس درجہ تمتع حاصل کیا جائے جو دوسروں کو نہ حاصل ہو اور امتیاز ہو۔ یہ کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچاتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ قیمت صرف ۸ محصول ۵ ر

شب نامچہ عروسی

ایک مست شباب دوشیزہ کا روزنامچہ ہے اور سہاگ کی اندھیری راتوں کا دہ سرشار اور کیف اندوز الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ پڑھتے پڑھتے سسکیاں بھرنے لگتے ہیں۔ یہ صرف چند نشاط افزا الفاظ کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ازدواجی مسرت کے پوشیدہ رازوں کی کتاب ہے۔ معلوم ہوتے ہیں۔ اتنی دلچسپ اور صنفی معلومات سے پُر شاید ہی کوئی دوسری کتاب ہو۔ شب نامچہ عروسی میں لٹریچر سے پُر کیف گدگدیوں کے ساتھ ساتھ کئی رنگین عکسی فوٹو بھی ہیں تاکہ دل و دماغ کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی لطف اندوز ہوں۔ قیمت عہ محصول ۵ ر

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے پیشتر کیا معلوم کرنا چاہتی ہے۔ شادی کے بعد اس کے لئے کن باتوں کا علم ضروری ہے۔ حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور دوشیزہ کی پُر کیف زندگی سے عیش و مسرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے ان تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری دیگا۔ ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے ان تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ فوٹو بلاک کی دو درجن حسین و جمیل تصویروں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت دو روپے ۲ ر

دُلہن کی ڈائری

ایک شوخ و طرار دُلہن کی آپ بیتی۔ شب وصال کا پہلا سماں۔ کچھ خوف، کچھ ڈر، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ، دولہا میاں کی ہیبت، نوجوانی کی عشرت کی گھڑیاں، بے صبری، جذبات بیتابی کے مطالبے، پوشیدہ عادات کا بیان۔ خوشگوار دلچسپیوں کا لاجواب نمونہ ہے۔ قیمت صرف ۸ ر

لذت النکاح

زن و شوہر کے تعلقات پر نہایت دلچسپ کتاب ہے جس کو جوانی اور اس کے جذبات کا علم رکھنے والوں کو پڑھنا چاہیئے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دولہن کو کیا کرنا چاہیئے اور اپنے ازدواجی تعلقات کا لطف کیونکر بڑھایا جائے۔ قیمت ۸ ر

دُلہنوں کی کانفرنس

سات دُلہنوں کی شبہات خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شریفانہ الفاظ میں سنا کر تشنۂ حسن سوم کا بیڑہ اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حصول کا سوال پیدا کرتی ہیں۔ ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگزشت ہے۔ قیمت عہ ر

قانون مواصلت

میاں بیوی کی زندگی کا رہبر اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آپ کی قوت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھائیں گے۔ اس میں مواصلت کی بابت تمام ضروری باتیں درج ہیں۔ قیمت ۸ ر

عہد شباب

نوجوانوں کی رہبر کامل عاقبت اندیش کے لئے مشیر۔ آئیے قوت رفتہ کی روک تھام، از سر نو اس کی واپسی کی تدبیریں۔ صنفی قوتیں اپنی حالت پر نہیں رہیں بلکہ اس میں اضافہ کی صورتیں نکالی گئی ہیں۔ طبی ہدایات اور تیر بہدف نسخوں کا لاجواب مجموعہ ہے۔ قیمت عہ ر

بہار عروس

یہ وہ کتاب ہے جس کو ایک دلہن نے اپنی پہلی ختم کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگذشت لکھ کر بھیجی تھی۔ ایک مجلہ چھاپ دی گئی اس میں پوشیدہ دلچسپ تماشہ ہے۔ بڑی پر لطف اور مزیدار کتاب ہے۔ ایسی کتابیں کم ہوں گی۔ قیمت ۸ ر

ثمرہ وصال

اس میں خلوت صحیحہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نہایت ہی مکمل کوک شاستر ہے جو کوک شاستروں سے بہت بلند ہے۔ اولاد پیدا کرنے کے لئے بڑے بڑے عجیب طریقے بتائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی حمل کے طریقے بھی سمجھائے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۸ ر

دولہا دولہن

یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو بیوی سے حقیقی لذت حاصل کرنا سکھائیگی اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں ان سے بچائیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مواصلت میں غیر معمولی لذت پیدا ہو جائیگی۔ اس کتاب کی مجرب و عملی تدابیر معلوم ہونے کے بعد تمام عمر ممسک اور مقوی اور دوسری فضول دواؤں کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایڈیشن جلد ختم ہو جانے والا ہے۔ قیمت ۸ ر

عیش و نشاط

اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کے لئے وہ نکتے درج ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد عیش و لطف، کیف، تن پرستی، تندرست اولاد، عورت کی محبت اور شادی کی لذتیں چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کی جا سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۸ ر

زن و شوہر

یہ طلسمی کتاب شادی شدہ نوجوانوں کی زندگی کو راحتوں سے لبریز کر دیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد عورت کی فطرت سے اس قدر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بھوکا ننگا رکھ کر بھی خوش رکھ سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

نوٹ۔ ان کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں ہمارے کتبخانہ سے صرف ایک کارڈ آنے پر کفایت سے روانہ کی جاتی ہیں

مرد و عورت اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آخر عمر تک زوجین تندرست رہیں گے اور انہیں وہ تجربے معلوم ہونگے جن سے شاید اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

میاں بیوی یہ کتاب دراصل بے تکلف احباب کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے لوگ بیوقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ قیمت ۸ ر

ملنے کا پتہ۔ کتبخانہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

آج کل کے مسلمان اپنے مذہب سے بالکل ناواقف ہیں

چونکہ اول تو مسلمانوں کو علوم عربیہ حاصل کرنے کا بہت کم موقعہ ملتا ہے جس سے مذہبی مسائل و نکات سے واقفیت ہو سکے، دوسرے اب تک اُردو میں ایسا مذہبی لٹریچر موجود نہ تھا جو اس کمی کو کما حقہٗ پورا کرے اس غرض سے مندرجۂ ذیل کتابیں تالیف کی گئی ہیں تاکہ مسلمان اپنے مذہب کے نکات اور ارکان اسلام کے تمام مسائل سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکیں۔

عقائد الاسلام

مصنفہ علّامہ محمد عبدالحق صاحب محدث دہلوی جس میں مسلمانوں کے عقائد کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور اس فن کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور زمانہ حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر مخالفوں کے شبہات کا محققانہ جواب دیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک عہ

اسلامی تعلیم

فقہ اسلامی کی وہ مستند اور مقبول عام کتاب جو مفتی محمود الوری نے کمال محنت سے مرتب فرمائی فقہ اسلامی اور آسان طرزِ ادا میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ جن جن لوگوں کے پاس یہ کتاب موجود ہے انہوں نے کسی مولوی سے فتویٰ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں اس کا شہرہ ہو گیا، اپنی آسانی کے لئے علمائے کرام بھی اسے زیر مطالعہ رکھتے ہیں آپ مسلمان ہیں تو مذہب سے واقفیت بھی ضروری ہے اور مذہب کی معلومات کے لئے یہ کتاب ازبس ضروری ہے قیمت مجلد تین روپے محصول ۸؍

فلاح دین ودنیا

ہمارے اسلامی کتب خانہ کی برابر ایک زبردست اسلامی انسائیکلوپیڈیا جو ساٹھ اسلامی ضخیم کتابوں کی روح ہے اور جس میں دس ہزار سے زیادہ دینی اور دنیاوی مسائل ہیں جن میں ایک دنیا دار دین دار کی دنیاوی اور دینی ضروریات کی ایسی کوئی معلومات نہیں ہے جو موجود نہ ہو، یہ کتاب ہندوستان جیسے غریب ملک میں بھی بیس ہزار روپے سے زائد کی فروخت ہو چکی ہے اس میں نہایت مکمل دینی تعلیم ہے جس گھر میں یہ کتاب ہے وہاں ایک زبردست عالم، ایک زبردست دنیادار اور ایک دانشمند فلاسفر موجود ہے قیمت مجلد چار روپے محصول دس آنہ ۱۰؍

مذہبی معلومات

نئی روشنی کے ایسے لامذہب درسگاہیں جو اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں، لیکن اسلامی تعلیم سے ناواقف ہیں اور جب ان سے مذہب کی ناواقفیت کا سبب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اُردو میں ایسی کوئی کتاب ہی نہیں جو ہم کو مطمئن کر سکے اور کم سے کم وقت میں ہم زیادہ معلومات حاصل کر سکیں ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ مذہبی معلومات کا مطالعہ کریں جو تمام اسلامی تعلیم کی روح ہے جس میں صدہا مسائل درج ہیں جن کے معلوم کرنے کے لئے علماء کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اس کتاب کو تجارتی اغراض کے لئے خواہ مخواہ ضخیم نہیں بنایا گیا۔ قیمت صرف بارہ آنہ ۱۲؍

تفسیر سورہ یٰسین

یہ تفسیر اس زمانہ میں لکھی گئی ہے جو کہ بغاوت و طغیانی کا زمانہ ہے اور قدم قدم پر مذہب کے لئے عقلی دلائل مانگے گئے ہیں یہ تفسیر اس لحاظ سے بہت شاندار ہے کہ ہر بات کو معقول طریقہ پر سمجھایا ہے۔ یہ تفسیر علامہ عبدہ مصری کی تفسیر القرآن سے ماخوذ ہے اور ایسے عجیب و غریب پیرایہ میں مذہب کے اعمال کو ذہن نشین کیا گیا ہے کہ بالآخر ملحد بھی ایمان لے آتا ہے صرف تفسیر کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر بہت اہم ہے اور ایک ایک واقعہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے گویا بہت سی تفاسیر کا عطر ہے اس کتاب میں نفس سالت پر بھی بہت ہی پرلطف بحث ہے قیمت

البیان فی علوم القرآن اُردو

اس کتاب میں اسلام کے ہر مسئلہ کو مدلل پیرایہ اور فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا ہے اور غیر مذاہب کے مسلّمات اور فرقہ باطلہ کی مکمل تردید آپ کو اسی کتاب میں مل سکتی ہے مصنفہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی حجم ۷۶۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

تسخیر القلوب

کیا کوئی دل ہے جس پر آپ قابو چاہتے ہیں، وہ کوئی دل ہو کسی کا ہو مرد کا ہو یا عورت کا ہو، خاوند کا ہو، بیوی کا ہو، حاکم کا ہو دوست کا ہو آشنا کا ہو چھوٹے کا ہو بڑے کا ہو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آپ اس پر قابو حاصل کر لیں گے اگر آپ تسخیر القلوب منگا کر جو اس میں لکھا ہے اس کے عامل بن جائیں احباب کا مسخر کرنا زن و مرد کا مطیع کرنا آقا و افسر پر قابو پانا مقدمات کا اپنے حسب منشا فیصلہ کرانا اس کتاب کے عامل کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصول ۴؍

سیرت باقی

سالار نقشبندیہ حضرت خواجہ غریب نواز حضور خواجہ باقی باللہ رضی اللہ عنہ بخاری کی مفصل شرح سوانح عمری حضرت خواجہ کے تمام خلفاء کا تذکرہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی روحانی تعلیم تزکیۂ نفس کے سہل طریقے مجرب المجربات اوراد و وظائف حضرت خواجہ غریب نواز کی صوفیانہ قرآن حکیم کی تفسیر پڑھنی چاہتے ہو تو سیرت باقی کا مطالعہ کرو جس کے مصنف جناب پیرزادہ سید عزیز حسن بقائی دہلوی ہیں قیمت ۸؍ محصول ۴؍

تذکرۃ الاولیائے ہند اُردو

کفرستان ہند میں سات سَو اولیائے ہند تو ایسے ہیں جن کا حال اس کتاب میں ہے جس میں حالات و کرامات کے ساتھ اقوال اولیا کا وہ خزانہ بھی شامل ہے جو شائع نہیں ہونے پائے یہ کتاب اپنی جگہ خود صاحب تصرف ہے، کیونکہ ایک ہندو پریس نے اس کو پہلے پہل چھاپا اور اس کتاب کے ذریعہ مالا مال ہو گیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے مطالعہ سے گذرے گی تو ان کے دل و دماغ معرفت الٰہی سے منور ہوں گے قیمت ۱۲؍

فالنامہ ناصری

ہر کام شروع کرنے سے پہلے احسن طریقہ یہ ہے کہ استخارہ کر لیا کریں تاکہ اس کا انجام اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو ترک کر دیا جا سکے اس میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب استخارہ کا ترجمہ ہے اور اس کے علاوہ قرأۃ الانبیا فالنامہ پیغمبران، فالنامہ اولیائے کرام، فالنامہ غوث الاعظم، فالنامہ دیوان حافظ، فالنامہ مثنوی شریف شامل کر دیا ہے، یہ فالنامہ بہت مجرب ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصول ڈاک ۴؍

ملنے کا پتہ:- مکتب خانہ علم و ادب بازار چوڑی والان دہلی

تفسیر حقانی اُردو کامل آٹھ جلد

(مصنفہ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی محدث دہلوی)

یہ تفسیر آٹھ جلد وں میں پوری ہوئی ہے جس میں مذاہب کے حالات اور عالم آخرت کے اسرار اور قرآن شریف کی مصطلحات کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ تفسیر مع اصل متن مستند اور معرکۃ الآرا مشہور تفسیر ہے' جو کہ پچاس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خلائق ہے۔ اس تفسیر کی مختصر خوبیاں یہ ہیں کہ مخالفین اسلام کے جملہ اعتراضوں کا محققانہ مدلل پیرایہ میں جواب دیا گیا ہے۔ اس تفسیر سے معمولی اُردو داں سے لیکر متبحر عالم تک مستفید ہوتے اور بچے بوڑھے جوان مرد و عورت سب لوگ پڑھ سکتے ہیں' طلبار اور علمار کے لئے اس تفسیر میں علمی مباحث کے وہ دریا بہائے گئے ہیں جن کی شناوری ہر مباحث و مناظر کے لئے ضروری ہے علم تصوف اور مسائل روحانیت کو ایسا کشف فرمایا ہے کہ ذوق سلیم رکھنے والا صوفی منش انسان بیتاب ہو جاتا ہے۔ اصل کلام اصلی متن جلی قلم اعراب صحیح تفسیر اُردو عام فہم نہایت سلیس با محاورہ۔ روایات صحیح ربط آیات مع ترتیب شان نزول ساتھ ساتھ قصص و واقعات جملہ مسائل وغیرہ سب باتیں اس تفسیر میں درج ہیں۔ اگر آپ بھی عالم' واعظ' محقق' مناظر و صوفی بننا چاہتے ہیں تو تفسیر حقانی ملاحظہ فرمائیے جس کی مجموعی قیمت پچیس روپے ۲۵ علاوہ محصول ہے' اور ہر جلد کی علیحدہ علیحدہ قیمت یہ ہے پہلی جلد دو روپے پانچ آنہ سے آٹھ جلد تک فی جلد چار روپے علاوہ محصول ڈاک کے۔ اگر ڈاک کے ذریعہ منگاتے ہیں تو ثلث محصول ڈاک خرچ ہوتا ہے اس لئے ریل کے ذریعہ منگائیے۔ پانچ روپے پیشگی آنے پر روانہ کی جائیگی۔

معلومات نماز

انی تشریحات کے ساتھ بالکل نئے انداز میں نماز کو بہترین عبادت ثابت کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں نماز پڑھی جائے تو وہ انسان کو بہترین انسان بنا دیتی ہے۔ عنوان چند یہ ہیں۔ مذہب اسلام' عبادت' حکمت احکام عبادت کے منافع' ثمرات عبادت' ثمرات دنیا' ثمرات آخرت' تارک نماز' فضیلت نماز' نماز کے طبی فائدے' امتیازی عبادت' مقصد نماز' نفلی عبادت' نماز کے وقتوں کا قرآن سے ثبوت' بے نمازیوں کی کہانیاں' نماز قرآن میں اس کے بعد تمام نمازوں کا بیان ۶۰ صفحات قیمت صرف آٹھ آنہ ۸/

اسلام کے شو سپاہی

یہ مفید اور اہم کتاب مصنف کی تاریخ بینی کا نتیجہ ہے کہ جس وقت وہ اپنے سحر طراز قلم سے اسلام کے بہادر سپاہیوں کے محیر العقول مجاہدانہ کارنامہ کو بیان کرتے ہیں تو بزدلوں کے دلوں میں سچی اسلامی بہادری کا بجلی پیدا کر موجیں مارتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مسلمانوں میں اتحاد کی ایک غیر فانی لہر پیدا ہو جائیگی وہ خانہ جنگی کے طوق لعنت کو گلے سے اتار کر پھینکدیں گے۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

پیام خیام

خمکدۂ تصوف کے چھلکتے ہوئے ساغر آج ہی نہیں صدہا برس سے بادہ کشان تصوف کے لئے کیف اندوز ہیں آج وہ نئے ساقی کے ہاتھ سے تقسیم ہورہے ہیں۔ یہ خیام کی رباعیاں اور ان کی دلنواز شرح ہے' مشرق کے اس سب سے بڑے فلسفی نے ایک ایک رباعی میں پوری کائنات تصوف بھردی ہے اور صحیح معنوں میں کوزہ میں دریا بند ہیں۔ خیام کی رباعیاں وہ رباعیاں ہیں جن کی ہر ولایت میں شوق کی نگاہوں سے تاکا اور وہ شوق فیاں ہوئیں کہ ہر زبان ہر فن کے دفتر بھرے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب اُردو کی سب سے بڑی پایہ شرح اور سب سے زیادہ نفیس اور مکمل ہے قیمت عام

عملیات

اس وقت تک عملیات کو غیر مستند کتابوں نے بدنام کر رکھا تھا' اس کتاب میں پانچسو سے زیادہ ایسے مستند اعمال' اشغال اور عملیات ہیں جو اولیا اللہ اور بزرگان دین کے زیر عمل رہے ہیں۔ اس میں فن کی حیثیت سے عمل پڑھنا نقش لکھنا اور تمام اعمال کے متعلق ضرور باتیں درج ہیں قیمت تین روپے

حکایات الصالحین اُردو

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی عمدہ عمدہ حکایتیں ہیں۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

خواب نامہ صدیقی

آپکے خواب کی تعبیر کیا ہے' یہ بات دریافت کرنے کیلئے آپ کس قدر مشوش رہتے ہیں۔ جب آپکے گرد و پیش کوئی صحیح تعبیر بتانے والا نہیں ملتا اول تو لاکھوں میں کوئی ایک آدھ ہی کامل ہے جو صحیح تعبیر کرسکے اس لئے اگر آپ خوابکے مضر و مفید اثرات معلوم کرنا چاہیں تو خوابنامہ صدیقی پاس رکھئے اس میں خواب کی قسمیں قابل قدر تحفہ تعبیر خواب دونوں کے اثرات پیٹ کی خرابی فلسفہ خواب اور خوابکے متعلق صدہا مضامین ہیں قیمت عمر محصول

درس معاشرت

مایہ ناز انشا پرداز کے نوکِ قلم عبرت خیز' عجیب اور سبق آموز افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے ہر ایک افسانہ اسلامی طرز معاشرت کی بولتی تصویر ہے افسانہ کے پیرایہ میں مسلمانوں کی نہایت مؤثر الفاظ میں اصلاح رسوم کی اصلی تعلیم دی گئی ہے کسی مسلمان کا گھر اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۱۸۰ صفحات قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے صرف آٹھ آنہ رکھی گئی ہے۔

سیّدہ کا لال

اس شاہ ٹریجڈی علامہ رشد الخیری کا لکھا ہوا شہادت نامہ جس کے فرضی اصلاحی قصے پڑھنے سے دل ہل جاتے ہیں اور سیدنا امام حسین علیہ السلام کا واقعہ شہادت تو اپنی جگہ خود ہی بجد الم انگیز ہے اب اس تصور کیجیے کہ یہ درد انگیز حالات جب مولانا کے قلم سے لکھے گئے ہوں تو ہے کوئی سخت سے سخت دل انسان جو اس کا دعویٰ کرے اس کتاب کا ایک ہی باب بلا روئے پڑھ لیگا۔ یقین فرمائیے کہ خونریزی کربلا پر یہ کتاب پہلی اور آخری ہے جو شخص بلا روئے کتاب ختم کرے وہ دام واپس لے قیمت ڈیڑھ روپیہ محصول ۷/

یُوسف و ناہید

اسلامی تاریخ کا ایک درد انگیز واقعہ جس میں مسلمانوں کی سرفروشی کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی بھی داستان ہے اس سے دلچسپ ناول شاید ہی آپ کی نظر سے گذرا ہو قیمت ۱۲/

کلید مراد

دُعائیں مانگنے اور مرادیں حاصل کرنے کے طریقے' کلام اللہ اور احادیث سے اخذ کرکے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

آپ کی دعائیں قبول نہیں ہوتی

اس لیے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقوں اور آداب سے ناواقف ہیں۔ اگر آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے واقف ہو جائیں تو آپ کی دعا قبول ہوگی اور ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ قرآنی دعائیں پڑھئے۔ اس کتاب کے پڑھنے اور عمل کرنے کے بعد بہت سے صاحب اولاد بن جاتے ہیں غریبوں کو افلاس سے نجات مل جاتی ہے۔ مقروض قرضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ہدیہ آٹھ آنہ ۸/

آپ سے کون خفا ہے؟

کس منانے سے نہیں منتا؟ آپ کسے اپنا مطیع اپنا فرمانبردار یا دیوانہ بنانا چاہتے ہیں، وہ کوئی عورت ہو مرد ہو کوئی بوڑھا ہو کوئی آقا ہو کوئی حاکم ہو، آپ کے پیچھے پھرنے لگے گا اگر آپ اس عجیب غریب طلسمی کتاب کو ملاحظہ کریں، اور اس کی ہدایتوں پر عمل کریں۔ ہر عمل کی ترکیب نہایت آسان ہے قیمت آٹھ آنہ

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آتا ہے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے۔ اس میں صرف تین چھوٹے چھوٹے نقطے تجویز کر دیئے ہیں جن سے جس بحر کی تقطیع کرو۔ بس اگر آپ شاعر بننا چاہتے ہیں تو کتاب فن شاعری منگائیے قیمت ۸/

غزلیات علم مجلسی کے پانچویں حصہ میں غزلیات ہیں مجموعہ وہ غزلیں جو ہزاروں لاکھوں غزلوں میں انتخاب کی گئی ہیں۔ قیمت ۸/

فن تسخیر دلوں کو مسخر کرنے والے اخلاق و آداب سکھانے والی کتاب۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

فن تقریر تقریر اور گفتگو کرنے کے مفید اصول ۸/

اولاد کی تربیت بچوں کو بُری عادتوں سے بچانے اور اُن کے اخلاق و عادات درست کرنے کے لیے ایک عمدہ کتاب۔ قیمت ایک روپیہ

بیوی کے فرائض عورت پر بیوی بننے کے بعد جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا صاف اور مشرح بیان۔ قیمت ۸/

فیضان قدسی آیۃ الکرسی کے فضائل و اعمال ۸/

طوفان زندگی نہایت مفید و دلچسپ اخلاقی افسانے قیمت ۱۲/

صدائے ضمیر مسلمانوں کو خدا ترس پابند مذہب بہادر طاقتور تعلیم یافتہ باکار اور معمول نسیں بنانے والی اصلاحی کتب۔ قیمت ۱۲/

تصویر معاشرت نہایت مفید عبرت انگیز اصلاحی افسانے قیمت ایک روپیہ ۱۲/

زندگی کی صبح و شام دس دلولہ انگیز اخلاقی افسانے قیمت ایک روپیہ ۱۲/

پتھر سے ہیرا قصہ کے پیرایہ میں تبلیغ قیمت ۱۲/

قتل بہرام ایک پُراسرار قتل کے حیرت انگیز حالات ۹/

پیلا نیچے نجد ایک نہایت دلچسپ رنگین افسانہ ۱۲/

دو درویش دو درویشوں کی نہایت دلچسپ سرگذشت ۳/

تصانیف مصور غم علامہ راشد الخیری!

آمنہ کا لال اردو زبان میں مولود شریف کی مستند کتاب ۱۲/

سیدہ کا لال شہادت کی مفصل مکمل تاریخ در مراثی کربلا ... ۱۲/

صالحات ایک لڑکی کے حالات بصورت ناول ۱۲/

شب زندگی اصلاح نسواں کے سلسلہ میں مشہور و معروف کتاب ...

نسوانی زندگی چار سبق آموز نتیجہ خیز افسانے قیمت ۸/

جواہر قدامت دو بہنوں کی جگر خراش کہانی قیمت ۱۲/

طوفان حیات شرک قبر پرستی پیر پرستی رسوم کی پابندی کے خلاف معرکۃ الآرا تصنیف قیمت ایک روپیہ ۱۲/

تمغہ شیطانی سات نہایت دلچسپ کیرکٹر در جوہ دلآویز نتیجہ خیز افسانے

ستونتی ایک شریف بیوی کا قصہ جو اپنے کارناموں سے حیرت میں ڈال دیگی

سودۂ محروم دولت لڑکی کا درد و غم بھرا سبق آموز قصہ ۸/

انگوٹھی کا راز تین مختلف الخیال لڑکیوں کی دلچسپ کہانی ۸/

تفسیر عصمت خلع وارتداد پر مشتمل فسانہ پُر مذاق نصیحت خیز

منازل ترقی ترقی کی دھن، لیڈری کے شوق اور دولت کے نشہ میں انسان کیا کر بیٹھتا ہے قیمت ۳/

بیچہ کا کرتہ ایک عاشق زار بدنصیب ماں کی ناکام محبت ۳/

وِڈیا کی سرگذشت یورپین میاں بیوی کے تعلقات کا ہو بہو فوٹو کھینچا ہے قیمت ۴/

بیلہ میں میلہ غدر کی ماری شہزادی کے جگر دوز حالات باتصویر

جوہر عصمت سبق آموز دردانگیز نتیجہ خیز افسانے ۱۲/

سیلاب اشک نہایت دلآویز سبق آموز عبرتناک افسانے

مہر افروز باتصویر۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲/

طوفان اشک ۱۲ دل ہلا دینے والے مؤثر افسانے ۱۲/

روداد قفس وہ دردانگیز نظمیں جن کا ایک ایک شعر کلیجے پار ہو ...

گرفتار قفس سوز و گداز کی نظموں کا مجموعہ ۴/

نوبت پنج روزہ یادگار ظفر بہادر شاہ دہلی کے پانچ دن اور غدر کے حالات۔ قیمت ۱۲/

ولایتی نخی نہایت پُر لطف قصہ سنتے سنتے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ قیمت صرف چھ آنہ ۶/

نالۂ عشق اس قدر دلچسپ افسانہ کہ ختم کئے بغیر نہ چھوڑیں

الین کا دم واپسیں زبیدہ خاتون کے لخت جگر شہزادہ امین الرشید کا دردناک قتل ۳/

قلب حزیں ۲۳ دلآویز مختصر مضامین نظم و نثر

وداع خاتون محترمہ خاتون اکرم کی جوانمرگی ... ۱۰/

گلدستۂ عید سبق آموز افسانوں اور مضامین کا مجموعہ خاص رمضان اور عید کی کتاب قیمت ۸/

شہید مغرب طرابلس مراکش اور ہندوستان میں مسلمانوں کی خون کی ہولیاں۔ قیمت ۱۲/

عروس کربلا میدان کربلا کے دردناک حالات دل کے پیرایہ میں ...

درشہوار ایران سیستان کے مدبران کی لڑائیوں کا ہولناک قصہ ...

محبوب خداوند تغیر طرابلس کے مسلمانوں کا جوش ایمانی عیسائی راہب کی سیاہ کاریاں قیمت دو آنہ ۲/

منظر طرابلس مذہبی پیشوا کے سیاہ اعمالنامے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں مسلمانوں کی فتوحات ۸/

شہنشاہ کا فیصلہ عہد عباسی کے بغداد کا دلآویز افسانہ ۴/

سودائے نقد جوان لڑکی کی شادی کرنیکے دردناک نتیجے ۵/

[illegible]

جُرعات

جلد ۹ | ساقی۔ بابت ماہ جون ۱۹۳۴ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نگاہِ اوّلین

زیرِ نظر اشاعت میں کئی لائقِ قدر مضامین شامل ہیں۔ "موسیقی کا بہرہ اُستاد" ترجمہ کے اختصاصی جناب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی، ناظم دارالترجمہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن کا عطیہ ہے۔ "آخری مغل شہنشاہ رنگون میں" جناب احتشام حسین رائے پوری کا مضمون ہے جو ہندی میں شائع ہوا تھا۔ اُس کا ترجمہ صاحبِ مضمون کے بھائی جناب مظفر حسین شمیم نے نذرِ ساقی کیا ہے۔ "تذکرۂ دہلی مرحوم" اِس لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے کہ اِس سے گذری ہوئی بہاریں پیشِ نظر ہو جاتی ہیں۔ اگر اِس قسم کے مضامین ساقی میں زیادہ شائع ہوں تو ساقی اپنے نصب العین میں بڑی حد تک کامیاب نظر آئے گا۔ "جاپان میں اُردو ڈرامہ" کی رو‌داد مسٹر برلاس نے خوب لکھی۔ پروفیسر برلاس جاپان میں اُردو کی بہت اچھی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ اپنی زبان کی ہر دلعزیزی دیکھ لیجئے کہ سات سمندر پار بھی اس کی دُھوم مچی ہوئی ہے۔ اِسے اُردو کی لائقِ رشک کامیابی سمجھئے۔ محترمہ حجاب نقوی کا افسانہ "قیدِ حیات و بندِ غم" پلاٹ کے اعتبار سے اچھوتا نہیں ہے۔ تاہم اسلوبِ بیان کی خوبیوں نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

ساقی کا حصۂ نظم بھی بہ نسبت پہلے کے اب بہتر نظر آتا ہے۔ باکمال شعرا بزمِ ساقی میں زیادہ شریک ہونے لگے ہیں۔ پُروف ریڈر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ جناب علی اختر کی نظم "اظہارِ حقیقت" اب سے کچھ عرصے پہلے نگار میں شائع ہو چکی ہے۔ رسالہ نگار کے فائل دیکھنے سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ ہم جناب علی اختر کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ساقی بفضلہ اب اس اسٹیج سے نکل چکا ہے جس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اُمید ہے نہ صرف علی اختر صاحب بلکہ ساقی کے دیگر قلمی معاونین بھی ترسیلِ مضامین میں احتیاط رکھیں گے صحافت میں اس قسم کی بدعنوانیاں مستحسن نہیں سمجھی جاتیں۔

افسانہ نمبر:- جولائی کا پرچہ ساقی کا افسانہ نمبر ہوا کرتا ہے۔ اِمسال بھی بدستورِ سابق ساقی کا افسانہ نمبر شائع ہوگا مگر دیگر اخبارات و رسائل کے افسانہ نمبروں سے اِسے ممتاز کرنے کے لئے اب کے یہ تجویز کی گئی ہے کہ ایک ہی پلاٹ پر مُلک کے مشہور افسانہ نگار حضرات سے افسانے لکھوائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ساقی کے افسانہ نمبر میں ایک ہی پلاٹ کے کم از کم بارہ نہایت عمدہ افسانے شامل ہوں گے۔ اِس طرح یہ افسانہ نمبر نہ صرف اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ ہوگا، بلکہ شائقین کو افسانہ نگاری کے اُصول ذہن نشین کرنے کا بھی اچھا موقع مل جائے گا۔ مفصل اعلان اِسی اشاعت میں کسی اور صفحہ پر ملاحظہ کیجئے۔

لاہور کے مشہور رسالہ "ادبی دُنیا" نے منصور احمد کی ادارت میں لائقِ رشک ترقی کی ہے۔ (خُدا نظرِ بد سے بچائے) دسویں جلد کا آغاز بڑی تقطیع سے ہوا ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی اپریل کا پرچہ گذشتہ پرچوں پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے۔ اس سائز کے ۴۸ صفحات کو سابقہ سائز کے ۹۶ صفحات کے برابر سمجھنا چاہئے اور اسی لحاظ سے اس کا سالانہ چندہ بھی دوگنا کر دینا چاہئے تھا مگر حیرت کی بات ہے کہ اس میں مطلق اضافہ نہیں کیا گیا یعنی وہی پانچ روپے مع محصول ڈاک۔ جن حضرات کو بہترین جدید لٹریچر کا شوق ہے "ادبی دُنیا" کے مستقل خریدار بن کر کوڑیوں کے مول اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

شاہد

موسیقی کا بہرا اُستاد

مارچ سنہ ۱۸۲۲ء کی بیسویں تاریخ تھی کہ ملک آسٹریا کے شہر بان میں ایک بڑی عمر کا آدمی اپنے گھر میں پریشانی کے ساتھ سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ کچھ ہلکے کپڑے نکال کر ایک تھیلے میں رکھ رہا تھا۔ موسم بہت سرد تھا۔ دروازوں کے شیشے برف سے ڈھک گئے تھے۔ کمرے میں آتشدان میں دو چار لکڑیاں جل کر ختم ہونے کو تھیں۔ آگ کو تیز کرنے کا خیال یا تو اس لئے نہ آیا کہ اس غریب کا دل کسی غم میں مبتلا تھا۔ یا یہ وجہ ہوئی کہ سفر درپیش تھا اور جو قلیل سرمایہ پاس تھا اس میں کفایت شعاری کی ضرورت تھی۔ گھر کی صورت سے افلاس ظاہر تھا نہ کہ آسودگی۔ سامان میں ایک پرانی مسہری تھی جس پر پھیکے رنگ کے سبز پردے پڑے تھے۔ دو چار پرانی وضع کی کرسیاں تھیں جن کی گدیاں بوسیدہ ہو کر بالکل خراب ہو گئی تھیں۔ باقی ایک میز اور ایک ہارپ سیکورڈ باجا تھا۔ میز پر بہت سے کاغذ پریشان پڑے تھے۔ ان پر خط موسیقی میں کچھ نئے راگ تصنیف کئے لکھے تھے۔ ایک کاغذ پر کچھ مٹے کٹے حرف تازے لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہ غریب آدمی کس کام میں مصروف تھا۔ اس ویران گھر کے رہنے والے کی عمر پچاس اور ساٹھ کے بیچ میں تھی۔ گو غموں نے پشت کو خم کر دیا تھا لیکن بلند پیشانی پر جس سے ذہانت ظاہر ہوتی تھی، روپہلی بالوں کی لٹیں بکھری رہتی تھیں۔ آنکھوں میں وہ چمک اور گرمی تھی جیسے سیاہ شعلے ہوں۔ رخساروں کی تیز سرخی باقی چہرے کی زردی سے مقابلہ کرتی تھی۔ جب سفر کا ضروری سامان کر لیا تو میز کے قریب آیا۔ یہاں ایک خط جس پر شہر وآینا کے ڈاکخانہ کی مہر تھی، پڑا تھا۔ خط کو اٹھا کر دیر تک اس کے مضمون کو پڑھتا رہا حالانکہ مضمون صرف اتنا ہی تھا "پیارے چچا۔ اس وقت ایک رنج اور تکلیف کا باعث ہوتا ہوں جس کی معافی چاہتا ہوں۔ ایک جرم میں ماخوذ ہوا ہوں اور حکم ہوا ہے کہ فوراً وآینا سے شہر بدر ہو جاؤں اور پھر یہاں داخل نہ ہوں۔ اس لئے درخواست ہے کہ آپ یہاں آ کر میری مدد کریں۔ صرف آپ ہی کا ایک دم ہے جو مجھے اس وقت کی مصیبت سے نجات دے سکتا ہے۔ خدا حافظ۔ جون"

جب اس خط کو بار بار پڑھ لیا تو سفر کا ارادہ مصمم ہو گیا۔ غرض ایک ہاتھ میں تھیلا اور ایک ہاتھ میں لکڑی لیکر یہ غریب آدمی وآینا کو جانے کے ارادے سے اٹھا۔ لیکن جب گھر کی دہلیز تک پہونچا تو پھر کر بڑی حسرت کے ساتھ اس بے سامان اور اجڑے گھر کو دیکھا جس میں مدت تک امن کے ساتھ زندگی بسر کی تھی۔ دل سے ایک آہ نکلی اور فوراً گویا کسی سحری کشش سے مجبور ہو کر باجے کے قریب آیا اور جلدی سے جو کچھ ہاتھوں میں تھا پھینک کر باجے کے پردوں پر انگلیاں دوڑانے لگا۔ افسردہ چہرہ اثر نشاط سے شگفتہ اور روشن ہوتا گیا۔ اور ساز کی جانفزا صدائیں آسمان کی طرف بڑھیں جو حقیقی وطن خدا کی تعریف کا ہے۔

اس کیفِ طرب کی محویت میں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح اس عالم کو خیرباد کہہ کر صبر و اطمینان کی تلاش میں اس عالم میں پہونچی ہے جو سب سے بالا ہے۔ کچھ دیر کے بعد باجا تھم گیا۔ بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک

آہ سرد بھر کر چلّایا۔

"ہائے غضب ہے کہ میں اور بالکل نہ سُن سکوں"

افسوس کہ فنِ موسیقی کا یہ صاحب کمال بالکل بہرا تھا۔

غریب مسافر نے پھر اپنا عصا اُٹھایا اور منزل طے کرنے کا ارادہ کیا۔ گھر سے نکل کر جب راستے کے موڑ پر پہونچا تو ایک مرتبہ پھر حسرت کی نگاہ سے اُس گھر کی طرف دیکھا جہاں دس برس ہوئے کو آئے تھے کہ ثقلِ سماعت نے دُنیا کی آوازوں کو سُننے سے محروم کر کے گوشہ تنہائی میں بٹھا دیا تھا۔ اب کہ سامعہ بالکل معطل ہو چکا تھا موسیقی اس کی رُوح میں ٹھکن تھی۔ غرض شہر سے نکل جنگل اور دیہات میں سے گذر ہوا تنگ دستی نے مجبور کیا تھا کہ سفر میں پیادہ پائی اختیار کی جائے۔ منزل تک نہ پہونچا تھا کہ رستہ ہی میں رات ہو گئی۔ چلتے چلتے ایک دہقان کے گھر کے سامنے ٹھہر گیا۔ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر کے سمجھا تھا کہ رات ہونے سے پہلے وہاں پہونچ جائے گا جو اُس کے وطن سے تیس میل تھا۔ بہت ہمت سے یہ راہ طے کی تھی مگر اب تاریکی کی وجہ سے راستہ چلنا دُشوار ہوا اور معلوم ہوا کہ طاقتِ رفتار بھی جواب دے چکی ہے۔ مجبور ہو کر ایک دہقان کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک کم عمر لڑکی نے دروازہ کھول کر پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟" لڑکی نے جو کچھ کہا وہ مسافر نے نہ سُنا لیکن اُس کے لبوں کی حرکت سے سوال معلوم کر کے جواب دیا "پیاری لڑکی، میں مُسافر پروری چاہتا ہوں" لڑکی نے اتنا سُنتے ہی کہا "تو اچھا آپ اندر آجائیں۔ میرا باپ تو ہمیشہ ایسے مُسافروں کی خاطر و تواضع کرتا ہے جنہیں رستے میں رات آجاتی ہے" جب اس طرح سچے دل اور سادگی سے مدارات کی گئی تو مُسافر گھر میں داخل ہو کر بڑے کمرے میں آیا۔ یہاں غریبوں کا کھانا گرم گرم میز پر چُنا تھا۔ لڑکی نے جلدی سے ایک اُجلا رومال جہاں باپ بیٹھا تھا اُس کے قریب ہی میز پر بچھا دیا۔ اور اب مہمان بھی اُسی میز پر کھانے ہو بیٹھا جس کے گرد سارا کنبہ کھانے بیٹھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمان آتشدان کے قریب جا بیٹھا۔ آتشدان میں آگ جو باعثِ راحت تھی خوب دہک رہی تھی۔ ماں بیٹی نے جلدی جلدی میز کو صاف کیا۔ دہقان نے اپنا ہارپ سیکورڈ باجا کھولا تینوں بیٹوں نے اپنے اپنے ساز دیوار پر سے اُتار لئے۔

باپ بیٹوں نے اپنے اپنے باجوں کو ملایا۔ ماں بیٹی اپنا اپنا کام لیکر آگ کے پاس جا بیٹھیں جہاں اکیلے ایک چراغ نے سارے گھر میں اُجالا کر رکھا تھا۔ باپ نے بیٹوں کی طرف شروع کرنے کا اشارہ کیا اور چاروں نے مل کر ایک راگ اس خوبی اور خداداد ملکے کے ساتھ بجانا شروع کیا جو بمقابلے اور قوموں کے صرف اہلِ جرمنی ہی کو نصیب ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور طرح طرح کی حرکات چہروں سے ادا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو اُس محویت کے حوالے کر دیا جس نے اُن کو کسی اور ہی عالم میں پہونچا دیا تھا۔ ماں بیٹی دم بند کئے راگ سُنا کیں۔ یہاں تک کہ جو کچھ اُن کے ہاتھ میں تھا وہ فرش پر گر پڑا۔ باجے بھی آخر کار بند ہو گئے۔ اور جوشِ مسرت سے نگاہیں ایک دوسرے پر اپنا کام کرنے لگیں۔ لڑکی نے اُٹھکر اپنے بوڑھے باپ کے سفید سر کو پیار کیا۔ اور سب اسبات کو بھول گئے کہ ایک غیر بھی اُس وقت گھر میں موجود ہے۔ بڈھے مہمان نے محبت کی نگاہ سے یہ تمام کیفیتیں دیکھیں لیکن بہرے کانوں نے ایک آواز بھی ان دلکش نغموں کی نہ سُننے دی تھی جنہوں نے اس کے میزبانوں پر اسقدر اثر کیا تھا۔

بڈھے مسافر نے کانپتی آواز سے کہا: "اے میرے میزبانو! تم بڑی قسمت والے ہو کہ راگ سن سکتے ہو۔ یہاں تو برسوں سے موسیقی کی دلآویز صدائیں جو خدا کی آوازیں ہیں سنائی دینی بند ہو گئیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ اگر کبھی کسی دھن میں جنگل کو نکل جاتا ہوں تو وہ ہوا جو میرے گرد چلتی ہوتی ہے اُسے محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اس کی زبردست آواز جب وہ اپنی قوت سے اور پنچھی درختوں کو جنبش میں لاتی ہے یا اُن کی شاخوں اور پتوں میں ملکے ملکے سراسر اکر فطرت کی ہم آہنگی میں شامل ہو جاتی ہے مطلق نہیں سن سکتا۔ جب بہار کے موسم میں دن چھپے گھر کو آتا ہوں تو غریب چرواہے کی لڑکی کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے گلے کو چشمے پر پانی پلانے لے جاتی ہے لیکن وہ سہانی الاپ جسمیں وہ اپنا پیارا گیت گاتی جاتی ہے میرے کانوں پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ جنگل کے خوش آواز پرندوں کو جبکہ پہاڑ کی چوٹی سے اڑ کر وہ گھاٹی میں اترتے ہیں جہاں ان کے آشیانے انسان کی آنکھ سے اوجھل ہیں ہوا میں اڑتے دیکھتا ہوں لیکن اُن کے چہچہے جو جنگل کی سائیں سائیں کرتی ہوا سے ہمساز ہوتے ہیں نہیں سن سکتا۔ اے نغمہ و سرود۔ تم میری جان ہو میری روح ہو۔ لیکن افسوس، وہ قوت جو تمہیں محسوس کرنے کی مجھ میں تھی وہ زائل ہو گئی۔ اے میزبانو، تم مجھے وہ کاغذ دیکھ لینے دو جنہیں دیکھ کر تم نے اپنے ساز بجائے تھے اور تم پر عجیب کیفیت طاری ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر مہمان اٹھا اور وہ کاغذ اٹھا لئے جنہیں دیکھ کر باپ بیٹوں نے ساز بجائے تھے۔ کاغذوں کو دیکھتے ہی دفعتاً اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور بیہوش ہو کر اپنی کرسی پر گرا۔

سرورق پر جہاں مصنف کا نام ہوتا ہے اپنا نام لکھا دیکھا۔ گرتے ہی سب لوگ قریب آ گئے۔ اور اس حالت کا سبب دریافت کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد جب آواز پر کچھ قدرت ہوئی تو لڑکھڑاتے ہو کر کہنے لگا: "اے میرے مہربانو! میں ہی وہ بد نصیب ہوں جسے بیٹھوون کہتے ہیں۔ اور یہ راگ مجھ ہی کم نصیب کے تصنیف کئے ہوئے ہیں۔" اس نام کے سنتے ہی دہقان نے فوراً اپنے سر سے ٹوپی اتار لی اور تعظیم دینے کو جھکا۔ بیٹوں نے بھی فوراً تعظیم دی۔ بیٹھوون نے ان نوجوانوں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا لیا اور خوشی سے رونے لگا۔ نیک بخت دہقان نے بیٹھوون کے ہاتھ کو بوسہ دیا کیونکہ یہ وہ صاحب کمال تھا جس کی تصانیف سے دن بھر کے تھکے ہارے غریبوں کا کچھ دیر کو غم غلط ہو جاتا تھا۔ یہی وہ ہر دلعزیز شخص تھا جس کی وائنا میں اس درجے عزت ہوتی تھی کہ جب کبھی راستے میں نظر آتا تھا تو راہگیر کہتے تھے کہ "دیکھو بیٹھوون وہ جاتا ہے۔" اور چپکے سے اُس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں اُس کے کسی خیال میں مخل نہ ہوں۔ بیٹھوون کی پیشانی پر غموں نے گو مہر ہلاکت ثبت کر دی تھی لیکن غریب دہقان نے دلی مسرت سے دیکھا کہ انوار کمال اُس پیشانی پر ابھی تک حلقہ کئے ہیں۔

اب بیٹھوون خود باجے کے قریب گیا اور لڑکوں کو ساز لینے کا اشارہ کر کے اپنی تصنیف کی ہوئی چیزیں شروع کر دیں۔ راگ کی دھن میں از خود رفتہ ہو کر وہ چیزیں سنا گیا جن کو خود پہلے نہ جانتا تھا۔ سننے والے بت بنے سمجھ رہے تھے کہ آج بیٹھوون کی روح ان بندشوں کو توڑ کر جنہوں نے دنیا میں قید کر رکھا تھا بڑی شان سے آسمان کی طرف اٹھ رہی ہے۔

بیٹھوون کے ہاتھ میں آج باجے نے بھی غیر معمولی صدائیں پیدا کی تھیں۔ کبھی یہ صدائیں ایسی پُرشوکت

ہوتی ہیں جیسے بادل کی گرج اور کبھی ایسی نحیف جیسے جانکنی میں مرنے والے کی آہیں۔

افسوس، بیٹھوون کا یہ شغل آخری تھا۔ رات کا بڑا حصّہ اس میں گذر گیا۔ دہقان نے وہ بستر جس پر خود سویا کرتا تھا مہمان کی نذر کیا اور سب نے اصرار کیا کہ وہ اس پر آرام کرے۔

جب رات زیادہ ہوئی تو بیٹھوون کو بخار ہو گیا گرمی سے ماتھا جلنے لگا۔ ٹھنڈک کے لئے ہلکے ہی کپڑے پہنے باہر نکل آیا۔ ہوا اس وقت بہت سرد اور تیز چل رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں میں سسکیاں لے لیکر رو رہی تھی۔ بن اور دیہات پر زور کا مینہ برس رہا تھا۔ غرض جب کمرے میں واپس آیا تو بدن کی حس و حرکت جاتی رہی۔ استسقا کا مرض پہلے ہی سے تھا۔ اب وہ عود کر آیا اور قلب تک اس کا اثر پہونچ گیا۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ اب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ آخر کار مریض وائنا میں لایا گیا۔ یہاں ایک طبیب نے آکر دیکھا اور مایوسی ظاہر کی۔

ہومل جو بیٹھوون کا سب سے بڑا رفیق اور سچا دوست تھا علالت کا حال سُنتے ہی دوڑ آیا تاکہ اخیر وقت جو کچھ ہو سکے دوست کی خدمت کرے۔ لیکن جب پہونچا تو بیٹھوون کے حواس سلامت نہ رہے تھے۔ دوست کو دیکھکر مریض نے کچھ کہنا چاہا لیکن جن لفظوں کو ادا کرنے کی جستجو تھی وہ خود مردہ لبوں تک آکر بے جان ہو گئے۔ اس حال میں بھی دوست کو کچھ پہچانا اور ایک افسُردہ تبسم سے اُس کا شُکریہ ادا کیا۔ ہومل نے غم سے بیتاب ہو کر مریض کے ہاتھوں کو جو برف ہو چکے تھے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ مرنے والے کو جب دوست کا ہاتھ محسوس ہوا تو ایک پل کے لئے آنکھوں میں کچھ نور آیا۔ لیکن پھر تکیہ پر سر کو آہستہ سے جنبش ہوئی اور ایک ہچکی کے ساتھ رُوح پرواز کر گئی۔

(آسٹریا کے ملک وائنا میں لوئی وان بیٹھوون فنِ موسیقی کا اُستاد کامل گذرا ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۷۷۰ء کو شہر بون میں پیدا ہوا۔ اور ۵۶ برس زندہ رہکر ۲۶ مارچ ۱۸۲۷ء کو دارالحکومت وائنا میں فوت ہوا۔ ان دونوں شہروں میں اُس کے مجسمے نصب ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک نے اپنے اس مطرب کی کس درجے عزت کی۔ بیٹھوون کی تصانیفِ موسیقی کی قدر اب تک یورپ میں کی جاتی ہے۔ سب سے دردانگیز واقعہ اُس کی زندگی کا یہ تھا کہ چھتیس برس کی عمر میں بالکل بہرا ہو گیا۔ یہ مصیبت سب کے لئے سخت ہے لیکن ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگانی کا دارومدار ہی سامعہ پر ہو اس کی سختی کی انتہا نہیں رہتی۔ غرض زندگی کے بیس برس اس معذوری میں گذرے۔ لیکن اس حالت میں بھی شوق جاری رہا اور بڑی قابل قدر چیزیں تصنیف کیں۔ مندرجہ صدر مضمون ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے اور اس میں وہ چند واقعات بیان ہوئے ہیں جو موت سے چھ دن پہلے بیٹھوون پر گذرے تھے۔)

عنایت اللہ۔ بی۔ اے۔ دہلوی

آفتاب و ماہتاب

جُدا ہے تیری طریقت سے دوست میری روش
تجھے ملی ہے صباحت، مجھے ملی ہے تپش

تری نگاہ میں غلطاں ہیں چاندنی راتیں
مری نظر میں نمایاں ہیں عشق کی گھاتیں

تری سرشت میں ہے برگِ گل کی شیرینی
مرے مزاج میں طوفاں کی وحشت آئینی

تو ایک قوسِ قزح ہے، میں ایک ابرِ جنوں
میں ایک شعلۂ آتش، تو بادۂ گلگلوں

میں ایک جھونکا ہوں طوفاں کا، تو ہے موجِ نسیم
مگر، کمال ہے، باوصفِ اختلافِ عظیم

پناہ دی تجھے قدرت نے میرے پہلو میں
ملا نشاطِ دو عالم مجھے تری خو میں

ترے بغیر مکمل نہیں حیات مری
مرے بغیر ہے تاریک کائنات تری

تو حُسنِ زیست ہے، میں التہابِ ہستی ہوں
تو ماہتاب ہے، میں آفتابِ ہستی ہوں

عدم

آخری مغل شہنشاہ رنگون میں

۱۸۵۷ء کا ذکر ہے!! علی الصباح کچھ پالکیاں اور ڈولیاں آکر لال قلعہ کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ اندر سے آہ وزاری کی صدا بلند ہوتی ہے اور باہر اُس کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ آج آخری مغل شہنشاہ کے آخری دیدار کے لئے میدان میں لوگوں کا اژدھام لگا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا گورے سنتریوں کے پہرے میں آتا اور ایک پالکی میں سوار ہوجاتا ہے۔ اُس کی حسرت بھری نگاہیں قلعہ کی سنگین دیواروں میں گڑجاتی ہیں۔ آہ، وہ قلعہ جہاں مغلوں کی شوکت پارینہ دفن ہے۔ جہاں ہندوستان کی عظمت آخری ہچکیاں لے رہی ہے!!! اب شاہی خاندان کے کچھ لوگ اور چند بیگمیں سر پر خاک اُڑاتے ہوئے نکلتے ہیں، پالکیاں روانہ ہوجاتی ہیں، اور اُن کے ساتھ مغلوں کا جھلملاتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ شکست خوردہ کی کہانی ریت کے ڈھیر پر لکھی ہوتی ہے جسے زمانہ کا ایک جھونکا مٹا دیتا ہے۔ یہی حال بہادر شاہ کا ہوا۔ تاریخ کو صرف اتنا یاد ہے کہ مغلوں کا آخری نام لیوا بہادر شاہ رنگون گیا وہیں مرا اور وہیں دفن ہوا۔ لیکن اُس کی زندگی کی آخری گھڑیاں کیسے گذریں، اُس کے کنبے کا کیا حال ہوا۔ اِس دردناک کہانی کے کون کون سے داغ اب تک باقی ہیں! زمانہ کی گردش نے کن کن لوگوں کا نشان مٹا دیا یہ ہمیں نہیں معلوم۔ تاریخِ مغلیہ کا یہ باب سادہ پڑا ہوا ہے اور اسے آنسوؤں کی بوندوں کے سوا اور کون لکھ سکتا ہے؟ میں یہاں صرف یہ لکھوں گا کہ رنگون میں بہادر شاہ کے ہمراہی کون تھے اور اُن کی اولاد پر کیا گذری۔

جب بہادر شاہ رنگون پہونچے اُس وقت اُن کے ساتھ تقریباً تیس آدمی تھے۔ ان میں سے گیارہ نے اُن کے آخر وقت تک حقِ رفاقت ادا کیا۔ بقیہ میں سے کچھ ہندوستان واپس آگئے اور کچھ برما ہی میں بس گئے۔ بہادر شاہ کے ہمراہیوں میں اُن کا چہیتا بیٹا جواں بخت، اُن کی بہو زمانی بیگم اُن کی دُکھ سُکھ کی شریک ملکہ زینت محل اور ایک دوسرا بیٹا عباس شاہ تھے، کہا جاتا ہے کہ تاج محل بیگم اور شاہزادی رابعہ بیگم بھی رنگون آئی تھیں اور سر تاج کے اُٹھ جانے کے بعد ہندوستان لوٹ گئیں۔

ظفر کے جو ہمراہی برما میں رہ گئے تھے اُن میں سے اکثر نے مولمین میں گھر بنایا اور برمی عورتوں سے شادیاں کرلیں۔ شاہزادہ عباس شاہ نے بھی مولمین میں ایک برمی عورت سے عقد کیا۔ چنانچہ اُن کے فرزند پرنس رحمت سلطان اب تک وہاں موجود ہیں۔ ظفر کے عزیز شاہزادہ نظام شاہ نے بھی مولمین میں ڈیرا ڈالا، یہیں اُن کے بیٹے انتظام شاہ زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ باقی لوگوں کا کوئی پتہ نہ لگنے پایا۔ وہ برمی سوسائٹی میں گھل مل گئے اور زیادہ دنوں تک اپنی پرانی آن بان قائم نہ رکھ سکے۔ اس طرح زمانہ قید میں لے دے کر اُن کے ساتھ اُن کے بیٹے جواں بخت۔ بہو شاہ زمانی بیگم۔ باقی رہ گئیں ـــــــ اندھیرے میں تو سایہ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے پھر دوسروں سے کیا اُمید؟

مغل شہنشاہ کا قیدخانہ

بہادر شاہ کو جہاز سے اتار کر گوروں کے سخت پہرے میں صدر بازار۔ ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گیا۔ یہ پرانے گھڑ دوڑ کے میدان کے پاس موجودہ "واہل روڈ" کے کنارے یہ مکان بنا ہوا تھا۔ اب تو اسکا کہیں پتہ بھی نہیں۔ اب وہاں کچہری اور پولیس کی چوکی نظر آتی ہے۔ یہ کل احاطہ ایک انگریز مسٹر ڈاسن کی ملکیت ہے جس میں آخری مغل شہنشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ آخری نیند سو رہا ہے۔ ظفر کی زندگی میں اس بنگلے کے ارد گرد پہرے دار چیل کی طرح منڈلاتے رہتے تھے!!

کسی بادشاہ کی روح کا خاتمہ کرنا ہے تو اس کی شاہی آن بان کا خاتمہ کر دو پھر دیکھو وہ کس طرح تڑپتا ہے۔ اسکی ہر سانس ایک آہ ہے اس کی ہر بات ایک کراہ ہے۔ اس کی مسکراہٹ موت کی ہنسی ہے!! انیسویں صدی کے ہشتاد سالہ مصیبت زدہ مغل شہنشاہ کی تصویر کھینچو! جس نے ساڑھے تین سو برس کی عظمت شوکت کو باد فنا کی ایک ٹھوکر سے خاک میں ملتے دیکھا ہے، جس کے کانوں نے اپنی بیٹیوں کی چیخ اور ننھے ننھے بچوں کی پکار سنی ہے ---- اور اب ہمیشہ کیلئے دنیا سے الگ کر دیا گیا ہے۔ بھلا اسکے جذبات کی گہرائیوں تک کون پہونچ سکتا ہے؟

ظفر اپنے تنگ و تاریک کمرے سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ چارپائی پر پڑے ہوئے بے جان سے کش کھینچتے۔ اپنے دردناک شعروں کو گنگناتے اور نماز پڑھتے ہوئے صبح سے شام اور شام سے صبح کر دیتے تھے اور کبھی کبھی اپنے پیارے بیٹے جواں بخت کو اس سنگدل دنیا کی بے وفائی کی حکایتیں سنانے لگتے۔ پچھلی باتوں کی یاد زخم پر نمک کا کام کرتی تھی ہم ذیل میں ظفر کے کچھ ایسے اشعار درج کرتے ہیں جو انہوں نے زمانۂ قید میں لکھے تھے۔ سچ کہا ہے کہ شاعری دل کا آئینہ ہوتی ہے۔

کون نگر سے آئے ہم اور کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے ہم کون نگر کو ہوتے من میں ہراسے ہیں

کیسا ملک ہے، کیسا روپیہ، کیسی چال اور کیسی ڈھال
یا ہی ان کو اندیشے اور یا ہی جی کو سانسے ہیں

دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا
کون آنند کرے ہے وہاں اور رہتے کون ہراسے ہیں

کیا کیا پہلو دیکھے ہم نے پہلے اس پھلواری میں
اب جو پھلے اس میں پھل ہیں کچھ اور ہی نیں باسے ہیں

بادبندی سب ہی یاں کی واں کی ہے کچھ اور ہوا
کوئی بتائے یہ ان کو جو لڑتے لوگ ہواسے ہیں

دنیا ہے اک رین بسیرا بہت گئی رہی تھوڑی سی
ان سے کہدو سو نہ جائیں نیند میں نندا سے ہیں

کہتے ہیں کہ بدنصیب شہنشاہ نے دلی سے رنگون جاتے ہوئے ذیل کی غزل کہی تھی۔

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے

نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کو
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

جو پائے بند صداقت ہیں قول سے اپنے
کبھی نہ ٹھوکریں کھائے اگر چلن سے چلے

مرے پہ دامنِ صحرا نے پردہ پوشی کی
برہنہ آئے تھے لپٹے ہوئے کفن سے چلے

ایک ایک لفظ سے اُداسی ٹپکتی ہے اور کیوں نہ ٹپکے یہ دُکھے ہوئے دل کی صدا ہے! افسوس ہے کہ علم ادب کے یہ آبدار موتی ہم تک نہ پہونچ سکے۔ اِسی سلسلے میں ایک عجیب بات مشہور ہے، وہ یہ کہ ظفرؔ نے دیواروں پر ناخن سے اپنے شعر لکھ دیئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پتہ چلتے ہی کسی نے شعروں کو نقل کر لیا اور اب سے تیس پینتیس برس پہلے چھاپکر شائع کر دیا معلوم نہیں یہ افواہ کہاں تک سچ ہے لیکن ایک زمانہ ہوا کہ یہ کتاب میری نظر سے گذری تھی!! اُردو علم ادب کی بدنصیبی ہے کہ ایسی نادر روزگار کتابیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ ظفرؔ کے ایامِ اسیری پر الگ کچھ لکھنے کا موقع ملا تو میں اِس موضوع پر روشنی ڈالوں گا۔

ظفرؔ کی موت

ظفرؔ کو کتنی پنشن ملتی تھی اِس سلسلہ میں کئی افواہیں گرم ہیں۔ مگر اب قطعی طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ سخت مصیبتیں جھیلنے کے باوجود شاہی قیدی نے اڑ نہ چھوڑی اور حکومت برطانیہ سے پھوٹی کوڑی تک لینے سے انکار کر دیا۔ آخر وقت تک ظفرؔ نے اپنی آن پر دھبہ نہ لگنے دیا۔ اگرچہ کئی کئی فاقے گذر گئے۔ کپڑے تار تار ہو گئے بستر کی جگہ چیتھڑوں نے لے لی مگر اُس نے خودداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ سرکار نے لاکھ پنشن دینا چاہا مگر ظفرؔ کی "نہیں" "ہاں" سے نہ بدلی۔ زینت محل کے بچے کھچے زیوروں کو بیچ کر روٹیاں چلتی رہیں!

بہت دنوں سے انہیں گُردے کے درد کی شکایت تھی، فکر اور تکلیفوں نے خون کی گرمی اتنی بڑھا دی کہ دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی۔ اور سرسام ہو گیا۔ آخر کار ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رُوح کا قیدی جسم کے محبس کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا اور اِس طرح خاندانِ مغلیہ کا آخری جھلملاتا ہوا چراغ خلیج بنگالہ کے تیز و تُند جھونکوں کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لئے رنگون میں بجھ کر رہ گیا! بسترِ مرگ پر زینت محل، جوان بخت، شاہ زمانی بیگم اور اُن کی دو مہینے کی بچی رونق زمانی بیگم کے سوا اور کوئی نہ تھا! ایک اکبر کی موت تھی کہ ایک طرف دھنونتری اور مسیحا سے ٹکر لینے والے وید اور حکیم ملک الموت سے دست و گریباں ہیں! اور دوسری طرف حُسن کی دیویاں تلوے سہلا رہی ہیں۔ ایسی موت ہو تو کون نہ مرجائے اور اُس کے اکلوتے نام لیوا کی موت کو دیکھو کہ نبض پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں!! اور وہ آج دو پھول کو محتاج۔

اب یہ قیدخانہ ہے تھیٹر روڈ کہلاتا ہے۔ اُس کے احاطہ میں بہت ہی معمولی طریقہ سے آخری مغل شہنشاہ کی مٹی دبا دی گئی۔ زینت محل روزانہ اپنے بدنصیب شوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھتیں اور گھنٹوں بیٹھی آنسو بہایا کرتیں لیکن فلک کو یہ بھی پسند نہ آیا۔ شاہی کنبہ کو یہاں سے نکال کر ایک دوسرے مکان میں رکھا گیا جو اَب تک "بٹلر انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ" کے آگے موجود ہے۔ کچھ دنوں بعد ایک انگریز مسٹر ڈاسن نے اِس پُرانے احاطہ کو خرید لیا۔ خانگی ملکیت ہو جانے کی وجہ سے اب ظفرؔ کی قبر پر پھول جانے اور شمع روشن کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی اور قبر کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ اُس زمانہ میں رنگون ایک چھوٹی جگہ تھی اور ہندوستانیوں کا آنا جانا بھی کم تھا اس لئے رفتہ رفتہ لوگ اس قبر کو بھول گئے اور ظفرؔ کی یہ پیشگوئی صحیح اُتری کہ:-

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ!! دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

آج سے بیس پچیس سال پہلے جب مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کیا تو سرکار نے قبر کے پاس سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر یہ الفاظ کندہ کرا دئے:-

Bahadur Shah ex-King of Delhi died at Rangoon, Nov. 7th 1862, and buried near this spot.

"بہادر شاہ سابق شاہ دہلی کا ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں انتقال ہوا اور اس مقام کے قریب (انہیں) دفن کیا گیا" "اس مقام کے قریب" ۔۔۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتبہ اصل قبر پر نہیں لگا تھا کیونکہ ڈاسن صاحب نے قبر کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ اب برسوں کی مقدمے بازی کے بعد راستہ کھل گیا ہے۔ قبر کی بن گئی ہے اور ہر جمعرات کو لوگ نذر چڑھانے کے لئے مزار پر حاضری دیتے ہیں!! انسان کی عقیدت کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ چنانچہ شاعر نے بھی کہا ہے

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہیگا۔

زینت محل بیگم کی حیات و موت

زینت محل اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ نئے مکان میں کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن گذارنے لگیں۔ ایک تو پہلے سے ان کے مزاج میں حکومت تھی دوسرے بے علمی اور عصائب نے چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ شاہ زمانی بیگم بھی بڑی تیز مزاج تھیں۔ آپس میں اَن بن رہتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کی موت کے پانچ برس بعد جواں بخت اپنی بیوی اور لڑکی کو لیکر ماں سے علیحدہ ہو گئے اور اُس مکان میں سکونت اختیار کر لی جو اُن کے لئے سرکار نے خرید رکھا تھا۔ یہ مکان رنگون سنٹرل جیل کے نیو کمشنر روڈ کے سامنے "صاحبزادہ کا بنگلہ" کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت تک زینت محل اپنے مرحوم شوہر کی اڑ پر قائم تھیں انہوں نے سرکار سے ایک پیسہ بھی نہ لیا تھا۔ لیکن اُس کے بعد اُنہیں اور جواں بخت کو پانچ پانچ سو روپے ماہانہ پنشن ملنے لگی۔ زینت محل ۱۸۸۴ء تک اسی مکان میں زندگی کے دن کاٹتی رہیں۔ جس کی سواری کے ساتھ "ظل سبحانی بادشاہ بیگم" کے فلک بوس نعرے لگتے تھے جس کے گوشۂ چشم کا اشارہ خدا جانے کتنی قسمتوں کو بنا اور بگاڑ سکتا تھا سو ہی مغل ملکہ اُنیس سال تک ایسی حالت میں زندگی گذارتی ہے کہ اکلوتا بیٹا آنکھوں کے آگے رہ کر بات نہیں پوچھتا۔ بیوگی اور بڑھاپا الگ چٹکیاں لیتے ہیں۔ گذرے ہوئے زمانہ کی یاد علیحدہ رہ رہ کر دل میں تڑپ پیدا کرتی ہے، آئندہ زندگی بھیانک اور مصیبت ناک معلوم ہوتی ہے ۱۸۸۴ء میں اس کی زندگی کا سہارا مولمین میں دم توڑ رہا ہے اور وہ بے بس دکھیاری اُس کے درشن کی پیاس سے رنگون میں بے تاب ہے۔ اس جان لیوا حادثہ نے مصیبت زدہ بیگم کا دل بالکل توڑ دیا اور دو برس بعد وہ بھی راہئ ملکِ عدم ہو گئی۔ اُسے ظفر کی قبر کے پاس دفنا دیا گیا۔

آج اُس ملکہ کی یادگار ایک کتبہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس کے خاندان کی ایک بزرگ خاتون تاج محل میں موت کی نیند سوتے ہوئے باجود حیاتِ جاودانی کا لطف اُٹھا رہی ہے۔

جواں بخت اور شاہ زمانی بیگم

ظفرؔ کے جیتے جی اور اُن کی موت کے پانچ برس بعد تک جواں بخت کی سختی سے نگرانی کی گئی۔ اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر بھی نہ نکل سکتے تھے۔ جب ماں سے الگ ہونے کے بعد وہ نئے مکان میں رہنے لگے تو نگرانی میں وہ سختی نہ رہی اور رنگون کے اندر گھومنے کی اجازت مل گئی۔ اُن کی دو اولادیں ہوئیں۔ لڑکی رونق زمانی بیگم اور لڑکا پرنس جمشید بخت!!

جواں بخت اچھا زمانہ دیکھ چکے تھے اس لئے دلّی کی یاد انہیں ہمیشہ اُداس رکھتی تھی۔ وطن اور عزیزوں کی محبت ہمیشہ اُنہیں بےچین کرتی تھی۔ شاہانہ اندازِ طبیعت سے دُور نہ ہوا تھا۔ چار گھوڑوں کی بگھی میں سیر کو نکلتے تھے۔ پانچ سو روپے میں بھلا اُن کا کیسے کام چلتا دُکانداروں کا کبھی قرض ادا نہ کر سکے۔ مرنے کے بعد سرکار نے ادا کیا۔ رام رنگی منہ لگی ہوئی تھی۔ مرنے سے دو سال پیشتر اپنی بیوی سے قطع تعلق کر لیا اور ایک نومسلم برمی عورت سے شادی کر لی اور اُسی کے ساتھ مولین چلے گئے۔ اور وہیں انتقال ہوا۔ آخری وقت میں ماں پاس تھیں نہ بیوی اور نہ بچے!!

جس کی شادی میں غالبؔ و ذوقؔ سہرے لکھ کر آپس میں اُلجھ پڑیں، جسے ولیعہد بنانے کے لئے آسمان و زمین ایک کر دئے جائیں وہ مرتا ہے تو کوئی اپنا پرایا آنسو بہانے والا بھی نہیں۔ وہیں کے قبرستان میں دفنائے گئے اور اب کچی قبر آخری مغلیہ ولیعہد کے ماتم میں اپنے سر پر خاک اُڑا رہی ہے۔

شاہ زمانی بیگم کو اپنے شوہر کے برتاؤ سے ایک طرح کی چڑ ہو گئی تھی وہ اُن سے اس قدر خفا تھی کہ جب اُن کے موت کی خبر ملی تو جواب دیا "وہ میرے لئے دو سال پہلے ہی مر چکے تھے"۔ بڑھاپے میں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ برمیوں سے اتنی نفرت تھی کہ جب کوئی ملنے آتا تو پہلے پوچھتیں "برمی ہو یا ہندوستانی؟" ایک یوروپین نرس دیکھ بھال کے لئے رکھی گئی تھی مگر اس سے ہمیشہ چلم بھروایا کرتی تھیں، اسے ہمیشہ شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا کرتیں۔ یہاں تک کہ حقہ کا پانی بدلنے کے لئے الگ ایک مسلمان نوکر رکھ چھوڑا تھا جب رونق زمانی بیگم بڑی ہوئیں تو اُن کے سلوک نے ماں کے آخری زمانہ کو اور بھی اور زیادہ بھیانک بنا دیا۔ ان کا ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ انتقال ہوا۔

ہم ذیل میں شاہ زمانی بیگم کا ایک خط درج کرتے ہیں۔ پورا خط بےبسی اور بےکسی کا مرقع ہے۔ اُنہوں نے بہادر شاہ کی زندگی میں یہ خط رنگون سے اپنی ماں کو دلّی بھیجا تھا۔ غدر کی تاریخ میں اس خط کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ افسوس کہ اب اصل خط کہیں نہیں ملتا میں اسکی نقل کیلئے حضرت خواجہ حسن نظامی کا ممنون ہوں۔

شہزادی کا خط

از رنگون۔ ملک برما۔ دِلّی کے قیدی بادشاہ کا گھر۔ امّاں حضرت کو آداب!! میں آپ کی بیٹی کالے پانی میں ہوں۔

جلاوطن دلّی سے ہزاروں کوس دور، میکے سے جدا اور ایسی جدا کہ اب جیتے جی کبھی کسی میکے والے سے ملنے کی آس نہیں ہے۔ آپ کا خط سائیں ببیل شاہ صاحب لے کر آئے تھے۔ جب وہ حضور (بہادر شاہ) سے باتیں کر رہے تھے تو میں نے چلمن میں سے دیکھا وہ زار زار رو رہے تھے اور حضور کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ باتیں کر کے سائیں صاحب اُن کے (جواں بخت کے) ساتھ میرے کمرے میں آئے اور خط دیا۔ خط دیتے ہی رونے لگے۔ مجھے بھی وہ وقت یاد آگیا جب میری شادی ہوئی اور غالبؔ ذوقؔ کے سہروں کا چرچا ہوا اور میں نے آپ کے ذریعہ وہ دونوں سہرے منگوائے تو یہی سائیں ببیل شاہ صاحب لے کر آئے تھے۔ اُس وقت میں ولیعہد ہندوستان کی ملکہ تھی۔ سائیں ببیل شاہ سات ڈیوڑھیوں اور پہرے داروں کو عبور کر کے مجھ تک آئے تھے۔ آج میں ایک جلاوطن قیدی ہوں اور ایک قیدی کی بیوی ہوں، قیدی ساس اور سسرے کی بہو ہوں۔

اب نہ یہاں وہ لال قلعہ ہے نہ سات ڈیوڑھیاں ہیں نہ پہرے دار۔ بس لکڑی کا بنا ہوا ایک مکان ہے جو برسات میں ٹپکتا ہے اور جس میں دو چار کمروں کے سوا زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ ایک کمرے میں حضور اور ملکۂ عالم (زینت محل) کی خوابگاہ ہے۔ دوسرے میں میرا اور اُن کا بستر ہے۔ تیسرے میں نوکر ہیں۔ چوتھے میں کھانے پکنے جلنے کا انتظام ہے۔ مجھے یہاں کی ہوا راس نہیں آتی۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ مچھر بھی بہت ہیں۔ مکان بھی پرانا اور بوسیدہ ہے۔ اکثر بخار ہو جاتا ہے۔ حضور اور ملکۂ عالم بھی بیمار رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ (جواں بخت) بس ایسے ہیں کہ جن کو یہاں کی ہوا سے کچھ نقصان نہیں ہوا۔ آپ نے دلی کی تباہی کا جو حال لکھا ہے وہ تو جب ہم دلی میں تھے اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ ہاں آکا بھائی (بڑے بھائی) کی پھانسی کا حال اِس خط سے معلوم ہوا۔ وہ تو غدر کے دنوں میں بنارس گئے تھے۔ اُن کو کس خطا پر پھانسی دی۔ یہ بات آپ نے نہیں لکھی۔ سائیں صاحب سے میں نے پوچھا تھا کہنے لگے حضرت سید حسن عسکری کو پھانسی دی گئی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی اُن کی سازش میں شریک تھے اور شاہ ایران کو جو خط گیا تھا اُس میں ان کا بھی دخل تھا ـــ (کہتے ہیں کہ غدر کے پیشتر شاہ ایران اور بہادر شاہ میں خط و کتابت ہو رہی تھی اور یہی سید حسن عسکری خفیہ قاصد کا کام انجام دے رہے تھے۔ دلی میں اُن کی خدا پرستی کے بڑے چرچے تھے۔ غدر کے بعد پھانسی ہو گئی۔ اختر) اور بنارس اسی غرض سے گئے تھے کہ بات چھپانے کا ایک بہانہ ہو جائے۔ میں نے آکا بھائی کا حال سُنا کہ انہیں بڑی بیدردی سے پھانسی دی گئی اور آپ خود پھانسی کے وقت موجود تھیں تو مجھے مارے غم کے غش آنے لگا۔ ہم جب دلی سے جلاوطن ہو کر چلے ہیں اُس وقت تک تو وہ بنارس سے آئے نہیں تھے۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کا بیان کر کر کے رونا سائیں صاحب سے سُنا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اُس کی عمر ابھی چار برس کی ہوگی۔ غریب کو کیا خبر کہ باپ کہاں چلا گیا۔ جب میں نے سعیدہ کی یہ بات سُنی کہ آکا بھائی کی لاش گھر میں آئی تو اُس نے آپ سے کہا "ابا حضرت ہم سے خفا ہو گئے۔ بولتے نہیں۔ آنکھ بند کئے لیٹے ہیں" تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سعیدہ مجھے بہت یاد کرتی ہے اور جب سے آکا بھائی کے مارے جانے کا حال سُنا ہے سعیدہ کا خیال روز آتا ہے۔ موئی مٹی کی نشانی ہے۔ میں اُس کو دیکھتی تو دل کے زخم پر مرہم لگ جاتا۔ مگر میں کہاں اور سعیدہ کہاں اور میرے ماں باپ کہاں اور دلی شہر کہاں۔ اب تو کوئی اُمید دلی آسکنے کی نہیں ہے۔

ہمارے بزرگوں پر بہت ہی بُرے وقت آچکے ہیں۔ حضرت بابر ہم سے زیادہ مصیبتوں میں پڑ چکے ہیں۔ مگر وہ اتنے

مایوس نہیں تھے جتنے مایوس ہم ہیں. کیونکہ اُن کی ہمّت کے آگے ساری دُنیا کے دروازے کُھلے ہوئے تھے۔ اُن کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے ہزاروں لاکھوں آدمی اُن کی حمایت کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ اور اُن کی مُصیبت دُور ہوجاتی تھی۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اِس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ دُنیا میں ہمدردی جبھی ہوتی ہے، جب ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ اُمید ہو۔ ہم سے بھلا کسی کو کیا اُمید ہوگی! سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہوگئی۔ ہمارے اقبال کا چراغ گُل ہوچکا۔ ہمارے سب حمایتی مرچکے۔ اب جو ہماری مدد کا ارادہ کریگا یا ہم سے ہمدردی رکھے گا اُسے قید ہوگی یا پھانسی اور کوئی انعام واکرام ہم اُسے نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام حسینؑ کے قاتلوں کو یزید کے دربار سے بہت کم گذارا ملتا تھا یعنی فی کس ڈیڑھ سیر جَو دئے جاتے تھے اور قاتلوں نے محض ڈیڑھ سیر جَو کے لئے رسول اللہؐ کے نواسے کو قتل کردیا۔ اگر حضرت امام حسین ڈیڑھ سیر جَو شاہی فوج کے ہر آدمی کو دے سکتے تو وہ قاتل اُن ہی کے ساتھ ہوجاتے۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ آج ہم اپنے ہمدردوں اور حمائیتوں کو ڈیڑھ سیر جَو بھی نہیں دے سکتے۔ پھر ہم سے کوئی کیوں ہمدردی کرے اور ہماری حمایت کا خیال اُس کے دل میں کیوں آئے۔ یہ دُنیا تو اُمید پر قائم ہے۔ جب ہم کسی کی اُمید پوری نہ کرسکیں تو وہ ہماری مدد کیوں کرے۔

اِس مُلک کی زبان اور ہے۔ مذہب اور ہے۔ رہنا سہنا، کھانا پینا سب ہم سے اجنبی ہے۔ یہ جانتے بھی نہیں کہ ہم کون ہیں۔ اور یہاں ہم کو کیوں قید کیا گیا۔ اماں بی ہماری یہ قید ایسی قید ہے کہ نہ ہم قید میں نہ آزاد ہیں، نہ زندہ ہیں نہ مُردہ ہیں اپنے گھر میں اپنے شہر میں اپنے مُلک میں جا نہیں سکتے اس لئے قید ہیں۔ طوق و زنجیر گلے اور پاؤں میں نہیں ہے اس لئے آزاد ہیں۔ سب دوستوں قرابت داروں سے جُدا ہیں اِس لئے مُردہ ہیں۔ بولتے چالتے کھاتے پیتے ہیں اِس لئے زندہ ہیں۔ کہاں تک لکھوں سائیں بھیل شاہ کی زبانی سب حالات معلوم ہوجائیں گے۔ سعیدہ سلطانہ (بڑے بھائی کی یتیم لڑکی) کو گود میں لینا، سینے سے لگانا۔ مُنہ چومنا اور کہنا کہ پھوپی کا پیار لو۔ ابّا حضرت کو یاد نہ کرو۔ ہمیں بھی بھول جاؤ۔ نہ وہ ملیں گے نہ ہم ملیں گے۔ وہ قبر میں ہیں اور ہم بھی قبر میں ہیں۔ اُن کی قبر وطن میں ہے اور ہماری قبر پردیس میں ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں قبر میں ہیں۔ اور جب مرجائیں گے تب بھی قبر میں ہوں گے۔

آداب اماں جانی ـــــ تسلیم

خالی گود والی ـــــ آپ کی بیٹی

پرنس جمشید بخت

یہ آخری مُغل شہنشاہ کے ولیعہد جواں بخت کے سب سے زیادہ چہیتے بیٹے تھے۔ کشمیر روڈ والے مکان میں پیدا ہوئے اور زندگی بھر وہیں رہے۔ سرکاری اسکول میں مڈل تک تعلیم پائی۔ انہیں پتنگ بازی اور گھوڑے سواری کا بڑا شوق تھا۔ اچھے اچھے گھوڑے تھان میں بندھے رہتے تھے۔ یہ سوار ہوکر دن دن بھر رنگون کے باہر سیر کیا کرتے، اگرچہ یہ اُردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے مگر وہ اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ ظفر نے زمانۂ قید میں جو شاعری کی تھی، اُسے اُنہوں نے رومن رسم الخط میں قلمبند کیا تھا۔ جسے مرنے کے بعد دوسرے سامان کے ساتھ ضبط کرلیا گیا اور غالباً برٹش

میوزیم لائبریری بھیج دیا گیا۔ لوگوں سے زیادہ ملتے جُلتے نہ تھے البتہ اکثر گھوڑے پر سوار ظفر کی غزلیں الاپتے نظر آتے تھے۔ انگریزی اچھی جانتے تھے مگر انگریز ان کو بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ اس اکڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکار کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی پنشن کم کر دی گئی اور سخت نگرانی ہونے لگی۔ میں اپنے مضمون "تیموری آفتاب[۱] کی آخری کرن" میں پرنس جمشید بخت اور اُن کے فرزند بیدار بخت کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں، اُس کا یہاں اعادہ کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں وہی باتیں لکھی گئیں جن کا بعد میں علم ہوا۔

اگرچہ جمشید بخت کی جوانی الھڑپنے میں گذری مگر بعد میں سنبھل گئے تھے۔ انہیں اپنی عالی خاندانی کا بڑا غرّہ تھا۔ ظفر کی دو چار ٹوٹی پھوٹی یادگاروں کو نہایت حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا۔ جب کوئی ملنے جاتا ایک ایک چیز نکال کر دکھایا کرتے اور اپنی عالی خاندانی کا بیان کرکے گھنٹوں افسوس کیا کرتے۔ بچپنے کا لئے وسے رہنے کی وجہ سے رنگون میں ہر دلعزیز تو نہ تھے تاہم اپنے حسنِ اخلاق، حب الوطنی اور شاہی ٹھاٹ باٹ کے سبب نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ شادی سے پہلے سرکار سے ایک سو پچاس روپے ملا کرتے تھے مگر شادی کے بعد تین سو روپے ماہانہ کر دئے گئے۔ بعد میں سات سو روپے ماہانہ ملنے لگے تھے۔ موت سے پیشتر ہزار روپے ماہانہ پنشن منظور ہو چکی تھی۔ مگر جیتے جی اُسے نہ لے سکے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بعمرہ ۵۹ سال انتقال کیا۔ یہ خلافت ایجی ٹیشن کا زمانہ تھا لوگوں میں جوش پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ مغلوں کی اس آخری یادگار کا جنازہ ایسی دُھوم سے اُٹھایا گیا کہ اب تک رنگون میں اُس کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ عزت نہ بدنصیب بہادر شاہ کو نصیب ہوئی اور نہ جواں بخت کو! تجہیز و تکفین کے متعلق حکام اور رعایا میں ایسی کشاکش پیدا ہوئی اور لوگوں میں ایسا سخت جوش پھیلا کہ ایک گورے کا کچومر نکل گیا۔ پکڑ دھکڑ ہوئی اور کئی شخصوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

ہمایوں اور اکبر کا یہ نام لیوا اٹھمو سے کے قبرستان میں ایک کچی قبر کے نیچے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو رہا ہے۔ جمشید بخت ہی) وہ اکیلے مغل شہزادے تھے جن کی رگوں میں خالص مغلیہ خون موجزن تھا، اُن کے باپ دہلی کے تخت کے دعویدار تھے اور ان کی ماں بھی شاہی خاندان کی چشم و چراغ تھیں! سچ پوچھو تو اُن کے بعد کوئی ایسا مغل نہ رہا جو یہ کہہ سکے کہ میری رگوں میں خالص شاہی خاندان کا خون موجیں مار رہا ہے اور یوں کہنے کو تو اب بھی دلی میں تیموری خاندان کے متعدد افسراد موجود ہیں۔

رونق زمانی بیگم سے مُلاقات

اِن کی موت سنہ ۱۹۳۰ء میں رنگون میں واقع ہوئی۔ یہ جمشید بخت کی بڑی بہن تھیں، اور بہادر شاہ کے عینِ حیات سنہ ۱۸۶۱ء میں رنگون میں پیدا ہوئی تھیں۔ ماں باپ میں نا چاقی کی وجہ سے اُن کی تعلیم و تربیت اچھی طرح نہ ہو سکی۔ بعد میں ماں باپ کی علیحدگی کا اور بھی بُرا اثر پڑا۔ رونق زمانی کی شادی بھی عجیب ڈھنگ سے ہوئی۔ چین و برما کی سرحد پر "تالی فور" نام کی ایک ریاست تھی۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں وہاں کے والی نے جنگ میں شکست کھانے کے بعد خود کشی کر لی۔ اور اس کا بیٹا پرنس

[۱] اس مضمون کا ترجمہ آئندہ پیش کیا جائیگا۔

حسن جان سے کر رنگون بھاگ آیا۔ [illegible] میں سرکاری حکام نے بیچ میں پڑ کر ان دونوں کا عقد کرا دیا۔ لیکن لال قلعہ کی شہزادی اور منگونی شہزادے میں کس طرح بن سکتی تھی؟ کچھ روز بعد دونوں میں جھگڑا ہوا اور رونق زمانی بیگم یہ کہہ کر میکے چلی آئیں کہ موئے کے بدن سے بھیڑوں کی سی بُو آتی ہے۔"

پرنس حسن مر کھپ گئے ان کے بھائی بند اب تک رنگون میں موجود ہیں۔ رونق زمانی اپنے چھوٹے بھائی کو بہت چاہتی تھیں، اس لئے ان ہی کے ساتھ رہنے لگیں۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کی برمی بیوی کے فرزند سکندر بخت کیساتھ ۱۹۳۹ء تک اُسی مکان میں پڑی رہیں۔ آخری زمانہ میں سرکار نے ایک بنگلہ رہنے کے لئے دیا اور ایک "سیڈان" موٹر بھی خرید دی۔ مرتے دم تک بڑی شان و شوکت سے آٹھ نوکروں کے ساتھ اُسی مکان میں رہیں۔ انہیں رنگون سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ دو مرتبہ لکھنؤ ہو آئی تھیں، وطن سے ہمیشہ لَو لگی رہتی تھی۔ اور ہندوستان آکر مرنا چاہتی تھیں۔

۱۹۲۹ء تک سرکار کی طرف سے تین سو روپے ماہانہ ملتا تھا۔ اور مکان کے آس پاس کی زمین کا کچھ کرایہ بھی ملجاتا تھا۔ اور بعد میں چار سو روپے ماہانہ ملنے لگے۔ مگر اتنے روپے میں بھلا اُن کا کیا ہوتا؟ ۵۰ روپے پٹرول میں اُڑ جاتے تھے۔ شوفر کی تنخواہ بھی اتنی ہی تھی، پھر بہشتی۔ مختار۔ باورچی اور ظفر کی قبر کے محافظ وغیرہ ڈھائی سو روپے لے اُڑتے تھے۔ خورد و نوش میں بھی یہی دریا دلی جاری تھی۔ بس یہ حال تھا کہ سر ڈھکا تو پاؤں کھلا اور پاؤں ڈھکا تو سر کھلا۔

اصل بات یہ تھی، ماں باپ کے گھر ناز و نعمت سے پرورش ہوئی تھی، لال قلعہ کے افسانے ازبر تھے۔ ایسلئے روپیہ ٹھیکری معلوم ہوتا تھا۔ اُن کی نازک مزاجی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۷۱ سال کی عمر میں بھی پاؤں میں چھالے پڑے رہتے تھے۔ پاس ہی پاندان، خاصدان، اُگالدان اور پیچوان رکھے رہتے تھے، گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی گلوریاں چباتیں اور پیچواں پیا کرتی تھیں۔

ایک صاحب نے موت سے کچھ عرصہ پیشتر اُن سے گفتگو کی تھی۔ بات چیت بڑی دلچسپ تھی۔ ہم یہاں اُس کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں:۔

سوال: "آپ کے نانا کا کیا نام تھا؟"

جواب: "کچھ ٹیڑھا سیدھا تھا۔ میری اماں کو نہیں آیا مجھے کیا آئیگا؟"

سوال: "آپ ہندوستان جانا چاہتی ہیں؟"

جواب: "یہیں کوئی جیٹی (بندرگاہ) تک لے چلے تو آج جہاز پر سوار ہو کر چلے جائیں۔"

اِسی دوران میں ایک مُنہ لگے نوکر نے بات کاٹ کر کہا: "ٹھیک ہے بیگم صاحب، یہ ایک گھر رہے یہ بھی چلا جائیگا۔"

بوڑھی بیگم نے بگڑ کر کہا: "اے باپ دادا کی سلطنت چلی گئی! یہ بھڑوا گھر چلا جائے گا تو اب کیا بگڑ جائیگا؟"

بیگم اپنے بھانجے سکندر بخت کو بہت چاہتی تھیں مگر آخر میں اُن کے چال چلن سے ایسی ناراض ہوئیں کہ انہیں نکال باہر کیا۔ پوچھا گیا:۔

"آپ سکندر بخت سے کیوں ناراض ہیں؟"

بیگم نے ناک بھوں سکوڑ کر کہا "ننگی کیا نہائے گی اور کیا نچوڑے گی؟ خرچ میرے ہی پورا نہیں پڑتا۔ پھوپی کے بھتیجے کو کہاں تک روپیہ دوں؟"

رونق زمانی کی موت سے رنگون میں خاندانِ مغلیہ کی آخری جھلک بھی غائب ہو گئی۔ اب جو لوگ ہیں وہ سب بری ماؤں کی اولاد ہیں۔ نہ اُن میں خاندانی وقار ہے اور نہ حبّ الوطنی۔ دلّی میں اب بھی ایسے دو چار شاہزادے باقی ہیں جنہوں نے خاندانِ مغلیہ کے چل چلاؤ کا زمانہ دیکھا ہے۔ اَب وہ خود پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ تاریخ کے اِن پریشان درقوں کی چمن بندی یہی لوگ کر سکتے ہیں ورنہ اگر صبح ہو گئی تو یہ خواب کسے یاد رہیں گے!

خبر لو اے ساکنانِ ساحل — ہر اک نفس جان پر گراں ہے!!

اختر حسین رائے پوری

نغمۂ خاموش

ساری دُنیا ہے کیف سے مدہوش
میکدے میں ہے شورِ نوشا نوش
تیری بیداد کا گلہ کیسا
دل ہی میرا ہے خود اذیت کوش
ہائے انجام، شامِ غربت کا
بزم برہم ہے اور شمع خموش
رُوح مُضطر ہے اور دل بے چین
آ رہا ہے یہ کون زُلف بدوش
میری راحت کا تو قیاس نہ کر
میری ہستی ہے شیونِ خاموش
کیسی ویرانیاں ہیں پہلو میں
کاش پھر ہو وہ جنّتِ آغوش
سعیِ اِمروز و فکرِ فردا ہے
کس کو فرصت کہ کرے جو ماتمِ دوش
اِک تجلّی تو دیکھتا ہوں ضرور
کیا کہوں کون ہے یہ ہم آغوش
سُن رہا ہوں مَیں اپنی خلوت میں
سازِ عالم سے نغمۂ خاموش
کاش ایسی بھی ایک ساعت ہو
پھر ہوں وہ اور پھر مری آغوش
میری تخئیل کس قدر ہے بلند
میرا ہر شعر ہے نوائے سروش
تیرے نغمے ہیں یا نوائے سروش
تجھ سے ہوتی ہے عیدِ ہر مے نوش

ثاقب مست حال کو دیدے
اپنے ہاتھوں سے ساغرِ پُر جوش

ثاقب کانپوری

جاپان میں ہندوستانی ڈرامہ

ہندوستان میں تھیٹر بہت دیکھے مگر غیر ملکیوں کو ہماری زبان میں ڈرامہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں یہ بات دیکھنے میں آئی۔ یونیورسٹی کے لڑکوں نے اُردو زبان میں ڈرامہ کیا اس وجہ سے یہ بات اور بھی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ یہ ڈرامہ پروفیسر برلاس کے زیرِ اہتمام انجام پایا۔ اس وجہ سے مجھے اس کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئی اور پھر زنانہ لباس پہنانے میں مجھے خود بھی ہاتھ بٹانا پڑا تو اور بھی زیادہ حالات معلوم ہو گئے۔ افسوس ہے کہ رسمی پردہ کی پابندی کی وجہ سے مجھے ہندوستان کے کالجوں کے ڈراموں کے متعلق کچھ معلومات نہیں ورنہ میں اچھی طرح موازنہ کر سکتی۔ بہرحال میرے لئے یہ بات بہت دلچسپ تھی۔ جاپان کے متعلق ہمارے خطوط اور مضامین چونکہ ہندوستان میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اس لئے ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے ڈرامہ کا حال حوالۂ قلم کرتی ہوں۔

سب سے پہلا مرحلہ ڈرامے کے تعین کا تھا۔ اتفاق سے یونیورسٹی کی لائبریری میں اُردو میں کوئی ڈرامہ موجود نہ تھا۔ غیر زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کرنا مقصود نہ تھا کیونکہ زبان تو اپنی ہو جاتی مگر معاشرت بیگانہ رہتی۔ اور یہاں دونوں باتیں دکھانی منظور تھیں۔ مہینوں پہلے سے پروفیسر برلاس نے اپنے دوستوں کو ہندوستان خط لکھے۔ اس بارے میں وہ پروفیسر بدر الاسلام صاحب فضلی کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے کئی ڈرامے بھیجدیے۔ جب انتخاب کا موقع آیا تو ایک نئی مشکل پیش ہوئی کہ ڈرامہ صرف ایک ایکٹ کا ہو جو تقریباً آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے میں ختم کیا جا سکے۔ کیونکہ اُردو کے علاوہ دیگر نو زبانوں کے ڈرامے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ سب کو اتنا ہی وقت ملتا ہے۔ بڑی رد و قدح کے بعد مہاشہ سُدرشن کا ڈرامہ انتخاب کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کے جذبۂ حُب الوطنی کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس ڈرامہ کا نام "ماں کی پرتگیا" ہے۔ اس کا پلاٹ یہ ہے کہ ہندوستان کی شاہی افواج چتوڑ پر حملہ آور ہیں۔ اسی زمانہ میں مہارانہ کا انتقال ہو گیا۔ مہارانہ کی وصیت کے مطابق بڑے لڑکے کو گدی پر بٹھایا جا رہا ہے کہ دفعتاً ایک مہارانی دربار میں داخل ہوتی ہے اور پروہت کو رسمِ تاجپوشی کرنے سے روکتی ہے۔ دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پروہت حیرت زدہ ہو کر وجہ دریافت کرتا ہے۔ راج ماتا کہتی ہے کہ اس وقت ایک ایسے بہادر رانا کی ضرورت ہے جو میواڑ کی آزادی کو قائم رکھ سکے۔ جگمل سنگھ کے کمزور کندھے اس بوجھ کو سنبھالنے کے قابل نہیں۔ جگمل سنگھ یہ سُن کر چیں بہ جبیں ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ وہ کون ہے؟ راج ماتا اپنے لڑکے پرتاب کا نام پیش کرتی ہے جس کو میواڑ کا بچہ بچہ ایک سُورما سمجھتا ہے۔ پرتاب تاج قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسی بحث میں جگمل سنگھ راج ماتا کے منع کرتے کرتے تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ راج ماتا پرتاب سے اپیل کرتی ہے کہ تو دیکھ رہا ہے اور جگمل سنگھ میری بے عزتی کر رہا ہے۔ مگر پرتاب مداخلت کرنے سے انکار کرتا ہے اور ماں کے اصرار پر یہ جواب دیتا ہے کہ اس وقت شاہی افواج کے مقابلے کے لئے میواڑ کو ہر نوجوان کی ضرورت ہے میں اس لئے تخت و تاج سے گریز کرتا ہوں کہ مُفت میں خانہ جنگی ہو گی اور ہماری قوت ٹوٹ جائے گی۔ راج ماتا اُسے بُزدل کہتی ہے اور



پروفیسر برلس اور جاپانی طلبائے اُردو

Calcutta Art Press, DELHI

یہ بھی طعنہ دیتی ہے کہ اگر اس وقت میواڑ میں امن و امان ہوتا اور دشمن حملہ آور نہ ہوتا تو تیرے لئے یہ انکسار زیبا تھا۔ مگر افسوس کہ ایسے نازک وقت میں جبکہ میواڑ کو چاروں طرف سے مصیبت نے گھیر رکھا ہے تو بھی اس کا ساتھ دینے سے کتراتا ہے۔ یہاں تک کہ بدعا کا ڈراوا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تجھے معلوم ہے کہ میں بہت جلد مہارانا کی لاش کے ساتھ ستی ہونے والی ہوں قبر کے کنارے سے بول رہی ہوں میں تجھے بددعا دوں گی اور تو تاہ زندگی بےچین رہیگا۔ پرتاب اس پر بھی ثابت قدم رہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ماں کی بددعا میرا مستقبل برباد کر دے گی اور میں کتے کی موت مرونگا تاہم مجھے آپس کی خونریزی منظور نہیں۔ اس پر جگمل سنگھ متاثر ہوتا ہے اور خود تخت سے دست بردار ہو کر پرتاب کی خدمت میں تاج پیش کرتا ہے۔ راج ماتا کے سامنے ہی پرتاب کی تاجپوشی کی رسم ادا ہوتی ہے اور وہ اُسے ایسا سخت عہد دلاتی ہے جس کی وجہ سے اس ڈرامہ کا نام ہی "پرتگیا" ہے۔ عہد دلا کر وہ دربار سے رخصت ہوتی ہے کہ میں اب ستی ہوں گی۔ ماں کی مفارقت پرتاب پر شاق گذرتی ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ کہ وزیر یاد دلاتا ہے کہ حضور مہارانا میں حضور کے رونے سے رعایا پر برا اثر پڑیگا۔ پرتاب کہتا ہے کہ اس راج کے لئے مجھے کیسی کیسی بیش بہا قربانیاں کرنی پڑی ہیں۔ دراصل یہ راج بہت مہنگا ہے۔ مجھے رونے کی بھی اجازت نہیں۔ خیر، اب میں نہ روؤنگا یہ آنسو قوم کے ہیں۔

ڈرامہ کے انتخاب کے بعد لڑکوں کا کام شروع ہوا۔ لڑکوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اُسے چھاپ کر بہت ساری کاپیاں نکالیں اس کے بعد ان کو ڈرامہ پڑھایا گیا اور ہر پہلو اُن کے ذہن نشین کیا گیا۔ اعلیٰ جماعت کے لڑکے تو اتنی اُردو جانتے ہیں کہ سمجھانے سے مطلب سمجھ گئے۔ ادنیٰ جماعت والوں کو جاپانی پروفیسر صاحب نے سمجھایا اُنہوں نے ہی اس کا ترجمہ جاپانی زبان میں تیار کیا اور ایک خلاصہ مرتب کیا۔ پارٹ تقسیم ہونے کا حال سُنکر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ پروفیسروں نے اس بارے میں بالکل مداخلت نہیں کی لڑکوں نے خود ہی آپس میں طبیعت کے مذاق کے موافق پارٹ بانٹ لئے پھر خوبی یہ کہ ایک مرتبہ پارٹ تقسیم ہونے کے بعد قطعی ردوبدل نہیں ہوا۔ اس سے ان کے اتفاق و اتحاد کا کس قدر زبردست ثبوت ملتا ہے، مختصر یہ کہ ہر ایک نے اپنا پارٹ یاد کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پارٹ خوب یاد تھے تلفظ اور لہجہ کی نقل ہو بہو ادا کی تھی۔ ڈرامہ کے دن ٹوکیو اور یوکوہامہ کے چند ہندوستانی بھی موجود تھے۔ یہ اصحاب بھی لڑکوں کے ایکٹنگ کی تعریف کرتے تھے۔ ایکٹنگ کی تکمیل کے لئے لڑکے کسی تھیٹر سے ایک ایکٹر کو پکڑ لائے تھے جس نے ایکٹنگ کی تعلیم میں مدد دی۔

لڑکوں نے ایکٹنگ کے علاوہ دوسرے کام بھی خود ہی بانٹ لئے تھے۔ مثلاً ایک صاحب اسٹیج منیجر تھے، جن کا کام صرف اسٹیج کے انتظام کی نگرانی تھا۔ دوسرے خزانچی تھے جن کے ذمہ روپے کی فراہمی اور اس کے خرچ کا حساب تھا تیسرے انجنیر تھے جن کے ذمہ اشیائے اسٹیج کی تیاری تھی ان کی نگرانی میں لڑکوں نے خود ہی پردے سینری اور دوسرا تمام سامان تیار کیا تھا۔ چوتھے کے ذمے لباس کی فراہمی تھی۔ مگر یہ کام زیادہ تر مسٹر ہرلاس کو خود کرنا پڑا۔ کیونکہ جاپان کے تھیٹروں میں دوسرے ملکوں کے لباس تو مل جاتے ہیں مگر ہندوستانی لباس نہیں ملتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی ڈرامے نہیں ہوتے۔ اسی طرح دیگر کام مختلف لڑکوں کے ذمے تھے۔ مثلاً اسٹیج کی روشنی، پردے کا ڈالنا اور اُٹھانا۔ موسیقی وغیرہ۔

روپیہ فراہم کرنے میں ہندوستانی جماعتوں کے طلبا کو بڑی دقت ہوتی ہے۔ ہر سال دس زبانوں کے ڈرامے کئے جاتے ہیں ڈراموں کی تیاری کے لئے یونیورسٹی سے بہت کم مدد ملتی ہے لڑکوں کو بہت سا روپیہ چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ کچھ وہ اولڈ بوائز سے وصول کرتے ہیں۔ جن جماعتوں میں طلبا زیادہ ہوتے ہیں وہاں ہر لڑکے پر بار کم پڑتا ہے پھر بھی رقم زیادہ جمع ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی۔ فرانسیسی اور جرمنی ان میں بھی انگریزی زبان کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ دو کورسوں کے الگ الگ فریق ہیں اور ہر کورس والے علیحدہ علیحدہ ڈرامہ تیار کر لیتے ہیں یعنی انگریزی زبان کے دو ڈرامے ہوتے ہیں۔ بقیہ زبانوں کا ایک ایک چند زبانیں ایسی ہیں کہ جن کے ڈرامے ایک سال بیچ ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن میں طلبار کی تعداد کم ہوتی ہے اور اُن میں داخلہ بھی ایک سال بیچ ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبان بھی ان پچھلی زبانوں میں شامل ہے۔ لڑکوں کی کمی کی وجہ سے ہر ایک پر چندہ کا بار زیادہ پڑا۔

لباس کی فراہمی میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ روپیہ اتنا موجود نہیں کہ کپڑے تیار کئے جا سکیں۔ کسی تھیٹر میں ہندوستانی لباس نہیں کہ وہاں سے کرائے پر لئے جا سکیں۔ اپنے پاس ایسے کپڑے موجود نہیں کہ راجپوت سردار ملبوس کیا جا سکے۔ یہاں کے ہندوستانیوں سے بھی بہت کم کپڑے مل سکے۔ زنانہ کپڑے سب میرے گئے کچھ ساڑھیاں صافوں کے کام آئیں۔ کچھ دوپٹے پٹکوں کے کام آئے۔ غرض جوں توں کر کے لباس کا بھرت پورا ہوا۔ رانی کا لباس اتفاق سے نایاب نکلا۔ کارچوبی جوڑا رانی پر کھل گیا۔ دونوں شہزادے بھی صافہ باندھے ہوئے بڑے شاندار معلوم ہوتے تھے۔ پروہت کے لباس کی بڑی جستجو کی گئی ہندوستانیوں کے پاس کپڑے نہ مل سکے۔ دوسری یونیورسٹی کے ایک جاپانی پروفیسر کے پاس پروہت کا پورا لباس موجود ہونے کی اطلاع ملی۔ چنانچہ کئی آدمیوں کو اُن کے پیچھے لگایا۔ اُنہوں نے وعدہ تو کر لیا مگر وقت پر جو لباس وصول ہوا وہ برما یا سیلون کا تو کہا جا سکتا ہے مگر ہندوستان کا نہیں۔ پروہت کا تو کسی صورت میں نہ تھا۔ البتہ دوشالے سے بڑا کام چلا۔ پروہت سفید لمبی ڈاڑھی سے خاصہ متقی معلوم ہونے لگا۔ ہندوستانی جوتیاں ملنی ناممکن تھیں اسلئے ایکٹروں کو ننگے پاؤں اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ اور دربار کے موقع پر ایسا ہونا مناسب بھی تھا۔

سینری میں چند باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ اوّل انگیٹھی جس میں بلا آگ کے شعلے اُٹھتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اور اس پر ہون کیا جا رہا تھا۔ انگیٹھی خود لڑکوں نے مقوی سے نہایت سلیقہ اور خوبصورتی سے تیار کی تھی۔ سُرخ فیتہ لال روشنی اور بجلی کے پنکھے سے شعلے بھڑکنے کا منظر پیدا کیا تھا جو واقعی قابل دید تھا۔ دوئم ایک ایسی بات تھی جو لڑکوں نے پروفیسر برلاس کی لاعلمی میں خود ہی تجویز کی تھی اور حقیقت میں اُن کی تجویز نہایت موزوں نکلی۔ خود پروفیسر صاحب ان کی ذہانت کی داد دیتے تھے۔ ہمارے علامہ اقبال کے قومی ترانہ کا مصرع (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) انگیٹھی کے کارڈبورڈ کو کاٹ کر کترا تھا جو انگیٹھی کی روشنی میں صاف پڑھا جاتا تھا۔

ہر زبان کا ڈرامہ تین مرتبہ کیا جاتا ہے۔ پہلے روز صرف یونیورسٹی کے طالب علم اور پروفیسر ہوتے ہیں دوسرے تیسرے روز مہمان۔ تینوں دن زنانہ کپڑوں کے انتظام کے لئے مجھے جانا پڑا اور وہاں ان کا بناؤ سنگھار دیکھا۔ لڑکے میک اپ کا سامان خود ہی لائے تھے قدِ آدم آئینہ تک کہیں سے اُٹھا لائے تھے۔ میک اپ کا منظر میرے لئے بڑا دلچسپ تھا

کوئی اپنے چہرے پر قلعی کر رہا ہے کوئی رُخسار پر سُرخی لگا رہا ہے کوئی تیرِ مژگاں کو سنوار رہا ہے کوئی چہرہ پر جُھریاں بنا رہا ہو اور سب ایک دوسرے کی مدد نہایت خندہ پیشانی سے کر رہے ہیں۔ آپس میں مطلق بحث مباحثہ نہیں کوئی تکرار نہیں کوئی اعتراض نہیں۔ کوئی پروفیسر صاحب کے سامنے دستی لئے کھڑا ہے کہ صاحب یہ باندھ دیجئے۔ صافہ باندھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو یکے بعد دیگرے فوج کی فوج صافہ باندھے چلی آ رہی ہے۔ پروہت کے کندھے پر دوشالہ قائم رکھنے کی بڑی بڑی تدبیریں کی گئیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو دوشالہ اوڑھنا تو آتا نہیں کہ کھسکے تو ٹُٹے خود درُست کرلیں۔ یہی آفتیں مجھے ساڑھی باندھنے اور رانی کو ملبوس کرنے میں پیش آئیں۔ اللہ اللہ کرکے یہ ایکٹر تیار ہوئے، اور خوب ہوئے۔ اتنے میں خبر آئی کہ دوسرا ڈرامہ ختم ہو چکا ہے اب ہندوستانی ڈرامہ کی باری ہے۔ وہاں سے چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پہلے ڈرامہ والے اپنی سین اور سینریاں کندھوں پہ اُٹھائے چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف سے ہندوستانی ڈرامہ والے اپنی سینری اُٹھا کر چلے جا رہے ہیں۔ یہاں کے سٹیج کی ایک خصوصیت دیکھی کہ بڑے سے بڑے تھیٹر میں جب پردہ پڑتا ہے تو پیچھے سے کھٹا کھٹ کی آواز چلی آتی ہے گویا اسی وقت سینری کی ٹھوکا ٹھاکی ہوتی ہے۔ یہی یونیورسٹی کے ڈراموں میں ہوتا رہا۔

پردہ اُٹھتا ہے۔ ہندوستانی دربار آراستہ ہے۔ رانا کی گدی خالی ہے۔ صرف تلوار رکھی ہے۔ پروہت ہَوَن کر رہا ہے۔ ہَوَن ختم کرکے کھڑا ہوتا ہے اور نہایت سنجیدہ مگر زوردار آواز میں جگمل سنگھ کو مخاطب کرتا ہے اور بادشاہت کا حلف دیتا ہے۔ پروہت کا قد تو لمبا نہیں ہے لیکن تن و توش بھاری ہے اور آواز اس کے جسم کے تناسب سے موٹی ہے۔ تمام ہال اس کی آواز سے گونج رہا ہے۔ اس نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا اور یہ خوبی قابلِ تعریف تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ اصلی پروہت ڈرامہ سے دو تین روز قبل اتنا بیمار ہو گیا کہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ نقلی پروہت نے اصلی پروہت سے بڑھکر پارٹ انجام دیا۔

جگمل سنگھ کا پارٹ اگرچہ مختصر تھا لیکن اُس نے جو کچھ کہا اور جو کچھ عمل کیا اس میں ذرا بھی بناوٹ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ چہرے کا رعب و داب اور سوال و جواب عجیب شان رکھتے تھے۔ دراصل اس کا ایکٹ چھچھورے پن سے بالکل پاک تھا۔

رانی کا پارٹ بڑا طویل تھا۔ بھڑکیلے لباس کو اُس نے اپنے دلفریب ایکٹنگ سے اور چار چاند لگا دئے۔ دیکھنے والوں کو مطلق اس کے عورت ہونے میں شُبہ تک نہ تھا وہ بالکل ایک سچ مچ کی عورت نظر آ رہی تھی اور یہی اس کے ایکٹنگ کا کمال تھا۔ مردوں کے لئے اور خصوصاً غیر ملکیوں کے لئے ہندوستانی عورت کا پارٹ کرنا نہایت مشکل ہے۔ خود ہندوستانی ایکٹر عورت کے پارٹ میں زیادہ تھرکنے سے بدنمائی کا اظہار کرتے ہیں۔ رانی کا طرزِ بیان سُبحان اللہ اُس کی متین و غمگین صورت دلوں کو بے چین کئے دیتی تھی۔ اس کا پارٹ آسان نہ تھا کیونکہ کئی جذبات کا اظہار کرنا تھا۔ اوّل مہارانا کی موت پر مُردہ دلی، دوئم سلطنتِ میواڑ کے معقول انتظام کی فکر۔ سوئم اِس انتظام میں رُکاوٹوں سے غم و غصہ۔ چوتھے ستی ہونے کے لئے صبر و سکون کا اظہار۔ اور سب سے زیادہ مشکل کام یہ تھا کہ تماشائیوں کے دل سے یہ قُدرتی بدگمانی دُور کر دے کہ وہ اپنے بیٹے کی پچ کر رہی ہے۔ ان سب باتوں کو راج ماتا نے خوب نبھایا۔

پرتاب کی ایکٹنگ کے لئے اور ہی قسم کے جذبات ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اپنے وطن سے سچا عشق، اہالیانِ ملک کی امداد کا بھروسہ ہونے کے باوجود تاج کے حصول کی کوشش سے انکار کرنا جبکہ خود اس کی قوتِ بازو اس کی کامیابی کی ضامن تھی۔ یہ کتنی بڑی سیرچشمی تھی۔ اور یہ صرف اس لئے کہ کہیں خانہ جنگی میں میواڑ کی قوت ٹوٹ نہ جائے۔ پرتاب نے ان جذبات کو اس خوبی سے ادا کیا کہ جگمل سنگھ کو واقعی اس کے سچے ایثار سے متاثر ہو کر تخت سے دست بردار ہو جانا چاہیئے تھا۔

یہ چار خاص ایکٹر تھے ان کے علاوہ باقی ایکٹروں نے بھی تھوڑے بہت پارٹ انجام دئے لیکن ڈرامہ میں جان ان چاروں نے ڈالی اور یہ ان ہی کی حسنِ ادا کا نتیجہ تھا کہ حاضرین عموماً ہندوستانی ڈرامہ کی تعریف کرتے تھے اور دوسری زبانوں کے ڈراموں پر اس کو ترجیح دیتے تھے۔

مسٹر برلاس

تبسمِ صبح

اے صبح کے تبسم! اے شاہکارِ قدرت
اے نازشِ تکلم، روحِ روانِ فطرت
معصومیت میں ڈوبی۔ ناز آفریں ادا ہے
عالم کا ذرہ ذرہ اب مسکرا رہا ہے
دوشیزگانِ عالم تیری ہی برکتوں سے
دنیا میں حکمراں ہیں اپنے تبسموں سے
گلشن ہزار دل سے قربان ہو رہا ہے
غنچہ خوشی سے اپنی اب جان کھو رہا ہے

عنوانِ صبحِ عشرت۔ کیف آفریں مسرت
دنیائے شاعری کی دوشیزۂ محبت
تیرے سبب سے قائم ہے انتظامِ عالم
کرتا ہوں تیرے دم تک میں احترامِ عالم
پرتو ہے ایک تیرا۔ رنگینیاں جہاں کی
ہے حسن تیرا کامل، اے حورِ آسماں کی
صحرا میں نور تیرا۔ گلشن میں نور تیرا
ہے مختصر جہاں میں ہر جا ظہور تیرا

اے نقرئی تبسم! اے روحِ حسنِ کامل
اے جادۂ بقا کی اِک خوشگوار منزل
میخانۂ ازل ہے۔ تو جانِ آرزو ہے
رنگین وادیوں میں تو قلبِ رنگ و بو ہے
لی چاند نے بلائیں۔ تارے کئے نچھاور
پھر آسماں نے شب کو صدقہ اُتارا تجھ پر
عالم میں نور پھیلا۔ جب صبح مسکرائی
نورِ خدا فلک پر القصہ بن کے آئی۔۔۔
میں روز دیکھتا ہوں تجھ میں خدا کا جلوہ
موسیٰ نے طور پر جو صرف ایکبار دیکھا

ہاں میرا طور تو ہے اے صبح کے تبسم!
میں تجھ میں کھو گیا ہوں اے چشمۂ ترنم!

[illegible]

چھپرکھٹ

عزیز تولیہ لپیٹے غسل خانہ سے نکلا۔ اور آئینہ کے سامنے بال بنانے لگا۔

اگر میرے بال اور اونچے ہوتے تو ماتھا بہت خوبصورت ہوتا۔ کوئی ایسا پاؤڈر یا تیل بھی تو نہیں جو بالوں کو بالکل اُڑا دے۔ اگر یہ صرف پہلوؤں ہی سے اونچے ہو جائیں۔ لیکن میری بھویں تو بڑی خوبصورت ہیں۔ کس کس نے اِن کی تعریف کی ہے؟ باقر۔ کھلی پیشانی، گورا رنگ، جبرئیل۔ بڑی ڈاڑھی، موٹی ناک۔ بسوااس۔ گھنے بال، چکیلی آنکھیں، ہنسی، مُسکراہٹ۔ دو کمانوں کی طرح۔ بسوااس تو کہتا تھا کہ وہ قاف کے لوگوں کی طرح۔ لیکن وہ شاید صرف میری تسلی کے لئے تھا۔ میں بہت بدصورت ہوں۔ کلوں میں گڑھے، سُواسی ناک، اُنگلیوں میں کرکری ہڈی۔ لیکن بھویں تو۔ مگر صورت سے کیا ہوتا ہے۔ مرد کا حُسن جسم سے ہے۔

آئینے سے آنکھیں پھیر کر!

یہ کلائی، باہیں، یہ طاقتور پٹھے، کیسے گول اور سڈول ہیں۔ میرا سینہ تو خوب چکلا ہے۔ گوشت تو نہیں ہے لیکن خوب بھرا ہوا ہے۔ لوہے کی طرح سخت۔ اُنگلی بھی مُڑ جاتی ہے۔ پھر میری کمر، اور ٹانگیں، لمبی اور مضبوط۔ میرے اس قد پر ہر ایک چیز موزوں ہے۔ میں حسین ہوں۔ کون مجھے بدصورت کہہ سکتا ہے؟ اور میاں مردانگی چاہیئے۔ نزاکت اور حُسن عورتوں کو زیبا ہے۔ ورنہ میں آج کل کے اُن کمزور نوجوانوں کی طرح نہیں ہوں جن کو آتشک نگ گولیوں کی تلاش رہتی ہے۔ میں مرد ہوں مجھ میں طاقت ہے۔

کسی نے پیچھے سے اک نرم ہاتھ عزیز کے برہنہ شانہ پر رکھا، جس نے اُس کو اُس کے خواب سے زبردستی الگ کر دیا۔ چھٹکی سیکر، جیسے جونک پٹ سے علیحدہ کرلی جاتی ہے۔

"ہوں! رضیہ؟ کیا ہے؟"

"کیا آپ مجھ سے بالکل خفا ہو گئے؟ وہ آپ کی محبت......"

"محبت کی باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے کل میری شادی ہونیوالی ہے۔ مجھے تم سے کبھی محبت تھی ہی نہیں"

"تو کیا آپ کا التفات صرف میرے جسم سے تھا؟"

"اگر تم یہ پہلے نہ سمجھی تھیں تو تمہاری بیوقوفی تھی"

عزیز چھپرکھٹ پر بیٹھ گیا ــــــ کل میری شادی ہونے والی ہے! کل، آہ، کل۔ اور پھر میں اور صفیہ اور خوشی ہوگی۔ اور خوشی ہوگی۔ پھر میں ہونگا اور میرے خواب میرے پاس ہوں گے۔ وہ خواب جن کو میں نے ایک مدت سے پالا ہے اور سینہ سے لگائے رکھا ہے۔ کیا کیا مصیبتیں نہ اُٹھائی ہوں گی۔ ابا جان کی مخالفت، آپا کی ناراضگی۔ ہونہہ! چاہتے تھے کہ میں رُقیہ ہی سے شادی کروں، کیونکہ اُس سے میری منگنی بچپن ہی سے ہو چکی تھی۔ لیکن میں جیت ہی گیا۔ اور کل میری اُمیدیں بر آئیں گی۔ میرے خواب جنکو میں نے نازوں سے پالا ہے۔

رضیہ کھوئی ہوئی، مُرجھائی ہوئی، سکتہ کے عالم میں کھڑی تھی۔

لیکن وقت کیوں نہیں کٹتا؟ ایک ایک منٹ پہاڑ ہے۔ کب کل آئے گی؟ چھپر کھٹ تو وہاں سے آگیا ہے۔ یہ چھپر کھٹ پھر ہی چھپر کھٹ ہوگا۔ اور میری صفیہ میری ہوگی۔ اس ہی کمرے میں تو میں نے اس کو پہلے دیکھا تھا۔ اور یہ ہی کمرہ میں نے پہلی ملاقات کے لئے رکھا اور سجایا ہے۔

آئینہ میں اُس کو اپنی صورت بہت خوبصورت معلوم ہوئی۔

لیکن کمبخت رضیہ کیوں کھڑی ہے؟ میں اس سے اُسی روز کہہ چکا ہوں کہ مجھے اِس سے کبھی محبت نہ تھی۔ اک عجب رونا مچایا تھا۔ نہ معلوم میرے کیوں پیچھے پڑی ہے۔ مجھے اس سے کیا رغبت ہوسکتی ہے؟

"کیا تم کو کوئی کام نہیں ہے؟ اماں جان اکیلی جہیز کے جوڑوں میں ٹانکے لگا رہی ہیں۔ آخر تم کس لئے ہو؟ کام کیوں نہیں کرتیں؟ ابھی تک چھپر کھٹ پر پردہ بھی نہیں لگا"

رضیہ نے عزیز کو ایک نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اور غم کی صورت خاموش کھڑی رہی۔ خیالات کا ہجوم اُس کے دل میں اُمڈا ہوا تھا۔

اُف! دنیا ایک دھوکا ہے۔ جھوٹ کا دریا ہے۔ افسوس، یہ سب محبت کچھ بھی نہ تھی؟ نفسانیت اور خواہشات۔ کیا یہ سب ظلم مجھ پر ہی ٹوٹنے تھے؟ کاش کہ میں اتنی کمزور نہ ہوتی۔ اگر میں ان کی خواہشات کو پورا نہ کرتی تو شاید۔ لیکن میں ہوں ہی کیا؟ گو مجھ میں ان ہی کا خون ہے، لیکن آخر تو میں اُن کے خاندان کی نہیں۔ لیکن کیا میں انسان نہیں؟ کیا میں عورت نہیں؟ کیا میں بالکل ہی بدصورت ہوں۔ ایسی گئی گذری ہوں؟ تعلیم ہے تو کیا، ہوں تو لونڈیوں میں سے۔ یا تو مجھ میں وہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میرا جسم نہایت خوبصورت تھا۔ میری چھاتیاں، میرے پٹھے، میری کمر، ہر ایک چیز خوبصورت اور لاجواب تھی، میری صورت، میری باتیں سب ہی اعلیٰ تھیں۔ یا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، گو وہ بدصورت ہے لیکن خاندانی ہیں کیوں نہیں ہوں؟ کیا میری ماں انسان نہیں؟ اگر شجرہ والی ہوتی تو دنیا ہی اور ہوتی۔ خاندان سے کیا ہو جاتا ہے۔ کیا خاندان والیاں حوریں ہوتی ہیں؟ بے خصلت کی فرشتہ ہوتی ہیں؟ اگر اُس صفیہ کے باپ منصف ہیں تو میرے باپ بھی کوئی ایسے ویسے نہ تھے۔ لیکن میں لونڈی کے پیٹ سے ہوں! جیسے میں کوئی حیوان ہوں۔ مجھے محبت کرنے کی بھی اجازت نہیں، زندگی کا لُطف اُٹھانے کا حق نہیں۔ کیا مجھ میں وہ چیزیں نہیں جو خاندان والیوں میں ہوتی ہیں؟ آنکھ، ناک، صورت، شکل، دل دماغ، میں لاکھوں سے اچھی ہوں۔ اُس صفیہ سے تو کہیں برتر ہوں۔ لیکن خاندان نہیں۔ خاندان، خاندان، اگالدان، تابدان۔

میں اس کے چھپر کٹ کا پردہ لگاؤں؟ اُس کے چھپر کھٹ کا پردہ۔ اُس کا کفن سیوں گی۔ اپنا کفن سیوں گی۔ ایسی ہی اماں جان کو خاندان کی پرواہ ہے تو خود پردہ سئیں۔ میرے اوپر زور چلانا خوب آتا ہے۔ چھپر کھٹ کا پردہ لگاؤ۔ جیسے میں ہی تو چھپر کھٹ میں سوؤں گی۔ خود کیوں نہیں لگا لیتے۔ یہ چھپر کھٹ تو میرا تھا۔ اور اب میں بیوقوف بھی ٹھہری؟ کیا وہ سب مزے میرے حسن کے لئے تھے؟ ...... وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی ......

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"کیا میں اب اتنی بُری ہو گئی؟"

"رضیہ، اس میں بُرائی کی کوئی بات نہیں۔ بُرا ماننے سے کیا فائدہ؟"

"لیکن ایک وقت تو آپ کو مجھ سے محبّت تھی"

"ہاں. اگر تھی بھی تو جسمانی. تم سے مجھ کو جسمانی محبت تھی، جو اب نہیں"

"اور صفیہ سے! اُس میں تو جسم ہی نہیں"

"لیکن صفیہ سے تو مجھے رُوحانی محبت ہے. محبت کو حُسن کی ضرورت نہیں"

"تو کیا آپ کی رُوحانی محبت ایک دھوکا نہیں ہے؟"

"ان باتوں سے کیا حاصل. صفیہ صرف صفیہ نہیں. وہ میرے خواب ہیں"

"مگر خواب ٹوٹ جاتے ہیں. آنکھ کھلنے پر حقیقت سامنے ہوتی ہے. کیا میرے خواب ختم نہیں ہو گئے؟ اور اب حقیقت، آہ حقیقت رنج ہے. کاش کہ میں پیدا ہی نہ ہوتی"

"دیکھو، روؤ نہیں" عزیز نے رضیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے چھپر کھٹ پر بٹھا لیا "کیوں روتی کیوں ہو؟"

"اپنی قسمت کو روتی ہوں. زندگی ایک دُھوکا ہے"

عزیز نے رضیہ کو زور سے بھینچ کر اپنے پہلو سے چمٹا لیا. اُس کے جسم میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا.

"رضیہ میں کیا کروں؟"

"اگر آپ مجھ سے تھوڑی سی محبت کرتے رہیں تو زندگی دوبھر نہ ہو.

عزیز نے رضیہ کے نازک ہونٹوں کو دیکھا اور اُن کی طرف جُھکا.........

* * * * * * * * * * *

اور پھر وہ چھپر کھٹ جو صرف صفیہ کے لئے مخصوص تھا رضیہ کا تھا.

احمد علی. ایم. اے

داستانِ حسن

دل نے اگر کیا کبھی حوصلۂ بیانِ حُسن
شعلۂ آہ بن گیا سُرخیٔ داستانِ حُسن

جرأتِ دل کا راز ہے ہمتِ عشق میں نہاں
ورنہ کہاں میں خستہ جاں لائقِ امتحانِ حُسن

سجدۂ شیخ خود نُما داغِ جبینِ بندگی
نقشِ سجودِ عشق ہے زینتِ آستانِ حُسن

عشق کے سارے حوصلے ختم ہوئے اک آہ پر
تیرِ قضا سے کم نہ تھا غمزۂ جاں ستانِ حُسن

بہرِ نظارہ چاہیے چشمِ حقیقت آشنا
خاک کے ذرّہ ذرّہ سے جلوہ نما ہے شانِ حُسن

دیر و حرم کے شوق میں محو ہیں شیخ و برہمن
میری جبینِ عشق ہے اور ہے آستانِ حُسن

پوچھیے مستِ عشق سے کیفیتِ مئے الست
عالمِ عقل و ہوش میں کون ہے رازدانِ حُسن

سوز و گدازِ عشق بھی کتنا کرشمہ ساز ہے
ذرّۂ خاک بن گیا کوکبِ آسمانِ حُسن

کوکب شاہجہانپوری

اظہارِ حقیقت

ہمنشیں! کیوں شعر کہنے پر مٹا جاتا ہے تو … آہ! ناداں شستگی میں کیا ستم ڈھاتا ہے تو
ڈھونڈھتا ہے نقص کے سائے میں تنویرِ کمال … یوں بھی او ناداں! ملتی ہے کہیں نبضِ جمال
کر چکی تعمیرِ گلشن حسنِ پنہاں کی اُمنگ … اور تو ہے خار و خس سے طالبِ فانِ رنگ
نرمیاں ہیں کیف کی بیگانۂ رنجِ خمار … مختلف ہے صرصرِ طوفاں سے بادِ نوبہار
خاک کی افسردہ تاریکی میں ملتا ہے کہیں … وہ تبسم جس سے روشن ہے ستاروں کی جبیں
گوشِ محرم چاہیئے موجِ ترنم کے لئے … پنکھڑی ہے حسن کے نازک تبسم کے لئے
طالبِ غور و تأمل ہے حقیقت کا نظام … اور تری سعیِ نگاہِ جستجو ہے ناتمام
ہے سرِ میخانہ، رحمت کی گھٹا چھائی ہوئی … میکشوں کی بزم وقفِ جامِ صہبائی ہوئی
چُھو رہی ہے رُوح میں نورس شگوفوں کی شمیم … چھیڑتی ہے قلب کو آہستہ رو موجِ نسیم

اور تو اب تک ہے صرفِ تلخیٔ عہدِ خُمار
اِک خزاں پرورِ چمن، محرومِ صہبائے بہار

ہیں گراں کتنے مزاجِ شعر پر تیرے اُصول … چند تشبیہاتِ بے معنی، کچھ اوہامِ فضول
کوندتی ہیں بجلیاں پہنائے محسوسات میں … اور تو سرگرم ہے تعمیرِ متروکات میں
تو نے جانا مل گئی گیسو کی اِک تشبیہِ تام … تیری فطرت نے ابھی سمجھا نہیں شب کا پیام
صبح کے جلوے تجھے دیتے ہیں پیری کی خبر … تو اگر سمجھے! تو ضدِ شیب ہے جوشِ سحر
چھیڑتا ہے نغمۂ بلبل کی شیریں داستاں … گرچہ خرمن پر ترے لہرا رہی ہیں بجلیاں
ہے اِسی بیگانگی پر محرمِ رازِ حیات … تیری ہستی موت یکسر، تیری دُنیا بے ثبات
کسقدر بے رُوح ہے تیرا کلامِ ناصواب … کاش تو بھی دیکھ سکتا روئے فطرت بے نقاب

حسن رانِ زشتیِ اعمال ہے تیرے لئے عشق اک بازیچۂ اطفال ہے تیرے لئے
ہیچ ہے بیتابیِ خاکِ وطن تیرے لئے چاہیئے اک جوئے شیر و کوہکن تیرے لئے
شعر کو پابندِ الفاظ و بیاں کرتا ہے تو یعنی طوفان کی حد بندیاں کرتا ہے تو!
شعر اگر محرومِ معنی ہو تو کیا لطفِ بیاں لاکھ موجِ کوثر و تسنیم ہو تیری زباں
چند ہم آہنگ لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں تیری نازک بندیاں شرمندۂ معنی نہیں
موت ہے جس جا خموشی، آ چکا ہے وہ مقام ختم کر اس کو کہ درسِ خواب ہے تیرا کلام

ذوق ہے سوز و گداز دل سے بے پروا ترا
جام ہے ناآشنائے لرزشِ صہبا ترا

اے طلبگارِ ستائش ہے تجھے یہ بھی خبر ناشناسی پر تری ہنستے ہیں اربابِ نظر
اشتیاقِ داد میں ہو ہو کے مضطر دیکھنا ایک مصرع پر ترا پیہم اکڑ کر دیکھنا!!
شعر جس نے روح پر وا بابِ عرفاں کر دیا تو نے اسکو مصدرِ تخریبِ دوراں کر دیا
شعر تھا جو نطقِ انسانی کی اک موجِ لطیف کر دیا گفتار نے تیری اُسے تلخ و کثیف
شعر تھا جس پر کبھی تہذیبِ باطن کا مدار کر دیا تو نے اُسے تاریکیوں سے ہمکنار
شعر جس سے دوڑ جاتا تھا رگِ دل میں لہو تیری کم ذوقی سے ہے اک غنچۂ بے رنگ و بو
شعر جس نے نطق کو بخشی متاعِ لازوال تو نے اُس کو کر دیا اہلِ جنوں کی قیل و قال
کیا یہی گفتارِ بے معنی ہے شاعر کا پیام جس نے دم بھر میں بدل ڈالا ہے قوموں کا نظام
کیا اسی رنگِ بیاں پر ہے تجھے نازِ کمال کیا اسی طرزِ سخن کا نام ہے سحرِ حلال!
جو جگا دیتا تھا روحوں کو یہی انداز ہے! کھولتا تھا جو گرہ دل کی یہی اعجاز ہے!
کیا یہی اوہام پستی ہیں نشانِ برتری کہہ گئے ہیں "شاعری جزویست از پیغمبری"

کب تک اہلِ علم و دانش کو ہنسایا جائیگا
شعر کا یہ مضحکہ کب تک اڑایا جائے گا

قیامت

اوّل تو خدا سے ڈرنا یوں بھی عین ایمان ہے، دوسرے ایسی حالت میں جبکہ قیامت کا آنا برحق بھی ہو اور زلزلہ کی صورت میں نصف قیامت آ بھی چکی ہو، اگر کوئی خدا سے نہ ڈرے تو معاف کیجئے گا یہ بہادری نہیں بلکہ ہم تو اس کو فرعونیت کہیں گے۔ بہرحال ہم کو اپنے اس ایمانی استقلال پر ناز ہے کہ جیسے ہی اخبار میں ہماری نظر سے یہ خبر گذری کہ چندر گرہن کے وقت ایک چھوٹا سا ستارہ چاند سے متصادم ہو کر پاش پاش ہو جائے گا اور اُس کے ٹکڑے خطِ اُستوا سے اوپر دُنیا کے کسی حصّہ میں گریں گے جس سے سخت نقصانات پہونچیں گے، اور زمین اُن کے گرنے کی دھمک سے ہل جائے گی۔ تو جناب ہمارا خون منجمد ہو گیا، طائرِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لئے پر تولنے لگا اور اخبار ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ قصّہ اصل میں یہ ہے کہ اگر ہم گنہگار نہ ہوتے اور عاقبت کی طرف سے دل کو اطمینان ہوتا تو شاید یہ سراسیمگی کا عالم طاری نہ ہوتا مگر یہاں تو اُس طالب علم کا سا حال تھا جس نے تمام سال گلّی ڈنڈے کے نذر کیا ہو اور سالانہ امتحان بغیر اطلاع کے سر پر آ موجود ہو بلکہ یہ مثال بھی ذرا کمزور رہی ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اُس وقت یہ عالم تھا کہ گویا مَوت کی سزا کا حکم سُننے کے بعد موت کے خوفناک انتظار میں ۔ ۔ ۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی۔ کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک تو اس خوفناک خبر کا تخیّلی فلم دیکھتے رہے اس کے بعد اپنے تمام گناہوں سے بیاختگی کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے گھر میں آئے تاکہ اِس بقیہ مختصر سی زندگی کو بال بچوں کے ساتھ اور خُدا کی یاد میں صرف کریں، گھر میں آکر ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود اپنے کو ذرا مضبوط بنا کر بیگم کو یہ خوفناک خبر سُنا دی تاکہ وہ بھی بے خبر نہ رہیں۔ بیگم نے پہلے تو ہمارے متعلق یہ سمجھا کہ ہم شاید مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم نے اُن کو اخبار دکھایا تو وہ سنگر مشین کو اس طرح دبوچ کر بیٹھ گئیں کہ گویا قیامت سے اگر بچنے کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ سنگر مشین ہی ہو۔ ہم نے اپنی ہمتِ مردانہ اور استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے زبردستی متبسّم ہو کر کہا "آپ اسقدر پریشان کیوں ہو گئیں"

سہمی ہوئی آواز میں بولیں "اب بتائیے کیا ہوگا؟"

ہم نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "ہوگا کیا وہی ہوگا جو خُدا کو منظور ہے"

جنوری کے مہینہ میں چہرہ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "اب بتائیے کیا کریں؟"

ہم نے کہا "یہ بھی کوئی اپنے بس کی بات ہے۔ خُدا کو یاد کرو اور کیا کرو گی"

ٹھنڈی سی سانس لیکر دل کی گہرائیوں سے "یا اللہ توبہ ہے" کہکر بیگم نے کہا "اور یہ چندر گرہن ہے کب؟"

ہم نے کہا "کل رات کو دس بجے کے بعد پڑیگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آج نہا لوں تاکہ کم سے کم نماز ہی پڑھ سکوں"

بیگم نے گردن ہلا کر جواب دیا کہ "ہاں" اور ہم غسل خانہ میں چلے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ آج ہم نے غسل کیا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اپنے نزدیک جب ہم بالکل طاہر ہو گئے اور کلمہ پڑھ پڑھ کر وضو وغیرہ کر چکے تو غسل خانہ سے نکلے یہاں بیگم پہلے ہی سے سجدہ میں موجود تھیں۔ ہم نے بھی کپڑے پہنے اور ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی میں پہلی مرتبہ چار رکعت نمازِ فرض کی نیت باندھ کر اپنے کو خُدا کے حضور پیش کیا۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کس انہماک کے ساتھ یہ نماز ہوئی ہے اور اسکے بعد

جو نوافل کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو قضائے عمری کا لطف آگیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ چار بجے نماز کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور چھ بجے کے قریب بیٹھے۔ اس کے بعد ہی مغرب کا وقت آگیا اور ہم پھر وضو کے اوپر وضو کرکے کھڑے ہو گئے۔ مختصر یہ کہ نمازوں کا سلسلہ رات کو دس بجے تک قائم رہا۔ جب عشاء کی نماز اور نماز کے بعد تسبیح وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دسترخوان پر آئے۔ کھانا وانا تو خیر یونہی سا کھایا البتہ یہ رسم بھی ادا ہو گئی اور ہم سونے کے لئے لحاف میں پہونچ گئے مگر توبہ کیجئے نیند کا کہیں کوسوں پتہ بھی نہ تھا اور یہی حال بیگم کا تھا کہ ادھر سے اُدھر کروٹیں لے رہی تھیں۔ کبھی کبھی "یا اللہ توبہ ہے" کا نعرہ بلند کرتی تھیں اور رہ جاتی تھیں آخر ہم نے خود ہی اُن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "کیا نیند نہیں آرہی ہے؟"

کہنے لگیں: "اور آپ بھی تو جاگ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا: "ہاں ذرا کچھ وحشت سی ہے۔"

بولیں: "میرا بھی دل گھبرا سا رہا ہے۔"

ہم نے مردِ مسلمان بنتے ہوئے کہا: "ارے جی کوئی بات نہیں اللہ مالک ہے سو بھی جاؤ۔"

کہنے لگیں: "ہاں یہ تو ہے مگر دل جیسے اُلجھ سا رہا ہے معلوم ہوتا ہے جیسے دم اُلٹا جاتا ہے۔"

ہم نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں بس اللہ مالک ہے اُس کے حکم سے نجوم غلط ہو سکتا ہے اور منجم کی پیشگوئی جھوٹی ہو سکتی ہے۔ اور اگر واقعی قیامت آہی گئی ہے تو جو سب کا حشر ہوگا ہمارا بھی ہوگا۔ بہرحال یہ کوئی اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔"

بیگم نے کہا: "ہوں۔"

ہم چپ ہو رہے اور اِدھر اُدھر کروٹیں بدلنے لگے ـــــ یکایک ہم کو خیال آیا کہ ذرا صحن میں چل کر چاند کو دیکھیں تو سہی کہ اُس سے کون ستارہ ایسا قریب ہے کہ ٹکرا ہی جائے گا۔ اب جو ہم باہر آئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ چاند سے ایک ذرا چھوٹا سُرخ رنگ کا دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح کا ستارہ چاند سے کوئی ایک فٹ کے فاصلہ پر ہے اور چاند میں گرہن پڑا ہوا ہے۔ ہم نے دوڑ کر بیگم کو اُٹھا دیا اور دونوں بچوں کو کلیجہ سے چمٹا کر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں چاند اور ستارہ پر جمی ہوئی تھیں اور دل کی دھڑکن خود ہم کو ہلائے دیتی تھی۔ ستارہ رفتہ رفتہ چاند کے قریب ہوتا جاتا تھا اور اِدھر بیگم رفتہ رفتہ ہمارے قریب ہوتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ چاند اور اُس ستارہ کے درمیان شاید ایک انچ کا فصل رہ گیا اور بیگم نے ہمارا بازو نہایت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہم برابر کلمہ پڑھ رہے تھے اور دونوں بچوں کو خوب بھینچے ہوئے تھے کہ ایک دم سے ایک ہولناک فلک شگاف دھماکے کے ساتھ وہ ستارہ چاند سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو گیا اور اُس کے ساتھ ہی ہم اس طرح اُچھل پڑے کہ ـــــ آنکھ کھل گئی۔

بیگم نے کہا: "کیا ہے؟"

ہم نے لرزتی اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا: "کچھ نہیں۔"

بیگم نے کہا: "کیا ڈر گئے؟"

ہم نے کہا: "نہیں تو ـــــ ایک خواب دیکھا تھا۔"

بیگم چپ ہو گئیں اور ہم بھی اس ہولناک خواب سے سہمے ہوئے پڑے رہے خدا جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔ بہرحال

ہم اُس وقت بیدار ہوئے جب مؤذن "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہہ کہہ کر مسلمانوں کو آواز دے رہا تھا۔ ہم نے آج سے پہلے بارہا یہ آواز سنی تھی لیکن کبھی اس کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور ہمیشہ ہم یہ آواز سُنکر لحاف کے اندر اپنا مُنہ چھپا لیا کرتے تھے لیکن آج یہ آواز سُنتے ہی ایک لات مار کر لحاف اُلٹ دیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہوئے، وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور نہایت محویت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر کلام پاک کھول کر بیٹھ گئے۔ اُدھر بیگم دس دس اور پندرہ پندرہ منٹ تک سجدے میں پڑی ہوئی دُعاؤں میں مصروف تھیں مختصر یہ کہ اسی دینداری میں ہم دونوں نے سات بجا دئے، ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہی دُھوپ تھی جو آج آخری مرتبہ اپنی چمک دمک دکھا رہی تھی۔ بیگم اپنے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئیں اور ہم ذرا ٹہلتے ہوئے اپنے پڑوسی میر صاحب کی طرف چل دئے کہ دیکھیں وہاں کیا رنگ ہے۔ میر صاحب اس وقت باہر کے مردانے کمرہ میں بیٹھے رہتے تھے مگر آج خلافِ معمول گھر کے اندر گھسے ہوئے تھے ہم نے آواز دی تو اندر سے جواب دیا کہ نماز پڑھ رہے ہیں لہٰذا ہم نے بھی انگلیوں پر درود شریف پڑھنا اور ٹہلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں میر صاحب سر پر بلوچیوں کی طرح رومال باندھے کچھ بُدبُداتے ہوئے برآمد ہوئے۔ ہم نے کہا "میر صاحب اس وقت کونسی نماز پڑھ رہے تھے؟" کہنے لگے "چاشت" ہم نے کہا "اللہ اکبر" کہنے لگے "بھائی یہی وقت دُعاؤں کا ہے اور یہی تھوڑا سا وقت ہے کہ ہم عمر بھر کے گناہگار توبہ کرلیں" ہم نے بھی دل کی گہرائیوں سے میر صاحب کی تائید کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا "بیشک" میر صاحب کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی، ہم آئے تھے ذرا دل بہلانے مگر یہاں تو اور بھی خوف اور دہشت کا ماحول تھا لہٰذا ہم واپس ہونا ہی چاہتے تھے کہ میر صاحب نے کہا "سُنا ہے کہ جو ستارہ ٹوٹنے والا ہے وہ ہماری دُنیا کی طرح مٹی کا نہیں بلکہ لوہے کا بنا ہوا ہے" ہم نے کہا "مگر میر صاحب ایک بات ہے کہ اگر وہ لوہے کا ہے تو خود اس کو نہ ٹوٹنا چاہیئے بلکہ وہ تو چاند کو توڑ سکتا ہے" میر صاحب نے ایک بھولے بھالے مسلمان کی طرح جواب دیا "یہ سب خُدا کی قدرت ہے آپ کو کیا معلوم کہ وہ زیادہ مضبوط ہے یا چاند؟ ممکن ہے کہ چاند اس سے بھی زیادہ سخت کسی دھات کا بنا ہوا ہو اور نہ بھی سہی تو کیا یہ خُدا کی قدرت سے کچھ بعید ہے کہ مٹی لوہے کو توڑ دے اور کمزور چیز مضبوط چیز پر غالب آجائے" ہم کو ماننا پڑا کہ واقعی میر صاحب سچ کہتے ہیں۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ ۔ ع۔ یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب

ہم نے کہا "میر صاحب یہ تو گویا قیامت ہے" کہنے لگے "اور کیا جناب قیامت اور کسے کہتے ہیں، اب آپ یہ سمجھئے کہ وہ ستارہ چاند سے تھوڑا ہی چھوٹا ہے اور چاند بالکل دُنیا کے سر پر ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس وقت وہ چاند سے ٹکرا کر ٹوٹے گا اُس کے تمام ٹکڑے خطِ استوا سے اوپر دُنیا میں گریں گے۔ فرض کر لیجئے کہ کوئی ٹکڑا ہندوستان کے برابر ہے۔ اب اگر وہ ہندوستان کے اوپر گر پڑا تو ہندوستان کا کیا حال ہوگا؟" ہم نے لرزتے ہوئے کہا "ہندوستان بھی پاش پاش ہو جائے گا" جوش میں کہنے لگے "پاش پاش ہو جائے گا، جناب یہ کہئے کہ چٹنی ہو جائیگا چٹنی، کہیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ دُنیا کے نقشہ میں ہندوستان تھا بھی یا نہیں" ہم نے جھُرجھُری لیکر کہا "یا اللہ توبہ ہے، یا اللہ توبہ ہے" میر صاحب نے بھیانک طریقہ پر آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے کان پکڑے اور رُخساروں پر توبہ کے تھپڑ رسید کرنے لگے۔ ہم نے کہا "میر صاحب جو کچھ ہونا ہے وہ تو ٹل نہیں سکتا اور نہ ہم کہیں بچ کر جا سکتے ہیں مگر دل چاہتا ہے کہ چندر گرہن کے وقت سب لوگ پاس ہوں تو اچھا ہے"

میر صاحب نے ہماری تائید کرتے ہوئے کہا: "ہے تو بہت اچھا مگر اس میں ایک رکاوٹ ہے کہ ہم لوگ عورتوں سے علیحدہ رہیں گے اسلئے کہ پردہ کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے یہاں کی مستورات اور مرد کیونکر یکجا ہو سکتے ہیں:" ہم نے کہا: "بھائی ایسے نازک وقت میں پردہ کا کیا سوال پردہ تو وہ کرے جس کو اس دنیا میں رہنا ہے" کہنے لگے: "یہ ٹھیک ہے مگر ایسے موقع پر شرع کی پابندی اور بھی زیادہ ضروری ہے" ہم پردہ کے سخت مخالفین میں سے تھے مگر اس وقت شرع کا نام سن کر لاجواب ہو گئے اور یہی طے پایا کہ اسوقت اپنے اپنے گھر میں اپنے اپنے اہل بچوں کے ساتھ اللہ اللہ کریں۔

میر صاحب کے یہاں سے واپس آکر ہم کو دفتر جانا چاہیئے تھا مگر بیگم نے کہا: "آج دفتر نہ جایئے درخواست بھیجدیجئے" ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ دفتر نہ جائیں بلکہ اس تھوڑے سے وقت کو گھر ہی میں گذاریں مگر درخواست بھیجنے کی بھی ضرورت اس لئے محسوس نہ کی کہ درخواست تو وہ بھیجے جس کو ملازمت کرنا ہو اور اس دفتر میں بھیجے جو آئندہ بھی دفتر رہنے والا ہو مگر آج کے بعد نہ تو ہم ملازم ہی رہ سکتے ہیں نہ کل ہمارا دفتر ہی ہوگا۔ دفتر تو جب رہ سکتا ہے جب یہ دنیا رہے۔ اور جب دنیا ہی ختم ہونے والی ہے تو کیسا دفتر اور کہاں کی ملازمت لہٰذا ہم بغیر درخواست بھیجے ہوئے بیٹھ رہے اور بجائے دفتری چکی چلانے کے کلام خدا کی تلاوت سے اپنے مردہ ایمان میں روح پھونکنے لگے۔ اُدھر بیگم اپنے دونوں بچوں کے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھوا اُٹھوا کر دعائیں کرا رہی تھیں اور اُن کو طوطے کی طرح پڑھا رہی تھیں کہ "جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو"

ہم نے تمام دن عبادت اور خدا کی یاد میں گذارا اور مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم سب ایک ہی کمرہ میں بلکہ ایک ہی چارپائی پر اس طرح خاموش بیٹھ گئے کہ اگر نا سمجھ بچے ذرا دیر بھی خاموش ہو جاتے تھے تو ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی دل کی دھڑکن تک بخوبی سُن سکتے تھے۔ رات کی خوفناک تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ ہمارے جسم میں خون منجمد ہوتا جاتا تھا۔ ہم نے آٹھ بجے کے قریب بیگم سے کہا: "بجائے یہاں بیٹھنے کے ہم کو چاہیئے کہ کسی ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے چاند نظر آسکے۔ چلو صحن میں کیوں نہ بیٹھیں" بیگم نے ہمارا گھٹنہ مضبوطی سے پکڑ کر کہا: "واہ بالکل آسمان کے نیچے جا کر بیٹھ جائیں" ہم نے کہا: "تو کیا چھت کے نیچے ہونے سے ہم آسمان کے اوپر ہیں۔ اچھا خیر باہر نہ جاؤ مگر عشار کی نماز تو پڑھ ہی لیں" بیگم نے پوچھا: "گرہن کے بجے پڑیگا؟" ہم نے کہا: "دس بجے کے قریب" بیگم نے کہا: "اچھا تو پہلے آپ جلدی سے پڑھ لیجئے پھر آپ بچوں کو لیکر وظیفہ پڑھئے گا تو میں نماز پڑھ لوں گی مگر نماز کی چوکی چارپائی کے قریب بچھا لیجئے"

ہم نے بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے نماز پڑھنے کی چوکی چارپائی سے بالکل ملا کر نماز شروع کر دی اور انتہائی کوشش کرتے رہے کہ قیامت کے خوف کے بجائے خدا کی محبت اپنے اوپر طاری کر کے نماز پڑھیں مگر یہ کوئی اپنے بس کی بات نہ تھی۔ بہر حال گھبرا گھبرا کر کسی نہ کسی طرح گر پڑ کر نماز ادا کی اور تسبیح کھٹکھٹاتے ہوئے بچوں کے پاس آ گئے تاکہ بیگم بھی نماز پڑھ لیں۔ ہمارے آجانے کے بعد بیگم نے نماز شروع کر دی اور ہم بچوں کو لئے ہوئے تسبیح پڑھتے رہے۔ بڑے صاحبزادے جو بڑی دیر سے نہایت خاموشی کے ساتھ ہمارا منہ دیکھ رہے تھے کہنے لگے: "تو کیا آپ کے اللہ اللہ کرنے سے قیامت بھاگ جائے گی؟" ہم نے تسبیح پڑھتے ہوئے گردن کے اشارہ سے کہا: "ہاں" وہ بولے: "نہ بھاگے گی وہ تو آئے گی" ہم نے تسبیح پڑھتے ہوئے آنکھیں نکال کر اشارہ سے کہا کہ "دعا مانگو" وہ غریب کچھ سہم سا گیا اور ہاتھ اُٹھا کر جو اُس کی سمجھ میں آیا دعائیں کرتا رہا یہاں تک کہ دعائیں

مانگتے مانگتے سو گیا۔ چھوٹا بچہ پہلے ہی سے سو رہا تھا اور ہم تسبیح کے دانے نہایت مستعدی سے اس طرح گننے میں مصروف تھے کہ گویا۔ ع :۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی

بیگم بھی نماز پڑھنے کے بعد ہمارے پاس ہی بیٹھی ہوئی تصور ہی تصور میں گویا خدا کے دربار میں حاضر تھیں اور اپنے گناہ بخشوانے پر اڑی ہوئی تھیں کہ گھڑیال نے گونج جانے والی آواز کے ساتھ آخری مرتبہ دس کا گھنٹہ بجا دیا اور ادھر ہمارا دم گھٹنا شروع ہوا۔ بیگم تو بالکل ایک بیجان مجسمہ بنی ہوئی بیٹھی تھیں مگر ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے دل کی دھڑکن ہم کو منگیر کی طرح متزلزل بنائے ہوئے ہے۔ ابھی مشکل سے اس کیفیت کو دس منٹ گذرے ہوں گے کہ سڑک پر کسی نے کہا۔

"پڑ گیا چاند میں گرہن"

یہ آواز سننا تھی کہ بیگم اپنے بچوں کو کلیجہ سے چمٹا کر اور خود ہم کو بلی کے شکار کئے ہوئے چوہے کی طرح دبوچ کر بیٹھ گئیں ہم نے کہا "اللہ اللہ کرو"۔ بیگم نے کہا "یا اللہ تو مالک ہے یا اللہ تو مالک ہے"۔ سڑک پر آواز آئی۔

"دیا کرو۔ دھرم کرو"

یہ آواز گویا صور تھی۔ بیگم نے تھرتھر کانپنا شروع کیا اور ہمارے ہاتھ پیر اس طرح سرد ہو گئے کہ گویا اب اُن میں جان ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ٹھنڈا پسینہ بہنا شروع ہوا۔ "دیا کرو۔ دھرم کرو" کی دل ہلا دینے والی آوازیں برابر آ رہی تھیں اور ایک سے ایک بھیانک آواز والا مہتر یہ صدائیں بلند کر رہا تھا۔ دس سے گیارہ بجے اور بارہ سے ایک مگر نہ قیامت آئی نہ دل ٹھہرا، چاند گرہن میں تھا اور ہم موت کے منہ میں مع اہل و عیال، اگر کہیں کھٹ سے بھی کچھ ہوتا تھا تو ہم یہی سمجھ کر اُچھل پڑتے تھے کہ ستارہ چاند سے ٹکرا گیا مگر چونکہ خدا نے یہ دیکھ لیا کہ ابھی اُس کی دنیا میں اس سے ڈرنے والے بندوں کی کوئی کمی نہیں ہے لہذا ستارہ کو چاند سے ٹکرانے کی ضرورت باقی نہیں رہی نتیجہ یہی ہوا کہ چاند گرہن سے نکل گیا اور ہم چاند کے صاف ہو جانے کے بعد کچھ دیر قیامت کا انتظار کر کے سو رہے۔ البتہ صبح جب بیگم نے نماز کے لئے اُٹھانا چاہا تو ہم نے یہ کہہ کر لحاف میں منہ چھپا کر کروٹ لے لی کہ "قضا پڑھ لیں گے"

شوکت تھانوی

نسائیت کے دو جمیل پیکر

خُدا جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اپنے ملائکۂ آسمانی کو حکم دیتا ہے کہ اس کمبخت ناہنجار سے ریل کا سفر کراؤ۔ اب اگر جُرم زیادہ سنگین ہے تو فرشتے ارضِ پنجاب کو منتخب کرتے ہیں۔ کیونکہ موسم گرما میں روئے زمین کا کوئی حصہ پنجاب سے زیادہ غیر شاعرانہ ماحول پیش نہیں کرسکتا۔ اس حصہ میں سفر کرتے وقت آپ محسوس کریں گے، کہ آپ کا گذر کسی غیر متمدن وغیر مہذب طبقہ میں سے ہورہا ہے۔ جہاں کی تمام تر فضا عبارت ہوتی ہے آندھی کے تیز جھکڑوں اور گرد وغبار کے طوفان عظیم سے۔ مُسافروں کی زیادہ تعداد اُن اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے، جو اپنی وضع قطع، بول چال، عادات و اطوار اور سب سے زیادہ اپنی چلموں وغیرہ سے گاڑی کی تمام فضا کو افونت کی حد تک مکروہ کردیتے ہیں۔ لہجہ اور خود الفاظ اس قدر دُرشت اور سامعہ خراش ہوتے ہیں کہ گفتگو کے وقت معلوم ہوتا ہے، گویا آپس میں لڑ رہے ہیں۔

لیکن ان تمام اذیتوں سے زیادہ تکلیف دہ وہ لمحہ ہوتا ہے۔ جب کہ گاڑی کسی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو۔ اور اسی دورانِ استقرار میں مقابل کی پٹڑی پر مخالف سمت سے کوئی دوسری گاڑی آکر رُک جائے، اور وہ بھی اس طرح کہ زنانہ درجہ کا قیام بالکل نظر کے سامنے ہو، اس درجہ میں دیہاتی عورتیں بہت کم بلکہ شاذونادر ہی بیٹھتی ہیں کیونکہ مردانہ درجہ میں جاگزین ہوجانا ان کے لئے باعثِ عار نہیں ہوتا۔ اس موقع پر حُسنِ پنجاب اپنی تمام عُریانیوں اور بے حجابیوں کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کی بے پردگی بے حیائی کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ اور خاص طور پر وہ خواتین جو تھوڑی بہت تعلیم یافتہ ہونے کے بعد مغرب کی حیاسوز تہذیب سے آشنا ہوگئی ہیں۔ اپنے ظاہری حُسن و جمال سے مردانہ جذبات میں ہیجان پیدا کردینا ایک قسم کا فیشن سمجھتی ہیں۔ اور جس طرح سفر کی حالت میں عبادت کے اندر ہر لحاظ سے کسی قدر تخفیف ہوجاتی ہے، اسی طرح ان کا مذہبِ نسائیت اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ عارضی طور پر شرم وحیا کو خیرباد کہہ دینا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ظاہری حُسن وجمال کے لحاظ سے پنجاب تمام صوبوں سے بازی لے گیا ہے۔ اسی لئے ان غارتگرانِ تحمل نے غریب الدیار مُسافروں کو اور زیادہ خانماں برباد کردینا اپنا شیوہ بنالیا ہے۔

لاہور کا سفر۔ ماہِ جون، تنِ تنہا اور تیسرا درجہ۔ یہ تھے وہ عناصر اربعہ جن کے باعث میری طبیعت بہت زیادہ مکدر ہو رہی تھی کہ اچانک گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی اور دو ہی منٹ بعد دوسری گاڑی مقابل کی پٹڑی پر آکر ٹھہر گئی۔ پیشِ نظر درجہ کے باہر آویزاں ہونے والے تختے سے فوراً معلوم ہوگیا کہ اس کے اندر نسوانی مجسمے بند کئے جاتے ہیں۔ نظر نے اندرونی خلا کا جائزہ لیا اور نگاہ ایک مرکز پر جم کر رہ گئی۔ سیاہ لانبے بالوں کی بنگالیت، ساغر بدوش آنکھوں کی مدراسیت، شفق گُونر گل تمثال رُخساروں کی کشمیریت، ناز و ادا اور عشوہ و انداز کی لکھنویت، گداز مگر مختصر بلوری سینہ کی دہلویت، علیحدہ علیحدہ ہوش وحواس کو کم کردینے کے لئے کافی ہیں۔ چہ جائیکہ ان تمام کیفیات کا اجتماع ایک اور صرف ایک پیکرِ نسوانی میں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ؎

گردن سے شانہ تک کھلی سینہ کمر تک بے حجاب
کیا جانئے منظور ہے دُنیا کو اب کیا انقلاب

ہوا کی تازگی ہی محوریت کے سامان فراہم کرکے مدہوش کئے دیتی تھی کہ غیر متوقع طور پر ساقیِ کا نظر آجانا اگر قیامت نہیں تو کیا ہے۔ پنجاب کا حُسن سیاہ یا گہرے سُرخ ملبوس میں جس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے کسی دوسرے رنگ میں ممکن نہیں۔ پھر ساری کے پلو سے اپنے اندر دوشیزگی کو چھپائے ہوئے کہ یہ طرزِ لباس ویسے بھی غیر ارادی طور پر عورت کو عریاں کئے بغیر نہیں رہتا۔ کلائی میں اس طرح بَل ڈال کر بیٹھنا کہ ساعدِ سیمیں کی نقرئی مخملی سطح پر پیدا ہونے والی شکنیں اس امر کا پتہ دے جائیں کہ یہ شے لطیف بلور کے سانچے میں تو ضرور ڈھلی ہے، مگر بلور نہیں ہے۔ کھڑکی کی طرف سے مُنہ پھیر کر ایک دلفریب شانِ استغنا کے ساتھ اظہارِ اجتناب مگر کبھی کبھی غیر دانستہ ارادہ کے ساتھ گردن کو جنبش دیکر ادھر اُدھر نظر ڈال لینا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے گویا سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود کچھ بھی نہیں دیکھا اپنے جسم کو ذرا سمیٹتے ہوئے آنچل کو سنبھال لینا۔ قریب بیٹھنے والی ہمسفر خاتون سے کچھ نہ کہتے ہوئے لبوں کو زحمتِ جنبش دیکر تبسم بھیرتے ہوئے بجلی گرا دینا اور اُسے محسوس بھی نہ کرنا کہ ابکی اس ادا سے دیکھنے والے کے دل پر کیا گذر گئی۔ سفر کی تھکن اور ماندگی کی مصوّر شرح پیش کرنے کی نیت سے انگڑائی لینے کے انداز میں ہاتھوں کا اوپر کی طرف اُٹھا لینا۔ سینہ کے بلوری ساغروں کو جنہیں شعاعِ آفتاب سے محفوظ رکھنے کے خیال سے سیاہ اطلسی پردوں کے محرم میں ملفوف کر رکھا تھا، چھلک جانے کی حد تک اُبھار کر کمر میں خم پیدا کر لینا، چہرے کے خدوخال میں آثار چڑھاؤ پیدا کرکے صرف دو اُنگلیاں لبوں پر رکھ لینا اس طرح گویا کہ جمائی لی جا رہی ہے چھوٹے سے ریشمی رومال کے ساتھ جس کے ایک گوشہ پر انگریزی کے دو حروف کشیدہ ہوں۔ نرگسی آنکھوں کو صاف کرنا گویا ریت کا کوئی ذرہ اُن کے اندر جا پڑا ہے۔ ایک ایسے انداز میں کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہمدردی ہو جائے۔ کبھی کبھی اپنی پتلی حنا آلود انگلیوں سے گاڑی کے تختے کو کھٹکھٹانا اس طرح کہ ساعدِ سیمیں کو محیط کرنیوالی طلائی چوڑیوں کی جھنکار بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس نوع کا نغمہ پیدا کرے جو بادلوں کے شگافوں میں مُسکرانیوالی سماوی مخلوق کے غیر مرئی لبوں سے ناممکن المحسوس جنبشوں سے بیدار ہوتا ہے۔ غرض یہ تھیں شاعرانہ کیفیات کی وہ حُسن افروز جلوہ فرمانیاں جنکی آئینہ سامانی میں محو ہو کر میں غرقِ تحیر ہو گیا۔ اور ہاں باقتضائے عمر اپنی رگوں میں خون کے اندر کچھ وہ چیز بھی محسوس کی جسکو جوشِ شباب کی نشیلی اٹھکھیلیاں کہہ سکتے ہیں حتیٰ کہ میری گاڑی حرکت پذیر ہو کر جنگل کی لامحدود فضا میں بل کھانے لگی۔ اور اس طرح فلکِ بے مہر کی کج رفتاری نہیں تو کم از کم نسیمِ موعود کے آہنی دجال کی برق رفتاری نے مجھے ہمیشہ کے لئے ان صبر آزما جلووں سے محروم کر دیا۔ اور اس وقت مجھے اس امر کا علم ہوا کہ خود میں بھی مصروفِ سفر ہوں۔

کچھ دیر بعد گاڑی کی رفتار مدہم پڑی اور یہاں تک کہ بالکل رُک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہیں تھا۔ بلکہ راستہ صاف نہ ہونے کے باعث وہ ٹھہر گئی تھی۔ میں نے دیکھا اور صرف ایک نظر دیکھا کہ ایک دیہاتی لڑکی جلدی سے گھونگھٹ نکال کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی ہے۔ ایک برق تمثال جھلک میں جو کچھ نظر آیا۔ اس کے اظہار میں کوئی خاص شعریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک بجلی تھی کہ کوندی، چمکی، اور چمک کر روپوش ہو گئی۔ اس کی نصف برہنہ پنڈلیوں پر کھیت کی مٹی جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی اُنگلیاں گوبر وغیرہ سے نجس تھیں۔ کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے آویزاں تھے۔ آنکھوں میں سرمہ کی لہر نہ ہونٹوں پر مستی کی دھڑی منتشر اور اُلجھے ہوئے بال اور ملاگیری رنگ کا بوسیدہ میلا کچیلا لباس جس کی تنگی اس کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے سے ظاہر تھی۔ اس کے خدوخال میں کوئی رعنائی تھی نہ بے ڈول جسم میں کوئی مخصوص جاذبیت۔ چال بھی خرامِ ناز کی ترکیب سے ناآشنا تھی۔ غرض

ایک مشاعرے کے لئے اس کے جسم کا کوئی حصہ یا اُس کا کوئی انداز موضوعِ شعر نہ بن سکتا تھا۔ لیکن اگر شاعرانہ تعلیوں اور غیر حقیقی استعارات و تشبیہات سے خالی الذہن ہو کر اصلیت نگر آنکھوں سے جو جمالِ قدرت کا صحیح مطالعہ کر سکتی ہیں، دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ حد درجہ حسین تھی ۔۔ اس لئے کہ اُس کے پاس کچھ نہ سہی مگر "حیا" تو تھی جس اس کو ترجیح دے سکتا ہوں گاڑی کے زنانہ درجے میں بیٹھنے والی اس حسینہ پر جو اپنے جمالِ ظاہری کے اعتبار سے آراستہ اور بے حجاب بھی جس کے پاس سب کچھ تھا۔ مگر "حیا" نہیں تھی۔

فضل حق قریشی دہلوی

مکتوبِ ریاضؔ

حضرت ریاضؔ نے میرے خط کو رسالہ ساقیؔ کے سالنامہ بابت ماہ جنوری ۳۳ء میں شائع کرایا ہے۔ اُس خط کے جواب میں حضرت ریاضؔ نے جو پاکیزہ اور دلکش مکتوب میرے نام روانہ کیا ہیں اُسے قارئین ساقیؔ کی نظر کرتا ہوں تاکہ اس سلسلہ کی کوئی کڑی باقی نہ رہ جائے۔

شاہ دلگیر

"محترمی

کارڈ ملا۔ آپ کی محبت، آپ کی مرتبہ شناسی، آپ کی قدر دانی، جس میں تصنع کو ہمیشہ سے دخل نہیں، کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔

لکھنؤ میں ابتداءً آپ کس خلوص سے ملے۔ جس کا آغاز یہ ہو اُس کی محبت کا کیا ٹھکانہ۔ نظم اور نثر دونوں اب کچھ اور سے اور ہو گئی۔ لکھنؤ مرکز ہو کر بھی یتیم ہو گیا۔ مادری زبان گئی۔ پورانی باتیں نہیں۔

آپ نے میرے دو فقروں پر نوٹ دیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کس گہری نظر سے نظم و نثر کو دیکھتے ہیں۔

ابھی ایک غزل یوسف حسن صاحب منیجر نیرنگ خیال کی فرمائش سے کہی، وہ پیشِ نظر نہیں۔ مگر مطلع یاد ہے۔ نذر کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے کارڈ کا حاصل مل جائے۔

ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ برادرم نیازؔ نے آپ کے کارڈ کو بیحد پسند کیا۔ احباب کو سنایا۔ سب نے آپ کی تعریف بے انتہا کی۔ دو مہینے سے بیمار رہے۔ اب بفضلہ اچھے ہیں۔

آپ کا کارڈ اس قابل تھا کہ ساقیؔ یا کسی رسالہ میں چھپتا۔ ہائے نقادِ شعر کہنے سے رہا جاتا ہے۔ پُشت کارڈ پر سہی۔

صبح بہار میں نہ یہ شام بہار میں　　کھلتے ہیں پھول جا کے حسینوں کے ہار میں

مجھے دعویٰ ہے۔ دعویٰ شکن کوئی شعر کسی زبان کا لکھ بھیجئے۔

لیتی ہے سانس ایک ہوا میں تمام خلق　　جتنے ہیں سب بندھے ہوئے ہیں ایک تار میں

اس پامال قافیہ کو دیکھئے اور فارسی تار کے شعر ملاحظہ کیجئے۔

میں نے ساقیؔ میں آپ کی تحریر اس وقت دیکھی۔ آپ کے انتخاب اور لاجواب طرزِ تحریر نے ناصر علی کو قطعاً زندۂ جاوید بنا دیا۔ میں اپنے لئے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔"

"آپ پر ناز کرنے والا" ۔۔ ریاضؔ

فغانِ نیم شبی

میں ایک مایوسِ محبت ہوں شکستہ دل اور غم نصیب!

میں اُس کلی کی طرح ہوں جو شام کی اُداسی میں شاخ سے گر کر مُردہ ہو جاتی ہے!!

میری آرزوؤں کی بے بسی، پشیمانی کے سوگوار دامن میں مُنہ چھپا کر سو جانا چاہتی ہے اور میری ناکام تمنائیں اپنی حسرت ساماںیوں میں تحلیل ہو کر فنا ہو جانے کی آرزومند ہیں!!۔

حسرتوں سے لبریز ماضی نے افسردگی اور مایوسی کے قلم سے میرے دل پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھ دئے ہیں۔ جب شام کی سیاہی پھیلتے ہی کائنات ایک گہرا سانس لیکر خاموش ہو جاتی ہے اور لیلائے شب سیاہ نقاب ڈالے فطرت کو تھپک تھپک کر سُلانے لگتی ہے۔ اندھیری رات کے اس پھیلے ہوئے سکوت میں جبکہ دمکتے ہوئے تارے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ میرا شکستہ دل اپنی ناکامیوں کے افسانے دُہراتا ہے۔ کرب واندوہ کے سُروں میں، سوز وگداز کی لَے میں، بیتاب نغمے بلند ہو ہو کر کائنات کو لوری دینے لگتے ہیں۔ جامد وساکن رات میرے اُداس ترانوں سے گونج اُٹھتی ہے۔ فضا میرے گیتوں سے بھر جاتی ہے۔ تاآنکہ ——— ہوا کی سائیں سائیں۔ پتوں کی سرسراہٹ اور بہتے ہوئے پانی کی شیریں راگنی بھی میری ہی دُکھ بھری کہانی الاپنے لگتی ہے!۔

کتابِ محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے۔ تمام آرزوئیں۔ سب تمنائیں اور سارے ارمان تشنۂ تکمیل رہے ——— یہ نہیں کہتا کہ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نہیں جانتا عشق کسے کہتے ہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے خیال اور تمہارے ہی تصوّر میں ہمیشہ وہر وقت غرق رہنا میری زندگی کا واحد مقصد تھا۔ احساسات کی ان طویل اور مبہم کہانیوں کو جو میرے قلب پر مرتسم ہو چکی تھیں، رات کی خاموش تنہائیوں میں بار بار دُہرایا کرتا تھا۔ تمہارا نام ہر لحظہ وردِ زبان ہوتا تھا۔ اور تمہاری یاد ہمہ وقت میرے دل کو گرمایا کرتی تھی۔ یہی میرا مذہب تھا اور یہی میرا ایمان ——— یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری طرف سے ذرا سا اشارہ اور خفیف سی تقدیم بھی تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے آغوش میں لے آئے گی، میں "ادعائے محبت" کو گناہِ عظیم خیال کرتا تھا اس لئے کہ میں کسی طرح بھی تمہاری بیگانگی کی معصومیت کو برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بارہا وفورِ شوق نے مجھے عرضِ مدعا پر آمادہ کیا لیکن تمہاری حد درجہ کی معصومیت نے ہر مرتبہ میرے ارمانوں کے ہجوم پر اوس برسا دی۔ میری طرف سے تمہاری لگاوٹ آمیز بیگانگی ثابت کرتی تھی۔ کہ تم میرے دلی جذبات سے آگاہ ہو۔ کچھ عرصے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میری شیفتگی کا تمہیں احساس ضرور ہے۔ بس میرے لئے تمہارا یہ احساس ہی سب کچھ تھا ——— میرے پُرخلوص دل میں مسرّت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کے ایک ایک تار سے ابدی محبت کا میٹھا راگ پیدا ہوتا تھا۔ عشق اپنا بربط بجاتا تھا اور میرا ہر سانس اسکے نشیلے سُروں سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ کائنات کی ہر شے مجھے محبت کا پیغام سُناتی تھی۔ میں خوش تھا اور تمہارے تصوّر کو اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے الوہیت کے منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ——— آہ! ایک تیسرا شخص میرے اور تمہارے درمیان

حائل ہوگیا اور تم اپنی صداقت اور پاکیزگی قائم نہ رکھ سکیں۔ جوانی کی ترنگ نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم اُس شخص کا دَم بھرنے لگو۔ بیہوشی میں بھی اور آہ! بالآخر تم سے پریم شاستر کا سب سے بڑا پاپ ہو ہی گیا۔ وہ گیت جو میں نے تمہیں سکھایا تھا تم دوسروں کو سُنانے لگیں۔ تمہارا ہر سانس دوسرے شخص کی تعریف و توصیف کے لئے وقف ہو گیا۔ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی تمہیں میرا خیال نہ آتا تھا۔ تمہاری نظر میں دُنیا کی کوئی چیز نہ سماتی تھی۔ دن و رات کا ہر لمحہ تمہارا عیش و نشاط میں صرف ہونے لگا ——— مجھے دلی رنج ہے کہ کیوں نہ میں نے اپنے سوز دروں سے تمہیں آگاہ کر دیا۔ کاش میں ایک مرتبہ تمہارے حسین قدموں میں گر کر آنسوؤں کی بھر گم میں اپنا حدود دل بیان کر دیتا! شاید اس اظہار کے بعد میری زندگی یوں تشنہ کام نہ رہتی۔ لیکن نہیں، میں غلطی کرتا ہوں۔ ہر شخص کو انتخاب کا پورا حق حاصل ہے۔ دوسرا شخص ہر لحاظ سے اس لائق تھا کہ تم اپنی تمام دلکش رعنائیاں اُس پر نثار کر ڈالتیں۔ چنانچہ تم نے یہی کیا اور بالکل ٹھیک کیا۔ پھر میں دخل در معقولات کرنے والا کون؟ صرف ایک ہی تدبیر تھی وہ یہ کہ میں اپنے آپ کو علیحدہ کر لوں۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ تمہارے اُس خیال کو جسے مدت سے میں اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اور جو میری رگ رگ میں پیوست ہو چکا تھا ایک دم سے اپنے دل کی گہرائیوں میں سے نکال ڈالوں۔ پریت کی ان سُنہائی بندشوں کو جن میں میں برسوں سے جکڑا ہوا تھا ایک دم سے توڑ ڈالوں۔ لیکن میں نے تمہاری خوشنودی کیلئے یہ بھی کیا۔ اپنے سینے پر پتھر رکھکر تمہاری طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لئے ——— یہ نہ سمجھنا کہ وہ دوسرا شخص میرا محسود ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ خوش قسمت انسان اس لحاظ سے مجھے عزیز تر ہے کہ اب وہ تمہاری توجہات کا مرکز ہے!!!۔

بہت دنوں بعد میں نے تمہیں دیکھا۔ اُف! تم کس قدر بدل چکی تھیں۔ تمہاری دوشیزگی میں اب وہ فردوسی تقدس باقی نہیں رہا تھا۔ پیشانی کا کُندن ماند پڑ چکا تھا۔ سیاہ سُنبلی گیسو دوسروں کے شانوں پر بکھرتے بکھرتے بے آب ہو چکے تھے۔ لاج بھری نشیلی آنکھوں میں اب ایک لگاوٹ اور ایک خواہشِ دلربائی نظر آتی تھی۔ شکریں لبوں کی ہر جنبش ایک دوقِ سے کشی کی حامل تھی۔ رُخسار جو کبھی اپنی تازگی اور پنکھڑی جیسی نزاکت کے لئے آپ اپنی نظیر تھے اب "کثرتِ استفادہ" کے سبب زرد و بے رنگ ہو چکے تھے۔ بُشرے پر شرمگیں بشاشت کی بجائے دلیری اور "جمال فروشی" کے انداز پائے جاتے تھے۔ ارمان بھرے سینے کا ذوقِ نثار جُست بندھنوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ غرض تمہارے جسم کی ہر ادا، چال ڈھال، نشست برخاست، لب و لہجہ، ہر چیز ایک خواہشِ سُپردگی اور ایک تمنائے ربودگی کی حامل تھی ——— بے اختیار میری آنکھ سے چند خاموش آنسو ٹپک پڑے ——— تمہیں کسی قسم کا ملال نہ تھا۔ آنسوؤں کی زبان کو تم کیا سمجھتیں!!!۔

بہاراں، آسودگی اور آسائش۔ فُرصت کی کبھی نہ ختم ہونے والی گھڑیاں۔ محبت کا ابدی نور اور سحر کار موسیقی۔ میں اور تم ——— رنگین خوابوں کا ایک جمگھٹ!!! لیکن فراق کی سختیوں میں وصل کی اُن سُہاونی محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں جن سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکا۔ اب تو میری تمام توجہات ایک نئی دُنیا کی تعمیر کے لئے وقف ہیں۔ اس دُنیا میں پژمُردہ ارمانوں اور پامال حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ محبت اور رومان کی جگہ غم و غصہ کا دور دورہ ہے۔ یہاں غنچوں کی چٹک کی بجائے بلبل کا شیون سُنائی دیتا ہے۔ ظلمت و تاریکی، مایوسی و بے چارگی ہی میری رُوح کی انیس ہیں۔ اس جہانِ یاس میں رہ کر میں اپنے ناسوروں سے کھیلتا ہوں اور کبھی کبھی فطرت کے رباب کے ساتھ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ایک ایسا نغمہ بلند کرتا ہوں

جن سے میرے زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔

حاشا ۔ یہ نہ سمجھنا کہ جس محفل سے میں اُٹھ آیا ہوں اُس میں دوبارہ شمولیت کی آرزو رکھتا ہوں۔ یہ آخری چیز ہو سکتی ہے جسے میں کسی طرح برداشت کر سکوں۔ ہاں اس مکمل مایوسی و ہراسانی کے عالم میں میرے دل میں صرف ایک دُھندلی سی تمنا ہے اور وہ یہ کہ میرے سامعہ خراش بَین کبھی بھی تمہارے طرب آشنا کان تک نہ پہونچ سکیں اور بس۔

انصار ناصری بی۔ اے۔ دہلی

بیعتِ دستِ سبو

وقتِ سحر ہے، آؤ حریفو! وضو کریں — مینا اُٹھائیں، خدمتِ جام و سبو کریں
لو کھل گیا وہ پرچمِ خورشید زرنگار — اُٹھو، کہ وا دریچۂ صد رنگ و بو کریں
طائر خروش میں ہیں، صبا گرمِ اختلاط — آؤ حریمِ کیف میں پھر ہائے و ہو کریں
مستانہ وار جیب ترنم کے چاک میں — پھر رشتۂ شراب کہن سے رفو کریں
روئے خوشِ نگار کی دُہرائیں داستاں — حُسن و جمالِ یار کی پھر گفتگو کریں
بہرِ دعا زمانہ اُٹھائے ہوئے ہے ہاتھ — یارو اُٹھو، کہ بیعتِ دستِ سبو کریں
آؤ بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن — آئینہ آفتاب کے پھر روبرو کریں
ملبوسِ زندگانی و رختِ حیات کو — صہبا کی نرم آنچ سے پھر شست و شو کریں
لیلائے کیفِ دوش کا مرجھا چلا ہے ہار — پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں
آنے لگی ہے دَیر سے ناقوس کی صدا — آؤ تصورِ صنمِ سادہ رو کریں

ہاں پھر کلامِ جوش کو نغموں میں ڈھالکر
بزمِ سحر کو قبلہ گہِ آرزو کریں

جوش ملیح آبادی

پریم بھجن

۱

نین لگن تو شُبھ لگن ہے مگن رہو آرام بِنا
مول پریم کا سب سے نیارا ہاتھ آئے جو دام بِنا
سچا پریم وہی ہے پیارے چین نہو ہری نام بِنا

۲

یہ جیون ہے پھول کنول کا روتا ہنستا ساتھ رہا
جینا مرنا دھوپ چھاؤں ہے نیکی کرنا ہاتھ رہا
سچا پریم وہی ہے پیارے چین نہو ہری نام بِنا

۳

جو ہے اپنے کام لگا ہے کہیں نہیں بے کاری
لیکن پریم بنا اِس جگ میں ایشور کام ہے بھاری
سچا پریم وہی ہے پیارے چین نہو ہری نام بِنا

۴

جیون بھید پھول میں پایا ہنس ہنس ہوا بسائے
کہیں مگن ہو احمد پوری پھل ہو کے پک جائے
سچا پریم وہی ہے پیارے چین نہو ہری نام بِنا

۵

پیٹ ہی کارن ہاتھ جوڑ دوے سُن ہو جاوے کام بِنا
بھلے جانور ایسے منش سے جیتے مرے پر نام بِنا
سچا پریم وہی ہے پیارے چین نہو ہری نام بِنا

سید مقبول حسین احمد پوری

۱ مبارک۔ ۲ نرالا۔ ۳ زندگی۔ ۴ خوش ہو کر۔ ۵ بلند مرتبہ۔ ۶ گھبرا کر بھی۔ ۷ انسان۔ ۸ اخلاق

سوال وجواب

وہ بولے "پھول تھا" میں نے کہا "رخسارِ جاناں تھا"
وہ بولے "سرو تھا" مَیں نے کہا "سروِ خراماں تھا"

وہ بولے "تیر تھا" مَیں نے کہا "وہ تیرِ مژگاں تھا"
وہ بولے "تیغ تھی" میں نے کہا "ابروئے جاناں تھا"

وہ بولے "رات تھی" مَیں نے کہا "گیسوئے جاناں تھا"
وہ بولے "چاند تھا" مَیں نے کہا "وہ روئے تاباں تھا"

دوبالا ہوگئی تھی جس سے سُرخی دستِ قاتل کی
وہ بولے "مہندی تھی" میں نے کہا "خونِ شہیداں تھا"

دمِ فریاد چھالے پڑ گئے جس سے مرے لب پر
وہ بولے "آگ تھی" مَیں نے کہا "وہ سوزِ پنہاں تھا"

عیاں تھا جس سے جلوہ سرو کا سنبل کا نرگس کا
وہ بولے "باغ تھا" میں نے کہا "رشکِ گلستاں تھا"

شبِ وعدہ کسی نے توڑ ڈالا جس کو شوخی سے
وہ بولے "ہار تھا" میں نے کہا "وہ عہد و پیماں تھا"

زلیخا ہوگئی بدنام بزمِ حُسن میں جس سے
وہ بولے "عشق تھا" میں نے کہا "یوسف کا داماں تھا"

مجھے سب عاشقِ شوریدہ سر جس بات سے سمجھے
وہ بولے "نالہ تھا" میں نے کہا "چاکِ گریباں تھا"

کسی کی چاند سی تصویر تھی جب میرے پہلو میں
وہ بولے "وصل تھا" میں نے کہا "وہ روزِ ہجراں تھا"

کھٹکتا تھا جو رہ رہ کر رسا دل میں شبِ فرقت
وہ بولے "میرا پیکاں تھا" کہا میں نے "وہ ارماں تھا"

محمد اسمعیل رسا ہمدانی

تذکرۂ دہلی مرحوم

یہ اُس خط کا مقتبس ترجمہ ہے جو فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنی آرے نے دہلی سے مورخہ یکم جولائی ۱۶۶۳ء کو اپنے ایک دوست Monsieur De La Mothe Le Vayer مانشیور دی لاتھی لی وے آر کے نام بھیجا تھا۔ اس خط میں شہنشاہِ مغل کے دربار دہلی و آگرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز ہندوستانیوں کے ذہن و ذکا اور طرزِ معاشرت کو بلااجمال بیان کیا ہے۔

مَیں اِس خط کو ساقی میں صرف اس لئے شائع کرانا چاہتا ہوں کہ یہ خط درحقیقت تین سو برس پہلے کی دلّی کی سچی تصویر ہے۔

متنِ خط۔ صاحب مَن! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب میں فرانس واپس آؤں گا تو سب سے پہلے آپ مجھ سے یہی دریافت کریں گے کہ بمقابلہ پیرس کے، اس مُلک کے دارالسلطنت دہلی کی آبادی و خوبصورتی کا کیا حال ہے۔ لہذا آپ کے شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مَیں پہلے ان ہی اُمور کو بیان کرتا ہوں ان ہی کے ضمن میں مَیں دیگر غیر متعلقہ باتیں بھی آپ کے گوش گذار کروں گا جنکے بارے میں میرا خیال ہے کہ آپ اُن کو بھی دلچسپ تصور کرینگے۔

یورپ اور ہندوستان کے طرزِ تعمیر میں اختلاف کا سبب۔ آگرہ اور دہلی کی خوبصورتی کی نسبت کچھ کہنے سے پہلے مجھے یہ بیان کرنا لازم ہے کہ جب مَیں نئے آئے ہوئے اہلِ فرنگ کو یہ کہتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے شہروں کی عمارات فرنگستان کی سی خوش وضع نہیں ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس امر پر غور نہیں کرتے کہ عمارتوں کی وضع قطع ہر مُلک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ مثلاً جس ڈھب کی عمارت پیرس یا ایمسٹرڈم میں مفید اور آرام دہ ہے دہلی اور آگرہ میں بالکل ناکارہ ہے۔ بالفرض اگر یہ شہر ہندوستان آجائیں اور یہاں کے شہر وہاں جا رہیں تو اُن کی عمارات کو توڑ کر بالکل ایک نئی طرز پر نئے سرے سے تعمیر کرنا از بس ضروری ہو گا۔ بیشک یورپ کے شہر بہت خوبصورت اور اُس مُلک کی سرد آب و ہوا کے موافق ہیں لیکن دہلی بھی اپنی وضع پر اِس گرم مُلک کی آب ہوا کے موافق خوش وضعی سے خالی نہیں۔

ہندوستان میں گرمی اس شدت سے پڑتی ہے کہ کوئی اور تو کیا خود ظلِ سبحانی (بادشاہ) بھی پاؤں کی حفاظت کے لئے پاجامے نہیں پہنتے بلکہ صرف ایک ہلکی سی زیر پائی ہوتی ہے جسے "پاپوش" کہتے ہیں اور سر کی حفاظت کے لئے نہایت نفیس اور نازک کپڑے کی ایک ہلکی پھلکی سی پگڑی ہوتی ہے اور باقی لباس بھی ایسا ہی سُبک ہوتا ہے۔

گرمی کے دنوں میں مکان کی دیوار یا سرہانے کے تکیہ پر مشکل سے ہاتھ یا سر رکھا جاتا ہے اور چھ مہینے سے زیادہ ہر ایک مُتنفّس مکان کے باہر بغیر کسی قسم کے سائے کے سوتا ہے۔ عام لوگ تو گلیوں اور کوچوں ہی میں پڑ رہتے ہیں اور بڑے بڑے

تاجر اور آسودہ حال لوگ کبھی گھر کے صحن یا باغ میں اور کبھی مکان کے چبوترے پر جسے پہلے چھڑکاؤ کر کے ٹھنڈا کر لیتے ہیں آرام کرتے ہیں۔

اب اس حالت میں بالفرض پیرس کے مشہور محلے سینٹ جیکس یا سینٹ ڈینس مع اپنے بند وضع اور بیشمار منزلوں کے شہر دہلی لو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُن میں یہاں کوئی بھلا مانس رہ سکے گا؟

اور فرض کیجئے ایک شخص گھوڑے پر پھر پھرا کر گھر واپس آیا ہے اور گرمی اور گرد کے مارے آپے سے بے آپے ہو رہا ہے۔ تو کیا ہی سزا ہوا گر اُسے تنگ و تاریک زینہ سے چڑھ کر چوتھی یا پانچویں منزل پر ایسے کمرے میں ٹھہرنا پڑے جہاں مارے گرمی کے دم گھٹ جائے ہندوستان میں اِس قسم کی تکلیف کے سامان نہیں۔ یہاں تو سواری سے آکر فوراً تھوڑا سا تازہ ٹھنڈا پانی یا لیموں کا شربت پی لینا کپڑے اُتار کر مُنہ ہاتھ دُھونا اور سایہ میں پلنگ پر لیٹ جانا اور خدمتگاروں سے یہ کہنا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے پنکھے جھلنا شروع کردیں۔

شہر دہلی کا ذکر اَب مَیں آپ کو دہلی کی ٹھیک ٹھیک کیفیت سُناتا ہوں۔ پھر آپ غور کرسکیں گے کہ شہر خوبصورت ہے یا نہیں۔ تقریباً چالیس سال گذرے ظلِ سُبحانی کے قبلہ و کعبہ حضرت شہاب الدین شاہجہاں نے اسکا نام اپنے نام پر شاہ جہاں آباد یا مختصراً جہان آباد رکھا اور اسے دار السلطنت اس لئے بنایا کہ گرمی کی شدت کے سبب آگرہ بادشاہ کے قیام کے لائق نہیں ہے لیکن اس سبب سے کہ اس کی تعمیر کے سلسلہ میں اکثر مسالہ پُرانی دلّی کے آس پاس کے کھنڈروں سے بہم پہونچایا گیا تھا پردیسی لوگ پُرانے اور نئے شہر میں تمیز نہیں کرتے اور دونوں کو دلّی ہی کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اکثر جگہ یہ شہر اپنے بانی ہی کے نام پر بولا جاتا ہے۔ بہرحال میں نے آسانی کے لئے یورپ ہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

شہر دہلی ایک ہموار زمین پر جمنا کے کنارے پر جو لوائر برابر ایک دریا ہے ہلالی صورت میں آباد ہے اور اُس طرف کے سوا جو دریا کے سبب سے (جس پر کشتیوں کا پُل بندھا ہوا ہے) محفوظ ہے۔ حفاظت کے لئے سب طرف پختہ شہر پناہ بنی ہوئی ہے اور اگر اُن بُرجوں سے سو سو قدم کے فاصلے پر شہر پناہ کے کنارے بنے ہوئے ہیں اور اُس کچے پشتے سے جو چار یا پانچ فرانسیسی فٹ اونچا ہے قطع نظر کی جائے تو یہ بہت نامکمل ہے کیونکہ نہ تو اس کے گرد خندق ہے اور نہ کوئی اور بچاؤ کا سامان ہے یہ حصار شہر اور قلعہ دونوں پر محیط ہے لیکن اس کی وُسعت اتنی نہیں جتنی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ میں تین گھنٹہ کے عرصہ میں اس کے گرد اگرد پھر گیا ہوں حالانکہ میرا خیال ہے میرے گھوڑے کی رفتار فی گھنٹہ ایک لیگ فرانسیسی (یعنی تین میل) سے زیادہ[۵] نہ تھی۔ میں اس تخمینہ میں

شاہجہاں مانا ہے میں اس کی آبادی شاہجہاں کے بارھویں سال جلوس مطابق ۱۰۴۸ھ یا ۱۶۳۸ء شروع ہوئی تھی۔ خافی خاں نے "منتخب اللباب" میں لکھا ہے کہ تاریخوں میں سے جو شعراء نے اس کی بابت کہی تھیں۔ بادشاہ کو یہ مادہ پسند آیا تھا (شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد) اس مادہ کو صاحب آثار الصنادید اپنی سند پر میر یحیٰ کاشی کا نکالا ہوا بتاتے ہیں۔

[۵] صاحب آثار الصنادید "مرات آفتاب نما" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۲۴ جلوسی مطابق ۱۰۶۰ھ یا ۱۶۵۰ء میں شاہجہاں کے حکم کے بموجب مٹی اور پتھر سے چار مہینے کے عرصہ میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ فصیل تیار ہوئی۔ مگر دوسری ہی برسات میں اکثر جگہ سے ڈھ گئی اس لئے ازسرِ نو چونہ اور پتھر سے بننے کا حکم ہوا اور سات برس کے عرصہ میں چار لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ فصیل تیار ہوگئی۔

شہر کے گرد و نواح کی آبادیوں کو جو متعدد ہیں اور دُور تک لاہوری دروازے کی جانب سے بستی چلی گئی ہیں اس میں شامل نہیں کرتا اور پرانی دلّی کے اس بے شمار بقیہ کو اور نہ اُن میں چھوٹی چھوٹی بستیوں کو جو شہر کے نواح میں ہیں کیونکہ اُنہیں شامل کر لینے سے شہر کی وسعت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر وسط میں خط کھینچا جائے تو ساڑھے چار میل سے زیادہ لمبا ہو اور اگرچہ باغات وغیرہ کے بیچ میں آجانے سے میں ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ شہر کا کُل دَور کس قدر ہے لیکن کچھ شک نہیں کہ بہت ہی زیادہ ہے۔ قلعہ جس میں شاہی محلسرا اور بادشاہی مکانات تقریباً نصف دائرہ کی شکل کا ہے۔ اور سامنے دریائے جمنا بہتا ہے اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے بیچ ایک ریتیلا وسیع میدان ہے جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے اور امیروں اور سرداروں اور راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں جن کو بادشاہ محل کے جھروکوں میں سے دیکھا کرتا ہے۔ قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہر پناہ کے مُشابہ ہے لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ اور سنگ سُرخ کی بنی ہوئی ہے جو سنگ مرمر کے مشابہ ہے اس لیے شہر پناہ کی نسبت زیادہ خوبصورت اور شہر پناہ سے اونچان اور مضبوطی اور چکلان بھی زیادہ ہے اور شہر کے رُخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور دریا کی جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بھی بنی ہوئی ہے جس کی روکار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں اور جو پانی سے بھری رہتی ہے۔ جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں! یہ عمارت اگرچہ بظاہر مضبوط نظر آتی ہے لیکن اصل میں کچھ مستحکم نہیں ہے

۱؎ صاحب آثار الصنادید کی تحقیق کے مطابق پہلے اس شہر کا نام اندرپت تھا۔ اس باب میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ نام بدل کر کب اور کیوں دِلّی ہو گیا مراۃ آفتاب نما میں ہے "یہ بات مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چندر بنسیوں میں کا ایک راجہ ہے، اپنے نام پر دلّی آباد کی" لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجہ دلیپ کا ذکر ہے مگر کہیں دلی کا نام تک نہیں ہے بلکہ جہاں لکھا ہے اندرپت ہی لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں ہے کہ سنہ ۳۰۷ھ مطابق ۹۱۹ء تونوروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے برابر دہلی شہر بسایا۔ اس مصنف نے کتاب نزہتہ القلوب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں جہاں میخ نہ جم سکے اس سبب سے وہ بستی دہلی کہہ کے مشہور ہو گئی۔ مگر اس سنہ میں نہ تو تونوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی نام پڑنا قرین قیاس ہے۔ جو بات مشہور ہے اور دل کو بھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ (بقول مراۃ آفتاب نما) راجہ دہلو قنوج کے راجہ نے اس لئے کہ دہلی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں اندرپت میں اپنے نام پر شہر بسایا اور جب سے اس کا نام دہلی چلا۔ اس کا اصلی نام دہلی کی بجائے دہلو تھا جیسا کہ موافق روایت صاحب جواہر الحروف امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کے دہلو کا لفظ اپنے اِس شعر میں باندھا ہے ؎

یا بفرماہ کہ گردوں شینم و دہلو روم　　یا یکا یسم بخش یا از خود بفرما بارگی

راجہ دہلو راجہ فور (پورس) کا ہمعصر تھا اور اُسی کی لڑائی میں مارا گیا بعد ازاں سکندر نے راجہ فور پر فتح پائی۔ یہ واقعہ ۳۲۶ قبل ولادت مسیح علیہ السلام کا ہے اور تقریباً یہی زمانہ دہلی شہر بسنے کا ہے۔

۲؎ شاہجہاں نے اپنے جلوس کے بارھویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ یا ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں آباد آباد ہونے کا حکم دیا اور بارھویں ذالحج کو قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ اُستاد حامد اور احمد جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ اس کے تعمیر پر مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا اور پانچ ماہ دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مصالحہ جمع ہوا اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہوئی۔ پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا اور دو برس ایک مہینہ سات دن میں قلعہ کی چار دیواری بارہ بارہ گز بلند ہو گئی پھر مکرمت خاں کا ذمہ ہوا اور بیسویں جلوس یعنی تقریباً نو برس کے عرصہ میں سب کام تیار ہو گیا (بقیہ صفحہ آیندہ پر)

اور میری دانست میں ایک متوسط طاقت کا توپخانہ اُسے فی الفور زمین کے برابر کر سکتا ہے۔ اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے اور قلعہ معلّٰی کی عظیم الشان اور سُرخ رنگ کی فصیل کے سامنے ہونے کی وجہ سے بہت ہی خوشنما معلوم ہوتا ہے اور اس باغ کے متصل ایک بادشاہی چوک ہے جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے اور دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوتے ہیں۔ جو ملازم راجہ حسب معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں اُن کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ جو ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں قلعہ میں رہنے سے احتراز کرتے ہیں اور بدیں وجہ قلعہ کے اندر کا پہرہ اُمراء اور منصب داروں کا ہوتا ہے اور اس جگہ صبح کے وقت شاہی گھوڑے جو اُس کے قریب ہی ایک بڑے اصطبل میں رہتے ہیں، پھرائے جاتے ہیں۔ اور یہیں سواروں کو فوج کا میر بخشی نو ملازم سواروں کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا ہے اور اگر وہ ترکی النسل اور مضبوط ہوتے ہیں تو اُن کی ران پر شاہی داغ ڈلوا دیتا ہے اور اُس امیر کا بھی جس کی فوج میں یہ بھرتی ہوں۔

اِس جگہ انواع و اقسام کی بیشمار اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے چوک لگتا ہے جو پیرس کے "پونٹ نی آف" کی طرح ہر قسم کے کھلاڑیوں اور بھان متیوں ہندو و مسلمان نجومیوں اور رمالوں کا مرجع ہے اور یہ فاضل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اُن کے پاس علم ریاضی کے کچھ پُرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے۔ جس میں بارہ بُرجوں کی اشکال بنی ہوتی ہیں اور اس طرح یہ بھولے بھالے راہگیروں کو پھسلاتے اور فریب دیتے ہیں۔ اور سادہ لوگ اُن کو غیب داں جان کر اُن سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ لوگ جس امر کی بابت اُن سے سوال کرتے ہیں پہلے اُس کے لئے وقت اور "ساعت" یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اوڑھکر اُن کے پاس جاتی ہیں اور اپنی زندگی کے حالات دریافت کرتی ہیں حتیٰ کہ اپنے تمام دلی بھید اُن سے کہہ ڈالتی ہیں۔ جس طرح فرانس میں ایک وسواسن عورت اپنے پادری کے پاس جاکر توبہ کے قصد سے اپنے تمام گُناہ ظاہر کر دیتی ہے۔ اور یہ بے وقوف جاہل یقین رکھتے ہیں کہ ستاروں کی تاثیر کا بدل دینا اُن کے حیطۂ اختیار میں ہے۔ اِن نجومیوں میں سب سے زیادہ ہنسی کے قابل ایک دوغلہ پرتگیز تھا جو گوا سے بھاگ آیا تھا۔ ایک دن فرقہ جسوئٹ کے پیشوا فادر بوزی صاحب نے اُس کو اِس مکروہ کام میں مشغول دیکھکر پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے۔ تو اُس نے شرمندہ ہونے کی جگہ یہ جواب دیا "ایسے بیوقوفوں کا نجومی ایسا ہی ہونا چاہیئے"۔ یہ ذکر میں ان نجومیوں کا کر رہا ہوں جو بازاروں میں اپنی اوقات گنواتے پھرتے ہیں لیکن وہ منجّم جو امیروں کے پاس آتے ہیں وہ اُن کو بڑا علامہ سمجھتے ہیں اور اس طرح یہ دولتمند ہو جاتے ہیں۔ تمام ایشیا میں یہ بے اصل وہم پھیلا ہوا ہے اور خود بادشاہ اور بڑے بڑے امیران فریبی غیب گوؤں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں اور بغیر اُن کی صلاح کے کوئی کام شروع نہیں ہوتا۔ یہ ہر ایک کام کرنے کے لئے مُبارک گھڑی تجویز کرتے ہیں اور ہر ایک شُبہ کو قرآن (مجید) سے فال نکال کر حل کرتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اور جو بیس ربیع الاول ۱۰۵۸ھ میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ قلعہ اکبر آباد کے قلعہ سے دوگنا ہے۔ اس کی فصیل پچیس گز اونچی ہے اور گیارہ گز گہری بُنیاد ہے۔ دیوار کا آثار بُنیاد سے پندرہ گز اوپر سے دس گز کا ہے۔ اس کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ شاہی خرچ ہوا تھا۔ (آثار الصنادید)

وہ دو چوڑے بازار جن کا ذکر ابھی ہوا اور جو اس مربع میدان میں آکر ملتے ہیں اُن کا عرض قریب پچیس[۲۵] یا تیس[۳۰] قدم کے ہوگا۔ اور جہاں تک نظر پہونچتی ہے وہ سیدھے چلے جاتے ہیں اور اُن میں سے جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے بہت لمبا ہے۔ بلحاظ وضع عمارت یہ دونوں بازار ایک ہی سے ہیں اور جیسا کہ پیرس کا بازار پلیس رائل ہے ویسے ہی اُن کے بھی دونوں جانب دوکانیں محراب دار ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ایک تو اُن کی عمارت خشتی ہے دوسرے یہ کہ یہ سب ایک منزلہ ہیں اور اُن کی چھتیں بطور ایک مسطح چبوترے کے کام دیتی ہیں اور یہ بھی تفاوت ہے کہ پلیس رائل کی دوکانوں کے برانڈے اس قطع کے ہیں کہ اُن میں داخل ہوکر انسان بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتا ہے اور ان کی دوکانوں کے برانڈے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جن کے بیچ میں دیواریں حائل ہیں۔ ان میں بیٹھکر دن کے وقت اہل حرفہ اور صرّاف اپنا اپنا کام کرتے اور بیوپاری اپنا مال خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ ان محرابی برانڈوں کے پیچھے اسباب رکھنے کے لئے پختہ کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کے وقت سارا اسباب بحفاظت رکھ دیا جاتا ہے اور بیوپاریوں کے رہنے کے لئے بالا خانے بنے ہوئے ہیں جو بازاروں کی جانب سے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ مگر ایسے بالاخانے سب دوکانوں پر نہیں ہیں۔

ان کے سوا پانچ بازار اور ہیں اور اگرچہ اُن کی وضع قطع بھی اُنہیں کے قریب قریب ہے لیکن ایسے لمبے اور سیدھے نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ گلیوں اور کوچوں میں جو بے شمار بازار اور جو ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہیں ان میں سے اگرچہ اکثر کے سامنے کی وضع محرابی طور کی ہے۔ مگر وہ چونکہ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں جن کو عمارت کے تناسب کا کچھ خیال نہ تھا۔ اس لئے ان میں بہت کم ایسے خوش قطع، سیدھے اور عریض ہیں جیسے کہ وہ بازار جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔

شہر کے گلی کوچوں میں جو منصب داروں اور حکام عدالت اور دولتمند تاجروں اور دیگر لوگوں کی حویلیاں ہیں انہیں بہت سی خاصی خوبصورت ہیں مگر اینٹ پتھر کے بنے ہوئے مکانات شہر میں کم ہیں۔ ہاں کچے اور خس پوش زیادہ ہیں۔ مگر باوجود اس کے عمدہ ہوادار اور خوشنما ہیں اور اکثروں میں چوک اور باغیچے ہیں اور بہت آرام کے اور ہر قسم کے سامان سے آراستہ ہیں اور جو مکان خس پوش ہیں وہ بھی اچھے لمبے اور مضبوط بانس کے چھپروں اور کھپریلوں سے پٹے ہوئے اور کہگل اور سفیدی کئے ہوئے ہیں۔ یہ بے شمار خس پوش اور چھوٹے چھوٹے مکانات جو بڑے بڑے مکانات کے ساتھ خلط ملط ہیں ان میں معمولی فوجی سوار اور ان گنت نفر خدمتگار اور نان بائی وغیرہ جو بادشاہ اور لشکر کے ہمرکاب جاتے ہیں رہتے ہیں۔ اور ان کے سبب شہر میں اکثر آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے برس تین بار ایسی خوفناک آگ لگی کہ تیز ہوا کے سبب جو گرمی میں اکثر چلا کرتی ہے قریباً ساٹھ ہزار چھپروں پر پانی پھر گیا اور چند اونٹ اور گھوڑے اور بہت سی پردہ نشین خواتین بھی جل مریں۔ کیونکہ یہ بے چاریاں ایسی شرمیلی اور اپاہج ہوتی ہیں کہ نامحرم لوگوں سے منہ چھپانے کے سوا اِن سے کچھ بن نہیں آتا۔ چنانچہ جو عورتیں اس صدمہ سے ہلاک ہوئیں وہ اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ بھاگ کر نکل جائیں۔ ان کچے اور خس پوش مکانوں کے باعث میں ہمیشہ یہی خیال کرتا ہوں کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان یہاں زیادہ ہیں۔ دہلی گویا چند دیہات کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔

اُمراء کے مکان اگرچہ اکثر دریا کے کنارے اور شہر کے باہر ہیں۔ لیکن اور مقامات میں بھی ہیں۔ سعداللہ خاں کی حویلی[۱] میں خود

[۱] افسوس اس سنگین عمارت کا اب نام نشان بھی نہیں۔ ہاں کوچہ سعداللہ خاں کے نام سے دریا گنج میں ایک محلہ موجود باقی ہے۔ شارق ؎

گیا ہوں، بڑی عمدہ اور مضبوط عمارت ہے۔ مَیں نے بچشمِ خود اُس کی چھتوں پر توپیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ اِس گرم ملک میں اُسی مکان کو اچھا سمجھتے ہیں جس میں سب طرح کا آرام ہو اور سب طرف سے خاص کر شمال کی جانب سے ہوا آتی ہو۔ چنانچہ وہ مکان اچھے سمجھے جاتے ہیں جن میں ایک اچھا صحن اور باغیچہ اور درخت اور حوض اور دالان کے اندر یا دروازے کے باہر چھوٹے چھوٹے فوارے لگے ہوئے ہوں اور خوبصورت تہ خانے ہوں جن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی خنکی کی وجہ سے گرمی کے ایام میں دوپہر سے چار یا پانچ بجے تک جبکہ ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ سانس نہیں لیا جا سکتا، بہت آرام دہ ہوتے ہیں مگر تہ خانوں کی بہ نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کمرے ہوتے ہیں۔ جو اک قسم کی گھاس کی خوشبودار جڑوں سے بنائے جاتے ہیں اور صحن کے اندر اس غرض سے حوض کے قریب لگائے جاتے ہیں کہ خدمتگار لوگ چمڑے کی ڈولچیوں سے اُن کو باہر کی طرف سے آسانی سے چھڑک سکیں اور اس قطع کا مکان سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے جس کے چاروں طرف قدِ آدم اونچے دالان در دالان ہوں اور ان میں چاروں طرف سے ہوا آتی ہو اور ایک بڑے چمن کے اندر بنا ہوا ہو۔ اور واقعی کوئی مکان ایسا نہیں ہے جس میں گھر والوں کے سونے کے لئے صحن چبوترہ نہ ہو جہاں سے بارش یا آندھی کے وقت یا جب صبح کو سرد ہوا چلنے لگے یا شبنم پڑنے لگے تو پلنگ کو سرکا کر اندر کر لیا جاتا ہے۔ یہ شبنم اگرچہ زیادہ نہیں ہوتی مگر بدن میں سرایت کر جاتی ہے۔ جس سے اکثر ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں

اچھے گھروں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ فرش کے اوپر روئی کا ایک بھاری اور قریباً چار انگل موٹا گدا بچھا رہتا ہے جس پر گرمی کے دنوں میں سفید چاندنی اور جاڑوں میں ریشمین قالین بچھاتے ہیں۔ اور دالان کے صدر میں ایک یا دو گدیلے بچھے رہتے ہیں جن پر ریشم کے ہلکے کام کی سوزنی جس پر سنہری اور روپہلی زری کی دھاریاں بنی ہوئی ہیں پڑی رہتی ہے۔ اور صاحب خانہ اور معزز اور ممتاز لوگ جو ملاقات کو آتے ہیں اسی پر بیٹھتے ہیں اور ہر گدیلے پر کمخواب کا ایک گاؤ تکیہ بھی لگا رہتا ہے اور اُس کے علاوہ اہل مجلس کی آسائش کے لئے دالان کے گرداگرد کمخواب اور مخمل اور پھولدار ریشمین کپڑے کے غلافوں کے چند اور تکیئے بھی لگے رہتے ہیں اور دالان کے چاروں طرف جو زمین سے دو یا ڈیڑھ گز اونچے بہت معقول اور با قرینہ مختلف شکل کے طاق بنے ہوئے ہوتے ہیں اُن میں عمدہ عمدہ چینی کے برتن اور گلدان رکھے جاتے ہیں اور دالان کی چھت منقش اور ملمع کاری کی ہوتی ہے مگر انسان یا کسی اور جاندار شے کی تصویر اُس پر نہیں ہوتی کیونکہ یہ مذہب اسلام میں ممنوع ہے۔

یہ ہندوستان کے ایک عمدہ مکان کی اصلی تصویر ہے اور دہلی جیسے غدار شہر میں ایسے مکانات بہت موجود ہیں۔ اور مَیں خیال کرتا ہوں کہ بغیر یورپ کے مکانوں کی ہجو کے بلاشبہ اور بلا اندیشہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے دارالسلطنت کی عمارتیں اگرچہ یورپ کی عمارتوں سے کسی طرح بھی مشابہت نہیں رکھتیں تاہم خوبصورتی سے خالی نہیں۔ مگر جو چیز کہ فرنگستان کے شہروں کی زیب و زینت ہے وہ خوشنما اور شاندار دوکانیں ہیں جو دہلی میں نہیں ہیں۔ اور اگرچہ یہ شہر ایک عالیشان اور طاقتور بادشاہ کے دربار کا مقام ہے جہاں پر لازمی طور پر ہر قسم کی بیش قیمت اشیاء کا جمع ہو جانا ایک ضروری امر ہے۔ تاہم کوئی ایسا بازار یہاں نہیں ہے جیسا ہمارا سینٹ ڈینس ہے جس کا مقابل اور ہمسر غالباً تمام ایشیا میں نہ ہوگا۔ یہاں بیش قیمت مال اکثر گوداموں میں بھرا رہتا ہے اور یورپ کی طرح دوکانیں بھڑکدار اور بیش قیمت اسباب سے شاذ و نادر ہی آراستہ نظر آتی ہیں۔ اور

ؔ غالباً بارہ دری مراد ہے۔

اگر ایک دوکان میں پشمینہ کمخاب اور زری کار مندیلین اور ریشمین کپڑے وغیرہ ہیں تو پاس ہی کوئی پچیس[25] دوکانوں میں گھی تیل دال۔ چاول گیہوں اور جو وغیرہ سب شمار قسم کے اناج ہیں جو نہ صرف ہندوؤں کی معمولی غذا ہے جو کبھی گوشت نہیں کھاتے بلکہ غریب مسلمان اور بہت سے سپاہی بھی یہی کھاتے ہیں۔ ٹوکروں میں بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ ایک بازار ایسا ہے جس میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے اور اس میں بہت سی دوکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران۔ بلخ۔ بخارا اور سمرقند کے خشک میووں بادام۔ پستہ۔ فندق۔ کشمش سیاہ و زرد آلو اور جاڑوں میں سیاہ اور سفید نہایت عمدہ تازے انگوروں سے جو روئی کی تہہ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتی ہیں اور ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے جو جاڑے بھر بکتے رہتے ہیں، بھری رہتی ہیں۔ مگر یہ میوے بہت مہنگے بکتے ہیں۔ چنانچہ ایک سردہ پونے چار روپے کو آتا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ اہل دہلی کو سب میووں سے زیادہ مرغوب اور پسند ہے۔ امرا کے ہاں میوہ کثرت سے خریدا جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے "آغا" کے ہاں اکثر صبح کے کھانے کے موقع پہ پچاس روپے کا میوہ صرف میں آتا ہے۔

گرمی کے موسم میں دیسی خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا اور بجز اس کے کہ ایران سے بیج منگوا کر ایک اچھی اور کمائی ہوئی زمین میں بویا جائے جیسا کہ امرا اکثر کرتے ہیں، عمدہ میسر نہیں آتا۔ مگر اس پر بھی عمدہ اور اچھا خربوزہ کمیاب ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین موافق نہیں ہے اور ایک سال کے بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔

گرمی میں آم دو مہینے رہتے ہیں اور بہت کثرت سے اور سستے ملتے ہیں لیکن دہلی میں جو آم پیدا ہوتا ہے وہ نرم اور بے مزہ ہے اور رنگت بھی اچھی نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی امرا کے ہاں اچھا کھانے میں آتا ہے جو باہر سے بیج منگا کر بڑی احتیاط سے بواتے ہیں۔

شہر میں حلوائیوں کی دوکانیں کثرت سے ہیں لیکن مٹھائی اچھی نہیں بنتی۔ اور گرد سے اٹی اور مکھیوں سے بھری رہتی ہے۔ نان بائی بھی بیشمار ہیں مگر ان کے تنور ہمارے ہاں کے تنوروں سے مختلف وضع کے ہوتے ہیں اور بہت برے ہیں اور اسی وجہ سے روٹی نہ تو عمدہ ہی ہوتی ہے اور نہ خوب پکی ہوئی البتہ جو روٹی قلعہ میں پکتی ہے وہ کسی قدر اچھی ہوتی ہے اور امرا تو اپنے گھر ہی پر تیار کرا لیتے ہیں اور اس وجہ سے نہایت نفیس ہوتی ہے اور اس میں دودھ مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے اور اگرچہ خوب پھول جاتی ہے گر مزا جلی ہوئی کا سا ہوتا ہے اور زیادہ تر کیک جیسی ہوتی ہے۔ اور پیرس کی "گانس" اور دیگر روٹیوں کو ہرگز نہیں پہونچ سکتی۔ اگرچہ بازار میں کئی قسم کے کباب اور قلیہ وغیرہ بکتا ہے لیکن اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس جانور کا گوشت ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی ہوتا ہے۔ غرض کوئی کھانا جو گھر میں تیار نہ ہوا ہو معین صحت نہیں ہے۔ دہلی کے ہر گلی کوچے میں گوشت بکتا ہے لیکن بکرے کے گوشت کی جگہ دھوکے سے بھیڑ کا گوشت ــــ بھی دیدیتے ہیں۔ پس اس فریب سے بچنے کے لئے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ بیل کا گوشت اور خصوصاً بھیڑ کا اگرچہ مزے میں برا نہیں ہوتا لیکن گرم زیادہ ہوتا ہے اور نفاخ اور دیر ہضم بھی ہے! حلوان کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے مگر چونکہ بازار میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے اس لئے زندہ جانور خریدنا پڑتا ہے لیکن اس میں یہ بڑی دقت ہے کہ اس ملک میں صبح کا گوشت شام تک نہیں ٹھہرتا۔ دوسرے یہ کہ جانور دبلے ملتے ہیں اور اس وجہ سے گوشت بے مزہ ہوتا ہے اور قصائیوں کی دوکانوں میں دبلی بکریوں کا گوشت ملتا ہے۔

جو اکثر سخت ہوتا ہے۔ مگر مجھے تو خصوصیت کے ساتھ یہ شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جب سے میں اِن لوگوں کے چلن سے واقف ہوا ہوں ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ مجھے روٹی یا گوشت اچھا نہ ملا ہو۔ چنانچہ مَیں خاص شاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس قلعہ میں بھیجا کرتا ہوں اور وہ خوشی سے عمدہ کھانا دیدیتے ہیں جس پر اُن کی لاگت اگرچہ کم لگتی ہے مگر میں برضامندی ایک اچھی قیمت دیتا ہوں چنانچہ میرا "آغا" مجھ سے یہ سُنکر بہت ہنسا کہ میں برسوں سے چوری اور چالاکی سے اپنا گذارہ کرتا ہوں ورنہ پوسنے چار سو روپے میں جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتے ہیں فاقوں کے مارے مرجاتا حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنے روز میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔ جنگی مُرغ دلّی میں نہیں دکھائی دیتا کیونکہ اِس مُلک کے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں۔ اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے جن کو محلسرا کے کام کے لئے خوجہ بناتے ہیں۔ لیکن پرند جانور اکثر بازار میں بِکنے آتے ہیں اور اچھے اور سَستے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی قسم کی مُرغی جس کا چمڑا سیاہ ہوتا ہے اور جس کا نام میں نے "حبشی" رکھا ہے وہ بھی بکتی ہے۔ کبوتر بھی ملتے ہیں۔ مگر بچے نہیں ملتے۔ کیونکہ ہندوستانی بچوں کا مارڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں۔ تیتر بھی ملتے ہیں مگر ہمارے ملک کے تیتر سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی حال مُرغابیوں اور خرگوشوں کا ہے جن کو زندہ پکڑ کر پنجرے کے پنجرے بھرے ہوئے شہر میں لاتے ہیں۔

دلی کے نواح کے ماہی گیر اپنے پیشہ میں ہوشیار نہیں لیکن بعض اوقات اچھی مچھلی بھی بکتی ہے خصوصاً "سنگھاڑا" اور "روہو" جو اپنے ہاں کی پائک اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہے۔ مگر جاڑوں میں یہ لوگ مچھلی کم پکڑتے ہیں۔

اب میرا یہ بیان سُنکر آپ غور فرما سکتے ہیں کہ کیا کوئی خوش خور آدمی پیرس چھوڑ کر دلّی کی سیر کو خوشی سے آئے گا؟ یہاں بیشک امیروں اور دولتمندوں کو ہر شے میسّر ہے لیکن یہ صرف اُن کے مُلازموں کی کثرت اور کوڑے اور روپے کے باعث ہے۔ دلی میں متوسط الحال شخص کوئی نہیں ہے۔ یا تو بڑے ذی مرتبہ لوگ ہیں یا مفلوک الحال جن کی زندگی مصیبت سے بسر ہوتی ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ میری تنخواہ معقول ہے اور مَیں خرچ بھی دھڑلے سے کرتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاطرخواہ کھانا نہیں ملتا۔ وجہ یہ کہ بازار میں اچھی چیز دستیاب نہیں ہوتی اور اکثر وہی چیز ملتی ہے جسے اُمرا نے ناپسند کر کے چھوڑ دیا ہو۔ شراب جو یورپ میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے دلّی کی کسی دوکان پر آپ کو نہ ملے گی۔ اگرچہ دیسی انگور کی بن سکتی ہے لیکن شرع اسلام اور شاستر کی رُو سے برابر ممنوع ہے۔ چنانچہ احمد آباد اور گولکنڈہ میں بعض ڈچ اور انگریزوں کے گھروں میں مَیں نے پی ہے۔ جو بدمزہ نہ تھی اور سلطنتِ مُغلیہ میں اگر کبھی عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز یا جزائر کناری کی ہوتی ہے۔ چنانچہ شراب شیرازی تو ایران سے بندر عباس پہونچکر بذریعہ جہاز سورت میں آتی ہے۔ جہاں سے چھیالیس دن کے عرصہ میں دہلی پہونچ جاتی ہے اور جزائر کناری سے ڈچ لوگ سورت میں لاتے ہیں لیکن یہ دونوں قسم کی شرابیں اس قدر گراں قیمت ہیں کہ بقول اس مُلک کے لوگوں کے ان کی قیمت اُن کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بڑا شیشہ جو تین انگریزی بوتلوں کے برابر ہوتا ہے پندرہ یا سولہ روپیہ سے کم کو ہرگز نہیں آتا اور جو شراب خاص اس ملک میں بنتی ہے اور جسے یہاں "عرق" کہتے ہیں ایک قسم کی تیز اور تند شراب ہے جو گُڑ سے بھبکے میں کھینچ کر بناتے ہے۔ مگر اس کے بکنے کی بھی سخت ممانعت ہے اور سوائے عیسائی مذہب کے لوگوں کے علانیہ کوئی شخص نہیں پی سکتا۔ مگر یہ عرق ویسا ہی تیز و تند ہے جیسا کہ پولینڈ کے ملک میں اناج سے بناتے ہیں اور اگر اس کا تھوڑا سا بھی زیادہ استعمال

کیا جائے تو لاعلاج اعصابی امراض اُس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس عقلمند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا نہایت عمدہ میوے کے شربت کی، جو قلیل قیمت پر میسر آجاتا ہے اور کچھ ضرر نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس گرم ملک میں بہت ہی کم لوگوں کو شراب کی زیادہ خواہش ہوتی ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ اپنی شراب نہ پینے کی عادت اور پسینہ کے بکثرت آتے رہنے سے بہت سی بیماریوں مثلاً نقرس۔ سنگ مثانہ۔ امراضِ گردہ۔ زکام۔ نزلہ اور چوتھئے تپ کو جانتے بھی نہیں اور جو لوگ ان امراض کے شاکی یہاں آتے ہیں جیسا کہ خود میرا حال تھا وہ بہت جلد بالکل اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور اعضائے تناسل کی بیماریاں اور ملکوں کی سی نہ تو سخت ہی ہوتی ہیں اور نہ ویسے بُرے نتیجے ہی پیدا کرتی ہیں۔ البتہ اس ملک کے لوگ گرچہ اکثر تندرست رہتے ہیں تاہم ویسی ہمت نہیں رکھتے جیسے کہ ہمارے سرد ممالک کے لوگوں میں ہے۔

دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں۔ مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی لوگ صناعی اور کاریگری کی لیاقت نہیں رکھتے۔ ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنہوں نے شاید کسی اُستاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوتی اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسی کامل طور سے تقلید کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں سرِ مُو فرق نہیں رہتا چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ شکاری اور جنگی بندوقیں ہیں اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورپین سُنار ان سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔

مُصوّری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھ کر میں اکثر دنگ رہ گیا ہوں۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی مہموں کی ایک شبیہ جو ایک مشہور اور نامی مصوّر نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصے میں تیار کی تھی اُس نے تو مجھے بالتخصیص حیران و ششدر کر دیا اور میں نے اُسے عجوبۂ روزگار خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مُصوّر اکثر تصویر میں تناسب اعضاء اور اُن جذبات کے ظاہر کرنے میں جو مختلف حالات میں انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں کچے ہیں۔ لیکن اگر ان کو ایک اچھا اُستاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں۔

سید ابنِ حسن شارق دہلوی

زہریلی مکھی

گاؤں کا بوڑھا زمیندار اور نہایت خوشحال آدمی قریب المرگ تھا۔ بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے خدا اُسے سزا دے رہا اور زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔

"رامو کی حالت کو غور سے دیکھو وہ تمہارے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ اے فانی انسان تو خود کو کیا تصور کئے ہوئے ہے۔ تو تو کسی شمار میں بھی نہیں۔ رامو یقیناً ایک معزز ہستی ہے، اس علاقہ کا مجسٹریٹ بھی اس سے ہاتھ ملا لیتا ہے۔ اس گاؤں کا نواب اس کی عزت کرتا اور اس سے ملنے آیا کرتا ہے۔ وہ تم میں سب سے زیادہ متموّل ہے۔ لیکن میں پھر بھی اُسے خاک میں ملا سکتا ہوں۔ اُسے فنا کرنے کیلئے گرسنہ بھیڑیا بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی تناور درخت اُکھاڑ کر اس پر گرانے اور کچلنے کی ضرورت ہے۔ ایک حقیر مکھی اس مقصد کے لئے بہت ہے۔"

اور ہوا بھی یہی۔ ایک مکھی نے اس کے ہاتھ میں ڈنک مارا۔ زخم پر ورم ہو گیا اور ہاتھ کا رنگ پہلے سیاہی مائل اور پھر سُرخ ہو گیا۔ گاؤں کے چودھری اور نواب نے رامو کو ڈاکٹر سے علاج کرانے کی ترغیب دی۔ رامو کو ڈاکٹر کے بلانے جانے میں اعتراض نہ تھا۔ لیکن انہوں نے رائے دی کہ تار دیکر دہلی سے کسی ماہر سرجن کو بلایا جائے۔ اس مطلب کے لئے ڈاکٹر امتیاز علی کا انتخاب کیا گیا۔ وہ صرف ایک مرتبہ آنے کیلئے سفر خرچ کے علاوہ اسّی روپے لیگا لیکن اسے فضول خرچی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

"واہیات" رامو نے کہا۔ "وہ حقیر مکھی میرے جسم میں اتنی روپے کا نقصان نہیں کر سکتی ہے۔"

نواب نے اصرار کیا اور ڈاکٹر کی فیس اپنی جیب سے ادا کر دینے کی پیشکش کی۔ یہ چال چل گئی کیونکہ رامو ایک مغرور زمیندار تھا۔ تار روانہ کر دیا گیا جس کے جواب میں ایک دُبلا پتلا نوجوان عینک لگائے ــــ بالکل بے رعب شکل کا ــــ اس گاڑی میں سوار ہو کر آ گیا جو اُسے لینے کے لئے اسٹیشن پر بھیجدی گئی تھی۔

بوڑھے زمیندار کی نوجوان بیوی سیتا دیوی نے اس کا دروازہ پر استقبال کیا۔ "کیا تم ہی دہلی کے مشہور و معروف ڈاکٹر ہو؟" سیتا دیوی نے دریافت کیا۔ "بہتر ہے کہ تم اندر جا کر میرے شوہر کا طبی معائنہ کرو۔ اس کے ہاتھ میں محض مکھی نے ڈنک مارا ہے لیکن اُس نے اسقدر شور مچا رکھا ہے کہ گویا ہاتھی نے کاٹ کھایا ہے۔"

یہ بالکل غلط اور مہمل الزام تھا۔ بوڑھے رامو نے اپنی تکلیف کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی تھی اور جب تک اُسے مجبور نہ کیا جاتا وہ زخم کا ذکر تک بھی نہ کرتا تھا اور اصرار کرنے پر بھی بہت مختصر الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ وہ بیفکری اور لاپرواہی کے عالم میں بستر پر دراز تھا۔ اسکا سر بھیڑ کی کھال کے تکیہ پر تھا۔ اور حُقّہ کی نے مُنہ میں۔

"چودھری رامو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ "میں نے سُنا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں مکھی نے ڈنک مارا ہے؟"

"بس یہی تکلیف ہے" رامو نے زیرِ لب جواب دیا۔

"کس قسم کی مکھی تھی؟"

"سبز رنگ کی" رامو نے فوراً جواب دیا۔

"ڈاکٹر! تم ان سے بیماری کا حال دریافت کرلو" سیتا دیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔ میری ہنڈیا چولہے پر چڑھی ہوئی ہے اور آٹا بھی گوندھنا ہے۔"

"بہت بہتر اماں جان" ڈاکٹر نے لبخند ہوتے ہوئے کہا

یہ سُنکر سیتا دیوی نے ڈاکٹر کو کچھ اس طرح گھورا کہ گویا کسی نے اس کے کاٹ کھایا ہے اور اپنے ہاتھ اپنے کولوں پر رکھکر بولی "کیا! حیرت سے تو ہو۔ تم تو میرے باپ سے بھی بڑے ہو" سیتا دیوی نے قدرے برہمی اور غرور سے کہا "غالباً نہیں کچھ کم نظر آتا ہے اور ساتھ ہی دماغ بھی ہو"

یہ کہکر اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ وہ نوجوان اور مغرور تھی۔ جوشِ شباب سے اس کا سینہ تنا ہوا تھا۔ وہ طوفان کی طرح کپڑوں سے گرد و غبار اُڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا نگاہوں سے تعاقب کیا۔ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک تھی اور عمر کے لحاظ سے ڈاکٹر سے بہت چھوٹی اور اپنے شوہر کی بیٹی کے برابر تھی۔ ڈاکٹر نے معافی مانگنے کی غرض سے ابھی کوئی لفظ ادا بھی نہ کیا تھا کہ وہ غائب ہو گئی۔

"اچھا مجھے اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ کیا زخم میں درد ہوتا ہے؟" ڈاکٹر نے رامو کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"بہت زیادہ" رامو نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے ہاتھ کا آلہ سے معائنہ کیا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "زخم کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ مکھی یقیناً زہریلی تھی"

"ممکن ہے" رامو نے نہ صرف پریشانی اور اضطراب کا قطعی اظہار نہ کیا بلکہ پورے سکون سے کہا "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ معمولی مکھی نہ تھی"

"وہ مکھی ضرور کسی نعش پر بیٹھ کر آئی تھی"

رامو یہ پریشان کُن بات سُنکر مطلق نہ گھبرایا۔ ہاں زیرِ لب بڑبڑایا ضرور۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم نے مجھے عین وقت پر بُلالیا۔ میں اس کا اب بھی علاج کر سکتا ہوں۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی اور تم یقیناً مر جاؤ گے"

"یہ تو بہت حیرت انگیز معاملہ ہے" رامو نے ایک ہاتھ سے حقہ کی نے پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

"زہر کا اثر خون میں بہت جلد ہوتا ہے اب وقت ضائع کرنا خطرناک ہے۔ تم اپنا دل مضبوط کر لو، مجھے تمہارا ہاتھ کاٹ دینا پڑیگا"

"میرا ہاتھ؟" رامو نے استعجاب، نفرت اور لاپرواہی سے دریافت کیا۔

"ہاں یہ کاٹنا ہی پڑے گا"

اس کے جواب میں رامو نے زبان سے تو کوئی لفظ ادا نہ کیا لیکن سر ہلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا اور حقہ کے کش لگانے لگا۔

"میری طرف دیکھو" ڈاکٹر نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "اس سے تمہیں تکلیف بالکل نہ ہوگی۔ میں تمہیں سُلا دونگا اور جب تم جاگو گے تو بالکل آرام ہوگا۔ اور اگر ہاتھ نہ کاٹا گیا تو کل اس وقت تم پتھر کی طرح بےحس و حرکت ہو گے۔ اس وقت تمہیں دیوتا بھی نہ بچا سکیں گے"

"آہ! مجھے اکیلا چھوڑ دو" رامو نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ اُس نے یہ کہہ کر دیوار کی طرف مُنہ پھیر

لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس قدر ضد اور لاپرواہی کی ڈاکٹر کو توقع نہ تھی، وہ مجبوراً وہاں سے چلا آیا اور سیتا دیوی سے باتیں کرنے لگا۔

"میرے شوہر کی حالت کیسی ہے؟" سیتا دیوی نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کی غرض سے اپنے کام میں بھی مصروف رہی۔

"بہت زیادہ خطرناک، میں تم سے یہ درخواست کرنے آیا ہوں کہ تم کوشش کر کے اپنے شوہر کو اس بات پر رضامند کر لو کہ میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔"

"پرماتما رحم کرے" سیتا دیوی نے حیرت و استعجاب کا بے اختیار اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ روئی کے گالے کی طرح سفید ہو گیا۔ "کیا ہاتھ کا کاٹنا لابدی ہے؟"

"اس کا اب اور کوئی علاج ممکن نہیں اور اگر ہاتھ نہ کاٹا گیا تو وہ چوبیس گھنٹے کے بعد ضرور مر جائیگا۔"

یہ سنتے ہی سیتا دیوی کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہو گئے۔ اُس نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتی ہوئی اپنے بیمار شوہر کے کمرے میں لے گئی اور وہاں اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کہا "کیا تم نے مجھے بھی اُن عورتوں میں شمار کر لیا ہے جو لنگڑے لولے کی بیوی ہونے پر صبر کر لیں۔ میں تو شرم سے مر جاؤں گی۔ اِدھر، میری طرف دیکھو" یہ کہتے کہتے وہ اپنے شوہر کی طرف مُڑی اور چیخکر کہا "دیکھنا اسے اپنا ہاتھ ہرگز نہ کاٹنے دینا۔ تم اسکی باتوں پر توجہ ہی نہ دو۔"

بوڑھے زمیندار نے اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا "پیاری! تمہیں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں" اس نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا "یہاں کوئی قصاب نہیں ہے اور نہ کانٹ چھانٹ کرنے کی اجازت ہے۔ اور میں بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔"

ڈاکٹر نے بوڑھے زمیندار کو سمجھانے کی بیحد کوشش کی۔ زندگی کے فوائد اور بے وقت موت کے نقصانات پر مفصل بحث کی مگر بیکار، آخر اس نے اس مطلب کیلئے گاؤں کے نواب کو اور پھر گاؤں کے چودھری اور رامو کے عزیزوں اور دوستوں کو بلا کر اُسے سمجھانے کی تکلیف دی مگر رامو چکنا گھڑا ثابت ہوا۔ کسی کی بات کا بھی اس پر اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ اور اپنا ہاتھ کٹوانے سے صاف انکار کر دیا۔ اہل دیہات جس سکون اور اطمینان سے بغیر روئے دھوئے اور بغیر غم و غصہ کئے سفر عدم اختیار کرتے ہیں بس اسی طرح رامو کا چہرہ اور آواز بھی پورے سکون اور اطمینان کا اظہار کر رہی تھیں۔ اسے موت کا بالکل خوف نہ تھا۔ جیسے اس کے باپ اور دادا اپنے اپنے وقت پر مر گئے اسی طرح وہ بھی مرنے کے لئے تیار تھا۔ ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر نے بوڑھے زمیندار کو خودکشی سے باز رکھنے کی بیحد جدوجہد کی اور اس کی اس قدر منت و سماجت کی کہ بوڑھے زمیندار کے دل پر اثر ہونے لگا۔ اُسے ڈاکٹر کی پریشانی اور گھبراہٹ پر رحم آ رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ ڈاکٹر کو اس کی حالت زار پر اس قدر رنج ہے لیکن بایں ہمہ وہ اپنا ہاتھ کٹوانے کیلئے آمادہ نہ تھا۔ اسی وقت ناگہاں ڈاکٹر کو خیال آیا کہ جہانتک زمینداروں کا تعلق ہے روپے پیسے کے ذکر سے حیرت انگیز کام انجام دئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے کہا "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں خواہ تمہارا ہاتھ کاٹوں یا نہ کاٹوں اپنی مقررہ فیس تو ضرور وصول کروں گا۔ اندریں حالات آپریشن نہ کرانا روپیہ برباد کرنا ہے۔ اور آپریشن کے لئے صرف پانچ منٹ درکار ہیں۔"

"خیر اگر تمہیں میرا اس قدر خیال ہے تو اپنی فیس کے معاوضہ میں کوئی مرہم بتا دو" بوڑھے زمیندار نے کچھ اس قدر اطمینان سے

کہا کہ گویا وہ جوتیوں کا بھاؤ کر رہا ہے۔

ڈاکٹر نے ہر چند کوشش کی کہ رامو آپریشن کرائے مگر لاحاصل۔ آخر وہ مایوس اور شکستہ دل ہو کر مریض کے پاس سے چلا آیا اور پھر کرسے ان معاملات پر خوب غور کرنے اور گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ لینے کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ اس کو اس طرح بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ تھانیدار اور مجسٹریٹ کو مریض کے پاس لے گیا اور اقدام خودکشی کے جرم میں قید کر دینے کی دھمکی بھی دی مگر بے سود۔ اگر ڈاکٹر کوئی تدبیر سوچتا تھا جس سے اُسے کامیابی کی توقع ہوتی تھی۔ تو بھی اس کا مدعا حاصل نہ ہوتا تھا جس کی اہم وجہ یہ تھی کہ کامیابی سے ہمکنار ہونے سے قبل ہی سیتا دیوی اس کی محنت برباد کر دیتی تھی۔ وہ ہر موقع پر دو چار لفظ ایسے کہہ گذرتی تھی کہ رامو کی ضد بڑھ جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے بارہا شیطانی نظروں سے گھورا اور جب برداشت نہ ہو سکا تو چلا کر کہا: "جب مرد مشورہ کر رہے ہوں تو عورتوں کو اپنی زبان قابو میں رکھنی چاہیئے۔"

"ہر گھر میں عورت کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔" اُس نے غصہ سے جواب دیا۔

ڈاکٹر غصہ سے ہونٹ چباتا ہوا باہر آ گیا۔ صحن میں زمیندار کے نوجوان خوبرو اور طاقتور مُلازم سے ملاقات ہوئی جو اس گھر کا ہر کام انجام دیتا تھا۔ "گاڑی تیار رکھنا میں آدھ گھنٹہ میں چلا جاؤں گا۔" ڈاکٹر نے مُلازم سے کہا: "اور اپنی مالکہ سے کہنا کہ میں شام کے کھانے تک نہ ٹھہروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے، اس وقت اُس نے غیر ارادی طور پر دروازہ کے سُوراخ میں سے اندر کی طرف دیکھا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ نوجوان مُلازم سیتا دیوی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی اہمیت اور اپنے شباب کا احساس کرانے کے لئے اس کے قریب آتے ہی اپنا سینہ تان لیا۔ سیتا دیوی نے بھی نوجوان کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ان دونوں کی حرکات و سکنات سے صاف عیاں تھا کہ ان کے سینوں میں محبت کی آگ مشتعل ہو چکی ہے۔ اور ممکن ہے کہ قول و قرار بھی ہو چکے ہوں۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اب اُس کا یہ فرض ہے کہ اس معاملہ کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرے۔ ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایسی عورتیں ضرور ہوتی ہیں جو خود کو عاملہ کہتی ہیں اور اسی وجہ سے ایسی عورتوں کو نوجوان عاشقوں اور معشوقوں کے سربستہ راز معلوم ہوتے ہیں۔ وہ گرفتاران محبت کی مُرادیں پوری کرا دینے کا لالچ دیکر اُلٹے اُسترے سے اُن کو مونڈ ڈالتی ہیں۔ لیکن عشق کا سایہ پڑتے ہی انسان عقل و ہوش کو جواب دے بیٹھتا ہے اور اسی وجہ سے اُن کٹنیوں کے دام بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اسی وقت گاؤں کی کٹنی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اور اُسے اس مقصد میں جلد کامیابی ہو گئی۔ اور اُس نے کٹنی کو چند روپے دیکر کہا: "میں اسی گاؤں کی ایک دوشیزہ کے دامِ محبت میں بُری طرح گرفتار ہوں لیکن وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اب تم مجھے کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ وہ بھی میری محبت کے جال میں پھنس جائے۔"

"آہ! بس یہی تو مشکل ہے۔ تمہاری شکل چڑیل جیسی ہے اور یہاں کی عورتیں ایسی صورت پر جوتی بھی نہیں مارتی ہیں۔"

"یہ صحیح ہے اماں، لیکن میں اُسے اسکی فرمائش کے مطابق زرق برق لباس بنوا دونگا اور جس قدر روپیہ طلب کرے گی دیدونگا۔"

"تو وہ عورت کون ہے؟"

"رامو زمیندار کی بیوی سیتا دیوی۔"

"تم ہر پھول توڑ سکتے ہو۔ لیکن توڑے ہوئے پھولوں پر رال ٹپکانا شرافت نہیں۔"

ڈاکٹر بھی بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"اس پھول کو کس نے توڑا ہے؟" ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

"رامو کے نوجوان ملازم ریوتی سرن نے۔ سیتا دیوی کو بھی اس سے یقیناً محبت ہے کیونکہ وہ یہاں اکثر نوجوان کو قابو میں کرنے کے منتر دریافت کرنے آتی ہے۔ میں نے اُسے حال ہی میں ایک تعویذ دیا تھا کہ اُسے گھول کر نوجوان کو پلا دے"

"اور کیا زمیندار کو اس راز کا شبہ تک نہیں؟"

"مانا کہ وہ جہاندیدہ اور عقلمند ہے لیکن عورتوں کے مکر و فریب پر کب فتح پا سکتا ہے"

جب ڈاکٹر زمیندار کے گھر واپس آیا تو اس وقت بھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ نوجوان ملازم گھوڑے کی پیٹھ پر کھریرا کر رہا تھا اور ڈاکٹر کو اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ سیتا دیوی نے ڈاکٹر کو اپنے قریب بلایا اور دس دس روپے کے آٹھ نوٹ اُسے دیکر کہا کہ "ڈاکٹر! یہ تمہاری فیس ہے"

"بہت بہتر" ڈاکٹر نے جواب دیا "لیکن اے نوجوان عورت تم خود اس بات کی ذمہ دار ہو کہ میں اس نقدی کا زیادہ مستحق نہ ہو سکا"

"میرا ضمیر اسے برداشت کر لیگا۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں"

"اچھا اب میرا سوٹ کیس گاڑی میں رکھدو۔ اور اتنے میں تمہارے شوہر سے مل آؤں"

بوڑھا زمیندار عالم بیخبری میں پڑا ہوا تھا۔ حقہ ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں گویا وہ خواب راحت کے مزے لے رہا تھا لیکن دروازہ کھلتے ہی اُس نے ایک آنکھ کھول کر اوپر کو دیکھا۔

"رامو! اب میں دہلی واپس جا رہا ہوں" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا تم جا رہے ہو؟" زمیندار نے لاپرواہی سے دریافت کیا۔

"ہاں! اور یہاں رہ کر کیا کروں"

"کیا میری بیوی نے تمہاری فیس ادا کر دی ہے؟"

"ہاں! رامو تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ یقیناً بہت ہی دلفریب ہے"

بوڑھے زمیندار نے دوسری آنکھ بھی کھولدی اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"واقعی وہ بہت حسین ہے"

"اس کے نرم اور نشگب ہونٹ شہد سے بھی زیادہ شیریں ہیں"

"اس میں کیا شک ہے" بوڑھا زمیندار اپنی نوجوان بیوی کی تعریف سُن کر حقیقی مسرت سے مُسکرا رہا تھا۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بدمعاش ریوتی خوب ہی عیش اور لُطف کی زندگی بسر کر یگا"

یہ سُنکر بوڑھا زمیندار کانپنے لگا۔ اور اوپر کو دیکھتے ہوئے بولا "ڈاکٹر! تم نے کیا کہا تھا؟"

ڈاکٹر نے فوراً مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ گویا اُس نے غیر ارادی طور پر ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو اُسے ہرگز نہ کہنی چاہیئے تھی۔

"بہت تمہارے کی! مجھے ایسی باتوں سے کیا مطلب خدا نے ہر انسان کو عقل اور آنکھیں عطا کی ہیں۔ وہ خود ایسی باتوں کو دیکھ سکتا

اور اُن کا مطلب سمجھ سکتا ہو۔ جب تمہاری بیوی نے مجھے تمہارا ہاتھ کاٹنے سے روکا تھا۔ تو مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کیا تمہیں شک نہیں؟
.....ہاں میں اب سمجھا..... ٹھیک۔ بالکل ٹھیک ہے

رآمو نے دونوں مٹھیاں بند کر لیں۔ اور ہاتھ ہلانے لگا۔ اسے اس کا بھی خیال نہ رہا کہ اس کا ایک ہاتھ سوجا ہوا ہے لیکن جلد ہی وہ شدت درد سے بیتاب ہو گیا۔

"میرا ہاتھ..... آہ میرا ہاتھ..... ڈاکٹر اس گفتگو کو ختم کر دو"

"مجھے تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حق بھی نہیں ہے"

بوڑھے زمیندار نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر ایک سرد آہ بھری جو قلب کی گہرائیوں سے نکلی تھی "ڈاکٹر! کون ریوتی؟ تمہارا کس ریوتی کی طرف اشارہ ہے؟ وہ کون ہے؟"

"کیا یقیناً تم بے خبر ہو؟ ریوتی سرن، تمہارا نوکر"

بوڑھے زمیندار کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور خون دل کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے مٹا پیشانی پر ہاتھ مارا اور چلا کر کہا "آہ! میں کس قدر احمق ہوں۔ مجھے عرصہ سے اس کا حال معلوم ہو جانا چاہیئے تھا...... عورت واقعی سانپ سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے"

"رآمو! تمہیں اپنی عورت کو بُرا بھلا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ جوان ہے حسین ہے اور تندرست ہے۔ اس کو ابھی زندگی بسر کرنا ہے۔ دُنیا جن ظاہری باتوں کی پرستار ہے وہ اس میں موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی پاکدامن ہو۔ لیکن تمہاری موت کے بعد اُسے شادی کرنا ہی پڑے گی...... اور تمہاری موت میں کوئی شک نہیں ہے"

بوڑھے زمیندار نے کوشش کر کے کروٹ لی۔ اور ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر وہ تمہاری وفات کے بعد کسی نوجوان سے نکاح کر لے تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے" ڈاکٹر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "جب تمہاری ہڈیاں بھی جل کر راکھ ہو جائیں گی تو تمہیں ان باتوں کی کیا خبر ہوگی۔ اس کے علاوہ تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ تمہارے بعد اسے ایک نوجوان اور خوبصورت شوہر ملے گا۔ تمہارا ملازم بہت ہی خوبصورت اور مضبوط نوجوان ہے"

بوڑھا زمیندار دانت پیس رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو دانت آپس میں ٹکرا کر سُرمہ ہو گئے ہیں۔

"رآمو! تمہیں رشک و حسد کی آگ میں جلنے کی ضرورت نہیں۔ کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری موت کے بعد ایسی نوجوان اور اس قدر حسین عورت آغوش محبت میں پیر پھیلائے بغیر فنا ہو جائے۔ تمہارا ملازم احمق نہیں ہے۔ وہ ایسی خوبصورت اور دلفریب عورت کو اپنے جال میں پھنسا کر فائدہ اُٹھائے بغیر رہا نہ ہونے دیگا۔ اس کے علاوہ تمہارے بعد تمہاری بیوی ہی تمہاری دولت اور زمینداری کی وارث ہوگی اس لئے وہ بھی زندہ رہنا پسند کریگی...... رآمو! ان تینوں میں صرف تم احمق ہو"

بوڑھا زمیندار سرد آہیں بھرنے لگا۔ اس کی پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی۔

"رآمو! کیا تمہیں خیال نہیں کہ عورت کو دوسرے کے حوالے کر دینے کے مقابلہ میں اس پر ایک ہاتھ سے ہی حکومت کرنا بہتر ہے"

یہ طعنہ بوڑھے زمیندار کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کا دل رنج وحسد سے لبالب بھرا ہوا تھا اور قریب پھٹ جانے کے تھا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور اس نے اپنا سوجا ہوا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف پھیلا کر کہا۔

"ڈاکٹر! اپنا نشتر لاکر اُسے کاٹ ڈالو"

(پلاٹ ماخوذ) سید محمود مورخ۔ بی اے

دو آتشہ

(اقبال)

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ — ز بیمش زرد مانندِ زریری
بخود باز آ خودی را پختہ تر گیر — اگر گیری پس از مُردن نمیری

(نہال)

اجل کے خوف سے کیوں کانپتا ہے — یہ تیرے مُنہ پہ ہے کیسی اُداسی
شعارِ خودشناسی کر پسِ مرگ — رکھے گی زندہ تجھ کو خودشناسی

(اقبال)

دلِ من روشن از سوزِ دروں است — جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بے گانہ تر باد — کسے کو عشق را گوید جنون است

(نہال)

ہے دل روشن مرا سوزِ دروں سے — جہاں بیں آنکھ میری اشکِ خوں سے
رہے نا محرمِ اسرارِ ہستی — کہے جو عشق کو قسمِ جنوں سے

قیدِ حیات و بندِ غم

ہزار جلوہ در آغوشِ بیخودی ما راست جہاں شعور طلب می کنی، تو خوابِ طلب

اگر سننے والوں کے کان ہوں تو اُن کے لئے ہر صدا میں ایک سبق اور ہر آواز میں ایک عبرت ہے۔ اگر سینے کا وہ اندرونی ٹکڑا جسے "دل" کہا جاتا ہے قساوت سے بے حس ہو کر پتھر نہ ہو گیا ہو تو اُس کے لئے ہر لفظ ایک معنی رکھتا ہے۔ اور دُنیا کے ہر تغیر و انقلاب میں اس کے لئے ایک نصیحت ہے۔

موت! مرنے والے کے لئے بے نظیر رحمت، لازوال خوشی اور ہمیشہ کی آزادی ہے۔ لیکن جو رہ جاتے ہیں اُن کے لئے زندگی خود عذاب بن جاتی ہے۔ کملا ―― جو امر گی قسمت میں لائی تھی۔ اس سے کیونکر بچ سکتی تھی۔ شانتا کی پیدائش گویا کملا کی موت کا پیغام تھا۔

شانتا، شیرخوار حسین بچی دُنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لئے تنہا رہ گئی۔ پریم سنگھ نے جب دیکھا کہ لڑکی کی سنبھال اُن سے مشکل ہے۔ یہ بیل اُن سے منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ ہمیشہ فکر و تردد میں لگے رہتے، خیالات کے سیلاب میں بہے جاتے۔ ایک نرس مقرر کی۔ جو شانتا کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی۔ تاہم، ماں کی جگہ کون لے سکتا ہے؟

شانتا پروان چڑھی اور اب اس قابل ہوئی کہ باپ کا دل بہلائے، اس کا غم غلط کرے۔ باپ کے لئے اس کا وجود دلچسپی کا ذریعہ تھا۔ جس کے بغیر دیکھے پل بھر چین نہ آتا تھا۔ ماہی بے آب ہو جاتے۔ نرس بھی اس پر دل و جان سے فدا تھی۔ شانتا نے ازل سے ماں کی محبت نہ جانی۔ اس کو کیا خبر کہ شفقت مادری کیا چیز ہوتی ہے۔ اور اُس کی محبت کیسی نعمت ہے۔ غریب اس عطیۂ خداوندی سے محروم ہی رہی۔ اُس نے دُنیا میں آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُس کی ماں کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ بادِ حوادث سے دوچار ہونا تو اس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی قسمت میں لکھا تھا۔ کملا نہ مرتی تو شانتا کی زندگی ایک قصہ اور ایک زندہ کہانی کے سانچے میں کیونکر ڈھل سکتی تھی؟

―――― ۲ ――――

وہ سائے درد دل لے چارہ ساز رہنے دے کسی کے دردِ محبت کو راز رہنے دے!

انسان وہی ہے جس میں ہمت اور ارادہ ہے، جس میں حوصلہ اور عزم ہے۔ وہی انسان صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلایا جا سکتا ہے کہ جب وہ ایک کام کا فیصلہ کر چکتا ہے تو پھر پہاڑ اُس کی راہ میں گرد ہو جاتے ہیں۔ لہراتا ہوا سمندر بھی خشک ہو جاتا ہے۔ توپ اور بندوق کی ہولناک آوازیں اس کے کانوں میں صدائے مگس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔!!

پریم سنگھ انسان تو تھے ہی۔ اُن کے انسان ہونے میں کیا شک تھا۔ لیکن جادۂ استقلال سے ہٹے ہوئے۔ انہوں نے دُنیا دکھاوے کو تہیہ تو کر لیا تھا کہ "بس، اب میں شادی نہ کروں گا" یہ وہ "بے جان" الفاظ تھے جو ہر ذی رُوح کے گوشگذار کر دئے جاتے۔ ہر کس و ناکس سے خراج ہمدردی وصول کرتے۔ لیکن کسی میں اتنی قابلیت نہ تھی کہ ان الفاظ

کی تہہ کو پہونچ سکے۔ دنیا میں قول و فعل دو متضاد چیزیں ہیں۔ کر کے دکھانے والا کہہ کہہ کے اپنی بات نہیں کھوتا۔ گرجنے والے ابر برسا نہیں کرتے۔!!

پریم سنگھ فطرتاً اسم با مسمیٰ تھے۔ صاحب جائداد بھی، اُن کے موروثی مکان تھے۔ شہر میں اُن کی چند کوٹھیاں کرایہ پر تھیں۔ بھلا اِس سونے کی چڑیا کو کون چھوڑتا۔ اور چھوڑنا بھی حماقت تھی۔ دوست احباب نے مجبور کیا۔ لڑکی کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلائی۔ گھر کی آبادی کا خیال پختہ کر دیا۔ یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ امتدادِ زمانہ نے پریم سنگھ کا چار سال سے اُجڑا ہوا گھر از سرِ نو آباد کیا۔

۳

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

"وفا" میں دنیا سے بھی زیادہ ناپائدار ثبات پنہاں ہے۔

کملا کی یاد اب بھولے سے بھی نہیں آتی جس کے ساتھ تین سال کا زمانہ بڑے چاہ و پیار سے گذارا تھا۔ اب اسکا خیال تین سکینڈ کے لئے بھی نہیں آتا۔ جس کی تصویر ہمیشہ پیشِ نظر رہتی تھی اُس کا تصور بھی اب بارِ خاطر تھا۔ کہاں؟ دنیا میں آخر کس چیز کو ثبات ہے؟ ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شانتا جو محبت و شفقت کا مرکز تھی۔ اب درگا کے نئے وجود نے قریب قریب اس سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ درگا کے سامنے شانتا سے بات بھی بمشکل ہوتی۔ پیار کی باتیں تو درکنار ــــ!

ایک شام، پریم سنگھ ذرا قبل از وقت دفتر سے آ گئے۔ درگا اشنان کر رہی تھی۔ شانتا دوڑتی ہوئی آکر باپ سے لپٹ گئی۔ پریم سنگھ آخر باپ تھا۔ محبتِ پدری نے جوش مارا۔ فرطِ اُلفت سے بیتاب ہو گئے۔ شانتا کو حسبِ دستورِ (قدیم) گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کی آنکھوں کو چومنے لگے: "شانتا ــــ بیٹی تو اب بڑی ہو گئی ہے۔ تجھے یوں پڑا پھرنا نہیں چاہیئے۔ اچھی لڑکیاں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اُس کے کام کاج میں مدد کرتی ہیں۔ درگا تیری ماں ہے۔ تیری پیدائش کے بعد وہ تیرتھ کے لئے چلی گئی تھی۔ تو تو اس کو بھول بھی گئی ہو گی؟۔ ارے تیرے کپڑے دیکھ کس قدر میلے ہو رہے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس سے ملتفت تھے۔ باپ بیٹی میں درگا کی غیر موجودگی میں وقتاً فوقتاً یہ راز و نیاز ہوتے رہتے تھے۔ پریم سنگھ چاہتے تھے کہ شانتا کے دل میں درگا کی محبت ماں کی محبت کی شکل میں ڈھالیں۔ چنانچہ درگا سے بھی اُن کی یہی خواہش تھی کہ وہ شانتا سے محبت کرے۔ لیکن ــــ بیوقوف انسان ــــ محبت کوئی زبردستی کا سودا ہے؟ جو کہہ سُنکر زبردستی ایک کے دل میں پیدا کریں۔ اور نہ محبت اک طرفہ ہوتی ہے۔ درگا بظاہر خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ لیکن اُس کا دل؟ اس میں کیا خیالات تھے؟ خدا معلوم!!

بالعموم، ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے۔ چنانچہ جب پریم سنگھ نہ ہوتے درگا کا سلوک ہی اور ہوتا۔ شانتا آج باپ کو ضرورت سے زیادہ مہربان دیکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ پریم سنگھ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ شانتا کے قبل

اس سے کہ باپ کی باتوں کا جواب دے اس کی آواز ہچکیوں میں تحلیل ہو کر عرش کے کنگروں کو ہلا دے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن　　　اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ابھی پریم سنگھ شانتا سے مصروفِ کلام ہی تھے کہ درگا اشنان کر کے آگئی۔ اُن کے چند متفرق جملے بھی اُس کے کان میں پڑ گئے۔ جس پر وہ بہت برافروختہ ہوئی "لو جی۔ میں کیوں ہوتی اس کی ماں۔ وہ تو مرگئی، واہ دیکھا آپ کی محبت میرا شمار بھی آج مُردوں میں کرلیا۔ پھر سونے پر سہاگہ لڑکی کو ابھی سے جھوٹ کی تعلیم دیتے ہو۔ کل کو لوگ کہیں گے، دیکھا سوتیلی ماں کی صحبت میں لڑکی نے جھوٹ بولنا سیکھا۔ اور پھر تمہیں ذرا لحاظ نہیں آتا جو اتنی سیانی لڑکی کو گود میں لئے کھڑے ہو۔"

درگا یونہی اپنی دل کی آگ بجھاتی سلگاتی رہی۔ پریم سنگھ کو اس کی یہ جاہلانہ بے موقع گفتگو بہت ناگوار گذری۔ وقت اور موقع کا مقتضا بھی یہ تھا کہ وہ بچی کو گود سے اتار کر بغیر کچھ جواب دئے باہر چلے گئے!۔

اکثر یہی ہوتا۔ درگا میٹھی رہتی اور سارے دنیا کے کام شانتا سے لیتی۔ باپ کی موجودگی میں کم، غیر موجودگی میں بےحساب۔ جو نہ کرنے کا ہوتا، جو اُس کی بساط سے باہر ہوتا۔ غرض لینے دینے سبھی کام اس بن ماں کی بچی سے لئے جاتے۔ کھانا کھاتے وقت جب دکھائی نہ دیتی، تو ماں جھوٹے منہ نہ پوچھتی۔ اسے ماں کہلانے سے عیب لگتا تھا۔ باپ اگر اتفاق سے اس کو یاد کرتے تو بس غضب ہی ہو جاتا۔ "آپ اور آپ کی صاحبزادی بیٹھ کر کھا لیجئے۔ بندی کو اس وقت بھوک نہیں" کہتی ہوئی صاف اٹھ جاتی۔

پریم سنگھ کو ان بے جا ناز برداریوں نے زن مُرید بنا دیا تھا۔ کبھی پریم سنگھ نہ ہوتے تو اس غریب پر آسمانِ ستم ٹوٹ پڑتا۔ بدزبانی کی ابتدا دست درازی کی انتہا پر ختم ہوتی۔ شانتا اس مظلوم پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی جو کسی شکاری پرندے کے پنجۂ ستم میں گرفتار ہو۔ اور زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔ اس سہمی ہوئی بچی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کو اس روز سے باپ سے بات چیت کرنے کی پھر ہمت نہ ہوئی۔ پیار کی باتیں، ہمدردی کے الفاظ، گود میں لینا تو اب خواب و خیال ہو چکا تھا۔ پریم سنگھ دیدہ و دانستہ لڑکی سے آنکھ چراتے تھے۔ کہ کہاں اس سے دو باتیں کروں۔ اور اسے بیٹھ کر پہروں مناؤں۔

(۴)

ع۔　　پروانۂ چراغِ حرم و دیر نداند

صداقت افسانہ سے زیادہ تعجب خیز ہے!

ماں کی محبت سے تو قسمت نے محروم کر ہی دیا تھا۔ اب شفقتِ پدری بھی شجرِ ممنوع کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس طرح آسمان سے نیلا رنگ کوئی چھین نہیں سکتا۔ خواب قابو میں آ نہیں سکتے۔ اسی طرح درگا شانتا سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک جاہل کندۂ ناتراش عورت تھی۔ اُس کا دل پتھر سے زیادہ سخت تھا۔ وہ بھی صاحبِ اولاد ہو چکی تھی۔ قُدرت کو عدل و انصاف منظور تھا۔ ہاں ـــــ تو اب والدین کی ساری محبت کا ملجا و ماوا "پاربتی" تھی۔ اماں خوب وارے نیارے جاتیں۔ باپ نچھاور ہوتے۔ پاربتی آنکھوں کا تارا، قلب کا سکون دل کا چین تھی۔ تو شانتا سوہانِ رُوح!۔

نرس نے پاربتی کے اجلاس کا جائزہ لے لیا ہے۔ اور پاربتی صرف گودوں میں پل رہی ہے۔ باپ نے جھولے پر ٹہلا کر ماں نے اٹھا لیا۔ ماں کی آغوش سے نکل کر نرس کیلئے وبالِ دوش بنی۔ اب کسی کو اعتراض نہ تھا۔ اب تو خیر اگر پاربتی

دس برس کی ہو کر بھی گھوڑوں میں سوار ہو تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ اُس کی ماں زندہ ہے۔ افسوس ایک ماں کا نہ ہونا اولاد کیلئے کیا ستم ہے۔ ادھر اس غریب کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ پہلے کھانے پینے کی باپ خبر لے لیا کرتے تھے، نرس بھی نگرانی کرتی تھی۔ اب تو بیری ہوگئی تین کے مصداق کسی فرد بشر کو اسکی فکر نہ تھی۔

(۵)

بے پر و بالی پہ غش ہوں کہ یہ ہمدم ہیں رفیق
تھی پر و بال ہی تک ہم سے وفائے پروانہ

پریم سنگھ جس مکان میں رہتے تھے یہ کملا کے والدین کا مکان تھا۔ کملا اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے والدین کے بعد یہ اس کی تنہا وارث تھی۔ اس میں اکثر درخت کملا نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے۔ لڑکپن سے اس کو باغبانی کا شوق تھا، ایک سُرخ پھولوں کا درخت، جس کو ہندوستان میں "گل مہر" یا "سنکیسر" کہتے ہیں اس کا محبوب ترین درخت تھا جس پر جھولا ڈالکر کملا اکثر جھولا کرتی تھی۔ اُس کے اطراف اُس نے مختلف قسم کے گملے جا لئے تھے۔ چاندنی راتوں میں اسکی چھوٹی سی یہ خوشنما کیاری عجب بہار دیتی، کہ غالب پر ایمان لانا پڑتا ہے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

شانتا کو جب گھر گرہستی سے ذرا بھی فرصت ملتی اس کو اس کیاری کی کشش وہاں لے جاتی جس کو اس کی ماں کے ہاتھوں نے سینچا تھا۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ جھولے میں بیٹھکر بڑی بڑی پینگیں لیتی۔ اس کا دل یہاں ایسا بہلتا کہ کچھ عرصہ کے لئے وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔!

یہی ایک جگہ تھی جہاں آنے سے درگا کے پر جلتے تھے۔ اس کو جھولے سے چکر آتا۔ کسی کو جھولا جھولتے دیکھ کر اُس کا سر چکرانے لگتا۔ چنانچہ اس کا خبیث پہرا اس درخت کے پاس نہ ہوتا۔ یہاں غریب شانتا آزادی کے چند سانس بھی لینے نہ پاتی کہ درگا کی خونخوار درندے کی سی ہیبت آواز اس کو اس چشم زدن کے خوش آیند لمحات سے بچھڑا دیتی۔ اس کا معصوم دل سینہ کے اندر پھڑپھڑانے لگتا۔

شام کا سایہ بڑھکر رفتہ رفتہ غائب ہو چکا ہے، کہ شانتا کے کانوں میں یہ فقرہ نشتر بن کر کھٹکنے لگا، "شانتا ساری او چھوکری تو کہاں چلی جاتی ہے جو بار بار مجھے چیخنا پڑتا ہے" ایک سہمے ہوئے ہرن کی مانند آنسوؤں کو خشک کرتی، دامن سنبھالتی، شانتا گھر کی طرف باغ سے بوئے گل کی طرح نکل جاتی ہے۔ اور اس کمرہ میں داخل ہوتی ہے جہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔ سب کھا چکے ہیں۔ صرف برتن وغیرہ اُٹھانے کی اٹل ضرورت نے شانتا کی یاد دلا دی۔ حیات کے یہ مسلسل جھٹکے، اتنی سی جان پر گھریلو زندگی کا بوجھ، غرض یہ ایک بیل تھی جو سوکھتی چلی تھی۔ جس کی خشکی و پامالی کا کسی فرد بشر کو احساس نہ تھا۔ جس کو بامراد دیکھنے کی کسی کو تمنا نہ تھی۔ جس کے ارمانوں کا جنازہ اسکی ماں کیساتھ نکل چکا تھا۔

(۶)

غالبؔ۔ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

رات کے ہیبت سایہ نے شانتا کے باغ کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ باغ ایک قبرستان کی طرح سنسان ہے،

کچھ دور فاصلہ پر ستیش کے مکان کی برقی روشنی نظر آرہی ہے۔ جو اس خوفناک تاریکی کے تسلسل کو کبھی کبھی اپنے پرتو سے منتشر کر دیتی ہے۔ شانتا کا عنفوانِ شباب تھا۔ اس کا وہ لڑکپن جس میں وہ اپنی سوتیلی ماں کی ضرورت سے زیادہ خدمت کرتی تھی۔ جس کا ہر لمحہ اُس کے خوف و ہراس میں کانپتا رہتا تھا جس کے ہر ادنیٰ سے اشارہ پر یہ اپنا سرِ تسلیم خم کر دینا باعثِ ادب سمجھتی تھی۔ اب یہ خیالات اس کو بچہ وابیات سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسکو ذمہ داریوں کا احساس ہو چلا ہے۔ سنِ شعور نے بتدریج ساری نادانیوں، بالے پن کی کمزوریوں پر قبضہ کر لیا ہے۔

احساسات شدت سے پختگی کا جامہ پہنتے جا رہے ہیں۔ ستیش شانتا کا بچپن کا منگیتر ہے۔ جبکہ درگا کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ دونوں مکان قریب قریب تھے۔ ستیش اکثر شانتا سے کھیلنے آیا کرتا۔ لیکن درگا کی آنکھوں میں یہ بھی خار بن گیا۔ وہ یہ چاہتی ہی کب تھی کہ دُنیا میں کوئی متنفس ایسا نکلے جس کو شانتا سے محبت ہو۔ جس نے باپ کی محبت میں رخنہ ڈالا اس کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ کوئی خانہ اِنی لڑکا شانتا کا گرویدہ رہے۔ چنانچہ اُس نے دونوں طرف آگ لگائی۔ اِدھر پریم سنگھ کے دل میں آئندہ کی تصویروں کو ہیبت ناک رنگ میں ڈھالا۔ اِدھر ستیش کے والدین کو ورغلایا۔ حالانکہ ابھی شانتا دس بارہ برس کی ہی تھی کہ جال بچھا دیا۔ غرض ہر طرح مٹی پلید کی۔ باپ کی شفقت سے محروم ہوئی۔ ستیش سے کھینا گیا۔ شانتا انسان تھی۔ اس کے سینے میں ایک شریف دل تھا۔ اس کو یہ کب گوارا تھا کہ وہ چوری سے ستیش سے ملے۔ اس کا دل درگا کی ذلیل حرکات سے بہت پُر تھا۔ مہینوں اُس کے لب نا آشنائے تبسم رہتے۔ قہقہہ مار کر ہنسنا تو اس کے لئے قسمت سے ودیعت ہی نہ ہوا تھا۔ ایک ستیش تھا جس سے اُسے محبت تھی۔ لے دے کے وہی مونس و رفیقِ زندگی معلوم ہوتا تھا۔ یوں تو دُنیا میں کوئی اس کو "اپنا" سمجھنے اور کہنے والا نہ تھا۔

اس رات یہ بہت بے چین تھی۔ اس کو پہر رات گئے نیند نہ آئی۔ آخر قدرت بھی اُس کے تھکن سے چور چور اعضا پر مہربان ہوگئی۔ اور وہ سو گئی۔ صبح آنکھ نہ کھُلی، دن چڑھ گیا، اکثر —— ہمیشہ —— جو سب سے پہلے بیدار ہوتی تھی —— آج اتفاق سے محوِ خواب ہے۔ اس کو اس بُری طرح جھنجوڑ کر اُٹھایا جاتا ہے۔

"تمہیں سونے کے سوا دوسرا کام بھی ہے؟ ایک رانی کی طرح پڑی جو سو رہی ہو! یہاں کام کاج تمہارا سب کون کرے۔ برتن سب بغیر دُھلے پڑے ہیں۔ روٹی پکانی باقی ہے۔ بچوں کا مُنہ کون دُھلائے۔ پھر گیہوں بنانا، پیسنا، آٹا چھاننا۔ یہ سب کون ہے کرنے والا؟ تمہیں شرم نہیں آتی اتنی سیانی ہو کر جو پڑی سوتی ہو"—— اتنی ساری بے معنی، مہمل بکواس کا جواب ہی کیا تھا؟ دل چھلنی، کلیجہ پاش پاش، آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں۔ سب کا دل دل ہے۔ کسی کا پتھر کا۔ کسی کا موم کا نہیں ہوتا۔ آج اگر درگا کو کوئی ایسی ساس ملتی جو اس کو جا و بیجا یونہی دل دُکھا کر اس سے کام کاج لیتی تو اس کا دل اس وقت کیا کہتا۔ کیا وہ ان الفاظ کو برداشت کر سکتی تھی۔؟

دُنیا میں چین و آرام، دولت و مال مہیا نہیں کر سکتے۔ دل کا چین۔ رُوح کا آرام اصل راحت ہے۔ درگا کے ناپاک وجود نے نسوانیت پر داغ لگا دیا تھا۔ وہ ایک شقی القلب قاتل تھی۔ اس کے پہلو میں دل تھا لیکن دردِ خالی، احساس سے اجنبی، رحم سے بیگانہ۔

شانتا اُٹھکر اپنی ساری ذمہ داریوں کو سرانجام دیتی ہے۔ اس کے حالِ زار پر ترس کھانے والا کون ہے! سوائے منصفِ حقیقی کے!!

وہ تمام تمام دن گھر کے دہندوں میں گرفتار رہتی۔ شام ہوتی اور وہ سستانے کیلئے ذرا باغ کی طرف نکل جاتی۔ اسی طرح اسکی صبح ہوتی تھی ـــــ اور شام بھی آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوئی رخصت ہوجاتی تھی۔

(۷)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دن بھر کی تھکن سے چُور ہوکر شانتا باغ کے ایک گھنے درخت کے تنے سے لگی بیٹھی ہے۔ اس کو آج دُنیا بھر کے تصوّرات نے مضطرب سا کر رکھا ہے۔ اس کو ماں کا خیال رہ رہکر بے چین کئے ہوئے ہے۔ کبھی وہ پاربتی، شکنتلا اور پریا کے لاڈ پیار اُن کی ماں کے ساتھ دیکھتی ہے۔ اس کو اپنی ماں یاد آتی ہے۔ پاربتی اب بھی اتنی سیانی ہوکر اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر لٹک جاتی ہے۔ باپ کے گلے کا تینوں ہار بنی رہتی ہیں۔ شکنتلا و پریا تو بسم اللہ کے گنبد میں پل رہی ہیں۔ ایا ایک سے بڑھکر ایک کا ناز اُٹھتا ہیں۔ اِدھر اُن لوگوں نے کوئی فرمائش کی اُدھر پوری ہوگئی۔ تینوں میں سے ایک بھی ذرا نظروں سے اوجھل ہوئی کہ کیسے بے چین ہوکر ایک ایک کو پوچھتے ہیں۔ میری طرف تو ایک نگاہ بھی اُٹھانی قسم ہے۔ وہ انہیں خیالات میں غرق اپنی بچھڑی ہوئی ماں کے تخیل میں کھوگئی ہے۔ جس کو مشکل سے ایک گھنٹہ گذرا ہوگا۔ آفتاب اسکی بے کسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے رُخصت ہوچکا ہے۔ کہ شانتا، شانتی کی مسلسل چیخیں آنے لگیں۔ پاربتی پکارتی، تو درگا چیختی ـ وہ چُپ ہوتی کہ شکنتلا چلاتی۔!

یہ جواب دینا چاہتی ہے لیکن گریۂ گلوگیر نے اس کی آواز سلب کرلی ہے۔ اس کی نیازمندیوں نے اب رفتہ رفتہ بے نیازیوں اور لاپرواہیوں کی شان اختیار کرلی ہے۔ انسان جب زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے تو پھر اس کو کسی بات کا خوف و خطر نہیں رہتا۔ اس کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہوگیا تھا۔ دُنیا میں نازبرداروں کی گھُرکیاں، جھڑکیاں سُننا امرِ محال ہے۔ یہاں تو کوئی چار صلواتیں سُناکر پاس کھینچنے والا بھی نہ تھا۔

"او سارے جہاں کے مالک! کیا (ع) دن گِنے جاتے تھے اس دن کے لئے؟ اے پرماتما! یہ لوگ آخر میرا کیا بگاڑینگے؟ بہت کریں گے جان ہی لیں گے نا؟ اچھا ہے جو کمبخت جان چلی ہی جائے، قصہ پاک ہو۔ یہاں زندگی کی کس کو تمنا ہے۔ مگر پھر (ع)۔ مرکے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے؟"

یوں ہی دل سے مخاطب ہوتی ہوئی درگا کی درگاہ میں پہونچتی ہے "آماں ـــــ میں صرف گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لئے کیاریوں میں چلی گئی تھی کہ کچھ دیر دم لوں، کھُلی ہوا میں ذرا دل بہلاؤں۔ کہ آپ اس طرح پکارتی ہیں جیسے میں دو پہر سے کہیں دور نکل گئی"

"کیا صرف آدھ ہی گھنٹے سے تو وہاں ہے؟" چین بجبیں ہوتے ہوئے "شاید دُنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو وقت کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ آخر کیا باغ میں ہی ہوا ہے گھر کے اندر اس کا گذر نہیں۔ جو آپ ہواخوری کرنے وہاں نکل گئی تھیں۔ یہاں میم صاحبہ کا شاید دم گھُٹ رہا تھا۔ یہ کیوں نہیں صاف صاف کہدیتی کہ آتش سے جلنے گئی تھی۔

اس کی موجودگی میں تجھے وقت گذرتا معلوم نہیں ہوتا۔ گھڑیاں گذر جائیں تو تجھے وہ گھنٹہ یا نصف گھنٹہ ہی معلوم ہوگا۔"

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا ایک حسّاس انسان کے لئے جہنم کے عذاب سے کم نہیں۔ درگا کی اس فضول کمینی تقریر نے شانتا کے مجروح و ستم رسیدہ دل کو جو تکلیف پہنچائی اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ لیکن جس کا حساب پاک ہو اس کو محاسب سے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا؟ شانتا نے برملا کہدیا کہ "میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ نہ میں ستیش سے ملی نہ اُس کو دیکھا۔ جب تم نے ایک مرتبہ اس کو صاف صاف کہدیا کہ وہ یہاں نہ آئے تو کیا کوئی خوددار انسان اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ پھر وہ اس گھر میں قدم رکھکر اپنی عزت گنوائے؟"

وہ چاہتی تھی کہ آج ہی فیصلہ ہو جائے۔ جان جائے یا رہے۔ کیونکہ آج اس کا دل اندر ہی اندر اس کو کسی آنیوالی مصیبت کی خبر دے رہا تھا۔ اُس کو دنیا سے ایک بیزاری کا احساس ہو رہا تھا۔ کسی کام، کسی خیال، کسی مشغلہ میں اس کا ذہن نہ بٹتا تھا۔ "اوہو۔ کل کی چھوکری مجھ سے زبان درازی تو دیکھو۔ اللہ رے خوددار انسان! بہت بڑا خوددار۔ ستیش کو تجھ سے زیادہ میں جانتی ہوں۔ بیکار محض، نکما۔ جیسا تیرا ستیش ہے۔ ویسا ہی تو ہے نا کہ ایک بار کے کہنے سے نہ آئے گا۔ بڑا عزت والا۔ صاحب توقیر۔ خوددار۔ ایک تو ہے اور تیرا ستیش۔ بڑی اس کی طرفدار نکلی ہے۔ جاؤ جہنم میں تم دونوں۔ مجھے میرے کام سے کام ہے۔ کل کے لئے کچھ چیزیں تیار کرنی ہیں۔ مٹھائیاں بنانی ہیں۔ ہوا تو آپ کھا چکیں۔ اب ذرا باورچی خانہ میں ٹہل آئیے!"

انسان میٹھی زبان اور محبت سے دلوں کو تسخیر کر سکتا ہے لیکن ایسی کڑوی کسیلی باتیں، طعن و تشنیع دلوں کو سنگ پاروں کی طرح پاش پاش کر دیتا ہے (ع) دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

"کل کیا کچھ تیوہار ہے؟ صبح اُٹھکر سب چیزیں تیار کر دوں گی۔ صبح سے شام تک تم جتنا کام چاہو مجھ سے لے سکتی ہو۔ شام میں میری حالت مُردہ سے بدتر رہتی ہے۔ مرجاؤں تو کوئی رونے والا بھی نہیں۔ صحت سے رہونگی تو تمہاری خدمت بھی کر سکونگی۔ یہاں صحت ہی کے لالے پڑے ہیں!"

"وہ تو ہے نا کچھ مثل مشہور۔ روتے کیوں ہو تو کہا صورت ہی ایسی ہے۔ ہوا خوری جو کر آئیں۔ آزادی جو اپنی نصیب ہے، پھر صحت کے لالے پڑے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔ اُونٹنا جلنا تو جنم کا ساتھی ہے۔ ماں باپ بھی جنم کے ساتھی ہیں کرم کے ذمہ دار نہیں۔"

"ماں سچ ہے تم کیا کرو گی۔ کرم جو پھوٹے ہیں۔ روتی صورت نہ کہلائیں تو کیا ہو۔ ایک دن جو ہنسی تھی اسدن تم نے کیسا بُرا مُنہ بنا کر کہدیا "کیا پڑا ملا جو باچھیں کھلی جاتی ہیں؟" تم کہہ کر بھول گئیں۔ مجھے یاد ہے۔ میرا ہنسنا بولنا پسند کس کو ہے جو ہنسوں بولوں۔"

جب یہ تُرکی بہ تُرکی جواب ملا تو قلعی کھلی۔ اور کہنے لگی "مٹھائی کی ضرورت کل صبح کے لئے ہے۔ اگر آج ساری رات بھی اس کی تیاری میں لگ جائے تو مضائقہ نہیں۔ کل علی الصباح دولہا اور اُس کے سارے براتی آئیں گے۔ اور تو وہی رٹے جاتی ہو کہ کل صبح ــــ خوب!!"

"دولہا اور اُس کے براتی ۔۔۔؟ کون دولہا؟ کس کی بارات؟"

"پاربتی کا دولہا ۔۔۔ اور کس کا؟ تو سمجھتی ہے کہ تو جو بیس برس کی ہوگئی اور بَر نہ نصیب ہوا۔ تو کیا میری لڑکیاں بھی اسی طرح بیٹھی رہیں گی؟ نوج جو تیری کسی پر پرچھائیں پڑے۔ ایشور نہ کرے جو میری لڑکیاں بھی اس سن کی ہو کر بیٹھی رہیں!"

شانتا کے بھرے زخم میں ایک نشتر لگا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کو ماں کی یاد نے پھر تڑپا دیا۔ ہائے کاش میری ماں بھی آج زندہ ہوتی۔ تو کیوں میرا یہ حشر ہوتا۔ اگر میں بیس نہیں چالیس برس کی بھی ہو جاتی تو اس پر وہ بھر نہ ہوتی۔ اس کو بھی میری شادی کی ایسی ہی تمنا ہوتی۔ آج اس طرح نشانۂ ملامت کوئی کون بناتا؟ لیکن، یہ دولہا کون ہوگا؟ یہ سوال پھانسی بن کر حلق میں پھنس گیا۔ اس کی زبان نے یاری نہ دی۔ اس سوال کی اذیت نے قلب میں ناسور ڈال دیئے۔!!

(۸)

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

پریم ناتھ کا گھر بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ بارات کی دُھوم، نوبت نقارے کی آواز نے سارے محلہ کو سر پر اُٹھا لیا ہے۔ پھولوں کے خوبصورت کونڈوں سے چمن آراستہ کیا گیا ہے۔ درختوں میں برقی روشنی لگا کر سارے گلستاں میں آگ لگا دی ہے۔ پریم ناتھ اور درگا بائی مارے خوشی کے پھُولے نہیں سماتے۔ ان کی بڑی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے تو اُن کی مسرت کا کیا ٹھکانہ۔ خدا نے مدتوں کی آرزو پوری کر دی۔ پاربتی کے ہاتھ پیر مہندی سے لال ہو رہے ہیں۔ زر و زیور سے اس کو خوب لاد دیا گیا ہے۔ شادی کا شہانا جوڑا بہت پُر تکلف اور ٹھاٹھ کا رکھا ہوا ہے۔ دوسری دونوں لڑکیوں کے لئے بھی کپڑے بنے ہیں۔ لیکن ایک بن ماں کی بچی ان سب عنایات و الطاف سے محروم ہے۔ اس کے لئے ایک مستعمل جوڑا رکھ دیا گیا ہے۔ کہ وہ پکوان سے فارغ ہو کر اشنان کر کے پہن لے۔ اس کے بھی باپ کی کمائی تھی۔ اولاد کی حیثیت سے تو سب برابر تھے۔ انصاف شاید اسی کا مقتضی تھا ۔۔۔ جو ہوا ۔۔۔ اور جس کو کر کے کوئی پشیمان بھی نہیں۔ لیکن اگر ایسے ادنیٰ گھٹیا درجہ کے لوگوں میں انصاف کا بول بالا ہو جائے تو پھر منصفِ حقیقی کا عدل کہاں جائے؂

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شانتا نے بارات کی دُھوم، نوبت کی آواز سُن کر چاہا کہ دیکھے۔ باورچی خانہ سے لپک کر اس کی کوشش کی کہ کسی طرح ایک نظر دیکھ لے۔ لیکن چاہنے والی اماں نے باہر سے دروازہ ہی مقفّل کر دیا تھا کہ شاید اس کی نظرِ بد لگ جائے۔ نصیبہ کی گردش، قسمت کے پھیر نے سب ہی دروازے بند کر دیئے تھے۔ اس کو دیکھنے میں کون سرخاب کے پر لگے تھے؟ شانتا کا دل آج کچھ انوکھے انداز سے اس کو بے چین کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے، نامعلوم سی خلش نے اُس کو مضطرب بنا دیا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اچانک اُس کی نگاہ دروازے کے ایک خفیف سے روزن پر پڑی۔ اور اسی سوراخ نے اُس کی رہنمائی کی۔ اس نے تقریباً گھنٹہ بھر تک دیکھتے رہنے کے ایک آہِ سرد بھری۔ ۔۔۔ ایسی آہ ۔۔۔ کہ اگر آج کل کی آہوں میں کچھ اثر ہوتا تو اس کی اس دلدوز آہ سے سارا سنسار جل کر بھسم ہو جاتا۔

اُس نے ایسا کچھ دیکھا کہ پھر اس کا دل نہ چاہا کہ دُنیا میں اور کسی چیز کو دیکھے۔ ایک ٹیس نے سارے جسم میں جھنکار ڈال دی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کو تشنج کے سے دورے ہونے لگے۔ جیسا کہ اپنے ہی ستونوں کو مرتفع تختہ بن گئی ہے۔! آہ ـــ کیا دُنیا سچ مچ اتنی غدار و بیوفا ہے؟ کیا اس کا کچھ بھروسہ نہ کرنا چاہیئے؟ لیکن کیا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں؟" اس وقت اس کا دل، اس آئینے کے ٹکڑے سے زیادہ پاش پاش تھا جس کو کسی شیشہ میں بال آگیا ہو جسے پتھر پر پٹک دیا ہو۔ اور اُسکے ذرّے ہر طرف دیوانہ وار منتشر ہو گئے ہوں!!۔

لیکن پھر کچھ دیر کے لئے اُس کا دماغی ہیجان اس کو اس نکتہ پر لاتا: نہیں ـــ آپا نے مجھے صرف ایک ناگہانی مسرّت سے دوچار کرنے کی ٹھانی ہے۔ اچھا ہوا جو میں نے دیکھ لیا۔ ورنہ شادی مرگ کی نوبت پہونچتی۔ لیکن پھر وہ معاً اُس خوشگوار تخیل، اِس پُر لطف تصوّر کو دل سے محو کر دیتی ہے۔ جس طرح ایک بچّہ کسی حسین چیز سے کھیلے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کو بھول جائے!!۔

۹

کہتا ہے کون نالۂ بُلبُل کو بے اثر ۔۔۔ پردہ میں گُل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پاربتی آئینے کے سامنے کھڑے خود کو سنوار رہی ہے۔ بہت پُر تکلّف لباس میں ملبوس۔ زیورات سے لدے ہوئے۔ یہ خود کو آئینہ میں دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتی۔ ایک کامیابی کی مسرور مُسکراہٹ اس کے لبوں پر مرتعش ہے۔ چند لمحوں میں دُلہن کہلانے کا تصوّر اُس کو مغرور بنائے ہوئے ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہتی ہے "ساری دُنیا میں جو ملتا ہے کہتا ہے، شانتا سب سے حسین ہے۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے رہتی ہے۔ تمام دن چولھے میں گھُسے رہنے سے اس کا رنگ بھی کس گیا ہے لیکن اس پر بھی محلہ بھر میں اُسکے حُسن کا شہرہ ہے۔ اب بتاؤ گی کون حسین ہے، پاربتی یا شانتا ـــ!!

وہ ان ہی تخیلات میں مگن، فرعونِ بے ساماں بنی ہوئی ہے۔ وہ آج خود سے بڑھ کر خوش نصیب کسی کو نہیں سمجھتی ـــ!!

دولھا مسند پر بیٹھا ہے۔ چاروں طرف سے اس کو برہمن اور پروہتوں نے گھیر لیا ہے۔ مقدس آگ روشن ہے، جس کے دُھوئیں نے اُس کی آنکھیں سُرخ کر دی ہیں۔ انجام کار وہ مبارک و مسعود گھڑی آتی ہے۔ پاربتی کی زندگی میں سب سے زیادہ مسرّت انگیز وقت وہ ہوتا ہے جبکہ وہ اس مقدس آگ کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ دولھا کی آنکھیں چاروں طرف کسی مانوس چہرہ کی متلاشی ہیں۔ پروہت کی مجبور کُن صدا سارے ہال میں گونجتی ہے:۔

"دُلہن کے گلے میں اس مقدس دھاگے کو باندھ کر گرہ دو!" لیکن دولھا متعجب نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اُسکو ایک اچنبا سا ہوتا ہے۔

"لیکن کہاں ہے دُلہن جس کو دھاگہ پہنا کر باندھا جائے؟"

"دُلہن تو تمہارے سامنے کھڑی ہے!"

"لیکن یہ تو پاربتی ہے۔ میری دُلہن نہیں۔ شاید کچھ غلطی ہو گئی ہے!"

کمرۂ عروسی میں ایک مُردنی سی چھاگئی۔ ساری محفل سرگوشیوں کا مُرقع بن گئی۔ کوئی کچھ کہتا۔ کوئی کچھ، کس کس کی زبان پکڑتے؟ کس کو رُوک سکتے تھے؟

خود پریم ناتھ سارے مجمع کو منتشر کرتے نوشاہ کے قریب آتے ہیں: "یہ تم کیا کہتے ہو ستیش؟"

"کیوں کیا آپ نے اپنی بڑی لڑکی دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

"ہاں ـــ تو؟ پاربتی میری بڑی لڑکی ہے۔ پھر اب کون امر مانع رہا؟"

"نہیں۔ پاربتی آپ کی بڑی لڑکی کیسے ہوسکتی ہے۔ شانتا آپ کی بڑی لڑکی ہے" ستیش نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تم غلطی پر ہو۔ جب تم سے میں نے "اپنی" (زور دیتے ہوئے) بڑی لڑکی دینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ یقینی پاربتی ہوسکتی ہے۔ شانتا تو خارج از بحث ہے۔ اس کی تو گنتی ہی نہیں۔ اب جب کہ تم یہاں تک نوشاہ کی حیثیت سے آچکے ہو تو انکار نہیں کر سکتے"

ستیش کا باپ بول اُٹھا "دیکھئے جناب میرا لڑکا چونکہ اس واقعہ سے قطعی لاعلم تھا معلوم ہوتا ہے یہ نسبت دانستہ کی گئی ہے۔ آپ کو ہزار روپے ہرجانہ دینے ہونگے!!"

"بس؟ کیا اتنے ہی؟ میں دینے کیلئے تیار ہوں۔ ستیش بابو کیا اب رضامند ہیں؟"

"جناب میں کسی طرح پاربتی سے عقد نہیں کر سکتا۔ اوہ ناممکن، قطعی ناممکن!!"

"لیکن ایسی غلطیاں تو عموماً ہوتی ہیں۔ یہ بھی تو آخر اُن کی بڑی لڑکی ہے؟" ستیش کے گرگ باراں دیدہ باپ نے سر ہلاتے ہوئے کہا ــــ!

"مگر جناب میرے لئے تو کوئی اور ہے۔ میں کسی اور کا ہوں۔ اگر یہ میری اختیاری بات نہ ہوتی تو شاید آپ لوگ اپنا زور چلا لیتے!"

"مگر ستیش بابو پاربتی بھی اچھی لڑکی ہے۔ اب جو ہوا سو ہوا۔ تمہارا یہ انکار بہت بعد از وقت ہے!" ستیش کے باپ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بعد از وقت کی ایک ہی رہی۔ آپ سب نے جو مجھے قبل از وقت اس حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ اچھی لڑکی ہے تو ہوا کرے، وہ کسی اور کے لئے ہوگی!"

ستیش کا دل جلا ہوا تھا۔ اُس نے خوب جلے پھپھولے پھوڑے۔ اس واقعہ کو وہ ایک پریشان خواب سمجھتا ہے، سر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے وہ کسی گہرے سوچ میں مستغرق ہے۔ قریب کے دروازہ سے ایک درد بھری آواز آہِ سرد میں ڈوبی ہوئی ستیش کے قوتِ سامعہ میں ہلچل ڈال دیتی ہے "ہاں بیشک بعد از وقت" ستیش ــــ برداشتہ خاطر ستیش کمرۂ عروسی سے ایک آزاد قیدی کی طرح نکل جاتا ہے۔ (۲)

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

شادی کا گھر جو ابھی کچھ دیر پہلے نوبت نقارے سے گونج رہا تھا۔ جہاں کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی، سب پر اوس

پڑھاجاتا ہے۔ درگا سر پکڑ کر بیٹھ گئی ہے۔ پریم سنگھ روپوش ہو کر زنانخانہ میں چلے گئے ہیں۔ پاربتی بے نیل و مرام واپس چلی جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اتر گیا ہے۔ ہاں ــــ غرور کے سر نے ہی نیچا دیکھا ہے !!

۱۰

تو برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی؟

زمانہ گذر رہا ہے۔ لیل و نہار ہی اور ہیں۔ درگا اور پریم سنگھ یہ سوچ کر کہ کم از کم لڑکیوں کو زیورِ علم سے ہی آراستہ کریں۔ اس شہر میں کوئی نسوانی درسگاہ تو نہیں تھی۔ اب انہیں ایک معلم یا معلمہ کی زبردست تلاش تھی۔ کیونکہ تمام تمام دن یہ تینوں لڑکیاں محلہ والیوں سے فضول بکواس میں گذار دیتیں۔ کیونکہ گھر کا کام دھندا تو کسی اور کے حوالے تھا۔ جس کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ یہ خرافات تو در کنار ــــ !

محلہ والیوں میں ہی کسی نے یہ خبر بھی سنادی کہ ستیش گھر بار سب چھوڑ چھاڑ کر تیرتھ کے لئے چلا گیا۔ اس افواہ نے کسی کے دل کو ڈھارس دی، کسی کے دل کو مفارقت میں تڑپتا رکھا۔ غرض جتنے دل تھے اتنی کیفیات !

ستیش نے واقعی محلہ چھوڑ دیا ہے !!

جوئندہ یابندہ۔ پریم سنگھ کو آخر ایک دن ایک اچھا معلم مل ہی گیا۔ اپنے گھر میں ایک کمرہ اس کے لئے خالی کر دیا۔ اور یہ حضرت رہنے لگے۔ یہ صورت شکل کے لحاظ سے بہت قابل اور ذہین معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بشرہ سے شرافت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں میں عالمانہ وقار، چال میں ایک غیر معمولی تمکنت تھی۔ گھنی داڑھی رکھتے تھے۔ لیکن قیافہ سے تیس چھبیس کا سن معلوم ہوتا تھا۔ منشی ست نرائن ان کا نام تھا۔ غرض تعلیم کا آغاز ہوا۔ اور پریم ناتھ کی "حقیقی تینوں لڑکیاں" ان کی شاگردی میں دیدی گئیں۔ شانتا کو بھی جب کبھی فرصت ملتی پردہ سے وہ بھی کچھ پڑھ لیتی۔

۱۱

کشش رہگذرِ یار کچھ ایسی ہے کہ ہم ٹھوکریں کھاتے ہیں مرتے ہیں مگر جاتے ہیں!

مرورِ زمانہ کی وہی رفتار ہے۔ سب لوگ ستیش کو قریب قریب بھول چکے ہیں۔ لیکن شانتا کے دل سے اس کا خیال نہیں جاتا۔ زمانہ کا کوئی نشیب و فراز اس کو مٹا نہ سکا۔ اس کا دل اب کتابوں سے بہلتا ہے۔ کچھ رسائل بھی پریم سنگھ نے لڑکیوں کے شوق کیلیے منگوا لئے تھے۔ ان کے مطالعہ سے بھی شانتا کی بہت کچھ دلبستگی ہوتی تھی۔ ورنہ وہ دیوانی ہو جاتی۔

ایک دن پڑوس سے چند ملنے والیاں درگا کے پاس آتی ہیں۔ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ سلسلۂ کلام میں ایک ان میں درگا سے کہنے لگی "بہن، ایک بات کہوں جو برا نہ مانو۔ ممکن ہے اس لئے پاربتی کو بر نہیں جڑتا کہ تم نے اس سے بڑی لڑکی کو بٹھا رکھا ہے۔ اکثر لوگ شانتا کو پوچھتے ہیں۔ نہ معلوم کیا بات ہو کہ اس کا گھر گھر چرچا ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھو۔ شاید پرماتما کی خوشی اسی میں ہو۔ ایشور کی دیا سے پاربتی کا گھر آباد ہو جائیگا۔"

"اری دیوانی تجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کب نہیں چاہتی کہ شانتا کی شادی ہو۔ یہ تم سے کس نے کہدیا کہ میں اسکی شادی کی مخالف ہوں؟ لیکن کوئی بر جڑے بھی اس کو؟؟"

درگا نے ایک عجیب بیزاری سے یہ جملہ ادا کیا ۔

اس پر اُس کی سہیلی نے اُس کو خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ محلہ بھر میں یہ چرچا ہے کہ تم نے ہی شانتا کی شادی ستیش سے نہونے دی ۔ زبردستی کی کہ وہ پاربتی سے عقد کرے ۔ لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوا ۔

بات آئی گئی ہوگئی ۔ وہ عورتیں سب اپنے اپنے گھر چلی گئیں ۔ دوسرے دن پھر اتفاق سے ملنا ہوا تو وہی ذکر چھڑا ۔ درگا عاجز آکر کہنے لگی " تو آخر بتاؤ ناکس کو دوں ؟ کون آیا پرستان کی پری کو لیجانے ۔ اچھا ہے جو اس کا کہیں بیاہ ہو جائے ۔ شاید اسی کے قدم سے میری لڑکیاں اَن بیاہی بیٹھی ہیں ! "

بس کیا تھا ، کہنے کو تو کہدیا ۔ اب یہ خلش اس کو لگی ہے کہ یہ ضرور ستیش ہی ہوگا ۔ اسی کی سب سکھائی ہوئی باتیں ہیں ۔ ورنہ یہ سب کیوں مجھے تنگ کرتیں ۔ ان کو شانتا کی شادی سے یا اس کے بن بیاہے رہنے سے کیا دلچسپی ؟ اگر ستیش ہی ہوا تو پھر میری لڑکیاں تمام عمر کے لئے اَن بیاہی ہی رہ جائیں گی ۔ لیکن خیر دیکھا جائیگا ۔ کہدیا ہے ۔ کیا ابھی شادی ہی ہو جائے گی ؟ "

پھر اُس کو ایک خیال آیا " کیوں نہ اس بوڑھے معلم کے گلے ڈالدوں ؟ ستیش سُنے گا کہ شانتا بیاہی گئی تو وہ انتقام کے طور پر میری پاربتی سے شادی کرے گا ـــــ شانتا کی اماں کا سُنتی ہوں بہت سا زیور ہے ۔ میں نے کئی بار اُن سے کہا کہ مجھے ایک نظر دکھا دیں ۔ لیکن یہ وصیت کا ایسا خیال رکھتے ہیں کہ دکھانا تو ایک طرف بتایا بھی نہیں کہ کیا کیا ہے ! "

انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی کہ راج کماری اسکی سہیلی آگئی " بہنا لاؤ مٹھائی کھلاؤ تو کچھ سُنائیں "

" اونہہ ۔ کیا سناؤ گی ؟ وہی جس کا پھالیا ہے ۔ وہی نا ـــ ؟ "

" ہاں ، ہاں اسی کے متعلق ، تو کیا تمہیں گوارا نہیں کہ کنیا کا کہیں ٹھاؤ ٹھکانہ ہو جائے ؟ "

" ارے یہ کون کہتا ہے ؟ تو پھر سُناتیں کیوں نہیں ؟ " دل میں " الٰہی خیر ، کیا نسبت دھری رکھی تھی ؟ جواب دینے کی دیر تھی ۔ مجھے تو بات بنتی نظر آتی ہے ! "

" بہن دُور کیوں جاؤ ۔ بر تو تمہارے گھر میں ہی موجود ہے ۔ کیوں منشی ست نارائن سے بیاہ نہیں دیتیں ؟ سُنا کہ وہ ابھی تک اَن بیاہے ہیں ۔ انہوں نے بہت دنوں سے رشیوں کی سی زندگی اختیار کر لی تھی "

" کل کو لوگ کہیں گے بوڑھے کو لڑکی دیدی ۔ گھر پڑا استاد نوکر رکھا اُسی کے گلے چیپ دی ۔ جب تم جواب دو گی شاید ؟ "

" ہاں میں اس کا جواب دے لونگی ۔ بس نا ؟ "

" اچھا ہے ۔ تو ان کو آلینے دو ۔ ذکر کروں گی ۔ نہ معلوم رضامند بھی ہوتے ہیں یا نہیں ۔ وہ بھی عجیب خیال کے واقع ہوئے ہیں ـــــ ! "

(۱۲)

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

شام کو درگا نے پریم سنگھ سے ذکر چھیڑ ہی دیا۔ وہ دل میں تو خوش تھی کہ ایک معمولی حیثیت کے آدمی کو شانتا بیاہی جائیگی، جو سن و سال کے لحاظ سے چالیس سے اوپر ہی ہوگا۔ اچھا ہے پھر میری لڑکیوں کے لئے راستے کھل جائیں گے۔ اس نے شوہر سے کہا۔ پریم سنگھ نے سوچا اچھا ہے سوتیلی ماں کی تکلیفوں سے اسکو نجات مل جائے گی۔ گھر بار سے لگی رہے تو بس ہے۔ انہوں نے ایک دم رضامندی ظاہر کردی۔

اب درگا کو یہ شکوک چین لینے نہیں دیتے کہ ہو نہ ہو یہ انہی کی پالیسی تھی۔ ورنہ کبھی یوں آسانی سے کسی بات پر راضی نہونے والے اب کیسے فوراً رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ انہی خیالات کی رو میں بہی چلی جاتی تھی کہ پریم سنگھ سوال کر بیٹھے "کیا سوچ رہی ہو؟ کیا تمہیں منظور نہیں؟"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کپڑے وغیرہ کے لئے رقم کہاں سے آئے۔ اسکی اماں کا زیور ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بیچ ڈالو۔ جو کچھ پیسہ آئیگا اس میں کپڑے تیار کر لئے جائینگے"

"ماں کا تو زیور ہوا۔ اب کیا لباس پر بھی میری کوڑی خرچ نہ ہو۔ اور اسی کا زیور بیچ دیا جائے؟ مگر اس کی ماں کے بھی تو جوڑے بہت سارے تھے۔ وہ رہی کتنے سال؟"

"پاربتی کے جوڑوں میں بھی میں نے دو تین جوڑے اسکے رکھدئے تھے۔ مجھے تو وسواس آتا ہے"

"ارے واہ اچھا ہے آپ کا وسواس۔ اس کی ماں کے جوڑے، آپ کون حقدار پاربتی کے جوڑوں میں لگانیوالی؟ بلکہ اکثر برتن اسی کے ہیں جو آپ استعمال میں لا رہی ہیں۔ اس کی کسی چیز کے تصرف کی آپ مجاز نہیں۔ یہ سب شانتا کا ہے۔ اس کی ماں کا گھر بھی تو ہے جس میں آج ہم بیٹھے براج رہے ہیں؟"

"تو چلو گھر بھی دیدو۔ کہیں جھونپڑا اڈال کر رہیں گے۔ آپ جو مہربان ہیں پھر تو کل کائنات مہربان ہوسکتی ہے۔ مخالفت کرنے کی مجال کیا ہے؟" درگا نے جل کر کہا۔

"ٹھیک، بات تو دراصل یہی ہے۔ اسی کا حق ہے۔ یا آپ اس کی اجازت سے رہیئے۔ یا یہ مکان اس کے حوالے کر دیجئے۔ میرے کئی مکان کرایہ پر ہیں۔ ان میں سے ایک عنقریب گارنٹی کی مدت سے سبکدوش ہو جائیگا، اس میں چلے جائینگے!"

پریم سنگھ کی آج کی تقریر بالکل اور تھی۔ وہ انصاف پر کمربستہ تھے۔ اُن کے لئے پاربتی کی شادی میں رکاوٹ اُس کے بر کا انکار، تمام عمر کے لئے یہ ندامت کافی تھی۔ وہ ان سب کا بانی اب درگا کو سمجھنے لگے تھے۔ مارے غیرت کے وہ سوسائیٹی میں مُنہ دکھا نہ سکتے تھے۔ یہ سب اُن کی زن مُریدی کا نتیجہ تھا۔ درگا جو چاہتی اُن سے کر والیتی۔ اور یہ بالکل کاٹ کے اُلو بنے ہوئے اُس کے ہر اشارہ پر ناچنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ جس کا نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔ ماں باپ کا کیا دھرا اولاد کے آگے آتا ہے۔ لیکن نیکیاں کبھی خالی نہیں جاتیں۔ ان کا ثمر ضرور اچھا ملتا ہے۔ شانتی خود صبر کی دیوی تھی۔ دوسری ہوتی تو اوچھے پن سے سوتیلی ماں کا مغز چاٹ جاتی۔ بلکہ اُن کے گھر میں گذر مشکل ہوتی۔ وہ باپ سے چاہتی تو ہر بات کی شکایت کر سکتی تھی۔ لیکن اُسکے سینہ میں ایک شریف دل تھا۔ وہ صبر و رضا کی دیوی تھی۔

رفتہ رفتہ اُس کے کان تک بھی یہ بات آئی کہ وہ ست نارائن سے بیاہی جانے والی ہے۔ لیکن اُس کا دل جسکو

وہ ستیش کا طرفدار بھی تھی۔ وہ بھی اب پہلو تہی کرنے لگا تھا۔ یعنی وہ شانتا جو اگر ستیش نہ ملتا تو عمر تمام اَن بیاہی رہنے کا عہد کر چکی تھی، اُس کو بھی اپنے معلّم سے کچھ محبت سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس کا اس سے پردہ تھا۔ وہ اپنے دل کو لعنت ملامت کرتی۔ اُس کے خیال کو نکال پھینکتی۔ لیکن وہ اُسی کی طرف جاتا۔ آخر ایک روز اُس نے اپنے اُستاد سے اُنکی داستان سُننے کا تہیہ کر لیا۔ اور کہنے لگی "ایک کہانی سُنائیے۔ آج پڑھنے کے لئے طبیعت نہیں چاہتی۔ دل کچھ اُچاٹ سا ہے"

یہاں کیا تھا۔ بس چھیڑنے کی دیر تھی۔ اُنہوں نے اپنی ساری داستان سُنائی۔ اپنی شادی کا واقعہ کہ کس طرح اُنکے ساتھ فریب چلا گیا۔ اُن کی منگیتر اور تھی۔ غرض ساری کی ساری کہانی ستیش کی زبانی تھی۔

شانتا یہ سُنکر دنگ رہ گئی۔ اب یہ اپنے دل سے ناراض نہ تھی۔ بلکہ خوش تھی کہ کسی غیر کا خیال نہیں بلکہ اُسکے پتی کا خیال ہی اُس کو آرہا تھا۔ اب تو اس کے دل کو اس کا کامل اطمینان تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ستیش کی ہونے والی ہے۔ ستیش اُسی کا ہے۔

ستیش کا برباد شُدہ گھر از سرِ نو آباد ہوا۔ جس کی آبادی کا اُس کو وہم و گُمان بھی نہ تھا۔ شادی کا خیال اُسنے حرفِ غلط کی طرح دل سے محو کر دیا تھا۔ مگر خدا کی درگاہ میں دیر ہے اندھیر نہیں ——!!۔

(طبعزاد) ح ج نقوی

حقائق

جب سے وہ بے مہر زیبِ بزمِ نامحرم ہوا
اس دلِ حسرت زدہ کا کچھ عجب عالم ہوا

شب کو تُربت پر مری کس دُھوم سے ماتم ہوا
شمع نے کی اشکباری گریۂ شبنم ہوا

پُتلیاں پھرتے ہی سب نے اپنی اپنی راہ لی
دم زدن میں ایک جلسہ درہم و برہم ہوا

جسکے ملنے سے ہزاروں رنج پہنچے تھے مجھے
جبکہ وہ بچھڑا تو دل کو انتہائی غم ہوا

لاکھ بزمِ دہر میں ہنگامہ آرائی ہوئی
حق کا باطل کے آگے سر نہ لیکن خم ہوا

وہ گئے تھے غیر کے ہمراہ اتنا علم ہے
یہ نہیں معلوم پھر کیا مشورہ باہم ہوا

سوچتے تھے سردیوں میں اَب کے آئیگی بہار
وائے قسمت روتے دھوتے ختم یہ موسم ہوا

تیری رُسوائی کا باعث درحقیقت میں نہیں
اِن رقیبوں کے سبب سے شہر میں او دہم ہوا

اُس دلِ مرحوم کا رونا مقدر تھا فہیم
ایک مدت جس میں زندہ دوست کا ماتم ہوا

فہیم چغتائی

طلسمِ خیال

دریائے نیل کے اُس کنارے نیرِ اعظم کی شعاعوں میں پلنے والا مہتاب نیل کے چمکدار پانی پر اپنی رنگین کرنیں عکس ریز کرتا ہوا آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔

نیل بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا!۔

چاند اظہارِ اُلفت کر رہا تھا اور دریا کی بے اختیار لہریں محبت کی چاندنی سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ مہتاب کی کرنیں لہروں میں جذب ہو رہی تھیں اور بیتاب لہریں چاند تک پہونچنے کی کوشش کرتیں مگر ناکام واپس آجاتیں۔

نوجوان حسینہ، جو عالمِ شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی، سیاہ ماتمی لباس پہنے کنارۂ دریا پر جھکی ہوئی کھڑی تھی ———!

دریا کی ٹھنڈی ہوائیں اُس کے سیاہ اور نرم بالوں کو چوم رہی تھیں اور اُس کی آنکھیں کرنوں اور لہروں کے جذبات اور کشمکش میں محوِ نظارہ تھیں ......

اُس کی سیاہ دراز پلکوں پر موتی جیسے سفید آنسو چمک رہے تھے ———

آہ! ایک بن ماں کی بچی!۔

اُس کے لب ہائے لعلیں میں حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے آنکھوں کے موتیوں کو نیل کی سطحِ آب پر بکھیرتے ہوئے، لہروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس فنا ہونے والی دُنیا میں "ماں" سے زیادہ محبت اور شفقت کرنے والی رحمدل اور ہمدرد کوئی اور ہستی بھی ہوتی ہے؟ دُنیا و مافیہا سے بیخبر معصوم لہروں! جب نیل خشک ہو جائیگا تو اُس کے بعد بھی کیا تم فنافی المار ہونے کے لئے بیتاب ہوگی؟ نہیں۔ اے دُنیا کو عبرت دینے والی لہروں! "ماں" کے بعد کس طرح کوئی سایۂ مادری میں پناہ دے سکتا ہے ..... ؟"

وہ "ماں" "ماں" کہتی ہوئی اندازِ طفلانہ میں چیخیں مارنے لگی۔

نیل کی بے قرار لہریں بھی مچلنے لگیں!۔

دریا میں تموّج پیدا ہوا اور نیلے گہرے پانی میں ایک ڈراؤنی اور بہت اونچی موج اُٹھی ——— اور وہ "ماں کی محبت" کی متلاشی اس موج کے آغوش میں جانے کے لئے جھکی ——— کہ ——— دفعتاً چاند نے شدّتِ رنج والم سے سیاہ بادل کے ایک ٹکڑے سے اپنا مُنہ چھُپا لیا ——— اور کسی نے حُسن کی دیوی سے کان میں کہا۔ "یہ سب کس کے لئے؟ اُس ایک ماں ہی کے لئے جس نے تجھے پالا مگر ——— اُس ذاتِ حقیقی کے لئے جس نے نہ صرف تجھکو بلکہ تیری پالنے والی (ماں) کو اور تمام مخلوق کو پیدا کیا اور پالا، تو نے کیا کیا؟"

——— وہ اپنے ارادے سے رُک گئی اور پیچھے ہٹی ———

مہتاب نے اپنی نقاب اُلٹ دی اور ــــــ چاندنی اچھی طرح کِھلنے لگی!۔

دریائی ہواؤں نے رُخ بدلا اور مشرق کی طرف چلنے لگیں۔

وہ معصوم و حسین لڑکی بھی اِن کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلدی......

ساحل ماتم کرنے لگا۔

وہ تھوڑی دُور تک اپنے خیالات میں غرق چلتی رہی کہ اُس نے دیکھا کہ ایک ہرن کا بچّہ اپنی ماں کے گرد، جو بےحِس و حرکت پڑی تھی، چکر لگا رہا ہے اور چیخ رہا ہے......

وہ قریب پہونچی ــــــ ہرنی مر چکی تھی!

بچّے کی دیوانہ وار حالت دیکھکر اُس کا زخم اور بھی تازہ ہوگیا ــــ اُس نے بچّے کو اُٹھالیا اور آگے بڑھ گئی ــــــ

بچّہ خاموشی سے اُس کا مُنہ تکنے لگا اور بچاری لڑکی کے آنسو نکلنے لگے!

اُس نے اپنی زندگی جنگل کے زخمی و بےکس جانوروں کی پرورش میں صرف کردی اور اس طرح ــــ بَن کے بہت سے جانور اُس سے مانوس ہوگئے!۔

اور ایک دن جبکہ اس معصوم و پاکیزہ ہستی نے جنگل کے رہنے والوں کو الوداع کہی تو اس سرے سے لیکر اُس سرے تک ایک دردانگیز کہرام مچا ہوا تھا اور انسانی ہاتھوں کے پلے ہوئے جانور ایک "ماں" کی یاد میں ماتم کرنیلگے۔

نیل اب بھی، جب کہ چاند اپنی زرّین و سیمیں شعاؤں سے پانی کو اُچھالتا ہے، اُس ہستی کی یاد میں جس نے ماں کی یاد میں خود ماں جیسی خدمت کی، ماتم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ــــــ ہوا ایک دردانگیز گیت گانے لگتی ہے!

صادق الخیری دہلوی

تجلّیات

شیشۂ دل میں شرابِ ارغواں رکھتا ہوں میں
اِک نظر میں دو جہاں کی مستیاں رکھتا ہوں مَیں

بجلیاں گرتی رہیں گی آسماں سے تا بکے؟
پھر گلستاں میں بنائے آشیاں رکھتا ہوں مَیں

ہمنوا! سرمایہ دارِ غم ہے میری زندگی
ہر نفس میں ایک عمرِ جاوداں رکھتا ہوں مَیں

عِشق کی مجبوریاں اظہار کے قابل نہیں
تو نہیں سُنتا جسے، وہ داستاں رکھتا ہوں میں

چاک کر ڈالوں نہ اپنا دامنِ ہستی کہیں
فصلِ گُل میں وہ جنوں سامانیاں رکھتا ہوں میں

دے رہا ہوں آج بزمِ حُسن کو درسِ وفا
ذرّے ذرّے پر جبینِ خونچکاں رکھتا ہوں میں

گلشنِ ہستی میں تابشؔ پھر کب آئے گی بہار
اب بہارِ زندگی صرفِ خزاں رکھتا ہوں مَیں

تابش
بمبئی

نقد و تبصرہ

لکھا گیا ہے اور صاحبِ مضمون نے دادِ تحقیق دی ہے۔ بعض مضامین اُردو میں اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل نئے ہیں اور بعض تنقیدی لحاظ سے لائقِ ستائش۔ نوجوان طلبار کا یہ ذوق و شوق زبانِ اُردو کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ اگر اسی سرگرمی سے یہ بزم کام کرتی رہی تو ہندوستان کی اور سب انجمنوں سے بازی لے جائے گی۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ چند نوجوانوں نے مل کر ایک ایسی مستحسن کوشش کی ہے کہ بڑی بوڑھی انجمنیں بھی نئی نویلی بزم کا مُنہ تکتی رہ گئیں کہ عملی اقدام کی اب تک کسی کو سُوجھی ہی نہیں۔ جس کی ابتدا یہ ہو اس کی انتہا کا کیا کہنا۔ یہ تعمیر اگر جاری رہی تو بہت جلد ایک سربفلک عمارت تیار ہو جائے گی اور اُردو کی اس شاندار کامیابی کا سہرا "بزمِ فروغِ اُردو" کے لائق نوجوانوں کے سر رہیگا۔ بزم کے مولّس و صدر پروفیسر محمد دین تاثیر اور سکریٹری جناب مرزا محمود نظامی مستحقِ تشکر ہیں کہ انہیں حضرات کی کوششوں سے یہ بزم معرضِ وجود میں آئی اور زبانِ اُردو کی صحیح خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہم اپنی اکثر توقعات کو اس بزم سے وابستہ کر سکتے ہیں اور دعا میں جناب کیفی دہلوی کے ہمنوا ہیں کہ "پروان چڑھے بزمِ فروغِ اُردو"۔

"فروغِ اُردو" کی صرف ۲۲۲ کاپیاں چھپی ہیں اس لئے اپنی کاپی طلب کرنے میں تاخیر نہ کیجئے۔ قیمت عہ؁ ۔

علی گڈھ میگزین۔ اِس دفعہ جناب ظفر احمد صدیقی۔ بی۔ اے (علیگ) کی ادارت میں پہلی سہ ماہی کا پرچہ شائع ہوا ہے۔ اس پرچہ کو گذشتہ پرچوں سے جو خصوصیت ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں تقریباً تمامتر مضامین یونیورسٹی کے افراد ہی کے ہیں۔ لائق مُدیر کی یہ انتہائی کامیابی ہے کہ وہ علی گڈھ میگزین کو علی گڈھ والوں ہی کے مضامین سے مُرتب کر سکے۔ اس کے لئے اُنہوں نے یقیناً بہت کاوش کی ہوگی اور اس کا صلہ اُنہیں ایک کامیاب ترین پرچہ کی شکل میں مل گیا۔ مضامین نظم و نثر سب اچھے ہیں۔ بعض بہت اچھے ہیں اور بعض تحقیق اور تفتیش کے اعتبار سے لائقِ قدر ہیں۔ "داغ و احسن" کی جس قدر بھی قدر کی جائے کم ہے۔ "فانی کی شاعری کے چار مختلف دور" میں صاحبِ مضمون نے سخن گسترانہ رائے دیکر تنقید کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ "الغزالی اور اُن کی اندرونی نشوونما" اور "فارسی شاعری اور ہجویات" جیسے بلند پایہ علمی مقالات کی اشاعت پر ادارۂ علی گڈھ میگزین ناز کر سکتا ہے۔ "شہیدانِ وفا کا خون بہا کیا" اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ایک خاصہ کی چیز ہے۔ حصۂ نظم میں "صبح بہار"، "نوائے مجاز"، "تجابات"، "جزحیات" اور "دوشیزۂ بہار" لائقِ رشک ہیں۔ جناب جگر مُرادآبادی کی غزل بہت روکھی پھیکی رہی اور

عمدہ غزلوں کی موجودگی نے اُس کار ہاسے ہارُوپ بھی کھو دیا۔ اُمید ہے کہ جناب مُدیر دورِ حاضرہ کے ممتاز شُعراء کے کلام کو بھی شائع کرنے سے پہلے بنظرِ غائر دیکھ لیا کرینگے۔ کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ پرچہ پر قیمت درج نہیں ہے۔

عربک کالج میگزین دہلی۔ یوں تو ہر کالج کا ایک رسالہ شائع ہوتا ہے مگر عربک کالج میگزین اس لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے کہ بہت تھوڑے سے عرصے میں اِس نے لائق فخر کامیابی حاصل کرلی۔ اس کی داغ بیل جناب آغا محمد اشرف نبیرۂ حضرت آزاد مرحوم نے ڈالی تھی اور اب علامہ راشد الخیری کے ہونہار فرزند جناب صادق الخیری اس کے ادارتی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مضامینِ نظم ونثر کا معیار بہت عُمدہ ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ میگزین کی عنانِ ادارت ایک ایسے صاحبِ ذوق کے ہاتھوں میں ہے جس کی گھٹی میں علم وادب پڑا ہے۔ اس سال کا پہلا رسالہ بقرعید کے موقع پر شائع ہوا۔ پہلے سنگی طباعت ہوتی تھی مگر اس دفعہ سارا رسالہ خوشنما ٹائیپ میں چھاپا گیا ہے۔ سرورق کا ڈیزائین بھی نظر فریب ہے۔

سلطنتِ خُداداد۔ ازجناب محمود خانصاحب بنگلوری۔ ضخامت (۶۶۴) صفحے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الدین ۹۴ بلا کپلی روڈ بنگلور۔

تاریخوں میں جس قدر اختلاف نظر آتا ہے علم وادب کے کسی اور شعبے میں نظر نہیں آتا۔ اِس کی وجہ بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ مُورّخ اپنے ذاتی رُجحانات و تاثرات کو بھی تاریخی واقعات میں شامل کردیتا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ مورّخ قطعی غیر جانبدار ہوکر تاریخی واقعات پر قلم اُٹھائے۔ ہندوستان میں جتنی تاریخیں سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس درجہ متعصب ذہنیت کی مظہر ہوتی ہیں کہ اُن کا نصاب میں شامل کرنا اخلاف کو اسلاف سے متنفر کرنے کا مُرادف ہوتا ہے۔ حضرت اورنگ زیب کی تاریخی شخصیت اس قدر بدنمائی سے پیش کی گئی ہے کہ مسلمان بچّوں کے دلوں میں اس بُزرگ و برتر ہستی سے محبت کرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ مرّوجہ تاریخوں کے اکثر وبیشتر صفحات مسلمان بادشاہوں کے کردار مسخ کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔ اِس قسم کی کتابوں کو تاریخ موسوم نہیں کرنا چاہیئے بلکہ من گھڑت فسانوں سے بھی انہیں کمتر درجہ دینا چاہیئے۔

"سلطنتِ خداداد" میسور کی تاریخ ہے۔ نواب حیدر علی اور ٹیپو سُلطان کی تاریخ کی اُن مظلوم ہستیوں میں سے ہیں جن کے کارنامے صحیح روشنی میں پیش نہیں کئے گئے۔ اُن کے لئے ہر متعصب مورّخ کے قلب کی سیاہی زبانِ قلم سے ٹپکتی ہے۔ ہمیں جناب محمود خانصاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے بے انتہا تحقیق و تفتیش کے بعد تاریخِ ہند کے اِن دو ہیروز کی صحیح اور مکمل تاریخ لکھی۔ انگریزی، فارسی اور

اُمید کی جتنی تاریخیں اُنہیں مل سکیں اُن سے اِس کتاب کے لئے مواد جمع کیا۔ معتبر ماخذوں سے مسالہ فراہم کیا۔ کچھ قلمی نسخے مُہیا کئے اور ان تمام ہی کے علاوہ حیدر علی اور ٹیپو سُلطان کے اوصاف، عادات و اقوال کے متعلق مقامی روایات سے بھی مدد لی۔ ایک ایک واقعہ کو بھی اچھی طرح چھان بین نہیں کرلی اپنی کتاب میں اُسے شامل نہیں کیا۔ کتاب کے آخر میں "مزار سُلطان شہید پر چند آنسو" لائقِ رشک ہیں۔ ادبی حیثیت سے بھی یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ محمود خاں صاحب نے اپنی رنگینیِ قلم سے تاریخ جیسے خشک موضوع میں بھی شگفتگی پیدا کردی ہے جس کی وجہ سے اس کے مُطالعہ سے طبیعت نہیں اُکتاتی۔ تاریخ سے شغف رکھنے والے حضرات کے لئے "سلطنتِ خداداد" ایک خاصہ کی چیز ہے۔

مختصر تاریخِ عالم:- مؤلفہ سید حکیم احمد صاحب نقوی۔ ضخامت ۱۶۰ صفحے قیمت عہ۔ انگریزی میں اِس موضوع پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں سب سے مشہور ایچ۔ جی۔ ویلز کی تاریخِ عالم ہے۔ اُردو میں "مختصر تاریخِ عالم" اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ اس قسم کی کتابیں اگر ہماری زبان میں زیادہ شائع ہوں تو اُردو دوسری زبانوں کے مُقابلہ میں تہی دست نظر نہ آئے گی۔ کتاب کے ابواب حسبِ ذیل ہیں:-

عالمِ ارضی و سماوی۔ عالمِ ارضی میں حیات کے پیدا ہونے کی داستان۔ خشک زمین پر حیات کے پھیلنے کی داستان۔ روئے زمین پر انسان سے ملتی جلتی شکلوں کا نمودار ہونا۔ اصل نوعِ انسانی کا ظہور۔ اقوام یا نسل ہائے انسانی۔ شاہراہِ ترقی کے ابتدائی مراحل۔ تاریخی زمانہ کا آغاز۔ مؤلف نے اقرب الفہم پیرایہ میں ہر عنوان پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جابجا قرآنِ کریم کی آیات سے بھی استدلال کیا ہے۔ کتاب کا صرف پہلا حصّہ شائع ہوا ہے۔ دوسرا حصّہ غالباً تاریخی زمانہ پر مشتمل ہوگا۔ کتاب کا مُطالعہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہوگا۔ اُمید ہے کہ اِس گنجینۂ معلومات کی قدر کی جائے گی۔ جناب سید حکیم احمد صاحب نقوی۔ سینئر ممبر کورٹ آف وارڈز۔ ریاست گوالیار سے یہ کتاب طلب کی جاسکتی ہے۔

نخلستان:- مُلتان سے اِس نام کا پرچہ بغرضِ تبصرہ موصول ہوا ہے۔ جلد ہشتم کا پہلا پرچہ اِس وقت پیشِ نظر ہے۔ ن۔ م۔ راشد ایم۔ اے۔ فقیر غلام حیدر۔ اور آغا عبدالحمید، بی۔ اے (آنرز) اس کے ارکانِ ادارہ ہیں۔ ن۔ م۔ راشد صاحب پاکیزہ نظم اور عمدہ نثر لکھنے کی وجہ سے کافی شُہرت حاصل کرچکے ہیں۔ اِن کی ادارت میں جو پرچہ شائع ہو وہ علم و ادب کا ثمرِ نورس ہی ہوسکتا ہے۔ اِس اشاعت کا اداریہ (اُردو شاعری کے رُجحانات) قابلِ قدر ہے۔ اسلوبِ بیان بعض جگہ پسندیدہ نہیں ہے مثلاً۔ "حالی اور اُس کا شریک کار بُت شکن آزاد اپنے آپ کو بے حد علی آدمی تصوّر کرتے تھے" یا "حالی کی مسدّس کا محرک خود سرسّید ہوا تھا" اس قسم کے فقرے بعض سنجیدہ حضرات کو ناگوار گذریں گے۔ ان سے قطعِ نظر مضمون میں بڑے کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔

اس پرچے کی ایک خصوصیت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس میں مغربی ادب کے عمدہ تراجم زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری زبان میں خیال و بیان کی نئی نئی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اس لئے تراجم کو بہت اہمیت دینی چاہیئے۔ اور "نخلستان" اگر صرف اِسی ایک خدمت کو اپنے ذمّے لے لے تو اُردو کو اس کے ذریعے بہت کچھ مل جائے گا۔ حصّہ نظم میں بھی جدید روش کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ضخامت ۴۸ صفحے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ اشتہاروں کے فقدان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "نخلستان" محض خدمتِ ادب کیلئے نکالا گیا ہے اور بصورتِ موجودہ یہ بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ پرچہ نقصان برداشت کررہا ہوگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ عمدہ پرچوں کے شائقین "نخلستان" کے خریدار خود بنیں اور اپنے احباب کو بھی اسکی خریداری پر مائل کریں۔ چندہ سالانہ یا قیمت فی پرچہ اس اشاعت پر درج نہیں ہے۔ نمونہ کا پرچہ منیجر نخلستان ملتان سے طلب کیجئے۔

اصغر گونڈوی کی شاعری (حصّہ اوّل) جناب اصغر کی شاعری سے متعلق موافق و مُخالف مضامین کا مجموعہ جناب سر کوب نے شائع کیا ہے۔ مُرتب کے فرضی نام ہی سے بُغض و عناد کی بُو آتی ہے اس لئے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اِس کتاب کی اِشاعت میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔ جن حضرات کو اِس قسم کی دلآزار کتابیں پڑھنے کا شوق ہو مہدی علی خاں بُک سیلر ۲۴ چوک الہ آباد سے ۸ر میں طلب کرسکتے ہیں۔

کیفستان

"عکاسِ جذبات" جناب قیسی رامپوری کے بارہ بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں حضرت قیسی کا شاہکار کونسا افسانہ ہے۔ کیونکہ ہر افسانہ ادب، جذبات، نفسیات اور بلند طرزِ بیان کا مکمل مجموعہ ہے۔

"گلوخ انداز را پاداش سنگ است" یہ مجموعۂ مذکور کا پہلا افسانہ ہے اور شیکسپیئر کے معروف ڈرامے Measure for Measure کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے۔ حضرت قیسی کے ترجمے بھی اُسی قدر بلند وارفع ہوتے ہیں۔ جس قدر طبعزاد افسانے۔ اس امر کا سب سے بڑا شاہد ہارڈی کے معرکتہ الآرا ناول Jude the Obscure کا وہ ترجمہ ہے جو چھ ماہ تک مسلسل سرو‌ش لاہور میں شائع ہوتا رہا ہے۔

"فرد" یہ دوسرا افسانہ ہے۔ اور حقیقتاً بیحد پُر درد ہے۔ عبارت اس قدر صاف، مؤثر اور دلنشین ہے کہ ایک ایک فقرہ کو کئی کئی بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اول تو افسانے کے واقعات بجائے خود کم دلچسپ نہیں لیکن مصنّف کی سحر نگاری نے ان کو اس قدر دل گداز و رقت خیز بنا دیا ہے کہ شدید سے شدید رجائی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی بعض فقروں کی شگفتہ بندش اور الفاظ کا بیساختہ استعمال اس قدر پُر لطف ہے کہ اشکبار آنکھ میں دفعتاً مسرتِ خندہ جھلکنے لگتی ہے۔ غرض اس میں قیسی صاحب نے رقت و مسرت دونوں کو بیک وقت سمو دیا ہے۔

"کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں" ایک مزاحِ خفی کا حامل افسانہ ہے۔ جس میں واقعات سے قطع نظر کر کے انسان کی ایسی حقیقی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے جس کو بہت کم لوگ قابلِ التفات سمجھا کرتے ہیں۔ ہر شخص بقدرِ توفیق کسی قدر خبط ضرور رکھتا ہے۔ مصنّف کا یہ افسانہ بھی اسی موضوع کا حامل ہے۔

"نزولِ محبت کے پانچ مناظر" نفسیاتِ محبت کو سلجھانے والا اس سے واضح تر مضمون آج تک آپ کی نظر سے نہ گذرا ہوگا۔ یہ ایک غیر مسلسل مضمون ہے جس کو مصنّف نے پانچ مناظر پر مشتمل کر کے محبت کو جداگانہ منظر کے ضمن میں اس خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تقسیم کے متعلق شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہر شخص محبت کی ایک ہی صنف کو مدِ نظر رکھکر فسانہ لکھتا ہے لیکن اس افسانہ میں مصنّف نے "باعثِ محبت" پانچ کلیات قائم کر کے چھوٹے چھوٹے پانچ افسانوں کے ذریعہ اُن کلیات کی حیرت انگیز صراحت کی ہے۔ پھر جس تاثر میں ڈوبے ہوئے انداز میں یہ مضمون لکھا گیا ہے اُسکی داد الفاظ میں دینی محال ہے۔

"ایثار" یہ مصنّف کی قلم سے سب سے پہلا لکھا ہوا دلدوز افسانہ ہے۔ جو لوگ جناب قیسی کے سات سال پہلے کے لکھے ہوئے سب سے پہلے افسانے کے طرزِ بیان، اسلوبِ نگارش اور قدرتِ تخیل کو دیکھنے کے طالب ہیں وہ اس افسانہ کی جاذبیت و کمالِ انشا پردازی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو صلاحیت مصنّف میں اُس زمانہ میں اس درجہ مکمل تھی وہ اب کسقدر مکمل تر ہو گئی ہوگی۔ یہ افسانہ کیف میں شائع ہوا تھا اور اسقدر مقبول ہوا کہ فوراً چار معاصر رسالوں نے اُس کو نقل کر لیا تھا۔

"بُعد ہے حسن و عشق میں" اس افسانے کو شروع کرتے ہی ناظر مصنّف کے سحرِ قلم سے اس قدر مسحور ہو جاتا ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ گویا اپنی خود کی ناکامی، پُر شدائد تاثرات اور مایوس جذبات کی رُوداد پڑھ رہا ہے۔ پھر افسانہ کا پلاٹ اس قدر حزن میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھ کر آنسو نکلے بغیر نہیں رہتے۔ جس حساس ہستی نے اس افسانے کو بار بار پڑھا ہے اور پڑھ پڑھ کر سر دھنا ہے اُس کے الفاظ کو اس افسانے کی پُشت پر ثبت کر کے اس کو اسی کے نام پر بطور یادگار معنون کر دیا گیا ہے۔

"بدحواسی" ایک مزاحیہ افسانہ نما مضمون ہے اور مزاح سے پُر ہے۔

"یہ تباہ کن محبت" بھی ایک مضمون نما افسانہ ہے۔ محبت کا صحیح فلسفہ اس قدر خوبی اور پُر فصاحت الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا تھا۔ عبارت بعض جگہ بے حد فلسفیانہ ہو گئی تھی۔ لیکن مصنّف کے شوخ فقروں نے اُس کو

دلچسپ بنا کر آسان اور سمجھ میں آنے کے لائق کر دیا ہے۔ پھر انجام اس قدر رنگین اور شگفتہ ہے کہ بیساختہ داد منہ سے نکل جاتی ہے۔

"عشق یا فتح از شکست شود" ایک نہایت ہی جذباتی کہانی ہے۔ یہ جذبات و اسرار کا ایسا مرکب مضمون ہے کہ اس ٹریجڈی کا ایک ایک لفظ اپنے بلند تاثرات کا اعلان کر رہا ہے۔ آرٹ کو مصنف کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ افسانہ کا انجام بظاہر ایک عامیانہ زمین پر آگیا تھا لیکن یہ جناب قیسی ہی کا مشاق قلم ہے جس نے اُس کو اسقدر آرٹسٹک بنا دیا۔

"ارتقا" بظاہر ایک مزاحیہ مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن نتیجہ خیز، انسانی جذبات کے مدوجزر کا اتنا صحیح مکمل نقشہ آپ کی نظر سے آج تک نہ گذرا ہوگا جتنا اس مختصر سے مضمون میں موجود ہے۔ بعض اوقات ایک خوشگوار اور اُمید افزا ماحول یا اس کے برعکس محن و شدائد سے بھری ہوئی فضا انسان کے توازنِ دماغی کو کس قدر برہم کر دیتی ہے۔ یہ افسانہ ایسے ہی انسان کی نفسیات کا حامل ہے۔

"نفسیاتی تبدیلی" معاشرت اور رومانیت کو جس کمال سے اس افسانہ میں ظاہر کیا گیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ فلسفہ کا فلسفہ اور کتابی کی کہانی۔ یہ افسانہ شروع اس قدر تیز بیانی اور ہنگامہ آرا الفاظ سے ہوتا ہے کہ دو تین صفحات تک شگفتگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے بعد دفعتاً سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سنجیدگی کو فلسفے سے خاص مس ہے۔ چنانچہ اس کی جھلک بھی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن فوراً ہی پھر شستہ الفاظ کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ معاشرت کی ایک زبردست اُلجھی ہوئی کڑی باتوں ہی باتوں میں حل ہو جاتی ہے۔ اب آپ انجام کے منتظر رہتے ہیں جس کو اس قدر "عام پسندی" کے ساتھ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

"یاس" یہ مجموعہ کا آخری افسانہ ہے اور تمام افسانوں کا حاصل۔ یہ افسانہ تمام تر رنگین بیانی، مؤثر عبارت، پرشکوہ الفاظ اور معانی آفرینی سے مملو ہے۔ شروع کی تمہید اس قدر اثر آفریں، سوز میں ڈوبی ہوئی اور مؤثر ہے کہ ناظر وجد میں سر دھننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثلاً سطور ذیل کی تاثر انگیزی سے کون انکار کر سکتا ہے:۔

> "میں محبت و الفت کے باب میں ہمیشہ بدنصیب رہا ہوں۔ مجھے محبت کی کسی خاص صنف سے بحث نہیں (واضح الفاظ میں یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میری دلچسپیوں کی پذیرائی میں ان "وحدت تہری" رکھنے والی اشیاء نے بہت کم بے اعتنائی برتی ......) میں ہر شے کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگتا تھا لیکن ہر شے دیوانگی کی حد تک میرے والہانہ جذبات کو برقرار رکھنا پسند نہیں کرتی تھی"۔

اس افسانہ کا پلاٹ اس قدر پُر واقعات اور تخیلات کا تسلسل لئے ہوئے ہے کہ theme (موضوع) خود منہ سے بول رہا ہے، کسی جگہ ناظر کے تخیل کو اُستادانہ دھوکا دیا گیا ہے جس سے فسانے میں ایک ایسی شگفتہ Mystery (سی) پیدا ہو گئی کہ اختتامی سطور پڑھکر انسان حیرت، رقت اور بیخودی میں مبتلا رہتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر کیفستان وفادار بلڈنگ، دہلی دروازہ۔ اجمیر
" ساقی بک ڈپو۔ دہلی "

میرزا یگانہ کی دوسری کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر صاحب ساقی

مائی ڈیر شاہد صاحب سلام علیکم۔ ساقی کا مئی نمبر پہونچا۔ شکریہ۔

"یگانہ شاعری" کے عنوان سے ایک بدایونی مرد نے جو بھولی بھالی بکواس کی ہے اُسے پڑھکر اس جنگل کی تنہائی میں کسی قدر تفریحِ خاطر ضرور ہوئی۔ مگر اس فسادی لڑکے نے مجھ پر مذہبی تعصب کا بہتان رکھ کر جو قلم فرسائی کی ہے میں اِس چالاکی کو خوب سمجھتا ہوں۔ وہ مذہب کی آڑ پکڑ کر مجھے زک پہونچانا چاہتا ہے۔ حالانکہ ترانہ کوئی مذہبی تصنیف نہیں ہے۔ محض ایک رباعی ـــ (کس دن کے لئے علی سے بیعت طلبی؟) ـــ مجموعہ رباعیات میں میں نے اس لئے شامل کر دی ہے کہ مصنف کا شخصی خیال اسلام کی ابتدائی سیاسی حالت کے متعلق معلوم ہو سکے۔ شاعر کا بہ حیثیت شاعر کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مگر شخصی اعتبار سے اُس کا کچھ نہ کچھ عقیدہ ضرور ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ اُس کا عقیدہ جمہور کے عقیدے کے موافق ہی ہو۔ اہلِ خبر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ خلافت کا جھگڑا کوئی مذہبی جھگڑا نہ تھا۔ محض سیاسی جھگڑا تھا جو بنی ہاشم اور دیگر قبائل قریش کے موروثی تنازعے پر مبنی تھا۔ اسے مذہبی مسئلہ قرار دینا قوم کو گویا دھوکا دینا ہے۔ مسلمانوں کے بعض باخبر اور سنجیدہ افراد کو خود اس پر افسوس ہے کہ مجلسِ شوریٰ میں عبدالرحمٰن بن عوف اور عمرو بن عاص کی عیاریوں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہو گیا۔ جس کا نتیجہ آگے چل کر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سیاسی سازشیں تھیں۔ انہیں مذہب سے کیا سروکار۔ حضرت عثمان کا اس طرح انتخاب ہو جانے کے بعد جب حضرت علی مجلسِ شوریٰ سے بغیر بیعت کئے اُٹھ چلے تو اُنہیں قتل کی دھمکی دیکر بیعت پر مجبور کیا گیا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس طرح بیعت پر مجبور کرنا کیا اسلام کا کوئی قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ ان واقعات کا رباعی مذکورہ میں کوئی ذکر تو ہے نہیں البتہ ایک لفظ سازش ضرور کچھ اشارہ کر رہا ہے۔ اسی لفظ کو پکڑ کر مذہبی تعصب اور دل آزاری کا الزام رکھنا حسد شرارت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ یہ تو وہ واقعات ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم سبھی جانتے ہیں۔ دل آزاری تو جب ہوتی جب کسی مذہبی مسئلہ یا کسی مذہبی شخصیت کے خلاف کوئی چوٹ کی گئی ہوتی۔ ڈیر شاہد بات یہ ہے کہ بعض نوخیز افراد مجھ سے اُلجھنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نادان نہیں کہ ہر کس و ناکس سے اُلجھ پڑوں۔

مضحک صاحب کے نام سے جو مضمون شائع ہوا ہے وہ بھی شاید کسی لڑکے کا لکھا ہوا ہے مگر مجھے کیا ضرور کہ ایسے فضول اعتراضات کا جواب دوں۔ ملک اہلِ زبان سے بالکل خالی نہیں ہے۔ زبان کے پرکھنے والے ابھی تک کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ ہاں مضحک صاحب کی تحریر میں ایک اعتراض ایسا ہے جسے صاف کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ اعتراض بھی میرے کلام پر نہیں ہے بلکہ فٹ نوٹ کی عبارت پر ہے۔ بات یہ ہے کہ کاپی دیکھتے وقت میں نے رواروی میں چند فٹ نوٹ بھی لکھدئے تھے۔ جو لوگ مضمون نگاری اور انشاپردازی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جہاں دھیان بھٹکا تو لکھنا چاہتے ہیں کچھ اور قلم سے نکل جاتا ہے کچھ اور۔ مبتدا ہے واحد تو خبر بھی صیغۂ واحد میں لکھنی چاہیئے۔ مگر قلم واحد کی جگہ جمع اور جمع کی واحد لکھ جاتا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں نکالنا چاہو تو میرے خطوط میں بھی مل سکیں گی۔ اسی قسم کی غلطی میرے اُس فٹ نوٹ میں ہو گئی ہے جو "ڈگن لگی" کے متعلق میں نے کاپی دیکھتے وقت لکھدیا تھا۔ ع۔

تازہ کوئی ڈگن لگی ہے شاید

مصرع میں کوئی گنجائش کلام نہیں ہے۔ ڈگن کے متعلق نوٹ میں یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ "ڈگن اُس کانٹے سے مراد ہے جو مچھلی کے شکار کے لئے ڈور میں باندھا جاتا ہے۔" "ڈگن کانٹے سے مراد ہے" کے بدلے قلم سے یہ لکھ گیا: "ڈگن اُس کانٹے کو کہتے ہیں۔" اس سے معترض کو زبان پکڑنے کا موقع [illegible]۔

مگر معترض کا یہ قول درست نہیں ہے کہ "ڈگن لگنا محاورہ نہیں ہے۔ یا ڈگن لگتی نہیں لگائی جاتی ہے۔" نہ معترض کا یہ قول درست ہے کہ ڈگن اُس چھڑ کو کہتے ہیں جس میں ڈور باندھی جاتی ہے۔

مچھلی بازوں کی اصطلاح میں (جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ مگر میں کوئی مچھلی باز نہیں میں نے کبھی خود مچھلی کا شکار نہیں کھیلا) ڈگن نہ تو اُس چھڑ کو کہتے ہیں جس میں ڈور اور کانٹا بندھا ہوتا ہے اور نہ محض کانٹے کو کہتے ہیں بلکہ چھڑ اور ڈور اور کانٹے کے مجموعہ کا نام ہے ڈگن اور اسی ڈگن کو بنسی بھی کہتے ہیں جس میں چھڑ اور ڈور اور کانٹا شامل ہے۔ یہ تو ہوا ڈگن کا وہ مفہوم جو مچھلی بازوں کی اصلاح کے مطابق ہے۔

مگر شاعر ڈگن جب کہتا ہے جب کہ اس کے سامنے ہاتھ سے گرا دیا گیا۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کیونکہ شاعر تو کانٹے ہی سے مطلب رکھتا ہے جو اصل چیز ہے۔ چنانچہ اُستاد بحر لکھنوی نے بھی ڈگی سے کانٹا ہی مُراد لیا ہے ؎

دل مرد ماہی آب کے ہیبت سے بنے گا شکار
جس دن تری مژہ کی ڈگن ڈالے گی

جناب معترض کا یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ ڈگن لگنا محاورہ نہیں ہے۔ ڈگن لگے ہی گی نہیں۔ تو مچھلی پھنسے گی کیونکر؟ بس یہ تھی حقیقت جناب معترض کے اعتراض کی کہ آپ نے فٹ نوٹ ہی اس سہو القلم سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔

دساہتی دُر گت پر بھی اعتراض غلط ہے۔ اردو کے فصحا گت بھی دُر گت اور دساہتی دُر دسا بولتے ہیں۔ یعنی گت اور دسا میں دُر کا مفہوم شامل ہے یعنی بُرے معنی میں بولے جاتے ہیں۔ گت کہو یا دُرگت، دسا کہو یا دُر دسا دونوں کا مفہوم ایک ہے اور دونوں طرح اردو میں مستعمل ہے مگر دسا شاذ اردو میں مستعمل نہیں ہے۔

ساقی کا افسانہ نمبر

صحافتِ اُردو میں اپنی طرز کا پہلا پرچہ ہوگا

ایک ہی پلاٹ پر مُلک کے مشہور افسانہ نگار حضرات کے افسانے

مُلاحظہ فرمائیے۔ کردار نگاری و اسلوبِ بیان کی خوبیاں دیکھ کر آپ تسلیم

کرلیں گے کہ فی الحقیقت

"افسانہ شاعری اور مُصوّری کا نچوڑ ہے"

افسانہ نمبر میں کم از کم ایکدرجن نہایت بلند پایہ افسانے ہونگے۔ مندرجہ ذیل حضرات سے افسانے لکھوائے جارہے ہیں۔

نیاز فتحپوری	ایم۔ اسلم	مرزا عظیم بیگ چغتائی
قیسی رامپوری	انصار ناصری۔ بی۔ اے	فضلِ حق قریشی دہلوی
ناکارہ حیدر آبادی	سید محمود مورّخ	ابو طاہر داؤد
ماہر القادری	محمد صادق ضیا	صادق الخیری دہلوی

جرعات

جلد ۱۰	ساقی دہلی - بابت ستمبر سنہ ۳۴ء	نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

دلگیر اکبرآبادی سے جُدا ہونے کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ریاض خیرآبادی کے سانحۂ ارتحال کی خبر آئی۔ دل کے زخموں سے پھر خون رسنے لگا۔ ایسے لوگ اب کہاں سے آئینگے ؎

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے　　　لوحِ زمیں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

مرحوم نے گو نوّے برس کی عمر پائی اور بادی النظر میں اُن پر یہ مثل بھی اصل ہے کہ "گر بیبر نو د سالہ بمیرد عجب نیست" مگر ریاض کا مرنا اُردو لٹریچر کیلئے فی الحقیقت ـــــ عجب اِک سانحہ سا ہوگیا ہے۔ میر ناصر علی کی موت کے ساتھ نثر کے سر کی بادشاہی لُٹی، ریاض کے اُٹھ جانے سے نظم کا سُہاگ بھی مِٹا۔ اِنا للّٰہ و اِنا الیہ راجعون۔

جناب "عقیل" ناظر حسین جعفری نبیرۂ حضرت ریاض مرحوم کا خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

ساقی دہلی کے نام

"شرر صاحب نے داعیِ اجل کو جب لبیک کہا تو اُردو والوں کو اُردو کے "سرمونڈی" اگر نہیں تو "نگوڑی" ہونے میں تو کوئی شک و شبہ ہی نہیں رہا، لیکن جب دہلی کی طرف نظر اُٹھی تو سوکھے دھانوں میں پھر پانی پڑ گیا یہ دیکھکر کہ ناصر علی، اُردو کا باپ تو ابھی سر پر موجود ہے۔ لیکن آہ جب ـــــ جس وقت کا کھٹکا تھا وہ وقت آ گیا آخر ـــــ یعنی ناصر علی بھی جب مر گئے تو اُردو کے یتیم ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں رہا۔ یہ "صلائے عام" تھی کہ اُردو بے وارث ہوگئی تاہم "باپ" کے غم میں دلگرفتہ "دلگیر" ابھی موجود تھا اسلئے ڈوبتا تنکے کے سہارے زندہ تھا لیکن اب جبکہ دلگیر بھی اکبرآباد کا تنگ قفس چھوڑ کے "خُلد آشیاں" ہو چکے تو کیا رہ گیا ـــــ اب کیا رہا ہے جسپہ رقیبوں کا ڈر کریں ـــــ ہاں اس کلبۂ احزان میں ایک شمع اب بھی روشن تھی جو "تمام رات کا افسانہ" تھی۔ یہ جھلملاتی ہوئی شمعِ سحر، حضرت ریاض تھے جو تقریباً پوری ایک صدی کی زندہ تاریخ تھے، پر آہ! شعر و ادب کا یہ روشن آفتاب بھی ۳۰ رجولائی ۱۹۳۴ء کو بالآخر خیرآباد میں بوقت ۳ بجے سہ پہر "دن دوپہر" غروب ہوگیا ؎

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　　زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے"

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

اس پرچہ میں چند نہایت پاکیزہ مضامین شامل ہیں۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا مضمون ایک دلچسپ تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے۔ خواجہ صاحب کو اس قسم کے اکثر واقعات یاد ہیں جو ساقی کی آئندہ اشاعتوں میں پیش کئے

جائینگے۔ ساقی کی گذشتہ اشاعت میں جناب دیوانہ بریلوی کا نامکمل مضمون "بیوی" کا انتخاب شائع ہوا تھا جسے سید آلِ رضا ماہری صاحب نے مکمل کیا تھا۔ اس اشاعت میں جناب سید ضمیر احمد ہاشمی کا تکملہ شائع کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر برکاس نے جاپان سے ایک تحقیقی مضمون بھیجا ہے جو اس اشاعت میں شامل ہے۔ بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ دہلی کے جب اچھے دن تھے اور لال قلعہ آباد تھا تو بیگمات میں رواج تھا کہ شب ماہ میں اپنے ڈوپٹوں میں جگنو ٹنکوا لیا کرتی تھیں۔ اسے آسمان پر پھیلے ہوئے ستاروں کا جواب سمجھیئے۔ جناب شہاب نے دلگیر مرحوم کا افسانہ اس قدر دلچسپ لکھا ہے کہ اُسکے دورانِ مطالعہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مرحوم سامنے بیٹھے مزے مزے کی باتیں سُنا رہے ہیں۔ صاحبِ مضمون کی یہ بڑی کامیابی ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ "خطوط کی ستم ظریفی" کی آخری قسط اس پرچہ میں شامل ہے۔ اس مضمون کے متعلق صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ چغتائی صاحب کا مضمون ہے۔ "الفاظ کی تاریخ" جناب ماہر القادری نے نہایت تحقیق و کاوش سے لکھی ہے۔ یہ مضمون بہت قابلِ قدر ہے اور ہر صاحبِ ذوق کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔ جناب طاہر قریشی اپنے بلند پایہ تراجم کی وجہ سے صحافتِ اُردو میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ساقی کے علاوہ آپ کے مضامین "ادبی دُنیا" اور "ہمایوں" میں بھی شائع ہوکر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "رخصت" موپاساں کے ایک دلچسپ مضمون کا کامیاب ترجمہ ہے۔ جناب تمنائی بھی عمدہ ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ "فقیر کا گیت" ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جناب منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دُنیا نے ساقی کے "افسانہ نمبر" کو بہت پسند فرمایا اور اپنے پرچہ کی تازہ ترین اشاعت میں اُس پر ایک طویل ریویو بھی لکھا ہے۔ آپ نے جن الفاظ میں میرا اور ساقی کا ذکر کیا ہے اُن پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ ایک زبردست نقاد اور فلسفی ادیب نے ساقی کی خوبیوں کا نہ صرف فیاضانہ اعتراف کیا ہے بلکہ محبت و خلوص سے سراہا بھی ہے۔ یہ چونکہ تحسینِ سخن شناس ہے اس لئے میں اسے ساقی کے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں اور خوش ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

لاہور کے مشہور رسالہ "ہمایوں" کا "افسانہ نمبر" یکم اگست کو بڑی آب و تاب سے شائع ہوا۔ حامد علی خاں صاحب ایک مشہور جرنلسٹ اور ادیب ہیں۔ ہمایوں کا صرف ایک خاص نمبر سالگرہ کے موقع پر شائع ہوتا تھا مگر اب ایک اور خاص نمبر حامد علی خاں صاحب کی مساعی سے شائع ہوا ہے۔ ہمایوں اپنی سنجیدگی و متانت کے لئے مشہور ہے۔ افسانہ نمبر میں بھی یہ امتیازی شان برقرار رکھی گئی ہے۔ "افسانہ نمبر" میں جتنے افسانے ہیں اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے شوق سے نہ پڑھا جائے۔ تین افسانوں پر بڑے بڑے انعامات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ رنگین اور سادہ تصاویر سے بھی مزین ہے۔ ہفت رنگ سرورق کی وجہ سے افسانہ نمبر کو "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" سمجھیئے۔ اس میں صرف ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جناب حامد علی خاں صاحب کا کوئی ترجمہ اس میں شامل نہیں ہے۔ حامد علی خاں صاحب کے تراجم کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اصل سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ثبوت کے لئے آپ دور نہ جائیں۔ "افسانہائے عشق" کا کوئی سا افسانہ دیکھ لیں۔ ناظرینِ ہمایوں اس کمی کو ضرور محسوس کرینگے۔ "افسانہ نمبر" کی قیمت دس آنے ہے مگر مستقل خریداروں سے جداگانہ قیمت نہیں لی جائے گی۔

شاہد

اپالو ــــــ

میں سورج کا دیوتا ہوں ـــــ اپالو میرا نام ہے۔

کائنات کے ذرّے میرے محکوم ہیں ــــ نظامِ قدرت میرے دم سے قائم ہے ــــ

میرا تنفس بادِ سموم ہے ــــ میرا عرقِ جبیں آتشِ سیال ــــ میرے تبسم میں بجلی کی چمک ہے ــــ میرے ترنم میں بادل کی گرج ــــ

یہ عطارد و زہرہ ــــ یہ زحل و مشتری ــــ یہ شہابِ ثاقب ــــ یہ چاند اور ستارے ــــ یہ گردشِ بریں کی تبدیلیں ــــ یہ سب کیا ہیں ؟ ــــ

میری شبستان کے ٹمٹاتے ہوئے چراغ ــــ میرے آتش فشاں بستر سے جھٹکے ہوئے شرر انگیز باسی پھول ــــ میری بساطِ تپش پر بکھرے ہوئے برق پاش مُہرے ــــ انوارِ شرارت سے معمور عہدِ طفلی میں ٹھکرائے ہوئے مشتعل کھلونے ــــ

یہ کہکشاں ؟ ــــ میرے پامال شدہ راستہ کا غبارِ منجمد ــــ

یہ شفق کی سُرخی ؟ ــــ میرے پُرغضب چہرے کا عکسِ دور افتادہ۔

یہ بادلوں کے بگولے ؟ ــــ میرے نغمات کے متشکل ہیولے۔

میں آگ ہوں ــــ کبھی نہ بجھنے والی آگ ــــ جلا دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں ــــ

وقت اور جگہ کے تعین سے آزاد ہوں ــــ ازلی ہوں ــــ ابدی ہوں ــــ ہمیشہ سے ہوں ــــ ہمیشہ رہونگا ــــ فضائے بسیط کی لامحدود وسعتیں میری آماجگاہ ہیں۔

یمین و یسار میں ــــ چپ و راست میں ــــ زیر و زبر میں ــــ غرض شش جہت میں ــــ دُنیائے آب و گل میں ــــ عالمِ جاودانی میں ــــ ثوابت کی دُنیا میں ــــ سیاروں کی نگری میں ــــ خواب میں ــــ بیداری میں ــــ ہر جگہ ہر مقام پر ــــ صبح و مسا آٹھوں پہر ــــ میری خدائی کا ڈنکا بجتا ہے ــــ

میں دیوتاؤں کا دیوتا ہوں۔ خداؤں کا خدا ــــ

کرۂ ارض کے مکین میری پرستش کرتے ہیں ــــ باشندگانِ مریخ میرے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں ــــ میں اُن کا معبود ہوں ــــ وہ میرے عبادت گذار بندے ــــ میں خالقِ اکبر ہوں ۔ رب العالمین ــــ جبار ہوں ۔ قہار ہوں رحیم و کریم ــــ

میرا جسم لوہے کا ہے ۔ میری استخواں فولادی ــــ رگوں میں خون نہیں سیماب ہے ــــ سیماب نہیں برقِ سوزاں ہے ــــ آتشِ سیال ہے ۔ تڑپ ہے ۔ گداز ہے ــــ

صبح سے شام تک، شام سے صبح تک ۔ سورج سے آگے ہوں ۔ مصروفِ سفر ہوں ــــ تھکن ہے ۔ نہ ماندگی ــــ



اپالو

Calcutta Art Press, Delhi.

اضمحلال ہے نہ پژمردگی ـــــ تھمتا نہیں ۔ رُکتا نہیں ۔

چوبِ طوبیٰ سے میری رتھ بنی ہے ـــ دوزخ کی بھٹی میں پہیے ڈھلے ہیں ـــ شیر ببر میری گاڑی کو کھینچتے ہیں ـــ وہ جنگل کے بادشاہ ہیں ۔ مگر میرے غلام ـــ وہ ازلی سرکش ہیں ۔ مگر میرے مطیع و فرمانبردار ۔ نہیں غصہ آتا ہے ـــ وہ غضبناک ہوتے ہیں ـــ لیکن دبک جاتے ہیں ـــ سہم جاتے ہیں ـــ وہ خائف رہتے ہیں میرے جلال سے ـــ ڈرتے ہیں میرے رعب و داب سے ـــ اشارے پہ چلتے ہیں ۔ اشارے پہ تھمتے ہیں ۔ حاجتِ لگام ہے نہ چابک کی ضرورت ـــ

ملاگیری بادلوں کے نیلگوں شگافوں میں ـــ برف [illegible] کے بلند کاندھوں پر میری سواری نکلتی ہے ـــ ہواؤں کو چیر کے ـــ فضاؤں کو پامال کر کے ـــ

میں تمام دُنیاؤں کو ٹھکراتا ہوا چلتا ہوں ـــ میں بدل دیتا ہوں خزاں کو بہار میں ـــ صبح کو شام میں ـــ حُسن کو عشق میں ۔ ناز کو نیاز میں ـــ

میں چاہوں تو سمندر کنارے سے دُور ہٹ جائے ـــ دریا واپس پہاڑوں پر چڑھنے لگیں ـــ آگ میں خُنکی پیدا ہو جائے ـــ اور برف میں تمازت ـــ آندھیوں کا طوفان کوہسار کی شکل میں منجمد ہو سکتا ہے ـــ فلک بوس وزنی پہاڑ فضا میں پرواز کر سکتے ہیں ـــ میرا تخیل مجسم ہو جاتا ہے ـــ مادی اشیا غیر مرئی ـــ بے جان پیکر ذی حیات بن جاتے ہیں ـــ فنا و بقا میرے حکم سے ہے ـــ مالکِ جزو کل ہوں ۔ حاکمِ ارض و سما ہوں ۔

لیکن کوئی نہیں جانتا ۔ کوئی نہیں سمجھتا ـــ میرے مسلسل سفر کی غایت ؟ ـــ میری بے چینی کی وجہ ؟ ـــ میرے اضطراب کا سبب ؟ ـــ ماورائے ادراک ہے ـــ فہمِ بشر سے دُور ہے ـــ کسی کو معلوم نہیں ۔ کچھ خبر نہیں ـــ کس جستجو میں ہوں ؟ ـــ مجھے کس کی تلاش ہے ؟ ـــ

شاید بلکہ یقیناً نمودِ صبح کی دیوی اوردرا ـــ چاند ستاروں سے خراج لینے والی عروسِ فلک نرم و نازک، حسین و جمیل اوردرا ـــ اس کا جواب دے سکتی ہے ـــ وہ مجھ سے آگے ہے ـــ محوِ خرام ہے ۔ دو سو قدم کے فاصلے پر ـــ میری نظر کے سامنے ـــ میرے تخیل میں ـــ میرے تصوّر میں ـــ اعماقِ قلب میں ـــ

میری جستجو لاحاصل ہے ـــ میری کوششیں بے سود ـــ میں اُسے پکڑ نہیں سکتا ـــ میں اُسے چُھو نہیں سکتا ۔ وہ سبک خرامی میں بھی تیز رفتار ہے ـــ میں معذور ہوں اس بعد کو قرب میں نہیں بدل سکتا ـــ

میں قادرِ مطلق ہوں اور مجبورِ محض ـــ معبودِ حقیقی ہوں بندگی کے نقاب میں ـــ حاکمِ ازلی ہوں محکومیتِ ابدی کے پردے میں ـــ سرکش مرد ہوں ـــ نسائیت کی بارگاہ میں جُھکا ہوا ۔

آہ ! ـــ اوردرا ـــ

فضلِ حق قریشی دہلوی

بسلسلہ
"بیوی کا انتخاب"

فرخندہ جس طرح دفعتاً آئی تھی اُسی طرح یکلخت چلی گئی۔ نشاط کو کوئی موقعہ ہی نہیں مل سکا کہ اُس کی موجودگی میں اپنے ذہن میں حالات کا تجزیہ کر سکتی یا اپنے پیشِ نظر اس تصور کو لا سکتی جو حالات کی تبدیلی سے وقوع میں آ سکتے تھے۔ کبھی اسکو اپنی غیر متوقع کامیابی کا احساس ہونے لگتا اور انسانی کمزوری کے باعث اُسکو جب اپنی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کا خیال آتا تو اُس پر ایک عجیب بیقراری مستولی ہو جاتی۔ کبھی اُس کے دل میں جمال کی طرف سے نفرت اور حقارت کا عارضی جذبہ پیدا ہونے لگتا۔ وہ خیال کرنے لگتی کہ مرد بھی کس قدر خود غرض ہوتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کے جذبہ اور محبّت کے پاک اثر میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جمال کو جب اُس سے محبّت تھی تو پھر وہ فرخندہ کی طرف کیسے رجوع ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی محبّت کی رو میں وہ جمال کی اس کمزوری سے درگزر کرنیکے لئے تیار ہو جاتی۔ نشاط کا مضطرب سینہ انہیں خیالات کا تھوڑی دیر تک آماجگہ بنا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ ادراک نے جذبات کے فوری اثر کو زائل کر دیا اور نشاط کے سامنے حالات کو واضح تر بنا دیا نشاط کو اپنی ہستی ایک ایسی مظلومہ کی مانند نظر آنے لگی جو فرائض کی خاطر اپنے عزیز ترین ارمانوں کو قربان کر دیتی ہے۔

جمال ایک متلاشی شخص تھا جو حُسن و عشق کے جذباتی تلاطم سے مجبور ہو کر کورانہ تجسس میں مشغول معلوم ہوتا تھا۔ لیکن فرخندہ کے مقابلہ میں نشاط کو اپنی اور جمال دونوں کی ہستیاں حقیر معلوم ہونے لگی۔ عالی حوصلہ ہونیکے علاوہ فرخندہ محبت کی حقیقت سے آشنا نظر آنے لگی۔ جس امر کے لئے نشاط نے مجبوراً رضامندی دی تھی اور جو جمال کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ فرخندہ اُسی امر کے لئے بخوشی تیار تھی۔ اس سے زیادہ اور کیا نیکی۔ ایثار اور اظہارِ محبّت ہو سکتا تھا۔

ان خیالات کے ساتھ ہی نشاط کو اپنے وعدہ کا خیال اور اپنے والد مرحوم کی نصیحت یاد آنے لگی۔ وہ جس قدر غور کرتی اُسی قدر اُس کا عزم راسخ ہوتا جاتا۔ کہ اگر جمال سے کوئی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا مستحق تھا تو وہ فرخندہ ہی تھی۔ نشاط کا یہ ارادہ مصمم ہو چکا تھا اور اُس کے باعث اُسکو بہت حد تک یکسوئی اور طمانیت نصیب ہو رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے فوراً ہی فرخندہ کو ایک محبّت نامہ لکھا اور اس امر کی اُمید ظاہر کی کہ وہ اُسکو اپنے ہاتھوں دُلہن بنا سکے گی۔ خط کے آخر میں اپنی محبّت کا واسطہ دلا کر اصرار کیا کہ وہ نشاط کو اُس کے عزمِ راسخ میں متزلزل کرنے کی کوشش نہ کریگی، نشاط کے نزدیک جمال اب وہ خیالی دیوتا نہ تھا جس کی وہ ایک زمانہ میں پرستار تھی۔ ہر چند وہ اب بھی اپنے دل میں۔ جمال کی محبّت کا اُسی قدر شغف موجود پاتی تھی۔

جمال کو ایک گونہ تذبذب بے چین کئے دیتا تھا۔ ایک طرف تو اُسکو نشاط کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی آتی تھی اور دوسری طرف فرخندہ کے گذشتہ رویہ سے اُس کے دل میں فرخندہ کی وقعت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اُسکے لئے کوئی قطعی فیصلہ فوراً کرنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ فرخندہ اپنے غم میں نڈھال ہو رہی تھی۔ ادھر تو ماں جیسی شفیق ہستی کا

[redacted]

سایۂ یلکخت سر سے اُٹھ گیا۔ اُدھر اُس نے اپنے مستقبل کا خاتمہ خود ہی کردیا تھا۔ لیکن اپنے ایثار کے باعث اُسکو بہت حد تک طمانیت نصیب ہوچکی تھی۔ اگر وہ خود کامران نہیں ہوسکتی تھی تو کم ازکم دوسرے کو خوش نصیب بنا سکتی تھی اس خیال سے اُس کی ڈھارس اور بھی بندھی ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ شب کا غلبہ ہونا شروع ہوا۔ اور کسی نہ کسی طرح جمال۔ نشاط اور فرخندہ تینوں شب کی پُرسکون آغوش میں بڑی دیر تک مضطرب رہنے کے بعد محوِ خواب ہوگئے۔ نشاط کم وبیش آدھی رات تک کروٹیں بدلتی رہی اور تب جاکر اُسکو نیند میسّر ہوسکی۔ گذشتہ شام کے خیالات کا اس قدر ہجوم تھا کہ سونے پر بھی وہ خیالات نشاط سے وابستہ معلوم ہوتے تھے۔ صبح کاذب کا آغاز ہوگا کہ نشاط یلکخت پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کمرے میں گھوم رہی تھی۔ کبھی کسی چیز سے ٹکراتی تو دوسری طرف مُڑ جاتی۔ وہ برابر بڑبڑا رہی تھی اور ایک گونہ فرطِ مسرّت سے وارفتہ سی معلوم ہوتی تھی۔ اور خوابیدگی کی حالت میں جو دل میں گذر رہا تھا وہ اس کے زبان پر جاری تھا۔ جمال کا نام زبان پر بار بار آرہا تھا اور وہ غیر مربوط جملے جو اُس کی زبان سے نکل رہے تھے۔ کبھی پوری طرح ادا ہوتے اور کبھی محض بڑبڑاہٹ سی معلوم ہوتے۔

"جمال۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو .... فرخندہ پیاری تم سا فرشتہ خصال اور کوئی نہیں ہوسکتا ..... تم نے مجھے وہ چیز عطا کی جس سے میں مایوس ہوچکی تھی۔ تمہاری بدولت میری زندگی خوشی سے بسر ہوسکے گی .... جمال! پیارے جمال! تم کھڑے کیوں ہو۔ ذرا بیٹھ جاؤ ..... دیکھو مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ بالآخر ہماری شادی ہو رہی ہے .... یا اللہ! میں کہیں دن میں تو خواب نہیں دیکھ رہی .... جمال! فرخندہ بھی کیا پاک ہستی ہے۔ تم اور میں اُس کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے ...... کیا یہ سب اسی کی بدولت نہیں" بہت سی بڑبڑاہٹ میں کم ازکم یہ جملے صاف سُنائی دے رہے تھے۔ نشاط کی حالت بتدریج اور بھی زیادہ مجذوبانہ ہوتی جارہی تھی۔ کہ یلکخت وہ دروازے کی طرف یہ کہتی ہوئی دوڑی! ...... "اچھا جمال۔ پیارے۔ خدا حافظ۔ دیکھو شام کو ضرور آنا فرخندہ بھی ہوں گی۔ تب ہی تاریخ مقرر کرسکیں گے ...... اب میں تمہاری ہوچکی اور تم میرے۔ لو مجھے سینے سے چمٹ جانے دو" نشاط کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ کمرے سے بھاگتی ہوئی۔ برآمدہ میں چلی جارہی تھی۔ کہ دفعتاً اُس کا سر برآمدہ کے ایک ستون سے بہت زور سے ٹکرایا۔ اور اُس کی آنکھیں جو ابتک بند تھیں کُھل گئیں۔ آنکھوں کا کُھلنا تھا کہ وہ ایکدم فرش پر جا پڑی ....

نشاط کی روح ایک خوشی کے عالم میں بالآخر اِس دُنیا کی جدوجہد سے ہمیشہ کیلئے آزاد ہوچکی تھی۔

ضمیر احمد ہاشمی۔ ایم۔ اے

قطعۂ تاریخ انتقال حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم

در صنعت تخرجہ

(از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی۔ گیا دی ٹریل ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) بی۔ایل۔ ایڈووکیٹ

اب تک یہی گمان ہے کوئی کو ستانہ ہو
مجھکو تصور ایسا ہی ہردم ریاض کا

وہ شوخیٔ زبان وہ بیاں اب کسے نصیب
تھا شاعری میں اک نیا عالم ریاض کا

وہ خمریاتِ تازہ کے اب جامِ نو کہاں
باقی تھا میکشوں میں فقط دم ریاض کا

سحر البیاں کی ہائے وہ سحر آفرینیاں
دل کو خیال کیوں نہ ہو پیہم ریاض کا

خالی ہیں بوتلیں تو شکستہ ہی جامِ مے
سُنسان میکدہ ہی کہ ہے غم ریاض کا

جو جانِ شاعری تھا وہی ہائے اُٹھ گیا
کیا خاک لکھیں مرثیہ اب ہم ریاض کا

نکلی ہے "آہ" دل سے رسا از سرِ الم
ہر اک جگہ ہے ہند میں ماتم ریاض کا

۱۹۴۱
۶
سنہ ۱۹۳۴ء

چندر بھاگا

سنہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے کہ چندر بھاگا مہاراجہ گوالیار کے محل میں تھی، نہایت قبول صورت منتظم خوش گلو علم موسیقی کی جاننے والی ہر چیز میں سلیقہ، ہر کام میں دخل ایسی ہردلعزیز تھی کہ مہاراجہ نے اُس کا دل بہلنے کیواسطے پچاس ساٹھ سہیلیاں رکھدی تھیں، اور ڈہاری نوکر رکھ کر اُسے گانا سکھایا تھا، دربار میں اُسی کا حکم چلتا تھا عدالت میں اُس سے مشورہ لیا جاتا، مہاراجہ صاحب کو اُس سے بہت محبت تھی۔ چھ سات کروڑ کا زیور بنوایا اُس کے محل میں ہروقت ارباب نشاط کا مجمع رہتا۔ اُس کی سہیلیاں سب گانے اور ناچنے میں طاق تھیں۔ مہاراجہ کی رسوئی کے پاس اگر یہ موجود نہ ہو تو وہ خاصہ نوش نہیں فرماتے تھے، خدا نے اُسے دو بیٹے عطا کئے تھے۔ بڑے کا نام بھیا گنپت راؤ چھوٹے کو کنورجی کہتے تھے۔ بھیاجی علم موسیقی میں شہرۂ آفاق تھے اور ہندوستان میں ان کی خاص شہرت تھی۔ اور چھوٹے کی تعلیم باقاعدہ جاری تھی، اور دربار میں ہروقت موجود رہتے۔ سلیقہ سلطنت میں ان کو رسوخ کامل حاصل تھا۔ ان کے لئے دن عید تھا اور رات شبرات تھی، خدا نے سب طرح کا آرام دیا۔

چندر بھاگا کی عزت اور توقیر اسی واسطے تھی کہ اور رانیوں سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا، دوسری رانیوں کو اس کا بہت رشک تھا۔

بے نیاز تیری باتیں تو ہی جانے، جو عزت اور وقار خدا نے چندر بھاگا کو دیا تھا بڑی بڑی رانیاں اسکا رشک کرتی تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ اُس کے دربار میں ایک طبلیا تھا جس کا نام گھسیٹ خاں تھا، بدصورت۔ بدسیرت تنگ پیشانی۔ کوتہ گردن، سیاہ فام بدقوارح بدعقل بھگا بیوقوف، پچا سا چہرہ، چیاں سی آنکھیں اس کے پاس چندر بھاگا جاتی ہے اور کہتی ہے تو ہمارے محل میں رات کو آنا ہمارے ساتھ سونا۔

یہ سُن کے اُس غریب کا خون خشک ہوگیا، ہاتھ باندھ کر عرض کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں جیتا چنوا دیا جاؤں۔ ارے یہ مہاراجہ کی عملداری ہے اور خودمختار بادشاہت ہے اگر ذرا بھی خبر ہوجائے تو آدمی کی گردن کاٹ لی جائے۔ اور خطا معاف بیوی جی مجھے تو آپ کی تقدیر کچھ گردش میں معلوم ہوتی ہے کہ اتنی بڑی سلطنت اتنے بڑے راج پاٹ کو چھوڑ کر آپ مجھ جیسے کم ظرف غریب فقیر پر التفات فرماتی ہیں ارے خدا کا شکر بھیجو کہ اُس نے دولت دی، ریاست دی، حکومت دی، اولاد سے مالامال کیا، ہم دو چار سو آدمی تمہاری بدولت روٹی پاتے ہیں۔ ہم کو آپ پرورش کرتی ہیں، ان داتا ہو ذرا ہوش میں آؤ اور آگا پیچھا سوچ لو۔

ہمیں تو معاف کرو ہم سے یہ نمک حرامی نہ ہوگی۔ سراسر جان کا ضرر، آبرو کا خوف، روزی کا زیان ہو خدا جانے کس حالت سے مارے جائیں، راجہ کتوں سے نچوا ڈالے شیر کے منہ میں دیدے جو چاہے کرے، تم دو چار دن اپنے

دل میں خیال کرو آدمی کو ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ پیچھے پچھتانے سے کیا فائدہ جو مرتبہ تمہیں خدا نے دیا ہے اچھے اچھے بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

یہ سُنکر دو چار دن تو چُپ ہو رہی پھر ایک دن موقع پاکر کہا۔

گھسیٹ خاں معلوم ہوتا ہے تمہاری قضا قریب آگئی ہے کہ تم ہمارا حکم نہیں مانتے ہو! اگر تم ایسا نہ کرو گے تو میں مہاراجہ سے کہدوں گی کہ گھسیٹ خاں میرے محل میں گھس آیا اور مجھے خراب کیا۔ اس طرح چھپے چوری تو شاید دو چار مہینے زندہ بھی رہ جاؤ لیکن اگر میں راز فاش کردوں گی تو تم کو اُسی دن سُولی مِل جائے گی۔ مہاراجہ کا نام سُنکر گھسیٹ خاں کانپ اُٹھا اور چندر پربھا کے قدموں پر گر پڑا۔ کہ بیوی خدا کے واسطے اپنے ہاتھ سے گردن کاٹ لو وہ بہتر ہے۔

چندر پربھا نے کہا۔ تو تمہاری زندگی اسی میں ہے کہ ہمارا کہنا مانو۔

گھسیٹ خاں نے دیکھا کہ اس وقت شراب کے نشے میں چُور ہے کوئی نصیحت اُسے کارگر نہ ہوگی۔ اس طرح ٹالا کہ اچھا بیوی مجھے بھی اپنا آگا پیچھا سوچ لینے دو، دو دن کے بعد اس کا جواب دونگا مرنا تو دونوں طرح ہے، بُری خبر تو سب سے پہلے کھل جاتی ہے غرض اُس رات کی آفت ٹلی اور اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہدیا کہ راجہ کو ابھی اطلاع نہ دینا۔ وہ خاموش رہی۔

اب گھسیٹ خاں اپنے دل میں غور کرنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے ہم لوگوں کی تقدیر گردش میں آگئی ہے اور موت دونوں طرح ہے، اگر چندر پربھا کا حکم مانتا ہوں تو جس سرکار کا برسوں سے نمک خوار ہوں اُسکی نمک حرامی ہوتی ہے اور نہیں مانتا ہوں تو جس وقت ایک رانی الزام لگائے گی اُس وقت راجہ میری کیونکر سُنے گا۔ ہائے بُری طرح پردیس میں موت آئی۔ یہ کہہ کر خوب دل کھول کر رویا، جب خوب رو چُکا تو ایک بات اُس کی سمجھ میں آئی۔

تیسرے دن چندر پربھا سے کہا۔ میں نے خوب سوچ لیا اور سمجھ لیا کہ دونوں طرح میری اور تمہاری موت ہے، ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، اگر تم مجھے چاہتی ہو تو مہاراجہ کی عملداری سے باہر نکل چلو، زندگی بھر تمہارا غلام بنا رہوں گا اور میرا بھی کوئی نہیں ہے، نہ جورو ہے نہ بچے۔

اُس نے سوچکر کہا بات تو اچھی ہے، اس کے ساتھ کی سہیلیوں میں ایک لڑکی تھی حبشن جس کا نام نظیر تھا اور ایک راج کنور جو بہت خوش گلو اور حسین تھی، اس طرح کی بیس سہیلیاں انتخاب کیں اور بڑے لڑکے کو جس کی عمر پندرہ برس کی تھی اُنکو ساتھ لیا۔

آٹھ صندوقچے جواہرات اور زیور کے جن کی قیمت چھ کروڑ تھی، دو تین لاکھ کے نوٹ نقد باندھ کر گھسیٹ خاں سے کہا۔ کہاں چلنا چاہیئے۔ اُس نے کہا سب سے بہتر تو آپ کے واسطے لکھنؤ ہے، اتنی دور کی خبر تو راجہ کو بھی برسوں نہ ہوگی۔ ایک دن مہاراجہ کہیں شکار کو گئے ہوئے تھے موقع پاکر سب کو لے کر سیدھا لکھنؤ کا ٹکٹ لیا۔

یہاں آکر مُہرا نے نخاس میں کرایہ کو ایک مکان لیا۔ صبح کو یہ خبر لکھنؤ میں منتشر ہوئی کہ چندر پربھا کا ایک

حسین گوالیار سے آئی ہے جو علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی اور بہت خوبصورت ہے۔
سب سے پہلے گھسیٹ خاں اپنی برادری سے ملنے گئے سب نے ان کو آسودہ حال اور عمدہ پوشاک سے آراستہ پیراستہ دیکھکر (اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ چندر بھاگا بھی ہے) دعوت کرنا شروع کی "استاد کل تو ہمارے یہاں سوکھی روٹی قبول فرمایئے۔
سب ڈھاریوں نے تو گھسیٹ خاں کی دعوت کی، چندر بھاگا کی دعوت لکھنؤ کی تمام رنڈیوں نے کی سب سے پہلے چودھرائن صاحب نے نہایت دھوم دھام سے ان کی دعوت کی۔
اب جس نے دیکھا اُس نے مان لیا کہ چندر بھاگا کی صورت شکل کی تو لکھنؤ میں ایک رنڈی بھی نہیں ہے۔ نہ ایسا گانا کوئی جانتی ہے نہ ایسا کسی کا گلا ہے۔
نواب محسن الدولہ نواب ممتاز الدولہ اور دیگر نوابان لکھنؤ نے چاہا کہ چندر بھاگا ہماری ملازمت قبول کرے اور بڑی بڑی تنخواہیں دینے کو تیار تھے مگر کسی کی دعا قبول نہ ہوئی۔
ایک ہزار روپیہ صرف اپنے مجرے کا مقرر کیا تھا شہر میں اور بیرون شہر اُس سے کچھ زائد اس پر بھی ہر شادی میں جو صاحب دولت تھے ہمت کر کے چندر بھاگا کو بلاتے تھے، شہروں شہروں اُس کی شہرت پھیل گئی لوگ دُور دُور سے شکل دیکھنے آتے تھے جس زمانہ میں شہر کی تمام رنڈیاں چندر بھاگا کو دعوت دے رہی تھیں اور قریب قریب کوئی دن دعوت سے خالی نہیں جاتا تھا کیونکہ لکھنؤ میں سات سو طائفہ فقط گھونگرو بند تھا۔ یعنی سات سو گانے والیاں تھیں، دوسری رنڈیوں کا کچھ شمار نہ تھا اس کی دعوت کا کیا ٹھکانا ایک دن جاؔدی نے ان کی دعوت کی، جاؔدی شہر کی نامی رنڈی تھی اور نواب خورشید مرزا کی نوکر تھی، نواب خورشید مرزا سات سو کے تنخواہ دار تھے، یہ دعوت چندر بھاگا کو بہت پسند آئی کیونکہ اس میں شراب کی کثرت تھی اور چندر بھاگا کو شراب کا بہت شوق تھا نواب خورشید مرزا بھی شراب پیتے تھے اور گھسیٹ خاں بھی شراب کے عادی تھے۔
رفتہ رفتہ جاؔدی اور چندر بھاگا میں بہت میل ہو گیا۔ یہاں تک کہ دونوں میں دو پٹہ بدل ہو گئی۔ اور دونوں بہنیں بن گئیں اب کبھی چندر بھاگا جادی کے یہاں آتی ہیں اور رات رات بھر رہتی ہیں گھسیٹ خاں بھی ساتھ ہوتے ہیں، اور کبھی جاؔدی مع نواب خورشید مرزا کے آتی ہے اور رات رات بھر مہمان رہتے ہیں۔
نواب خورشید مرزا کے پاس ایک آدمی نوکر تھا چار روپے مہینے کا اُسے فضلو کہتے تھے، میاں فضلو نے جو دیکھا کہ چندر بھاگا اکثر یہاں آتی ہیں اور بہت خوش گلو ہیں اور خوبصورت ہیں اپنی مالکہ جاؔدی سے کہا کہ بی بی خدا جانتا ہے کہ میں نے ایسی حسین ایسی خوش گلو آج تک نہیں دیکھی میری جان ان پر جاتی ہے اگر مجھ کو بے داموں کا غلام بنالیں تو کچھ عذر نہ ہوگا ان کا گانا تو ہمیشہ سُننے میں آئیگا۔
اُس نے کہا خبردار اُس کا نام بھی آج سے نہ لینا، تیری کیا ہستی ہے ٹکے کا نوکر، بڑے بڑے رئیسوں کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

پھر دو چار دن کے بعد نواب خورشید مرزا سے کہا۔ وہ بولے کچھ شامت آئی ہے اتنے جوتے پڑیں گے کہ کھوپڑی گنجی ہو جائیگی، تیری کیا ہستی ہے وہ ہم جیسے دس رئیسوں کو مول لے کر چھوڑ سکتی ہے مگر میاں فضلو کے سر سے عشق کا جن نہیں اُترتا۔

بہت دنوں کے بعد ایک دن چندر بھاگا جادی کی مہمان تھی اور کچھ ایسی شراب چلی کہ سب بیہوش ہو کر الگ الگ کمرے میں اپنی اپنی مسہری پر پڑ رہے۔

میاں فضلو کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا اور جا کر چندر بھاگا کے وصال کے مزے لوٹنے لگے۔

اتنے میں اُس کا نشہ اُترا وہ سمجھی گھسیٹ خاں ہے، کہنے لگی کیوں گھسیٹ خاں یہ کیا حرکت ہے کہ دوسرے کے مکان میں بے غیرت تجھے شرم نہیں آتی۔

اُس وقت میاں فضلو نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور کا غلام فضلو ہے تب وہ بہت غصہ میں آئی اور کہا۔ اُو بے ادب یہ کیا گستاخی کی اب تیری کیا سزا ہونا چاہیئے۔ اُس نے کہا حضور چاہے مار ڈالیں میں تو آپ کے اوپر مدت سے جان دیتا ہوں اپنی غلامی میں مجھے رکھ لیجئے آپ کی اطاعت سے عمر بھر باہر نہ ہونگا۔ یا اپنے ہاتھ سے میری گردن کاٹ ڈالیے، میں نے اپنا خون آپ کو معاف کیا۔ زندگی میں تو حضور کا دامن نہیں چھوٹ سکتا۔ اُس کے دل میں کچھ رحم آگیا دو سو روپیہ کا ایک نوٹ دیا اور کہا جاؤ ہمارے واسطے ایک مکان کرایہ کا لو ہم اپنا اسباب لے کر تمہارے ساتھ چلے آئیں گے۔

دوسرے دن وہی ہوا کہ چندر بھاگا معہ اپنی سہیلیوں کے اور عملے کے نخاس کے مکان سے اُٹھ کر وکٹوریا گنج کے مکان میں میاں فضلو کے ساتھ رہنے لگی اور یہ خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح دوڑ گئی جس نے سُنا اُس کو حیرت ہوئی اور ہر شخص نے یہ واقعہ سُنکر دانتوں میں اُنگلی دبالی۔

میاں فضلو مزے کر رہے ہیں، تین چار لاکھ نقد روپیہ بنک میں اپنے نام سے جمع کرا دیا ہے اس کا سُود آتا ہے، زر و جواہر کے صندوقچے انہیں کے قبضہ میں ہیں، سب کو فروخت کر کے بنک میں جمع کرتے جاتے ہیں کچھ شُد بُد حرف شناس ہیں، خیرات خانہ نصیر الدین حیدر میں سفارشوں سے ایک ملازمت لکھنے پڑھنے کی مل گئی ہے، اب منشی فضل حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔

اب اُس بیچارے گھسیٹ خاں کا حال سُنیئے کہ اتنی بڑی منزلت سے گر کر دیوانہ ہو گیا ہے، ہر وقت ہائے کے نعرے مار کر روتا ہے اور کہتا ہے، ہائے مجھے چندر بھاگا نے کہیں کا نہ رکھا مزے سے مہاراجہ کے یہاں رہتا تھا۔ ہائے چندر بھاگا تو نے مجھ سے دغا کی، ہائے مجھے بے موت مارا۔ جو گھسیٹ خاں سے ملاقات کے شمنی رہتے تھے وہ صورت دیکھکر مُنہ پھیر لیتے اور ہنستے۔ وہ بیچارا غم کا مارا ہر وقت روتا اور کسی وقت اشکباری کا تار نہیں ٹوٹتا، ہر شخص کہتا ہے پاگل ہو گیا ہے، اب رونا موقوف کر، جو کچھ قسمت میں لکھا تھا وہ ہوا مگر وہ ہے کہ اپنی جان دیئے ڈالتا ہے، نہ کھانے کے ہوش نہ پینے کے، کپڑے میلے ہیں پھٹے ہیں تو اُسے غم نہیں، سودن

کھانا میسر نہیں آتا تو اُسے پرواہ نہیں ہے بالکل پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک دن ایک دوست نے ترس کھا کر امرود دیئے اور کہا اسے کھالو، کہنے لگا ہائے میاں امرود کیا کھاؤں میرا تو کلیجہ پھٹک رہا ہے، دم نکل رہا ہے، ہائے چندر بھاگا دغا دے گئی، ہائے میرا دم نکل گیا ہے، ہائے اب تو کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آتی ہے، میں تو بے موت مرگیا ہائے، اس کے بعد بیچارہ چار پانچ مہینے تک اسی طرح ہائے ہائے کرتا ہوا مر گیا، رحم دل آدمی اس پر افسوس کرتے تھے۔

اب تو منشی فضل حسین کا طوطی بول رہا ہے، نوریا گنج میں ایک بہت بڑی عمارت بنوائی ہے جس میں چندر بھاگا مع اپنی سہیلیوں کے رہتی ہے، کربلا بنوائی۔

منشی فضل حسین کا حال یہ ہے کہ آپ ایک قصائی ہیں بلوچ پورے کے رہنے والے خدمت کاری سے آج اس مرتبہ اعلیٰ پر قابض ہیں، چندر بھاگا کی تمام املاک پر قبضہ کر کے اُسے اپنے نام سے بنک میں جمع کیا ہے، گاؤں بھی مول لیتے ہیں، خیرات خانہ سے بہت کچھ آمدنی ہے، ایک دفعہ چندر بھاگا کو معلوم ہوا کہ اس کی ایک کمسن سہیلی نظیر جان جبشن پیٹ سے ہے، پانچ مہینے کا حمل ہے، یہ سُن کر بہت تعجب ہوا، کہا کہ میں تو تیرا نکاح کرنے والی تھی، یہ کیا ہوا تجھ کو؟ کس کا پیٹ ہے سچ بتا نہیں تو کھال کھینچ لوں گی۔

اُس نے کہا بیوی اس میں میرا قصور نہیں ہے، آپ کے میاں فضل حسین مجھے اپنے کمرے میں رات کو لیجاتے تھے، انہیں کا پیٹ ہے، یہ سُنکر بہت غصہ آیا اور فضل حسین کو بلا کر بہت لعنت ملامت کی کہ آخر قصوڑا ہے نا اپنی اوقات پر گیا تجھکو شہر بھر میں اور کوئی نہ ملا، موئی جبشن لونڈیا سے آشنائی کی، وہ تو میری بیٹی کے برابر تھی۔ اب اس کی شادی میں تجھ سے کئے دیتی ہوں، وہ میری بہو ہے اور تو میرا بیٹا، اور پھر ان کی صورت سے بیزار ہوگئی اور کسی قسم کا تعلق ان سے نہ رکھا، اُسی جبشن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام میاں جانی تھا مگر عورت تھی ہوشیار سمجھی کہ اگر ان سے بگڑ کر کہیں چلی جاؤں تو میرا روپیہ ملنا دشوار ہوگا کیونکہ ساری املاک اُس نے اپنے نام سے جمع کی ہے اور سب روپیہ بنک میں اُسی کے نام سے ہے، خاموش ہو رہی، بظاہر وہی میل جول برقرار رہا۔

جس زمانے میں بالکل محتاط تھی اور کوئی موقع نہ ملا کہ کسی دوسرے سے تعلق پیدا کر سکے محبوب شاہ ایک حسین عورت جو شہر میں اپنے خلاف فطرت فعل سے مشہور عام تھی اور شہر کے رئیس جن کا آنا بھی پسند نہیں کرتے تھے وہ ان کے یہاں پہونچ گئی اور ان سے کہا جب تم کسی مرد سے نہیں مل سکتی ہو تو ہم سے تعلقات پیدا کرو۔ وہی پسند آئی اور محل میں محبوب شاہ زندگی بھر رہی۔

سید آغا حسن بیان کرتے ہیں کہ جوانی میں ہم سے ایک طوائف سے ملاقات تھی جس کا نام کگن تھا اور ہم کو اُس سے بہت محبت تھی، ایک دفعہ وہ ہم سے خفا ہو کر چندر بھاگا کے محل میں چلی گئی۔ جب ہم کو معلوم ہوا تو ہم چندر بھاگا کے مکان پر گئے اور کسی عورت کو بلا کر اندر کہلا بھیجا کہ کگن سے کہو پھاٹک تک آکر ہماری بات سُن لیں، ہم اُن کے منتظر پھاٹک کے ایک پایہ پر بیٹھے تھے شام ہو چکی تھی۔

اتنے میں دو زبردست جوان تنومند قوی ہیکل صافہ باندھے ہوئے عمدہ پوشاک پہنے ہوئے آئے اور ہم سے

کہا منشی فضل حسین کا یہی مکان ہے؟ ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوبارہ پوچھا ہم خاموش، سہ بارہ کہا اور ڈانٹ کر سخت لہجہ میں کہا ہم تم سے پوچھتے ہیں جلد بتاؤ۔ منشی فضل حسین کا یہی مکان ہے؟ کرخت آواز سے ہم کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی فوجی افسر ہیں۔ ہم نے کہا ہاں، وہ دونوں درانہ پھاٹک کے اندر گھستے چلے گئے۔ نیچے کے درجہ میں ستو ڈیڑھ سو عورتیں تھیں، وہ غیر مردوں کو اندر گھستے ہوئے دیکھ کر بدحواس ہو کر چیخنے لگیں ہے ہے موئے چور شام سے گھر میں گھس آئے، پھاٹک پر آج کوئی نہیں، بہادر علی کہاں مر گیا۔ اُسے آواز دو، ان مردوں کو باہر نکالے اس غل غپاڑے میں چندر بھاگا نے جو کوٹھے پر آ کر دیکھا تو مہا راجہ بہادر اور ان کا ایڈی کانگ۔

اس کی تو روح نکل گئی، پاس کمرے میں منشی فضل حسین بیٹھے تھے بدحواسی میں ان سے کہا جلد مجھے کہیں چھپاؤ مہاراجہ آ گئے اب میری جان بچنا مشکل ہے۔

منشی فضل حسین جس کا خون خشک ہو گیا جلدی سے کمرے کی پُشت کا دروازہ کھول کر گلی کی طرف کسی کا چھپر پڑا ہوا تھا اسی پر کود پڑے اور وہاں سے گرتے پڑتے گلیوں گلیوں کربلا کی طرف بھاگ گئے، وہ دونوں نہایت غصّہ میں بھرے ہوئے سیدھے کوٹھے پر چڑھ گئے اور چندر بھاگا کی چوٹی پکڑے ہوئے باہر آئے اتنے میں ہم پھاٹک سے ہٹ کر سڑک پر گھر کی طرف جا رہے تھے۔

ہم نے دیکھا ایک آدمی نہایت غصّے میں بھرا ہوا چندر بھاگا کی چوٹی پکڑے ہوئے کشاں کشاں لئے جاتا ہے۔ ہم سمجھے کہ ضرور کوئی گوالیار سے فوجی افسران کو قتل کرنے آیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ کسی نے اپنے دشمن پر پورا قابو پا کر اس پر رحم کھایا ہو جو کمالِ شان بہادری ہے۔

اب ہم چندر بھاگا سے سو قدم پیچھے پیچھے جا رہے ہیں کہ تماشا دیکھتے ہیں وہ کٹوریا گنج سے نخاس کے پُل کے قریب تک اسی طرح کھینچتے ہوئے لاتے اور پل کے قریب آ کر اس جوان نے کہا کیوں حرامزادی بیسوا اب تیری کیا سزا ہونا چاہیئے۔ چندر بھاگا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی ان داتا بیشک میں حضور کی خطا وار ہوں، میں نے نمک حرامی کی، آپ کو اختیار ہے جان سے مار ڈالیئے، تلوار سے گردن کاٹ لیجئے، ناک کاٹ لیجئے، گولی مار دیجئے، توپ دم کر دیجئے، سب درست اور بجا ہے۔ کیونکہ مجھ بدقسمت نے ایسی ہی خطا کی تھی، یہ کہہ کر قدموں پر گر پڑی۔ اس جوان نے کہا تھوک ہے اور ذوق ہے تیری اوقات پر، یہ کہہ کر تھوکا اور اُسے زمین پر چھوڑ کر آگے چلا گیا۔

میں نے آگے جا کر کیا دیکھا کہ تین چار فٹن نفیس کھڑی ہیں اور دو چار جلیل القدر انگریز حاکم ٹہل رہے ہیں، دونوں ایک فٹن میں بیٹھے اور سب حضرت گنج کی طرف روانہ ہو گئے، پیچھے مُڑ کر جو دیکھا تو چندر بھاگا گھبراتی ہوئی کبھی ادھر جاتی ہے کبھی اُدھر، اُسے راستہ بھی نہیں سُوجھتا۔ قدم قدم پر گری پڑتی ہے۔

ہم ان کے پاس گئے اور کہا آپ کدھر جاتی ہیں؟ آپ کا مکان تو اس طرف ہے، کہنے لگی مجھ کو گھر تک پہونچا دو تم سلامت رہو، ہم اُن کا ہاتھ پکڑ کر کٹوریا گنج کی طرف چلا اور ان سے پوچھا یہ کون لوگ تھے؟ کہنے لگیں مہاراجہ گوالیار تھے، خدا نے آج جان بچا لی ان کو گھر پہونچا کر واپس آیا۔

دوسرے دن منشی فضل حسین گھر میں لنگڑاتے ہوئے واپس آئے تو اُس نے کہا تھوک ہے تم پر آخر ہو نہ تھوڑلا! تم سے تو گھسیٹ خاں ہزار درجہ بہتر تھا اگر اُسے معلوم ہوتا تو مجھے ضرور ساتھ لے کر بھاگتا ورنہ اپنی جان پہلے دیدیتا۔ خیر جو میری قسمت میں ذلت و رسوائی تھی وہ پوری ہوئی۔ عرش پر چڑھ کر زمین پر گری۔

اُس دن سے اس کا معمول تھا کہ دن بھر میں دو ایک مرتبہ زوف ہی تھوک ہی تھکتی اور آبدیدہ ہوتی۔

خواجہ عبدالروف عشرت

حشرِ جذبات

وہ ترا حُسن کو خود بینی خود آرا کرنا ۔۔۔ وہ مرا بیخودیٔ شوق میں دیکھا کرنا
دار پر چڑھ کے ترے حُسن کو رسوا کرنا ۔۔۔ خام تھا عشق میں منصور کا دعویٰ کرنا
کتنا بیسود ہے یہ خوفِ مکافاتِ عمل ۔۔۔ عیشِ امروز میں اندیشۂ فردا کرنا
کہیں مٹ جائے نہ اہلِ دہر سے تقلیدِ وفا ۔۔۔ دل سے تم شکوہ نہ اربابِ وفا کا کرنا
اِسی صورت سے ہی ممکن کہ ہو تکمیلِ حیات ۔۔۔ خونِ دل خونِ جگر صرفِ تمنّا کرنا
آؤ سُن لو مرے بربادیٔ دل کی رُوداد ۔۔۔ تجھے منظور ہے اب شرحِ تمنّا کرنا
عجب افسانۂ عبرت ہی یہ سعیٔ ناکام ۔۔۔ مرے جذبات کا خود ہی مجھے رسوا کرنا
اللہ اللہ یہ مجبوریٔ پاسِ اُلفت ۔۔۔ حشر میں بھی نہ مری خون کا دعویٰ کرنا

ہو مبارک تمہیں اِس موسمِ گُل میں ثاقب
دل کے ہر ذرّے کو ہم وسعتِ صحرا کرنا

نوجوانی کے مزے

یاد ہیں اب تک وہ عہدِ نوجوانی کے مزے
نوجوانی کے مزے کیا، زندگانی کے مزے

وصل کی بادِ خنک میں، ہجر کے طوفان میں
کامرانی کے مزے، ناکامرانی کے مزے

بسترِ حرماں پہ، خونی کروٹوں کے ساتھ ساتھ
غم کی راتوں میں بلائے آسمانی کے مزے

بادلوں سے جھوم کر، سرشار ساغر چوم کر
جلوہ گاہِ رنگ و بو میں شعر خوانی کے مزے

موجِ بربط، موجِ گل، موجِ صبا کے سامنے
جامِ زرّیں و شرابِ ارغوانی کے مزے

صبح کے جھونکوں میں شاخوں کے مچلنے کا سرور
شام کی سرخی میں لہروں کی روانی کے مزے

روز اک اندازِ نو سے با ہزاراں طمطراق
حلقۂ احباب میں جادو بیانی کے مزے

مست راتوں میں، بہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق
میہمانی کے مزوں میں، میزبانی کے مزے

بارہا آ آ کے زیرِ سایۂ شمشیرِ یاس
شعلہ پرور ولولوں کی سخت جانی کے مزے

روٹھنے اور روٹھ کر منّنے کے دورِ ناز میں
مہربانی کے مزے، نامہربانی کے مزے

صحبتِ ہمراز میں، مکتوبِ رنگیں کی بہار
گوشۂ خلوت میں پیغامِ زبانی کے مزے

کمسنی کی خوابگاہوں میں بے تکمیلِ شوق
جرعہ جرعہ پی کے مے، افسانہ خوانی کے مزے

بارگاہِ دلبری میں گاہ بے فرطِ رعب سے
نقش بر دیوار ہو کر بے زبانی کے مزے

گاہ حرف و صوت کی سبکی کے بچنے کے لئے
جنبشِ مژگاں میں دل کی ترجمانی کے مزے

پھول سے سر رکھ کے اکثر زانوئے پُرشوق پر
گل رخوں کی نیند کی ماتی جوانی کے مزے

جلوۂ صہبا کی رنگینی بھری برسات میں
آگ کی موجِ رواں کے ساتھ پانی کے مزے

خاکِ راہِ دوست میں اکسیر کی سی شوخیاں
نقشِ پائے یار میں تاجِ کیانی کے مزے

پہلوئے جاناں کی شیریں گرمیوں سے گاہ گاہ
عمرِ فانی میں حیاتِ جاودانی کے مزے

لرزشِ صہبا میں لہجے کا ترنم تول کر
پیشِ خوباں نطق کی گوہر فشانی کے مزے

بدگمانی کے محل پر حسنِ ظن کے ولولے
حسنِ ظن کے ولولوں میں بدگمانی کے مزے

التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں
ہر قدم پر جوششِ مرگِ ناگہانی کے مزے

جوش ملیح آبادی

جاپان میں جُگنو

جاپانی زبان میں جگنو کو "ہوتارو" کہتے ہیں اور جاپانی تحریر میں یہ لفظ اس طرح لکھا جاتا ہے کہ اوپر آگ کی علامت بنی ہوتی ہے اور اس کے نیچے پروانے کی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ قدیم زمانہ میں اس لفظ کے معنی "آگ کی اولین پیداوار" تھے اور بعض کے نزدیک اس لفظ کے اجزا کے معنی "ستارہ" اور "قطرہ" تھے۔ لیکن یہ شاعرانہ تخیلات معدوم ہوتے ہیں۔ لفظ ہوتارو کے معنی کچھ بھی ہوں یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامات میں جگنو کو اب بھی پیارے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

یوں تو جاپان میں جُگنو کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر دو اقسام بہت زیادہ پائی جاتی ہیں اور اُنہیں عام طور سے "گینجی بوتارو" اور "ہیکی بوتارو" کہتے ہیں[1]۔ ایک روایت کے بموجب یہ جگنو اُن میناموتو اور ہیکی کے بہادروں کے بھوت ہیں جو بارھویں صدی کی جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ پروانوں کی شکل میں بھی ان کو اپنے قبیلوں کی بارھویں صدی کی جنگ یاد ہے اور یہ ہر سال چوتھے مہینے کی بیس[2] تاریخ کو دریائے "اُجی" پر ایک گھمسان لڑائی لڑتے ہیں۔ اِس لئے اُس تاریخ کو تمام مقید جگنوؤں کے پنجرے کھول دینے چاہئیں۔ تاکہ وہ آزاد ہو کر اس معرکہ میں شریک ہو سکیں۔

جاپانی جگنوؤں میں گینجی بوتارو سب سے بڑی ذات کا ہے۔ یہ سوائے شمالی حصص کے جزائر جاپان کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے۔ ہیکی کے بوتارو عام طور سے شمال میں یعنی جزیرہ ہکیدو میں بکثرت ملتا ہے مگر جزیرہ ہوندو یعنی خاص جزیرے میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ گینجی سے چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی روشنی بھی مدھم ہوتی ہے۔ ٹوکیو، اوساکا، کیوٹو اور دوسرے شہروں میں پروانے والے سوداگر جو جگنو بیچتے ہیں وہ بڑی ذات کا یعنی گینجی ہوتا ہے۔ جاپانی محققین ان دونوں جگنوؤں کی روشنی کو چائے رنگی بتاتے ہیں۔ جاپانی چائے کا رنگ، اگر پتی اچھی ہو تو سبزی مائل زرد ہوتا ہے۔ لیکن اچھے گینجی کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ بہت تیز نگاہ ہی سبزی کی تمیز کر سکتی ہے۔ پہلی نظر میں اس کی چمک لکڑی کی آنچ کی طرح زرد رنگ کی معلوم ہوتی ہے۔ چمک کی تیزی کی تعریف ایک نظم میں بجا طور سے یوں کی گئی ہے:-

---

[1] لفظ "گینجی" قبیلہ "میناموتو" کا دوسرا نام ہے۔ اور ہیکی کے قبیلہ "تائرا" کا۔ یہ دونوں قبیلے وزارت کے دعویدار تھے اور ان دونوں کے درمیان ۱۱۸۵ء میں جاپانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین لڑائیوں میں سے ایک ہوئی تھی۔ یہ جنگ ایسی سخت تھی کہ قبیلہ تائرا جو اس وقت برسرِ اقتدار تھا کلیتہً فنا ہو گیا۔ یہ لڑائی ساحل سمندر پر ہوئی تھی۔ اِس ساحل پر جو کیکڑے پائے جاتے ہیں، اُن کو بھی ہیکی کے کیکڑے کہتے ہیں۔ اُنکی پیٹھ پر کچھ ایسے نشان بنے ہوتے ہیں، جو وحشتناک چہرے سے بہت ملتے جُلتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ جنگجویانِ تائرا زخموں سے چُور ہو کر مرے تو اُن کے چہرے سے ایسی ہی وحشت ظاہر ہوتی تھی۔ اس جنگ کے متعلق اور بھی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ "ہوتارو" اور "بوتارو" ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔

[2] جاپان میں ۱۸۶۸ء کے انقلاب کے بعد جہاں دوسری باتیں یورپ اور امریکہ سے اختیار کی گئی ہیں سال کا حساب شمسی بھی وہیں سے لیا گیا ہے۔ سابق میں قمری حساب سے مہینوں اور برسوں کا شمار ہوتا تھا۔ مہینوں کے نام وہی تھے جو اب ہیں یعنی "ایک مہینہ"، "دو مہینہ"، "آٹھ مہینہ"، وغیرہ۔ اس طرح اپریل کا نام "چار مہینہ" ہے۔ تقویم قدیم کے بموجب سال کی ابتدا وسط فروری کے بعد ہوتی تھی۔ اور تقویم جدید کے بموجب یکم جنوری سے ہوتی ہے۔ گویا پُرانے حساب سے جگنوؤں کی جنگ

یہ کہیں فاصلے پر ہولی کی آگ بھڑک رہی ہے یا یہ جگنو کی چمک ہے۔ آہا! یہ تو گینجی ہے[1]۔ اگرچہ الفاظ گینجی بوتارو اور ہیئی کے بوتارو عام طور سے مستعمل ہیں لیکن عام لوگوں کی زبان پر اور نام بھی چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر صوبے میں الگ الگ نام ہیں۔ کہیں گینجی کو جگنوؤں کا علم کہتے ہیں۔ کہیں گاؤں جگنو۔ کہیں خزر جگنو، کہیں سورج مکھی جگنو اور کہیں اُجی کا جگنو۔ اسی طرح ہیئی کے بوتارو کو کہیں شہزادی جگنو کہتے ہیں۔ کہیں ننھا جگنو اور کہیں چھلاوہ جگنو۔ یہ نام صرف مثال کے طور پر دیے گئے ہیں ورنہ جاپان کے تقریباً ہر حصے میں ان جگنوؤں کا نیا نام ہے۔

جاپان میں بہت سے مقامات جگنوؤں کے لئے مشہور ہیں جہاں لوگ موسم گرما[2] میں صرف جگنوؤں کا نظارہ کرنے کے واسطے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور مقام پرانے زمانے میں جھیل بیوا کے کنارے پر ایک چھوٹی سی وادی ہے جس کا نام اشی یامہ ہے۔ اب بھی لوگ اُسے ہوتارو وانی یعنی جگنوؤں کی وادی کہتے ہیں۔ سترھویں صدی میں جس کے موسم میں یہاں جگنوؤں کی کثرت عجائبات قدرت میں شمار ہوتی تھی۔ ہوتارو وانی کے جگنو اب بھی اپنی جسامت میں مشہور ہیں مگر وہ تعجب خیز بہتات جس کا ذکر پرانی تصانیف میں ملتا ہے، اب مفقود ہے۔ آج کل جگنوؤں کے لئے سب سے مشہور مقام اُجی کے قرب میں ہے جو ضلع "یاماشرو" میں واقع ہے۔ اُجی ایک چھوٹا سا خوش وضع قصبہ ہے جو دریائے اُجی گاوا پر چائے کے مشہور علاقے کے مرکز میں واقع ہے۔ ہر سال کیوٹو اور اوساکا سے اسپیشل ٹرینیں چھوٹتی ہیں جن میں ہزاروں شوقین بیٹھ کر جگنوؤں کا نظارہ کرنے کے لئے اُجی جاتے ہیں۔ مگر ہوتارو کتسین یعنی جنگِ جگنو کا خاص منظر اسی دریا پر چند میل کے فاصلے پر دیکھنے میں آتا ہے۔ اس جگہ دریا پہاڑیوں کے درمیان پیچ و خم کھاتا ہوا گذرتا ہے۔ یہ پہاڑیاں سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں سے لاکھوں جگنو جھپٹتے ہیں، پانی کے اوپر آکر بھڑتے ہیں اور گتھ جاتے ہیں۔ بعض وقت وہ اس قدر گنجان ہوتے ہیں کہ ایک روشن بادل یا چنگاریوں کا بڑا سا گولہ نظر آتا ہے۔ بادل جلد ہی بکھر جاتا ہے یا پانی کی سطح پر گر کر پھٹ جاتا ہے۔ اور دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ جگنو چمکتے ہوئے بہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں دوسرا غول پھر اُسی جگہ جمع ہوتا ہے۔ شوقین لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر تمام رات اس منظر کا لطف اٹھانے میں دریا پر گذارتے ہیں۔

معرکۂ جنگ ختم ہونے پر دریا کی سطح پر بہتے ہوئے جگنوؤں کے چمکدار اجسام کی کثرت سے کہکشاں معلوم ہوتی ہے۔ جاپانی اسے دریائے رضواں کہتے ہیں۔ شاید ایسا ہی منظر دیکھ کر مشہور شاعرہ چیوو نے نظم کہی ہے جس کا یہ مطلب ہے:۔

کیا یہ دریا ہے؟ یا تاریکی خود سرک رہی ہے؟ اوہ! جگنو!

موسم گرما میں بہت سے آدمیوں کا ذریعۂ معاش جگنوؤں کا پکڑنا اور بیچنا ہوتا ہے۔ یہ کاروبار اس کثرت سے ہوتا ہے کہ

(بسلسلۂ صفحۂ گذشتہ) بتاریخ ۲۰ راپریل ہوتی تھی تو نئے حساب سے جولائی کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں ہونی چاہیئے۔

[1] بعض تہواروں کے موقع پر دیہات میں گاؤں یا قصبے کے بڑے بازار میں گھروں کے اوپر آگ روشن کی جاتی ہے جس کو ہم نے یہاں ہولی کی آگ کہا ہے۔ ایک تہوار پر آگوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مردوں کی ارواح کا جو اپنے گھروں کو واپس آ رہی ہیں، استقبال کریں۔

[2] جاپان میں یوں تو ہمیشہ مینہ برستا رہتا ہے لیکن جون میں زیادہ بارش ہوتی ہے۔ یہی یہاں کی برسات ہے۔ برسات کے بعد دو مہینے موسم گرما کے ہیں۔ اس موسم میں ہوا میں نمی کے ساتھ حبس بہت ہوتا ہے اور اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

اس کو ایک خاص پیشہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کاروبار کا خاص مرکز جھیل بیوا کے کنارے ضلع گوتھو میں ہے۔ یہاں سے بہت سی دکانیں وساکا اور کیوتو کے شہروں میں اور قرب و جوار کے علاقوں میں جگنو بھیجتی ہیں۔ موسم میں بڑی بڑی دکانیں ساٹھ ستر جگنومار ملازم رکھتی ہیں۔ جگنوماروں کے لئے مشق اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نوآموز کے لئے رات بھر میں ایک سو جگنو بھی پکڑنے مشکل ہیں مگر مشاق ماہرین تین تین ہزار جگنو پکڑ لیتے ہیں۔ جگنو پکڑنے کا طریقہ اگرچہ نہایت سادہ ہے مگر دیکھنے میں بڑا دلچسپ ہے۔

آفتاب غروب ہوتے ہی جگنومار شکار کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے کندھے پر ایک لمبا بانس ہوتا ہے اور کمر میں جالی کی ایک لمبی تھیلی پیٹی کی طرح لپٹی ہوتی ہے۔ وہ ایسی جگہ تلاش کرتا ہے جہاں دریا یا جھیل کے کنارے بید مجنوں کے درخت لگے ہوتے ہیں۔ جگنوؤں کے جنگل میں پہنچ کر وہ درختوں پر نظر ڈالتا ہے۔ جب درخت کافی چمکنے لگتے ہیں تو اپنی تھیلی تیار کرتا ہے اور سب سے روشن درخت کے نیچے پہنچ کر شاخوں پر بانس مارتا ہے۔ اس جھٹکے سے جگنو زمین پر گر پڑتے ہیں۔ کوئی دوسرا پروانہ ہو تو شاخ پر بانس پڑتے ہی فوراً اُڑ جائے مگر یہ بیچارہ زمین پر گر کر وہیں سے شکاری کو سگنل دیتا ہے۔ جگنو کا قاعدہ ہے کہ اس پر خوف غالب ہو یا چوٹ لگے تو اس کی چمک میں تیزی آجاتی ہے۔ یہ گرے ہوئے جگنو چند لمحے زمین پر پڑے رہ کر پھر اُڑ جاتے ہیں۔ لیکن شکاری ایسی پھرتی سے پکڑنا شروع کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی تیزی سے چلتے ہیں اور ایک ایک جگنو کو پکڑ کر اپنے منہ میں ڈالتا ہے۔ اسے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ ایک ایک جگنو تھیلی میں ڈالے۔ اس کا منہ بھر جاتا ہے تو جگنوؤں کو ویسے کا ویسا ہی تھیلی میں اُگل دیتا ہے۔

جگنومار تقریباً رات کے دو بجے تک اسی طرح شکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ قدیم اعتقاد کے بموجب بھوت نکلا کرتے تھے۔ اس وقت جگنو درخت سے گھاس پر اترنے لگتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ اپنی دُمیں زمین میں دبا دیتے ہیں کہ نظر نہ آئیں۔ جگنومار اس وقت دوسری چال چلتے ہیں اور بانس کی چھڑ کی بجائے بانس کی جھاڑو استعمال کرتے ہیں۔ جھاڑو سے ہلکے ہلکے مگر تیزی کے ساتھ گھاس کو کریدتے ہیں۔ جب جگنوؤں کے جھاڑو لگتی ہے تو ان کی لالٹین جھلمل جھلمل کرنے لگتی ہیں اور وہ فوراً ہی گرفتار کر کے قید کر لئے جاتے ہیں۔ پو پھٹنے سے ذرا پہلے شکاری شہر میں واپس آجاتے ہیں۔

دکانوں پر جگنوؤں کو چمک کے اعتبار سے چھانٹ کر الگ الگ کیا جاتا ہے۔ جو زیادہ چمکدار ہوتے ہیں وہ زیادہ قیمت پاتے ہیں۔ پھر ان کو پنجروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جن پر جالی چڑھی ہوتی ہے، اور ہر پنجرے میں تھوڑی گھاس تر کر کے ڈال دی جاتی ہے۔ ایک ایک پنجرے میں ایک سو سے لے کر دو سو جگنو تک بھرے ہوتے ہیں اور ہر قسم کے جگنو الگ الگ پنجروں میں بند کئے جاتے ہیں۔ ان پنجروں پر چھوٹی چھوٹی چوبی تختیاں لگی ہوتی ہیں جن پر گاہکوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ یہ گاہک ہوٹل اور رسٹورنٹ کے مالک ہوتے ہیں یا پروانوں کے تھوک فروش اور خردہ فروش سوداگر یا وہ اصحاب جو کسی خاص تقریب کیلئے سینکڑوں ہزاروں جگنوؤں کی فرمائش کرتے ہیں۔ یہ دکانیں پنجروں کو ہوشیار پیادوں کے حوالے کرتی ہیں جو انہیں منزلِ مقصود تک پہونچا دیتے ہیں۔ یہ کام چونکہ نازک ہوتا ہے معمولی پارسل پہنچانے والی کمپنیوں کے سپرد نہیں کیا جاتا۔

موسم گرما میں رات کی مجلسوں کی رونق کے لئے جگنوؤں کی بڑی بڑی فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ ہر بڑے جاپانی مکان میں مہمانوں کی نشست کا کمرہ باغ کی جانب ہوتا ہے۔ گرمی میں رات کی دعوت میں، یا کسی اور تفریحی جلسہ میں یہ دستور ہے کہ سورج

غروب ہونے کے بعد باغ میں جگنو چھوڑ دئے جاتے ہیں تاکہ وہاں اُن کی چمک کے نظارے سے محظوظ ہو سکیں۔ ریسٹارنٹ والے بھی پیمانے پر جگنو خریدتے ہیں۔ اوساکا کے ایک ریسٹارنٹ میں لاکھوں جگنو پکڑ کر ایک جنگلے میں بند رکھے جاتے ہیں جس پر جالی چڑھی ہوتی ہے اور گاہکوں کو اجازت ہوتی ہے کہ جگنوؤں کی ایک مقررہ تعداد پکڑ کر لے جائیں۔

موسم اور قسم کے لحاظ سے تھوک فروشی کی قیمت فی سینکڑہ تین سین سے لیکر تیرہ سین تک ہوتی ہے۔ خوردہ فروش اُنہیں چھوٹے چھوٹے پنجروں میں فروخت کرتے ہیں۔ ٹوکیو میں جگنو کے ایک پنجرے کی قیمت تین سین سے لے کر کئی ین[1] تک ہوتی ہے۔ سب سے چھوٹا پنجرہ جس میں تین چار جگنو بند ہوتے ہیں تقریباً دو انچ مربع ہوتا ہے۔ لیکن قیمتی پنجرے پرندوں کے پنجروں کے برابر ہوتے ہیں۔ اور بانس کی تیلیوں کے برابر ہوتے ہیں اور بانس کی تیلیوں کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں اور درحقیقت صناعی کے نمونے ہوتے ہیں۔ بعض مکانوں کی وضع کے ہوتے ہیں۔ بعض کشتی کی وضع کے، بعض مندروں کی لالٹینوں کی وضع کے اور بعض اَور وضع کے۔ ان کی قیمت تیس سین سے لیکر ایک ین تک ہوتی ہے۔

جگنو زندہ ہوں یا مردہ، اُن کی قیمت اُٹھتی ہے۔ یہ نازک پروانے قید میں زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ پروانوں کی دُکانوں میں بے انتہا جگنو مر جاتے ہیں۔ ایک مشہور دُکان ہر موسم میں دس سیر مردہ جگنو اوساکا کے کارخانوں کے ہاتھ بیچتی ہے۔ آج کل تو ان کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے مگر پہلے جگنو کی پوٹلیس اور گولیاں بنائی جاتی تھیں۔ اور چینی طب کے بموجب کئی دوائیں تیار ہوتی تھیں۔ آج کل بھی ان کے عجیب عجیب جوہر نکالے جاتے ہیں: ہوتارو ابورا، یعنی روغنِ جگنو کا استعمال بڑھئی کرتے ہیں اور اسے بانس کے فرنیچر پر ملتے ہیں تاکہ مڑا ہوا بانس سخت ہو کر اپنی جگہ قائم ہو جائے۔

چینی طب کے بموجب پہلے زمانے میں مختلف قسم کے مرہم جگنو بنائے جاتے تھے جن کے اثر سے مکان ڈاکوؤں کے حملے سے محفوظ رہتا تھا۔ زہر کا اثار ہو جاتا تھا اور مخصوص سو بھوت، بھاگ جاتے تھے۔ جگنو کی گولیاں بنائی جاتی تھیں جن کے کھا لینے سے آدمی ناقابلِ فتح ہو جاتا تھا۔ ایک قسم کی گولی کا نام 'کنشوگن' یعنی 'حبِ سپہ سالار' تھا، اور دوسری قسم کا نام 'بوئی گن' یعنی 'حبِ قوتِ فوجی' تھا۔

کاروبار کے طور پر جگنو کا شکار زمانۂ حال کی ایجاد ہے۔ لیکن تفریحی مشغلے کے طور پر یہ پُرانا دستور ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ اُمرا اور رؤسا کی تفریح تھی۔ بڑے بڑے نواب 'ہوتارو گاری' یعنی 'جگنو کے شکار' کی پارٹیاں دیا کرتے تھے۔ عہدِ میجی میں اُمرا کے لئے بھی فرصت کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب 'ہوتارو گاری' بڑے آدمیوں کی بجائے بچوں کی تفریح ہے، لیکن بڑے آدمی بھی گاہے ماہے شکار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہر سال گرمی میں تمام جاپان میں بچے جگنو کے شکار کو نکلتے ہیں اور ایسی مہموں کے لئے اندھیری راتیں پسند کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں کاغذی پنکھیاں لے کر نکلتی ہیں اور لڑکوں کے ہاتھ میں بانس کی لمبی ہلکی چھڑیں ہوتی ہیں جن کے سرے پر بانس کی تازہ گھاس کے گچھے بندھے ہوتے ہیں۔ جب جگنو گھاس یا پنکھا لگنے سے گرتے ہیں تو آسانی سے گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک مرتبہ گر کر اُٹھنا اُنکے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔ شکار کرتے وقت بچے چھوٹے چھوٹے گیت گاتے جاتے ہیں کہ جگنو گیت سُنکر اُن کی طرف کھنچ آئیں۔ ہر جگہ یہ گیت مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں بہت کم ایسے ہیں جن میں کوئی خوبی ہو کہ نقل کئے

[1] ایک ین کے ایک سو سین ہوتے ہیں۔

جا سکیں۔ دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صوبہ چوشو

آجا جگنو، آجا! اپنی روشنی جلتی ہوئی لے کر آجا! جاپان کی نفیس ترین لڑکی پوچھتی ہے، کیا تو اپنی لالٹین نہیں جلائیگا" اور میرے پاس نہیں آئے گا۔

شمونوسیکی کی زبان

ارے جگنو آجا! ارے آجا! شمونوسیکی کے تمام لڑکے خواہش کرتے ہیں کہ تو اپنی جلتی ہوئی لالٹین سمیت آجا!

آجا ارے آجا!

جگنوؤں کا شکار کرنے کے لئے اُن کی عادات سے واقفیت حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس بارے میں جاپانی بچے ہم لوگوں سے غالباً زیادہ جانتے ہیں۔ ناظرین کے لئے یہ حالات بہت دلچسپ ہونگے۔

"جگنو زیادہ تر پانی کے قریب پائے جاتے ہیں اور اُن کو پانی کے گرد چکر لگانا پسند ہوتا ہے لیکن بعض قسم کے جگنوؤں کو گندے اور بدبو دار پانی سے نفرت ہوتی ہے اور وہ صرف صاف ندیوں اور جھیلوں کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ گینجی جگنو دلدل اور خندق یا گندی نہروں سے دور رہتا ہے۔ مگر ہیئی کے جگنو کو ہر قسم کا پانی پسند ہے۔ ہر قسم کے جگنو پانی کا ایسا کنارہ تلاش کرتے ہیں جہاں گھاس لگی ہو اور اوپر درختوں کا سایہ ہو۔ لیکن وہ بعض درختوں کو پسند کرتے ہیں اور بعض کو ناپسند۔ مثلاً صنوبر کے درخت سے دور رہتے ہیں اور کبھی گلاب کی جھاڑی پر نہیں اُترتے۔ لیکن بید کے درختوں پر اور خصوصاً بید مجنوں پر ان کی بہتات ہوتی ہے۔ کبھی کبھی گرمی کی رات کو بید مجنوں کی لٹکتی ہوئی شاخوں پر چمکتے ہوئے جگنوؤں کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ آگ کے پھول دہکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چاندنی رات کی روشنی میں حتی الامکان درختوں کے سایہ میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کا تعاقب کیا جائے تو اُڑ کر چاندنی میں چلے جاتے ہیں جہاں اُن کی چمک مشکل سے نظر آتی ہے۔ لمپ کی یا کسی تیز روشنی سے گھبراتے ہیں۔ مگر چھوٹی چمکدار روشنی اُن کے لئے کشش کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً اندھیرے میں کوئلے کی چھوٹی سی چنگاری پر یا جاپانی پائپ کی چمک پر لپک کر گرتے ہیں۔ لیکن جگنوؤں کے لئے بہترین چارہ یہ ہے کہ ایک جونچال جگنو شفاف شیشے کی بوتل یا گلاس میں بند کر کے رکھ دیا جائے۔"

عام طور سے بچے جتھے بنا کر جگنو کے شکار کو نکلتے ہیں۔ پہلے زمانے میں جگنو کے تعاقب میں اکیلا چلا جانا بڑی حماقت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے متعلق عجیب و غریب اعتقادات تھے اور بڑی ڈراونی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔ یہ جو ہمیں جگنو دکھائی دیتے ہیں شاید ارواح بد ہوں یا مرگھٹ کی آگ کی چنگاریاں ہوں یا لومڑی کی روشنیاں ہوں جو راہگیروں کو دھوکا دینے کے لئے جلائی گئی ہیں۔ حقیقی جگنو بھی ہمیشہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بید مجنوں کو بہت پسند کرتے ہیں، اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہو کہ ان کا بھوت پریت سے کیسا قریبی تعلق ہے۔ تمام درختوں کے ساتھ اچھی یا بُری خاص خاص ارواح وابستہ ہوتی ہیں لیکن بید مجنوں

---

[1] جیسے ہندوستان میں جوان لڑکیوں یا عورتوں پر جن یا آسیب کا سایہ ہو تا ہے یا اُنکے سر پر سید صاحب سوار ہو جاتے ہیں یہاں لومڑی سوار ہو جاتی ہے۔ شہروں میں یہ اعتقادات معدوم ہو گئے ہیں۔ دیہات میں اب بھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں۔

خاص طور سے مُردوں کا درخت ہے اور انسانی بھوتوں کا منظورِ نظر ہے۔ کسے معلوم ہے کہ کوئی خاص جگنو بھوت نہیں ہے؟ علاوہ بریں یہ ایک پُرانا عقیدہ ہے کہ زندہ آدمی کی رُوح بھی کبھی کبھی جگنو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مندرجہ ذیل کہانی مُصنّف سے ایک خاص شہر میں بیان کی گئی تھی:۔

"ایک مرتبہ جاڑے کی رات تھی اور سردی خوب پڑ رہی تھی۔ مانسوئے کا رہنے والا ایک سپاہی زادہ کسی برات سے واپس آرہا تھا۔ اُس کو اپنے مکان کے قریب نہر پر ایک جگنو اُڑتا ہوا دکھائی دیا تو بڑا تعجب ہوا۔ اس کو حیرت ہوئی کہ برف باری کے زمانے میں جگنو کیسے اُڑ رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھنے کے لئے ذرا ٹھیرا تو وہ روشنی اس کی طرف جھپٹی۔ اُس نے لکڑی سے مارا مگر جگنو جھپٹ کر مُڑ گیا اور ایک قریبی مکان کے باغیچے میں گھس گیا۔

دوسرے روز صبح کو وہ اُسی مکان میں گیا کہ پڑوسیوں اور دوستوں سے رات کا واقعہ بیان کرے۔ ابھی اُسے کسی سے یہ بات کہنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ گھر کی بڑی لڑکی نادانستگی میں دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ نوجوان پر نگاہ پڑتے ہی اُسکے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ کہنے لگی "ارے! تم نے مجھے ڈرا دیا! مجھ سے اب تک کسی نے نہیں کہا تھا کہ تم آئے ہوئے ہو۔ میں اس کمرے میں آرہی تھی تو میرے دل میں تمہارا ہی خیال تھا۔ رات کو مجھے ایک عجیب خواب دکھائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اُڑ رہی ہوں۔ میں اُس نہر پر اُڑ رہی تھی جو ہمارے گھر کے سامنے ہے۔ مجھے پانی پر اُڑنے میں بڑا لُطف آرہا تھا۔ مجھے اُڑتے میں تم نظر آئے۔ تم نہر کے کنارے کنارے چلے آرہے تھے۔ میں تمہارے پاس گئی کہ تم سے کہوں کہ میں نے اُڑنا سیکھ لیا ہے۔ لیکن تم نے مجھ پر لکڑی سے وار کیا۔ میں ڈر کے مارے اُڑ گئی۔ اب بھی مجھے خیال آتا ہے تو خوف کے مارے کانپ جاتی ہوں" یہ بات سُنکر نوجوان نے اپنی رائے بدل دی اور اُس وقت کسی سے رات کا واقعہ بیان نہیں کیا۔ وہ لڑکی اُس کی منگیتر تھی اور سپاہی زادے کو خوف تھا کہ میں اپنا واقعہ بیان کرونگا تو اسکے دل پر دھکا بیٹھ جائے گا"

زمانہ قدیم سے جاپانی شعرا جگنو پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ شروع زمانہ کی بلند پایہ نثر میں بھی جگنو کا ذکر اکثر پایا جاتا ہے۔ مثلاً "گینجی مونوگری" نامی ایک مشہور ناول ہے جو اواخر دسویں صدی یا اوائل گیارھویں صدی میں تصنیف ہوا تھا۔ اس کے چوّن بابوں میں سے ایک باب کا نام جگنو ہے۔ مصنّف بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی رئیس نے اندھیرے میں ایک عورت کا چہرہ دیکھنے کی یہ ترکیب نکالی تھی کہ بہت سے جگنو پکڑ رکھے تھے، موقع پر سب کو ایک دم سے چھوڑ دیا۔ ادبی اعتبار سے جگنو میں دلچسپی لینے کی ابتدا تو اہلِ جاپان کی طبیعت اد معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس شوق کی زیادتی شاید چینی نظم کے مطالعہ سے ہوئی ہے۔ آج بھی ہر جاپانی بچے کو اُس مشہور چینی محقق کے بارے میں ایک چھوٹا سا گیت یاد ہے جو اپنی مفلسی کے زمانہ میں جگنوؤں کو کاغذ کے لفافے میں بند کر کے اُن کی روشنی میں کتب کا مُطالعہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اس شوق کی ابتدا اور ترقی کسی زمانے میں ہوئی ہو اس میں شک نہیں کہ جاپانی شعرا ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے جگنو پر اشعار کہتے چلے آئے ہیں۔ یہ مضمون جاپانی نظم کی ہر قسم میں پایا جاتا ہے۔ لیکن جگنو کی نظمیں سب سے زیادہ "ہوکو" قسم کی ہیں۔ یہ سب سے چھوٹی قسم کی نظم ہے جس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں۔ اور وہ مصرعے بھی اس قدر مختصر کہ تمام نظم میں صرف سترہ سیلیبل[1] ہوتے ہیں۔ ذیل میں جگنو کی نظموں میں سے چند کا انتخاب کر کے ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں بعض سینکڑوں برس کی پُرانی ہیں۔

[1] جاپانی حروف تہجی محض حروف نہیں ہوتے بلکہ اُردو کا ایک حرف کسی اعراب کے ساتھ مل کر ایک جاپانی حرف بن جاتا ہے جسے انگریزی میں سیلیبل کہتے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

جگنو کا شکار

آہ! گمشدہ بچہ! بیابر رو رہا ہے مگر جگنو پکڑے جاتا ہے۔
(رات کی) سیاہی میں سیاہ آدمی جگنو جگنو چلا رہے ہیں۔
اوہ! لوگوں کی آواز سنکر جگنو اونچا اڑنے لگا۔
اوہ! جگنو! پیچھا کئے جانے پر چاندنی میں چھپ جاتے ہیں۔
(دو شکاریوں نے ایک ہی وقت میں) پکڑنے کی کوشش کی، بیچارا جگنو کچل کر مر گیا۔

جگنو کی روشنی

پُل کے نیچے پہلے ہی سے جگنو چمکنے لگے اور ابھی اندھیرا نہیں ہوا ہے۔
جب پانی کی گھاس سیاہ معلوم ہونے لگتی ہے تو جگنو اڑنے لگتے ہیں۔
باغ میں جگنو چھوڑتے وقت دیوان خانے سے دیکھنا کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے۔
جتنی رات زیادہ آتی ہے جگنو زیادہ چمکتا ہے۔
ارے دیکھو! وہ گھس کھدے کی آستین میں سے جگنو اڑا۔
ادھر اُدھر رات کی گھاس جگنو کی روشنی کی وجہ سے سبز معلوم ہونے لگتی ہے۔
لالٹین بجھ گئی تو جگنو کی کیسی قدر ہوتی ہے۔
کھڑکی پر تو اندھیرا ہے مگر دیکھو وہ جگنو کاغذ پر چڑھ رہا ہے۔
جگنو کی روشنی کیسی آسانی سے ہو جاتی ہے اور پھر کیسی آسانی سے گل ہو جاتی ہے۔
دیکھو، ایک جگنو نیچے آیا ہے، باغ کی شبنم دکھائی دینے لگی۔
دیکھو، یہ جگنو میری ہتیلی پر چل رہا ہے، اس کی ٹانگیں دکھائی دے رہی ہیں (اس کی اپنی روشنی میں۔)
مجھے تو ڈر لگتا ہے، اس جگنو کی روشنی میرے ہاتھ میں سے دکھائی دے رہی ہے۔
کیسا بھیانک منظر ہے! روشنی کا تیر میری طرف آتا ہے اور ایک ہاتھ (کے فاصلے) پر غائب ہو جاتا ہے۔
دیکھو وہ جگنو جا رہا ہے، مگر اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے (پھر کس کی تلاش کر رہا ہے؟)
جگنو ابھی تو اس جھاڑی میں دکھائی دیا تھا (پھر کہاں گیا؟)!
یہ آدھی رات کا جگنو میری آستین پر آکر بیٹھا ہے، کیسا ڈر لگتا ہے[1]!
جگنوؤں کو دیکھو، اِس بید مجنوں کی بہار (یعنی پھول کھلنے کا موسم) رات کو آئی ہے!

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہیں۔ مثلاً ب، بِ، بُ، با، بی، بو، وغیرہ۔ ہوکُو کے پہلے مصرعے میں ایسے پانچ سلیبل ہوتے ہیں، دوسرے مصرعے میں سات اور تیسرے مصرعے میں پھر پانچ۔ اس نظم میں پورا خیال ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ عموماً صرف اشارے ہوتے ہیں۔ اِن اشاروں کو موزوں کرنا شاعر کا کمال ہے۔

[1] یعنی یہ جگنو ضرور کسی زندہ یا مُردہ آدمی کی رُوح ہے۔

(۳) اس جگنو کو پانی کے نیچے اندھیرے ڈر لگتا ہے (جبھی تو اس نے اپنی ننھی سی لالٹین جلائی ہے)

(۴) میں بہت دور نکل آیا۔ یہاں جگنوؤں کا اِدھر سے اُدھر اُڑنا بڑا ڈراؤنا منظر ہے۔

آہ! جگنو! جب اندھیرا چھٹنے لگتا ہے تو وہ گھاس میں چھپ جاتے ہیں۔

محبت

اے جگنوؤ! ذرا یہاں کچھ دیر جمع رہو کہ اُس شخص کی شکل دکھائی دے سکے جو مجھ سے یہ باتیں کہتا ہے۔

ذرا سی بھی آواز نکالتا نہیں مگر آتشِ عشق میں جلا جاتا ہے۔ جبھی یہ جگنو دوسرے رونے (چلّانے) والے پروانوں سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔

جب رات آتی ہے تو میری رُوح جگنو سے بھی زیادہ جلتی ہے۔ لیکن اُس شخص پر اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جلنا دکھائی نہیں دیتا۔

یہ تینوں نظمیں کسی عورت کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں جس کے دل میں کسی کی محبت سمائی ہوئی ہے اور اسے اندر ہی اندر جلا رہی ہے۔ ایسی نظمیں بے انتہا ہیں جن میں محبت کی خاموش سوزش کو جگنو کے جلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

مختلف موضوعات پر

یہاں پانی کے کنارے کیسی ٹھنڈک ہے! اور جگنو سامنے سے تیر کی طرح نکل جاتے ہیں!

پانی پر پہونچ کر وہ نیچے آجاتا ہے، وہ جگنو۔

پانی کی بوندیاں "کوزوں" پر پڑ رہی ہیں۔ پتّے کے نیچے سے جگنو نکل کر اُڑ جاتا ہے۔

آہ! آج رات کو بارش میں وہ صرف زمین پر چل رہے ہیں۔ وہ جگنو!

پانی کی پھوار میں وہ کیسے اِدھر اُدھر جھوم رہے ہیں، وہ جگنو!

پَو پھٹنے پر جگنو کے پنجرے میں سوائے گھاس کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

پَو پھٹنے پر وہ پھر کیڑے بن جاتے ہیں، وہ جگنو!

اوہ! یہ جگنو! دن کی روشنی میں اس کی گدی سُرخ نظر آتی ہے۔

جگنو خریدو تو ادب سے اِن کے آگے گھاس کے چار پانچ تنکے ڈال دو۔

پھیری پر جگنو والے کی آواز

وہ تمہیں دو تین جگنوؤں کے اسیری سے رہائی پانے کی سیر نہیں دیکھنے دے گا، یہ جگنو والا۔

وہ تین چار جگنوؤں کو پنجرے میں صرف روشنی کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے، یہ جگنو والا۔

کیونکہ اُسے اب خود اپنا جسم اندھیری رات میں لے جانا ہے یہ جگنو والا۔

(ترجمہ)

نورالحسن برلاس

۱؎ ایک پودے کا نام ہے جو اُمار وٹ کی طرح ہوتا ہے۔

الفاظ کی تاریخ

انسان کے ابتدائی عہد کی تاریخ اس درجہ تاریک ہے کہ تیز سے تیز نظر بھی اپنا کام نہیں کر سکتی۔ زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالیئے جہالت اور لاعلمی کے پردے پڑے ہوئے نظر آئیں گے، اور ہر طرف سکوت کا منظر اور "ہو" کا عالم دکھائی دے گا، لیکن جن افراد نے بصیرت کی شمع لیکر اس اندھیرے کی سیر کی ہے، وہ اُس عہد کے دُھندلے نقوش کو کسی نہ کسی طرح ضرور پا سکے ہیں، مگر اس جستجو کا تمامتر دارومدار "ظن و تخمین" پر ہے، چابکدست مصوّرین نے "ظن و قیاس" ہی کے رنگ و روغن سے واقعات کی تصویر کو مرتب کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا سمندِ خیال تاریخ کی اس بحرِ ظلمات کو بڑی پھرتی کے ساتھ پار کر گیا ہے "ظن و تخمین" پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا معرکۃ الآرا بحث ہے جس پر متعدد ارباب فلسفہ اور اہل عقل نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ بعض افراد نے "ظن و قیاس" کے کارخانے کو سراسر طلسم ثابت کیا ہے۔ لیکن اس ابطال و تکذیب کی آڑ میں وہ خود ظن و قیاس کا شکار بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "ظن و قیاس" کے پروں کے بغیر طائرِ خیال پرواز ہی نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس حربہ کا استعمال ترک کر دیا جائے تو ماضی کی تاریخی روایات کا اور واقعات کے سربفلک قصر، آن کی آن میں خاک میں مل جاتے ہیں۔

اگر انسان "ظن و قیاس" سے کام لینا چھوڑ دے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدرت کی ودیعت کی ہوئی عظیم الشان نعمت کو اُس نے ٹھکرا دیا، حالانکہ قدرت کی عطا کی ہوئی کوئی نعمت بھی ٹھکرا دینے کے قابل نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ ظن و قیاس کی بُنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں، اُن میں سے بعض مضبوط اور بعض کمزور ہوتی ہیں۔ مگر یقین جانیئے کہ بدیہیات کی عدم موجودگی میں ثانی الذکر عمارات کی کمزوری بھی اپنے اندر ایک خاص استحکام رکھتی ہے ــــ ظن و قیاس سے کس طرح کام لیا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب مثال کے ذریعے سمجھئے تاکہ مسئلہ کی عمومیت سے آپ واقف ہو جائیں، ظاہر ہے کہ کسی مسئلہ کی عمومیت سے باخبر ہو جانے کے بعد اُسکی خصوصیت کا خود بخود پتہ لگ جاتا ہے۔

آپ ایک بہتے ہوئے دریا کو دیکھ کر قیاس کرتے ہیں، کہ اس کا منبع پانی کا بڑا خزانہ ہوگا۔ حالانکہ آپ نے دریا کے نکلنے کی جگہ کو نہیں دیکھا۔ مگر آپ کا قیاس حقیقت سے سرِمو متجاوز نہیں ہے۔ ایک لانبی قبر کو دیکھکر، آپ ظن و قیاس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں، کہ صاحبِ قبر لانبے قد کا ہوگا۔ کھنڈروں کے مشاہدے سے آپ برباد شدہ عمارت کی نوعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خون کے تھالوں کو دیکھ کر، قتل و ذبح کے مقدمات آپ کے ذہن میں معاً آجاتے ہیں۔ اور آپ اُن مقدمات سے نتائج و عواقب کا استنباط بھی کرتے ہیں۔ پانی پت کے میدانوں سے جب آپ گذرتے ہیں تو آپ کے دل و دماغ پر خونیں ہنگاموں کے متعدد نقوش مُرتسم ہو جاتے ہیں۔ غرض آپ کو قدم قدم پر ظن و قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ پھر وہ مسائل جو بدیہیات و شواہد کی حدود سے ماوراء ہیں اُن کی تشکیل و تفہیم تو قیاس و تخمین کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی ــــ ظن و قیاس کی اس حقیقت کو پیش نظر رکھکر میرے مضمون کا مطالعہ فرمائیے۔

فطری جذبات

دُنیا میں زبانیں (——— Languages) کس طرح وضع ہوئیں؟ یہ ایک ایسا اہم بالشان موضوع ہے۔ جو جامعیت کے علاوہ بہت سی غیر محسوس اور غیر مرئی نزاکتوں کا حامل ہے، کیونکہ دُنیا میں کسی زبان کے بننے کی صحیح اور جامع تاریخ موجود نہیں ہے۔ لہذا ظن و قیاس ہی کے ذریعے اس خاکہ میں رنگ بھرنا پڑتا ہے، دُنیا کی تمام زبانوں پر نہ مجھے عبور ہے اور نہ اُن کی میں تجدید و تشریح کر سکتا ہوں، لہذا بجائے اس کے کہ ہر زبان کی تاریخ پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی جائے، بہتر ہے کہ مجموعی طور پر "وضع الفاظ" کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کر دی جائے تاکہ اسی حقیقت کی روشنی میں آپ دُنیا کی تمام زبانوں کی ابتدائی تاریخ کا ظنی مُطالعہ کر سکیں ——— وضع الفاظ کے سلسلہ میں، اُردو کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ اور آگے چل کر اسی زبان کے الفاظ و مخارج سے بحث کی جائے گی۔ البتہ ضمناً کہیں کہیں، دوسری زبانوں کے الفاظ کا بھی تذکرہ ہوگا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آج جبکہ دُنیا اس قدر متمدّن اور مہذب ہو گئی ہے، انسان کے فطری قوا اور جذبات میں، اس دور کے انسان کے مقابلہ میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوا۔ جبکہ حضارت و عمرانیت کا کوئی دُھندلا نقش بھی دُنیا میں موجود نہ تھا۔ جب انسان جنگلوں میں، درندوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا، اُس وقت بھی اُس کے دل و دماغ پر جذبات کے اُسی آفتاب کی کرنیں رقص کرتی تھیں۔ جس کی روشنی سے اِس وقت اس کے دل و دماغ منور ہیں۔ جبکہ عالیشان عمارتیں بھی اُس کے وجود کی سمائی کے لئے ناکافی نظر آتی ہیں۔ اگر ڈارون کے نظریۂ ارتقا (——— Evolution) کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، تو وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے، کہ جمادی اور نباتی منزلوں سے گذرنے کے بعد جب انسانیت کی منزل آجاتی ہے، تو مادہ کے نشو و ارتقا کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ کیونکہ "مادہ" کامل طور پر نشو و نما حاصل کر لیتا ہے، ڈارون کے اسی نظریے کو اگر ذرا وسعت دی جائے تو اُس کی شکل یہ ہو جائے گی کہ: فطرتِ انسانی ہمیشہ سے مکمل ہے، اور اُس میں کسی قسم کا اضافہ محال ہے، یہ جو کچھ آپ تمدن و تہذیب کی بہاریں، اور ادب و شائستگی کے منظر دیکھ رہے ہیں۔ ان کا فطری جذبات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، یہ تو سب خارجی اسباب اور دماغ کی اُپج کا نتیجہ ہیں، پس افریقہ کے حبشی اور امریکہ کے مہذب انسان کے فطری جذبات میں کسی قسم کا تفاوت نہیں ہو سکتا۔ لہذا ابتدائی دور میں جو چیزیں انسان کے جذبات کو اُبھارتی تھیں اب بھی وہی اشیاء جذباتِ انسانی کے لئے محرکات و موثرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

الفاظ کی ضرورت

سب سے پہلے الفاظ کی ضرورت اور اُن کے کام کو سمجھ لینا چاہیئے ——— مافی الضمیر کے ادا کرنے کا واسطہ الفاظ ہیں، یعنی جو خواہش آپ کے دل میں پیدا ہوتی ہے، اُس کے اظہار کا ذریعہ الفاظ ہیں، یا یوں سمجھیئے کہ "الفاظ" آپ کے جذبات کے پیام رساں (——— Messenger) ہیں، اُن کے ذریعہ سے آپ دوسرے لوگوں سے اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ فلسفہ کا یہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جب کوئی شے وجود میں آتی ہے، تو صفات بھی اُس کے ساتھ منصۂ شہود پر

جلوہ گر ہو جاتی ہیں، یہ کبھی نہیں ہوتا، کہ کوئی چیز آج پیدا ہو جائے، اور اس کی صفات دس برس بعد پیدا ہوں، بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں کہ وجود میں آنے کے بہت عرصہ بعد، اُن کی صفات ہم پر ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے صفات اور ذات کے ظہور میں کوئی زمانی فرق لازم نہیں آتا، پس انسان کو جب دُنیا میں پیدا کیا گیا، تو تمام صفات لیکر دُنیا میں آیا، اُس نے دُنیا میں آتے ہی سُننا، کھانا پینا شروع کر دیا۔ اسی طرح نطق کی صفت بھی اپنا کام کرنے لگی۔ قرآن شریف میں آدمؑ کی تعلیم اسماء کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ قدرت نے وہبی طور پر بعض اسماء کے نام انسان کو بتائے۔ لیکن "وضع الفاظ" کی وُسعت کا اندازہ کرتے ہوئے علم اسماء کی نوعیت اور اُنکے وجوہ و اسباب پر تفکر و تدبر کرنا بہت ضروری ہے۔

اگر تعلیم اسماء سے مقصد اشیاء کی ماہیت ہے، تو مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے، کہ قادر مطلق نے "القا فی الروع" کے ذریعہ انسان کو اشیاء کے خواص کا علم کرا دیا، یعنی جب انسان کو پہلی مرتبہ پیاس لگی۔ تو قدرت نے پانی کے چشمہ کی طرف اس کو رہنمائی کی۔ جب اُس کو بھوک لگی تو پھل اور نباتات کی طرف اُس کا رُخ کر دیا۔ جب جذبۂ شہوت کا غلبہ ہوا تو صنفِ نازک کی جانب طبیعت کا میلان کرا دیا۔ پس فطرت کی صحیح خواہش کی تکمیل کے لئے جو انسان نے پہلی مرتبہ، ذریعہ اختیار کیا۔ اُسی سنّت پر آج سارے انسان عمل کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی فطرت ابتدائے آفرینش سے اختتام تک ہمیشہ یکساں رہیگی۔

جب انسانی آبادی نے کچھ ترقی کی، تو یہ ناممکن تھا کہ سب کے سب پیاس بجھانے کے لئے چشموں پر جائیں، یا سب کے سب پتھروں کو رگڑ کر آگ پیدا کریں۔ بلکہ انسانوں نے کاموں کی تقسیم کا معاہدہ کر لیا۔ یا یوں سمجھئے کہ باپ کو پیاس لگی، اس نے بیٹے کو اُس سے آگاہ کیا۔ بیٹے نے باپ کی خواہش کو معلوم کر کے، اس کو پانی لا کر پلا دیا۔ اس حقیقت کو ذرا غور سے سمجھئے کہ یہیں سے وضع الفاظ کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ شروع میں مافی الضمیر کے ادا کرنے کے لئے انسان نے حرکات کو آلۂ کار بنایا ہوگا۔ جب اس کو پیاس لگی ہوگی تو اُس نے زبان کو نکال کر دکھانے سے "اظہارِ تشنگی" کیا ہوگا، بھوک کے لئے اُس نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ اشارات کب تک ساتھ دے سکتے تھے۔ پھر مختلف قسم کی ضروریات کے لئے اشارات وحرکات ناکافی ثابت ہوئے، پس اس نے اس ضرورت سے مجبور ہو کر الفاظ وضع کئے، اور اب زبان دکھانے کے بجائے صرف "پانی" کہدینے سے مطلب نکل گیا۔ اور پیٹ کی طرف اشارہ کرنے کی بجائے "بھوک" کا لفظ بول دینے سے دل کی بات ظاہر ہو گئی۔ لہٰذا ایسی تمام اشیاء جن کا زندگی کی فطری ضروریات سے ناگزیر تعلق ہے، اُن کے لئے انسانوں نے باہم مل کر الفاظ گھڑ لئے، چونکہ انسان میں صفتِ نطق موجود تھی، لہٰذا اُس کو وضع الفاظ اور اُن کے استعمال میں کسی وقت اور مشکل کا سامنا کرنا نہ پڑا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ مافی الضمیر کے ادا کرنے کے لئے شروع میں انسان نے حرکات و اشارات کے ذریعہ کام نکالا ہوگا۔ اس ظن و قیاس میں ممکن ہے، آپ کو کوئی اعجوبیت نظر آئے۔ مگر واقعات اس کی بہت کچھ تصدیق کرتے ہیں۔ کچھ دنوں کا واقعہ ہے کہ بنگال میں کسی انسان کے بچے کو شیر اُٹھا کر لے گیا۔ اور جوان ہونے تک اُس کی پرورش کی، اتفاق سے چند شکاری اُدھر آ نکلے، اُنہوں نے شیر کو ہلاک کر کے آدمی کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یہ آدمی بھوک اور پیاس کا اظہار اشاروں ہی سے کرتا تھا۔ اور جب کوئی عورت اُس کے کٹہرے کے قریب آتی تھی، تو وہ عجیب و غریب والہانہ انداز میں رغبت جنسی کو بھی ظاہر کرتا تھا، اس کے ماسوا ہم اس قدر ادب و علم کی بہتات کے بعد بھی اپنے بعض خیالات کا اظہار اشارات کے ذریعہ کرتے ہیں۔ شکار

میں اس خوف سے کہ کہیں جانور چوکنے نہ ہوجائیں، اشارات وحرکات ہی کے توسط سے بات چیت کی جاتی ہے، مریض میں جب بولنے کی سکت نہیں رہتی تو وہ اسی حربہ کو کام میں لاتا ہے۔ غرض یہ بات ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے کہ ابتدائی دور میں انسان نے حرکات واشارات کے واسطہ سے مافی الضمیر ادا کیا۔

آواز کا تعلق

نسل انسانی کے اضافہ کے ساتھ، تمدن بھی ترقی کرتا گیا۔ اور اب انسانوں کو دوسرے الفاظ کی تشکیل و توضیع کی فکر دامنگیر ہوئی۔ کیونکہ ہوا، پانی، آگ، مٹی کی ان گنت فروع اور بے شمار شاخیں ہیں۔ شروع میں انسان نے اُن چیزوں کے لئے الفاظ بنائے جن سے اُس کی ضروریات زندگی زیادہ سے زیادہ وابستہ ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے ترقی کرتا گیا۔ الفاظ کے وضع کرنے میں انسان کے وجدان اور سامعہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ اُس نے بلا سوچے، سمجھے، چیزوں کے نام نہیں رکھدئے، بلکہ اُن کی پوزیشن، او........... اُن کی اہمیت پر پوری نظر رکھتے ہوئے الفاظ بنائے، ہوا چلنے سے جنگل کے پتوں میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، اور اُس سے آواز نکلتی ہے۔ غرض اس طریقے سے مختلف محرکات کے باعث مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا پہلے اس کیفیت کے لئے "آہٹ" کا لفظ بنایا گیا۔ اور جس قسم کی آہٹ سُنائی دی، اُسی کی مُناسبت سے لفظ "آہٹ" میں آواز کی اُس قسم کا اضافہ کر دیا ——— گنگناہٹ، بھنبھناہٹ، سرسراہٹ او جھنجھناہٹ کی تشکیل کی علت غائی یہی آوازوں کا اختلاف ہے، مکھیوں کے پروں سے جو آواز ہوتی ہے، اُس کو اور لفظ "بھن بھن" کو سامعہ کی کسوٹی پر کسو تو دونوں پورے اُتریں گے، اسی طرح دوسری آوازیں گڑگڑاہٹ اور جھنجھناہٹ وغیرہ کا حال ہے، ان ہی الفاظ میں سے اور شاخیں نکلتی گئیں، حقہ کی ایک قسم "گڑگڑی" ہوتی ہے۔ اس کا نام گڑگڑی اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس سے جو آواز نکلتی ہے اس میں گڑگڑاہٹ شامل ہوتی ہے، اسی طرح جھنجھناہٹ سے جھنجھنا، جھانجن اور جھانجھ وغیرہ الفاظ تراش لئے، یہ تمام چیزیں جو آواز پیدا کرتی ہیں، ان پر غور کرو، تو معلوم ہوگا، اُسکی اصل "جھنجھناہٹ" کے سوا اور کچھ نہیں ہے ——

اشیاء کی حیثیات

اوپر کہا جا چکا ہے کہ الفاظ بلا سبب نہیں گھڑ لئے گئے، بلکہ اشیاء کی حیثیت فطری و وضعی کا بھی، اُن سے اظہار مقصود ہے، یہ بات نہیں ہے کہ کان اُن کو سُنتے سنتے عادی ہو گئے ہیں، اور ہم اشیاء کا الفاظ ہی کے ذریعے تصور کرتے ہیں۔ بلکہ فی الحقیقت واضعین الفاظ نے اُن کو صحیح طریقے پر واضع کیا ہے۔ ایک طرف پہاڑ، چٹان، چوٹی، پتھر، گھڑیال، مگرمچھ کی حیثیات پر غور کیجئے اور دوسری طرف ذرّہ، تنکا، گھاس، پتی، فاختہ اور کوئل کو ملاحظہ فرمائیے۔ پہاڑ میں لفظی حیثیت سے جو عظمت ظاہر ہوتی ہے، تنکے میں برخلاف اس کے عجز و تذلل کا پہلو نمایاں ہے، گھڑیال اور مگرمچھ کی حیثیات جسقدر خوفناک اور عظیم الہیئت ہیں، اس کے مقابلہ میں فاختہ اور کوئل، بہت ہی دلکش اور قصیر القامت ہیں۔ لہذا اگر کوئی کوئل کو مگرمچھ کہنے لگے، تو اس نے فی نفسہ لفظی ساخت کی یا تو روح کو نہیں سمجھا یا کوئل اور مگرمچھ کی ذاتی حیثیات سے نابلد ہے۔

انسان کے جسم میں سب سے سخت چیز کا نام "ہڈی" رکھا گیا۔ لہو، کھال، گوشت اور دوسری چیزیں سختی کی اس اہمیت کو ظاہر نہیں کرتیں، پس ان اشیاء کے لئے جو الفاظ وضع کئے گئے وہ بھی "ہڈی" کی طرح ثقیل نہیں ہیں۔

اسی طرح کلہاڑی، پھاوڑا، ہتوڑا اور چاقو، قینچی چھری میں فرق ہے۔ کلہاڑی اپنی قامت کے لحاظ سے بڑی ہوتی ہے، اُس سے کام بھی بڑا ہی لیا جاتا ہے۔ پس ان کا نام بھی اسی فلسفہ کی ترجمانی کرتا ہے، چاقو، کلہاڑی کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اُس سے کام بھی ادنیٰ لیا جاتا ہے، لہذا اس کا نام بھی اسی نوعیت کا وضع کیا گیا۔

کپڑا بہت سی قسم کا بنتا ہے، بعض کھردرے، اور موٹے ہوتے ہیں، اور بعض ملائم اور باریک ہوتے ہیں، کپڑوں کی اسی خشونت اور ملائمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، لٹھا، ململ، کھدر، اطلس، دیبا، کمخواب اور قاقم وغیرہ الفاظ کی ساخت پر غور کرو۔ اطلس کا اگر کھدر نام رکھدیا جائے، تو اُس کی نرمی اور نفاست کی کتنی شدید توہین ہوتی ہے، اسی طرح "لٹھے" کو اگر کمخواب کہنے لگیں تو "لٹھے" کی معنوی سختی خاک میں مل جاتی ہے ـــــ یہی نوعیت دوسرے الفاظ کی ہے۔

مخارج کا اثر

بعض الفاظ مخارج کے تحت وضع کئے گئے ہیں، جب زور سے ہنستے ہیں تو "ق۔ ہ۔ ق۔ ہ" کی آواز نکلتی ہے، لہذا اس زوردار ہنسی کا نام "قہقہہ" رکھدیا گیا۔ بوتل کی آواز کو "قلقل" کہتے ہیں۔ ایک طرف بوتل سے آواز پیدا ہورہی ہو، اور دوسری طرف آپ صحیح مخارج کے ساتھ "قلقل" کہیں تو یقین جانئے کہ آپ کی آواز، اور بوتل کی صدا، دونوں مل جائیں گی، کبوتر کی آواز کو "غٹرغوں" کہتے ہیں، غٹرغوں کا صحیح مخرج اور کبوتر کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے ــــــ اسی طرح غُرغُر کرنے کو غرّانا بولتے ہیں۔ غرّانے میں ایک قسم کا دل میں کبر و تجبر پیدا ہوتا ہے، لہذا اسی سے "غرور" بنا دیا گیا، کہ اہلِ غرور بھی "غرّاتا" ہے، اور "غرارہ" جو ایک خاص قسم کی آواز ہوتی ہے، اُس میں بھی "غرغر" کا بہت کچھ حصہ ہوتا ہے۔ "غرغر" کا مخرج حلق سے ادا ہوتا ہے، لہذا حلق میں پانی ڈال کر جو اُسے گھماتے ہیں، اُس کا نام "غرارہ" رکھدیا۔ یہ تمام الفاظ اپنی اپنی جگہ پر مستقل معنیٰ رکھتے ہیں لیکن اُن کی اصل حلق کا مخرج "غرغر" ہے۔ "غرفش" بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔ اس سلسلہ میں غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ "غرّانے" سے ماتھے پر شکن نمودار ہوجاتی ہے۔ یہی علامت غرور کی ہے، اور غرارہ کرنے میں بھی پیشانی کی تحریریں اُبھر آتی ہیں اور چہرے میں تناؤ سا پیدا ہوجاتا ہے۔

آبادیوں کے نام

جب آدمی زیادہ متمدن ہوگیا۔ تو اُس نے صحرانوردی کو چھوڑ کر، آبادیاں قائم کیں، جس طرح اُس نے دوسری اشیاء کے نام رکھے تھے، اسی طرح اپنی بسائی ہوئی آبادیوں کے نام وضع کئے۔ اشیاء کے نام وضع کرنے میں تو اس کو اُن کے خواص اور داخلی اور خارجی حیثیات کو مدِنظر رکھنا پڑا، لیکن آبادیوں کے معاملہ میں اس نظریہ کا استعمال بے معنیٰ تھا، پس اُس نے آبادی کی خاص نسبت کے لحاظ سے نام رکھدیا۔ پس دُنیا کا بڑے سے بڑا شہر اور چھوٹے سے چھوٹا قریہ۔ کچھ نہ کچھ ضرور معنی رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب اس کی شکل بگڑ گئی ہے جس کے باعث اس کا مفہوم خبط ہوکر دماغوں سے یکسر محو ہوگیا۔

مثال کے طور پر شہر بدایوں کو لے لیجئے اس کا اصل نام "بیدامئو" یعنی "حکیموں کے رہنے کی جگہ" تھا، انقلابات زمانہ کے ہاتھوں، جہاں شہر کی آبادی کو مختلف منازل سے گذرنا پڑا، وہاں اس کے نام پر بھی مصیبت نازل ہوئی، چنانچہ عہد اکبری میں اس کا نام "بداؤن" ہوگیا۔ ہندوستان کے نامور مورخ اور دربار اکبری کے سب سے جری سنّی عالم، ملّا عبدالقادر بدایونی سے جب اکبر اعظم، اس جرم پر ناراض ہوگیا کہ اُس نے اکبر کی خود ساختہ نبوت کی تکذیب کی، تو اس کو دارالسلطنت سے اپنا بوریا بندھنا سنبھال کر بدایوں آنا پڑا، اس شاہ پرستی کا بُرا ہو، کہ بادشاہ کے معتوب کے لئے وطن کی فراخ و وسیع سرزمین بھی تنگ ہوگئی، اور اہلِ شہر نے اُس کے ٹھہرانے سے گریز کیا کہ کہیں ہم پر بھی مصیبت نہ آجائے۔ اس پر ملّا عبدالقادر نے اہلِ بدایوں کی ہجو میں قصیدہ کہا، جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے۔ ع ۔

اے صبا از من ببر اہلِ "بداؤن" السلام

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں بدایوں کو "بداون" کہتے تھے۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے ضرورتِ شعری کے لئے بدایوں کا "بداون" باندھ دیا ہو، لیکن ضرورتِ شعری کی خاطر، الفاظ کو اس قدر مسخ کر دینا ایک بڑا ادبی گناہ ہے، اور یہی صحیح ہے کہ "بداون" بھی ضرور بولا جاتا ہوگا۔ اب ایک عرصے سے "بداون" کو بدایوں کہتے ہیں۔ اگر اس شہر کے نام کی تاریخ کی یہ کڑی کسی طرح گم ہو جاتی، تو کیا یہ کہنا صحیح ہوتا کہ "بدایوں" کے کچھ معنیٰ نہیں ہیں، جن ملکوں کے نام اپنے اصلی روپ میں موجود ہیں، اُن سے میرے اس نظریہ کی پوری تائید ہوتی ہے، کہ کسی خاص نسبت اور خصوصیت کے باعث ملکوں اور آبادیوں کے نام رکھے گئے ـــــــ مثلاً نجد کے معنی فراز و بلند کے ہیں اور تہامہ کے معنی پست ہیں، تہامہ اور نجد کے کوہستانی حصہ کو حجاز اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک حاجز (حاجب) اور پردہ ہے۔ حبش کے معنی ہیں مخلوط، حبش کے رہنے والے مخلوط النسل ہیں۔ لہٰذا حبش سے یہ مُراد ہے کہ وہ قطعہ ارض، جہاں مخلوط النسل لوگ آباد ہوں، یہ نام عربوں کا رکھا ہوا ہے، عربوں کو نسبی شرافت کا بڑا غرہ تھا پس اہلِ حبش کے اختلاطِ نسلی کے مدِنظر اُنہوں نے ملک ہی کے نام سے ایک وجہ امتیاز پیدا کردی۔

آدمیوں کے نام

بعض الفاظ، اعلام (ـــــــ Proper Nouns) کی حیثیات میں تھے۔ لیکن بعد میں جاکر، اُن کے معنیٰ کچھ سے کچھ ہو گئے، بوئی کوٹ (ـــــــ Captain Boycott) اسکاٹ لینڈ (؟) کا ایک کاشتکار تھا، کاشتکاروں کی جماعت نے آپس میں ایک سمجھوتا کیا، بوئی کوٹ نے اس کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا سب کسانوں نے اس کا معاشرتی مقاطعہ (ہندوستانیوں کی اصطلاح میں حقہ پانی بند کرنا) کر دیا، آج بائیکاٹ کا لفظ مستقل طور پر مقاطعہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اسکاٹ لینڈ کے غریب کاشتکار کو کیا خبر تھی کہ اُس کے نام کو دُنیا اس طرح پر زندہ رکھے گی۔ (بائیکاٹ کی تاریخی حیثیت سے مجھے ایک پروفیسر نے آگاہ کیا تھا۔ ماہر) اسی طرح پروپگنڈا لاطینی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنیٰ ہیں بڑھتی، زیادتی، فراوانی، اس لفظ کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۶۲۲ء میں روم کے پوپ گریگورس پانزدہم نے ایک مذہبی انجمن قائم کی اور اُسکا نام "پروپگنڈا" (ـــــــ Propaganda

رکھا، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ لاطینی قوموں میں مسیحیت پھیلائی جائے، آج کل کسی تحریک کی نشر و اشاعت کو پروپگنڈا کہتے ہیں اور فارسی والوں نے اس کا "پروپاغندا" بنالیا۔

آدمیوں کے نام بھی ضروری کسی خاص واقعہ، کمال، یا نسبت کے سبب رکھے گئے، اس سلسلہ کا پہلا ٹکڑا طوطمیت (ٹوٹمزم) ہے، یعنی دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف منسوب کرنا جیسے قریش، سہیل، شمس، در کالیداس۔

اسماعیل، عبرانی میں "شماع ایل" ہے۔ شماع (سماع) سننا اور ایل (اللہ) کو کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہوئے "خدا کا سننا" چونکہ خدا نے حضرت ابراہیم کی دعا اور حضرت ہاجرہ کی فریاد سنی۔ اس لئے بچہ کا نام شماعیل (حضرت اسمٰعیل) پڑ گیا

اختلاف استعمال

بعض الفاظ جس ضرورت کے لئے وضع کئے گئے تھے، بعد میں جاکر اُن کے معنی کچھ سے کچھ ہوگئے۔ ایک سبق ہی کے لفظ کو لو، جو دراصل گھوڑ دوڑ کی ایک اصطلاح ہے، اور جس کو بعد میں مجازاً متداول معنوں میں استعمال کیا گیا۔

ساتویں صدی ہجری تک یہ لفظ اپنے متداول معنوں میں استعمال ہوتا تھا، لیکن آٹھویں صدی ہجری میں صاحب شرح وقایہ حضرت عبیداللہ صدر الشریعۃ بخاری نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں اس کو درس کے معنی میں استعمال کیا، اور آج تک یہ لفظ اسی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو بعد میں جاکر کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں اور اُن کے اصل معنیٰ کا کوئی نقش بھی دماغوں میں محفوظ نہیں رہا۔

ماہر القادری

دُنیا

ہمنشیں! مجروحِ غم ہوں جان کھونے دے مجھے
خلق کی بیگانگی پر آہ! رونے دے مجھے

گرچہ مجھ پر بھی ستم ڈھائے ہیں دُنیا نے بہت
حشر اُٹھائے ہیں جہانِ فتنہ آرا نے بہت

دردِ محرومی، غمِ ناشادمانی کے لئے
مَیں بنا ہوں تلخیٔ ناقدردانی کے لئے

زندگی میں رُوح کے اجزا پریشاں کر دئے
میں نے اپنے دل کے ٹکڑے نذرِ دوراں کر دئے

بزم زار میں صبح کی جب جھلملاتے ہیں چراغ
مدّتوں کھولا ہے جوشِ فکر سے میرا دماغ

شب کی خاموشی میں جب سوتی ہے نبضِ جستجو
مدّتوں برسا ہے میری چشمِ گریاں سے لہو

کیف کی اُس فصل میں جب مُسکراتی ہے بہار
مدّتوں مَیں تشنہ کامی سے رہا ہوں بیقرار

چاندنی کے رقص میں جب گنگناتی ہے صبا
مدّتوں کانپی ہے میرے نالۂ غم سے فضا

اس فضائے نور میں جب حُسن اُلٹتا ہے نقاب
مدّتوں بیگانۂ عشرت رہا میرا شباب

عیش کے اُس عہد میں جب پھول بنجاتی ہے خاک
مدّتوں مَیں کاوشِ غم سے رہا ہوں سینہ چاک

اُس جواں سالی میں جب ہر چیز ہوتی ہے حسیں
مدّتوں دُھندلی رہی ہے میری دُنیا کی جبیں

آہ! اس سعی و عمل کا دیکھنا ہمدم، مآل
مَیں ہوں اور اِک مستقل کیفیتِ حزن و ملال

خاک کو تابندگی بخشی ضیائے مہر نے
میری جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا دہر نے

لیکن اے ہمراز! مَیں اِس پر نہیں اندوہگیں
خلق کی بیگانگی سے میرا مطلب ہی نہیں

صبر سے پیتا مَیں اپنی زندگی کا تلخ جام
خوں رُلاتا ہے مجھے دُنیائے فانی کا نظام

آہ دُنیا، سربسر معمورۂ وہم و قیاس
زندگانی ہے جہاں وابستۂ اندوہ و یاس

جس کی خاک آلودہ پیشانی ہے محرومِ جمال
باوجود ناتمامی ہے جسے نازِ کمال

ہے جہاں گردش میں اک ٹوٹا ہوا سا جامِ عقل
عقل ہے جس بزم میں آئینۂ اوہامِ عقل

ہیں جہاں ناآشنا اسرارِ فطرت سے دماغ
جادۂ تکمیل ہے اور پیرِ مکتب کا چراغ

دل جہاں سینوں میں ہیں نامحرمِ احساسِ درد
قبر کے مانند تیرہ، برف کے مانند سرد

زہرِ دولت ہے جہاں انساں کی نبضوں میں رواں
رُوح کی وادی ہے اور ابرِ غلامی کا دُھواں

جس میں ہیں اِک سطح پر مجروح، آزاد و اسیر
ہے جہاں انسان ننگِ رُوح و محرومِ ضمیر

جس میں نفرت سے سُنا جاتا ہے، فطرت کا پیام
ہے گراں جس کی طبیعت پر محبّت کا نظام

چھیڑتی ہے سازِ نو اَب گردشِ ایام کیا
دیکھئے ہوتا ہے اِس آغاز کا انجام کیا!!

افسانۂ دلگیر

زندگی کا اعتبار ہی کیا؟ دیکھئے! کل ہمارے محترم دوست جناب سید نظام الدین شاہ دلگیر زندہ تھے۔ محفل احباب میں بلبل ہزار داستان تھے، اور آج اُن کے نام کے ساتھ ہم مرحوم کہنے پر مجبور ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آہ جس نے کہا ہے بالکل سچ کہا ہے ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا　　آدمی بلبلا ہے پانی کا

دریا پورے جوش سے رواں ہے، جہاں امواج اُٹھ رہی ہیں۔ وہیں بلبلے بھی اپنی نمود بے بود دکھا رہے ہیں۔ دیکھنے والے سطح آب پر حباب کی افواج کی یورش دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ آب دریا بلبلوں کا مرکب ہے، تبھی تو ان کی سواری بہتے دریا کے تخت رواں پر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن آہ! نظر ابھی ایک بلبلے کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکتی کہ وہ مٹ جاتا ہے۔ اور خود مر مٹ کر دوسروں کے ظہور کے لئے میدان خالی کر جاتا ہے۔ اب جب نظر پھر اسی منظر پر پڑتی ہے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بلبلا تو محض ایک خیال تھا۔ اور وہ بھی خام۔ کیونکہ سطح آب اُن کی سواری نہیں تھی بلکہ موجوں کے کندھے ان کی میت اُٹھانے والے کندھے تھے۔ دریا حبابوں کا اکھاڑا نہیں۔ ان کا وسیع و عریض قبرستان ہے۔

دُنیا۔ انسانی دُنیا۔ یا زندگی کی دنیا کی مثال بھی ایک بحر مواج کی مثال ہے۔ اور انسانی افراد مختلف القامت حبابوں کے مثیل۔ اِس بحر میں بھی ہر انسانی بلبلا سطح آب سے اُبھر کر اپنا جوبن دکھاتا ہے۔ دریا کے شناور، یا کنارے پر بیٹھنے والے جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کو حباب کا طلسم ٹوٹتا دکھائی دیتا، اور اس بحر کائنات میں غرق ہوتا، فنا ہوتا، نظر آتا ہے۔ لیکن کیا یہ قوت مشاہدہ و عبرت پذیری ہم سب کو میسر ہے۔

اسی لئے کہنے والوں نے کہا ہے کہ زندگی یقینی نہیں، موت یقینی ہے کسی ہستی کا وجود میں آنا حتمی اور حکمی نہیں۔ مگر ہر آجانے والے کا مرجانا یقینی ہے۔ پیدائش موت ہی کا بُلاوا ہے، اور زندگی موت کی آنکھ مچولی۔ اسی لئے حکما اور مذاہب نے کہا ہے کہ پیدائش پر غیر معمولی خوشی اور موت پر غیر معمولی ماتم گساری بیکار چیز ہے۔ لیکن جب ہمیں چوٹ آتی ہے، تو درد بھی ہمیں کو ستاتا اور رُلاتا ہے۔ جب سر و سینہ زخمی ہوجاتے ہیں تو خون کا دھارا بھی ہمارے ہی سر و سینہ سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔

یہ تو سب کچھ ہے مگر نہ زندگی کا عقدہ کُھلا اور نہ موت کا راز فاش ہوا۔ پیدا ہونا مسلّم، جینا مسلّم، اور مرجانا حتمی طور پر مسلّم۔ لیجئے یہ ہے حیات، خصوصاً انسانی حیات کی مختصر داستان۔ پیدائش اور موت پر کسی کو اختیار نہیں۔ مگر جیتے رہنا بھی بس کی بات نہیں۔ ہاں اگر زندگی کے لمحہ مختصر میں کچھ کر لینا، شاید اختیار کی چیز ہو۔ کیونکہ ہمارے ایک حکیم شاعر کا بیان ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے۔ جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ ناری ہے نہ نوری ہے

اگرچہ حکیموں کا فیصلہ تو یہی ہے مگر اکثر زندوں کو مُردوں سے بھی بدتر دیکھا جاتا ہے۔ شاید زندہ وہی ہوتے ہیں جو کچھ ہوتے ہیں اور اس کے برخلاف جو کچھ نہیں ہوتے۔ ان کو زندگی کا فریب دیکر اس دُنیا میں پریشان حال رکھا جاتا ہے۔ مگر چونکہ زندگی کا فریب کم و بیش ہر متنفس نے کھایا ہے۔ اس لئے مشاہدہ یہ ہے کہ ہر فرد بشر اپنی بساط بھر کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے ہاں ہر ایک کا دائرۂ عمل جُدا ہوتا ہے یہی

وجہ ہے کہ اس دُنیا میں آنے والا کوئی سکندر بن جاتا ہے اور کوئی دارا۔ کوئی اکبر بن جاتا ہے اور کوئی ہیموں بقال۔ کوئی محمد (فداہ ابی و امی) بن جاتا ہے اور کوئی ابوجہل۔ کوئی محمود بن جاتا ہے اور کوئی ایاز۔ کوئی عابد بن جاتا ہے اور کوئی معبود۔ کسی کے قبر پر پتھر مارے جاتے ہیں اور کسی کی قبر پر پھول برسائے جاتے، اسے روزانہ غسل دیا جاتا اور نئی چادر چڑھائی جاتی ہے۔ اور کسی کی یاد دل کو خندۂ گل بنا دیتی ہے اور کسی کا تصور ہی شعلۂ آتش ثابت ہوتا ہے۔

جیساکہ یہ مسلّم ہے کہ ہر وجود جو دنیا میں آتا ہے وہ بیروزہ [illegible] نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ یہاں جو شخص زندہ رہا ہو، اس نے کچھ بھی نہ کیا ہو۔ کیونکہ "کچھ کرنا" اور "کچھ بھی نہ کرنا" دراصل اضافی باتیں ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کام یا یہ کارنامہ انجام دیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اُس نے ایسا کام کیا یا کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر موجود نہیں۔ یا وہ کام دُنیا کے سارے کارناموں پر بھاری ہے۔ بلکہ ہمارا کسی کے کام کو سراہنا ایک خاص نقطۂ نظر اور اس کام کی ایک خاص تعریف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ جب ہم کسی کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر کسی انسان کی تصویر کا کوئی خاص رُخ اور اسکے کارنامہ ہائے حیات کا کوئی خاص پہلو ہوا کرتا ہے۔ اور ان اُمور کے مُطالعہ کے بعد جو تاثرات ہم پر وارد ہوتے ہیں ہمارا بیان انہی تاثرات کا عکس ہوتا ہے۔ اس ہوسکتا ہے کہ ہمارا بیان حقیقت سے زیادہ ہو یا کم، مگر ہم اس عکس کو دیکھ کر مختلف حالات کے ماتحت کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیات محرک ہوئی ہیں کہ ہم حضرت نظام الدین شاہ صاحب دلگیر کے کارنامۂ حیات پر تبصرہ کریں۔ کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے حضرت میر ناصر علی خاں بہادر مرحوم کا ماتم کیا تھا اور میر صاحب مرحوم کے ماتم میں حضرت شاہ دلگیر بھی ہمارے شریک تھے۔ اور ابھی ماتم ناصر کے ایک سال بعد خود دلگیر کی موت کا حادثہ وقوع میں آیا جس کے معنی یہ ہیں کہ موت نے ہمارے مشہور ادیبوں میں سے ایک اور کم کر دیا۔ لیکن کیا ممکن ہے کہ جو ادیب زندہ ہیں وہ شاہ دلگیر کی موت پر خاموش رہیں۔ کیونکہ شاہ دلگیر مرحوم اکبرآبادی ہمارے اس دور کے نمایاں بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی ادبی دنیا میں نام پایا ہے۔ مگر جب تک دوسرے بُزرگ اس طرف متوجہ ہوں مَیں چاہتا ہوں کہ اپنی بساط کے مطابق اس مقالہ میں ان اثرات کو بیان کر دوں جو مرحوم شاہ دلگیر کے متعلق میرے دل پر چھائے ہوئے ہیں۔

غالباً ۱۹۰۸ء یا اس کے بعد کا واقعہ ہے کہ رنگون سے اُردو زبان کا ایک ادبی رسالہ شائع ہوا کرتا تھا جس کا نام "الرفیق" تھا اس رسالہ کے ایڈیٹر ایک بزرگ جناب عبدالسلام صاحب رفیعی تھے۔ اس رسالہ کا جو نمبر میں نے دیکھا تھا اس کی بنا پر میرا خیال ہے کہ رسالہ ہر حیثیت سے بہت اچھا تھا۔ وہ کتنے عرصہ زندہ رہا مجھے اس کا علم نہیں۔ کیونکہ میں نے اس کا صرف ایک ہی نمبر دیکھا تھا۔ اور اُسی نمبر میں ہمارے محترم دوست حضرت سید نظام الدین شاہ دلگیر اکبرآبادی کا بھی ایک مضمون درج تھا۔ مضمون کا عنوان اور موضوع بالکل یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ مضمون میں نثر سے زیادہ نظم یا اشعار سے کام لیا گیا تھا۔ انہی اشعار میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

ہرن کی آنکھ سے بڑھ کر تری چشمِ غزالی ہے　　　بڑی ہے مدبھری ہے شوخ ہے جادو ہے کالی ہے

علاوہ شعریت کے بوجوہ دیگر یہ شعر ہمیشہ مجھے یاد رہا ہے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب حضرت دلگیر سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو اس شعر کا بھی ذکر آیا تھا جو میں مناسب موقع پر آگے عرض کروں گا۔ شاہ صاحب کے محولہ بالا مضمون کے بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی اور علمی یا ادبی رسالہ میں کوئی چیز حضرت دلگیر کی پڑھی ہو۔

اسی رسالہ "الرفیق" والے مضمون کے چند سال بعد وہ زمانہ آیا کہ جس میں مرحوم حضرت شاہ دلگیر کی ادبی زندگی کا وہ دور شروع ہوا

جیسا ان کی ادبی زندگی اور کارناموں کے لحاظ سے ان کا حاصل عمر کہنا چاہیے یعنی اجرائے "نقاد" کا دور۔ غالباً ۱۳ء یا ۱۴ء کا زمانہ تھا کہ حضرت دلگیر کا یہ پری پیکر نقش ونگار ادب منصۂ شہود پر آیا۔ اور اس کا پہلا نمبر جو جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم کے نام آیا تھا ہمیں آپ کے فرزند اکبر جناب مرزا عزیز احمد صاحب ایم۔ اے۔ ت مطالعہ کے لئے مل گیا کہ اس وقت تک ہماری ملاقات مرحوم مرزا سلطان احمد صاحب سے نہ تھی۔

جیساکہ اوپر عرض ہوا رسالہ کا نام نقاد تھا۔ سائز اس کا کتابی تھا۔ لوح اس کی بالکل سادہ تھی۔ کاغذ بہت اچھا تھا۔ اس کا خط حسینوں کا تبسم اور طباعت ان کی جلوہ نمائی تھی۔ لوح پر رسالہ کے نام کے نیچے شاہ صاحب کا نام اور اس کے نیچے مطبع کا نام ہوا کرتا تھا۔ سرلوح درج ہوتا تھا: "حم اللہ من بدائی الی جوبی" رسالہ کا نام اور اس نام سے اس جملہ کا تعلق ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ میرے علم کے مطابق یہی پہلا رسالہ تھا جس کا سرورق اتنا سادہ ہوکر اتنا دلکش ہوتا تھا۔ اس کی یہ سادگی ہی پہلی چیز تھی جس نے میری توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا تھا۔ پھر سرورق کے اندر کی طرف قواعد وضوابط درج ہوتے تھے۔ جو کچھ اس شان اور انداز سے لکھے گئے تھے۔ کہ دل خود بخود اس رسالہ کی عظمت وجلالت کا معترف ہوا جاتا تھا۔ مثلاً "نقاد" کی اہمیت کا احساس قریباً ایسے الفاظ میں کرایا گیا تھا کہ ہمیں اعجاز سخن کا دعویٰ نہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ ادب عالیہ (کلاسکس) کے بہترین نمونے ان صفحات میں پیش کئے جائیں۔ یا نمونہ کا پرچہ قیمتاً دینے کا اعلان ان یا ایسے ہی خوبصورت الفاظ میں کیا گیا تھا کہ "نمونہ کا پرچہ اخلاقاً مفت ارسال نہیں کیا جاتا" وغیرہ۔ مقابلہ کرنے پر لفظوں میں یقیناً کمی بیشی ثابت ہوگی مگر مفہوم میں کمی بیشی کا امکان نہیں۔

یہ تو پہلا دن تھا۔ مگر اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ جب تک رسالہ نقاد زندہ رہا۔ اس کا کوئی ایک نمبر بھی میری نظر سے پوشیدہ نہیں رہا۔ نقاد نے بہت کم عمر پائی۔ غالباً تین چار سال۔ لیکن اس مدت قلیل میں بھی اس کی اشاعت میں دو ایک بار مہینوں کا تعطل واقع ہوا۔ اور جب بھی زمانۂ تعطل کے بعد دوبارہ شائع ہوا۔ اس کے سائز پر اس کا اثر پڑا۔ پہلے دور میں اگر یہ معرا (یعنی بغیر تصویر کے) ہوتا تھا تو دوسری بار کی اشاعت میں مرقع (یعنی مصور) ہوکر نکلا۔ نقاد کی تصویر اگر محض تصویر ہونے کے لحاظ سے پسند کی گئی ہو تو الگ بات ہے ورنہ اس تصویر کے متعلق رائیں زیادہ ہمت افزا نہ تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب رسالوں میں تصاویر کا معیار اتنا ادنیٰ نہیں ہوا تھا۔ جتنا آجکل ہے۔

جس وقت نقاد مطلع ادب پر ظاہر ہوا تھا۔ اس وقت سرزمین ہند میں اس شان اور رکھ رکھاؤ اور ادب وشعر کا علم بردار کوئی دوسرا رسالہ موجود نہ تھا۔ حضرت دلگیر کی خوش مذاقی اور محبت وخلوص نے چند ادیبوں کو جن میں نوخیز اور جوان بھی تھے۔ قدما اور کہنہ مشق بھی نقاد کے حلقۂ ادب میں لے لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کے تمام نازک خیال خوش مذاق اور اہل نظر ان ادیبوں اور ان کے کارناموں یعنی نقاد کو نظروں میں اٹھا اٹھاکر دیکھنے لگے تھے۔

نقاد کی ادبی دلکشیوں کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسی میں یادگار شعرائے سلف پیر میکدۂ ادب، حضرت ریاض کی جوان غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اور اسی میں حسرت اپنے قدیم اور خاص رنگ تغزل میں کبھی کبھی جلوہ فرما ہوا کرتے تھے۔ اسی میں لسان العصر حضرت اکبر کی مصلحانہ اور مخلصانہ چٹکیاں بھی دلوں کو برماتی اور گدگدایا کرتی تھیں۔ اسی رسالہ میں ہمارے نیاز رنگین نواثر کے علاوہ شاعرانہ انداز میں داد سخن دیتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے شعرا اور ادیبوں کا کلام نظم ونثر کی صورت میں نقاد ہی کے صفحات میں باصرہ نواز ہوا کرتا تھا۔

میں نے ریاض کی غزلوں کو جوان کہا ہے۔ گو ثبوت کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو ملاحظہ فرمایئے کہ ذیل کے تین شعر نقادؔ ہی کے مختلف پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔

مثلاً معشوق کی تلوار کی رفتار اور اسکے انداز معشوقانہ کے متعلق ارشاد ہے ؎

اُٹھی اٹھکر جھکی جھک کر رُکی قاتل تری شمشیر کو بھی ناز معشوقانہ آتا ہے

شراب کی تعریف میں آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ ع چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ مگر اس دلکشی کا کیا اندازہ ہو کہ حرم میں بھی چُھکر پی لی جائے اور وہ بھی کس طرح اور چور کون ہے؟ فرماتے ہیں ؎

بھر کر حرم کے گوشہ میں رکھدی تھی زمزمی پی لی چُرا کے زاہد شب زندہ دار نے

جوانی دیوانی کی شورشوں کا مرقع اس سے بہتر نہیں کھینچا جا سکتا ہے۔

مال ہاتھوں نے لیا ہونٹوں نے افشاں چھین لی آ کے قابو میں لُٹا آپ کا جوبن کیسا

جس کے بڑھاپے کے اشعار کا یہ رنگ ہو اگر اس کی جوانی کی شاعری نشۂ شراب نہ ہوئی تو اور کس کی ہوتی یا ہو سکتی تھی ؎

ہو ریاضؔ اک جواں مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

میرا حضرت ریاضؔ اور اکثر آفاقی روایات کی بنا پر خیال یہ تھا کہ ریاضؔ کی جوانی ان کی شاعری کی عملی تفسیر رہی ہوگی۔ مگر خدا بھلا کرے میرے عزیز دوست جناب مولوی سید رئیس احمد صاحب جعفری ندوی مولف سیرت محمد علی کا کہ آپ نے مجھے بتایا کہ ریاضؔ کی جوانی صرف شعر ہی تک ہی محدود رہی ہے۔ ورنہ حقیقت کے لحاظ سے آپ عالم شباب میں بھی "جوان" نہ تھے۔ میرے نزدیک اس کا ثبوت آخری شعر میں بھی موجود ہے۔ مولوی رئیس احمد صاحب حضرت ریاضؔ کے قابل اور فاضل نواسہ ہیں۔

ہاں تو میں نقادؔ کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ نقادؔ کی شاعری تو شعریت کا مرقع ہوا ہی کرتی تھی۔ لیکن اس کی نثر بھی شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے نقادؔ کے ذریعے نام پیدا کیا۔ یا جن کے قلم کی تراوشوں نے نقادؔ کو "نقاش ادب" بنا دیا تھا ان میں اگر خلیقی دہلوی کا نام نہ لوں تو یہ میری زیادتی ہوگی۔ مگر کون ہے؟ جو نہدیؔ کی معجز کلامیوں کا انکار کریگا۔ کس کا حوصلہ ہے کہ وہ نیازؔ۔ ہاں ہمارے مولانا نیازؔ کے ادبِ عالیہ کا انکار کر سکے۔ یہ سچ ہے کہ "ل۔ احمد" اکبرآبادی یعنی ہمارے اخلاق مجسم دوست جناب شیخ لطیف الدین احمد صاحب قریشی اکبرآبادی ادبی عروج موصوف کے ترجمے لالۂ رُخ سے ہوا جو نگار کے ابتدائی سنین میں شائع ہوا تھا۔ مگر آپ کی انشا پردازی کی ابتدا نقادؔ ہی میں ہوئی۔ آگرہ کے قابل وکیل اور مشہور اہل قلم جناب سید محمد محمود رضوی مخمورؔ گو ابتداً نگار کے نائب مدیر کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے۔ مگر آپ کے ادبی کارناموں کی ابتدا نقادؔ سے ہی ہوئی۔ اور سچ یہ ہے کہ نقادؔ کے نقاشوں میں جناب سید مخمورؔ کا دست صناع بھی موجود تھا۔

یہی زمانہ ٹیگور کی گیتان جلی یا "عرض نغمہ" اور اسکے نوبل پرائز کی شہرت کا تھا۔ اس لئے ہماری زبان میں اس وقت ٹیگوریات لکھنے کا ایک عام میلان سا پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس طرز میں اچھا لکھنے والوں کی سرپرستی یا قیادت و علمبرداری نقادؔ ہی کر رہا تھا۔

اس کے علاوہ نہدیؔ کے ادب و انشا کا بہترین حصہ "افادات نہدی" کو اُٹھا کر دیکھ لو۔ نقادؔ ہی کے صفحات میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ دُنیائے ادب کی نگاہیں نیازؔ پر نقادؔ ہی کے ذریعے پڑنے لگی تھیں (چنانچہ ساقیؔ میں "شباب" کے خط میں حضرت نیازؔ کے ادبی ارتقار کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ دراصل حضرت دلگیرؔ ہی کا قول تھا۔ جس کی طرف میں نے اپنے بعد کے ایک مقالہ میں اشارہ کر دیا تھا۔)

بلکل کے فالدے نقاد کے صفحات ہی کے ذریعہ زندگی پائی تھی۔

اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ نقاد کے دور میں اس صنف ادب میں جس کی نمایندگی نقاد کر رہا تھا، کوئی دوسرا رسالہ اور میگزین اس کا رقیب اور حریف نہ تھا، تو بالکل بجا ہوگا۔ نقاد کی خوبیاں جس قدر مقالہ نگاران نقاد کا کرشمہ تحریر ہوتی تھیں۔ اسی قدر حضرت دلگیر کی پُر محبت و خلوص مقناطیسی کشش کا ثبوت بھی تھیں۔

میں ہی نہیں اور بھی خدا جانے کتنے ہوں گے جن کے دلوں میں اب تک نقاد کی یاد باقی ہوگی۔ نقاد میں کچھ ایسی دلچسپیاں تھیں کہ دل یہی چاہتا تھا کہ نقاد کبھی بند نہ ہو۔ مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ باوجود امکانی وسائل مہیا ہونے کے، پروان چڑھنے سے پہلے ہی کئی بار موت کے منہ میں گیا۔ زندہ واپس آیا اور آخر اپنا نام ادبی دنیا میں یادگار چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے "حسن و عشق" یا "سرزمین تاج" میں گم ہو گیا۔ لیکن اپنے مداحوں اور پرستاروں کے دلوں میں ان تمام بزرگوں اور عزیزوں سے ملاقات کی ایسی تمنا پیدا کر گیا، جسے محبوب سے ملنے کی تمنا سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہمارے لئے یہ تمنا ایسی تھی جس کے برآنے کی بظاہر حالات کوئی صورت نہ تھی کیونکہ اس زمانہ میں ہم پانچ دریاؤں کی سرزمین کے ایک مشہور قصبہ میں جس کے لئے غنیمت نے کہا ہے ؎

ندیدم کشور غارت گر تاب   بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب

اپنے اس وقت کے خیال کے مطابق "قلمی جہاد" میں مصروف تھے۔ اور نقاد کے تمام اقمار و شموس مطلع تاج اور اس کے جوانی کی بلندیوں سے ضوفگن اور ضیا پاش عالم ادب ہوا کرتے تھے۔

لیکن دُنیا میں ہمیشہ عجیب عجیب کام ہوتے رہے ہیں۔ دیکھئے قدرت نے ان ادبی نقادوں اور شعری نقاشوں سے ہماری ملاقات کی کیا صورت پیدا کر دی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سنہ ۲۳ء اور اس کے ماقبل و مابعد کے دو سال ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ میں عجیب و غریب سال تھے۔ یہاں سیاسیات سے تو ہمیں بحث نہیں۔ لیکن مذہبی تاریخ کے لحاظ سے یوں سمجھ لیجئے کہ جناب سوامی شردھانندجی مرحوم جو ہندو مسلم اتحاد۔ بلکہ متحدہ ہندوستان کے قائد اور رہبر کی حیثیت میں جیل گئے تھے۔ جیل سے باہر اس شان سے آئے کہ آپ کی ایک ہی آواز نے ہندو مسلمانوں کو دو مخالف کیمپوں میں دو متخالف و متصادم طاقتوں کی طرح بانٹ دیا۔ اور کل کے جنگ آزادی وطن میں باہم متحد ہو کر نبرد آزما ہونے والے ہندو مسلمان آپس میں گتھ گئے۔ ایک طرف شدھی کی پکار تھی اور دوسری طرف تبلیغ کا نعرہ۔ دونوں طرف کے سور بیر اور مجاہد جن کے پاس تیر و تفنگ کی بجائے تیغ زبان اور قلم و بیان کے آلات حرب و ضرب تھے۔ اکبرآباد اور اس کے ماحول میں پوری قوت کے ساتھ آن ڈٹے۔ کم و بیش دو سال تک وہ قیامت خیز اور محشر زا معرکہ رہا کہ الامان والحفیظ۔ مگر اس حرب و ضرب اور جدال و قتال لسانی و اخباری کا فائدہ۔ کیا، کتنا اور کس کو ہوا؟ اس کی تصریح و تفصیل چونکہ ہمارے مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ اس سے قطع نظر تاہم اتنا بھی نہ کہنا سلسلہ کلام کو بے ربط چھوڑ دیتا ہے کہ اس "جنگ مقدس" میں حصہ لینے کے لئے ہم بھی اکبرآباد میں گئے تھے۔ اور اسی سلسلۂ جہاد میں تین ماہ تک ہمارا بھی وہاں قیام رہا تھا۔ قیام آگرہ کے چند روز بعد ہی جناب منشی انعام اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس آگرہ سے ملاقات ہوئی۔ اور انہی مرحوم کے ذریعے حضرت شاہ دلگیر کا پتہ معلوم کر کے جوہری بازار اور میوہ کٹرہ کا پتہ لیتا ہوا شاہ صاحب کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا۔

جوہری بازار آگرہ کا سب سے بڑا بازار ہے۔ تجارت کے لحاظ سے اسے اعلیٰ تجارت کا گھر کہنا چاہیئے۔ اور میوہ کٹرہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ اسی بازار کے اکثر بالاخانے اس مصرف میں آرہے ہیں جسے شہر کی مرکزیت کے لحاظ سے کسی اور جگہ ہونا چاہیئے تھا۔ بہرحال شاہ صاحب کے در دولت پر ایسے ہی راستوں میں سے ہو کر جانا پڑا۔ جب آپ کے احاطے میں داخل ہوا تو وہاں دھوبیوں کے مکانات زیادہ نظر آئے اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد شاہ صاحب کے مردانہ مکان میں پہونچا۔ مردانہ حصہ میں ایک کم عمر صاحبزادے نظر پڑے۔ کہہ نہیں سکتا کون تھے۔ موسم گرمی کا تھا۔ اور وہ صاحبزادے اتنے کم عمر تھے کہ لباس کی گرانباریوں سے بھی قریباً آزاد تھے۔ تاہم انہی کے ذریعہ اپنی حاضری کی اطلاع شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچائی۔

مردان خانہ میں داخل ہوتے ہی ایک سہ دری میں دستی پریس کا ڈھانچ اور دیوار کیساتھ لگے ہوئے چند پتھر دیکھے۔ متذکرۃ الصدر صاحبزادے مسافر کا پیام زنان خانے میں شاہ صاحب کے پاس لے ہی گئے تھے۔ اب مسافر آپ کی تشریف آوری کا انتظار کرنیلگا

نقاد کے مسلسل مطالعہ کے بعد حضرت دلگیر کی تصویر میرے ذہن و خیال نے یہ تیار کی تھی کہ آپ نقاد کے ادبی حسن کی طرح پیکر نازکی و لطافت اور حسن و رعنائی ہوں گے۔ گو یہ خیال تو نہ تھا کہ دلگیر کا حسن "عورت کا حسن" ہوگا۔ ہاں یہ ضرور خیال تھا کہ ایک عاشق مزاج مرد رعنا میں نسائی لطافتوں کا امتزاج یقیناً ہوگا۔ بس یوں سمجھئے کہ جیسے ہمارے ایک مشہور ادیب اور عالم دوست نے بغیر دیکھے اقبال کی شکل کو مرجھائے ہوئے فلسفی کا متخیل خیال کرتی تھے اور اقبال کو تندرست اور صحیح سالم پاکر مایوس ہو گئے تھے کچھ ایسا ہی حال میرا بھی ہوجاتا کیونکہ جو بزرگ میرے سامنے آئے وہ ماشاء اللہ عام آدمیوں سے زیادہ اونچے۔ نوجوانی کی حدود سے آگے۔ تندرستی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے رو بہ فربہی۔ آواز ق کے لحاظ سے باریک۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ یا میلا گورا۔ ہونٹ کسی قدر موٹے۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ راہ چلنے اور بات کرنے میں کندھوں کو خاص طرح سے ہلایا کرتے تھے۔ اسکے باوجود چہرہ مجموعی طور پر تبسم زار کہو یا شادمانی کا نمونہ بات بات پر مسکراتے تھے۔ ہنستے تھے اور شعر پڑھتے تھے۔ جب میں نے حقیقی دلگیر کو جسے "شاداں" کہنا چاہیئے اپنے روبرو پایا تو وہ عشق کا ستایا ہوا دلگیر خیالی روپوش ہو گیا۔ صدمہ کی وجہ کوئی نہ تھی۔ کیونکہ حقیقت کبھی خیالی اصنام کے مطابق نہیں ہوئی اور نہ ذہنی لطافتوں کے ظہور کے لئے ظاہری لطافتیں حتمی شرط اور قید تسلیم کی گئی ہیں۔

بہرحال شاہ صاحب تشریف لائے اور اخلاق مجسم ہو کر بلکہ بقول حضرت ریاضؔ "توبہ کی طرح ٹوٹ کر" ملے۔ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا کہ حضرت اگرچہ جناب سے ملنے کا ولولہ تو نقاد نے پیدا کیا ہے۔ مگر مجھے معنوی طور پر "الرفیق" کے فلاں مضمون کے ذریعہ آپ سے نیاز حاصل ہے۔ یہ کہکر میں نے آپ کے مضمون کا وہی شعر پڑھا جو اوپر عرض کر آیا ہوں۔ یعنی ؎

ہرن کی آنکھ سے بڑھ کر تری چشم غزالی ہے بڑی ہے مدبھری ہے شوخ ہے جادو ہے کالی ہے

گرمی کے دن تھے، شام کا وقت تھا۔ آگرہ کی گرمی خدا کی پناہ۔ دن بھر کی آتش فشانی کا اثر نمایاں طور پر اب تک باقی تھا۔ حضرت شاہ دلگیر کسی قدر آشوب چشم میں بھی مبتلا تھے۔ شعر سنتے ہی مسکرائے۔ آہ بھری اور کہا "اب وہ آنکھیں کہاں ہیں" نہیں معلوم ان کو کونسی آنکھیں یاد آگئیں اور کن آنکھوں نے ان سے یہ فقرہ کہلایا تھا۔ مگر میں نے موقع اور شاہ صاحب کی حالت کی مناسبت کو مدنظر رکھکر کہا "آنکھیں تو وہی ہیں مگر کسی قدر بیمار ہیں۔ یا ان غزالی آنکھوں کے لگائے ہوئے تیر اب تک سینہ میں پیوست ہیں۔ جن کے باعث ان آنکھوں میں خوں نابہ فشانی کا اثر ہے"

سلسلۂ گفتگو میں میں نے دریافت کیا کہ کیا نقاد کا "حسن پریس" یہی ہے جس کا سامان نیچے لی- ۔ دری میں رکھا ہے۔ یہ سُنکر پھر ہنسے اور فرمایا "حسن خیال یہاں بھی موجود ہے۔ نام تو "حسن پریس" ہے۔ اگرچہ وہ دو لکڑیوں کا ڈھانچ ہی کیوں نہ ہو" میں نے عرض کیا "یہ تو فرمایئے یہ نقاد کی اشاعت میں کیا اور کیوں تعویق ہے" ظاہر ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں اجنبی کے سامنے سارے حقائق تو رکھے نہیں جا سکتے۔ مگر پھر بھی میر صاحب نے اتنا کرم فرمایا اور بتایا کہ "نقاد قلت مضامین کے باعث یا سرمایہ کی قلت یا عدم قبولیت کے باعث بند نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ اور بھی موانع ہیں جن کے باعث اس کا سلسلہ اشاعت رُکا ہوا ہے۔ ورنہ یوں تو کاپیاں بھی تیار رکھی ہیں۔ اگر موانع دور ہو جائیں تو نقاد ضرور شائع ہوگا" یہ فرمایا اور جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے اُٹھے اور سامنے کمرے میں جا کر کاپیاں اُٹھا لائے۔ اور مجھے دکھائیں۔ میرا خیال ہے پورے رسالے کی کاپیاں تھیں۔ مضامین یاد نہیں مگر حاشیہ پر پنسل سے لکھے ہوئے اصلاحی الفاظ کے متعلق اتنا خیال ہے کہ وہ خوبصورت نہ تھے۔ اگر ان کاپیوں کی تصحیح شاہ صاحب ہی کی فرمائی ہوئی تھی تو مجھے کہنا ہوگا کہ آپ خوش نویس نہ تھے۔ اگرچہ یہ قیاس موجہ نہیں ہو سکتا۔

نقاد کے دور ثانی کا اہم واقعہ "قمر زمانی" کا "رومانی" واقعہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب نقاد کی اشاعت ملتوی ہو گئی، تو "قمر زمانی" نام کی کسی خاتون نے حضرت دلگیر کو خط لکھا جس میں نقاد کے دوبارہ اجرا پر اصرار اور اسی کے ساتھ وعدہ کیا کہ موصوفہ فرائض ادارت میں آپ کا ہاتھ بٹائیں گی۔ "قمر زمانی" کے مختصر مقالات نقاد میں چھپے اور ان کی تحریروں کے عکس بھی شائع ہوتے۔ حتیٰ کہ بعض "خوش مذاقوں" نے نقاد میں شائع ہونے والے عکس کو بھی "قمر زمانی" ہی کا عکس جمال خیال کیا تھا۔ اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئی تھیں۔ ایڈیٹر نقاد کی طرف سے ان ہی دنوں نقاد میں اس قسم کا ایک نوٹ شائع ہوا تھا کہ چونکہ اب نقاد کی اعانت میں ایک نسوانی ہاتھ بھی شامل ہے اس لئے امید ہے کہ اب اسے ناکام نہ ہونے دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو سب کچھ ہوا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد نقاد ایسا خاموش ہوا کہ اب اس کی یاد کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔

بے فکرے لوگوں میں مدتوں بحثیں رہیں کہ "قمر زمانی" آخر کون خاتون ہیں۔ جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ قمر زمانی کے پردے میں کوئی "قمر زماں" اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل دکھلا رہے تھے۔ چونکہ اس واقعہ کے ساتھ بہت سی دردمندیاں وابستہ تھیں اور کسی حد تک مجھے اس کا افواہی علم بھی تھا۔ اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ پہلی ملاقات یا بعد کی ملاقاتوں میں اس قمر زمانی کی داستان کے متعلق آپ سے کچھ دریافت کرتا۔

یہ تو تھا پہلی ملاقات کا حال۔ مگر اس کے بعد جب تک اکبر آباد میں میرا قیام رہا حضرت دلگیر سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آپ ہمیشہ محبت و خلوص سے ملتے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا بات بات پر شعر پڑھتے اور سر دُھنتے تھے۔ آپ کا تخلص اگرچہ "دلگیر" تھا مگر آپ کے حالات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی دلگیری تخلص کی حد تک ہی محدود تھی جیسا کہ ریاض کی رندی ان کی شاعری تک ہی محدود ہے۔ ورنہ لفظ دلگیر کا کوئی اثر ان کی زندگی پر نہ تھا۔ جیسا کہ حسرت موہانی کی زندگی ہر اعتبار سے ان کے تخلص کی آئینہ دار ہے۔

حضرت دلگیر جس وقت اپنے بے تکلف دوستوں کے مجمع میں ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ مرعوب سے نظر آیا کرتے تھے۔ چنانچہ میرے آگرہ کے سفر اول ہی کا واقعہ ہے کہ جب حضرت دلگیر ہی نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ مولانا نیاز بھوپال سے تشریف لائے ہیں اور کشمیر جا رہے ہیں، کیا آپ ان سے ملنے کے لئے چلیں گے۔ بھلا جب نیاز سے ملاقات کا سوال تھا تو اس میں استصواب کی ضرورت نہ تھی کیونکہ خود

میرے دل میں موصوف سے ملنے کی آرزو تھی۔ چنانچہ مغرب کے قریب حضرت دلگیر اور میں جناب شیخ لطیف الدین احمد صاحب معروف بہ لطیف کے مکان پر پہونچے کہ مولانا نیاز کا قیام وہیں تھا۔ جب ہم پہونچے ہیں تو صاحب مکان اور حضرت نیاز کے علاوہ بیدل مرحوم شاہجہانپوری حضرت مخمور اکبرآبادی اور جناب امام اکبرآبادی اور دو ایک اور حضرات تشریف فرما تھے۔ تعارف ہوا باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب احباب گفتگو فرما رہے تھے۔ لیکن دلگیر اس مجمع میں اگر دلگیر و دلگرفتہ نہ تھے تو ویسے بشاش بھی نہ تھے۔ جیسے میں نے ان کو ہمیشہ پایا تھا۔ بلکہ کسی قدر رُکے رُکے اور دبے ہوئے سے بیٹھے تھے۔ بیدل مرحوم سے ان کے مُرتبہ دیوان غالب کے متعلق اور حضرت مولانا نیاز سے انکی تاریخ تمدن اسلام کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ جس کے متعلق سُنا تھا کہ آپ بزمانۂ قیامِ بھوپال تالیف فرما رہے تھے۔

اسی مجمع میں کسی عنوان تاج اور اسکے متعلق ادبی معلومات کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ یوم تکمیل تاج سے لیکر آج تک جسقدر زائروں نے اس روضۂ "حسن ووفا" کی زیارت کی ہے اور اسکے دیکھتے ہی ہر ایک دیکھنے والے کے دل میں جو کیفیات وجذبات پیدا ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی طرح صفحۂ کاغذ پر آجائیں تو وہ مجموعہ کتنا لطیف وحسین اور نادر وبے مثال ادبی شاہکار ہوگا۔

نقادہی کے زمانہ سے نیاز۔ دلگیر۔ لطیف۔ مخمور۔ خلیفی۔ اور مانی وغیرہ وغیرہ حضرات ادبا کا ایک حلقہ بن گیا تھا۔ یہ لوگ "یاران نجدہ" کہلایا کرتے تھے۔ نگار کے ابتدائی دور میں مدتوں تک "یاران نجدہ" کے عنوان یا نام سے ادبی چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ ایک بار ان ہی یاران نجد کا فوٹو بھی نگار میں شائع ہوا تھا۔ اس مرقع میں حضرت دلگیر کی تصویر بلحاظ ڈاڑھی کے مجھے ایسی نظر آتی تھی جیسی مولانا نیاز کی تصویر آج کل پرچوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ مگر جب ۱۹۲۳ء میں مَیں نے دلگیر کو دیکھا ہے تو خشخاشی ڈاڑھی چہرے کو زیب دے رہی تھی اور مولانا نیاز کا رعب دار چہرہ گھنی مگر موزوں ڈاڑھی کے ساتھ بہت شاندار نظر آرہا تھا۔

کہہ نہیں سکتا کہ میرے پہلے سفر اکبرآباد کا واقعہ ہے یا دوسرے کا جو ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک بار بڑے پیمانہ پر ایک مشاعرہ حضرت دلگیر کے دولتکدہ پر منعقد ہوا۔ تقریب مشاعرہ کیا تھی۔ مجھے معلوم نہیں۔ مگر مشاعرہ کا اہتمام خود حضرت دلگیر ہی فرما رہے تھے۔ میر صاحب کا مردانہ حصۂ مکان بہت وسیع ہے۔ اسی میں مجلس مشاعرہ منعقد ہونے والی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سارا آگرہ ٹوٹ پڑا تھا۔ چونکہ اس مشاعرے میں شمولیت کی دعوت حضرت شاہ صاحب نے مجھے بھی دی تھی اس لئے مَیں بھی تماشائی کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا۔ کہ دیکھوں وطن الشعرا یعنی میر وغالب کے وطن اکبرآباد میں اب مشاعروں اور خود شاعری کا کیا رنگ ہے۔

اگرچہ دلگیر شعرا کرام اور دیگر سامعین کی آؤبھگت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی بہ محبت میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے ہر چند چاہا کہ مجلس میں ایک طرف بیٹھ رہوں۔ لیکن حضرت نے نہ مانا اور جناب صدر جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا ہے کے قریب لیجا کر بٹھا دیا۔ بڑے انتظار کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ اور حسب معمول پہلے مبتدیوں اور نومشقوں کا کلام شروع ہوا۔ ابھی وہ دور جاری ہی تھا کہ مشاعرے میں ایک خاص قسم کی بے ترتیبی اور زبانی لسانی تیر ونشتر کی جنگ اور داد دینے کے بے ڈھب ٹھاٹھ دیکھکر میرا دل مکدر ہوگیا اور میں موقع پاتے ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔

وہ مشاعرہ کیا تھا۔ اچھا خاصا شاعروں کی گنگا جمنی پارٹیوں کا دنگل تھا۔ حضرت دلگیر جو صاحب خانہ تھے۔ بچارے بے بس اور حیران ہوکر ایک طرف بیٹھے تھے۔ اور جناب صدر مٹی کے بُت کی طرح خاموش اور ادب وقاعدہ مجسم۔ مگر مجمع ان کے اقتدار واثرسے

قطعاً رہے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ شعر کی داد نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ خاص خاص پارٹیاں۔ خاص خاص اشخاص یا اپنے اپنے ارکان کو داد دیتی اور دوسری پارٹی کے شعرا پر عجیب و غریب، ستم ظریفانہ انداز میں بے داد کر رہی تھیں۔

یہ نظارہ ابھی پیش نظر ہی تھا کہ لشنے میں روز روشن میں "شمع کا فوری"! ایک بڑی بڑی مونچھوں والے، ترکی ٹوپی پوش۔ نوجوان کے سامنے آئی یعنی وہ صدر کے سامنے دو زانو بیٹھکر غزل پڑھنے لگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کون شخص تھا مگر میرے پاس بیٹھنے والے لوگ باہم اس غریب کے نام و نسب میں قیل و قال کر رہے تھے۔ اس غریب پر وہ فقرہ بازی ہوئی کہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید آپے سے باہر ہو جاتا۔ مگر آفریں ہے ان کے ضبط پر کہ اُس نے کاغذ پر سے نگاہ نہ اُٹھانا تھی نہ اُٹھائی۔ پوری کی پوری غزل پڑھکر ہی اپنی جگہ سے اُٹھا۔

یہ منظر ایسا تھا کہ مجھے اچھا نہ لگا۔ اس لئے میں واپس آگیا۔ ہاں مجھے اس کا افسوس تھا کہ اکثر اہل مجلس آداب مجلس سے کیوں بیگانہ ہو کر دوسروں کو وا فدار ثابت کرنے کے لئے خود دماغ مجسم بنا کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی افسوس تھا کہ اس ہڑبونگ کی وجہ سے اچھے شاعروں کے کلام سے بھی مستفیض نہ ہو سکا۔ بہرحال جب مشاعرے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ بھی عوام کی ان حرکات کے باعث اس مشاعرے سے خوش نہ تھے۔

اس مشاعرہ کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا بھی غیر متعلق نہ ہوگا کہ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جشن منایا گیا تھا۔ اس جشن کو کامیاب بنانے کے لئے علاوہ دیگر تقریبات کے ایک مشاعرہ بھی تجویز کیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں افواہ سُنا تھا کہ اس مشاعرے کی صدارت پہلے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ مگر جب آپ نے انکار کر دیا تو مولانا شیخ غلام قادر گرامی (مرحوم) کا نام تجویز ہوا۔ جب آپ نے بھی معذرت کر دی تو قرعۂ فال سر علی امام مرحوم کے نام پڑا۔ آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں اپنے صدر مشاعرہ تجویز کئے جانے پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا: "میں تو شاعر نہیں ہوں"۔ پھر مسکراتے ہوئے بذلہ سنجانہ انداز میں یہ بھی فرمایا کہ "مجھے شاید اس لئے صدر انتخاب کیا گیا ہے کہ میرے ابا شمس العلماء مولانا سید امداد امام اثر شاعر ہیں"۔ لطیفہ تھا۔ پسند کیا جاتا۔ مگر وہاں بھی علیگڈھ کے پُرانے کھنڈرے اور گھاگ جمع تھے۔ جن میں سے بعض بزرگی سن و سال کے باوجود علیگڈھ میں آتے ہی وہی پُرانے بچھیرے بن گئے تھے۔ مشاعرہ کے شروع ہوتے ہی بعض بے فکروں نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ مرحوم علی امام پریشان ہو گئے۔ مشاعرہ ختم کر دینے کی دھمکی دی۔ سب کچھ ہوا۔ مگر کچھ نہ بنا۔ آخر پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب کو اپنا قائم مقام بنا کر اور خود ناسازیٔ طبع کا عذر بادل ناخواستہ کر کے مشاعرہ سے تشریف لے گئے۔ قاضی صاحب وہیں کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی رسم و راہ سے خوب آگاہ تھے۔ سب قسم کے کڑوے کسیلے فقرے سنتے اور مسکراتے رہے۔ اور مشاعرہ ہوتا رہا۔

اسی مشاعرے کا بقیہ حصہ بجائے پنڈال کے وہیں کے کسی ہال میں ہوا تھا۔ جس کی صدارت مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے فرمائی تھی۔ اسی جگہ بعض شاعروں کو بعض شرکائے مشاعرہ کی فقرہ بازیوں کی وجہ سے روتے اور بعض کو کوستے دیکھا اور سُنا تھا۔ اسی جگہ جناب اصغر گونڈوی کی غزل۔ ایک نوجوان شاعر بیخود اٹاوی نے جو یونیورسٹی ہی کے طالب علم تھے، پڑھی تھی۔ یہی غزل الہامی قرار پائی تھی۔ یہاں بھی فقرہ بازی کا وہ انداز تھا۔ جو مشرقی درس گاہوں کی روایات کے شایاں نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے مشاعروں میں جیسی غزلیں پڑھی جاتی ہیں اور ان غزلوں میں جن مضامین بلند اور خیالات پاکیزہ کا اظہار ہوتا ہے وہ سبکو معلوم ہے۔

اگر شاعروں کے اصنام خیالی مجسم ہو کر اس بزم میں آجاتے۔ یا حضرت صدران فقرہ بازیوں کو پورے طور پر سُن لیتے تو ہمیں یقین ہے کہ آپ مشاعرے سے اسی طرح اُٹھ کر چلے جاتے جس طرح آپ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سے بمبئی کی ایک مسلم مشہور خاتون کو بے حجاب اسٹیج پر آکر لیکچر فرماتے دیکھ اور سُن کر پنڈال سے باہر چلے گئے تھے۔ یا اس مشاعرہ کی ابتری دیکھ کر مشاعرہ کے پہلے اجلاس سے سید علی امام کرسی صدارت چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے۔

شاہ صاحب اس دوسرے مشاعرے میں میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مشاعرہ ختم ہو گیا یا کر دیا گیا۔ مقام مشاعرے سے ہم دونوں ایک ساتھ باہر آئے۔ مشاعرے کی اس بے نظمی سے شاہ صاحب بہت ناراض تھے اور فرماتے تھے کہ شعراء کو بُلا کر ذلیل کیا گیا۔ اور لڑکوں کو قابو میں نہیں رکھا گیا۔ اگرچہ اس ساری افراتفری کے ذمہ دار غریب لڑکے ہی نہ تھے۔ کچھ اور لوگ بھی ان شورشوں میں برابر کے شریک تھے۔ مگر میں نے کہا "قبلہ بچے بچے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ گرو کل کے ہوں یا دیوبند کے۔ کیمبرج کے ہوں یا علیگڈھ کے۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ الصبی صبیٌ ولو کان نبیٌ"۔

اچھا شعر سنکر شاہ صاحب کا داد دینے کا طریقہ۔ جہاں تک مروجہ داد دینے کے طریقوں کا تعلق ہے۔ سب سے جُدا تھا۔ یعنی اچھا شعر سُنکر یا پڑھکر لفظ "معاذ اللہ" اس شان سے اُنکی زبان پر آتا تھا کہ ناواقف شخص اگر مغالطہ میں پڑ جاتا تو معذور تصور کیا جا سکتا تھا۔ مگر آپکے اس "معاذ اللہ" کے معنی وہی ہوتے تھے جو عام طور پر اچھے شعر پر "سبحان اللہ" کے ہوتے ہیں۔

میں شاعر نہیں ہوں۔ ابتدا میں شعر گوئی کا شوق تھا۔ مگر جب بصیرت حاصل ہوئی تو اپنی شاعری کو اصلی شاعری سے بہت فروتر پایا۔ اس لئے عزم کر لیا کہ آئندہ شعر گوئی کی غلطی کبھی نہ کروں گا۔ تاہم شدھی اور تبلیغ کی جنگ کے دنوں میں ایک غزل کہی تھی جو "آگرہ اخبار" میں شائع ہو گئی تھی۔ ساری غزل یاد نہیں دو شعر یاد ہیں۔ آپ بھی سُن لیجئے ؎

کہتا ہوں برہمن سے میں بندہ نواز دیکھئے　　اپنے بتوں کو دیکھئے میرے خدا کو دیکھئے
دار پہ کوئی چڑھ گیا کھال کسی کی کھچ گئی　　جرم وفا کو دیکھئے اس کی سزا کو دیکھئے

اس غزل کے شائع ہونے کے بعد جب حضرت دلگیر سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اسے بہت پسند فرمایا اور تعریف کی لیکن میں نہ اس وقت اپنی شاعری کا قائل تھا نہ اب ہوں۔ یہ واقعہ صرف اس لئے عرض کر دیا کہ حضرت دلگیر سے اس کا کسی قدر تعلق ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ شاہ صاحب اپنے احباب سے خلوص سے ملتے تھے۔ میں اُن کا ہم وطن نہ تھا۔ لیکن جب اور جہاں ملاقات ہوتی۔ بہت ہی محبت و خلوص سے ملتے۔ ایک بار شاہ ابوالعلاءؒ کے سالانہ عرس کا موقع تھا۔ دوستوں کا تقاضا ہوا کہ میں بھی چلوں؟ میر صاحب خود سجادہ نشیں تھے۔ بھلا اس سجادہ نشینوں کے مجمع میں آپ کیسے موجود نہ ہوتے۔ مگر جب خاکسار کو دیکھا اسی انداز محبت و خلوص سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو اُن کا ہمیشہ سے طریقہ تھا۔

حضرت دلگیر صاحب سجادہ تھے۔ آنریری مجسٹریٹ تھے۔ رئیس اور جاگیردار تھے۔ مزید برآں ایک مشہور ادبی رسالہ کے ایڈیٹر بھی تھے۔ مگر یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ محض ان کی بنا پر کسی شخص کی علمی دستگاہ کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ مجھ سے مرحوم کی خط و کتابت نہیں تھی۔ کہ اس کی بنا پر کچھ عرض کروں۔ ہماری باہمی ملاقاتوں میں علمی تذکرہ کبھی کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ نہ مذہبی۔ نہ فلسفی۔ نہ تاریخی۔ بعض ادبی تذکرے اور شاعرانہ داد و ایراد کے تفقیے ہمارا موضوع گفتگو رہا کرتا تھا۔ ہاں آپ کی گفتگو اشعار سے پُر ہوتی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ کو

کثرت سے اچھے اچھے اشعار یاد تھے۔ آپ کی شاعری کے نمونے بھی زیادہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ جو چند غزلیں دیکھی ہیں۔ ان میں سادہ اور معمولی باتیں سادہ و سادہ زبان میں کہی گئی ہیں۔ خیال کی بلندی اور بیان کی ندرت جس سے شعر تعبیر ہے کم از کم میں نے آپ کے اشعار میں کم پایا ہے۔ رہی زبان کی صفائی تو کون ہے جو دلگیر کی زبان کی صحت میں شک کریگا۔

آپ کے خطوط جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں حسن و عشق، حسن نظر اور شاعری کے متعلق مزے لے لیکر لکھے گئے ہیں۔ آپ کی کوئی تصنیف، جہاں تک مجھے علم ہے موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسالہ نقّاد میں بھی آپ کا کوئی مستقل اور خاص مضمون نہیں ہے۔ اگر نقّاد کے تمام فائلوں کا مطالعہ کیا جائے تو قمر زمانی کے جوابی مضامین کے علاوہ صرف شذرات ہیں اور بس۔ اگر نقّاد کے تمام مجلدات کے شذرات کو جمع کیا جائے تو کم و بیش انکی مجموعی تعداد نقّاد کے نمبروں کی تعداد سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان شذرات میں بھی گہرے خیالات اور علمی نکات و بصائر اور بلند نظریات مفقود ہیں۔ جو کچھ ہے وہ یا تو وقتی باتیں ہیں۔ یا شاعرانہ بذلہ سنجیاں، حسن بیان کی دلکشیاں اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان شذرات کا مطالعہ دلگیر کے فن انشا کی داد پر مجبور کر دیگا۔

سوال یہ ہے کہ دلگیر اتنے کوتاہ قلم کیوں تھے؟ اس کا باعث یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لکھ نہیں سکتے تھے۔ بلکہ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لکھتے کم تھے اور کم لکھنا کوئی عیب نہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں کم لکھنا زیادہ لکھنے سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اور حکیم کا ایک لفظ سفینہ کے لکچروں پر بھاری ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی کسی تصنیف کا کوئی مسودہ موجود ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن ان کے مکاتیب ادبی اور شعری حیثیت سے یقیناً دلچسپ ہوں گے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اگر ان کے صاحبزادے اور جانشین ان مکاتیب کو مرتب کر کے شائع کر دیں تو یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ اگر نقّاد کے خاص خاص مضامین اور اس میں سے حضرت دلگیر کے شذرات کو مرتب کر دیا جائے تو یہ کام بھی اہل ذوق کے شکریہ کا موجب ہوگا۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف چند شخصی تاثرات ہیں۔ مرحوم شاہ دلگیر کے سوانح حیات کا کوئی خاص پہلو اس مقالہ میں نمایاں نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ راقم الحروف اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس میں اگر کسی بات کے بیان کرنے میں غلطی ہو گئی ہو، تو سمجھ کی غلطی ہوگی۔ نیت کی برائی کو اس میں دخل نہیں۔ کیونکہ خاکسار خوبیوں کا افسانہ گو ہے۔ عیوب شماری کا گنہگار نہیں۔ خاکسار کے نزدیک محاسن دوسروں کے اور اپنی ذات کے عیوب دیکھنے والی نگاہ مبارک نگاہ ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دلگیر دوست تھے۔ اور دوست نواز بھی۔ شریف تھے اور شرافت کا خیال رکھتے تھے۔ میرے نزدیک ان کی سچی تعریف وہی ہے جو جناب مولوی شاہد احمد صاحب نے میرے نام کے خط میں لکھی کہ "ان کے مرنے سے اُردو کا سچا عاشق اُٹھ گیا۔" میں کہتا ہوں کہ ان کے مرنے سے نقّاد ایسے جمیل پرچے کا خلاق اُٹھ گیا جس کی یاد بھی ادب لطیف کا خواب دکھاتی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور حضرت کے فرزندوں کو فخر خاندان بنائے اور اس صدمۂ جانکاہ میں صبر جمیل عطا فرمائے۔

مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

حُسنِ خیال

جبر پر اختیار کون کرے　　موت کا انتظار کون کرے

نہیں آتی ہوائے دامنِ یار　　گل چراغِ مزار کون کرے

بتکدے میں ہو بت حرم میں خدا　　آپ کا اعتبار کون کرے

چشمِ پروانہ ہو چکی ہے بند　　سیرِ رقصِ شرار کون کرے

پاؤں ساقی کے لڑکھڑانے لگے　　سر کو وقفِ خمار کون کرے

عمر کٹ جائے گی کبھی نہ کبھی　　منتِ تیغِ یار کون کرے

اپنی ضد کے ہیں برق و باد و ابر　　پاسِ مشتِ غبار کون کرے

گل کھلائے گی اور قیدِ قفس　　الجائے بہار کون کرے

آبلہ پائیِ جنوں کب تک　　منتِ نوکِ خار کون کرے

جانستاں تم بھی ہو اجل بھی ہو　　دیکھیں اب پہلے وار کون کرے

کیا تعلق تھا قیس و لیلےٰ میں　　راز یہ آشکار کون کرے

بدگمانی کا اُن کی ڈر ہے تپش
شکوۂ روزگار کون کرے

تپش [illegible]

کسانتیپ

دُنیا میں اکثر ایسی خوش قسمت ہستیاں بھی گذری ہیں کہ جن کے ذاتی کارنامے گو ایسے نہیں ہیں کہ انہیں اپنی نوع کی دیگر ہستیوں پر ممتاز کر سکیں۔ لیکن فطرت نے اُن کو اپنے عہد کی ایسی شہرہ آفاق ہستیوں سے وابستہ کر دیا تھا کہ اُن کے طفیل اُن کا نام آج تک زندہ ہے اور تاابد زندہ رہیگا۔ وہ اپنی انفرادی حیثیت سے ایک معمولی ہستی ہوتی ہیں۔ مگر جس طرح ایک درخشندہ ستارہ کی موجودگی میں بساطِ آسمان کے دیگر ستارے بھی روشن معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ دُنیا میں نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسی ہی نامور ہستیوں میں ازمنۂ قدیم کے شُہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید فلاسفر سقراط کی بیوی کسانتیپ بھی ایک خاص حیثیت کی مالک ہے وہ ایتھنز کے ایک متموّل کسان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ فطرت نے اُسے دولت حُسن وجمال سے مالامال کرنے میں نہایت فیاضی سے کام لیا تھا۔ گو جملہ مورخین اور شُعرا نے اُسے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت نیک دل، خوش خلق، وفا شعار اور منکسر المزاج تھی۔ اُسے اپنے عصر کی عام مہ جبینوں کی طرح بھڑکیلے اور قیمتی لباس سے رغبت نہ تھی۔ لیکن اس کی سادگی کے باوجود اس کے ملائک فریب حُسن کی کشش اور جاذبیت نے ایتھنز کے رؤسا و امرا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مگر اُس نے اُن کی دولت و تموّل کو نظرِ حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور کسی کی طرف بھی التفات کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔

اس زمانے میں پرکلیز کی معشوقہ اسپاسیا ایتھنز کی محفلوں اور مجلسوں میں مایۂ صد جذب وکشش بنی ہوئی تھی۔ اُس کے غیر معمولی حُسن وجمال کی وجہ سے اس کے مکان پر اس کے دلدادوں اور پرستاروں کا خوب جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ سقراط بھی اکثر اس کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اور اگرچہ اس کا پیشہ سنگ تراشی تھا لیکن اُس نے اپنی خداداد ذہانت اور ذاتی کوشش و محنت سے علم وفلسفہ میں وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ آج تک اُس کا نام علمی دُنیا میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ اور اُس کے نامور معاصر بھی اُس کی دقیق فلسفیانہ بحثیں اور موشگافیاں سُنکر دنگ رہ جاتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ اسپاسیا کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو گیا تھا اور اس سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ لیکن اس کی مالی حالت بہت ہی خراب تھی اور اسی وجہ سے اسپاسیا نے اُس کی خواہش پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر اسپاسیا ہی کی تحریک اور اسی کے توسط سے سقراط کی کسانتیپ سے شادی ہو گئی۔

سقراط بہت ہی نادار اور مفلوک الحال تھا۔ اس کا مکان شکستہ اور بوسیدہ تھا۔ اور اس کے پاس فرنیچر اور سامان تزئین و تحسین کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ کھانے پینے کے برتن بھی نہ تھے۔ اور کسانتیپ ایک دولتمند کی لاڈلی بیٹی تھی جس نے ناز ونعم میں پرورش پائی تھی۔ اور جو ایک عالیشان محل میں کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے جب وہ سقراط کے مکان میں جاکر اُتری تو بہت پریشان ہوئی۔ اور گو اُسے اپنے شوہر کی بے سروسامانی سے تکلیف تو ضرور ہوئی اور یہ ایک طبعی چیز تھی۔ لیکن اس عالی حوصلہ خاتون نے اپنے قول وفعل سے اپنی اس اذیت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ اُس نے کچھ سامان تو اپنے باپ کے گھر سے منگا لیا اور کچھ اپنے مال سے خرید لیا۔ اور جب وہ سامان آرائش کو سلیقہ اور قرینے سے ترتیب دے چکی تو سقراط نے اُسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

کسانتیپ۔ (مسکراتے ہوئے) "کیا آپ اس سامان سے مسرور نہیں ہیں؟"

سقراط: بالکل نہیں۔ بلکہ میں انہیں سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

سقراط صاف گو اور حق پسند تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی بیوی سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ شب عروسی کو ہی اُس کی کسانتیب سے لڑائی ہوگئی تھی۔ اور اس کے بعد ہر رات کو سوتے وقت اس سے لڑا کرتا تھا لیکن اس بدرجہ غایت اطاعت شعار اور خوش خلق خاتون نے اپنے عزیز شوہر کو کبھی نشانہ طعن وتشنیع نہ بنایا۔ بلکہ وہ اُس کی کرخت مزاجی اور لاپرواہی کو حوصلہ اور صبر سے برداشت کرتی رہی۔ اس نے اپنے نفس کو اپنے جان ودل کے مالک پر قربان کر دینے میں دریغ نہ کیا۔ اور اُسے گرسنگی کے آہنی پنجوں سے چھڑانے کے لئے اپنا مال ومتاع اور ثروت وجاہ سب کچھ فنا کر دیا۔

اپنے مشہور معاصر پرکلیز کی وفات کے بعد سقراط نے سنگ تراشی کا کام بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کی بسر اوقات کسانتیب کے مال وزر پر ہوتی تھی۔ جب کبھی کوئی شخص اس سے دریافت کرتا کہ اُس نے اپنا کام کیوں ترک کر دیا ہے تو وہ فوراً جواب دیتا کہ "انسان کو صرف بحالت مجبوری کام کرنا چاہیئے۔ آج کل کسانتیب کی دولت پر بڑے آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے تو پھر محنت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟" اور جب کبھی کسانتیب اپنے شوہر سے ازراہِ نصیحت کہتی کہ "شریف انسان کو اپنے زور بازو سے روزی کمانی چاہیئے اور کسی حالت میں بھی محنت ومشقت کو باعث ننگ وعار نہیں جاننا چاہیئے۔ کیونکہ معبودوں اور مجذوبوں کے علاوہ اور کوئی بھی عمل سے آزاد نہیں ہے۔" تو اس کے جواب میں سقراط جھلا کر کہتا کہ "آج کل جنگ وجدل کے سبب ملک کی اقتصادی حالت نہایت ابتر ہے اور ایک شریف سنگتراش کے لئے کوئی راہِ عمل کھلی ہوئی نہیں ہے۔"

سقراط ایک نہایت بے پرواہ اور سخت مزاج شوہر تھا۔ وہ اکثر رات کا وقت اسپاسیا کی محفلوں اور مجلسوں میں گذارا کرتا تھا۔ جہاں ایتھنز کے نامور فلاسفر اور شہرہ آفاق مہ جبینیں شامل ہوا کرتی تھیں اور مرد وعورت نہایت آزادی وبے باکی کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے۔ کسانتیب بھی ان باتوں سے باخبر تھی لیکن وہ نیک دل خاتون ان سب کو نہایت خاموشی سے برداشت کیا کرتی تھی اور جب اُس کا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہوگیا تو اس نے ایک دن جب اسے ان محفلوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تو سقراط نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ "شریف عورت وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنے شوہر پر قربان کر دے۔" یہ سُنکر کسانتیب سے خاموش نہ رہا گیا اور اُس نے کہا "جبھی تو اسپاسیا اپنے نفس کو ہر شخص پر قربان کر دیتی ہے۔"

سقراط چار سو برس قبل از مسیح یونان کے مشہور شہر ایتھنز میں پیدا ہوا تھا۔ گو وہ سنگ تراشی کا کام کیا کرتا تھا لیکن فطرت نے اُسے علم وفلسفہ میں کمال حاصل کرنیکے لئے پیدا کیا تھا۔ اُس نے اپنی خداداد ذہانت اور کوشش سے وہ ترقی کی کہ جملہ مورخین نے اُسے ایک مسلّم الثبوت فلاسفر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ہر لحہ علمی بحثوں میں گذارنا پسند کرتا تھا۔ اسی کے متعلق ایک یہ روایت مشہور ہے کہ جب اُس کی شادی ہوئی اور وہ دُلہن کو اپنے گھر لے جانے لگا تو راستہ میں اُس نے اپنے احباب سے علمی بحث شروع کر دی اور اسی مصروفیت میں برات سے پیچھے رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ جب خداوند عزوجل نے کسانتیب کو ایک ننھی سی جان کی ماں بنایا تو اُس وقت سقراط مکان کے بالائی منزل پر علمی تجربہ کر رہا تھا۔ اور جب اُسے یہ خوشخبری سُنائی گئی تو بھی اُس نے اپنے کام کو ادھورا چھوڑنا پسند نہ کیا۔ وہ سوال وجواب کے ذریعے تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور اس طریقۂ تعلیم کا اسی کو موجد مانا جاتا ہے۔ اس کی

تعلیم کا بُنیادی اور اساسی مسئلہ معرفت ہے جسے وہ حُسن کے صحیح ادراک سے وابستہ مانتا تھا۔ حکّامِ وقت نے اُس کی تعلیم اپنے مذہبی عقائد کے خلاف جان کر اُس کی بیخ کنی کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے اُس کے خلاف کفر و الحاد کا فتوےٰ صادر کر دیا۔ اور اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ یونان کے دیوتاؤں اور معبودوں کی تحقیر کرتا ہے۔ اور قدیم مذہب میں جدید خیالات کا اضافہ کر کے اسکی توہین کر رہا ہے۔ اسی الزام کی بنا پر ۳۹۹ برس قبل مسیح اُسے گرفتار کر کے زنداں میں مقیّد کر دیا۔ اور آخر اُسے اُس کے اپنے پسندیدہ طریقے سے یعنی زہرِ ہلاہل کا پیالہ پلا کر موت سے ہم آغوش کر دیا۔

یہ ایک طبعی چیز تھی کہ کسانتیب کو اپنے سرتاج کے قید ہو جانے کا رنج ہو۔ لیکن رنج کی حالت میں بھی اُس نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور اُسے آزاد کرا لینے کی تدبیر سوچنے لگی۔ اُس نے اپنا طلائی و نقرئی زیور فروخت کر کے محافظینِ جیل کو ایک گرانبہا رقم بطور رشوت دی۔ اور ہر ممکن طریقے سے اس کی رہائی کی کوشش کی۔ اس دوران میں وہ سقراط سے ملاقات کرنے نہیں گئی۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اس سے سقراط کو تکلیف ہوگی۔ اور وہ اپنے رنج و غم سے اس کے صفا پرور اوقات مراقبہ و تدبّر کو مکدّر کر دے گی۔ وہ سقراط کی رہائی کے جُملہ انتظامات مکمل کر چکی تھی کہ سقراط کے ایک شاگرد نے یہ کہہ کر اس کا دل توڑ دیا کہ سقراط رہا ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اس سے اس پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ سخت بے قراری کی حالت میں سقراط کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اس کے پیروں میں سر رکھ کر نہایت عاجزی و انکساری سے کہا "میرے سرتاج! اگر تم اپنے نفس پر رحم نہیں کرتے ہو تو میری طرف دیکھو۔ اپنے اکلوتے بچے پر رحم کرو۔ اُس کی زندگی تباہ نہ کرو۔ تم نے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا ہے۔ آج اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ انصاف کرو۔ اور میری کوششوں پر پانی پھیر کر مجھے یاس و الم کے عمیق غار میں نہ دھکیلو"

سقراط نے اس رقت انگیز فریاد کو کمال بے توجہی سے سُنا اور سرد مہری سے جواب دیا "اے کسانتیب! میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے اور میری خوشگوار آرزوؤں کے درمیان حائل نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ تو نے کہا وہ تیری خلوص نیت پر مبنی ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ کوئی بات میرے ارادے کو بدل نہیں سکتی ہے۔ میرے مرنے کے بعد میرے شاگرد تجھے میری اس ہٹ کی وجہ بتا دیں گے۔ اب تو یہاں سے چلی جا اور مجھے اپنی زندگی کی چند بقیہ گھڑیاں اپنے احباب سے "قانون عام" کی اہمیت پر گفتگو کرنے میں گذارنے دے"

جس دن سقراط نے زہر کا پیالہ پی کر دُنیا سے کوچ کیا، کسانتیب آخری مرتبہ ملنے کے لئے اس کے پاس آئی۔ سقراط کے معزز معاصر افلاطون سے اس ملاقات کی مفصّل کیفیت لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انتہائی رنج و غم نے کسانتیب کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے آخری مرتبہ پھر سقراط سے عاجزانہ استدعا کی کہ "وہ اس کی اور اپنے بچے کی زندگیاں تباہ نہ کرے اور اپنے ارادے کو بدل کر آزادی حاصل کر لے" سقراط نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے ایک شاگرد سے کہا کہ "اس عورت کو میرے سامنے سے ہٹا دو" (ترجمہ)

سیّد محمود مورخ۔ بی۔ اے

تجلّیات

شعلۂ عشق لازمِ دل ہے
شمع سے آبروئے محفل ہے

حیرت افزا تجلیِ دل ہے
جس طرف دیکھتا ہوں منزل ہے

پھر رہا ہے کوئی نگاہوں میں
جوشِ پر حُسن کاریٔ دل ہے

ہے غنیمت جو آرزو رہ جائے
زندگی کا یہی تو حاصل ہے

بحرِ اُلفت میں لے دلِ ناکام
ڈوب جاؤں جہاں وہ ساحل ہے

گاہ ناپید، گاہ پیشِ نظر
برق ہے یا سوادِ منزل ہے

رہ گیا تھا یہی طریقِ ستم
دل نوازی پر اب وہ مائل ہے

کچھ شکایت نہیں مجھے واللہ
آپ کا غم ہے آپ کا دل ہے

کیوں اُٹھائیں وہ زحمتِ پرسش
حال اب دیکھنے کے قابل ہے

رنج سہتا ہوں اور جیتا ہوں
جان دینا بھی کوئی مشکل ہے

پھر کوئی یاد آگیا، کوکب
پھر وہی بے قراریٔ دل ہے

کوکب (شاہجہانپوری)

موت

چپکے چپکے آنکھ جھپکاتی ہوئی آتی ہے تو   اور اشاروں میں فنا کا راز سمجھاتی ہے تو
کون ہے؟ کس دیس میں روحوں کو لیجاتی ہے تو

کیا ہے یہ غارتگری تیری انوکھی ریت میں   دائمی نیندوں کا رس کیسا ہے ترے گیت میں؟
زندگی کی ہار پوشیدہ ہے تیری جیت میں

اشک اور آہیں عناصر ہیں یہ تیرے نام کے   سوگ اور ماتم یہ عنواں ہیں ترے اکرام کے
خوب دیکھے ہیں نظارے، تیرے فیضِ عام کے

زندگی کی شورشوں کو نیند سے آئی ہوئی   یا تری تصویر آنکھوں میں ہے لہرائی ہوئی؟
کیوں مرے جذبات پر ہے مُردنی چھائی ہوئی

ہے کہاں کشتی تری، کس سمت جانا ہے ہمیں؟   ساحلِ ہستی سے کب لنگر اُٹھانا ہے ہمیں؟
آنکھ میں کس دیس کا نقشہ جمانا ہے ہمیں

(بسلسلۂ گذشتہ)

خطوط کی ستم ظریفی

وہ سر کے بل اور میں مُنہ کے بل! اس طرح گرے کہ ہم دونوں کی ملکر صلیب بن گئی۔ کچھ پتہ نہیں کیسے اُٹھنا پڑا۔ چوٹ کے بارہ میں تحقیقات جوکی وہ ناممکن ہو گئی۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جاوے۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اُن کو اوپر چڑھا دوں اور خود پھنسا رہوں۔ چنانچہ میں نے کہا "آپ کو تو میں چڑھا دوں مگر پھر مجھے کون نکالے گا؟" انہوں نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "خدا کے واسطے....." آواز بھرا گئی۔ مُنہ پہلے ہی دوسری طرف تھا۔ میں نے پھر کہا "میں جاکر پوسٹ ماسٹر....." بات کاٹ کر انہوں نے گھبرا کر کہا "نہیں.... مجھے نکال دیجئے.... جلدی....."

ہم نے ایک سینما میں دیکھا تھا کہ ایک لڑکی کو ایک آدمی نے دیوار پر چڑھایا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں آپس میں پھنسالیں۔ اُس پر لڑکی نے بایاں پیر رکھا۔ دونوں ہاتھوں سے آدمی کا سر پکڑ کر دوسرا پیر آدمی کے کندھے پر رکھا اور اوپر پہونچ گئی۔ یہ طریقہ ہمیں بیحد پسند آیا تھا۔ اب تقدیر کی خوبی سے اس پر عملدرآمد کا موقع ملا۔ دوسری کوئی صورت ہی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ میں نے جب اُنگلیوں میں اُنگلیاں پھنسا کر اُن سے پیر رکھنے کو کہا تو معلوم ہوا کہ یہ ترکیب غلط ہے اور اس وقت تک اس پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ہندوؤں کی دیوی جی کی طرح ہمارے چار ہاتھ نہ ہوتے۔ اُنہوں نے اس طرف غور بھی نہیں کیا۔ وہ مضمون کہ لادے لادے۔ پیر پکڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پنجہ کے پاس سے میں نے اُن کی شلوار پکڑ کر پیر کے نیچے اپنا ہاتھ اُنگلیاں پھنسا کر ضروری ہدایات دیں اور ہاتھوں کو اوپر کھینچا۔ اب سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ یا تو وہ سر کے بل اوندھی گریں اور یا اس خاکسار کے گلے میں ہاتھ ڈال کر میرے کندھے پر اپنا دوسرا پیر رکھیں۔ مگر انہوں نے اس خاکسار کے گلے میں ہاتھ ڈالنے کے بجائے دیوار کریدنے کی ٹھہرائی۔ کام چل جاتا بشرطیکہ وہ فوراً ہی اپنے پیر سے میرے کندھے کو رونق بخشدیتیں۔ مگر انہوں نے یہ بے تکلفی بھی گوارا نہ کی اور پیر بھی دیوار میں اڑانا چاہا۔ میں نے بہت کہا مگر نہ مانیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے چھوڑنا اور انہیں لڑھکنا پڑا۔ میری جان ہی تو جل گئی اور ساتھ ہی میرا ذہن اب دوسری طرف منتقل ہوا۔ دور کونے کی طرف جا کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

"آپ کی اگر مرضی یہی ہے کہ رات گڈھے میں بسر ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں"

"مجھے نکالئے"

"آپ خود مجھے نکالئے" میں نے کہا "اس گڈھے میں گرنے کی سخت ممانعت ہے"

اُنہوں نے کہا "خدا کے واسطے....."

میں نے کہا "مگر آپ نہیں نکل سکتیں"

"مجھے نکالیے..... میں عمر بھر احسان نہ بھولوں گی"

میں نے کہا "اس میں ہمیں گرنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ یہ گڈھا ہمارے دھوبی کے گدھے کے خاص گرنے کیلئے "رزرو" ہے۔"

وہ بولیں "خدا کے واسطے رحم کیجئے"

میں نے کہا: "کیجئے آپ کے خود ہی میں نہیں ہے کہ نکلیں۔ دو صورتیں ہیں آپ کے نکلنے کی۔ یا تو میں یہاں سے چیخوں اور کوئی آئے اور ہم دونوں کو نکالے......"

"نہیں، نہیں....." گھبرا کر انہوں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "پوسٹ ماسٹر صاحب کو...."

میں نے کہا: "انہیں بلوا دوں؟"

"نہیں، نہیں۔ انہیں خبر تک نہ ہو۔"

میں نے کہا: "کیوں؟"

وہ بولیں: "میں آپ کو پھر بتا دوں گی۔"

میں نے کہا: "دوسری صورت یہ ہے کہ آپ...... کو مجھ سے غالباً گلے ملنا پڑے گا اور بغیر اس کے آپ کا نکلنا ناممکن ہے..... یعنی جب تک آپ میرا سہارا نہ پکڑیں۔"

وہ رقت آمیز لہجہ میں بولے: "خدا کے واسطے رحم کیجئے، رحم....." آواز میں زیادہ رقت آگئی۔

میں نے گھبرا کر کہا: "ابھی لیجئے۔" اور یہ کہہ کر میں اُن کی طرف بڑھا: "تکلف اور شرم کو ڈالو چولہے میں" میں نے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: "اِدھر آئیے۔"

چشم زدن میں اُنگلیوں میں اُنگلیاں پھنسا کر میں نے اُن کے لئے رکاب تیار کی۔ اُنہوں نے پیر رکھا۔ میری گردن چار و ناچار پکڑنا پڑی۔ زور جو لگایا تو گلے ملنا پڑا۔ اُن کا کان جو میرے قریب سے گذرا تو جو میرے جی میں آیا کہہ گیا۔ نہ معلوم کیا کیا۔ دوسرا پیر کندھے پر رکھکر میرے گلے سے ہاتھ نکل کر اوپر پہونچیں اور میرے کندھے پر سے پیر اُٹھکر میری ناک کے پاس سے گذرا تو میں نے بے اختیار ہو کر پکڑ لیا۔

"چھوڑئیے۔" اُنہوں نے بیٹھتے ہوئے اور زور لگاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا: "مجھے نہ نکالو گی تو میں پھنسا رہ جاؤں گا۔"

گھبرا کر اُنہوں نے کہا: "چھوڑئیے۔"

میں نے کہا: "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولیں: "پھر کر لیجئے گا۔"

میں نے کہا: "ملو گی پھر..... جواب دو گی....."

"ہاں۔ ضرور..... بخدا۔ چھوڑو مجھے......"

میں نے پیر چھوڑ دیا اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گئیں اور مجھے مسلسل پندرہ منٹ تک چیخنا پڑا تب جا کر کہیں میری آواز چوکیدار نے سُنی اور مجھے اس میں سے نکالا۔

******

یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کی ملاقات عموماً سخت اور نہایت ہی سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ رات بھر مجھے سخت تکلیف اور بےچینی رہی۔

ملاقات اس قدر مختصر تھی کہ بات تک نہ کر سکا۔ بہرحال وہی صورت سامنے تھی۔ صبح کام میں جی نہ لگتا تھا اور اسی ادھیڑبن میں تھا کہ وہی بڑھیا بہشتن آئی اور ایک خط لائی۔

پہلے تو میں یہ سمجھا کہ طرطنج آمن کے مقبرہ کا کوئی نوشتہ ہاتھ لگا مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ نہیں۔ بلکہ گنڈے والے دوست کا خط ہے۔ اس خط کی تحریر ایسی تھی کہ تمام حروف اور الفاظ چو کھنٹے تھے۔ مثلاً قاف "ق"۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ایک ریلوے پارسل پیر بخش کے فرضی نام سے آیا ہوا ہے۔ بلٹی پوسٹ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں آجاتی لہذا بھیجنے والے ہی کے پاس ہے۔ لہذا وہ پارسل چاہیے مجھے فوراً خیال آگیا۔ ایک چھوٹا سا کوئی ڈھائی سیر کا پارسل کپڑے سے سلا ہوا تھا۔ اندر کپڑا اور کاغذ بھرا ہوا معلوم ہوا۔ لاکھ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے پارسل بڑھیا کو دیدیا اور اپنے رجسٹروں میں وہ کارروائی کر دی جو بلٹی کھو جانے پر ہوتی ہے اور پیر بخش کے فرضی دستخط لیکر خانہ پُری کر دی۔ مجھے یہ طرزِ تحریر پسند آیا لہذا میں نے بھی اسی جناتی خط میں ایک رقعہ بھیجا۔ اور حسب وعدہ ملنے کا تقاضہ کیا۔ اس کا جواب دوسرے دن آیا اور اس خط کے آتے ہی میری بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ کیونکہ اس خط میں علاوہ اور باتوں کے یہ تحریر تھا۔

"........ جو غریب اور کمزوروں کی مدد کرتا ہے خدا اُس کی مدد کرتا ہے۔ میں بے یار و مددگار ہوں۔ آپ کی امداد اور ہمدردی کی طالب مفصل خط پھر لکھوں گی۔ یہ بھی لکھوں گی کہ میں گڑھے میں کس طرح گری۔ اور یہ بھی لکھوں گی کہ موجودہ صورت حال میرے لئے کس قدر پریشان کن ہے۔ خود میری جان خطرہ میں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھ غریب کی مدد کیجئے گا........" وغیرہ وغیرہ۔

یہ خط پڑھکر میں سناٹے میں آگیا۔ الٰہی یہ کیا معمہ ہے۔ میں اس گتھی کو کیونکر سُلجھاؤں۔ میرے دل پر اس تحریر کا نقش ہوتا چلا جاتا تھا اور دو چار سطروں کے پُرزے سوائے خطرناک چیز ہونے کے اور کچھ نہ تھے۔

کوئی ہفتہ بھر اسی بے کلی میں گذر گیا کہ ایک نہایت ہی مختصر پُرزہ آیا۔ یہ کہ "رات کے ساڑھے نو بجے میرے گھر میں کوئی نہ ہوگا آپ میری مدد کیجئے"

قصّہ کو مختصر کرنا ہے لہذا اُن تاثرات و کیفیات کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو اس عجیب و غریب پیغام کا نتیجہ تھیں۔ کسی دوسرے کے گھر میں اس طرح جانا ایک دُشوار کام تھا۔ لہذا مجھے مشورہ کی ضرورت پڑی اور محمد عمر صاحب سے میں نے اس بارہ میں مشورہ لیا۔ سارے حالات شروع سے آخر تک کہہ سُنائے۔ اُس بھلے مانس نے سوائے ہوں، یا ہاں، کے معاملہ میں کوئی عملی دلچسپی ہی نہ لی۔ جب میں نے بہت کچھ کھینچا کھانچا تو کہنے لگے کہ "چارپائی دیوار کے پاس رکھ کر اُس پر مونڈھا رکھ کر دیوار پر چڑھ جاؤ اور اُس طرف کود پڑو۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ دیکھا جائے گا۔"

رات کی ڈیوٹی دوسرے کلرک کی تھی اور قریب نو ساڑھے نو بجے میں محمد عمر صاحب کے کوارٹر میں پہونچا۔ چپکے سے چارپائی دیوار کے قریب رکھکر اُس پر مونڈھا رکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ بالکل خاموشی تھی۔ باوجود ہر طرح پتہ لگانے کے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پوسٹ ماسٹر کہاں ہیں۔ نہ تو کہیں باہر تھا اور ایک آدمی سے دروازہ پر دستک دلوائی تو اُس سے جواب پایا کہ نہیں ہیں۔

تھوڑی بہت دُشواری سے میں نیچے اُتر گیا اور سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ دبے پاؤں دروازے پر پہونچکر زنجیر کھولدی کہ کہیں فراری کا معاملہ پیش نہ آئے۔

بالکل خاموشی تھی مگر دالان کے اُس پار کمرے میں روشنی نظر پڑی۔ میں آہستہ سے اُس طرف بڑھا۔ قریب پہونچا تو میرے کانوں میں آواز آئی " بولو "

کس قدر رعبدارانہ اور خاموش لہجہ تھا! یہ کون ہے؟ میں چپکے چپکے بڑھا۔ دالان میں پہونچا۔ کمرہ کا ایک دروازہ بند تھا اور ایک کھلا جو دروازہ بند تھا میں اُس کے پاس پہونچا۔ اُس کی درازمیں سے جھانک کر جو میں نے دیکھا تو پیر تلے سے زمین نکل گئی! یہ واقعہ تھا کہ کمرہ میں پوسٹ ماسٹر تھے اور اُن کی نام نہاد بھانجی۔ بیچ میں چارپائی تھی۔ چارپائی کے اس طرف پوسٹ ماسٹر کھڑے تھے اور دوسری طرف لڑکی۔ جاذب اور دلربائی کی ایک ہوشربا تصویر۔ خشمگیں! حیران، پریشان۔ ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی کُرسی کا پایہ! ایسے کہ اگر ذرا بھی پوسٹ ماسٹر رُخ بدلیں تو کُرسی کا پایہ سر پاش پاش کردے۔ یہ ہوشربا منظر دیکھکر میں بیحد پریشان ہوا اور قبل اس کے کہ میں یہ طے کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اور کیا معاملہ ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے غضبناک لڑکی سے کہا۔

" بولو..... بولو..... کیا میں نے تمہیں پناہ نہیں دی؟ " یہ الفاظ نہایت ہی آہستہ سے کہے۔ لڑکی نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا۔ پوسٹ ماسٹر نے پھر کہا " میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کو آج وعدہ کرنا پڑے گا۔ مجھ سے شادی کرکے تم خسارے میں نہیں رہوگی "

" خاموش " لڑکی نے نہایت ہی جلال کے ساتھ مگر آہستہ سے کہا " تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے جانے دو "

" کہاں؟ "

" جہاں میرا جی چاہے "

" یہ ناممکن ہے "

" تمہیں شرم نہیں آتی "

یہ سُنکر پوسٹ ماسٹر بائیں طرف کو ہٹے۔ لڑکی بھی اُسی مناسبت سے مقابل میں اپنے بائیں ہاتھ کو سرکی۔ تاکہ فاصلہ وہی رہے۔ وہ اور سرکے اور لڑکی نے بھی ایسا ہی کیا حتیٰ کہ وہ اس پوزیشن پر آگئے۔ کہ اگر کوئی کمرے میں دوسرے دروازے سے (جو کھلا تھا) داخل ہو تو اُس کی طرف پوسٹ ماسٹر کی پُشت رہے۔ معاً میرے دل میں ایک زرّیں خیال آیا۔ ایک کمبل پڑا تھا بڑا سا۔ ننگے پیر تو میں تھا ہی۔ کمبل لیکر بجلی کی تیزی سے میں اندر جھپٹا۔ پوسٹ ماسٹر کسی خوشگوار اقدام کی نیت سے چارپائی پر اپنا بایاں پیر رکھا ہی تھا کہ پھانس دیا میں نے جال میں رَہ ہو۔ اُن کے سر پر کمبل ڈالکر جو گھسیٹا ہے تو قبل اس کے کہ وہ آواز نکال سکیں میں نے اُن کا سر اور مُنہ پکڑکر گرا لیا " مار ڈالوں گا " میں نے اُن کے کان میں گھٹی آواز سے کہا۔

" کون ہے " اُنہوں نے کہا۔

" ملک الموت " میں نے کہا " چلو جہنم کی طرف "

وہ بولے " مجھے مار و گے تو نہیں " (چیخ کے)

میں نے ایک کپڑے سے اُن کی گردن اس طرح باندھتے ہوئے جس طرح بوتل پر کپڑا رکھکر باندھ دیتے ہیں کہا: "ہرگز نہیں۔"

وہ بولے: "تم ہو کون! غل مت مچانا!"

یہ کارروائی کرکے اب میں اُس لڑکی کو جو دیکھتا ہوں تو غائب! چُپکے سے پوسٹ ماسٹر کے کان میں مَیں نے کہا: "پڑے رہو۔" مگر وہ اُٹھنے جو لگے تو میں نے اُن پر چارپائی اوندھا دی اور کمرے سے نکل کر دالان کی طرف جو آیا تو میرا ایک بڑی بی سے مچیٹا ہو گیا: "اوئی! گُلگے مُنہ سے نکلا اور موئے مونڈی کاٹے...." لیکن اُنہوں نے جوشین گن سنبھالی ہے تو میں نے اپنے کو ٹیں آکر دم لیا۔ اور کوئی دس منٹ جو پوسٹ ماسٹر نے غل مچایا ہے تو سب ہی تو جمع ہو گئے۔ میں بھی پہونچا۔ شکر ہے کہ میرے اوپر کسی کا شُبہ تک نہ تھا۔ خیریت سے محمد عمر صاحب نے چارپائی اور مونڈھا جگہ سے ہٹا دیا تھا۔ قصہ نے اس قدر طول کھینچا کہ گیارہ بجے تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ پوسٹ ماسٹر نے یہ قصہ گڑھا تھا کہ چور آگیا مگر جاگ ہو گئی تو چور بھاگ گیا۔

اب ظاہر ہے کہ واقعات میرے لئے کسقدر مُعمہ ہو گئے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بڑی بی جو میری مُنڈیا کترنے کہتی تھیں۔ وہ پوسٹ ماسٹر کی بیوی تھیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ لڑکی کہاں گئی! اور زوجہ محترمہ کے ہوتے ہوئے یعنی خاص الخاص گُرُو کے ہوتے ہوئے پشکر کی ضرورت کیسے پڑ گئی؟ اور پھر یہ ماموں کیسے اور وہ بھانجی کیسی! نہ تو میری سمجھ میں کچھ آیا اور نہ محمد عمر صاحب کی عقل نے کام کیا۔

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ یہ امر بھی پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا کہ پُرانے زمانہ میں نہ صرف عشاقِ خستہ جان بلکہ ان کے پیغامبر بھی اپنے فرائض جلیلہ کی ادائی کے سلسلہ میں زدوکوب سے مشرف کئے جاتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر نے بُڑھیا کو مطلع کر دیا کہ اگر وہ اُن کے گھر کی طرف رُخ بھی کرے گی تو مار ڈالی جائے گی۔ محمد عمر صاحب کے مکان میں جا کر سُن گن لی۔ وہ دوسری طرف جھانکنے نہ دیتے تھے۔ نہ پوسٹ ماسٹر کی حالت سے کچھ اندازہ لگا سکا۔ اور اسی حالت میں وقت گذر رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ پوسٹ ماسٹر کا کوارٹر مدفن کی طرح بدستور خاموش اور بند تھا۔

جب میری پریشانیوں کی انتہا ہو گئی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب ضرور مجھے کوئی احمقانہ حرکت کرنی پڑے گی کہ ایک اور ہی معاملہ پیش آیا۔ ایک خط آیا بیسیوں مُہریں لگی ہوئیں۔ میرے قدیمی پتہ پر آیا۔ وہاں سے پھر پھر کر ایک دوسری جگہ ہوتا ہوا مجھے اب ملا۔ یہ "رشیدی" کے نام تھا۔ یعنی ح۔ب صاحبہ کا خط تھا۔ میں نے لفافہ کھول کر خط پڑھا۔ القاب و آداب ندارد۔ بڑی برجستگی سے لکھا تھا۔

"اگر آپ کو مجھ سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو خدا کے واسطے میری مدد کیجیے۔ میری گذشتہ خطاؤں کو معاف کیجیے۔ میں جس مصیبت میں ہوں خدا دُشمن کو نہ ڈالے۔ اگر آپ یہاں دو روز کے لئے تشریف لا سکیں تو موجودہ پتہ حسب ذیل ہے۔ مکرر یہ کہ میں آپ سے ضروری مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ میری موت اور زیست کا سوال ہے۔ اس خط کو تار سمجھیں۔ دیر نہ کریں۔ اس پتہ پر تشریف لائیں۔"

آپ کی

ح۔ب

پتہ..............

میں نے مندرجہ بالا خط پڑھا۔ ایک اور جنجال میں پھنس گیا۔ وہ مضمون ہوا کہ یک نہ شد دو شد۔ یہ خط کوئی مہینہ بھر پیشتر کا چلا ہوا تھا۔ سوال یہ کہ وقت گذر چکا تھا یا میں اب بھی وہاں پہونچ جاؤں۔ ریلوے مُلازم کو چھٹی ملنے میں بھی ہفتہ بھر لگتا ہے۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔

کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ بجائے ایک کے اب دو معاملات درپیش تھے کہ تیسرا ایک اور پیش ہوگیا۔ وہ یہ کہ اسی دن ریل کی کھڑکی میں ایک احمق مسافر کی لاپرواہی سے میرے داہنے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی دب گئی۔ کچل کر بھرتہ ہوگئی۔ ایسی کہ مارے تکلیف اور درد کے اس کا قائل ہونا پڑا کہ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ عشق کا علاج پولیس کے پاس بھی ہے تو ایک حد تک صحیح ہے۔

اب ایسی صورت میں سوائے اسکے میں اور کیا کرسکتا تھا کہ ایک عرضی رخصت کے لئے دوں۔ انگلی کے علاج کا بہانہ بھی ہاتھ آیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ ح۔ ب صاحبہ کو خط لکھا کہ مجھے فوراً تار دو کہ تم سے آکر ملوں۔ اس خط میں میں نے اپنا نام و پتہ بھی ظاہر کر دیا۔

دوسرے کا ذکر ہے کہ مجھے انہی ح۔ ب صاحبہ کا ایک تار ملا۔ یہ تار بھی خط کی طرح قدیمی پتہ پر ہو کر خط کی رفتار سے آیا تھا۔ اس تار میں لکھا تھا کہ اگر آسکتے ہو تو تین دن کے اندر اندر آؤ۔ ظاہر ہے کہ میعاد کب کی عارض ہو چکی تھی۔ اسی روز شام کو پھر ایک خط اور ملا جو تار کے پیچھے پیچھے ہی گھومتا پھرتا آیا۔ حالانکہ میعاد گذرنے کے بعد آیا تھا۔ صرف چند حسرتناک لفظ تھے:۔

"وقت نکل چکا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پیغامات غالباً آپ تک نہیں پہونچے۔ ورنہ آپ ضرور آتے۔ اور اگر پہونچے بھی ہوں تو تو اب تکلیف کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ہمایوں کی طرح پچھتانا پڑے گا۔ میری اور مہارانی کرنارت[1] کی تقدیر کہیں ایک سی تو نہیں ہے! پانی سر سے گذر چکا آپ سے اور غالباً دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہوں۔ فقط آپکی۔ ح۔ ب"

میرا رنتھنبور پوسٹ ماسٹر کا گھر تھا اور میں ضرور اس قلعہ کو چھوڑ کر پہونچ جاتا مگر اب تو بیکار ہی تھا۔ لہذا افسوس اور صبر کرکے بیٹھ رہا۔ مگر وہ جو ارشاد ہے۔ ان اللہ مع الصابرین تو لاریب کہ سچ ہے۔ معاملات نے کیسا زبردست پلٹا کھایا ہے کہ ایک ایسا عجیب غریب معاملہ پیش آیا ہے کہ بس سنیئے اور وجد کیجیے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ریلوں کی گھڑگھڑاہٹ سے قطع نظر کرکے رات پُرسکون اور خاموش تھی میں اپنے کمرے میں پڑا انگلی کے درد میں کراہ رہا تھا کہ ہلکی سی غنودگی سی طاری ہوئی مگر جلد ہی کسی غیر معمولی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ معاً کمرے کی کھڑکی پر آواز آئی۔ جیسے کوئی دستک دیتا ہے۔ میں اٹھا اور منتظر رہا۔ مگر پھر خاموشی ہوگئی۔ مگر میں اٹھا اور میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا محض واہمہ تھا۔ مگر نہیں۔ میں نے کھڑکی بند بھی نہ کی تھی کہ پھر شبہ ہوا اور اب کھٹکا دروازے کی طرف معلوم ہوا میں نے روشنی لی اور دروازہ پر پہونچا "کون ہے؟" کہہ کر میں نے دروازہ کھولا۔ لالٹین اونچی کرکے دیکھتا ہوں تو ایک چادر میں لپٹی لپٹائی ......

ارے! میرے منہ سے ایکدم سے نکلا اور قبل اس کے کہ میں وجہ دریافت کرسکوں۔ ایک دبی ہوئی آواز نکلی: "مجھے بچاؤ" میں ارادہ دیکھکر کنارے ہوگیا اور وہ اندر چلی آئیں۔ خود دروازہ بند کر دیا۔ اب میں تصویر حیرت بنا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ خواب تو

---

[1] مہارانی کرنارت کا قلعہ جب دشمنوں نے گھیر لیا تو اس نے شہنشاہ ہمایوں کے پاس قاصد کے ہاتھ راکھی بھیجکر ہمایوں کو راکھی بند بھائی بناکر اس سے امداد طلب کی۔ ہمایوں نے یہ رشتہ قبول کرتے ہوئے قاصد کے سامنے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ: میری بہن سے کہدینا کہ میں مدد کو فوجیں لیکر آتا ہوں۔ خواہ رنتھنبور کے قلعہ سے ہاتھ دھونا پڑے" چنانچہ ہمایوں جلد سے جلد آندھی اور طوفان کی طرح رنتھنبور کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی بہن کی مدد کو دوڑا۔ اور پہونچا۔ مگر افسوس کہ وقت گذر چکا تھا اور دشمن کی کامیابی پر رانی خود کو آگ کے حوالے کر چکی تھی۔ ہمایوں کو بےحد افسوس ہوا۔

نہیں ہے۔ میں نے کمرے میں لاکر بٹھا دیا۔ اُن کا مُنہ اُسی طرح لپٹا ہوا تھا۔ دیکھنے کے لئے صرف ایک سوراخ تھا۔ میں نے اُن کو پلنگ پر بٹھایا اور اُن کو تکلیف میں دیکھکر خود دروازے کے پاس اس طرح بیٹھ گیا کہ آڑ رہے۔ قبل اس کے کہ میں پوچھوں اُنہوں نے خود کہا "آپ مجھے انتہا سے زیادہ بےحیا اور بےباک خیال کرتے ہوں گے۔ خدا کے واسطے میرا حال سننے کے بعد کوئی رائے قائم کیجئے گا"۔

میں نے اطمینان دلایا اور ہر امداد کا وعدہ کیا تو مختصراً اُنہوں نے اپنا حال سُنایا۔ قصہ دراصل نہایت ہی عجیب و غریب تھا۔ مختصراً عرض ہے۔ پوسٹ ماسٹر اُن کے سوتیلے بھائی کے ماموں تھے۔ ماں مر چکی تھیں۔ والد اور سوتیلے بھائی تھے۔ والد نے خود اُن کی اور سوتیلے بھائیوں کی مرضی کے خلاف شادی طے کر دی۔ نتیجہ یہ کہ دونوں سوتیلے بھائیوں نے مشورہ کرکے اپنے ماموں کے پاس پہنچا دیا۔ دونوں بھائی اپنے دوسرے ماموں کے لڑکے کے ساتھ رشتہ چاہتے تھے۔ مگر مصیبت اب یہ نازل ہوگئی کہ خود پوسٹ ماسٹر صاحب کے قلعۂ دل کو اُنہوں نے اپنے حُسن سے مسخر کر لیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کی موجودہ بیوی باوجود اپنی خوش جمالی و کہنہ سالی کے اس طرح اور اس قدر بےبس تھیں کہ وہ مضمون کہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" اُن کے گھر تھا نہ در۔ اور اپنے شوہر محترم کے ظلم و جبر، چار و ناچار سہنے کے لئے تخلیق کی گئی تھیں۔ گڈھے میں گرنے کی وجہ بھی کم دلچسپ نہ تھی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے نہ صرف اظہارِ عشق کیا بلکہ اُس دن میری خوش قسمتی سے کوئی ایسی "بدتمیزی" کی جو اُن کی غیور طبیعت کے لئے برداشت سے زیادہ تھی اور اُنہوں نے یہ طے کیا کہ پوسٹ ماسٹر سے بچنے کے لئے موت سے امداد لینا چاہیئے۔ کنوئیں میں جھانکتے ڈر لگا چپکے سے ریل کے نیچے کٹ مرنے کی ٹھانی۔ مگر ریل جو آئی تو بدحواسی میں گڈھا نوازی کی نوبت آئی۔ اور اُس کے بعد اب موجودہ صورت یہ تھی کہ اُن کی عزت آبرو اور جان تک خطرے میں تھی۔ لہٰذا اب ارادہ یہ تھا کہ میں اُن کو کچھ روپیہ قرض دیدوں اور ٹکٹ دلا دوں تاکہ وہ پھر اپنے بھائیوں کے پاس چلی جائیں۔ یہ تھی وہ امداد جو وہ مجھ سے چاہتی تھیں۔

اب جناب غور فرمائیں کہ اس قسم کی امداد مجھ سے کس طرح ممکن تھی۔ جب وہ اپنا لکچر ختم کر چکیں تو میں نے اپنا لکچر شروع کیا۔ تمہارے کوئی نہیں ہے تو میں نے کہا کہ میرے بھی کوئی نہیں ہے۔ تم فلک کی ستائی ہوئی ہو تو میں زمین کا ستایا ہوا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ خدا کے واسطے میری مدد خود تم کرو"۔

جب اُنہوں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تو میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ شکسپیر نے کہا ہو کہ کنواری زبان سے نہیں بولتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ شاید حضرت شکسپیر کی ملاقات اسی قسم کی کسی بےزبان خاتون سے ہوئی ہوگی۔ خیر۔ کچھ بھی ہو۔ میں نے اُن کی خاموشی کا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ہر کسی کو راضی کر لینے کا ٹھیکہ لیا۔ پوسٹ ماسٹر کی زیادتیوں کا واحد علاج ہی اس کو قرار دیا کہ میرے اوپر کرم کریں۔ واقعہ کچھ بھی نہ تھا۔ سوتیلے بھائیوں نے زبردستی یہاں بھیجدیا اور اُن کے ناہنجار ماموں نے یہ ساعت بد دکھائی کہ خود اپنی جان بچانے کی خاطر میرے حالِ زار پر کرم فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ایک باپ اپنی چہیتی بیٹی سے خوش ہونے کے سوائے کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس خوشگوار امکان کی طرف بھی میں نے اُن کی توجہ مبذول کرائی کہ اگر کہیں پہونچ گئیں اپنے والد بزرگوار کے قبضہ میں تو وہ ہرگز ہرگز نہ مانیں گے تاوقتیکہ اُن حضرت کے نکاح میں نہ دیدیں جن کے ساتھ نکاح کرنے کو وہ موت کے مترادف پہلے ہی قرار دے چکی تھیں۔

جب ان تمام باتوں کو سُننے کے بعد بھی وہ خاموش رہیں تو میں نے عملی قدم اُٹھانا چاہا۔ تقدیر سیدھی تھی۔ اُسی بات کیا بلکہ دو تین گھنٹہ پیشتر ہی گیارہ بجے کی گاڑی سے محمد عمر صاحب کی چہیتی بیگم صاحبہ تشریف لے آئی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ کیوں نہ محمد عمر صاحب کے

کرسکتا ہو تو بتا دیجئے۔

پوسٹ ماسٹر صاحب کی مجال نہ تھی کہ اپنی نام نہاد بھانجی کے بارہ میں خیال بھی کر سکتے کہ دیوار بیچ محمد عمر صاحب کے مکان میں موجود ہیں اور اس واقعہ کے ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر اس خاکسار کے ساتھ محمد عمر صاحب کی رشتہ کی "ایک سالی" سے میرا نکاح ہو گیا جس میں خود پوسٹ ماسٹر صاحب کو بہ نفس نفیس شریک ہو کر پلاؤ وغیرہ کھانا پڑا۔ اور اسی روز میں اپنی چہیتی بیوی کو اپنے گوا لیر میں لے آیا۔ شادی کی تاریخ بھی ایک طرح قابل یادگار تھی یعنی یہ کہ صبح کو میری انگلی کاٹی گئی تھی اور شام کو اس خاکسار اور کپڑوں کو ملا کر احباب نے ایک تھرڈ کلاس دولھا تعمیر کیا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ پوسٹ ماسٹر صاحب کو دوسرے دن حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے کیا کیا۔ سوال یہ ہے کہ میں نے اپنی پیاری بیوی کو کیسا پایا۔ میں کیا عرض کروں "بیوی ایک دلچسپ راگنی ہے جس کا دلکش نغمہ اپنی تمام ساحرانہ قوتوں کے ساتھ شادی ہوتے ہی کچھ اس طرح بیدار ہو جاتا ہے کہ شوہر عمر بھر اسی کے نشہ میں مدہوش رہتا ہے۔ ایک پُر کیف شراب ہے جو باوجود اپنی تلخیوں کے ثانی نہیں رکھتی۔ غیر بیوی اور اُس کی لازوال محبت کے ایک آدمی بیچ درندہ ہے۔ وہ جس کو دُنیا کے امن و امان کے لئے فوراً گولی مار دینا چاہیئے۔ چھٹے کنوارے ہیں اور شادی نہیں کرتے سب کو پھانسی ملنی چاہیئے۔ رات اندھیری ہو۔ ٹوٹا ہوا جھونپڑا ہو۔ مفلسی اور ناداری ہو اور اگر چند لمحات چہیتی بیوی کے ساتھ گذارنے کا موقع مل جائے تو حق بجانب ہے، وہ مفلس اگر دوسرے دن جھوم جھوم کر گائے ؎

چاندنی، دریا، شگوفہ، راگنی، بربط، شراب! پھٹ پڑی تھیں بزم پر نیرنگیاں سب رات کو!

لیکن افسوس کہ۔ ع۔

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

بمشکل چھ مہینے کا سفر طے ہوا تھا کہ اسٹیشن آگیا۔ بیوی بدمزاج ہو تو اُسے کلیجہ سے لگاؤ۔ لڑاکا ہو تو اُس سے لڑو اور پیار کرو۔ جنبہ داری کرے تو اُس کا منہ چوم لیا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ بیوفا ہو! تم سے جان چھڑائے! کسی اور کی ہونا چاہے! یا تمہیں چھوڑ دینا چاہے! یا تمہیں اپنا راز دار نہ بنائے! تب کیا کرنا چاہیئے؟ بعض کا خیال ہے کہ رسّی سے باندھ کر رکھو مگر میرا یہی خیال ہے اور رہیگا کہ ایسے جہنم میں ڈالو یعنی چھوڑ دو۔ کہ خس کم جہاں پاک۔ ہمیں نہیں چاہیئے کھوٹی اشرفی۔

میاں بیوی کی لڑائی ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اور میرے خیال میں تمام ایسی نوجوان اور خوبصورت بیویوں کو زندہ دفن کر دینا چاہیئے جو اپنے بدصورت شوہروں سے نہیں لڑتیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ لڑائیاں طرفین کی محبت اور ایمان کو بھی متزلزل کر سکتی ہیں؟ میرا خیال تھا کہ نہیں۔ لیکن ثابت ہوا کہ ہاں۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ شروعات میری طرف سے ہوئی یا میری بیوی کی طرف سے۔ میں نے جو شادی سے پہلے ج۔ ب صاحبہ کو خط لکھا تھا اُس پر وہاں کے مقامی ڈاکخانہ نے یہ نوٹ دیا "مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چلا" اور خط "ڈیڈ لیٹر آفس" پہونچکر کھولا گیا۔ وہاں میرا پتہ موجود تھا لہذا ایک اور لفافہ میں بند ہوا اور میرے پاس واپس آیا۔ میں نے لفافہ پھاڑ کر جو دیکھا تو اُس میں سے خط نکلا۔ اُس خط کو میں نے اپنی بیگم صاحبہ سے چھپا لیا۔ مذاق ہی مذاق میں باہر چلا گیا اور تلف کر دیا۔ میرے خیال میں یہ خط دکھانا مناسب نہ معلوم دیا۔ بیوی صاحبہ

کو کر پڑگئی بُرا مان گئیں۔ وہ بھی اس طرح کہ مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی اُن کا شبہ اب دوسری طرف منتقل ہوا۔ اُس پرائیویٹ بکس کی طرف جس میں ح۔ ب صاحب کے تمام خطوط رکھے تھے۔ یا اور اسی قسم کے دوسرے خطوط تھے چنانچہ انہوں نے ان خطوں کو دیکھنا چاہا۔ میں نے بہانے کئے۔ جھگڑا اُٹھا۔ بدمزگی پیدا ہوئی حتیٰ کہ میں بکس اُٹھا کر اسٹیشن لے گیا اور وہاں حفاظت الماری میں رکھدیا۔ اسی جھگڑے کے دوران میں میں نے بیگم صاحبہ کو دوسری طرح آڑے ہاتھوں لیا۔ اُس پارسل میں کیا چیز تھی جو پوسٹ ماسٹر سے چھپا کر مجھ سے منگائی گئی تھی اور وہ پارسل اب کہاں ہے۔ کیا مجھے حق حاصل ہے کہ فی الفور ان کے ایکوں ایک بکس میں پُرزہ پُرزہ کی تلاشی لوں۔ یہ سنتے ہی بیگم صاحبہ کا چہرہ غیر معمولی طور پر فق ہوگیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ہکلا گئیں۔ اِدھر میں اس پر آمادہ ہوگیا کہ ضرور تلاشی لونگا۔ اگر کچھ نہیں ہے تب بھی بکس دکھاؤ۔ اُس پارسل میں جو کچھ بھی تھا اُس سے بحث نہیں مگر تلاشی نہ دینا چہ معنی دارد۔ وہ ضد پکڑ گئیں طے یہ ہوا کہ اس وقت چونکہ ضد اور بحث ہے لہذا پھر کبھی وہ دکھاویں گی۔ اس سے یہ بدمزگی ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ میں اسٹیشن ڈیوٹی پر گیا تو دل میں طرح طرح کے شبہات لیتا گیا۔ وہ یہ کہ ضرور اُن کے پاس کسی نہ کسی طرح کے قابل اعتراض خطوط ہیں اور نیز یہ کہ میری غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر ضرور بالضرور آج ہی یہ ان کو تلف کردیں گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور انہوں نے کچھ کاغذات کمرے میں جلا کر اور راکھ کو پانی میں حل کر کے کھڑکی سے باہر پانی پھینکدیا۔ میں جو واپس آیا تو سب سے پہلا کام میں نے یہی کیا اور بہت جلد کمرے کے فرش پر غور کر کے پتہ چلا لیا۔ جلے ہوئے کاغذ کے ذرات۔ بلا کسی شرعی وجہ کے انگیٹھی جگہ سے ہٹی ہوئی۔ اُس میں کاغذ جلائے جانے کی شہادت موجود۔ بقیہ ثبوت کھڑکی کے باہر پانی سے مل گیا کیونکہ کاغذ کے ذرات اچھی طرح پانی میں حل نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ اس بات پر جھگڑا ہوا اور میرے الزام کی وہ قطعی جوابدہی نہ کرسکیں۔ مگر اپنی ضد پر اڑی رہی کہ کوئی کاغذ نہیں جلایا گیا۔ اس جھگڑے کے بعد ہی میرا ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہوگیا۔

شادی کے دوسرے ہی دن کا واقعہ ہے کہ میری انگلی تو بندھی ہوئی تھی۔ دفتر کا کام تو جوں کا توں کر کے قلم کو بیچ والی انگلی اور انگوٹھے کے پاس والی انگلی سے پکڑ کر چلا لیتا تھا لیکن ایک دوست کو خط لکھنے کی ضرورت جو پڑی تو بیگم صاحبہ سے فرمائش کی۔ انہوں نے قلم نہ جاننے کا عذر کیا درحالیکہ چو کھنٹے الفاظ بنا بنا کر وہ مجھے لکھ چکی تھیں۔ میں نے تعجب سے دریافت جو کیا تو مسکرا کر کہا کہ ویسا ہی یا اُس سے ملتا جلتا بُرا بھلا لکھ سکتی ہیں۔ وقت ہی ایسا تھا۔ چہیتی اور نئی نویلی بیوی کی یہ ادا بھی دل کو بھاگئی۔ کلیجہ سے لگا کر میں نے کہا کہ ویسا لکھدو۔ چنانچہ ویسا تو نہیں مگر ہاں اُسی طرح بُرا بھلا انہوں نے لکھدیا۔ یہ ایک نہایت ہی معمولی واقعہ تھا جس کی طرف شادی اور محبت کے طوفان میں کون توجہ کرتا ہے لیکن اب چونکہ طرح طرح کے شبہات موجود تھے لہذا میں نے فوراً یہ الزام ہی عاید کیا کہ تم دیدہ و دانستہ اپنی تحریر چھپاتی ہو جس سے ثابت...... ہوتا ہے کہ تمہاری اصلی تحریر کی شان کچھ اور ہے اور اُس تحریر میں کچھ خط وغیرہ موجود تھے جو تلف کر دئے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ الزام بھی وہ رد نہ کرسکیں کیونکہ ایک نہیں بلکہ میں نے درجنوں واقعات گِنا دئے۔ جہاں انہوں نے لکھنے سے گریز کیا تھا اور حتی الوسع برابر گریز کرتی رہتی تھیں۔ اور جتنی کچھ بھی اُن کی تعلیم تھی اُس سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ اتنی تعلیم یافتہ لڑکی صرف لکھنے میں اس طرح قاصر رہے۔ چنانچہ اس دن سے اصل پوچھیے تو مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہوگئی۔ اُن کے گھر والے تو گمنامی میں تھے۔ ان کو واقعات کی اطلاع تو ہوگئی تھی مگر باپ اُن کے بیحد خفا تھے۔ ایسے کہ اُن سے میرے ملنے تک کی نوبت نہ آئی تھی اُنہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری لڑکی مرگئی۔ اب ان واقعات پر میں نے غور کیا تو صاف معلوم ہوا کہ ضرور بالضرور باپ کی خفگی

اور معاملہ اصل کچھ اور ہے۔ اور ان تمام شبہات کی مکمل تصدیق بالآخر ایک دن اس طرح ہو گئی کہ بادہ و شاید میں نے ان کی ایک سہیلی کا خط پکڑ لیا جس میں اس کا پورا ثبوت تھا کہ میری بیوی کے کوئی عاشقِ زار ہیں اور اُن کی سہیلی نے پوچھا تھا کہ کیا اب بھی اُن سے خط و کتابت کرتی ہو یا نہیں۔ لیکن اس کا جواب بیگم صاحب کے پاس موجود تھا۔ اُنہوں نے میرے دو خط اسی قسم کے پیش کر دئے جن سے ثابت تھا کہ میری بھی کوئی دوسری محبوبہ ہے۔ یہ وہ خطوط تھے جو میرے دوستوں نے بجھ ح۔ ب صاحب کے بارے میں لکھے تھے۔ مارے غصہ کے میں نے تسلیم کر لیا کہ ضرور بالضرور میری ایک چہیتی اور بھی ہے اور غصہ میں بیگم صاحب نے بھی تسلیم کر لیا کہ جب یہ واقعہ ہے تو تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ میرا بھی کوئی عاشقِ زار ہے تو رہنے دو۔ نتیجہ یہ کہ بد مزگی کی انتہا ہو گئی۔ فوراً میں طلاق دیدیتا اگر کہیں مہر کا ڈر نہ ہوتا۔ لہٰذا نتیجہ یہ کہ میں نے کہدیا کہ تم میرے کام کی نہیں جاؤ اپنے عاشق کے پاس اور اُدھر انہوں نے کہدیا کہ تم میرے کام کے نہیں جاؤ اپنی محبوبہ کے پاس۔ نتیجہ یہ کہ اس قابلِ نفرت بیوی کو زادِ راہ دے کر میں نے رخصت کر دیا۔ اور جہاں کا اُنہوں نے ٹکٹ بتایا دلا دیا۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے یہاں چلی گئیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے کیا مطلب "جاؤ جہنم میں" یہ میرے الفاظ تھے۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔ یہ نتیجہ ہوا اس خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کا۔ افسوس اور رنج ہوتا تھا جب خیال آتا تھا کہ ایسی شکل و صورت والی لڑکی اور یہ چلن۔ پھر میں نے بھی قسم کھالی کہ اب عمر بھر شادی نہ کروں گا۔ نہ ایسی خوبصورت بیوی مجھے ملے گی اور نہ میں شادی کروں گا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ وہ مضمون ہوا کہ "سور کٹا بیر گئی" میں نے طے کر لیا کہ پلٹ کر کبھی خبر نہ لونگا۔ لیکن عرض ہے کہ یہ فلکِ کجرفتار بھلا کہیں عشاقِ خستہ جان کو بھی چین لینے دیتا ہے! توبہ کیجئے۔ در دسر وقع ہوئے بمشکل بیس دن ہوئے ہوں گے کہ رفتارِ زمانہ نے از سرِ نو ایک طرفہ تمہید اُٹھائی یعنی یہ کہ جب عزیز و اقارب کو معلوم ہو گیا کہ میری خود کردہ شادی کا یہ حشر ہوا تو لوگ سوچے کہ لاؤ پھر اسے پھانسو۔ میری شادی کرنے کا لوگ "وچار" کر رہے تھے نہیں بلکہ بڑے شد و مد کے ساتھ۔ مگر میں نے کورا جواب دیا۔ صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ ابھی دراصل شادی کی تلخ کامیاں "دور نہ ہوئی تھیں۔ بس وقت اپنی بیوی کا خوبصورت چہرہ سامنے آتا تھا دل مسل کر رہ جاتا تھا کہ ہائے تقدیر۔ چمکتی ہوئی چاندی مگر کھوٹی۔ تمام واقعات کا خیال کر کے روحی اذیت ہوتی تھی۔

میں نے اسی مہینہ میں ۲ ماہ کی رخصت لی اور گھر پہونچا۔ اور گھر پہونچ کر ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ خیر سے ایک روز محترمہ ح۔ ب صاحبہ "مرحومہ" کا خط آ دھمکا۔ میں چونکہ اپنے پُرانے پتہ پر تھا خط فوراً مل گیا۔ اُن کا پتہ البتہ بالکل نیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں واقعات میں میں نے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ شادی میں بھی اور ح۔ ب میں بھی۔ ح۔ ب صاحبہ کا خط بھی عجیب تھا۔ خط میں قدرے نہیں بلکہ بہت کافی پرانی زندہ دلی کی جھلک تھی۔ لُطف یہ کہ اپنی گذشتہ مصیبتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ قیاس دوڑایا گیا تھا کہ میں اُن کو بھول گیا ہوں گا۔ یا یہ سوچتا ہوں گا کہ اُن کے دُشمن کوچ کر گئے، اس دلچسپ جہان سے۔ یہ بھی توقع کی گئی تھی کہ "اب تو" میں اپنا نام و پتہ بتا دونگا اور وعدہ کیا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ خود بھی بتا دیں گی کہ کیا نام ہے اور کون ہیں۔ مگر شرط یہ تھی کہ پہلے میں اپنا نام و پتہ بتا دوں۔ میں نے بھی اس خط کا انتہائی زندہ دلی سے جواب دیا۔ خاص بات اس خط کی یہ تھی کہ مجھے بجائے بھائی وغیرہ کے "محسن" کے دلکش لقب سے سرفراز کیا تھا۔ اور اسی "حیثیت" سے میں نے اُن کو جواب بھی دیا۔ لفظ "محسن" کسی خاص نام نہاد رشتہ سے دست برداری کا مکمل ثبوت تھا۔

میرا جواب پاکر انہوں نے اپنی تمام قدیم روایات زندہ دلی کو نہ صرف از سرِ نو زندہ کر دیا بلکہ نئے عنوان "محسن" کے تحت میں دُنیا سے وہ خامہ فرسائی کی کہ تمام جلوے از سرِ نو بیدار ہو گئے۔ وہی میں تھا اور وہی وہ۔ لفظ "محسن" نے کیا سے کیا کر دیا۔ تیجہ یہ کہ ایک عجیب کشش تھی کہ مجھے اس گمنام مگر شوخ و شنگ لڑکی کی طرف کھینچ رہی تھی! عشق! ہرگز نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ دلچسپی! زندہ دلی، رنگینی، خط کیا تھا آتشیں پروانہ ہوتا تھا۔ نام بتانا انہیں بھی قسم اور مجھے بھی قسم۔ یہ خط و کتابت اس زور روں پر ہو گئی کہ روز اُن کا خط آتا اور ادھر سے میرا خط جاتا۔

میری رخصت کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور مجھے خیال ہوا کہ اس گمنام دوست سے ملنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اُن کو ایک خط لکھا۔ علاوہ دوسری باتوں کے میں نے لکھا "دوست من، معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری شامت آنے والی ہے۔ تم کہتی ہو کہ میں وہاں آیا تو تم نہیں ملو گی۔ خیر تم نہ ملنا۔ دیکھیں تو سہی کون ہارتا ہے۔ ہم یا تم۔ اور آخر وہ کون سی بات ہے کہ تم نے اس کا تذکرہ "تیسے ملاقات"[1] پر اُٹھا رکھا ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ اب ہم اس فکر میں دن و رات رہتے ہیں کہ اس شوخ کو پہچانو"۔

اس کے جواب میں انہوں نے مجھے لکھا کہ "غالباً تم ڈاکٹری شروع کر کے خود پاگل خانہ کے ڈاکٹروں کا علاج کرانے والے ہو مجھے ایک غیر ہو کر اس قسم کے جملے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ مگر مجبور ہوں۔ برادرم تم یہاں آؤ تو سہی۔ بخدا برادر بجان برابر بن کر لوٹو گے افسوس۔ حماقت بُرا مرض ہے......"

وہ دن بھی آیا کہ مکرمہ و معظمہ ح۔ب صاحبہ کے درِ دولت پر تو نہیں، ان کے پتہ پر پہونچے۔ وقت پہلے سے مقرر ہو چکا تھا ایک خاصا اچھا عالیشان مکان تھا۔ صاحب خانہ ندارد۔ ملازم موجود نہیں بلکہ گویا میرا منتظر تھا۔ یہ خاکسار "رشیدی" صاحب تھا ایک نہایت ہی صاف و ستھرے ڈرائنگ روم میں مجھے بٹھایا گیا۔ اب میں چاروں طرف ح۔ب صاحب کے لئے نظر دوڑاتا ہوں کہ لتے میں دروازے کے ایک پردے کو جنبش ہوئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ "کوئی" دلچسپ ترین "کوئی" مجھے دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی کانا پھوسی اسقدر سخت ہوئی کہ بیان سے باہر۔ ایک شیریں قہقہہ کے ساتھ نرم اور لوچ دار آواز آئی "میں خود جاتی ہوں" زور زور سے کانا پھوسی "اُف ٹہرو... ٹہرو... دبی ہوئی ہنسی کی آواز..... کشمکش ... پھر ہنسی کمبخت .... جانے دے"

یہ آوازیں میں چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ ہنسی کو روکتے ہوئے پردے سے وہی نرم اور شیریں آواز آئی "السلام علیکم"

"وعلیکم السلام" میں نے کانپتے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

وہ بولیں "کیا میں آ سکتی ہوں؟"

میں نے کہا "خوش آمدید....."

میرا یہ کہنا تھا کہ پردے کو ایک نازک ہاتھ نے جنبش دی اور نہایت ہی بے تکلفی سے ایک پھول سا چہرہ نمودار ہوا۔ چہرہ:

---

[1] نصف ملاقات سے مراد خط و کتابت تھی اور "تیسے ملاقات" سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ میں اُن سے ملنے آؤں تو وہ پس پردہ رہ کر مجھ سے بات کریں گی۔

حُسن و نزاکت کی پہیلیاں نادم رہی تھیں کہ مجسم تبسم تھا مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھکر یہ پوچھا کہ کیا میں آسکتی ہوں ؛

مَیں سرو قد کھڑا ہو گیا اور قبل اسکے کہ مَیں کچھ کہوں وہ داخل ہوئیں۔ وہ تبسم۔ وہ نزاکت، وہ خرام، ہنسی کو اس بطرح روکے ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ چہرے پہ نوجوانی اور شرارت کا نور غلطاں۔ اب کوئی میرے ساتھ سخت شرارت اور بدتمیزی ہونے والی ہے! میں نے آگے بڑھکر استقبال کیا۔ کہو اگیا تھا مصافحہ جو کیا ہے تو اُن کا چہرہ شوخی و دلفریبی سے جگمگا اُٹھا۔۔۔ میں مجبور تھا۔ چشم زدن میں۔۔۔۔ بیخبری میں گویا میں نے اُن کو گھسیٹ لیا اور قبل اسکے کہ انہیں خبر ہو کے وہ میرے آغوش میں تھیں اور آتے ہی جو۔۔۔۔ مگر یہ سب کچھ چشم زدن سے بھی کم وقفہ میں ہوا کہ۔۔۔۔ پردہ کو چیر کر کوئی نکلا۔۔۔۔ زبردست چیخ۔۔۔۔ ہنسی۔۔۔۔ کشمکش۔۔۔۔ یہ تیسرا کون مجھ سے اُلجھ پڑا! چھڑانے کو!۔۔۔۔ ارے! میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ از خود ہاتھوں سے چھوٹ گئیں! ایسے کہ دھم سے گریں اُٹھی۔ اور یہ جادو جا۔ میرے سامنے میری چہیتی بیوی کھڑی تھی اور میں حیران پریشان شرمندہ اس سوچ میں کہ ان دونوں میں سے ح۔ ب کون ہے۔ یہ یا وہ!

میں نے گھر والی سے پوچھا: "ح۔ ب کون ہیں؟"

اُس نے مُسکرا کر پوچھا: "اور رشیدی کون ہے؟"

مَیں نے کہا: "میں"

اُس نے کہا: "میں"

معلوم ہوا کہ وہ جنکے ساتھ میں نے تمام گستاخیاں کر ڈالیں میری بیوی کی سہیلی تھیں اور جب میری بیوی نے بجائے رشیدی کے مجھے دیکھا اور انہیں بتایا کہ مَیں کون ہوں تو باوجود میری بیوی کے منع کرنیکے وہ مجھے احمق بنانے آئیں۔ نتیجہ غیر دلچسپ رہا۔

نتیجہ

یہاں اس تمنا کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ لے کاش میری اُنگلی نہ کٹی ہوتی جو میری تحریر فوراً ہی میری بیوی پہچان لیتی اور معلوم کر لیتی کہ میں کون ہوں۔ یا یہ کہ اے کاش مجھ خاکسار یعنی "رشیدی" کو اُس نے اور دو ایک خط لکھکر ڈالنے کی نیت سے نہ رکھ لئے ہوتے جو مع میرے خطوط کے جو میں نے اس کو لکھے پوسٹ ماسٹر کے قبضہ میں نہ پہونچ جاتے اور وہ اس ڈر کے مارے کہ کہیں وہ میرے ہاتھ نہ لگ جائیں اپنے طرز تحریر چھپانے پر مجبور نہ ہوتی۔ بلکہ۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ہم دونوں نے غلطی یہ کی باوجود معصوم ہونے کے ایک نے دوسرے کو اپنا مازداں نہ سمجھا اور بھگتا۔

مَیں نوکری پر مع بیوی کے پہونچا۔ اسٹیشن کے دفتر کی الماری سے ح۔ ب کے وہ خطوط لاکر دئے جو خود اس کے لکھے ہوئے تھے لیکن پوسٹ ماسٹر ملعون میرے وہ خط نہیں دیتا جو میں نے رشیدی بن کر ح۔ ب کو لکھے۔ اپنی دانست میں ہماری کل داب ہے۔ فقط

"ایک احمق"

شکایت

اس افسانہ کو میں سخت شکایت پر ختم کرتا ہوں۔ جان بوجھکر بھائی شاہد نے نہیں بلکہ شاہد کی محبت نے مجھ سے مقرر کردہ پلاٹ پر قصہ لکھوا کر میرے ساتھ اور رسالے کے پڑھنے والوں کے ساتھ جبر کیا ہے جسکے خود شاہد صاحب ذمہ دار ہیں۔ یہ قصہ میں نے لکھا نہیں بلکہ زبردستی لکھوایا گیا ہے اور اسکے نقائص کی میں خود بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ لیکن خیر، اور کچھ نہیں یہ بات تو کم از کم ثابت ہو جائیگی کہ ایک وکیل نے افسانہ نویس کو قتل کر دیا اور بہتر ہے کہ اب۔۔۔۔۔ اس مُردے کو مت جھنجھوڑو ـــ یہ افسانہ اس طرح تیار ہوا ہے کہ جتنا تیار ہوتا گیا بھیجتا گیا۔ نام تک افسانہ کا مجھے نہیں معلوم۔ عظیم بیگ چغتائی

زندگی

"شاعر صاحبان کہیں گے "واہ، کیا کہنا اس غزل کا۔ مطلع غائب، مقطع ندارد اور قافیہ بھی کچھ یونہی سا یعنی فقط برائے نام" مگر حضرات! یہ اشعار مطلع اور مقطع کے لئے نہیں کہے گئے اور نہ قافیہ پیمائی کی خاطر۔ بلکہ ایک دُکھے ہوئے دل کی بے اختیار آہیں ہیں جو الفاظ کی شکل میں کاغذ پر منتقل ہو گئی ہیں۔ ہائے کیا خوب کہا ہے مرزا اسد اللہ خاں مرحوم نے ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

"پریم پجاری"

جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے
عذابِ جاودانی زندگی ہے

رُلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اِک رازِ میری زندگی ہے

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے

ہلاک انجام، تکمیلِ تمنا
بقائے آرزو ہی زندگی ہے

جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

وہ چاہے جس قدر بھی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

اُمیدیں مرچکیں، میں جی رہا ہوں
عجب بے اختیاری زندگی ہے

جوانی، اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے؟ یہ کوئی زندگی ہے

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
اُنہی کی یاد میری زندگی ہے

محبت، دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو، آہ، کیسی زندگی ہے

ناگن کی راگنی

ناگن اپنی تمام عمر میں صرف ایک ہی دفعہ راگنی سُناتی ہے۔

وہ بھی جنگل میں آدھی رات کو جبکہ چاندنی میں عالمِ شباب میں ہو اور راگنی ختم کرنے کے فوراً ہی بعد وہ سر پٹک پٹک کر جان دیدیتی ہے۔ رفیقِ حیات کی جدائی اور ہجر کی ستم انگیں گھڑیاں ہر ذی رُوح کے لئے قیامت خیز اور کٹھن ہوتی ہیں، اور پھر ناگن تو موسیقیت سے عشق جانیوالا دل رکھتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنے نر کی موت پر درد انگیز مرثیے سے جنگل کے تمام برگ ہائے سبز کو سُن کر دے تو کونسا جگر ہوگا جو اُس کی غمناک راگنی سُنکر خون نہ ہو جائیگا۔ ایک ایسی ہی شب تھی اور چاندنی کی نورانی رانی اپنے حُسنِ شرر افشاں سے سبز پتّوں میں کیکپی پیدا کر رہی تھی۔ بہار کا موسم تھا اور سبزۂ خوابیدہ پر ایک سیاہ ناگن، دراز قد، گنڈلی مارے اور پھن اُٹھائے بیٹھی تھی۔ رات جب نصف ڈھلک چکی تو اُس نے جگر کو چیر دینے والی راگنی بلند کی جس نے سازِ ہستی کے سنگین تاروں کو مرتعش کر دیا۔ قریب ہی اُگی ہوئی ناگ پھنی کے بڑے بڑے نوکیلے اور خاردار پتّوں میں تھرتھری پیدا ہوگئی اور املی کے اَن گنت پتے دلدوز آہوں سے متاثر ہو کر فرشِ زمردیں پر گر نے لگے۔

۲

ناگن نے زمین سے دو بالشت اوپر اپنا پھن اُٹھایا اور قصرِ شاہی کی طرف اپنا زہریلا مُنہ کر کے کہنے لگی۔

"انسان!! جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ بلند تصور کرتا ہے اور سب سے زیادہ رحمدل ہونیکا دعویٰ رکھتا ہے ذرا ٹھنڈے پیٹوں غور تو کرے کسقدر قابلِ نفرت ہستی ہے! وہ ہم بے زبانوں اور مظلوموں کو زہریلا سمجھتا ہے لیکن خود تو دیکھیے ہر وقت سمیت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ترحم کا دعویدار! ہم بے گناہوں کا سر اور دل کچل دے اور اپنے آپ کو پارسا سمجھے! تُف ہے ایسی ہستی پر اور لعنت ہے ایسے تخیل پر۔

میرا ناگ! آہ! میرا رفیقِ حیات! صرف محل کے پاس ہی سے گذرا تھا اور شہزادے نے اُسے اپنے تیر کا نشانہ بنا دیا۔ کیا محل کے پاس سے گذرنا اس قدر سنگین جرم ہے جسکی سزا زندگی سلب کرنے سے دی گئی؟ محل کیا وہ اپنی ماں کے پیٹ سے لایا تھا! یہ ہے رحم! اور اس کا نام ہے انسانیت! ایک ذرا سی غلطی کی یہ سزا! انسان کی رگ رگ میں ہمارے نام سے خوف پیدا ہو جاتا ہے! اور پھر جہاں کہیں ہم کو دیکھتے ہیں، چاہے ہمارا قصور ہو یا نہو ہمیں کچل دینے کے خیال میں لگے رہتے ہیں۔ صبح کا گیا ہوا رفیق جب دن ڈھلے تک واپس نہ آیا اور بچوں اور بزرگوں کی پریشانی حد سے گذر گئی تو میں اس کی تلاش میں نکلی اور اُسی باغ میں پہونچ گئی جہاں وہ اکثر جایا کرتا تھا ——صرف چلنے پھرنے اور کیا کرنے؟ —— آہ! میں نے کیا دیکھا! اسکے سارے بدن کو چھلنی کر کے باغ کے ایک سُنسان کونے میں پھینکدیا گیا تھا۔ وہ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ میری آنکھیں کاہے کو ایسا رُوح فرسا منظر دیکھنے کی عادی تھیں۔ لیکن میں نے اُسکی آنکھوں کے ذریعے اس کو پہچان لیا، جو ہمارے لئے ہماری ہر ضرورت کے تمام اسباب و سامان مُہیا کرنے کے تنہا ہتیار ہیں۔

آنکھیں! اس بیوقوف انسان کو ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے۔ انہی کے ذریعہ ہم انتقام لیتے ہیں اور انہی کے ذریعہ ہم اپنے بھیدی

اور قاتل کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ ہاں تو میں کئی گھڑیوں تک گم سم ہوگئی اور مجھے تن من کا ہوش نہ رہا۔ پھر کچھ دیر گذر جانے کے بعد میں سنبھلی اور مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میرا ناگ مجھ سے کہہ رہا ہے: کیا اسی کا نام ایفائے عہد ہے؟ جب تک میرے قاتل سے انتقام نہ لیا جائے گی ما تا میرا تن برابر جلتا جائیگا۔ اور میرا جسم جلا جا رہا ہے۔ پیاری! میری ملکہ! کیا تجھے مجھ پر رحم نہیں آتا؟" میں چونک پڑی۔ محبت بھرے الفاظ نے مجھ مردہ سے بدتر ہستی کو دوبارہ زندہ کر دیا گویا مسیحا کی پکار نے میرے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور میں نے غور سے اپنے ہمدم و ساتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ان میں اُسکے قاتل ـــــ یہی شہزادہ جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا ـــــ کی خونیں آنکھیں جھلک رہی تھیں۔ میرے تمام جسم میں انتقام کی آگ بھڑک گئی اور میں نے اپنے ناگ کے منہ پر منہ رکھکر عہد کیا کہ جب تک انتقام نہ لے لونگی بچوں کی صورت نہ دیکھونگی ـــــ بچوں کا کیا، وہ اگر موتی ہیں تو شوہر سیپ ہے جب سیپ ہی نہ ہو تو موتی کہاں سے آئیگا ـــــ بہرحال میں اُسکے منہ سے چمٹی رہی۔ ہمارے آنسو نہیں نکلتے۔ صرف فرطِ غم، غصہ یا مسرت میں سانس پھولنے لگتا ہے چنانچہ غم اور جذبۂ انتقام نے میرا دم پُھلا دیا۔ میں اُٹھی اور محل کی طرف بڑھی۔ تاریکی پھیل چکی تھی اور اگرچہ قصرِ عالیشان کی روشنی جگمگ جگمگ کر رہی تھی لیکن ہم تو رات کی رانی ہیں۔ انسان سے کہیں زیادہ ہم کو دکھائی دیتا ہے اس لئے میں آہستہ آہستہ بڑھتی ہی گئی۔ کوئی دو گھنٹے کی تلاش کے بعد مجھے وہی شہزادہ نظر آیا جس کی آنکھیں میں نے اپنے مرحوم دوست کی آنکھوں میں دیکھی تھیں۔ وہ اپنی دُلہن کی طرف ہاتھ پھیلائے بڑھ رہا تھا۔ میں سرکتے سرکتے قریب پہونچ گئی اور پیشتر اس سے کہ وہ اپنی دُلہن سے ہم آغوش ہوتا میں نے اُچک کر اسکی پنڈلی میں ڈسا ـــــ اور اپنا تمام زہر جو میں نے کئی سال سے محفوظ رکھا تھا اُس کے جسم میں داخل کر دیا۔ میرا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا کیونکہ میں شاہِ جنگل کی سیاہ فام رانی ہوں۔ چنانچہ وہ تڑپا اور چکرا کر گرا۔ اسکی چیخ پر اس کی دلہن پلٹی اور پیشتر اس سے کہ وہ کچھ کر سکتی میں وہاں سے بھاگ آئی اور یہاں آکر دم لیا۔

ہم میں صرف انتقام کی آگ ہی ایسا جذبہ ہے جو بے پناہ ہے اور جو ناگن یا ناگ اپنے ساتھی کا بدلہ نہیں لیتا وہ اندھا ہو جاتا ہے اور کوئی اژدھا اُسے فوراً ہی چٹ کر جاتا ہے۔

وہاں اب کہرام مچا ہوگا۔ اس کے ماں باپ بیوی بچے ماتم کر رہے ہوں گے ـــــ کیا کریں! ـــــ مجھے کیا؟۔ جب انسان کو ہماری پرواہ نہیں تو ہم کیوں ان کا خیال رکھیں۔ میرے ناگ نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ کیا کسی کو ڈس لیا تھا جو تیروں سے اُسے قتل کر دیا؟ اس کے بھی تو ماں باپ ہیں۔ اس کی بیوی ہے اور بچے بھی۔ اُن کی کیفیت کا اُسے اندازہ نہ ہوا؟ یہ تو کرنی کا پھل ہے، جیسا کیا، ویسا بُھگتے! بس!...... اب مجھے اس دُنیا میں کرنا ہی کیا ہے۔ میں نے انتقام لے لیا جو میرا ایمان تھا۔ اب مجھے فوراً اپنے شریکِ حیات کے پاس پہونچ جانا چاہیئے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی نعش کو زمین میں نہیں گاڑا ورنہ انسان تو اکثر مار کے دفن کر دیتے ہیں۔ اس وقت تو بے شک ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب آنکھیں ہی نہیں دکھائی دے سکتیں تو قاتل کا پتہ کیسے چلے۔ اچھا ہوا ـــــ اب یہ آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے اور اسکے بدلے اُلفت کی آگ بھڑک اُٹھی ہے۔ اب میں ہونگی اور میرا ـــــ "

پاس ہی رکھے ہوئے سفید پتھر پر ناگن نے اپنے سر کو دے دے پٹکا اور لہولہان ہو کر جان دیدی۔

صادق الخیری دہلی

رخصت

دو دوست کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ہوٹل کی کھڑکی میں سے انہوں نے انسانوں کا ایک اژدہام بازار میں دیکھا۔ اس وقت مشکبار اور جانفزا ہوا جو شہر پیرس میں گرمیوں کی پُرسکوت راتوں میں چلا کرتی ہے۔ جو آدمی کو کسی نامعلوم دور دراز مقام پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور کردیتی ہے۔ اور جس کے اثر سے اس کے دماغ میں ترنم ریز دریاؤں، نور پاش جگنوؤں اور نغمہ سنج بلبلوں کے مناظر خواب کی صورت میں سامنے آ جاتے ہیں، ان کی شامہ نوازی کر رہی تھی۔

ان میں سے ایک نے جس کا نام ہیزی سائمن تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "آہ میں اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ یہ بات کس درجہ غم انگیز ہے۔ ایک زمانہ تھا جب آج جیسی خوشگوار راتوں میں میں اپنے جسم میں جذبات کا بے پناہ سمندر موجزن پاتا تھا۔ اور آج سوائے سرد آہوں اور حسرتوں کے اور کچھ نہیں۔ آہ زندگی کتنی سُرعت سے گذر جاتی ہے!"

وہ کچھ موٹا سا تھا۔ اسکی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔

دوسرا کارنیر جو اُس سے عمر میں بڑا ہونے کے باوجود قوی اور تنومند معلوم ہوتا تھا۔ بولا "میرے پیارے! اگر میری بابت پوچھتے ہو تو میں بے خبری ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ میں ہمیشہ ہشاش بشاش، خوش مذاق اور تنومند رہتا تھا۔ جب آدمی ہر روز آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھے تو وہ امتدادِ حیات کا اثر نمایاں طور پر نہیں معلوم کر سکتا۔ کیونکہ وہ آہستہ آہستہ اور بتدریج واقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس حسرت سے مر نہیں جاتے جو ہر دو تین سال کے بعد اسکی غیر مرئی تبدیلی ہم میں چھوڑ جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کو معلوم کرنے کی خاطر ہمیں چاہیئے کہ ہم پانچ چھ ماہ اپنے چہرہ کو بن دیکھے گذار دیں۔ آہ اسکے بعد جو نمایاں تبدیلی ہمیں نظر آئیگی، وہ صد درجہ جانکاہ ہوگی۔

آہ میرے پیارے! عورتیں...... میں ان بیچاریوں پر جس قدر افسوس کروں کم ہے۔ ان کی تمام خوشی، اُن کی تمام طاقت، اُنکی تمام رعنائی صرف اُن کے حُسن میں پنہاں ہے، جو زیادہ سے زیادہ دس سال تک قائم رہتا ہے۔

اچھا، تو میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں —— جب میں پچاس برس کا تھا تو خود کو کمسن سمجھا کرتا تھا۔ اسوقت میرے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس لئے میں غم واندوہ سے آزاد زندگی بسر کیا کرتا تھا۔

جوانی کی رُخصت اور بڑھاپے کی آمد ایک سادہ مگر وحشت انگیز طریق سے محسوس ہوئی۔ اور اس افسوس سے جو وہ اپنے ساتھ لائی میں چھ مہینے بستر پر اوندھا پڑا رہا۔ اسکے بعد میں نے اپنے آپ کو قضا و قدر کے حوالے کر دیا۔

میں نے اکثر دفعہ دوسرے انسانوں کی طرح محبت کی ہے۔ مگر ایک دفعہ غیر معمولی طور پر شدت کے ساتھ۔

میں نے اُسے آج سے تقریباً دس سال قبل، جب جنگ ابھی ابھی ختم ہوئی تھی ساحلِ سمندر پر ایٹریٹاٹ کے مقام پر دیکھا۔ ایٹریٹاٹ پر صبح نہانے کے وقت ساحل کا دلکش نظارہ تمام مناظر سے کہیں دلفریب ہوتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی گھوڑے کے سُم کی طرح خمدار جگہ ہے۔ جو پہاڑ کی ان بلند و بالا چوٹیوں پر واقع ہے، جنکے سلسلہ کو ہیبتناک درّے قطع کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک درّہ بڑا طویل ہے۔ جس کی کوہ پیکر لمبان سمندر کے اندر تک چلی گئی ہے۔ دوسرا اس کے بالمقابل واقع ہے۔ وہ پست اور تنگ ہے۔ عورتوں کا ہجوم اُن اونچی چٹانوں پر جمع

ہوتا ہے، جو سلسلۂ کوہ کے اختتام پر ڈھلان قائم کرتی ہوئی سمندر تک پہونچ جاتی ہیں۔ اُن پر بہار آفریں باغ نظر آتے ہیں۔ اور جب موجیں ان ڈھلانوں پر پوری تابانی کے ساتھ درختوں کے مختلف رنگوں اور سبزی مائل نیلے سمندر پر چمکتا ہے تو ہر ایک چیز شگفتہ، دلفریب، اور پُر بہار معلوم ہوتی ہے۔ تم جاؤ اور پانی کے کنارے بیٹھکر دوشیزاؤں کو نہاتے دیکھ سکتے ہو۔ وہ ساحل پر فلالین کا لباس زیب تن کئے، جس کو وہ کیف آمیز چھوٹی چھوٹی لہروں کے قریب جاکر اُتار دیتی ہیں، سُبک رفتار ہلکے ہلکے قدموں سے سمندر میں گھُس جاتی ہیں۔ کبھی وہ شیریں تھرتھراہٹ سے کانپتے ہوئے مختصر سے سانس لیتی ہیں۔

بہت کم عورتیں غُسل کے اس امتحان میں پوری اُتر سکتی ہیں۔ کیونکہ جب وہ پانی سے باہر نکلتی ہیں تو وہ ناتواں اور کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ گو سمندر کا پانی نازک و نرم جسموں کے لئے بہت زیادہ طاقت بخش ہے۔

پہلے پہل جب میں نے اس نوجوان عورت کو نہاتے دیکھا تو میں وارفتہ سا ہو گیا۔ وہ غُسل کے امتحان میں پوری اُتری۔ کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی دلفریبی، اور دلکشی ہمارے دل کو ایک ہی نظر میں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اور ہم خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم روز ازل ہی سے ان سے محبت کرتے چلے آئے ہیں۔ میں نے بھی اسے پہلی بار دیکھکر ایسا ہی محسوس کیا۔

مَیں نے اُس سے اپنا تعارف کرایا۔ میرا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کُلیلیں کر رہی تھی۔ اور اپنے آپ کو اس پیکرِ حُسن کے سامنے پیش کر دینے میں مَیں بے اندازہ اور فاتحانہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا تیرِ نظر، اس کا تبسّم، اس کی گردن کے بال جو نسیم صبح کے ساتھ دلکش انداز سے رقص کر رہے تھے۔ اُس کے چہرے کے باریک سے باریک نقوش، اور اس کی دلفریب چال ڈھال نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ اُس کی تمام تر ادائیں، اس کے غمزے، اُسکے کپڑے، جو وہ اُس وقت زیب تن کئے ہوئے تھی، مجھ پر سحر آفریں اثر ڈال رہے تھے۔ میں اُسکے دوپٹے اور رومالوں کو دیکھکر لرزہ براندام ہو رہا تھا۔

وہ بیاہتا تھی۔ مگر اُس کا شوہر اتوار کے اتوار اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اور پیر کے دن چلا جایا کرتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ میرے لئے چھ روز کا وقفہ چھوڑ دیا کرتا تھا۔ کہ مَیں اپنی پیاری کی دید سے پیاس بجھالیا کروں۔ عام لوگوں کی طرح مَیں اس کے ساتھ بالکل حسد نہ کیا کرتا تھا...... مجھے معلوم نہیں کہ مَیں حسد سے کیوں بچا رہا...... مجھے اُس کی زندگی نہایت شاندار اور اہم معلوم ہوتی تھی — ا۔

آہ مَیں اُس سے کس درجہ محبت کیا کرتا تھا اور وہ کس قدر خوبصورت اور نوجوان تھی یقین جانیئے، وہ نوجوانی، خوبصورتی اور شگفتگی کا ایک دلکش پیکر تھی۔ مجھے اس سے پہلے معلوم نہ تھا کہ صنفِ لطیف کس قدر نزاکت اور لطافت سے تکمیل پذیر ہوئی ہے۔ مَیں اس سے قبل رُخساروں کی ارتعاش انگیز دلکشی اور لب لعلیں کی ہوش رُبا دلبستگی سے واقف نہ تھا۔ مگر یہ تمام کی تمام خوبیاں اس کے دیکھنے سے اس حسن و خوبی سے ظاہر ہو گئیں جو بیان سے باہر ہے۔

مَیں اس کے غیر فانی حُسن سے تین ماہ تک لُطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے بعد میں امریکہ چلا گیا۔ میرا دل یاس و حرماں سے کُڑھا جا رہا تھا۔ مگر جب مَیں اُس کا تصور اور وہ فتح جو وہ مجھ پر پایا کرتی تھی، خیال میں لاتا تو اس دور دراز فاصلے پر بھی میں یوں محسوس کرتا تھا گویا وہ میرے پہلو میں ہے۔ کئی سال گذر گئے۔ میں نے اُسکی یاد کو لمحہ بھر کے لئے بھی کبھی محو نہ کیا تھا۔ اسکی رعنا صورت ہمیشہ میرے دل اور آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ اور مَیں اپنی محبت میں استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔

بارہ سال آدمی کی زندگی میں اتنا کم عرصہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں گذرتے ہوئے محسوس تک نہیں کرتا۔ وہ یکے بعد دیگرے، خاموشی اور آہستگی سے لمحہ لمحہ بیت جاتے ہیں۔ اور جب آدمی اُنکے بے معلوم سے روزانہ اثرات کا اُن کے گذر جانے کے بعد اپنے نمایاں بڑھاپے کیساتھ مقابلہ کرتا ہے تو یہ نمایاں تبدیلی جو آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہے ایک لاینحل معمہ بن کر رہجاتی ہے۔

فی الحقیقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی کل کی بات ہے جب میں ایذ ثیات کے مقام پر ساحل سمندر کے بہار پرور منظر سے لطف اٹھا رہا تھا۔

گذشتہ موسم بہار میں میں میتنسز کے مقام پر ایک دوست کے ہاں دعوت پر گیا۔ گاڑی ابھی چھوٹی ہی تھی کہ ایک تنومند عورت، چار ننھی لڑکیوں کو ساتھ لئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے بمشکل ہی اس بال بچوں والی عورت کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا کی جس کا گول سا بے ڈول چہرہ لیس دار ٹوپی میں سے نظر آرہا تھا۔

وہ بمشکل سانس لے سکتی تھی۔ اور جلدی جلدی چلنے کی وجہ سے اس کے سانس کا تسلسل ٹوٹ رہا تھا۔ بچے آپس میں چڑ چڑ کرنے لگے۔ میں نے اخبار کا صفحہ الٹا اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ہم ابھی آستیرز کے اسٹیشن سے گذرے ہی تھے کہ میرے ہمسائے نے اچانک مجھ سے پوچھا "موسیو! معاف کرنا کیا آپ موسیو کاریز ہیں؟"

"ہاں مادام"

یہ سنکر وہ ایک مطمئن عورت کی طرح مسرت آمیز انداز سے ہنسنے لگی، جس میں کچھ کچھ اُداسی کو بھی دخل تھا۔

"کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

میں ذرا جھجکا۔ اور دل میں خیال کیا کہ میں نے ضرور ایسا چہرہ کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں؟ اور کب؟ یہ یاد کرنے سے میں قاصر تھا۔

میں نے جواب دیا "ہاں...... نہیں...... ہاں میں آپ کو جانتا ہوں مگر مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا۔

یہ سنکر اس کا چہرہ افراط خون سے سُرخ ہو گیا اس نے کہا "مادام جیولی!"

میں کبھی اس درجہ حیران نہیں ہوا۔ ایک ہی ثانیئے مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ سب کچھ میرے اوپر گذر رہا ہے۔ اور جیسے کئی سالوں کے حجابات میری آنکھوں پر سے ہٹا لئے گئے ہیں اور جگر پاش تصورات سے میری باصرہ نوازی کیجا رہی ہے۔

"کیا یہ وہی —— ہاں یہ بھدی، معمولی سی عورت —— وہی عورت ہے۔ اور کیا یہ چار لڑکیاں اسی کی جنی ہوئی ہیں......؟ ان ننھے منے بلونگڑوں کو دیکھکر مجھے سخت حیرانی ہوئی...... کیا یہ اسی کے جگر کے ٹکڑے ہیں اور کیا یہی اس کے بعد زندگی کی تگ و دو شروع کرنے والے ہیں؟"

اس خیال سے میرے دل پر گہرا افسوس طاری ہو گیا۔ اور میں فطرت کے تخریب آمیز سفاکانہ فعل کے خلاف احتجاج کرنیلگا۔ میں مادام جیولی کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی گذشتہ جوانی اور موجودہ پژمردگی پر آنسو بہانے لگا۔

اس کا گلا گھٹ رہا تھا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولی "میں بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہوں۔ کیا یہ نہیں؟ آدمی کی زندگی

ایسے ہی گذر جاتی ہے! تم دیکھ رہے ہو کہ مَیں اب ماں ہوں ـــــ ایک اچھی خاصی ماں ـــــ! آہ میں خیال کیا کرتی تھی کہ اگر ہمیں دوچار ہونے کا کبھی موقع مل گیا تو آپ پہچان بھی نہ سکیں گے۔ آپ بھی تو بڑی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔ مجھے آپ کی صورت پہچاننے میں بہت دیر تک سوچنا پڑا تھا کہ مَیں غلطی تو نہیں کر رہی۔ دیکھ لیجئے آپ کا رنگ کس قدر زرد پڑ چکا ہے..... آہ ابھی دس سال گذرے ہیں ـــــ صرف دس برس ـــــ! میری بڑی لڑکی دس سال کی ہوئی ہے"!

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس میں ویسی ہی دلکشی تھی، جیسی اس کی ماں میں ـــــ اور زندگی مجھے تیز چلنے والی گاڑی معلوم ہونے لگی۔

ہم متینز کے اسٹیشن پر پہونچے۔ میں نے اپنے دیرینہ دوست کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور گذشتہ زندگی کے حالات اُسے سُناتا رہا۔ اس کے بعد ہم دونوں اشکبار آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

ایک شام، جب مَیں گھر میں اکیلا بیٹھا تھا، مَیں آئینہ سامنے رکھکر دیر تک اس میں اپنا چہرہ دیکھتا رہا ـــــ دیر تک اور بار بار۔ جوں ہی میں نے اپنی سفید مونچھیں اور چہرے پر جوانی کے پژمردہ آثار دیکھے، میرے جسم میں کپکپا دینے والی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور آئینہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور میں نے یوں محسوس کیا گویا مَیں "الوداع میری جوانی الوداع!" گنگناتے ہوئے بڑھاپے کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں ـــــ!!

(موپاساں)

طاہر قریشی

ثمراتِ تخیل

اُن کا جلوہ وہ کہ جس سے اِک جہاں ششدر رہے
آئینہ سے اُن سے دیکھا چاہیئے کیونکر بنے

ان پریزادوں سے کیونکر اے دلِ مضطر بنے
جب دمِ عرضِ تمنا ہر ادا خنجر بنے

اِرتقائے سوزِ الفت نے یہ بدلیں صورتیں
خاک سے آتش بنے آتش سے خاکستر بنے

ہے مجھے مدِ نظر سیرِ جہانِ بے خودی
موجۂ مے سے کوئی کہدے مری رہبر بنے

لذتِ پرواز آخر لے گئے پہونچی تا قفس
خود مری وجہ اسیری میرے بال و پر بنے

یوں سمجھ میں عظمتِ پیرِ مغاں کیا آئے گی
پہلے زاہد روشناسِ شیشہ و ساغر بنے

پھوڑ لینا سر کا سمجھا جائے گا صفتِ جنوں
بات تو جب ہے کہ ہر دیوارِ زنداں در بنے

جس چمن میں تھا نشیمن وہ چمن ہی مٹ گیا
یہ بتا اے خانہ بربادی کہاں اب گھر بنے

حشر پر موقوف اپنی جلوہ آرائی نہ کر
دل کا ہر ذرہ بجائے خود نہ اِک محشر بنے

حُسن کو تفویض فطرت نے کیا فرمانِ عیش
عشق سے یہ کہدیا اندوہ کا منظر بنے

اور اِسکے ماسوا کیا غایتِ دل ہے نہال
یہ زمیں الفت [illegible] لگا صد محشر بنے

پیری

دنیا کی طرف اب جو نہیں دیکھتے ہیں
ہم زیست کا انجام اب آخر میں دیکھتے ہیں
پیری میں نقاہت سے جھکی ہے جو کمر
مدفن کے لئے اپنے زمیں دیکھتے ہیں

تخمین کا گر دانتے کا طالب ہم کو
تربت کی طرف کیسے فنا طالب ہم کو
کیوں ضعف سے پیری میں نہ جھکتا سر
تعظیم اجل کی ہے مناسب ہم کو

کیا بات دم آخر کی نشانی کہیے
کیا عمر گزشتہ کی کہانی کہیے
سہ دم پیری نہیں یہ موت سے پہلے
کفن ان کی ہے تن نعش جوانی کہیے

خاموش ہیں یک لب سے ستم ہمہ پیچ
کس واسطے بیتاب ہے دل ہمہ پیچ
پیری سبب ننگ عیب آیا وابا اُف
جگر شست بنا تیغ سے ہمہ پیچ

حیدر دہلوی

فقیر کا گیت

معلوم نہیں اس بھوک کی دُنیا میں کون زیادہ مغموم ہے، گانے والا یا سُننے والا!۔

مَیں اکثر اس غم انگیز کیفیت کو یاد کرتا ہوں جو آج سے پندرہ برس قبل اپنے کرایہ کے مکان کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا!۔ مالک مکان کی رحمدلی نے شہر کے تمام فقیروں کو — غربت، افلاس، رنج و مصیبت کے "خاموش" اور "نغمہ سرا" مجسموں کو — صحن میں گانے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور مَیں اُنہیں اپنی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا!۔

اُن کے عجیب و غریب نغمے، نئے تانوں، نئے سروں میں ہر وقت سُنائی دیتے! کبھی صبح سویرے! کبھی شام کے بعد!۔

آہ! یہ موسیقی، درد انگیز! ملتجی! موسم کے تغیرات سے بے پروا! بارش سے نہ ٹھٹھرنے والی!۔

کبھی کسی لڑکے کی مہین آواز برف کو چیرتی ہوئی، بادلوں کی گرج سے مل جُلی آتی! کبھی مئی کی دوپہر میں جب آفتاب آگ برساتا ہوتا، مکانوں کے دروازے بند ہوتے، کسی بدنصیب کی دردناک تان بلند ہوتی! آواز کی تھرتھراہٹ ہی سے اُسکے بھوکے ہونے کا پتہ چلتا!۔

آہ! رنج و الم کے یہ ملے جُلے یہ حسرتناک گیت! ننھی توتلی زبانوں سے لیکر بوڑھوں کے گلے تک سے نکلتے ہوئے!۔

مرض، بدنصیبی، غم اور تکلیف کا ہر منظر میری کھڑکی کے نیچے نظر آتا۔ مَیں نے بوڑھے فقیر سے "جنگنا علیؑ" بھی سُنا اور نوجوان لڑکے کا نغمہ بھی..... جس کی پہلی ہی تان پر میں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور ایک نیلی جھیل کا تخیل جس کے کنارے پر نارنگی کے باغ تھے، میری آنکھوں کے سامنے آگیا!۔

انکے آلاتِ موسیقی بھی افلاس و مصیبت اور سخت کوش زندگی کا اظہار کرتے... سارنگی تھکی ہوئی۔ ولدوز آواز سے آہ کرتی معلوم ہوتی!۔ ستار کے ڈھیلے تار سوکھی اُنگلیوں کی ضرب سے عجیب طرح کراہتے!۔ بانسری سے ایک غمناک نوحہ نکلتا!۔

بعض وقت بہترین موسیقی سُننے میں آجاتی۔ ناتربیت یافتہ زبان سے خراب ہو کر!..... لوگ افسوس کرتے کہ ایسی عمدہ چیز کا اس طرح خون ہوا!۔

اس کے بعد اندھے آتے، اپنے ہمراہیوں کا ہاتھ پکڑے۔ پھر بوڑھی بوڑھیاں بیٹھی ہوئی آواز سے گاتے ہوئے!۔ لڑکے بھی آتے۔ بہت چھوٹے چھوٹے۔ پھٹے چیتھڑے کپڑوں کے باوجود وہ کتنے بھولے معلوم دیتے معصوم!..... آہ! بیچاری بھٹکی ہوئی بُلبلیں! ان کا کیا حشر ہوگا؟..... لڑکے خوشی میں گاتے ہیں لیکن انکا گانا تو زبردستی تھا! مجبوری! اُنہیں گانے کی سزا دی گئی تھی!۔

آہ! میں نے کیسی کیسی آوازیں سُنیں! کھوکھلی، چیختی ہوئی، کرخت، جن پر مشکل انسانی آواز کا خیال بھی ہو سکتا ہے!... کتنی، جذبات کو برانگیختہ کرنے والی! احساسات کے تاروں پر چوٹ لگانے والی — "وعدہ کی راہ پر!"

طرح طرح کے راگ کا۔ قسم قسم کی آوازوں کا ملا جُلا عجیب و غریب ہنگامہ! جیسے کہ کوئی بالکل خواب میں ہو!۔

کبھی کوئی پورا خاندان آجاتا! — ابا، اماں اور آدھے درجن بچے۔ سب گاتے مل کر لیکن ہر ایک کا سُر علیحدہ ہوتا، سب کی تان الگ! جیسے کسی ٹوٹے ہوئے جہاز کے تختہ پر کئی آدمی بہے جا رہے ہوں اور اپنی اپنی آوازیں مدد کے لئے چیخ رہے ہوں!۔

میں اُس غریب کو نہیں بھول سکتا! وہ اپنے سے بڑی بانسری سے گر آتا اور بڑی تیز آواز سے بجاتا۔ ختم کر چکنے کے بعد کچھ دیر تک بالکل خاموش سر جھکائے کھڑا رہتا۔ شاید مدہوش ہو جاتا!..... اُس کی نظریں نیچی رہتیں اور زبان بند! کوئی کچھ نہ بھی دیتا تو وہ چُپ چاپ چلا جاتا ـــــ!

ایک بوڑھے کو بھی یاد کرتا ہوں۔ اس کے لمبے سفید بال کاندھے تک لٹکے تھے۔ وہ پیتل کے گول گول ٹکڑے ہاتھوں میں ہوتے اور خاص انداز سے بجاتا۔ اب بھی جب اُس کی یاد آتی ہے تو وہی مغموم جھنجھناہٹ سننے لگتا ہوں۔ اور اس مصیبت زدہ مایوس بوڑھے کی تصویر آنکھوں تلے آجاتی ہے!

آہ! بدقسمتو! تمہارے راگوں کا کیا حشر ہوتا ہے؟... آہ، عبرت، حسرت، جب تمہاری آواز ایک مشغول شہر میں پہونچتی ہے، جہاں ہمدردی تو درکنار، سُننے کی بھی کسی کو فرصت نہیں!... تم گاتے ہو اور لوہار اپنے ہتوڑے چلائے جاتا ہے، لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں۔ بغیر قدم آہستہ یا آواز نیچی کئے۔ گاڑی اور ٹرام تم آتے ہیں اور اُن کی گھڑگھڑاہٹ تمہاری آواز پر غالب آجاتی ہے!... تمہارے افسانہائے محبت، چاند اور بہشت کے گیت، رکابیوں کی جھنکار، بچوں کی چیخوں اور زندگی کے دوسرے بکھیڑوں میں گم ہو جاتے ہیں!

آہ! قدرت کی ستم ظریفی! کتنا سنگدل فرق! ـــ کھانے کو ایک پیسہ! دید خدا کی راہ پر ـــ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں!

بجائے اس کے کہ ان کریہہ آوازوں، ان التجاؤں سے مجھے تکلیف ہو۔ میرا دل بھر آتا ہے۔ جذبات کے تنے تار ان کی موسیقی سے ہمنوا ہو جاتے ہیں! انہیں آوازوں، انہیں گانوں کے ذریعے ہم تک اس مصیبت، اس تکلیف کی خبر پہونچتی ہے جس سے ہم ناواقف ہوتے ہیں یا قصداً باخبر ہونا نہیں چاہتے۔

بعض وقت رات کو میں ان تمام آوازوں کو ایک ساتھ سُنتا! معلوم ہوتا جیسے موسیقی کا ایک طوفان کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہا ہے! قسمت کے ماروں کی ـــ ان قسمت کے ماروں کی جو رنج و تکلیف میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مایوسی میں مرجاتے ہیں ـــــ دکھ بھری آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے انسانیت کراہ رہی ہو! چیخ رہی ہو!

ایک اندھا نوجوان بڑی اچھی لیکن مغموم آواز میں ایک نظم گاتا ـــ کہ "ایک عاشق اپنے محبوب سے جُدا ہو گیا ہے اور اب تک کہ ایک مدت گذر گئی اُس کی آواز، اُس کے محبوب کی آواز، اس کے سینہ میں گونج رہی ہے! دائمی صدائے بازگشت کی طرح!" ـــ ہر بند کے آخر میں وہ بڑے درد سے دُہراتا "آہ! وہ آواز! مجھے اچھی طرح یاد ہے!"

کیا یہ بے چارہ گانے والا فقیر جو کھڑکی سے اپنا نغمہ اندر پھینکتا میرے جذبات کو سمجھتا تھا ـــ؟ ان جذبات کو جو اُس کے نغمے سے میرے سینے میں بیدار ہوتے!...... کیا اُس نے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی خیال کیا ہوگا کہ اس سنگیں دیوار کے پیچھے کوئی سسکیاں لے رہا ہے؟ جو اس سے چُپ رہنے اور چلے جانے کی درخواست کرنے کے بعد جلد جلد اس کے الفاظ کو دُہرانے لگتا ہے۔ جو چُپ چاپ کھڑکی سے اس کے آگے پیسے گرا دیتا ہے کہ وہ پھر آوے اور اس کے سینے میں جذبات کا ہنگامہ بیدار کرے! اُسے کسی پیاری آواز کی غم انگیز یاد دلاوے! ـــــ

......"آہ! وہ آواز! مجھے اچھی طرح یاد ہے"......

تمنائی (دہلی)

ریزۂ مینا

.........اچھا اب ایک ضروری بات سُنیئے۔ پانچ برس سے میں نے شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے کہ بغیر کسی تحریک کے ہم سے شعر نہیں کہا جاتا اور ڈھاکہ میں بجز تحریکِ نزلہ کے اور کوئی تحریک موجود نہیں۔ لندن میں البتہ ایک واقعہ سے متاثر ہو کر ایک ناتمام نظم سی نوریہ کہی تھی۔ جو تمام ہونے کے باوجود کامل تباہی کا باعث ہوئی۔ اس کے بعد اب تک خاموشی رہی۔ اِسی ہفتہ یکایک خوابیدہ جذبات نے انگڑائی لی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی رومان پیدا ہونے والا ہے۔ گو بظاہر اس کے کچھ سامان نہیں۔ خدا خیر کرے۔ اپنے کلام کی اشاعت کی مجھے کبھی تمنا نہیں ہوئی۔ مگر اب جی چاہتا ہے کہ لکھوں بھی اور شائع بھی کروں۔ مگر کس طرح؟ فرضی نام سے۔ یقین ہے دُور سے تماشہ دیکھنے میں بہت لطف آئیگا۔ چند شعر اسی ہفتے میں کہے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر (گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں، انہی کی یاد میری زندگی ہے) کئی برس ہوئے جب کہا تھا۔ اور ایک "افسانہ" کے ضمن میں شائع بھی کیا تھا۔ وہ ایسا مقبول ہوا کہ اس چار برس کے عرصہ میں تین لکھنے والوں نے اُسے اپنے مضامین اور افسانوں میں نقل کیا.......

"پریم پجاری"

"...... ....."افسانہ نمبر" کے کیا کہنے! حیران ہوں کہ آپ کی ان لطیف جدت طرازیوں کی داد کون دے سکے گا۔ مُلک میں صحیح ذوقِ ادب کے لالے ہیں۔ پیٹ کے دھندے سے فرصت ہو تو لوگ فنونِ لطیفہ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں پہلا اور آخری سوال یہی "روٹی" کا مرحلہ ہے۔ پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ آسودہ تر طبقوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ کوئی صحیح الدماغ اور ہوشمند رہبر اُن کی اُپج کو صحیح ڈگر پر ڈالدے تاکہ اُن میں بے ڈھنگے پن کی بجائے اعلیٰ مذاق پیدا ہو سکے۔ مگر یہ کام کسی کے بس کا نہیں۔ کہا جاتا ہے رسائل کے ذریعے عام ذہنیت پر خاطر خواہ اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں خفیف سی جنبشِ لب "سیاہ کار" اور "راندۂ درگاہ" کا خطاب دلوا دیتی ہے۔ لیکن مُنہ پر آئی بات نہیں رُک سکتی۔ قسم لے لیجیئے جو موجودہ رسائل میں سے باستثنائے چند کوئی بھی کام کا ہو۔ جس نام نہاد "علمی، ادبی، اخلاقی صحیفہ" کو دیکھیے "بھیک کا ٹھیکرا" نظر آئے گا۔ مضامین پر نظر ڈالئے۔ خواہ مخواہ اول فول باتیں۔ بے سر و پا عشقیہ داستانیں "آہ" اور "اُف!" کا نام ادب لطیف! بدمذاقی کی حد ہے۔ دو ایک رسالے ایسے ہیں جن کا مقصد جلب زر نہیں۔ لیکن اُن کی حالت دردناک ہے۔ بازاری کشمکش کے ہاتھوں بچاروں کی وہ زبوں حالت ہوئی ہے کہ چراغِ سحری کی طرح آخری سانسوں پر نوبت ہے.........

خوشامد اور چاپلوسی کا اتہام نہ لگے تو عرض کروں کہ اس افراتفری کے دور میں میرے ساقی نے اپنی مخصوص روشِ لطف کر سے جو جو گرانمایہ خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں سُنہری الفاظ میں لکھنے کے لائق ہیں۔ اسی افسانہ نمبر کو دیکھیئے کیسا نادر مجموعہ ہے۔ ایک ہی پلاٹ پر ایسے چندرہ افسانے حاصل کر لینا معمولی کام نہیں۔ مَیں نہیں جانتا کن الفاظ میں آپ کی ان اعلیٰ ترین کاوشوں کی داد دوں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ خوب! بالخصوص قیمتی۔ شاہد، فضل حق اور انصار ناصری کے افسانے اپنے اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ خدا کرے آپ کے ہمعصر خاص نمبروں کی بھرمار کرنے سے پہلے ساقی کے خاص نمبروں کو اپنے لئے شمعِ ہدایت اور سراج المنہاج تصور کریں۔ لغاظی پر محمول نہ کیا جائیگا کہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ تتبع انکے لئے ایک ایسی سعادت ہوگی جس پر وہ فخر کر سکیں......"

عبدالحکیم۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی جالندھری

نقد و تبصرہ

رہنمائے تعلیم "افسانہ نمبر" لاہور کا مشہور تعلیمی رسالہ "رہنمائے تعلیم" کچھ کم تیس سال سے جاری ہے۔ اس کے عام پرچے بھی غیر معمولی طور پر ضخیم ہوتے ہیں اور اس میں ہر ماہ اچھے اور مفید مضامین کثیر تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ سکولوں کے لئے اس سے بہتر پرچہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ پنجاب سے اور بھی اچھے اچھے رسائل شائع ہوتے ہیں مثلاً "ہمایوں" "ادبی دنیا" "نیرنگ خیال"، "یادگار" وغیرہ لیکن یہ رسالے بچوں اور لڑکوں سے زیادہ مردوں کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ صرف "رہنمائے تعلیم" ہی ایک ایسا رسالہ ہے جو سکول کے بچوں اور لڑکوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ تعلیم کے جدید طریقوں پر جو مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ اور رسائل میں قطعاً نایاب ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ اسم بامسمیٰ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ "رہنمائے تعلیم" کا "جوبلی نمبر" شائع ہوا تھا اور اس شان کے ساتھ کہ آج تک صحافتِ اردو اتنا ضخیم رسالہ پیش نہ کر سکی۔ تقریباً آٹھ سو صفحے اور دو سو تصویریں! "رہنمائے تعلیم" کا "جوبلی نمبر" صحافتِ اردو کا لائق رشک کارنامہ تصور کیا جائے تو بجا ہوگا۔ اب کے "افسانہ نمبر" اس پیمانہ پر شائع کیا گیا ہے کہ اسے بھی کارنامہ موسوم کیا جائیگا۔ اتنا ضخیم "افسانہ نمبر" آج تک ہمارا کوئی پرچہ شائع نہ کر سکا۔ تقریباً پانسو صفحے اور افسانہ نگار حضرات کی بے شمار تصاویر پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ پسندیدہ ہے حیرت ہے کہ ماسٹر جگت سنگھ صاحب اتنے عمدہ افسانے فراہم کرنے میں کیسے کامیاب ہوگئے۔ اس کامیابی پر ادارۂ ساقی کی جانب سے مبارکباد پیش کی جاتی ہے دوسرا حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ "افسانہ نمبر" صرف دو روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی قیمت پانچ روپے بھی رکھی جاتی تب بھی زیادہ نہ ہوتی۔ قیمت کی اس کمی سے ہر شخص کو فائدہ اٹھانا چاہیئے یہ بیش قیمت مجموعہ ہر سکول اور ہر لائبریری میں موجود رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی حیثیت رسالہ سے زیادہ انسائیکلو پیڈیا کی سی ہے۔ ضرورت ہے کہ علم دوست طبقہ اس نوع کی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھے اور حوصلہ افزائی کرے تاکہ آئندہ اس سے بھی بہتر نمونے دیکھنے میں آئیں تعلیمی محکموں کو اس طرف خاص طور سے توجہ کرنی چاہیئے۔

انارکلی:- دہلی سے اس نام کا فلمی پرچہ تقریباً ایک سال سے احمد سعید صاحب جوہری کی ادارت میں جاری ہے۔ پہلے ماہوار شائع ہوتا تھا اب مہینہ میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے۔ پہلے ہر پرچہ کی قیمت ایک آنہ تھی، اب دہلی کے لئے دو پیسے اور باہر کے لئے تین پیسے ہے۔ ہر اشاعت میں بیس صفحے کے مضامین ہوتے ہیں جن میں فلمی معلومات کے علاوہ ادبی مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہر پرچہ میں کئی کئی تصاویر بھی ہوتی ہیں۔ جن حضرات کو سستے اور عمدہ فلمی رسالے کی ضرورت ہو "انارکلی" خریدیں۔ ہر شہر میں ایجنٹوں سے خریدا جا سکتا ہے۔

شاہجہاں:- سید ولایت حسین صاحب نے دہلی سے یہ رسالہ جاری کیا تھا۔ پانچ ماہ میں دس پرچے انھوں نے شائع کئے اور اپنی علالت کی وجہ سے اس سے دست بردار ہوگئے۔ سات ماہ تک دفتر ساقی سے یہ پرچہ شائع ہوا۔

اس طرح اگست ۱۹۳۱ء سے جولائی ۱۹۳۴ء تک اس کے پورے چوبیس پرچے شائع ہوئے۔ ادارۂ ساقی اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاہجہاں کے ادارتی فرائض پوری طرح انجام نہ دے سکا۔ اسلئے یکم اگست سے سید وصی اشرف صاحب سابق مدیر "ملا دہلی" نے اسے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ پہلے پندرہویں دن چھپتا تھا مگر اب ماہوار شائع ہوا کرتا ہے۔ آیندہ کے لئے اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ صرف افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل ہوگا۔ پہلا پرچا اگست میں شائع ہو چکا ہے۔ چندہ سالانہ ۲ فی پرچہ ۳ر۔ دفتر شاہجہاں۔ جامع مسجد دہلی سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

موتی:- جناب سید یوسف بخاری نے ہر زبان کے اقوال ترجمہ کرکے کتابی صورت میں "موتی" کے نام سے شائع کئے ہیں حضرت خواجہ حسن نظامی اور علامہ راشد الخیری نے اس کتاب کی ابتدا میں حوصلہ افزا تبصرے لکھے ہیں مؤلف نے ایک بسیط و پُر مغز مقدمہ لکھا ہے جس میں فلسفۂ اقوال بڑی عمدگی سے سمجھایا ہے۔ ان اقوال کے مطالعہ سے اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو اتنا ضرور ہوگا کہ پڑھنے والے کے خیالات پر جلا ہو جائیگی۔ حکماء و فلاسفۂ قدیم سے ذہنی سالقہ ہوگا جس سے قواء عقلی کو اُبھرنے اور نشو و نما پانے کا موقع ملے گا۔ اقوال کیساتھ ساتھ اس کتاب میں اچھے اچھے ادب پارے بھی شامل ہیں۔ مغربی زبانوں میں (Wise Sayings اور Aphorism) کی بے شمار کتب آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہر مشہور آدمی کے مقولے خوبصورت جیبی کتابوں کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں مگر اُردو میں اس قسم کی کتابوں کا کال ہے۔ یوسف صاحب کی پہلی کوشش بہت کامیاب نظر آتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آیندہ وہ ایک ایسا مجموعہ بھی شائع کر سکیں جس میں صرف اکابر اُردو کے مقولے جمع ہوں۔ اگر یہ کام اُن کے ہاتھوں انجام پا گیا (اور اُن کے لئے یہ کوئی دشوار امر بھی نہیں ہے) تو اُردو اپنے سپوت کے اس کارنامہ کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ موتی کی کتابت و طباعت پاکیزہ ہے۔ اس کی ہر سطر کو سلک مروارید سمجھئے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ قیمت صرف بارہ آنے رکھی گئی ہے جو نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز، کی مُقتضی ہے۔

ملنے کا پتہ:- مؤلف۔ گلی امام مسجد جامع، دہلی ـــــ یا ـــــ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

دِلّی آخری دیدار:- مصنفہ سید وزیر حسن دہلوی۔ قیمت ۱۲ر

دِلّی کی گذری ہوئی بہاروں کی تصویر۔ لال قلعہ کی بیگمات، شہزادوں اور شہزادیوں کی دلچسپ رسوم حضرت بہادر شاہ ظفر کا پروگرام۔ برکھا رُت کی دلچسپیاں۔ پھول والوں کی سیر۔ دِلّی والوں کی طرز معاشرت اور قدیم تہذیب کا مرقع۔ لال قلعہ کی ایک شہزادی کی زبانی اس دلربش داستان کو سُنیئے۔ دلکش، نرم، لوچدار قلعہ معلیٰ کی نتھری سُتھری زبان۔ انشا پردازی کا بہترین نمونہ۔

ملنے کا پتہ ـــــ

ساقی بُک ڈپو دہلی

مفت

ہمایوں کا بے نظیر "افسانہ نمبر"

یکم اگست ۳۴ء کو ہمایوں کا "افسانہ نمبر" شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستان میں آج تک افسانوں کی کسی بہتر سے بہتر کتاب میں بھی ایسے مسحور کن دلاویز اور فن کے لحاظ سے بلند معیار افسانے شائع نہیں ہوئے۔ یہ رسالہ نہیں مستقل حیثیت کی ایک بدیع المثال ادبی تالیف ہے۔ ضخامت ہمایوں کے سائز کے تقریباً نوّے صفحات کتابت طباعت اور کاغذ نفیس۔ رنگین تصویر خوبصورت سرورق۔

پانچ روپیہ چھ آنے معہ محصولڈاک سالانہ چندہ دیکر آپ سال بھر کے پرچوں کے ساتھ افسانہ نمبر اور جنوری ۳۵ء کا ضخیم سالگرہ نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ تین روپیہ ششماہی چندہ ادا کر کے بھی آپ ان دونوں رعایتوں کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ

منیجر "ہمایوں"، ۲۳ لارنس روڈ، لاہور

دِلّی نمبر

ساقی کا "دلی نمبر" اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ قیمت ۱ر

مستقل خریداروں کو مفت دیا جائیگا

"دلی نمبر" کے چند مضمون نگار

حضرت خواجہ حسن نظامی۔
نواب سراج الدین خاں سائل۔
جناب افضل حسین چشتی مضحک
پروفیسر ستار خیری۔ ایم۔ اے۔
جناب جاذب قریشی۔ بی۔ اے (آنرز)
جناب اشرف صبوحی۔
جناب آغا محمد اشرف۔ ایم۔ اے۔

علامہ راشد الخیری۔
پنڈت امرناتھ ساحر۔
جناب انصار ناصری۔ بی۔ اے
جناب ظفر قریشی۔ بی۔ اے۔
جناب صادق الخیری۔
جناب شاہد احمد۔ بی۔ اے (آنرز)
جناب سید وزیر حسن۔

علامہ دتاتریہ کیفی
جناب وحید الدین بیخود۔
پروفیسر احمد علی۔ ایم۔ اے
جناب فضل حق قریشی۔
جناب ممتاز حسین۔ بی۔ اے (آنرز)
جناب جلال الدین حیدر۔
جناب آغا شاعر قزلباش۔

ان حضرات کے علاوہ اور کئی حضرات کے مضامین بھی ہونگے۔

قرآن شریف

[illegible] زبان میں مترجم

[illegible] قرآن شریف ۴۰ سال سے مقبول [illegible] صاحب کا مترجم اور محشی ہے۔ ہدیہ مجلد [illegible] رعایتی [illegible] [illegible] رعایت نہ تو آجتک ہوئی ہے نہ ہوگی۔

بڑا قرآن شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب تقطیع ۲۲×۲۹ [illegible] ضخامت ۷۰۰ صفحات ترجمہ بین السطور کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو ہدیہ مجلد بارہ روپیہ [illegible] محصولڈاک [illegible] فرمائش کے وقت چوتھائی رقم پیشگی بھیجنی لازمی ہے۔

جامع المصاحف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم (ترجمہ بین السطور) کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو تقطیع ۲۲×۲۹–۸ ہدیہ مجلد پارچہ چھ روپے چار آنہ (لعہ) مجلد چرمی سات روپیہ (للعہ) محصولڈاک [illegible]

غرائب القرآن

اسمیں ایک صفحہ پر متن کلام مجید ہے مقابل کے صفحہ پر ترجمہ حاشیہ پر حل لغات عربی کاغذ ولایتی صفحات [illegible] تقطیع ۲۲×۲۹–۸ ہدیہ مجلد پارچہ [illegible] مجلد چرمی [illegible] محصولڈاک [illegible]

معجز نما حمائل مترجم

اس میں متن مع ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کا ہے۔ کامل تفسیر شروع میں سوانحعمری وغیرہ کاغذ اول نمبر ولایتی حنا شدہ ہدیہ مجلد چار روپیہ [illegible] قسم دوم معمولی کاغذ، قیمت مجلد [illegible] محصولڈاک گیارہ آنہ ۱۱

حمائل شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو سفر و حضر میں ساتھ رکھنے کے قابل۔ ہدیہ مجلد چار روپیہ آٹھ آنہ (للعہ) رعایتی تین روپے آٹھ آنہ (للعہ) محصولڈاک [illegible] یہ حمائل شریف [illegible] مرتبہ چھپ چکی ہے۔

بلا ترجمہ نورانی قرآن مجید

بچوں کے سیکھنے کیلئے کتابت کے لحاظ سے اس سے بہتر قرآن شریف قریب قریب دنیا بھر میں نہیں ہے۔ نہ آئندہ لکھا جا سکتا ہے اس حجم اور تقطیع پر اس سے زیادہ صاف چھپا ہوا اور کوئی قرآن شریف نہیں ہے۔ جمایت صحیح ہے۔ ہر پارہ علیحدہ ہو سکتا ہے۔ تاکہ مساجد میں جلدیں بنواکر دیدیں۔ ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چھ آنہ (للعہ) مجلد چرمی ایک روپیہ دس آنہ محصول [illegible]

بارہ مہری قرآن شریف مصری

یہ تمام ہندوستان میں مقبولیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور ہندوستان کے ہر مکتب میں پڑھایا جانے لگا ہے لکھائی چھپائی نہایت خوشنما ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ (للعہ) محصولڈاک بارہ آنہ (۱۲)

سترہ مہری قرآن مجید مصری

یہ قرآن مجید بہت صحت کے ساتھ آٹھویں بار طبع ہوا ہے ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ (للعہ) محصولڈاک بارہ آنہ ۱۲

معجز نما متوسط قرآن شریف

بد و ترجمہ زیر متن

ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی ترجمہ دوم مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حاشیہ پر کامل تفسیر اردو اور شروع میں تمام پیغمبروں کی سوانحعمری و تجلیات وغیرہ درج ہیں کاغذ اول نمبر ولایتی گلیز چکنا سفید و نرم عمدہ پالش ہدیہ مجلد چھ روپیہ [illegible] قسم دوم معمولی کاغذ تین روپے آٹھ آنہ (للعہ) محصولڈاک ایک روپیہ تین آنہ (للعہ)

کلام مجید مترجم (مرزا حیرت)

بہت بڑا سائز ہدیہ بارہ روپیے [illegible] محصولڈاک [illegible] کل سترہ روپیہ [illegible]

قرآن شریف کلاں معہ تفسیر حسینی اردو

قدیم طرز پاکیزہ لکھائی چھپائی ہدیہ مجلد آٹھ روپیہ [illegible] محصولڈاک ایک روپیہ چھ آنہ [illegible]

قرآن شریف بد و ترجمہ کلاں

منشی ممتاز علی صاحب مہاجر مکی مرحوم کی دلی تمنا کے مطابق منشی محمد عبد الغنی صاحب کی جگر کاری اور دیدہ ریزی کی آخری یادگار مطبع مصطفائی کا مطبوعہ ہے۔ اسمیں دو ترجمہ نہایت مستند عالم با عمل کے لکھے گئے ہیں بین السطور میں ترجمہ اردو تحت اللفظ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب۔ دوسرا ترجمہ فارسی بر حاشیہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نیز حاشیہ پر مولانا شاہ عبد القادر صاحب کے فوائد موضح القرآن درج ہیں تقطیع ۲۲×۲۹–۴ حنا شدہ ہدیہ مجلد پارچہ [illegible]

معجز نما پنجسورہ

بلکہ دہ سورہ و مجموعہ وظائف مع مکمل اوراد چشتیہ مترجم بالتفسیر ہدیہ دس آنہ (۱۰) مجلد [illegible] محصولڈاک ۵

مجموعہ دلائل الخیرات

و حزب البحر و قصیدہ بردہ مترجم حنا شدہ مع کامل تفسیر و حالات مصنفین جلی قلم۔ ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ (للعہ) مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ (للعہ) محصول ۶

رکن دین

اس کتاب کے اندر تمام مسائل دینی و دنیاوی جمع کر دیئے ہیں ہر گھر میں اس کتاب کا ہونا نہایت ضروری ہے یہ کتاب عورتوں کے مطالعہ میں بھی رہنی چاہیئے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت صرف دس آنہ (۱۰) محصول پانچ آنہ ۵

قصص الانبیاء

دنیائے اسلام کی نہایت ضروری کتاب ہے از ابتدائے پیدائش حضرت آدم تا رسول کریم تمام پیغمبروں کی سوانحعمری تقطیع ۲۰×۲۶ ۱/۸ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) محصول ۷

ملنے کا پتہ: کتب خانہ [illegible]

[illegible]

[illegible] ... بیحد مقبول کتاب ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے قیمت صرف ... محصول ۸ر

شب عروسی

شادی کے بعد شب عروسی کی سب سے پہلی علم ہو جائیں گی۔ شادی کے وقت اپنے دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کو کوئی مفید چیز کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو شب عروسی کتاب دیجئے۔ شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا سبق ہے یا تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائے گا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی قیمت عہ رہے جو اس کے منافع پر سو مرتبہ صدقہ ہے محصول ۵ر

کیف مواصلت

دنیا کے لطف مسرت اور لذت و کیف میں شباب ایک مرد اور جوان مرد کیلئے عورت کی مواصلت ہے یہی وہ کیف آفریں امر ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے یوں تو فطرت کی سیدھی راہ میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو فطرت کی طرح دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گذار دیتے ہیں۔ یہ کہ اس کیف سے اور شعور حیات میں اس درجہ تمتع حاصل کیاجائے جو ... حیات عالم سے ممتاز ہو ... کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہو قیمت عہ محصول ہر

بہار شباب

صنفی کتابوں میں جو مسلسلہ بیان کو اختیار ... ... کی ... مطالعہ کیلئے ... کبھی نہ دیکھی ہو ... لیکن ... فائدہ ... کے ماتحت ہے جس کے ماتحت ہر ایک انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے کیونکہ قائم ہو جاتا بہار شباب میں ایسا ہی ... کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کیلئے ... بڑی عجیب طریقہ ... ہدایات ... کی بڑی ... باتیں اور عورتوں کی اندرونی کیفیات ... پر آئینہ ... ایک قیمت ایک روپیہ ... محصول ہر

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے لکھا گیا ... عالم ہے اس کتاب میں ... نے لذت کے ... عورت کو ... انداز میں پیش کیا ہو کہ وہ لذت میں جوانی کی ... آدمی کے ذہن میں ... ہیں شاید ہی اس کے پاسنگ بھی نہ ہوں ... عورت کے ... ہی لذت شباب کی ہو اور اسی طرح مرد کی قوت ... کو مزید طاقتور کرنے کیلئے نسخے ... اور ... علاج کے سلسلہ میں ... بیان ہوتی ہیں وہ ... قیمت ... محصول ۸ر

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہو جبکہ تم اسکے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو۔ اولاد کی کثرت سے نصف ... حسن کے باغ جمال پر خزاں چھا جاتی ہو بلکہ ... والدین کیلئے انکی پرورش سوہان روح ہوتی ہو اور انسان ازدواجی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہو برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہو جسکو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کیساتھ اولاد کو پیدائش تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی قیمت عہ محصول ۸ر

لذت شباب

شباب جاودانی کی جستجو ہو تو لذت شباب یعنی ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپکو معلوم ہوگا کہ شباب کے ... راز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں عورت کے تاثرات کیا ہیں حسن کی ملکہ کس طرح لطف اندوز ہونا چاہئے گلزار شباب کس طرح دقف خزاں ہوتا ہو شباب کی رنگین ہوئی دیوی کس طرح ... عورت اگر عورت ہو اور مرد اگر مرد ہو اپنی خواہش پوری کرے تو کیسے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں ... لذت شباب میں ... شباب کو لذت تازہ جستجو کیلئے صدہا مجرب نسخے ... فوٹو بلاک قیمت عہ محصول ہر

شب عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شب عروسی کے تمام لذائذ کو یکجا جمع کرنے میں کامیاب ہو اس کا دوسرا نام عروس نو ہے کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ کتاب ... ہوگی ... جو کہ عروس نو کی طرح ... یہ کتاب جو لذات اور جذبات کی آئینہ دار ہے شب عروسی کے متعدد افسانے ... کی ... دلہن بنکر سامنے آجاتے ہیں جتنے افسانے ہیں انکی ہی طرح ... پر اس زندگی کی سب سے بہتر رات میں مزے لوٹے گئے ہیں۔ کامیاب زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہیں قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۶ر

قانون مواصلت

... زندگی کا رہبر اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں ... آپکی قوت میں کمزوری پیدا ... اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھائیں گے۔ اس میں مواصلت کی ... تمام ... باتیں درج ہیں قیمت ...

عہد شباب نوجوانوں کی رہبر کامل ... آب حیات قوت رفتہ کی ... تمام ... اس کی ... بیہودہ ... بلکہ اس میں اضافہ کی ... نسخوں کا مجموعہ ...

تاج العروس

یہ کتاب صدہا قیمتی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے اس میں صنف نازک کے ہر پہلو اور امور خانہ داری کے ہر نکات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھا گیا ہے درحقیقت یہ کتاب صدہا عربی فارسی اور ہندی معلومات کا بہترین نچوڑ ہے قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

ثمرۂ وصال } عیش و سرور کے منازل کے ساتھ اولاد پرورش اطفال پر بہترین کتاب قیمت ۱۲ر علاوہ محصول۔

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں شادی سے پیشتر کیا کرنا چاہئے ہے شادی کے بعد ... کونسی باتوں کا علم ضروری ہے حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کیجاتی ہو نو دوشیزہ کی پرکیف زندگی سے عیش و مسرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہو ان تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا ایک مست شباب دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا، ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے ان تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی۔ فوٹو بلاک کی دو درجن حسین و جمیل تصویروں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہو قیمت ...

افشائے راز نہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب اور ایسی عجیب و غریب کہ آپنے اس دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب بھی نہ ہوگی اسمیں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کیا تھا خود ان کے قلم سے لکھے ہوئے امریکہ کی ایک مس ... عورت نے یکجا کرکے کتابی صورت میں پیش کئے اور امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی اب اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ خدا جانے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہونیکا خطرہ ہے اسلئے جلدی منگا لیجئے قیمت ... محصول ہر

کلید مراد

دعا کے آداب اور مقصد حاصل کرنے کے طریقے کلام اللہ اور احادیث سے اخذ کرکے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸؍

فن تسخیر

دلوں کو مسخر کرنے والے اخلاق آداب سکھا سکنے والی کتاب قیمت آٹھ آنہ ۸؍

فن تقریر

تقریر اور گفتگو کرنے کے مفید اصول ۸؍

آپکی دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

اس لئے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقوں اور آداب سے ناواقف ہیں، اگر آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے واقف ہوجائیں تو آپ کی دعا قبول ہوگی اور ضرور ہوگی اسکے لئے کہ قرآنی دعائیں پڑھئے، اس کتاب کے پڑھنے اور عمل کرنیکے بعد بے اولاد صاحب اولاد بن جاتے ہیں غریبوں کو افلاس سے نجات مل جاتی ہے، مقروض قرضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں ہدیہ آٹھ آنہ ۸؍

آپ سے کون خفا ہے؟

کون منانے سے نہیں منتا! آپ کسے اپنا مطیع اپنا فریفتہ اپنا دیوانہ بنانا چاہتے ہیں! وہ کوئی عورت ہو یا مرد ہو کوئی بوڑھا ہو کوئی آقا ہو یا کوئی حاکم ہو، آپ کا مطیع و مسخر ہوسکتا ہے، اگر آپ اس عجیب و غریب طلسمی کتاب عمل تسخیر کو ملاحظہ کریں، اور اس کی ہدایتوں پر عمل فرمائیں، ہر عمل کی ترکیب نہایت آسان ہے قیمت آٹھ آنہ ۸؍

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آتا ہے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے اس میں صرف تین چھوٹے چھوٹے نقطے تجویز کر دیئے ہیں آپ جس بحر کو چاہیں تقطیع کر لیں اگر آپ شاعر بننا چاہیں تو فن شاعری منگائیے قیمت ۴؍

تصانیف مولانا شبلی نعمانی

الفاروق

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رض کی نہایت معتبر مستند اور مبسوط مکمل سوانحعمری قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴؍ معمولی ایڈیشن ۳؍

الغزالی

حجۃ الاسلام امام غزالی کی سوانحعمری اور ان کا فلسفہ، علم کلام، اخلاق اور تصوف میں ان کے مجددانہ کارنامے قیمت ۱۲؍

سیرۃ النعمان

سراج الامہ حضرت امام ابو حنیفہ رح کی سوانحعمری اور انکے اجتہادات اور مسائل فقہ حنفی کی تاریخ اور اسلامی قانون پر تبصرہ قیمت اعلیٰ ایڈیشن دو روپیہ ۲؍ معمولی ایڈیشن ۱؍

سوانح مولانا روم

اسلام کے مشہور صوفی شاعر حضرت مولانا روم کی مفصل سوانحعمری انکا اسرار تصوف، علم کلام اور مثنوی پر تبصرہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱؍

المامون

مامون رشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، دولت عباسیہ کے عروج و زوال کا دلکش مرقع قیمت اعلیٰ ایڈیشن دو روپیہ ۲؍ معمولی ۱؍

رسائل شبلی

اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تمدن وغیرہ سے متعلق مولانا کے قابل دید اور مضامین کا مجموعہ قیمت ۱؍

مقالات شبلی

علامہ ابن تیمیہ ابن حزم قاضی ابن رشد اور دیگر علماء اسلام اور مغلیہ تمدن سے متعلق متفرق مضامین کا مجموعہ قیمت جلد اول ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱؍ دوم ۱۲؍

مکاتیب شبلی

مولانا کے ان پرائیویٹ خطوط کا مجموعہ جن میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی تعلیمی اور ادبی کارنامے ہیں قیمت جلد اول ۱؍

اسکول ماسٹر

جو طالب علم انگریزی بغیر استاد کی مدد کے سیکھنا چاہتے ہیں دونوں کے لئے اسکول ماسٹر کا مطالعہ بس مفید ہوگا۔ نیز جو تجارت پیشہ حضرات انگریزی میں خط و کتابت نہیں کرسکتے ان کو بھی اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے اس کتاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ اخبارات کے ترجمہ میں بھی آسانی ہو ضخامت ڈیڑھ سو صفحات بہترین لکھائی چھپائی۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲؍ علاوہ محصول۔

اتالیق فارسی

مولفہ جناب رشید طلعت صاحب منشی فاضل اسسٹنٹ اورنٹیل ٹیچر سنسکرت ہائی اسکول دہلی۔

یہ کتاب ہائی اسکول اور کالج کے طلباء کو خاص طور پر ترجمہ سکھانے کے لئے لکھی گئی ہے قیمت صرف ۱۲؍ علاوہ محصول

بغیر استاد کے فارسی سکھانیوالی کتاب

فارسی بول چال

جس کی مدد سے آپ چند ہی دن میں فارسی زبان کی پوری مہارت اور لیاقت پیدا کرسکیں گے ہر قسم کی بول چال کے فقرے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور کاروباری رقعہ جات کے نمونے گفتگو کے طریقے ہزاروں اور لاکھوں ایسے الفاظ جو پرانی فارسی میں غیر زبانوں سے شامل ہوگئے ہیں اور سب کی تشریح اور ساتھ ہی ایک فرہنگ غرضکہ فارسی خواں طلباء کے لئے بہتر اور عمدہ کتاب ہے قیمت صرف ۵؍ محصول ڈاک ۴؍ کل ۹؍

اتالیق عربی

مصر، حجاز، شام اور ہندوستان کے روشن خیال علماء کے مشورہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کتاب کا یہ کمال ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد ایک مہینہ میں عربی لکھنا اور عربی بولنا آجاتا ہے قیمت ۱؍

ترجمہ قرآن شریف انگریزی (مرزا حیرت)

یہ وہ قرآن شریف ہے جسے یہ فخر حاصل ہوا کہ مرزا حیرت دہلوی مرحوم نے اس آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا جو مدتہائے دراز تک غیر مقبولیت کی نظروں سے دیکھا گیا تھا لیکن یکایک کچھ ایسا ناپید ہوا کہ لوگ ڈھونڈتے رہ گئے لیکن اس وقت اتفاقاً ہمیں چند ہی جلدیں ایک جگہ سے دستیاب ہوگئی ہیں چنانچہ فائدہ عام کی غرض سے پہلی قیمت بجائے سولہ کے صرف آٹھ روپے میں مجلد نہایت خوبصورت چرمی جلد کا ہدیہ کر رہے ہیں بہت تھوڑی جلدیں ہیں جلد توجہ کیجئے۔

مولانا شبلی کے تاریخی مضامین

یہ مولانا موصوف کے بعض ان علمی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو زبان کا مایۂ ناز سرمایہ کہلانے کے مستحق ہیں ان سے آپکی معلومات میں اضافہ ہوگا اور خیالات میں وسعت پیدا ہوگی۔ قیمت مجلد صرف ۸؍

مولوی نذیر احمد کے علمی مضامین

اسمیں مولانا موصوف کے بعض علمی اور مذہبی مضامین جو دہلی کی ٹکسالی زبان میں ہیں ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں مذہب اور زبان کی رہبری کے لئے یہ کتاب ضرور طلب کیجئے قیمت مجلد صرف آٹھ آنہ ۸؍

مضامین حالی مولانا موصوف کے چیدہ مضامین قیمت مجلد ۱؍

ہر سال ساقی کے چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جرعات

[illegible] ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ للعہ ششماہی [illegible] مع محصول ڈاک [illegible]

جلد ۱ | ساقی دھلی۔ بابت نومبر ۱۹۳۴ سنہء | نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

زیرِ نظر اشاعت میں کئی مضمون قابلِ قدر ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں ناظرینِ ساقی سے محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کا تعارف کرانا ہے۔ آپ پہلے ہندی میں مضامین لکھتی تھیں مگر اب اُردو کو ترجیح دیتی ہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ ہماری زبان میں اظہارِ خیال کے لئے جس قدر لوچ ہے ہندوستان کی کسی اور زبان میں نہیں۔ ہندی کی تو خبر نہیں، اُردو آپ اچھی لکھتی ہیں۔ "سنجوگ" کسی افسانے کا ترجمہ ہے۔ عمدہ تراجم کی اُردو کو بہت ضرورت ہے۔ جناب اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے ہمارے مُلک کے اُن نوجوانوں میں سے ہیں جن سے ہم اپنی بہترین توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔ سنسکرت میں آپ کو حال ہی میں "ساہتیہ النکار" کی سند ملی ہے۔ کئی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ بنگال کے باغی شاعر نذر الاسلام کو آپ ہی نے پہلی مرتبہ اُردو جاننے والے حضرات سے روشناس کرایا ہے۔ "افلاس سے خطاب" براہِ راست بنگالی زبان سے ترجمہ ہے۔ نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ آئندہ بھی ساقی کے ذریعے پیش کیا جائے گا۔ جناب ظفر قریشی، دہلی کے اُن باہمت افراد میں سے ہیں جو غیر زبانوں کے جواہر پاروں سے اُردو کو مالا مال کرتے رہتے ہیں۔ اِن لائقِ قدر تراجم کے علاوہ اِس اشاعت میں چند بلند پایہ طبع زاد مضامین شامل ہیں۔

"ڈرامے کی تنقید" میں صاحبِ مضمون نے سخن گسترانہ بات کہی ہے۔ اسٹیج اور اسکرین کی حدود قائم کرنے کے لئے اِس سے بھی گہری بُنیادوں کی ضرورت ہے۔ اسٹیج کے لئے ڈرامہ اور اسکرین کے لئے کہانی لکھی جاتی ہے۔ اس لئے اِن دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا رکھا جائے تو مُناسب ہے۔ "سچی کہانی" ایک مشہور ادیب کے چشم دید حالات ہیں۔ سچے واقعات من گھڑت قصے کہانیوں سے زیادہ عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ "پریم پُجاری" نے جس خوبی سے ان واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اُس کی مثال اُردو میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ صاحبِ مضمون نے اپنا نام پوشیدہ رکھنا چاہا ہے اس لئے بطورِ تعارف ہم صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ "پریم پُجاری" ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ ایران اور لندن میں ایک عرصے تک رہنے کی وجہ سے آپ نے لکھنا لکھانا چھوڑ دیا تھا۔ ساقی کے قدیم سرپرستوں میں سے ہیں اس لئے ہندوستان واپس آنے کے بعد آپ نے اِس نئے نام سے ساقی کے لئے مضامین لکھنے شروع کئے ہیں۔ آئندہ بھی آپ نے ساقی کے لئے مضامین بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

"حُسن کی ہلاکت پسندی" بھی ایک خاص چیز ہے۔ طرزِ تحریر کے اعتبار سے یہ مضمون بہت وقیع ہے۔ صاحبِ مضمون نے اپنا نام یہ کہہ کر پوشیدہ رکھا ہے کہ "یہ میرے رنگ کی چیز نہیں ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ اگر انہوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا تو اُردو میں ایک طرزِ جدید کا اضافہ ہو جائے گا۔

سالنامہ — ساقی کا سالنامہ زیرِ ترتیب ہے۔ مضامین کے لحاظ سے یہ سالنامہ گذشتہ سالناموں سے بڑھ چڑھ کر شائع ہوگا اور ہمیں اُمید ہے کہ تصاویر کے اعتبار سے بھی پچھلے سب سالناموں سے بازی لے جائے گا۔ مفصل اعلان کسی اور صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔

شاہد

۲

قدیم لکھنؤ کی ایک جھلک

آصف الدولہ بہادر کو خط بنوانے میں کمال حاصل تھا کوئی ایسا ویسا حجام سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ دُور دُور سے انتخاب روزگار حجام بلوائے جاتے تھے۔ حکم ہوتا تھا کہ خبردار کھونٹی کا نام نہ رہے۔ جب حجام خط بنا چکتا تو آپ ایک ریشمی رُمال سے دونوں رُخسارے پونچھتے اور اُسکے بعد رومال کو غور سے ملاحظہ فرماتے تھے۔ اگر خط اچھا نہ بنتا تھا، اور کھونٹیاں رہ جاتی تھیں تو رومال میں اُنکی گھرگھراہٹ سے پھوسڑے دکھائی دیتے تھے اور اگر خط اسقدر چھیلا جاتا تھا کہ کھونٹیاں پھٹ جائیں تو پونچھنے سے سفید ریشمی رومال میں خون کے دھبے آجاتے تھے۔ اور آصف الدولہ بہادر غصے میں جو چھرا آگ میں لال کیا ہوا رکھا رہتا تھا پیٹ میں بھونک دیتے تھے، اس خوف سے اچھے اچھے حجام آتے ہوئے کانپتے تھے۔ کسی دُور ودراز مقام سے عتیق اللہ نامی حجام قسمت آزمائی کو لکھنؤ آیا، کوشش اور جستجو سے بادشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کی، طالع کی یاوری اور اہلِ دربار کی سفارش سے بادشاہ نے طلب فرمایا۔ یہ خوشی خوشی حاضر ہوا اور خط بنانے میں مصروف ہوا۔ کچھ اس نرم ہتھکی سے آہستہ آہستہ بنانے لگا کہ آصف الدولہ کی آنکھ بند ہونے لگی۔ خط بنا چکا تو سفید ریشمی رومال طلب ہوا، دونوں رُخسارے خوب صاف کرکے پونچھے گئے لیکن داغ دھبہ خون کا نہ آیا نہ رومال نے پھوسڑے دیئے۔ بہت خوش ہوئے، دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور حکم ہوا آج سے سوا ہمارے کسی کا خط نہ بنانا۔ عتیق اللہ نے تھوڑے زمانہ تک خط بنایا اسکے بعد جب نظر سوٹ ہوگئی تو یہ خیال کرکے کہ ایسا نہ ہو کہ ایکدن دھوکا اُٹھاؤں۔ بہانہ کیا کہ فدوی کی بینائی جاتی رہی۔ اندھے بنکر زندگی بھر دو ہزار روپیہ ماہوار لیا کئے اور اچھے اچھے امیروں کیطرح بسر کی۔

حسین بخش کشمیری بھانڈ نصیر الدین حیدر بہادر کے دربار میں ناچنے گانے پر ملازم تھا۔ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ نصیر الدین حیدر کے رعب وداب کا یہ حال تھا کہ اچھے اچھے بہادر آنکھ ملتے ہی کانپنے لگتے تھے، جہاں سخاوت کا دریا بہتا تھا وہاں حکم بھی نادری ہوتا تھا، عدول حکمی کے جرم میں دم بھر میں آدمی دیوار میں چنوا دیا جاتا تھا۔

ایک دن حسین بخش مجرا کر رہا تھا صحبت خاص تھی بادشاہ شراب کی قلم ہاتھ میں لئے ہوئے ایک گلاس بھرا ہوا اُسکے مُنہ کے قریب لے آئے اور کہا اسکو پی لو۔ کہنے لگا غلام جاں بخشی کی اماں پائے تو عرض کرے حکم ہوا کہو، کہا اِسبات کو خدا جانتا ہو کہ منشی اشیا کے نام سے اس قدر پرہیز ہو کہ حدت کیوجہ سے آجتک لونگ بھی نہیں کھائی۔ اب جیسا حکم عالی ہو، فرمایا ہمکو نہیں معلوم تھا۔ اچھا آج سے اگر ہمارے دور میں حسین بخش ہو تو اُسکے سامنے خالی پانی کا دور چلا دینا۔

ایک روز مجرا ہو رہا تھا عصر کی نماز کا وقت قضا ہوا جاتا تھا اور حسین بخش جیسا مجرائی جو سُولی پر بھی نماز پڑھے۔ لوگوں میں کھچڑی پکنے لگی کہ اگر اس وقت اس نے مجری بند کیا تو بادشاہ عیش منغص ہوگا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نقالوں میں نامی نقال چین سکھ کا جو، شیخ جگن کا جوڑ، روتے آدمی کو ہنسادیں چین سکھ کی لمبی داڑھی اور ثقہ صورت مگر غضب کی پھبتی کہنے والا۔ اُسی وقت نقل شروع کی کہ قربان جاؤں شیعہ سُنّی اپنی مسجدوں میں کیونکر نماز پڑھتے ہیں، ایک شیعہ الگ وضو کرکے نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا

سنّی جماعت نے وضو کئے اذان دی تکبیر کہی اور نماز پڑھی۔ ایک بے نمازی نقال محفل کے ہنسانے کیلئے پھبتیاں کہا کیا۔ اللہ میاں نے اچھی اوٹھا بیٹھی نکالی ہے، نماز کیا ہے فوجی قواعد ہے، انگلی کے اشارے سے اٹھ بیٹھ اوندھا پڑ جا۔ جبتک نماز ہوا کی یہ ہنسایا کیا۔ آخر سلام پھیرتے ہی طبلے پر تھاپ پڑی اور گانا شروع ہوگیا۔

نصیر الدین حیدر نے غالب جنگ، روشن الدولہ، اور راجہ قہرا سے کہا اس نقل کی آل کچھ سمجھے، حسین بخش نے اپنی وضع کو کس خوبصورتی سے نباہا۔

درِ دولت پر ایک شیر بندھا رہتا تھا، گلے میں نفیس بھنور کلی اور بھنور کلی میں فولادی زنجیر لوہے کے کھٹے میں بندھی ہوئی۔ شیر ببر بہت غصّے ور تھا، لیکن نصیر الدین حیدر کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا، اور خوش فعلیاں کرتا تھا۔ بادشاہ جب محل سے برآمد ہونے تھے تو ان کے ہمراہ دو تھیلی بردار سرخ و سفید ریشمی تھیلوں میں اشرفی اور روپے بھرے ہوئے لئے ہوتے تھے، چار خاص بردار دونالی بندوقیں بھرے ہوئے عقب میں ہوتے تھے۔ ایک روز شیر کے معائنے کو تشریف لیگئے، شیر خدا جانے اس وقت کس خیال میں تھا، بادشاہ کو دیکھ کر غرّایا، نصیر الدین حیدر کو فوراً غصہ آگیا اور کہنے لگے نمک حرام ہمنے جنگل سے زیادہ تجھکو آرام دیا، چار آدمی تیری خدمت کو ملازم رکھے۔ دو دُنبے روز کھانے کو دئے، اسکا عیوض تو نے ہمکو دیا، اِرہ تو سہی، یہ کہکر اُسی وقت شکاری کو بلوایا اور کہا شیر کو ہمارے سامنے کھول دو۔ اس نے عرض کیا کہ حیوان درندہ ہے چھوٹتے ہی دو چار پر جھپٹ کریگا۔ اہل شہر کی جان کا خوف ہے۔ فرمایا ہم حکم دیتے ہیں کھولدو۔ شکاری نے شیر کو کھولدیا، کھلکر شیر نے ایک انگڑائی لیکر زور سے جماہی لی حکم ہوا گولی ماردو، خاص بردار نے گولی حلق کے اندر ماردی، شیر تڑپا، اور بہت ملند ہوا۔ ایک چیخ مار کر گرا اور مر گیا۔

مکّا درزی نے گذارش کی کہ خاص پوشاک کے واسطے جو تھان آتے ہیں۔ اُن کے ٹکڑے بچ رہتے ہیں۔ وہ مجھکو مرحمت ہوا کریں، میں ایک ہزار روپیہ ماہوار سرکاری خزانہ میں جمع کردیا کرونگا۔ نصیر الدین حیدر نے فرمایا کہ کیا تو نے مجکو پارچہ فروش سمجھا ہے جو ٹکڑے بیچوں، ہمارے کس کام کے ہیں؟ وہ سب تو لے لیا کر۔

آصف الدولہ بہادر کے زمانے میں خواجہ معین الدین انصاری عامل صوبہ بریلی تھے۔ انکی سخاوت کا یہ حال تھا عشرہ محرم میں عاشورہ کے دن تمام نقد و جنس جائداد منقولہ و غیر منقولہ زن و فرزند بلکہ اپنی ذات سید الشہدا کے نام پر خیرات کردیتے تھے۔ دوسرے روز قرض لیکر فاقہ شکنی کرتے تھے، کچھ دنوں فیض آباد میں رہے، وہاں چوری کا بازار گرم تھا۔ آپ نے ہی حکم دیا کہ آج سے سب لوگ رات کو اپنا دروازہ کھول کر سویا کریں جسکا مال اُٹھ جائیگا ہم نقصان ادا کریں گے، نامی نامی چور بھاگ گئے، بعض قتل ہوئے، بعض کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے، شہر میں چور کا نام باقی نہ رہا جب شہر میں جاتے تھے مسجد اور امام باڑہ اور اپنی قبر بنواتے تھے، کہ زندگی کا اعتبار نہیں، پہلے سے مستعد رہنا چاہیئے۔ نجف اشرف کی تعمیر کیلئے آصف الدولہ بہادر نے روپیہ بھیجا تو آپ نے بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ رقم شریک کی، اس عدالت اس سخاوت اور اس دولت پر مزاج میں اس قدر خاکساری تھی کہ جب کسی عرضی پر دستخط یا کلمہ سفارش لکھتے تو پہلے قلم اُٹھا کر کہتے "داتا بر حق موجود و بیشک" کمر میں چمڑے کا تسمہ باندھتے تھے، شجرفی پوشاک پہنتے تھے، غریبوں کیلئے لنگر خانہ جاری رہتا تھا۔

سودی میں جڑا اول تقسیم ہوتی تھی۔ سال بھر میں ایک مرتبہ عاشورہ کے روز بالکل فقیر ہو جاتے تھے۔

نواب سعادت علیخاں نے لکھنؤ میں ایک نیا بازار قائم کیا۔ اور اُسکا نام سعادت گنج رکھا۔ اُسکی آبادی اور سرسبزی کو دوبالا کرنے کی غرض سے یہ حکم نافذ فرمایا کہ جو پنساری بنیا، سوداگر، اس گنج میں قیام کرے اس پر پولس کو کسی قسم کی کارروائی کا اختیار نہ ہوگا، اور مجرم قصاص اور سزا سے محفوظ رہیگا، قرض کا دعوی مسموع نہ ہوگا۔ اسی لحاظ سے ہندو مسلمان بنیئے۔ اُٹھائی گیرے، سوداگر دُور دُور سے آکر آباد ہوئے۔ اور شہری رونق دوبالا ہوگئی، کوئی شخص بغیر دستخط رابداری ناکے سے باہر نہ جاسکتا تھا۔

مرزا محمد حسن قتیل بہت پابند وضع تھے، غازی الدین حیدر بادشاہ نے دو دفعہ دربار میں یاد فرمایا، عرض کی حصول دولت ملازمت عین سعادت ہے لیکن اپنی آزاد پسند طبیعت سے مجبور ہوں، دربار میں دستار پوشی کا حکم ہے۔ بندہ کلاہ کا خوگر ہے، دربار میں جانے کو بار نہیں اور میں مدارس کا دلدادہ ہوں، اپنی عزت نہیں چاہتا مگر اپنی معلومات کی تعظیم کا طالب ہوں، علم دوست سخن آشنا بادشاہ نے فرمایا تم درباری ضوابط سے مستثنے ہو۔ آخر مرزا جب دربار حاضر ہوئے، بادشاہ نے تعظیم دی، کلام سنا تعریف کی۔ بادشاہی نوازشوں سے مالا مال ہو گئے۔

غازی الدین حیدر بہادر کے روبرو ایکدن ایک تیز طرار آدمی نے عرضی پیش کی جس پر لکھا تھا، ع

شاعر و خوشنویس و نقاشیم

حضور نے جواب لکھوایا، ع

بخت اگر نیست ہر ہنر باشیم

(خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی)

ایک آرزو!

سارے سنسار پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے
جس طرف دیکھو اک تازہ بہار آئی ہے

اسقدر مست ہوا ہے کہ فلک سے گویا
باغِ فردوس سے خوشبوئیں چرا لائی ہے

فطرتِ کہنہ ہے ملبوس قبائے نو میں
عالمِ پیر کو پھر دعوتِ برنائی ہے

دل مچلتا ہے فضاؤں سے لپٹنے کیلئے
موجزن آج کچھ اس طرح کی رعنائی ہے

مینہ برستا ہے کہ ساون کی پری جنت سے
آبِ کوثر کی کوئی نہر بہا لائی ہے

بیخودی کہتی ہے ہر ذرے کے بوسے لیجے
کیسی ہر ذرہ پہ رنگینی ہے رعنائی ہے

نت نئے پھولوں سے لبریز ہے گلشن کہ ہوا
اپنے دامن میں کوئی خلد اٹھا لائی ہے

یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک کسر ہے باقی
دل کسی اور کسی کا بھی تمنائی ہے

گلِ نظارہ سے تکمیل کی بُو آ جائے
اس سمے میں جو کسی سمت سے تُو آ جائے

اختر شیرانی

افلاس سے خطاب

از شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام

اے افلاس تو نے مجھے یہ عظمت بخشی ہے۔

عیسٰے کے سر پر کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ مرحبا اُسی زینت سے تو نے مجھے بھی سرفراز کیا، اور وہ جواں مردی عطا کی جو تو حقیقی کی پروردہ ہو۔

میری نگاہ کو تو نے دزدیدہ و آتش فگن اور میری زبان کو تند خو بنایا۔ اور یہ تیری تربیت کا اثر ہے کہ میرا نغمہ شمشیر سے زیادہ تیز ہو گیا۔

اے ستمگر! تیری قیامت خیز تپش نے میرے کندن جیسے جسم کو گلا ڈالا۔ بتلا بتلا وہ حسن جمال جاں آفریں کیا ہوا؟

ان لاغر ہاتھوں تک جب لب ساغر نہیں آیا۔ او لئیم! تو نے کیسی بیدردی سے اُسے چورچور کر ڈالا۔

وہ فردوس بریں اب میرے لئے ایک طلسم خیال ہوا اور بس!

اب تو میری آنکھیں میری ہی متاع حسن پر آگ برساتی ہیں۔

میری آرزو ایک کلی تھی جو درد کی شاخ میں جھول رہی تھی، ظالم ابھی وہ کھلنے نہ پائی تھی کہ تو نے بھوک کی کلہاڑی سے اسے شاخ سمیت کاٹ ڈالا۔

کڑکڑاتے جاڑوں کی صبح کی طرح میرا دل لرزتا تھا اور اشک فشاں زمین کو بادِ مہر بوسے دیتی تھی، شبنم کی بوندیں دردکا دریا تیر رہا تھا، آہ تو نے سورج بنکر اسے خشک کر دیا۔ خوشی و راحت کی سپنا پوری اُجڑ گئی۔

میرے حلق میں سم قاتل ٹپکاکر تو پوچھتا ہے "آب حیات میں کیا رکھا ہے؟ نہ کوئی سوزش ہے نہ کوئی سرور نہ کوئی خمار! بدبخت! اس دُکھ کی ماری دُنیا میں بقائے دوام تیرے بس کی چیز نہیں ہے"

تو نے افلاس کی گود میں پرورش پائی ہے۔ کانٹوں کے بیچ میں بیٹھ کر آنسوؤں کے ہار گوندھتا: روزِ ازل ہی تیری جبین پر درد کا ٹیکا لگ چکا ہے"۔

ہمیشہ مصروفِ شکوہ سنجی رہ۔ یہانتک کہ حلق میں کانٹے پڑ جائیں۔

اے غیظ و غضب کی صورت! کشکول گدائی لے کر در در کی ٹھوکریں کھا۔ جہاں عاشقوں کیلئے لیلیٰ شب مسرت کا پیغام لے کر آئی ہو وہاں جاکر دستک دے اور کہہ:۔

"نادانو! یہ دنیا عیش کدہ نہیں ہے۔ یہ دنیا اس لئے ہے کہ فراق میں تڑپو اور جدائی کے صدمے جھیلو، محبوب کے آغوش میں کانٹے ہیں، اُن سے بھی بغلگیر ہو"

تو شمع یہ کہہ کر دم توڑ دیتی ہے کہ موت کی یہ رات کاٹے نہیں کٹتی،

بھوک کا سا نحیف و لاغر جسم راہ میں کیسے دیکھ کر یکایک چیں بہ جبیں ہو جاتا ہے، اور افلاس دونوں آنکھوں میں شرار بن جاتا ہے۔

پھر تو یکبارگی طوفان۔ قحط اور وبا کے قہقہے سنائی پڑتے ہیں، اور گلشن تباہ ہو جاتے ہیں، محلات کا نام و نشان نہیں رہتا۔

افلاس! تیرے آئین میں صرف ایک سزا ہے، موت، اور بس!

تہذیب و تمدن کو تو خاطر میں نہیں لاتا کہ رقصِ عریاں تیرا محبوب مشغلہ ہے، شرم و حیا کے نام سے بھی تو واقف نہیں ہے۔

جو بھی سر بلند ہوا تیرے قدموں تلے کچل دیا گیا۔ منزلِ دنیا کے مسافر تیرا ارشاد بجا لا کر ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔

اے افلاس! بھوک کے ایندھن سے موت کی آگ سلگا کر تو کتنا مسرور ہوتا ہے۔ دولت کی دیوی کے تاج کو کیسی بیباکی سے تو ٹھکرا دیتا ہے۔

اب کہہ کہ شاعری کی دیوی کے رباب کے کن تاروں کو تو چھیڑنا چاہتا ہے جو اُن کے سائے سے راگ لرزہ براندام ہو رہے ہیں۔

کل صبح آنکھ کھلی تو شہنائی کا جگر سوز ترانہ سننے میں آیا جیسے کوئی آج بھی گھر نہ لوٹا ہو اور شہنائی اُسے پکار رہی ہو۔

دُلہن کا دل شہنائی کے سُروں میں یوں تڑپنے لگا جیسے آج پیتم دور ہی سے جواب میں "آیا، آیا" کہہ رہا ہو!

سکھی! اللہ بتا! آنکھیں یوں کیوں پونچھ رہی ہے کہ کاجل بھی بہ گیا؟ اور آج صبح بھی اُٹھ کر سُنا کہ شہنائی "آ دا! آ دا!" کہہ کر رُو رہی ہے۔

سوگوار پھول ہو کے تبسم کیطرح ٹپک پڑا! اس کی خوشبو کتنی نشہ آور تھی!

اللہ اللہ! اس دلِ ناداں کو دیکھنا کہ کتنا بیقرار ہو رہا تھا اور آمدِ بہار کے گیت کیسے مزے لے لے کر گا رہا تھا۔

مگر آہ خود بخود آنکھیں پُرآب کیوں ہوئی جاتی ہیں؟ میرا دامن کوئی زمین کے آنچل سے کیوں باندھ رہا ہے؟ یکایک میں سہم جاتا ہوں۔

شاید وہ میری ننھی بچی ہے — میری لختِ جگر،

آہ۔ میری بچی جاگ اُٹھی، اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا، اسے میں دودھ کی دو بوند بھی نہ دے سکا۔

مجھے مسرور ہونیکا کیا حق ہے، گویا غربت اس بچی کی صورت میں میرے گھر میں پیدا ہوئی ہے اور مجھے ہمیشہ افلاس کا نوحہ سیکھنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔

میرے نصیب میں نہ عیش و حسن ہے اور نہ مے و ساغر، مجھے پینے کیلئے زہر ملتا ہے اور کھانے کے لئے غم و یاس۔

آج بھی وہ شہنائی درد بھرے سُروں میں گاتی ہے "کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے"! +

۱؎ شاعر کی زندگی کا ایک صحیح واقعہ + مترجمہ:- اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے۔

سنجوگ

منّو بالا مالن کی بیٹی جھونپڑوں میں پلی تھی۔ اُس نے کبھی محلوں کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی، پھولوں کی سیج پر سونے میں کیا مزا آتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ گلے میں پھولوں کے گجرے سے کس قسم کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دوسروں کی سیجوں کے لئے پھول توڑنا اور دوسروں کے گلے کے لئے گجرے تیار کرنا اُس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ غنچہ و گل کی نکہت و صباحت میں اُس نے اپنی زندگی کے سترہ سال گذار دیے تھے۔ اور گذشتہ دس سال میں اُس نے جتنے کنٹھے گوندھے غالباً اُن کا شمار بھی مشکل تھا۔ یقیناً اُسکے ہاتھوں توڑے ہوئے پھولوں کی تعداد رات کو آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی تعداد سے بڑھ گئی ہوگی۔ لیکن اُس نے اپنی ذات کے لئے کبھی ایک ہار بھی بنانے کی جرأت نہ کی۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں تک کو سونگھنا اس کے لئے حرام تھا۔ کیونکہ وہ کنواری تھی۔ ابھی اُسکا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سہاگ کی رات آنے سے قبل پُرانے لوگوں کی بنائی ہوئی رسوم کے مطابق اپنے آپ کو تمام عمدہ چیزوں سے محروم رکھنا اس کا فرض تھا۔ تاہم وہ پھولوں کی خوشبو سے نا واقف نہیں تھی۔ کیونکہ روزانہ جب باغیچے میں جاتی تو ہوا کے خوشگوار جھونکوں میں ملی ہوئی پھولوں کی مہک از خود اُس کی ناک میں پہونچکر مشامِ جان بن جاتی تھی۔ گویا وہ آسمانی ستاروں کی چمکدار گینددں کو صرف دور سے دیکھتی تھی۔ اُن سے کھیلتی نہیں تھی۔

علی الصبح چمن میں جانا اُس کا معمول تھا۔ وہ رات بھر میں کھلے ہوئے ہر قسم کے تمام پھول توڑ لیتی۔ کچھ گجروں کے لئے کچھ گلدستوں کے لئے، کچھ منتشر حالت میں فروخت کرنے کے لئے۔ چمن سے واپس آکر وہ اپنے اور باپ کے لئے کھانا تیار کرتی۔ کیونکہ ماں مر چکی تھی اور داسی رکھنے کا مقدور نہیں تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوئی تاگہ لیکر بیٹھ جاتی۔ اور سہ پہر تک پھولوں کی ترتیب میں محو رہتی۔ شام ہوتے ہی اس سامانِ تزئین کو ٹوکری میں لگا کر وہ چوک چلی جاتی اور شاید ہی کوئی دن ایسا منحوس ہوتا ہوگا کہ اُس کا سب سامان فروخت نہ ہوتا ہو۔ بھلا کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنے سُریلے ترنم میں پھولوں کی آواز لگائے اور آنے جانے والوں کی توجہ اُس کی طرف مبذول نہ ہو۔ بعض لوگ تو صرف اس لئے پھول خرید لیا کرتے تھے کہ بیچنے والی ایک عورت ہے۔ اور وہ بھی نوشگفتہ غنچہ کی طرح نوخیز۔ نسائیت میں یوں ہی کیا کم جاذبیت ہوتی ہے، کہ عالمِ شباب سونے پر سہاگہ کا کام دے دیتا ہے۔ ان کیفیات میں ایک ہی بار جلوہ نمائی سے کچھ دیر کے لئے سنگین بُت میں بھی ہم آغوشی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے پجاری کے قدموں میں گِر کر پاؤں چوم لوں۔

چوک سے واپس آکر وہ پھر دوزخِ شکم کی آسودگی کے لئے کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو جاتی۔ اکثر وہ سوچا کرتی کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ چکّی کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھوما جائے، اور کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو۔ وہ سونے کے لئے لیٹتی تو ٹوٹی ہوئی چارپائی پر عمدہ بستر بھی نہ ہوتا تھا تاہم اُسے جلدی ہی نیند آجاتی تھی۔ کیونکہ غیر ارادی طور پر پھولوں میں بسے ہوئے دامن اُس کے دماغ کو معطر کر دیا کرتے تھے۔ غنچوں کی نکہت میں رہتے رہتے وہ خود ایک غنچہ بن گئی تھی۔ لیکن گل چیں کے دستبرد سے محفوظ۔

۲

ایک روز شام کے وقت حسبِ معمول وہ پھول بیچنے گئی۔ اُس دن یا تو مانگ ہی زیادہ تھی یا خود اُس کے اُترے ہوئے چہرے کی بڑھی ہوئی رعنائیوں نے لوگوں کو گرویدہ کر لیا۔ بہرحال خلافِ توقع سب سامان بہت جلد فروخت ہو گیا صرف ایک مختصر سا ہار باقی تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ ایک گاہک کے انتظار میں وقت گنوانا اچھا نہیں۔ آج کی اُجرت بھی روز کی نسبت زیادہ ہو گئی ہے بہتر ہے کہ یہ بچا ہوا کنٹھا مندر میں جا کر دیوی کے گلے میں ڈال دوں۔ پوجا کئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ وہ جلدی ہی اس فیصلے پر پہونچ گئی۔ لہٰذا دیوی کے چرنوں میں خراج پیش کرنے کی نیت سے چوک کے شور و غوغا کو چھوڑ کر اُس نے پُر سکوت مندر کی راہ لی۔

ابھی وہ راستہ ہی میں تھی کہ ایک شخص نے اُسے ٹوکا۔ سُر بالا اُسے جانتی تھی۔ وہ غیر تھا۔ مگر اپنوں سے زیادہ۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ دونوں بچپن میں ساتھ کھیلے تھے۔ ایک ہی باغیچہ میں، ایک ہی فضا میں۔ منوہر ٹھیکیدار کا لڑکا تھا، امیر تھا۔ اُسے بھی سُر بالا سے محبت تھی۔ لیکن اُس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا کہ ایک مالن کی لڑکی کو شریکِ حیات بنایا جائے۔ وہ رسم و رواج کے مطابق رشتہ جوڑے بغیر اُسے اپنا بنا لینے کا آرزومند تھا۔ لیکن سُر بالا اس کو کیوں گوارا کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ لغزش ہو جانے کے بعد زندگی ہمیشہ کے لئے لائقِ نفرین ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ ہوا منوہر کی شادی ہو چکی تھی۔ سُر بالا کو اس حقیقت کا علم تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا ایسی باتیں پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اِس لئے اگر منوہر صرف اپنی ذات کے لئے ہار کی فرمائش کرتا تو وہ کبھی دریغ نہ کرتی۔ بلکہ اگر پھول نہ ہوتے تو وہ اُسی وقت چمن میں گل چینی کے لئے جاتی۔ اور اگر پھول کھلے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اپنے قلب کی تپش سے، اپنے تنفس کے جھونکوں سے، اپنے آنسوؤں کی طراوت سے اور سب سے زیادہ اپنے حُسن کی گرمی سے اُن کو قبل از وقت شگفتہ کر دیتی، یا آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو نوچ لیتی۔ یا اپنی رگوں میں دوڑنے والے خون کو منجمد کرتی اور گلاب کی پتیوں کی شکل میں کاٹ کتا گے میں پرو لیتی۔ وہ کبھی گوارا نہ کرتی کہ منوہر کا دل میلا ہو، اُسے رنج پہونچے۔ لیکن اب جانتی تھی کہ وہ پھولوں کا ہار کس ہستی کیلئے طلب کر رہا ہے۔ آتشِ رقابت اُس کے سینے میں بھڑک اُٹھی، اُس نے تہیہ کر لیا کہ پھولوں کو مسل کر پھینک دونگی۔ لیکن اس کو نہیں دوں گی، اُس نے صاف انکار کر دیا، وجہ بھی معقول تھی۔ اُس نے کہا۔

"میں نیت کر چکی ہوں کہ یہ ہار دیوی کے گلے میں پہناؤں گی، اس لئے مجبور ہوں، تمہیں نہیں دے سکتی۔ کسی اور جگہ سے لے لو۔"

منوہر نے کہا: "سُر بالا! تمہیں ہار دینا ہوگا۔ میں بھی اپنی دیوی ہی کے لئے مانگ رہا ہوں۔ میری دیوی تمہاری دیوی سے زیادہ سُندر ہے۔"

ان الفاظ سے اُسکے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار منوہر کو نام لیکر مخاطب کیا۔

"منوہر! اپنی دیوی کے گلے میں جوتیوں کا ہار پہنا دو، اُس کو کہنا پھول بکنے بند ہو گئے چمن میں خزاں آ گئی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے منوہر کا ہاتھ جھٹک دیا اور بظاہر مُسکراتی ہوئی چل پڑی۔ لیکن چند ہی قدم کے بعد اپنے دامن میں آنسو جذب کرنے کی خاطر رُکنا پڑا۔

۳

وہ مندر کے دروازے پر پہونچی، اندر داخل ہوئی۔ اور بادلِ ناخواستہ ہار دیوی کے گلے میں ڈالدیا۔ اُس نے پوری طرح پوجا کی رسم



محترمہ طاہرہ دیوی شمرانی

بھی دہ خاموش رہی۔ اُس کا دل تو آنسو بہانے کے لئے بیتاب تھا۔ وہ جلدی ہی باہر آ کر گھر چلی گئی۔

اُس نے صبح کی پکی ہوئی باسی روٹی اپنے باپ کو کھلا دی۔ خود کچھ نہ کھایا۔ باپ کے پوچھنے پر بہانا کر دیا کہ میری طبیعت خراب ہے، سر میں درد ہو رہا ہے۔ یہ ایک ہی عذر ایسا ہے جس کو سننے والے جلدی تسلیم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ کسی قسم کا درد دکھائی نہیں دیتا۔

وہ سونے کے لئے چارپائی پر لیٹی تو برابر روتی رہی۔ کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے منوہر کی بیوفائی پر اسقدر آنسو بہائے۔ اس کا دل بھرا چلا آتا تھا۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی کہ کہیں باپ کو خبر نہ ہو جائے۔ کئی بار بے اختیاری کے عالم میں چیخ نکل جانے کے قریب تھی کہ اُس نے ضبط سے کام لیکر اُسے روک لیا۔ لیکن متلاطم سمندر کی طغیانی کہیں لکڑی کا بند لگانے سے روکی جا سکتی ہے۔ ایک زبردست سیلاب گریہ تھا، جو اُسے جھونپڑی سے بہا کر کسی ایسے ساحل پر لے جانا چاہتا تھا۔ جہاں سہارا دینے کے لئے منوہر کا ہاتھ ہو۔ اُس کے رباب حیات میں ترنم ریزیاں بیدار ہو رہی تھیں۔ زندگی کے تاروں میں جنبش تھی، کائنات کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ جبتک وہ ناشنیدہ نغمے جو اب تک بیرونِ ساز نہیں ہوئے فضا میں منتشر نہ ہونگے۔ تجھے کامل سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ اُس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیقراریاں بڑھتی گئیں، اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اندر ہی اندر دل کو مسوس رہا ہے۔

وہ پشیمان تھی کہ اُس نے منوہر کو ہار کیوں نہ دے دیا۔ فرمائش کرنے والا تو وہی تھا۔ اس سے کیا غرض کہ وہ کس کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے کبھی کسی گاہک سے نہیں پوچھا تھا کہ تم پھول کیوں خرید رہے ہو۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا مصرف مختلف ہے۔ کوئی قبر پر چڑھاتا ہے، تو کوئی مندر میں دیوی کے سامنے پیش کرتا ہے، کوئی دوا بنانے کے لئے آگ پر رکھتا ہے، اور کوئی لطفِ خواب حاصل کرنے کے لئے سیج پر بچھاتا ہے۔ کاش! آج اس کے دل میں پوجا کا خیال پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ وہ منوہر کو بالکل اجنبی سمجھتی اور ہار اُسکے ہاتھ فروخت کر دیتی۔ یا ان سب سے زیادہ یہ کہ باغیچہ میں کوئی پھول نہ کھلا ہوتا، تو بہتر تھا۔ وہ گھر سے نہ نکلتی، باہر ہی نہ جاتی، منوہر سے نہ ملتا۔ لیکن جو ہونا تھا سو ہو چکا۔

جوشِ اضطراب سے اس کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہونے لگے جو انسان کو لامذہب اور بے دین کر دیتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ پتھر کی بے جان دیوی پر پھول چڑھانا بالکل حماقت ہے، جبکہ اُس میں احساس کا مادہ ہوتا ہی نہیں، اس کے چہرہ پر ناک ہوتی ہے مگر سونگھنے کی قوت نہیں۔ لہٰذا چنبیلی کی کلیاں ہوں یا دھتورے کے پھول، اس کے لئے سب یکساں ہیں۔ اور پھر اس کو جاندار انسان سے زیادہ مرتبہ کیوں دیا جائے۔ کسی تصویر کے نقوش ـــــ جو نتیجہ ہیں مصور کی رعنائیِ خیال کا ـــــ کبھی اپنے نقاش سے زیادہ فضیلت حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مندر میں پوجا پاٹ سب لغو چیز ہے۔ انسان کو انسان ہی کی عبادت کرنی چاہیئے۔

اُس نے ایک فلسفی کی طرح یہ بھی سوچا کہ اگر منوہر بے وفا ہے تو ہوا کرے۔ میں اُس جیسی کیوں ہوں۔ چاند سورج چھپنے کے بعد دوبارہ نکل آتے ہیں۔ ممکن ہے، منوہر کا پھرا ہوا دل بھی کچھ عرصہ بعد میری طرف مائل ہو جائے۔ ہائے افسوس! اگلی چینی کرتے زمانہ گذر گیا، میری آنکھوں نے خزاں کے بعد بہار دیکھی مگر اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔

(۴)

اس کا اضطراب بڑھتا گیا، حتیٰ کہ اُس نے محسوس کر لیا کہ اگر اس احمقانہ غلطی کا ردِ عمل نہ کیا گیا تو زندگی یقیناً دوبھر ہو جائیگی۔ اور صبح پکڑنی مشکل ہو جائے۔ لہٰذا وہ چارپائی سے اُٹھی، لیکن اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سانس روکے ہوئے آہستہ قدم، دامن کو

نہایت احتیاط سے اُٹھا کر، مبادا کسی چیز کے ساتھ اُلجھ کر کھٹکا پیدا نہ کر دے۔ وہ باہر آگئی۔ چاندکی روشنی زمین پر چھٹکی ہوئی تھی۔ پھر بھی اُتھکا عالم تھا۔ کوچہ و بازار میں بالکل سناٹا تھا۔ فضائے بسیط بالکل ساکت و خاموش، کائنات کا ہر ذرّہ محوِ خواب تھا۔ بارہ بجے کا عمل، وہ تنِ تنہا، ڈری ہوئی، سہمی ہوئی، مندر کی جانب چل پڑی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر اس سنسان میں کوئی بدمعاش، خبیث انسان اس کو سرِ بازار دیکھ لے، بالکل بے باکانہ طور پر آدھی رات کے وقت جاتا ہوا، اور دست درازی کر بیٹھے تو عزّت بچانی مشکل ہو جائے گی۔ نیند کے ماتے اُس کی چیخ پکار کو سُن سکیں گے۔ اُس کے تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ شرم و حیا سے پسینہ آگیا۔ رُک گئی۔ کچھ سوچا۔ پھر چل پڑی۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ اگر آج کی رات اپنے ہاتھ کے توڑے ہوئے پھول بلکہ وہی پھول جو مندر کی چار دیواری میں دیوی کے گلے میں ڈال دئے ہیں، منوہر کی پُرشباب خلوت میں نہ پہونچا سکی تو ہمیشہ کے لئے گُل چینی ترک کر دونگی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ قرب و جوار کی کسی چیز پر نظر ڈالنی نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کی تمام قوت ٹانگوں میں مجتمع کر دی اور ایسے تیز قدموں کے ساتھ جس کو دوڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہ گرتی پڑتی مندر کے دروازے تک پہونچ ہی گئی۔

۵

کواڑ بند تھے۔ لیکن اچھی طرح نہیں۔ کیونکہ اندر جلنے والے چراغ کی مدہم روشنی جھری میں سے ہو کر باہر آرہی تھی۔ اور یہ ثبوت تھا اِس امر کا کہ کنڈی کھلی ہوئی ہے۔ اور کنڈی لگانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ سومنات کا مندر تو تھا ہی نہیں، جس میں جواہرات کے بُت تھے، وہاں کی کُل کائنات کی قیمتِ اصلی اُن کو چُرا کر لے جانے والے کی مزدوری سے بھی زیادہ نہ ہوتی۔ ایسی صورت میں کس سُلطانِ غزنی کا ڈر تھا کہ اس مذہبی متاعِ خاص کی رکھوالی کی جاتی۔ دروازے کے قریب نگہبان پُجاری کی چارپائی تھی، اور وہ بےخبر محوِ خواب تھا۔

سُربالا کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے سوچا اگر یہ مذہبی پیشوا بیدار ہو گیا تو اپنی بریّت میں کس حیلے سے کام لوں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پوجا کا بہانہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ آدھی رات آچکی تھی، اور اس وقت دیوتا اور دیویاں بھی سو جاتی ہیں۔ نذر کون قبول کرے۔ وہ سچ بات بھی بیان نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بوڑھا جس کے جذبات فنا ہو چکے تھے، یہ تسلیم کرنے سے معذور تھا کہ جب محبّت دل میں گھر کر لیتی ہے تو آنکھوں پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں سوائے مسلکِ عشق کے مذاہب و ملّت کا کوئی آئین نظر میں نہیں جچتا۔ ہزاروں دلیلیں، اور سینکڑوں نظرئے سُن لینے کے بعد وہ یہ نہ مانتا کہ محبّت کی خاطر مقدس معبد میں کس قسم کی چوری جائز ہو سکتی ہے۔ تاہم سُربالا نے پس و پیش میں زیادہ وقت نہیں گنوایا اور دوراندیشی کی تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر دروازے کو کھولنے کی غرض سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ کواڑ پر رکھدیا۔

اُسکی آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور دماغ اُسی کیفیت میں مُبتلا تھا۔ جو تیز جھولے میں سے ... گر جانے کے بعد طاری ہو جاتی ہے۔ اُس نے لبوں پر زبان پھیر کر سانس کو سنبھالا اور دو چار بار پلکوں کو جلدی جلدی جھپکا کر قوتِ بینائی میں وہ لوچ پیدا کر لیا جس سے انسان معمول سے زیادہ دیکھنے لگتا ہے۔ اُس نے ہاتھ کے دباؤ میں اضافہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جِھری میں بتدریج فصل پیدا ہونے لگا، اُس کا دل چور تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ میں ایک جُرم کا ارتکاب کر رہی ہوں، جو دُنیا والوں کی نگاہ میں ناقابلِ معافی ہے لیکن محبت کی خاطر جس کی دُنیا میں ہر مجلسِ قانون ساز کے آئین بدل جاتے ہیں سب کچھ روا ہے۔

دروازہ کھل گیا۔ لیکن اس قدر آہستہ گویا وہ کھلا ہی نہیں۔ وہ اندر داخل ہوگئی۔ ایک غیر مرئی سایہ کی طرح۔ مدہم روشنی تھی، چاروں طرف اُداسی چھائی ہوئی۔ کڑوے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ اور اُس کی لَو کے ارتعاشِ پیہم کے باعث پتھر کی مورت سے لیکر چھت میں آویزاں گھجر تک ہر چیز کا سایہ سامنے کی دیواروں پر رقص کر رہا تھا۔ اس نے اُن میں سے کسی چیز پر نگاہ نہیں ڈالی۔ اسوقت افسانوی کلمہ سے زیادہ اس پر ذاتی جذبات کا بھوت سوار تھا۔

اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھی اور مورت کے بالکل قریب جاکر اس نے پُرسکوت لہجہ میں کہا۔

"دیوی! میں قربان، تو اپنے گلے کا ہار مجھے دیدے، میں یہ اپنے محبوب کو پیش کر دوں گی۔ اور ہاں اے پتھر کی بے جان مورت!" اس نے مستفسرانہ لہجہ میں کہا "کیا کبھی تجھ کو بھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟ لیکن نہیں نہیں بھولی۔ تیرے پاس تو وہ دل و دماغ ہی نہیں ہیں جن پر محبت کے نقوش ثبت ہو سکتے ہیں۔ تیرا جسم تو پتھر کا ہے۔ سخت پتھر کا!" گویا اُس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیدیا۔

۶

وہ سیڑھی پر چڑھ گئی۔ اور اپنا دایاں ہاتھ مورت کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کی انگلیاں جو باوجود موسم گرما کے سخت سرد ہو رہی تھیں، ہار کے پھولوں سے مس ہوئیں، فوراً قوتِ برق کی سی ایک تیز لہر سر کی چوٹی سے پاؤں کی ایڑی تک تمام جسم میں جسم کے ہر رونگٹے میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی۔ اور جس طرح ساحلِ دریا پر کھڑے ہو کر پانی کی روانی کو دیر تک دیکھتے رہنے سے چکر آنے لگتے ہیں۔ وہی کیفیت اس پر بھی طاری ہو گئی۔ اگر اس وقت وہ ہوشیاری سے کام لیکر مورت کے آگے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ نہ لیتی تو یقیناً توازن کے بگڑ جانے کے باعث نیچے گر پڑتی۔ اس وقت خدا جانے کیا حشر ہوتا۔ کیونکہ لازمی امر تھا کہ اس دھماکے سے نگہبان پجاری کی آنکھ کھل جاتی اور پھر سارا حال بھی منکشف ہو جاتا۔

اُس نے سوچا کہ یہ ارادہ ترک کر کے واپس چلا جانا چاہیئے۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ تمام محنت اکارت جاتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے وہی بے چینی، وہی جان لیوا اضطراب۔ بھلا وہ کب ساتھ چھوڑے گا زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لہذا اُس نے اپنی ہمت بلند کی۔ استقلال سے کام لیا۔ اور اس طرح جیسے بلی چوہے پر جھپٹا مارتی ہے۔ اُس نے دیوی کے گلے میں سے اپنا پیش کیا ہوا ہار اُتار لیا۔

اب دوسری مُہم مندر سے باہر جانے کی تھی۔ اُس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھوں کی آخری سوئیاں نکالنے میں غفلت ہو جائے اور حصولِ مقاصد سے محروم رہ جاؤں۔ لیکن خود ہی عقائد کی غیر مدلل قوت کو بروئے کار لاکر اُس نے خیال کیا کہ جس پرمیشور نے یہاں تک پہونچنے میں کامیابی دی ہے، وہی میری دلی آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دے گا۔ عقائد خواہ کتنے ہی ناقص اور غیر بنیادی کیوں نہ ہوں، وقت پر عزم کو راسخ کرنے کیلئے کام آہی جاتے ہیں۔ بھلا سوچنے کی بات ہے۔ اگر کوئی شخص سرِ بالا سے سوال کرتا کہ کیا پرمیشور ہی چوریاں کراتا ہے تو اُس کے پاس اپنی ناقص منطق کا کیا جواب ہوتا۔

چنانچہ اندر داخل ہوتے وقت اُس نے جس احتیاط سے کام لیا تھا، اُسی طرح آہستہ آہستہ دروازہ کھول کر دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ اور صبح ہونے کے بعد بھی پجاری کے فرشتوں کو علم نہ ہوا کہ رات کے وقت مندر میں چوری ہو گئی ہے۔ کیونکہ پھولوں کا معمولی ہار کچھ ایسی زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ اسکی غیر موجودگی کسی کی نظر میں کھٹکے۔

وہ ایک بار پھر ڈرتی ہچکتی اُسی راستہ سے واپس پلٹی جس پر سے خوف وہراس کے عالم میں گذری تھی۔ اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ بدن کے ایک ایک عضو میں لرزش تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے سے ہوکر منوہر کے مکان پر پہونچی۔ کیونکہ وہ زیادہ دُور نہیں تھا۔ ہر قدم پر ہیجانِ جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب اُس نے دروازے کی جھری کے قریب آنکھ کی اور جھانک کر صحن میں دیکھا تو اُسکے جوش میں کبھی نہ ساکن ہونے والے سیماب کی طرح ایک جاں سوز تڑپ پیدا ہوگئی۔ شاید وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اب میں بھی جوان ہوگئی ہوں۔

اُس نے دیکھا کہ منوہر اپنی شریکِ حیات کے گلے میں باہیں ڈالے محوِ خواب ہے۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ اب کیا تدبیر کرنی چاہیئے۔ دستک دیکر اُنہیں بیدار کر دینا نہ صرف زبردست حماقت بلکہ ایک حد تک غیر موزوں امر بھی ہے۔ اور بغیر تکمیلِ مقصد کے واپس چلے جانا گویا ہلاکتِ آرزو اور پامالیِ تمنا کے مترادف تھا جس میں شکستگیِ جذبات کی تھوڑی سی تلخی بھی شامل ہو۔ اور یہ کوئی شخص بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں تھی۔ کہ باہر سے کھڑے ہوکر ہار کو صحن میں اس طرح پھینکے کہ وہ منوہر کے اوپر جا پڑے۔ لیکن اندیشہ تھا کہ اندازہ ٹھیک نہ ہو اور وہ کسی دوسری طرف جا گرے۔ یا ممکن ہے بالاخانہ کی چھت پر جا پڑے۔ وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ مُرغانِ سحر کے چہچہے اُسے سُنائی دینے لگے۔ صبح کی سفیدی نمودار ہونے والی تھی۔ وہ گھبرا گئی، پریشان ہوئی، اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگی کہ تمام وقت سوچنے ہی میں گذار دیا۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جائے گی۔

اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کے اوپر سے ہار صحن میں پھینک دیا۔ اُس کے گرنے کی آواز سُنائی دی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں؟ وہ اب بالکل ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ اس کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ کہیں پتا جی بیدار نہ ہوجائیں۔ اگر انہوں نے اُٹھکر دیکھ لیا کہ سرہالا کی چارپائی خالی ہے تو صدہا قسم کے شکوک اُن کے دل میں پیدا ہوجائیں گے۔ کبھی خیال کریں گے کہ لڑکی آوارہ ہوگئی ہے، کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کبھی سوچیں گے کہ شاید پریشانیوں سے تنگ آکر خودکشی کرلی، قریب کی ندی میں جاکر ڈوب مری۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئے گی کہ وہ محبت بھرے دل کے ساتھ بارگاہِ عشق میں اپنا پہلا خراج پیش کرنے گئی ہے۔ کیونکہ انسان جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ اُسکے حافظ کی کمزوری رفتہ رفتہ سابقہ رنگینیوں کے نقوش کو لوحِ قلب سے مٹاتی جاتی ہے۔

وہ ہانپتی کانپتی اپنے جھونپڑے میں پہونچی اور اطمینان کا سانس لیا، یہ دیکھ کر کہ ابھی بوڑھا باپ بیدار نہیں ہوا ہے۔ اُس نے جلدی سے مُنہ دھویا۔ آنکھیں صاف کیں تاکہ بے خوابی کے باعث ان کے اندر نمودار ہوجانے والے سُرخ ڈورے غمازی نہ کرنے لگیں۔

اس کام سے فارغ ہوکر اُس نے اپنی ٹوکری اُٹھائی اور سیدھی چمن میں چلی گئی۔ نہیں معلوم فریبِ نظر تھا یا کیا۔ آج کائنات کا ایک ایک ذرہ اُسے درخشاں نظر آرہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا گذشتہ رات ہی سے موسمِ بہار شروع ہوا ہے۔ اور اس سے قبل خزاں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ غنچے غیر معمولی طور پر زیادہ متبسم ہیں۔ شاید اُس کی کامرانی پر ہنس ہنس کے مُبارک باد دے رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے پروں میں قوس قزح کا رنگ بھر گیا تھا۔ اور بازوؤں میں بجلی کی سی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ بادلوں سے ترکیب پانے والے پہاڑوں کی وادیوں میں فرشتے رقص کرتے اور گاتے دکھائی دئے۔ وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس وقت میرا ہی وجود اس آسمانی مخلوق کے لئے موضوعِ رقص و موسیقی بنا ہوا ہے۔ لیکن آخر یہ تمام تغیر نظامِ قدرت میں کس وجہ سے ہے۔ اور کائنات کے ذرّے کس کے دل کی دھڑکن اور کس کی ضربات نبض کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانے کیلئے بیتاب ہیں؟۔

قبل اس کے کہ اس کا ذہن ان سوالات کے جواب تحقیق کرے، شرم کا پسینہ اُس کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ بجائے ہوئے اُس نے اپنا دامن سنبھالا اور گلاب کی پتیوں کو چٹکی میں مسلتی رہ گئی۔ افسوس ہے کہ اس فضائے نکہت و صباحت میں اس رنگِ رُخ کے آثار چڑھاؤ کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہاں کوئی اتنا بھی نہیں تھا۔ کہ اگر اُس کی انگلی میں کانٹا چُبھ جائے تو اس تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کر کے اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔

شام کے وقت حسبِ معمول وہ گجرے وغیرہ لے کر چوک گئی۔ لیکن آج شاید سرمہ در گلو تھی۔ اُس کی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ اور اگر نکلتی بھی تو اس پرندہ کی طرح جو کہ ایک اسیرِ دام ہو جانے کے باعث چہچہانا بھول گیا ہو۔ اُس نے گاہکوں کے ساتھ بے اتفاقی برتی۔ وہ معمولی ہار کی قیمت اس قدر زیادہ بتاتی کہ لوگ بگڑ کر چلے جاتے۔ دو ایک منچلے نوجوانوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پھولوں کا مول کر رہی ہو یا خود اپنے حسن کا۔ اور اگر سربالا اپنے خیالات میں محو نہ ہوتی تو یقیناً یہ ناشائستہ الفاظ اُسے برہم کر دیتے۔

وقت گذرتا گیا اور ایک پیسے کی بھی بوہنی نہ ہوئی۔ لیکن اُس نے واپس جانے کا نام نہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی منتظر ہے۔ اور یہی تھی بھی حقیقت۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد منوہر آن پہونچا۔ اُسے دیکھ کر سربالا نے زمین پر ٹوکری رکھدی۔ اور خود اس طرح علیحدہ کھڑی ہو گئی۔ گویا نظر بچا کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ منوہر نے ایک گجرا اُٹھاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اس طرح آنکھیں ڈالکر گھورا، کہ سربالا کی نوکِ مژگاں پر جمے ہوئے آنسو جو نہیں معلوم کب تڑپ کر باہر نکل آئے تھے۔ ضبط کی تاب نہ لا سکے۔ اُس نے یہ سب کچھ دیکھا مگر ظاہر کیا گویا کچھ نہیں دیکھا اور بیشک مصلحت اسی میں تھی۔ کیونکہ اگر وہ معمولی طور پر اتنا ہی پوچھ لیتا کہ "سربالا تم کیوں رونے لگیں" تو نہیں کہا جا سکتا کہ خود اُسکے جذبات کی برانگیختگی اس کے نظامِ ہستی میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتی۔

منوہر نے گجرا ٹوکری میں رکھدیا اور کسی قدر طنز کے ساتھ کہا:۔

"اونہہ! یہ تو کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ رات ہم سو رہے تھے تو کسی آسمانی دیوی نے ہمارے اوپر ہار ڈال دیا۔ وہ اتنا عمدہ اور اتنا اچھا تھا کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ سمجھیں سربالا؟۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی کوئی دیوی ہار پھینک جائے گی۔ لہذا میں تم سے کیوں خریدوں۔ ٹھیک ہے نہ؟"

سربالا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اپنے آنسوؤں کی جھڑی میں ایک مصنوعی تبسم کی جھلک پیدا کر دے۔

منوہر چلا گیا۔ اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کر بھی کیا سکتی تھی۔ نسائیت مانع تھی۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ بھاگ کر اس سے کہتی کہ

رات کو ہار پھینکنے والی دیوی میں ہی ہوں۔

چند منٹ تک وہ گم سم بنی کھڑی رہی۔ اور اس کے بعد واپس لوٹ گئی۔ حسبِ معمول باپ نے پوچھا کہ پھول کتنے بیچے ہیں۔ اُس نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے فوراً کہہ دیا کہ سب بک گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کو پہلے ہی سے باغیچہ میں ایک محفوظ جگہ چھپا آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باپ تو روپے پیسے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ وہ خود ہی ہر قسم کے آمد و خرچ کی مختار تھی۔ اگر وہ یہ کہہ دیتی کہ آج چوک پر پھول کی ایک پتی بھی فروخت نہیں ہوئی تو بہت ممکن تھا کہ دوسرے دن وہ اُسے نہ جانے دیتا، اس خیال سے کہ اب پھولوں کی مانگ کم ہو گئی ہے۔

۹

رات کے خاموش لمحے گذرتے چلے جا رہے تھے۔ مگر سربالا کو کسی عنوان نیند نہ آتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُس ہی کی مرضی نہیں ہے کہ آنکھ لگے۔ وہ بیدار رہنا چاہتی تھی۔ وہ ایک مخصوص وقت کی منتظر تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ منوہر کے قول کے مطابق میں آج پھر ایک دیوی بنکر چین سے سونے والوں پر پھولوں کی بارش کروں گی۔ چنانچہ جب بارہ بجے کے گھنٹے کی بھیانک آواز نے رات کے طلسمِ سکوت کو توڑا تو وہ فوراً اپنی چارپائی سے کھڑی ہو گئی۔ باپ کے خراٹوں کی تیز آواز آسودگیٔ خواب کا تسلی بخش ثبوت تھی۔ اور ظاہر تھا کہ بازاروں میں آمد و رفت کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہو گا۔

وہ سب سے پہلے باغیچہ میں گئی۔ اور وہاں پوشیدہ ٹوکری میں سے چند گجرے نکال کر دامن میں چھپا لئے۔ وہ کچھ دیر ٹھٹکی، ٹھہری، اور گہرا سانس لیکر ہر چیز پر مسرت کی نظر ڈالی۔ پھر چل پڑی۔ کچھ ایسے جگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ گویا ایک مخصوص منزلِ مقصود اُس کی نظر کے سامنے نہیں ہے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اُسکی نبض تیز تر تھی۔

وہ چوروں کی طرح چھپتی چھپاتی اور گلیوں میں دوکانوں کے ساتھ لگے ہوئے تختوں کے نیچے سونے والے کتوں سے کتراتی منوہر کے مکان کے قریب پہونچ گئی۔ پہلے سوچا کہ ہاتھ بڑھا کر گجرے پھینک دوں، مگر فوراً خیال آیا کہ جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ منوہر کس شان سے سو رہا ہے۔ چنانچہ اس ارادے کے ساتھ وہ دو قدم اور آگے بڑھی۔ چاہتی تھی کہ جھری میں سے جھانکے کہ اچانک کواڑ کھل گئے۔ منوہر اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وہ سر سے پاؤں تک کپکپا اُٹھی۔ رؤیں رؤیں میں تھرتھری تھی۔ دل کی دھڑکن میں اختلاج کی حد تک اضافہ ہو گیا، ہر شے اسکی نگاہ میں رقص کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پاؤں شل ہو گئے۔ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ آنچل سنبھالنے میں مصروف تھے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔

آخر منوہر نے طلسمِ سکوت کو توڑا۔

"سربالا، کیا تم میرے پاس آئی ہو؟ مجھ سے کوئی ضروری کام ہے؟..... اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

یہ کہہ کر اُس نے ساری کے نیچے سے سربالا کا وہ ہاتھ پکڑ لیا، جس میں گجرے تھے اور اُنہیں دیکھ کر مصنوعی اظہارِ تنفر کے ساتھ کہا۔

"میں تو آج ایک بھی پھول نہیں خریدوں گا۔ اگر خریدنے ہوتے تو چوک پر ہی لے لیتا۔ ہاں اگر تم بطور تحفہ پیش کرو تو

میں قبول کر سکتا ہوں؛

سر بالا کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور اگر منوہر نہ سنبھالتا تو یقیناً سب پھول زمین پر گر جاتے۔ لیکن وہ مُنہ سے نہ بولی۔ اُسکی زبان بند ہوگئی تھی، اُسے سانپ سونگھ گیا تھا پھر منوہر بولا "سر بالا اندر آجاؤ۔ دہلیز پہ کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میری بیوی میکے چلی گئی ہے۔ آج گھر میں کوئی نہیں ہے"

پہلے تو وہ اندر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ مگر یہ سُنکر کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، پھر ٹھٹک کر رہ گئی "گھر میں کوئی نہیں ہے" ایک تیز اُکھڑے ہوئے سانس کے ساتھ یہ جملہ اُسکی زبان سے صدائے بازگشت کی طرح نکل گیا

"آ بھی جاؤ، کیا حرج ہے، تمہاری موجودگی اس تنہائی کو دور کر دے گی" یہ کہہ کر اُس نے سر بالا کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ وہ اس طرح چل رہی تھی گویا اُس میں جان ہی نہیں ہے۔ بلکہ بجلی کی قوت لوہے کی مشین کو چلا رہی ہے۔ صحن میں پلنگ بچھا ہوا تھا۔ لیکن چادر پر ایک بھی شکن نہیں تھی جس سے ظاہر تھا کہ اس وقت تک کوئی اس پر نہیں بیٹھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ مگر منوہر نے گھسیٹ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

"مجھے معاف کر دو، سر بالا! میری غلطی تھی کہ میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا۔ لیکن کل سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمناؤں میں تجدید ہو رہی ہے۔ اب تم میری ہو اور میں تمہارا۔ لو میرے ہاتھ سے یہ کنٹھا پہن لو"

"نہیں، نہیں، میں ہرگز نہیں پہنونگی۔ یہ خلاف دستور ہے۔ پھول صرف سہاگنوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اور میری ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ میں کس طرح پہن لوں۔ کیا تم نہیں جانتے؟"

میں جانتا ہوں، اور اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن غالباً تم یہ نہیں جانتیں کہ آج کی رات تمہارے لئے سہاگ ہی کی رات ہے۔ اسلئے اپنے پریمی کے ہاتھ سے پھول پہننے میں تامل نہ کرو"

(۱۰)

منوہر نے پھونک مار کر چراغ گُل کر دیا۔ اس کی رہی سہی مدہم روشنی بھی غائب ہوگئی۔ سر بالا کو پہلے تو یقین نہ آتا تھا۔ لیکن نمودِ سحر سے قبل اُسے بھی تسلیم کر لینا پڑا کہ بیشک وہ رات اس کے لئے سہاگ کی پہلی رات تھی۔

—طاہرہ دیوی شیرازی

طوائف

اے زنِ ناپاک فطرت، پیکرِ مکر و ریا
دشمنِ مہر و وفا، غارتگرِ صبر و حیا

تیری ہر شوخی لچر ہے، تیرا ہر انداز پوچ
سخت تر ہے سنگ و آہن سے تری بانہوں کا لوچ

ہر تبسم پر ترے مکروہ تھنوں کی پھڑک
سینۂ انسانیت میں جس سے ہوتی ہے دھمک

تیرا ظاہر خوشنما ہے، تیرا باطن ہے سیاہ
ہر ادا تیری مکمل دعوتِ جرم و گناہ

تیری چٹکی کی صدا ہے، یا کہ شیطاں کا خروش
رحم کر انسانیت پر او بتِ عصمت فروش

الاماں! اے تیرے مصنوعی تبسم کا فریب
تھرتھرا اٹھتی ہے جسکے زور سے نبضِ شکیب

یہ نزاکت کی نمائش، یہ فریب آمیز چال
دوشِ ہستی پر تری ناپاک ہستی ہے وبال

سسکیاں بھرتی ہے تو، انگڑائیاں لیتی ہے تو
اُف رے مکارہ! بھری محفل کو جل دیتی ہے تو

تیرے ہر غمزے کی تہ میں ہے بناوٹ کا شکوہ
جسکے آگے سر بسجدہ معصیت کے دشت و کوہ

تیرا چہرہ ارغوانی، تیرا دل بے آب و رنگ
زندگی کیا ہے تری قانون سے فطرت کے جنگ

تیری پیشانی کا ہر خط معصیت آلودہ ہے
تیرا ہر اقدام، نافرجام ہے، بیہودہ ہے

تو حصولِ زر کی خاطر رات دن بیچین ہے
مال و دولت زندگی کا تیری نصب العین ہے

تیرے مذہب میں حفاظت آبرو کی ہے گناہ
مانگتی ہے تیری باتوں سے نسائیت پناہ

تیرا دل ہے زنگ آلودہ، مگر چہرہ ہے صاف
تیرے ظاہر اور باطن میں ہے کتنا اختلاف

تیرے ہونٹوں پر ہنسی ہے دل مگر افسردہ ہے
تو بظاہر جی رہی ہے روح تیری مُردہ ہے

جانتی ہے اپنی رُسوائی کو تو وجہِ نمود
صنفِ نازک کیلئے توہین ہے تیرا وجود

تیری بیداری نہیں ہے اِک مُسلسل خواب ہے
کیا تو ناواقف ہے عصمت گوہرِ نایاب ہے

جانتا ہوں تیری باہوں کی بچک کو بدشعار
کیوں دکھاتی ہے جڑاؤ کنگھنوں کو بار بار

ریشمیں ساری کو خود ہی سر سے ڈھلکاتی بھی ہے
بالارادہ بیحیائی کرکے شرماتی بھی ہے

میری نظروں کو خدارا دعوتِ کاوش نہ دے
جگمگاتے موتیوں کے ہار کو جُنبش نہ دے

زلفِ مشکیں کو حنائی اُنگلیوں سے مت سنبھال
کُھل چکا ہے میری نظروں پر ترا رازِ جمال

ریشمیں رومال سے ہونٹوں کی سُرخی کو نہ چھُو
مجھ پہ چل سکتا نہیں تیرا فریبِ رنگ و بُو

کوئی ہو جاتا ہے جب تیرے تصنع کا شکار
چُپکے چُپکے کام کرتا ہے فریب آمیز پیار

تو دلا دیتی ہے اسکو اپنی اُلفت کا یقیں
سچ تو یہ ہے تیرے کاٹے کا کوئی منتر نہیں

زندگی کو اُس کی یکسر تلخ کر دیتی ہے تُو
کانپ جاتا ہے جگر، وہ چُٹکیاں لیتی ہے تُو

بھاگتا ہے کوئی جیسے سانپ کی پُھنکار سے
دُور رہنا چاہیئے یوں ہی ترے کردار سے

[illegible] حسین [illegible]

ڈرامے کی تنقید

ادب میں کسی چیز کی تصنیف اتنی زیادہ دشوار نہیں جتنی اُس کی تنقید۔ صرف شاعری کی مثال لے لیجئے۔ آئے دن رسالوں میں مشاہیر شعرا کے کلام پر تنقیدیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ان تنقیدوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو شاید شاعری کے مقابلہ میں اُن کا زیادہ حجم ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تنقیدوں کے پڑھنے میں بھی انسان کو وہی لُطف آئے گا جو اُس شعر کے پڑھنے میں جس کی وہ تنقید ہے؟ کیا وہ دل و دماغ کے لئے عشرت کا وہی سامان بہم پہونچا سکیں گی جو کسی شاعر کی خون میں ڈوبی ہوئی معنوی تخلیق میں ہے؟ میرے نزدیک نہیں! لیکن آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا صرف یہ کہ شعر میں فطرتاً کچھ ایسی باتیں ہیں جو دل و دماغ پر ایک نثر کے ٹکڑے سے زیادہ اثر کرتی ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر ترنم اور نغموں کی گود میں پلا ہے اور نثر کے ٹکڑے اس نعمت سے محروم ہیں؟ کیا اسکا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ نظم جذبات کی، اُن لطیف جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جن کی دُنیا درد کی کسک سے آشنا ہے اور نثر کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں؟ بیشک یہ سب کچھ بھی ہے لیکن اس سے زیادہ یہ کہ نثر کے یہ ٹکڑے جو شعر کو فنا کرنے کیلئے لکھے جاتے ہیں، صحیح رُوح سے خالی ہیں۔ اُن کا مقصد صرف تخریب ہے اور شعر کا مقصد ہمارے لطیف جذبات کی تعمیر۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کبھی کبھی نثر کے فقرے بھی شعریت کی دُنیا اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔ اُن میں بھی وہی لطیف کیفیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو شعر کو شعر بناتی ہیں۔ لیکن موقعے دوسرے ہیں۔ جب ہم شاعر کی پیدا کی ہوئی رُوحانی تخلیق کو پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُس وقت ان نثر کے ٹکڑوں میں یہ لطافت، یہ شیرینی، اور یہ کیف نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ شعر اُن سے زیادہ تاثیر پیدا کرتا ہے۔

لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان نثر کے ٹکڑوں میں بھی وہی کیف پیدا کر سکیں جو شعر میں ہے؟ جواب ہے کہ یقیناً ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ جب ہم کسی شعر پر تنقید کرنے بیٹھیں تو اپنی دُنیا کو صرف شعریت تک محدود رکھیں۔ ہمارے خیال، ہماری زبان، ہمارا قلم، ہماری تحریر، ہر چیز شعر کی دُنیا میں رقص کرے۔ اگر ہم میں یہ صلاحیت نہیں تو ہم ہرگز اس قابل نہیں کہ شعر کی تنقید پر قلم اُٹھائیں۔

شعر کی تنقید میرے نزدیک اتنی زیادہ دُشوار نہیں، جتنی ڈرامہ کی، ڈرامہ پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں سب سے پہلی چیز وہی کرنی پڑے گی جو کسی دوسری تنقید کرتے وقت، ڈرامہ کی دُنیا کے گوشہ گوشہ کو اچھی طرح دیکھ بھال کر ہم اس بات کا ارادہ کریں گے کہ ہم اس پر تنقید شروع کریں۔

وڈرامہ کی دُنیا' ایسا فقرہ ہے جسکے معنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسلئے اب ہم اس شاعرانہ تخیّل کو چھوڑ کر حقیقت کی دُنیا میں قدم رکھینگے اور یہ بتائینگے کہ ایک ڈرامہ کے نقاد کے لئے کن کن لوازم کی ضرورت ہے۔

ڈرامے کا لفظ سُن کر سب سے پہلی چیز جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ پڑھنے کی نہیں بلکہ کھیلے جانے کی چیز ہے۔ اُسے لکھنے کے بعد لوگوں کی نظروں تک پہونچانے کا ذریعہ اسٹیج ہے۔ اس لئے کسی ڈرامے کو پڑھتے وقت ہمیں سب سے پہلے یہی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ ڈرامہ آسانی سے اسٹیج پر کھیلا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اور اسٹیج پر کھیلے جانے میں ڈرامہ نگار کی

پیش کی ہوئی تصویریں اُسی طرح قائم رہتی ہیں یا نہیں۔ واقعات کے تسلسل اور ترتیب میں تو کوئی فرق نہیں آتا؟۔ یہ اور اسی قسم کی اکثر چیزوں کا جانچنا نقادِ ڈرامہ کا پہلا فرض ہے۔ اور اس فرض کی تکمیل کے لئے اُس کے لئے بیحد ضروری ہے کہ وہ اسٹیج اور اُسکے متعلقات سے اچھی طرح واقف ہو۔ اُسے یہ معلوم ہو کہ ایک ڈرامے کو اسٹیج پر کھیلتے وقت ہمیں کون کون سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اسٹیج کی موجودہ صورت میں اُن میں سے کن کن دقتوں کو آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے اور کون سی دقتیں ایسی ہیں جن کا ظاہر کوئی علاج نہیں۔ اگر ڈرامہ اس قسم کا ہے کہ اُسے کھیلتے وقت ایسی دقتیں پیش آئیں گی جنہیں کسی طرح بھی دُور نہیں کیا جا سکتا تو ڈرامہ نگاری کے فن کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن یہ کہہ دینے کے بعد بھی ہمارے سامنے ایک بڑی دقت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ بہت سے ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جو اسٹیج پر کھیلنے کے لئے ہرگز نہیں لکھے جاتے اس لئے ایک نقاد کا یہ بھی فرض ہے کہ فنی تنقید کرتے وقت ایسے ڈراموں کو الگ کر دے۔

اس موقع پر ہم شلیگل ([illegible]) کے پیش کردہ نظریہ کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائیں گے:۔

"یہ ظاہر ہے کہ ڈرامہ نگار کے خیالات کی پوری ترجمانی کرنے کے لئے اگر توضیحات کی مدد نہ لی جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آسانی سے اسٹیج پر کھیلا جا سکے۔ اس لئے کسی ڈرامے کو ہم ہمیشہ دو طریقوں سے جانچنا چاہیئے۔ پہلا یہ کہ آیا وہ اسٹیج پر کھیلے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ اس میں شاعری کو کتنا دخل ہے[1]......"

اس تقسیم کے بعد ہماری دقتیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ خود ہماری زبان میں جس میں ڈراموں کا سرمایہ بہت کم ہے اس قسم کے ڈرامے موجود ہیں جنہیں اس لئے نہیں لکھا گیا کہ وہ اسٹیج پر کھیلے جائیں۔ ایسے ڈراموں کو اسٹیج کے اصول سے جانچنا غلطی ہے۔ مثال کے طور پر اگر امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انارکلی" پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اسٹیج کے لئے ہرگز نہیں لکھا گیا۔ ہر سین اور ڈراپ کے شروع ہونے سے پہلے تاج نے ماحول کی ترجمانی کرنے کے لئے مفصل نوٹ درج کئے ہیں۔ یہ طریقہ مغرب میں عموماً اور برنارڈ شا کے ڈراموں میں خصوصاً عام ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی پیدا کر سکیں۔ "انارکلی" میں اسٹیج کے فن کی کمیاں ہیں۔ لیکن ہم اُسے بہت اچھا ڈرامہ سمجھتے ہیں، اس لئے کہ وہ شلیگل کی تقسیم کے مطابق صرف شاعرانہ ڈراموں کی ضمن میں آسکتا ہے۔

اُردو میں اور بھی ایسے ڈرامے ہیں جنہیں اس فنی اُصول سے جانچنا سخت غلطی ہے۔ مثلاً حکیم احمد شجاع کا ڈرامہ "باپ کا گناہ" یا مولانا عبدالماجد کا ڈرامہ "زود پشیماں"۔ اس نقطۂ نظر سے نہیں لکھے گئے کہ وہ اسٹیج پر کھیلے جائیں۔ اُنہیں اسٹیج پر کھیلنے کے بعد اُن میں وہ کیف باقی نہیں رہیگا جو اُنہیں صرف دلچسپی کے لئے پڑھکر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دوسری طرف ہم اگر بیتاب، طالب یا حشر کے ڈراموں میں سے کوئی ایک ڈرامہ لیں اور اُسے پڑھ کر وہی لطف حاصل کرنا چاہیں جو اُسے اسٹیج پر دیکھ کر حاصل ہوتا ہے تو ہماری اُمیدوں کا پورا ہونا معلوم۔ حشر کے ڈرامے "دل کی پیاس" اور "خوبصورت بلا" صرف اسٹیج ہی پر اچھے معلوم ہو سکتے ہیں۔

ان دو متضاد باتوں کے کہنے سے ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ شاعرانہ ڈراموں کے لئے فن کی پابندی ضروری نہیں۔

[1] A Course of Lectures on Dramatic Art and Literature. (English Translation)

لیکن ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ بلکہ اُصول یہ ہونا چاہیے کہ شاعرانہ ڈراموں میں شعریت اس درجہ نہ بڑھ جائے کہ وہ ڈرامے کی دُنیا سے نکل کر صرف شعریت کی دُنیا میں داخل ہو جائیں۔ شعریت محمود ہے لیکن فن کی حدود کے اندر۔ اس کی مثال میں وہ ڈرامے پیش کئے جاسکتے ہیں جو الا پرشاد برقؔ نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ خصوصاً اُن کا ڈرامہ "مرنالنی" شعریت اور فن کے امتزاج کی بہترین مثال ہے۔

کسی ڈرامے کی تنقید سے پہلے یہ جان لینے کی بھی ضرورت ہے کہ یہ ڈراما کسی خاص ایکٹر یا ایکٹروں کی کسی خاص جماعت کو پیشِ نظر رکھ کر تو نہیں لکھا گیا۔ ڈرامے کو پڑھ کر اس کو بلا سوچے سمجھے تنقید کرنا اُصولِ تنقید کی سخت ترین منافقت ہے۔ انگریزی ڈرامے کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے۔ خصوصاً شیکسپیر کے ڈراموں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُس کے ڈراموں کے خاص خاص افراد کی مصوری کچھ مخصوص ایکٹروں کی خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے۔ خود اُردو کو دیکھ لیجئے اِس قسم کی پچاسوں مثالیں مل جائیں گی۔ پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کے خاص ڈرامہ نگار طالب بنارسی کے اُن ڈراموں کو اُٹھا کر دیکھئے جو اسی کمپنی کے لئے لکھے گئے تو صاف طور معلوم ہو جائے گا کہ ہر ڈرامہ میں اُنہوں نے ایک ایسا طربیہ پارٹ ضرور رکھا ہے جسے اُس کمپنی کے مالک بالا والا اپنے خاص انداز میں ادا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے جو ڈرامے ہیں اُن میں عموماً تین زنانے پارٹ ضرور ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر ظاہر بیں نظریں کوئی خاص نتیجہ نہیں نکال سکتیں۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہ تین پارٹ اُس کمپنی کی مشہور نسائی افراد مس خورشید، مس زہرہ اور مس مہتاب کے لئے رکھے گئے تھے۔ اپنے زمانے کے اُن ڈراموں کو دیکھ لیجے جو آغا حشر مدتوں تھیٹر کے لئے لکھتے رہے۔ ایسے ڈراموں میں جابجا ناچ رنگ کی محفلیں جمائی جاتی ہیں۔ ڈراموں کو دیکھنے یا پڑھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بات صرف ڈرامے کی دلچسپی کے لئے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک دوسری چیز جو ذرا غور کے بعد معلوم ہو سکتی ہے یہ ہے کہ مڈن کمپنی کے پاس کچھ اطالی لڑکیاں ہیں اور یہ پارٹ موقع بے موقع صرف اُنہیں کے لئے ڈرامے میں شامل کیا جاتا ہے۔ دوسری مثال چیز جو حشر کے اِس دور کے ڈراموں میں عام ہے یہ ہے کہ وہ اُنکے مزاحیہ حصہ میں صرف ایسے افراد کو داخل کرتے ہیں جو اس کمپنی کے مشہور ایکٹر ماسٹر موہن اور ایکٹرس مس پیشنس کوپر کے لئے موزوں ہو سکے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اس زمانہ میں جو مذہبی اور ہندی ڈرامے لکھے اُن میں ایک نسائی پارٹ پر خاص طور پر زور دیا اور اس میں جابجا کثرت سے ہندی اور فن کے اعتبار سے مکمل گانے شامل کئے۔ اس کی بھی ظاہرا وجہ صرف دلکشی معلوم ہوتی ہے لیکن ان پکے گانوں کے شامل کرنے اور اس نسائی پارٹ کو بہت زیادہ نُمایاں کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ پارٹ خاص طور پر منّی بائی کے لئے بنایا گیا ہے۔ منّی بائی کو موسیقی میں خاص دخل ہے۔ اُس کی آواز اور گلا پکے گانوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے ڈرامہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنے کی بےحد ضرورت تھی۔ حشر کے ڈراموں کا نقاد اس قسم کی باتوں سے بےخبر رہ کر اُن کے ڈراموں پر سچی تنقید ہرگز نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اسٹیج کی طرف سے اُن ڈراموں کی طرف متوجہ ہوں جو متحرک تصاویر کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں تو یہ بات ہمیں اور زیادہ صاف طور پر نظر آئے گی۔ مثال کے لئے صرف امپیریل فلم کمپنی کو لیجئے۔ اُس کے ڈراموں میں ہیرو یا ہیروئن کے پارٹ کچھ اس انداز کے ہوتے ہیں کہ وہ سلوچنا اور بلیموریا کے لئے موزوں ہو سکیں۔ غوری اور دکشت کی وجہ سے ڈرامہ نگار کو اُس میں دو ایسے غیر ضروری افراد کو شامل کرنا پڑتا ہے جو صرف مزاح اور تفریح کا مشغلہ بن سکیں۔

تیسری چیز جو ڈرامے کی تنقید کے وقت نظر میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ ڈرامہ کس زمانے میں اور کس قسم کے دیکھنے

والوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ ڈرامہ نگار کی سب سے بڑی کامیابی یہی سمجھی جاتی ہے کہ جب اُس کا ڈراما اسٹیج پر کھیلا یا سینما کے پردے پر دکھایا جائے تو دیکھنے والے وقتاً فوقتاً اس سے ایسے متاثر ہوں کہ بے ساختہ اُس کی تعریف کریں۔ ان کے جذبات پر کبھی کبھی ایسا اثر پڑے کہ وہ تالیاں تک بجانے لگیں۔ مولیر ([illegible]) نے ایک جگہ اس بات کو اس طرح لکھا ہے :-
"میں دیکھنے والوں کی داد کو ڈرامہ کی کامیابی کا بڑا راز سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ جو لوگ تماشہ دیکھنے جاتے ہیں اُن میں سے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو اُسے فن کی حیثیت سے جانچنے کے اہل ہیں۔ اور باقی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور نہ کسی تعصب کو دخل دیتے ہیں۔ نہ بناوٹ کو اور نہ ایسی نفاست کو جو حماقت کی حد تک پہونچ جائے۔"

ایسی صورت میں ناظرین کی تعریف ڈرامے کی کامیابی کا بڑا راز ہے۔ اس لئے ڈرامہ نگار کو زمانہ کی رفتار دیکھتے ہوئے صرف ایسے ڈرامے لکھنے پڑتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ایسے اجزا شامل کرنے پڑتے ہیں جو ان کے ناظرین کے مذاق کو زیادہ سے زیادہ خوش کرسکیں۔ اُس کا نتیجہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ڈرامے ادبی حیثیت سے بہت بلند پایہ نہیں ہوتے لیکن ناظرین اُن کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ اس لئے ایک نقاد کا یہ بھی فرض ہے کہ ڈرامے پر تنقید کرنے سے پہلے یہ معلوم کرے کہ یہ ڈراما کس مخصوص سوسائٹی کے سامنے کھیلے جانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ یا جس وقت یہ لکھا گیا اُس وقت سوسائٹی کا مذاق کن چیزوں کو پسندیدگی سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اُردو ڈرامہ نگاری کی مختصر سی تاریخ میں دیکھ لیجئے کہ ستر برس کے زمانے میں ڈرامہ میں کتنے انقلاب ہوئے۔ پہلا دور وہ تھا جب لوگوں کی نظریں رمس اور ٹونکی دیکھنے کی عادی تھیں۔ کان ایہام اور لفظی رعایتوں میں لطف محسوس کرتے تھے۔ اس اثر کا نقشِ اول امانت کی اندر سبھا کو سمجھئے۔ واجد علی شاہ کے دربار کی نیرنگیاں تمام ہونے کے بعد یہ پہلا دور ختم ہوا تو رونق بنارسی اور حسینی میاں کی ڈرامہ نگاری شروع ہوئی۔ ان ڈراموں کی خصوصیت یہ تھی کہ جن، دیو، پری کے افسانوں کو اس میں خاص دخل تھا۔ دلچسپی پیدا کرنے کا ایک ہی واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ گانے کو اتنی اہمیت تھی کہ ہر کردار اپنی گفتگو میں صرف نظم کو کام میں لاتا۔ اس زمانے کے تماشوں میں شیریں فرہاد، علی بابا، نقشِ سلیمانی، اکسیر اعظم، گل بکاؤلی، حاتم طائی، بدر منیر، گل صنوبر، الہ دین جیسے ڈراموں کو دیکھئے تو اُن سب میں یہی خصوصیات عام نظر آئیں گی۔

احسن اور بیتاب کے ڈراموں میں کسی قدر نفاست پیدا ہوگئی۔ زبان کی صفائی کے علاوہ نظم کی بھرمار نہیں رہی اور اب ڈراموں میں صرف قافیہ پیمائی کا دخل رہ گیا۔ مافوق الفطرت عنصر فطری عناصر سے بدلنے لگا۔ اور حشر کے زمانے تک اس میں نفسیاتی جھلک بھی پیدا کی جانے لگی۔ سینما کی ترقی نے حشر کے ڈراموں کو بھی اب پس پشت ڈالنا شروع کر دیا ہے اور وہ اب سے دس برس پہلے کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے لئے نیو تھیٹرس کے ڈراموں اور اُن کی مقبولیت دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ نفسیاتی عنصر کیساتھ فطرت کی بے نقاب اور سیدھی اور سچی تصویریں زیادہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔

اِن باتوں سے ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہیں کہ اندر سبھا کو بیتاب یا احسن کے ڈراموں کے معیار سے بیتاب اور احسن کے ڈراموں کو حشر کے ڈراموں کے معیار سے اور حشر کے دس برس پہلے کے ڈراموں کو موجودہ متحرک تصاویر کے معیار سے جانچنا بالکل ایسا ہے جیسے بکرماجیت یا اشوک کے درباری مصاحبوں کو انگریزی وضع میں دیکھنے کی اُمید کرنا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کے حسن کی سادگیوں میں دوشیزۂ مغربی کی عشوہ گریاں تلاش کرنا۔

بہرحال ڈرامے کے نقاد کے لئے اور باتوں کے ساتھ اس بات کی تحقیق بھی لازمی ہے کہ وہ جس ڈرامے پر تنقید لکھ رہا ہے اُسے دیکھنے والے کون تھے اور اُن کا مذاق کیا تھا۔ اِس لئے اُس کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ڈراما جن لوگوں کے لئے لکھا گیا اُن کی پوری تفریح اُس سے ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی تو ڈراما مکمل ہے اور اگر نہیں ہوئی تو اُس میں فن کی بہت بڑی کمی ہے۔

ڈوما (Dumas) نے فرانسیسی ڈرامہ نگار اسکرائب (Scribe) کے ڈراموں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ صرف اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اسٹیج کے لئے۔ اُس کی یہ تمنا نہیں تھی کہ وہ لوگوں کو اخلاق کی تلقین کرے۔ اُن کے اعمال کو نیکیوں کا راستہ دکھائے، اُن کے لئے اخلاقی رہنما بنے، وہ صرف اُنہیں مسرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُس بلندی کا طالب نہیں تھا جو انسان کو موت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ وہ صرف اس بات سے خوش تھا کہ لوگ زندگی میں لے سراہیں وہ اوّل درجہ کا شعبدہ باز تھا۔ وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک واقعہ کو اس طرح پیش کرتا تھا جیسے ایک گیند۔ وہ اُسے کبھی اِدھر اچھالتا کبھی اُدھر، کبھی لوگوں کو ہنساتا، کبھی رلاتا اور کبھی اُن کے دلوں کو حیرت سے بھر دیتا۔ وہ صرف یہی کرتا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

Dumas کی اس تنقید سے بھی ہم وہی نتیجہ نکالتے ہیں جو اس سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ بہت سے ڈرامے ایسے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھے نہیں، لیکن ناظرین نے اُنہیں ایسا پسند کیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ ظاہرا یہ دو باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔

Dumas کے اس بیان سے ہمارے سامنے تلقینِ اخلاق کا مسئلہ آجاتا ہے اور ایک ڈرامہ کے نقاد کو اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر Dumas کی رائے سے اتفاق کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈرامے کے لئے کسی اخلاقی تلقین کی ضرورت نہیں۔

اس سوال کا جواب ایک آدھ لفظ میں آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ نقادانِ ڈراما اس معاملہ میں اسقدر متضاد رائیں رکھتے ہیں کہ کسی صحیح فیصلہ پر پہونچنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ڈرامہ کا مقصد صرف تفریح ہے اگر اخلاقی تلقین اس تفریح میں کوئی فرق ڈالے تو اسے بالکل نظرانداز کر دینا چاہیئے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ طربیہ ڈرامے اس مقصد سے نہیں لکھے جاتے کہ وہ ہمیں کوئی اخلاقی تعلیم دیں لیکن اسکے باوجود بھی بعض اوقات ہم اُن سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کا معیار کسی قدر بلند ہو جاتا ہے اور صرف ایک طربیہ ڈرامے کو دیکھنے کے بعد ہی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم زندگی کی کسی بلند سطح پر چل رہے ہیں۔

تیسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ طربیہ ڈراموں کے لکھے جانیکا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم وہ باتیں اختیار کریں جو ہماری زندگی میں مفید ثابت ہوں اور ایسی باتیں چھوڑیں جن سے ہمیں اخلاقی نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

چوتھا گروہ سب سے الگ ہے۔ نہ وہ اس کی تردید کرتا ہے نہ اُس کی۔ نہ اسکے موافق ہے نہ اُس کے۔ ایک شاعرانہ بات ہے اور وہ یہ کہ تفریح خود ایک ایسی چیز ہے جس سے ہماری اخلاقی سطح کسی نہ کسی طرح بلند ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی سی بات بھی ایسی نہیں جسے پورے طور پر مانا جا سکے۔ ڈرامے میں اخلاق ہونا ضروری ہے۔

لیکن اُسے اس طرح اس میں شامل ہونا چاہیئے کہ ڈرامہ کی دوسری خصوصیتیں اس کے مقابلہ میں ماند نہ نظر آنے لگیں۔ تماشہ دیکھنے والا اُسے دیکھتے وقت یہ ہرگز نہ محسوس کرے کہ اُسے کوئی اخلاقی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دام خرچ کرنے پڑے ہیں۔ بلکہ ہونا یہ چاہیئے کہ جب وہ تماشہ دیکھ چکے تو خود بخود وہ یہ محسوس کرے کہ اُس نے دلچسپی اور تفریح حاصل کرنے کے علاوہ کچھ اخلاقی بلندی بھی حاصل کی ہے۔

ایک نقاد کسی ڈرامے کے اخلاقی پہلو کو جانچتے وقت اتنی زیادہ مشکلوں میں پڑ جاتا ہے کہ اُس کے لئے یہ دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ڈرامے کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھے یا صرف تفریح کے خیال سے۔ مگر اب اور اب سے پہلے کے قریب قریب سارے نقادانِ ڈراما متفق ہیں کہ ڈرامے میں "تفریح اور تلقین" دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ڈرامہ نگار ڈرامہ لکھنے سے پہلے اپنے ذہن میں اس قسم کا کوئی اخلاقی پہلو لیکر اُسے لکھنا شروع کرتا ہے؟ یا اُسے ایسا کرنا چاہیئے کہ نہیں۔

ایک نقاد جواب دے گا کہ ہرگز نہیں۔ اس بارے میں میرے نزدیک جرمنی کے نقاد اور فلسفی گیٹے (Goethe) کی رائے سب سے زیادہ موزوں اور قابلِ قبول ہے۔ Lessing نے ایک جگہ انتہائی احتیاط برتتے ہوئے لکھا ہے:۔

"میں نہیں کہتا کہ اگر کوئی ڈرامہ نگار اپنے پلاٹ کی ترتیب اس طرح دے کہ اُس سے کوئی اخلاقی نتیجہ مرتب ہو تو یہ عیب ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ پلاٹ کی اس قسم کی ترتیب غیر ضروری یقیناً ہے۔ لیکن اکثر ڈرامے ایسے ہیں جن کا مقصد کوئی اخلاقی تعلیم نہیں لیکن وہ انتہا سے زیادہ اخلاقی درس دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ہماری سخت غلطی ہے کہ ہم کسی ڈرامے کے انجام میں کسی اخلاقی تلقین کی واعظانہ تلاش کریں۔"

Lessing نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے۔ لیکن گیٹے کے کہنے کا طریقہ زیادہ مؤثر اور فطری ہے۔ اُس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اگر ایک شاعر کا اخلاق یا اُس کی روح سفاکلیز کی طرح بلند ہے تو اُس کا اثر ہمیشہ اچھا ہوگا۔ وہ اپنے کلام میں خواہ کچھ ہی کہے۔"

اس بیان میں یہ نفسیاتی پہلو ضرور ہے کہ جو انسان جیسا ہوتا ہے اُسی قسم کی عملی تخلیق اُس سے ممکن ہے، وہ باوجود کوشش کے بھی اپنے راستہ سے نہیں ہٹ سکتا۔ اس لئے اگر کوئی ڈرامہ نگار اخلاقِ حسنہ سے مزین ہے تو بلا کوشش کے بھی اُسکے ڈرامہ میں ایسے عناصر پیدا ہو جانے لازمی ہیں جو بڑی سے بڑی اخلاقی تلقین کر سکیں۔

اس لئے ایک نقاد کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ کسی ڈرامے کو اخلاقی پہلو سے دیکھتے وقت اس بات پر خاص نظر رکھے کہ ڈرامہ میں اخلاق کا عنصر پیدا کرنے کے لئے فنی اور شاعرانہ خوبیوں کو اُس پر قربان نہیں کیا گیا ہے۔

ایک نقاد کے فرائض یہیں نہیں ختم ہو جاتے بلکہ اُسکے لئے آگے چلکر اور بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں اور وہ دقتیں بہت نازک فنی اصول سے متعلق ہیں۔ ظاہراً اُن میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن تنقید کی نظروں کیلئے اِن عام باتوں میں بھی چند ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن پر نظر رکھنا ایک نقاد کا سب سے پہلا فرض ہے۔

اِن چیزوں میں سے پہلی چیز خود ڈرامہ کا پلاٹ ہے۔ نقاد کو اسے کئی حیثیتوں سے جانچنا پڑتا ہے۔

پہلی یہ کہ ڈرامے کے افراد کے لئے ڈرامہ نگار نے جو حرکات مخصوص کر دی ہیں۔ وہ کہاں تک فطری ہیں اور اُن حرکات و سکنات کا دیکھنے والے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ایکٹر کا پارٹ شروع سے آخر تک اس قسم کا ہے کہ ہم اُس کی حرکتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتے ہم اُسکے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف اُن لفظوں یا مکالموں کے ذریعے سے جو افرادِ ڈرامہ آپس میں کرتے ہیں۔ وہ خود اپنی حرکتوں سے کوئی ایسی بات نہیں ظاہر ہونے دیتا جس سے ہم اُسکے متعلق کچھ مزید معلومات فراہم کر سکیں۔ یہ پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہے اور اگر کسی ڈرامہ میں کہیں یہ کمی نظر آئے تو نقاد کا فرض ہے کہ وہ اِسے ایک بہت بڑی اُصولی اور فنّی غلطی تصور کرے۔ پلاٹ کے سلسلہ میں دوسری چیز جس کی طرف ہماری توجہ ہونے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ ڈرامہ نگار اپنے ڈرامے کے ماحول اور گرد و پیش کو ایسا بنائے کہ اُس کو دل و دماغ کے علاوہ آنکھیں بھی خاص طور پر لُطف اندوز ہو سکیں۔ یہ چیزیں اُن مقامات سے تعلق رکھتی ہیں جن میں واقعات ڈرامہ پیش آتے ہیں۔ اس موقع پر ڈرامہ نگار سے یہ غلطی ہو جانے کا بھی امکان ہے کہ وہ ہمارے سامنے نظر فریب مناظر، دلکش مقامات یا گرد و پیش لانے کے خیال میں یہ بھول جائے کہ اُسے جو کچھ دکھانا ہے وہ صرف اسٹیج کی حدود کے اندر رہ کر۔ اگر اُس نے اِس فنی اُصول کی پابندی بھی کامیابی سے کر لی تو ایسے ڈرامے کو اچھی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

تیسری چیز جو ایک ڈرامے کے پلاٹ میں دیکھنے کی ہوتی ہے یہ ہے کہ واقعات کو اسٹیج کے مطابق بنانے میں ڈرامہ نگار نے کہیں ایسا تو نہیں کیا کہ ضروری واقعات کو پسِ پُشت ڈالکر غیر ضروری واقعات کو نمایاں بنا دیا ہو۔ اگر اُس سے یہ غلطی ہوئی تو اِسے فن کے اعتبار سے معیوب سمجھنا چاہیئے۔

چوتھی بات جسے ڈرامہ کے پلاٹ سے خاص تعلق ہے اور جو دوسری باتوں سے کہیں زیادہ ضروری بھی ہے۔ اُس کی موزونیت و تناسب ہے۔ ڈرامہ میں موزونیت کا مقصد یہ ہے کہ واقعات میں شروع سے آخر تک ایک ایسا سلسلہ ہو جسے ہر نظر آسانی سے سمجھ سکے۔ ڈرامہ میں چونکہ واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور انہیں عملی صورت میں دکھانے کا وقت کم اسلئے انہیں ایکٹ اور سینوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایکٹ اور سین اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتے ہیں اُنمیں ایک خاص ابتدا بھی ہوتی ہے اور انتہا بھی لیکن اسکے باوجود بھی بیحد ضروری ہے کہ آنیوالے سین کی ابتدا گذشتہ ہوئے سین سے کسی نہ کسی طرح ملی ہوئی ہو۔ پچھلے سین میں اس قسم کا کوئی لطیف اشارہ ضرور ہونا چاہیئے جسکے ذریعہ سے دیکھنے والے دو مختلف منظروں میں تعلق پیدا کر سکیں اور ڈرامہ ختم ہونے کے بعد تماشہ کے سب مناظر ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے معلوم ہوں جیسے کسی ڈھلی ہوئی مشین کے پُرزوں کے جوڑ۔

لیکن اس موقع پر اس کا خیال بھی ضروری ہے کہ یہ لطیف اشارات جو مناظر کو آپس میں ملاتے ہیں اتنے مبہم ہرگز نہیں ہونے چاہئیں کہ دیکھنے والے اُنہیں آسانی سے سمجھ نہ سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو ڈرامہ کا پورا اثر خاک میں مل جائیگا۔

ڈرامہ کی تنقید کا سب سے اہم حصہ نہ اُس کا فن ہے نہ اُصول۔ نہ اُس کا اسٹیج ہے نہ ایکٹر بلکہ سب سے بڑی چیز جس پر ایک نقاد کو نظر رکھنی چاہیئے اُس کی زبان ہے۔ ڈراموں کی زبان عام بول چال سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ اور یہ اختلاف وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اُردو کے بالکل ابتدائی ڈراموں کی زبان اور اُن کے مکالموں کو پڑھیئے تو نثر کا کہیں نام بھی نہیں۔ ہر شخص روزانہ کی گفتگو بھی گانوں میں کرتا ہے۔ غصہ آنے کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ایکٹر اس قدر جلدی جلدی گا کر بولے کہ طبلہ اور ہارمونیم اُس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ غم کی شدت دکھانے کے لئے بھی صرف گانوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی سے اپنا دُکھڑا روتا ہے تو وہ بھی گا کر ہونا ممکن ہے۔ ماں اپنے بیٹے سے، بھائی اپنے بھائی سے، آقا اپنے نوکر سے، نوکر اپنے آقا سے، ایک اجنبی کسی دوسرے اجنبی سے جب

باتیں کرے گا تو نظم میں، جواب دینے والے کی حاضر جوابی ملاحظہ ہو کہ جواب نظم ہی میں دے گا۔ اور لطف یہ کہ بحر اور قافیہ تک میں اپنے مخاطب کی پیروی کرے گا۔ یہ تو بالکل ابتدا کے ڈراموں کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسرے دور کے ڈراموں میں یہ روش کسی قدر فطرت کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور نثر رفتہ رفتہ نظم کی جگہ لینی شروع کر دیتی ہے۔ لیکن اس نثر میں بھی نظم کے اتنے اجزا ہیں کہ مشکل سے نثر کہا جا سکتا ہے۔ جتنے مکالمے ہیں وہ مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں ترکی بہ ترکی جواب سُنے جائیں گے۔ لفظوں میں غصہ ہوگا۔ فقروں میں غم کی تاریکی ہوگی۔ باتوں میں کسی شدید جذبہ کا پرتو ہوگا لیکن قافیہ پیمائی کبھی ہاتھ سے نہ جانے پائے گی۔ اس دور کے ہر ڈرامہ کے ہر ایکٹر کی فطرت شاعرانہ نظر آتی ہے۔ اور یہ شاعرانہ فطرت دوسرے جذبات کو اس طرح غالب رکھتی ہے کہ اُن پر کبھی اُفتاد کیوں نہ پڑے ان کی شاعری اور اس کے لوازم کے دست و گریباں رہنا ضروری ہے۔ بیتاب اور احسن کے قریب قریب سب ڈرامے اور حشر کے ابتدائی ڈراموں میں یہ رجحان عام ہے۔ تیسرے دور میں اس میں صرف یہ تبدیلی ہوئی کہ قافیہ پیمائیاں کم ہوگئیں لیکن ہر جواب میں شاعرانہ فطرت جلوہ گر ہے۔ ڈرامہ نگار ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ جب دو افراد ڈرامہ میں مکالمہ ہو رہا ہو تو اُن میں سے ایک کی گفتگو اس قدر پُر زور یا با اثر ہو کہ وہ ہر فقرہ پر ناظرین کے دلوں میں نفرت یا محبت کے جذبات ضرور پیدا کرے۔

آج کل اردو ڈراموں میں زبان اور مکالموں کی یہ سب روشیں عام طور پر جاری ہیں۔ مثال کے لئے ہم صرف ایک ہی ڈرامے کا نام لیتے ہیں۔ چترا بکاؤلی جو مدن تھیٹریکل کمپنی کا بے حد مشہور ڈرامہ ہے۔ شروع سے آخر تک نظم کے فقروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کا ہر کردار جب آپس میں گفتگو کرتا ہے تو نظم میں۔ حتیٰ کہ راجہ اندر کو جب بکاؤلی پر غصہ آتا ہے تو اس کا اظہار نظم ہی میں ہوتا ہے۔ معتوب بکاؤلی کا محبوب عاشق جب جنگل میں اُس سے ملنے جاتا ہے تو شدتِ غم میں وہ اس سے سوال کرتی ہے تو نظم میں۔ غمزدہ عاشق باوجود اپنے غموں کی شدت کے اُس کا نظم ہی میں جواب بھی دیتا ہے۔

دوسری روش وہ ہے جس میں نظم بھی ہے اور اُس کے ساتھ مقفیٰ اور مسجع نثر بھی۔ اس کی مثال شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں جیسے ڈرامے ہیں۔ جن میں عاشق و معشوق کی گفتگو میں۔ بادشاہ اور غلام کی باتوں میں دیوانہ اور فرزانہ کے مکالمہ میں ہر جگہ قافیہ اور سجع کی پابندی کی گئی ہے۔

تیسری روش حشر کے دل کی پیاس، دھرمی بالک، پریمی بالک، جیسے ڈراموں میں نظر آئے گی۔

لیکن اس کے علاوہ ایک چوتھی روش جو ڈرامہ نگاری کے فن سے متعلق ہے یہ ہے کہ مکالموں کے لفظ جس قدر کم ہوں اچھا ہے۔ جذبات کا اظہار لفظوں سے نہیں بلکہ چہرے اور بدن کے دوسرے اعضا کی حرکت سے ہونا چاہیے۔ بعض ڈرامہ نگاروں نے اس روش کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اُن سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ ایسے موقعوں پر مناسب اور موزوں ترین لفظوں کا انتخاب نہیں کر سکے۔ مکالموں میں اختصار ضرور ہو گیا۔ جذبات کی ترجمانی آنکھوں کی گردش اور چہرے کی شکنوں سے ہو گئی۔ لیکن لفظوں کا جادو بے اثر رہا۔ اور یہ ایک بہت بڑی ناکامی ہے۔ اس لئے ایک نقاد کو ڈرامہ کی زبان اور مکالمہ پر نظر ڈالتے وقت یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ لفظوں اور جملوں کے اختصار سے کہیں اُن کا اثر تو غائب نہیں ہو گیا۔ مثال کے طور پر نیو تھیٹرس کا ڈرامہ محبت کی کسوٹی (روپ لیکھا) دیکھئے۔ اس میں ڈرامہ نگار نے زبان کے ابتدائی تین منازل کو پیچھے چھوڑ کر اس کی چوتھی اور اصولی روش اختیار کی ہے۔ ہر جگہ جذبات کی ترجمانی کردار کے چہرے اور حرکات سے ہوئی ہے۔ لفظوں کا استعمال بہت کم ہے۔ لیکن ایک آدھ موقع کے

سوا کوئی موقع ایسا نہیں۔ جہاں لفظوں میں جملوں کا اثر نہ ہو۔ اختصار میں گہرے معنی پوشیدہ نہ ہوں۔ قطرے سے سمندر کا کام دیا گیا ہو، اور یہی ہے فن کی تکمیل۔ اشوک، اروپ، سادھو، جس کی گفتگو کو سُنیئے فطرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوگی۔ جہاں صرف حرکت کسی جذبہ کی ترجمانی کر سکتی تھی۔ زبان کو تکلیف نہیں دی گئی۔ جہاں صرف لفظ مقصد کو پورا کر سکتے تھے وہاں جملے نہیں بیسے گئے۔

زبان کی ان روشوں کو دیکھنے کے بعد ایک نقاد کی حیثیت سے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ اُردو ڈراموں میں ایک ہی وقت میں زبان اور مکالموں میں چار ایسی روشیں کیوں جاری ہیں جن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس پر زیادہ غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہر ڈرامہ کی زبان کی تنقید اُس کے ماحول پر نظر ڈال کر ہونی چاہیئے۔ نظم کے مکالمے اب سے پچاس برس پہلے کی چیز ہے اس لئے اُس وقت کے ڈراموں میں پسندیدہ۔ مسجع اور مقفّٰی نثر اب سے پچیس برس پہلے کی چیز ہے اس لئے اُسی وقت کے ڈراموں کے لئے موزوں۔ صرف شاعرانہ تخیلیں اب سے دس برس پہلے چھُٹ گئیں۔ اس لئے ہماری دُنیا میں اُن کا ہونا غیر ضروری ہو ان بتوں کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ جب زمانے نے خود پرستاریِ زبان کا ایک سیدھا سادا اور مختصر سا بت کھڑا کر لیا ہے تو ہمیں اُسی کی پرستش کرنی چاہیئے اور اپنے ڈراموں میں صرف زبان کی چوتھی روش کی تلاش۔

زبان کے متعلق جو کچھ مختصر طور پر لکھا گیا وہ ڈرامے کو مجموعی حیثیت سے نظر میں رکھکر! ور اس لئے یہ اُصول صرف اُس کی مجموعی تنقید کرتے وقت کارگر ہو سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک ہی ڈرامے میں چار ایسے کردار ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک ہر بات شاعرانہ انداز میں کرنے کا عادی ہے اور ایک کو صرف خشک فلسفیانہ فقروں سے محبت ہے۔ تیسرا خاموشی کو اپنی گفتگو سمجھتا ہے اور چوتھے کے نزدیک ایک داستان مختصر جملے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہرا یہ بات دقّت طلب نظر آئے گی۔ لیکن اس کا اُصولی علاج یہ ہے کہ کیا ان چاروں متضاد افراد کو ہمارے سامنے پیش کرتے وقت ڈرامہ نگار نے ان کی انفرادی خصوصیتوں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو قابلِ الزام نہیں۔ ایسی صورت میں ڈرامہ نگار کا فرض اب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان چاروں کی انفرادی خصوصیات کو آخر تک قائم رکھے۔ اگر وہ اس بات میں کامیاب ہو گیا تو اُس پر اعتراض کرنے والے دیوانے۔

زبان کا ایک اور مسئلہ جسے صرف ڈرامہ ہی سے تعلق نہیں آج کل بہت پیش پیش ہے۔ ہندی اُردو پر اتنا گہرا اثر کر رہی ہے کہ ڈرامہ نگار بلا پس و پیش ہندی اور اُردو کے ایسے لفظوں کو ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں جن کی آواز میں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دو سوتیلی ماؤں کی اولادیں ہیں جو مل کر بیٹھنا جانتی ہی نہیں۔ ایک گورا ایک کالا۔ ایک موٹا ایک دُبلا۔ ایک پری رو ایک دیوزاد بھلا انہیں کون اور کس طرح ملائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے نقاد سختی کے ساتھ اس پر تنقید کریں کہ ڈراموں میں ایسی زبان نہ استعمال کی جائے کہ لفظوں اور جملوں میں زمین آسمان کا تفاوت ہو۔

ہندی بھی ہماری ہے، اُردو بھی لیکن اسی حد تک جہاں ان کو شیر و شکر کیا جا سکے۔ جب یہ منزل دور ہو گئی تو ہم دونوں سے بیگانے ہو جائیں گے۔

سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے

بادشاہ دہلی کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر

مسٹر ولیم لیڈورڈز نے ایک کتاب "Reminiscences of a Bengal Civilian"
(ایک بنگالی سول افسر کے مشاہدات) تحریر کی تھی جس میں دربار دہلی اور غدر کے بہت سے دلچسپ واقعات ہیں۔
اس میں ایک قدیم دستاویز "بادشاہ دہلی کے حضور میں آخری نذر" کے عنوان سے بھی بطور ضمیمہ شامل ہے۔
اس نذر کے حالات جو انگریز افسروں نے "یادداشت" کے طور پر مرتب کر کے ولایت بھیجے تھے اور جس سے اس
عہد کے دربار دہلی پر کافی روشنی پڑتی ہے اس قابل ہے کہ قارئین ساقی کے لئے بطریق نمونہ یہاں پیش کی جائے۔
یادداشت حسب ذیل ہے۔ اگرچہ طرز بیان معاندانہ ہے، اور جو قدرتی ہے، لیکن پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ظفر قریشی

جس روز ہمارا کیمپ دہلی میں ہوا، ہمیں معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت شہنشاہ ہند بیمار ہیں۔ اور قدیم رواج کے مطابق گورنر جنرل ہند یا اسکے نمائندوں کو مزاج پرسی کے لئے حاضر ہونا اور کچھ مبلغات بطریق "نذرانہ" پیش کرنا ضروری ہے۔ کمپنی کے پرانے ریکارڈ نکال کر دیکھے گئے اور اُن میں مختلف حالات پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ اگرچہ گورنر جنرل ہند اور بادشاہ دہلی کے درمیان "کوئی" کا رابطہ نہیں تھا لیکن پھر بھی گورنر جنرل ہند کو سال بہ سال بادشاہ دہلی کے حضور میں ایک نذر پیش کرنی ضروری ہوتی تھی۔ نذر پیش کرنا اور اعلیٰحضرت مغل شہنشاہ کی مزاج پرسی کرنا دراصل اس بات کا ثبوت اور نشان تھی کہ ہم ہندوستان کے حصص و اقطاع پر بادشاہ کے کارندے اور باجگزار کی حیثیت سے حکومت کرتے ہیں۔ اور بادشاہ کے سامنے اپنی عقیدت و محکومیت کا ثبوت پیش کرنا ہمارے لئے ازحد ضروری تھا۔ نیز کچھ طلائی مُہروں کا "نذرانہ" بھی رواج کے مطابق ضروری تھا۔

چونکہ یہ ایک قدیم رواج اور ہماری اطاعت گذاری ایک مانی ہوئی بات تھی اس لئے گورنر جنرل سے استفسار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور میں مسٹر طامسن کے ہمراہ بادشاہ عالی جاہ مغل شہنشاہ ہند کے حضور میں طلائی مہروں کے ریشمی تھیلیاں اور دیگر تحائف لیکر بعد آداب و خصوصیات مشرقی ہم اپنے کیمپ سے روانہ ہوئے۔

جلوس کی روانگی کی صورت یہ قرار پائی کہ اعلیٰ افسرانِ وفد اور طلائی مہروں کی تھیلیاں ہاتھیوں پر بار کی جائیں۔ ان کے آگے اور پیچھے گورہ دستہ اور نشان انگلشیہ ہو۔ ہم کو یہ بھی ہدایت ہوئی تھی کہ بادشاہ کے حضور میں جوتے اتار کر اور جُھک کر پہونچنا چاہیئے۔ اور مشرقی دربار میں اس ادب کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارے کیمپ کے لوگ بے دست و پا بادشاہ کے سامنے اپنی اس تذلیل کو قطعی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت تک جو رواج قائم تھا اُسے دُور کرنا یا ایکدم بغاوت کر کے اُسے پس پشت ڈالدینا بھی ہمارے بس کی بات نہ تھی اس لئے بادلِ ناخواستہ میں نے اور سب نے یہ بات منظور کرلی اور نذر پیش کرنے والا جلوس قلعہ دہلی کی جانب بڑھنا شروع ہوا۔

ہم نے اپنے جوتوں پر ریشمی غلاف بہن لئے لیکن "دربار عام" میں جُھک کر پہونچے اور "کورنش" اور کرنے کے

لوازمات سے تب بھی مفر نہ ہوا۔

جب ہم شہ نشین کے نیچے پہونچے تو دربار لگا ہوا تھا۔ ہمارے پہونچتے ہی ایک پردہ ہٹا اور [illegible] رکھا ہوا دیکھا۔ اگرچہ تخت طاؤس جا چکا تھا لیکن تیموری خاندان کی تسلی ہوتی اگر دارالحکومت دہلی میں کوئی شاہی تخت نہ ہوتا۔ اس لئے ہم نے جیسا تخت دیکھا وہ بھی آن بان میں کچھ کم نہ تھا۔ بادشاہ دہلی ایک نہایت بوڑھا اور ضعیف و نحیف انسان تھا۔ آلتی پالتی مارے گاؤ تکیوں سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے زوال و انحطاط کے آثار نمایاں تھے جو شاید آنے والے واقعات کا عکس تھے۔ مگر اس وقت ہمیں صرف جسمانی کمزوری اور طوالت عمر کے طبعی نشانات محسوس ہوتے تھے۔

ہم نے تخت کے قریب پہونچکر ایک ایک دفعہ بوسہ دیا اور اپنے اپنے ہاتھوں کی تھیلیاں، جن میں کافی طلائی مُہریں تھیں گذرانیں اور اعلیحضرت کے مزاج کے متعلق مشرقی طریق پر ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا۔

چونکہ یہ آخری نذر تھی جو کسی باقاعدہ خراج دہندہ اور ماتحت نے آلِ تیمور کے سامنے پیش کی۔ اس لئے بہت زیادہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں جس وقت اپنی نذر لیکر اوپر چڑھا، میرے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ میرے سامنے قدیم مغل بادشاہوں کی وسیع سلطنت، دبدبہ اور حیرت انگیز طاقتوں کا منظر تھا۔ اور جب اس بادشاہ کو دیکھتا تھا تو انقلابِ زمانہ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آداب عرض کیا اور نذر پیش کی جسے بکمال مہربانی قبول کر لیا گیا۔ برطانوی سلطنت کی جانب سے مغل بادشاہ کے حضور میں یہ آخری نذر تھی۔ اس کے بعد مغلوں کو ہم سے ایک پائی لینی بھی نصیب نہ ہوئی۔

مغل بادشاہ نے ہماری نذروں کو قبول فرما کر ہمیں خلعت اور طلائی صافے پہنائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ پورے آدابِ مُغلیہ کے ساتھ ان احکام پر عمل کیا گیا اور دربار کے اس آخری منظر سے متاثر ہو کر ہم نے پھر آداب اور کورنش بہ انداز مقررہ ادا کیا اور رخصتی جملے جس میں اپنی اطاعت گذاری کا یقین اور ان کے اقبال و دولت کی ترقی کے الفاظ تھے پھر دُہرائے اور قلعہ سے رخصت ہوئے۔

ہم اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوئے اور جلوس پھر آراستہ کیا گیا۔ بادشاہ دہلی کی خوشی اور حکم کے مطابق ہمارا جلوس دہلی کے بڑے بڑے بازاروں میں سے نکلا جس کے ہمراہ شاہی افواج اور انتظام کرنے والے بھی تھے اور ہر جگہ یہ چرچا تھا کہ "بادشاہ غازی نے ان کو شرف باریابی بخشا ہے" اس لئے ان کی نمائش و جلوس اہلِ دہلی کے علم و خوشنودی کے لئے بازاروں میں سے گذارا جا رہا ہے۔

ہمارے جسموں پر مشرقی طریق کے جو زرباد اور قیمتی لباس پڑے ہوئے تھے انہوں نے ہمیں ایک عجیب مضحکہ خیز چیز بنایا تھا اور ہمارے دل میں سنجیدگی اور متانت کے کوئی جذبات نہ تھے۔ لیکن لوگ شاید ہمیں قدر کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ مجھے تو اس لباس سے اس قدر شرم آئی کہ میں نے اپنے ہاتھی کو کیمپ کی جانب کر دیا اور کیمپ میں پہونچکر ان کپڑوں کو فوراً اتارا۔ اس اثنا میں کرنل براڈفٹ اور دوسرے ساتھی بھی آ گئے۔ اور ہم سب نے یہ لباس اُتارا اور آدمی کی صورت بنے۔

اس کے بعد ہم سب گورنر جنرل صاحب کے خیمہ میں گئے اور وہاں جا کر آج کے تمام حالات سنائے لیکن گورنر جنرل صاحب

ہم ہیں بحیثیت ناظر ہوتے کہ بغیر اُن کی مرضی کے بادشاہ دہلی کو کیوں نذر پیش کی گئی۔

اُنہوں نے بیان کیا کہ اس نذر کی پیشی اور دیگر رسوم کی ادائیگی سے ہم نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ملکۂ وکٹوریہ کی سلطنت مُغل بادشاہوں کی باجگذار اور اطاعت گذار و ماتحت سلطنت ہے اور ہم ہندوستان پر مغل بادشاہ کی مرضی اور رعایت کی وجہ سے حکومت کر رہے ہیں۔ چونکہ ایسا کرنے سے حکومت انگلشیہ کی توہین ہوتی تھی۔ اور نظر دینا اب ضروری نہیں تھا اس لئے ہم تینوں افسروں کا یہ اقدام غیر مآل اندیشانہ قرار پایا۔

گورنر جنرل نے بتایا کہ اب حکومت انگلشیہ کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ اطاعت گذاری کی جائے اور نذریں پیش کی جائیں۔

گورنر جنرل نے اُسی وقت احکام جاری کئے کہ ہندوستان کے کسی حصہ سے کوئی برطانوی باشندہ یا باشندگان کسی حیثیت سے بھی بادشاہ دہلی کو نذر یا خراج پیش نہ کریں۔ نیز اس بات کی تحقیق کرائی گئی کہ اس سال میں کس قدر روپیہ بطور نذر اعلیحضرت بادشاہ دہلی نے وصول کیا تھا۔ اس روپیہ کے موازی روپیہ بادشاہ کے وظیفہ میں برطانوی خزانہ سے دیا جانا منظور کیا گیا لیکن آئندہ نذریں دینی بند کرائی گئیں اور کوئی رسمی بات نہیں ہوئی۔ ہاں زرِ نقد بادشاہ کو غدر تک دیا جاتا رہا جس کی شکل وظیفہ کی سی رہی اور جس کی کمی و بیشی کا حکام انگلشیہ کو اختیار رہا لیکن نذر اس واقعہ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی۔ یہ آخری دربار تھا جو تیمور کی اولاد میں سے کسی نے کیا اور جس میں فرنگیوں نے ماتحت ہونے کی حیثیت سے شرکت کی اور نظر گذرانی۔ یہ بادشاہ دہلی کی آخری نذر تھی۔

ظفر قریشی۔ بی۔ اے دہلوی

نذرِ غالبؒ

درد ہو تو دوا کرے کوئی — مرنے والے کا کیا کرے کوئی
ہو چلے پھر لبِ شکایت بند — پھر قیامت بپا کرے کوئی
نہ سہی عشق دل لگی ہی سہی — روئیں ہم اور ہنسا کرے کوئی
فیصلہ ہو رہا ہے قسمت سے — آ نہ جائے خدا کرے کوئی
جان دے کر بھی بے وفا ٹھہرے — کیا کسی سے وفا کرے کوئی
کھو دیا راہِ کس میپُرسی میں — تم کو اور رہنما کرے کوئی
تم وفا سے نہ ہاتھ اُٹھاؤ تپش — بے وفا ہے ہوا کرے کوئی

عبداللطیف تپش

کلامِ بیخود

یقیں ہے دست رنگیں سے کریگا قتل تو مجھکو
کہ آتی ہے پسینہ سے مرے مہندی کی بو مجھکو

سُناؤں پھر نہ میں تجھکو جلائے پھر نہ تُو مجھکو
خدا ایسا کرے ہو جائے اپنی آرزو مجھکو

جفاؤں سے محبت کے سبق دیتا ہے تو مجھکو
بجا ہے سچ کہا ناآشنائی کی ہے خو مجھکو

تڑپنے دے دبا زانو سے لے قاتل نہ تو مجھکو
وہانِ زخم سے کرنی ہے شرحِ آرزو مجھکو

جفا کا شوق ہے تجھکو ستم سہنے کی خو مجھکو
رہا کرتی ہے تیری آرزو کی آرزو مجھکو

صفات و ذات کا نظارہ وہ بھی بزمِ دُشمن میں
وہ جل کر خاک ہو دیکھے جو تیرے روبرو مجھکو

وہ بعد فاتحہ میرے تصور سے یہ کہتے ہیں
تری تربت پہ لائی ہے وفا کی جُستجو مجھکو

شریکِ رنج و راحت میں کسی کا ہو نہیں سکتا
بکتا کر دیا تو نے دلِ بے آرزو مجھکو

نظر میں کھپ گئی ہے ناخن وحشت کی گلکاری
بُرا معلوم ہوتا ہے گریباں کا رفو مجھکو

قیامت میں مری تُربت پہ ہو کر کون گُذرا تھا
جگا کر کھینچ لائی گیسوئے مشکیں کی بو مجھکو

یہ پردے کی نرالی طرز سے پردہ نشیں نکلی
جب آنکھیں بند ہوتی ہیں نظر آتا ہے تُو مجھکو

کہیں عالم میں مجھ سا خود غرض عاشق بھی ہوتا ہے
یہ تیرا حُسنِ ظن رُسوا کریگا چارسو مجھکو

یہی اشکِ ندامت میری بخشش کا سبب ٹھہرے
انہیں موتی کی لڑیوں سے ملی ہے آبرو مجھکو

عدم چھڑوا دیا۔ دُنیا کو چھوڑا۔ قبر چھوڑوں گا
یقیں ہے خلد تک لیجائے اس کی جُستجو مجھ کو

جنابِ شیخ کی دعوت بھی ہو روزہ کُشائی بھی
کہیں سے ہاتھ آ جائے اگر بے رنگ وبو مجھکو

عدو کی بزم میں پینے کو جو ساغر اُٹھاتا ہوں
اسی ساغر میں آتا ہے نظر دل کا لہو مجھکو

مری ہستی سے رونق مٹ رہی ہے بزمِ دُنیا کی
چراغِ صبح ہوں لے شمع کیوں روتی ہے تو مجھکو

شرابِ عشق سے مدہوش رہتا ہوں مگر بیخود
فرشتہ بھی چھو سکتا نہیں ہے بے وضو مجھکو

بیخود دہلوی

سچّی کہانی

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں"۔ مجھے خود اپنی زندگی میں بارہا ایسے واقعات پیش آئے جو افسانوں میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

میں نے اپنے تجربہ کار دوستوں کے مشورہ کے مطابق لندن پہنچکر کسی ہندوستانی سے میل جول نہیں بڑھایا مگر مسٹر فریدی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اور دراصل اُن سے تعلقات کا پیدا کرنا اور بڑھنا خود اُنہیں کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ تھا۔ وہ ہمارے کالج یونین کے سکرٹری بھی تھے۔ اُن کی تحریک پر ایک روز میں نے اپنی سیاحتِ ایران کے متعلق یونین میں لکچر دیا۔ تقریر بہت کامیاب رہی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جب میں ہال سے نکلنے لگا تو پروفیسر مارٹسین نے دو ماں بیٹیوں سے میرا تعارف کرایا جو لکچر سُننے کے لئے شہر سے آئی تھیں۔ لڑکی کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہی کالج میں پڑھتی تھی اُس کا نام آیوا تھا۔ آیوا کی عمر اسوقت سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لندن کے دوسالہ قیام اور سفرِ یورپ کے دوران میں جمال و رعنائی کی ایسی کمل تصویریں میں نے دوچار سے زیادہ نہیں دیکھیں۔ جہاں آیوا موجود ہو وہاں کوئی شخص یہ سوچنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ انگریز عورتیں معیاری حُسن سے عاری ہوتی ہیں۔ میں نے اکثر اُسے لائبریری میں لُغت کی مدد سے فارسی کی کتابیں پڑھتے دیکھا تھا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ وہ فارسی پر اتنی محنت کیوں کرتی ہے۔ مگر کوئی معقول وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔

مسز براؤن یعنی آیوا کی والدہ گو دیکھنے میں خاصی سن رسیدہ معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اُن کی عمر کُل ۴۲ سال تھی۔ پروفیسر مارٹسین نے بیان کیا کہ ان کے شوہر کا جوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا اور اسی غم نے اُنہیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ مسز براؤن نے تعارف کے بعد میری تقریر کی بہت تعریف کی اور اگلے اتوار کو اپنے یہاں چاء کی دعوت دی۔ میں بعض وجوہ سے اس دعوت کے قبول کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا مگر فریدی نے خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے ہوئے مذاق کے طور پر کہا کہ "اگر آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو میں انہیں زبردستی کھینچکر لے آؤں۔ دراصل یہ لندن میں میرے بغیر کہیں نہیں جاتے"۔ میں نے کہا "مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔ اسی کو کہتے ہیں۔ بہرحال اگلے اتوار کو ہمارا مسز براؤن کے یہاں چاء پر جانا طے پاگیا۔

فریدی کئی برس انگلینڈ میں رہ چکے تھے پھر بھی پابندیِ وقت کے معاملہ میں پکّے ہندوستانی تھے۔ بارہا تجربہ ہوچکا تھا کہ خواہ کہیں جانا ہو وہ کبھی ٹھیک وقت پر نہیں پہونچ سکتے تھے۔ عید کی نماز کے لئے ووکنگ تشریف لے گئے تو ایسے وقت پہونچے کہ نماز ہوچکی تھی۔ خیر خطبہ میں شریک ہولیئے۔ ایک روز تھیٹر جانا تھا۔ سیٹیں ریزرو کرالی تھیں۔ میں تھیٹر کے دروازہ پر

انتظار کرتے کرتے اُکتا گیا اور جب تماشہ شروع ہوگیا تو اندر جا بیٹھا۔ پورے آدھے گھنٹے کے بعد آپ ہلتے ہوئے تشریف لائے اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "یار کیا بتاؤں دیر ہوگئی"۔ مگر جس دن مسز براؤن کے یہاں دعوت تھی، دوپہر ہی سے میرے یہاں آموجود ہوئے اور جلد تیار ہوجانے کے لئے تقاضے شروع کر دئے۔ مجھے حیرت تھی کہ فریدی اور اس قدر عجلت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت سے ۲۰ منٹ پہلے ہی ہم مسز براؤن کے یہاں پہونچ گئے۔ دونوں ماں بیٹیوں نے ہماری بہت خاطر تواضع کی اور نہایت پُرتکلف چاء پلوائی۔ جس کمرہ میں ہم بیٹھے تھے اُس کا ایک دروازہ باغیچہ میں کھلتا تھا۔ چاء پی کر فریدی آیوا کے لگائے ہوئے پودوں اور پھولوں کی سیر کرنے آیوا کے ساتھ باغیچہ میں چلے گئے۔ فریدی کو میں نے بارہا یہ کہتے سُنا تھا کہ "انگریزی پھول کسی کام کے نہیں ہوتے جس پھول میں خوشبو نہیں وہ بھی کوئی پھول ہے۔ اصلی اور نقلی میں پھر فرق ہی کیا۔ ایسے تو کاغذ کے بھی بن سکتے ہیں"۔ مگر اس وقت فریدی کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ قابل تعریف اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف انگریزی پھول تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص پھولوں کا اور خصوصاً انگریزی پھولوں کا عاشق ہے۔ ایک ایک پھول کی نزاکت، خوش رنگی۔ خوبصورتی اور "لطیف مہک" نیز آیوا کی خوش ذوقی کی قصیدہ خوانی میں ساری لیاقت ختم کی جارہی تھی، میں یہ سب کچھ سُن رہا تھا اور جی میں کہتا تھا کہ واقعی کسی کا اعتماد حاصل کرنے اور کسی کو موہ لینے کیلئے۔ اپنے ذاتی خیالات، نظریوں اور رایوں کی قربانی سب سے پہلی شرط ہے۔ مگر اس کے لئے بڑا جگر چاہیئے۔ ایک ہم ہیں کہ اگر سارڈین کی بو ناپسند ہے تو اب کوئی کچھ کہے اور کیسا ہی سارڈین کا دلدادہ ہو جب اظہار رائے کا موقع ملیگا تو ہم یہی کہینگے کہ سارڈین بُری اور بہت بُری۔

مسز براؤن مجھ سے ایران کے حالات بڑے شوق سے پوچھتی اور بہت دلچسپی سے سُنتی رہیں۔ کہنے لگیں آپ وہاں کسی یورپین سے بھی ملے۔ میں نے کہا ہاں طہران میں روسی اور فرانسیسی سفارتخانوں کے کئی آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ امریکن کالج کے ایک پروفیسر موسیو فیرلین سے تو خاصے مراسم ہوگئے تھے۔ بلا کا لسّان اور خوش گفتار آدمی تھا۔

"آپ دونوں ماں بیٹیوں کو ایران سے بہت دلچسپی ہے اور آیوا تو فارسی سیکھ بھی رہی ہیں۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟" میں نے ذرا تعجب کے لہجہ میں پوچھا۔ میرے اس سوال پر مسز براؤن نے ایک دلدوز آہ کی اور "کیا بتاؤں مسٹر پریم" کہہ کر خاموش ہوگئیں۔ چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنکے سینہ میں رنج والم کا ایک طوفان اُمنڈ رہا ہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اُن کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔ میں چاہتا تھا کہ مسز براؤن سے اس گریۂ بے اختیار کا سبب پوچھوں۔ مگر یہ پہلی ملاقات تھی۔ پہلے ہی سوال کا جواب کیا ملا تھا جو اسکا ملتا اس لئے میں سوچنے لگا کہ کس طرح موضوع گفتگو کو بدلا جائے۔ اتنے میں مسز براؤن نے مجھ سے کہا:۔

"مسٹر پریم۔ کیا آپ ہم پر ایک عنایت کریں گے؟"

"فرمائیے"۔

اتنے میں آیوا اور فریدی بھی کمرہ میں آگئے۔ فریدی میرے پاس اور آیوا اپنی ماں کے پاس صوفہ پر بیٹھ گئی۔

"پروفیسر مالیسن نے مجھ سے بیان کیا کہ فارسی آپ کا خاص مضمون ہے اور فارسی بولنے کا آپکو خاص ملکہ ہے!" مسنر براؤن نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آیوا کو زمانۂ حال کی گفتاری فارسی سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر یہاں کوئی ڈھنگ کا سکھانے والا نہیں ملتا۔ کالج جاتے بھی اسے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔ فارسی کچھ لکھ تو لیتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ اگر آپ مہربانی فرما کر اسے ہفتہ میں گھنٹہ دو گھنٹے وقت دیدیا کریں تو یقیناً کچھ نہ کچھ سیکھ جائیگی۔"

مسنر براؤن جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھیں، فریدی کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ فطرتِ مسرت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہفت اقلیم کے خزانے اس شخص کے تصرف میں آ گئے یا کم ازکم دہلی کا تخت مل گیا۔ اُن کا بس نہ تھا ورنہ میری طرف سے فوراً کہدیتے کہ "بسر و چشم" مگر میری اور اُن کی مصلحتوں میں فرق تھا۔ اس لئے میں نے ایک دو منٹ خاموش رہنے کے بعد جواب دیا کہ :-

"مسنر براؤن! آپ کی خواہش کے پورا کرنے میں یوں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر آپکو معلوم ہو کہ یہاں سے میرے قیامگاہ کا فاصلہ چودہ پندرہ میل ہے کم ازکم دو ڈھائی گھنٹے تو آمد و رفت میں لگ جائیں گے۔ میں بہت عدیم الفرصت ہوں۔ پابندی کے ساتھ ہفتہ میں دو مرتبہ کیا ایکمرتبہ یہاں آنا بھی میرے لئے مشکل ہوگا۔"

"لیکن آپکو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آیوا خود آپکے یہاں چلی جایا کریگی۔" مسنر براؤن نے کہا۔

"جی ہاں جس دن آپکو فرصت ہو میں حاضر ہو جایا کرونگی۔" آیوا نے ماں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ آیوا کا یہ کہنا تھا کہ معلوم ہوا فریدی کو جنت کی کنجیاں مل گئیں۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بیساختہ بول اُٹھے "بس تو پھر کیا دقت ہے۔" مگر دقت ہنوز باقی تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری اور فریدی کی مصلحتوں میں فرق تھا اس لئے میں پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اب انکار کا کونسا پہلو اختیار کروں۔ میری لینڈ لیڈی مسنر باسورتھ عجیب قسم کی عورت تھی۔ نہ معلوم اُسے میرے بزرگوں اور سرپرستوں کی قائم مقامی کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا تھا۔ وہ خود کو میرا اتالیق خیال کرتی تھی اور اُسے کسی طرح گوارا نہ تھا کہ کم ازکم اُس کے مکان پر کوئی نوجوان لڑکی مجھ سے ملنے آئے۔ خواہ اس ملاقات کی غرض کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ دو دو دن تک بات نہ کرتی۔ کھانے اور آسائش کے دوسرے انتظامات میں خلل پڑ جاتا۔ میں اُسے چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ جو سہولتیں اور آرام مجھے وہاں میسّر تھا دوسری جگہ اُس کا تصوّر بھی محال تھا، خصوصاً دوگنی ہفتہ میں۔ اب آیوا اگر میرے یہاں آتی تو مسنر باسورتھ سے روزانہ کلکل ہوتی اور میں "خانہ جنگی" کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ مسنر براؤن پھر بولیں :-

"ہاں ایک بات تو میں کہنا بھول ہی گئی۔ ہم لوگ دولتمند نہیں ہیں۔ تاہم اس زحمت کا جو مناسب معاوضہ آپ تجویز فرمائیں وہ ہم بخوشی آپکی نذر کریں گے۔"

فریدی میرے سکوت سے مضطرب ہو رہے تھے۔ کوئی دو منٹ خاموش رہنے کے بعد میں نے کہنا شروع کیا۔

"بات یہ ہے مسنر براؤن......" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ میری کمر میں کسی کیڑے نے بڑے زور سے کاٹ

کھایا اور میں اُچھل پڑا۔ دراصل کیڑے نے نہیں کاٹا تھا مسٹر فریدی نے چٹکی لی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں بہانہ کر رہا ہوں لہذا قطع کلام کا یہ نرالا پہلو نکالا۔ اور فوراً میرے بہت قریب ہو کر آہستہ سے اُردو میں کہا "اللہ ...
وہ اسوقت سراپا یاس بنے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سنگین جرم کی پاداش میں ابھی ابھی انہیں سزائے موت کا حکم سُنایا جانے والا ہے۔ اور کچھ اس ستمرحمانہ انداز سے اُنہوں نے میری طرف دیکھا کہ میں تو خیر یوں بھی ایک کمزور دل کا آدمی ہوں۔ میری جگہ اگر تیمور لنگ بھی ہوتا تو اُسے ترس آجاتا۔ چارو ناچار مجھے کہنا پڑا کہ "اچھی بات ہے سنیچر کے دن دو بجے آپ میرے یہاں آسکتی ہیں"۔ یہ جملہ میں نے ایوا سے مخاطب ہو کر کہا تھا جس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرے قیامگاہ کا پتہ اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ وقت کافی ہو چکا تھا لہذا اب ہم لوگ دونوں ماں بیٹیوں کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر کسی دن ملنے کا وعدہ کرکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ایوا کے ساتھ ساتھ فریدی نے بھی مجھ سے فارسی پڑھنا شروع کردی۔ ہر وقت آمدنامہ جیب میں رکھے پھرتے تھے مگر اُن کی فارسی "بلی"، "نہ خیر"، اور "خیلی خوب" سے آگے نہ بڑھی۔ دراصل وہ اپنا زیادہ وقت اور توجہ فارسی کے بجائے ایوا کے پڑھنے میں صرف کرتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ تین ہی مہینے میں ایوا کو جیسا وہ سمجھ سکتے تھے کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ ایوا نے جب میرے یہاں آنا شروع کیا تو مسز باسورتھ نے بہت "غرفش" کی مگر جب دیکھ لیا کہ مجھے ایوا سے کوئی "ذاتی" دلچسپی نہیں تو ناشتہ اور کھانے میں دو ہفتے تک جو کمی کی تھی اُس کا بدل کردیا۔ اس دوران میں فریدی نے کئی مرتبہ دونوں ماں بیٹیوں کو چاء اور کھانے پر بلایا اور مسز براؤن نے بھی تین مرتبہ ہم لوگوں کی دعوت کی۔ ایوا اب فریدی سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ فریدی نے شام کو میرے ساتھ رہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اور ایوا اب ایک ورق کے دو صفحے ہو کر رہ گئے تھے۔ جب دیکھو ساتھ ساتھ اُن کی اکثر شامیں ایک دوسرے کی صحبت میں گزرتی تھیں۔ مسز براؤن مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھیں، ایک دن جبکہ میں اُن کے یہاں بیٹھا چاء پی رہا تھا اور فریدی اور ایوا ٹینس کھیلنے کے لئے باہر جا چکے تھے۔ میں نے چاء کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "مسز براؤن۔ آپ کی زندگی تو سرتاپا ایک راز معلوم ہوتی ہے۔ راز کیا بلکہ مُعمّہ جسے میں کبھی نہ سمجھ سکا اور یقیناً آپ کے بتائے بغیر کبھی نہ سمجھ سکونگا"۔ مسز براؤن کے ہونٹوں پر ایک غم آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگیں:۔

"مسٹر بریم۔ آپ سے کچھ پردہ نہیں۔ مگر واقعات اس درجہ اندوہناک ہیں کہ سُنیئے گا تو خواہ مخواہ آپ کو بھی رنج ہوگا۔ اور کچھ حاصل نہیں۔ اسی لئے میں نے کبھی اس ذکر کو نہیں چھیڑا"۔

"شاید میں آپکی کچھ مدد کرسکوں"، میں نے کہا۔

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ مگر مسٹر بریم، میرا مرض علاج کی حد سے گذر چکا ہے۔ پھول مُرجھا کر بھی کبھی پھر شگفتہ ہوا ہے؟" یہ کہہ کر مسز براؤن نے ایک دلدوز آہ کی اور آج پھر دو آنسو اُن کے رُخسار پر ڈھلک پڑے۔ مسز براؤن کی سوگوار حالت دیکھکر ہمیشہ میری طبیعت متاثر ہوتی تھی اور اس وقت تو وہ ایک اندوہ مجسم

"مسٹر براؤن!" میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "میں فطرتاً غمدوست واقع ہوا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح کو بیدار کرنے کے لئے کشاکشِ حیات کے الم انگیز افسانے، عیش و نشاط کی داستانوں سے کہیں زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کی دکھ بھری کہانی ضرور سنونگا۔ سنائیے اور تفصیل سے سنائیے۔"

مسز براؤن نے رومال سے اپنے اُن آنسوؤں کو خشک کیا جو ابھی آنکھوں سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اس کے بعد گردن کو ایک جھٹکا دیکر بائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی طویل داستان نہیں۔ سُنئے اور سُنکر میری بدبختی پر آپ بھی دو آنسو بہا لیجئے۔ یہ واقعہ آغازِ بہار ۱۹۱۳ء کا ہے۔ مگر اٹھارہ برس گذرنے کے بعد بھی اُس کی یاد اسی طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات۔ میں اسوقت جوان تھی۔ زندگی کی چوبیسویں منزل میں قدم رکھا تھا۔ یہ کُملایا ہوا چہرہ ہمیشہ سے ایسا ہی نہ تھا۔" مسز براؤن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کہنا شروع کیا۔ "میری بربادی کا باعث وہ شخص ہوا جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اُس کا نام پرسی تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑا تھا۔ پرسی کی محبت سمندروں کی طرح اتھاہ اور طوفانوں کی طرح پُرشور تھی۔ وہ مجھے کوئی ارضی مخلوق نہیں سمجھتا تھا بلکہ اُسکے نزدیک میں ایک فردوسی حور تھی جو اُس کی زندگی کو یکسر رنگ و بُو اور جاودانی بنا دینے کے لئے انسانی پیکر میں زمین پر بھیجدی گئی تھی۔ وہ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجتا تھا۔ مجھے دیکھکر جیتا اور میرے اشاروں پر جان قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا۔ پرسی جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ برسرکار تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ میرا پرستار تھا۔ اُسکی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث میرے والدین اُسے بیحد پسند کرتے تھے۔ مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ مجھے کبھی اُس سے دلی لگاؤ پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی قدردانیاں اور قربانیاں دیکھ دیکھ کر مجھے ترس بھی آتا تھا۔ مجھے اُس سے بے انتہا ہمدردی تھی اور میں حتی المقدور اُس کے جذبات کا احترام بھی کرتی تھی مگر مجھے اُس سے اتنی محبت نہ تھی جتنی ایک چرواہے کو اپنے گلّہ کے پاسبان کتے سے ہوتی ہے۔ اُس نے کئی بار مجھ سے شادی کی درخواست کی مگر میں نے ہمیشہ یہی کہکر انکار کر دیا کہ "افسوس پرسی مجھے تم سے محبت نہیں اور میں تمہیں دھوکا دینا نہیں چاہتی۔" پرسی میری صاف گوئی سے کبھی بددل نہیں ہوا۔ اُس کی محبت کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ رفتہ رفتہ میرے خیالات بدل جائیں گے اور ایک دن میں اُس کی شریکِ زندگی بن کر رہونگی۔ میں خود بھی جانتی تھی کہ پرسی جیسا محبت کرنے والا قدردان شوہر اگر چراغ لیکر ڈھونڈونگی تو بھی مجھے نہ ملیگا۔ مگر میں اپنے دل کو اُسکے ساتھ محبت کرنا نہیں سکھا سکتی تھی۔

ایک شب کو پرسی مجھے ایک جگہ ڈانس (رقص) میں لے گیا۔ تھوڑی دیر ڈانس کرنے کے بعد جب ہم چائے پینے کے لئے بیٹھے تو میری نظر ایک نوجوان پر جا پڑی جو کچھ دُور بیٹھا ہوا بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پرسی کی اُس طرف پیٹھ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی۔ اُس کی صورت دیکھنا اور دیکھتے رہنا آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہماری نگاہیں ملیں بیک وقت ہم دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی مگر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ میں کیا کر رہی ہوں اور میں نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ سر جھکا لیا۔ مگر درحقیقت میری یہ بے نیازی مصنوعی تھی آنکھوں سے

زیادہ دل اور دل سے زیادہ آنکھیں اُس ناآشنا کو دوبارہ دیکھنے کیلئے آرزومند تھیں۔ میں نے پھر سر اُٹھایا [illegible] جا وہ مگر ابھی تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ خیال جو اُس طرف مصروف ہوا تو میں کچھ کھوئی کھوئی سی [illegible] چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے اُلٹ گئی جس نے مجھے چونکا دیا اور وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ابھی ہم [illegible] کر رہے تھے کہ برابر سے آواز آئی۔

"ہیلو پرسی!" ہم دونوں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہی مقناطیسی آنکھوں والا اجنبی ہمارے برابر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو ایڈی!" پرسی نے فوراً جواب دیا اور گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر مجھ سے تعارف کرایا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔ ایڈی پرسی کا ہم سن بچپن کا دوست اور اسکول فیلو تھا۔ ملازمت کے سلسلہ میں مانچسٹر سے تبدیل ہو کر کل ہی لندن آیا تھا۔ حسن اتفاق بلکہ سوئے اتفاق کہنا چاہیئے کہ وہ شام کی تنہائی سے گھبرا کر یہاں ناچ گھر چلا آیا تھا۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر وہاں اور ٹھہرے اور اس اثناء میں میں نے ایڈی کے ساتھ بھی کئی مرتبہ رقص کیا۔ رقص میں یہ کیفیتِ سرور مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، ایک بیخودی سی میرے حواس پر چھائی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہیں ہوا میں اُڑ رہی ہوں۔ ایڈی کا مضبوط ہاتھ میری کمر کے گرد مجھے ایک پھول کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ میرا دل اندر زور سے دھڑکتا تھا اور بار بار جسم میں ایک سنسنی سی پیدا ہوتی تھی، اثنائے رقص میں جب وہ یکایک مجھے بھینچ لیتا تو میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ جاتی۔ قلب میں اس قسم کی سرور انگیز خلش میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ پرسی کے ساتھ میں نے سینکڑوں مرتبہ رقص کیا تھا۔ مگر بالکل مشین کی طرح۔ جذبات کو اس میں ذرا سا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ مگر اُس وقت .... بس کیا بتاؤں کیا کیفیت تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ زندگی تمام ہو جائے اور یہ رقص کبھی تمام نہ ہو۔

اُس رات کو میں نے کئی مرتبہ ایڈی کو خواب میں دیکھا۔ کبھی اس طرح کہ ہم دونوں ایک ہی جہاز کے مسافر ہیں اور امریکہ جا رہے ہیں، کبھی اس طرح کہ میں ہوا میں پرواز کر رہی ہوں اور ایڈی بھی میرے ساتھ ہے، پھر وہ یکایک گھبرا میں غائب ہو گیا۔

ایڈی سے چند ہی ملاقاتوں کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ اور میں برسوں کے دوست ہیں۔ پرسی کو ہمارا یہ بڑھتا ہوا ارتباط ناگوار تھا۔ وہ ہمارا یہ رنگ دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا کہ کہیں ایڈی مجھے اُس سے چھین نہ لے۔ مگر اُس بیچارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں تو پہلی ہی ملاقات میں ایڈی کی ہو چکی تھی۔ وہ ہمارے درمیان حائل ہونا چاہتا تھا مگر سیلاب کہیں تنکوں سے رُکتا ہے۔ ایک دن صبح کو وہ ہمارے یہاں آیا۔ میں حسبِ معمول ڈرائنگ روم میں اکیلی بیٹھی وائلن بجا رہی تھی، اس کے آنے پر میں نے وائلن ایک طرف رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ صاحب سلامت کے بعد ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ خلافِ معمول آج پرسی کی آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں شاید وہ تمام رات نہیں سویا تھا یا شاید رویا تھا۔ کئی منٹ تک ہم دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ پرسی [illegible] قریب آ گیا۔ اُس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ایک نہایت [illegible] مجھے دیکھنے لگا۔ [illegible]

[illegible] بہت کر اُس کی آنکھوں میں آگئی تھیں۔ اُس کی حالت بالکل مجنونوں کی سی تھی۔ اب بھی وہ خاموش تھا میں بھی خاموش تھی۔ یکایک اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اب بھی وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میری گردن سے نکالکر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اور میرے شانے پر سر رکھکر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مگر وہ آگ جو ایڈی سے پہلی ملاقات کے بعد میرے سینہ میں لگی تھی اب دور تک پھیل چکی تھی اور یہ چھینٹے اُسے بجھانے کے لئے بالکل ناکافی تھے۔ میں نے کہا۔

"پرسی۔ آخر اس سے فائدہ؟" پرسی نے سر اُٹھایا اور پھر ایک مایوسانہ نگاہ میرے چہرہ پر ڈالکر کہا:-

"کلیرا۔ کیا مجھے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے؟"

"پرسی! مجھے بہت افسوس ہے۔ مگر میں بالکل مجبور ہوں۔" میرے یہ الفاظ سُنکر پرسی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھے۔ بال درست کئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"کلیرا اب میں تمہیں تکلیف نہ دونگا۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہا اور میرے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد ایسٹ بورن[1] کے ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کے دروازہ پر لکھا تھا "مسٹر اینڈ مسز براؤن"۔ یہ کلیرا اور ایڈی تھے، جو ہنی مون منانے کے لئے یہاں آئے تھے۔

"اچھا تو ایڈی، مسٹر براؤن ہی کا نام تھا۔" میں نے مسز براؤن کا سگرٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" مسز براؤن نے سگرٹ کا دُھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "دراصل اِنکا پورا نام ایڈورڈ براؤن تھا۔ مگر بے تکلف دوست ایڈی کہا کرتے تھے۔"

"جس وقت آپ کی شادی ہوئی کیا جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔" میں نے مسز براؤن سے پوچھا۔

"نہیں۔ اِس بلائے آسمانی کے نازل ہونے میں ابھی دو مہینے باقی تھے۔ اور سچ پوچھو تو ہماری حقیقی زندگی کی کُل اتنی ہی عمر ہوئی۔ اُس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہماری خوشی اسقدر مختصر ہوگی اور مسرت کی یہ چند گھڑیاں مجھے عمر بھر خون کے آنسو رُلائینگی۔ جنگ کے چھڑتے ہی انتشار و اضطراب سارے مُلک پر محیط ہوگیا مگر ہم دونوں دُنیا و مافیہا سے بے خبر، آنے والے خطرات سے یکسر بے نیاز ہوکر، شور انگیز محبت کے ریلوں میں آنکھیں بند کئے بہتے چلے جا رہے تھے۔ ایڈی کے آغوشِ محبت میں میں اپنے آپکو دنیا کے ہر خطرہ سے محفوظ خیال کرتی تھی۔ جنگ کی دہشتوں نے شہر کو وحشتکدہ بنا رکھا تھا۔ مگر میں، میرا وائیولن، چاندنی رات، سمندر کا کنارا اور ایڈی کا مسکراتا ہوا چہرہ، یہ ہماری چھوٹی سی دُنیا ان مسرتوں سے لبریز تھی جو کائنات کی وسعتوں میں نہ سما سکیں، جدھر نظر اُٹھتی تھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کا ذرہ ذرہ

[1] ایسٹ بورن ایک چھوٹا سا ساحلی مقام ہے جو لندن سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ گرمی اور بہار کے موسم میں ہزاروں آدمی سیر و تفریح کیلئے یہاں آتے ہیں اور روزانہ ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

ہیں مسرور دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ آسمان سے خوشی برس رہی ہے۔ زمین سے خوشی اُبل رہی ہے۔ فضا خوشی سے [illegible] رنج، غم، اضطراب، دوری، مجبوری، آہیں، آنسو، ان میں سے کسی ایک لفظ کے معنی اُسوقت ہمیں معلوم [illegible] فطرت سے ہماری یہ کامرانی دیکھی نہ گئی۔ رشک ہوا۔ رشک کیوں بلکہ حسد کہنا چاہیئے۔ دیکھتے دیکھتے ہماری [illegible] گہوارہ حسرت تو نکا تابوت بن گیا۔ صبح تک سب کچھ تھا، شام ہوتے کچھ نہ تھا۔ ایڈی مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا۔ آہ کیا کہوں مسٹر پریم، کہی نہیں جاتی اپنی بربادی کی..........."

مسز براؤن کی آواز گلوگیر ہوگئی اور ناتمام جملہ ناتمام ہی رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رخساروں پر ڈھلک ڈھلک کر موتیوں کی طرح اُن کی گود میں گرنے لگے۔ "مسز براؤن، رنج و غم سے مغلوب ہوجانا رنج و غم کا علاج نہیں، دل کو سنبھالیے" میں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔ دراصل اس وقت مسز براؤن کی یہ الم انگیز حالت دیکھ کر میرا دل خود بھر آیا تھا، مگر میں نے اپنے آپکو سنبھالا۔ اُٹھ کر مسز براؤن کے برابر جا بیٹھا۔ اپنے رومال سے اُن کے آنسو پونچھے۔ دوسرے کمرے سے لا کر لیمن سکواش کا ایک گلاس پلایا۔ اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ باقی واقعات پھر کسی وقت سن لونگا۔ موضوع گفتگو کو بدلنے کے لئے میں نے پوچھا "کیا آپ اور فریڈی آج سینما جا رہے ہیں؟"

"غالباً"

"پھر ہم لوگ بھی کیوں ساتھ نہ چلیں؟"

"جیسی آپ کی خوشی"

"تو پھر اُٹھیئے، تیار ہو جائیے" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیے ابھی جلدی کیا ہے، میں بات تو ختم کر لوں" مسز براؤن نے سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا میں پھر مسز براؤن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور مسز براؤن نے کہنا شروع کیا:۔

"داستان کا رنگین حصّہ آپ سن چکے۔ غمناک ٹکڑا باقی ہے۔ مگر آپ سنتے سنتے اکتا تو نہیں گئے؟"

"اکتا تو نہیں گیا۔ خوب۔ یہ اکتانے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی۔ مسز براؤن شاید آپکو یاد ہو، میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں فطرتاً غمدوست واقع ہوا ہوں۔ المناک افسانوں سے کبھی مجھے سیری نہیں ہوتی۔ آپ کے سے واقعات [illegible] کیا بلکہ ساری رات اگر کوئی سُنائے جائے تو میں سُنے جاؤں"

"اچھا تو سُنیئے" مسز براؤن نے کہا۔ "پرسی سے آخری ملاقات کو تقریباً پانچ چھ مہینے گذر چکے تھے۔ اس اثنا میں میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ سُنا تھا کہ وہ اُسی روز لندن سے کہیں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے ملنے غالباً اب وہ کبھی نہ آئیگا۔ ایک روز دفتر سے واپسی کے بعد ایڈی نے مجھ سے پوچھا کہ "پرسی کی بھی کچھ خبر ہے" میں نے کہا "نہ معلوم بیچارہ کہاں ہے۔ مجھے تو کچھ علم نہیں۔ کیوں؟ اس وقت تمہیں بیٹھے بیٹھے پرسی کا خیال کیسے آگیا" کہا "کچھ نہیں یونہی یوں ہی پوچھا" مگر میں نے دیکھا کہ ایڈی کے چہرہ پر کچھ رنج اور غصّہ کے آثار نمودار ہوئے اور اُس کی آواز میں بھی میں نے ایک تغیر محسوس کیا۔ مگر بات کی تہ کو نہ پہونچ سکی۔ ایڈی اپنی تمام خوبیوں کے باوجود محبت کے معاملات میں

یہ ہمیشہ کی عادت ہو رہا تھا اور یہ اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھی جس نے مجھے اور اُسے دونوں کو برباد کیا۔ آپ نے ایک روز بیان کیا کہ ہندوستانی مسلمان، عورتوں کے معاملے میں بے انتہا غیرت مند ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں ایڈی، ہندوستانی مسلمانوں سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر تھا۔ دوسرے دن وہ خلاف معمول وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے گھر آگیا۔ اُس کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا آج جلد کیسے آگئے؟" کہا "کیا اس سے تمہارا کوئی پروگرام غلط ہو گیا؟" اُس بات کے جواب سے مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اس کے بعد بھی میں نے جو بات کی اوندھا ہی جواب ملا۔ مجھے اس آزردگی سے بے انتہا ملال ہوا اور غصّہ بھی آیا۔ یہاں تک کہ رات کو میں اُسے اخبار پڑھتا چھوڑ "شب بخیر" کہے بغیر ہی جا کر سو رہی۔ رات میں آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایڈی پلنگ پر موجود نہیں۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید کسی ضرورت سے نیچے گیا ہوگا، مگر جب بہت دیر ہو گئی اور وہ واپس نہ آیا تو مجھے تشویش ہوئی۔ گھڑی دیکھی، دو بجنے والے تھے۔ میں نیچے اُتر کر پہلے اسی کمرہ میں آئی، دیکھا کہ یہ سامنے والا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ایڈی باغیچہ میں ٹہل رہا ہے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں اُس کے پاس گئی۔ دیکھا تو اُس کی عجیب حالت تھی۔ بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں بھاری۔ چہرہ پر وحشت، میں یہ صورت دیکھ کر سہم گئی اور گھبرا کر پوچھا "ایڈی خیر تو ہے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا، اُسی طرح آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا باغیچہ کے اُس کنارے تک چلا گیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے پاس جا کر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کاندھوں پر رکھ دیئے اور پوچھا "خدا کے لئے بتاؤ تو آخر بات کیا ہے؟"

"کچھ نہیں" اُس نے غصّہ سے جواب دیا۔

"یا اللہ مجھ سے بھی پردہ ہے" میں نے پھر منّت سے کہا۔ اور اُسکے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

"تنگ نہ کرو کلیرا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" اُس نے نہایت سرد مہری سے جواب دیا۔ اور میری باہیں اپنی گردن سے علیحدہ کر کے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کا میرا اضطراب اور صدمہ بس کیا بتاؤں مسٹر بریم۔ میں خود دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی۔ دل بیٹھا جاتا تھا۔ میں نے پھر دوڑ کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا "تمہیں بتانا پڑیگا"

"بس الگ رہو" اُس نے نہایت حقارت اور نفرت کے لہجہ میں کہا اور جھٹکا دیکر اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑا لئے۔ میں ملال ہی سے بے حال ہو رہی تھی۔ اچانک جھٹکا کھا کر گر پڑی۔ بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا "بیدرد" اور بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ مگر ایڈی نے کوئی اعتنا نہ کی اور ٹہلتا ہوا پھر اُس طرف چلا گیا۔ شاید جاں کنی کے وقت انسان کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہوگی جو مجھے ایڈی کے اس بیدردانہ سلوک سے اس وقت ہوئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں اُٹھی مگر ابھی کھڑی نہ ہونے پائی تھی کہ چکر آگیا اور پھر گر پڑی۔ مگر ایڈی، ہائے سنگدل ایڈی نے پرواہ بھی نہ کی۔ وہ اسی مجنونانہ حالت میں ٹہلتا رہا۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد میرے حواس کچھ بجا ہوتے تو میں سنبھل کر اُٹھی اور اپنے بستر پر پہونچ کر جس قدر رویا گیا خوب روئی۔ یہ حالت تھی جیسے کوئی کلیجہ مسلے ڈالتا ہے۔ دیر تک دونوں ہی تڑپتی رہی آخر روتے روتے اور تڑپتے تڑپتے تھک کر چور ہو گئی اور اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔ جاگی تو صبح کے ۹ بج چکے تھے۔ اُٹھی نیچے آئی۔

ایڈی میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی ناشتہ کئے بغیر جا چکا تھا۔ آج جمعرات تھی۔ جمعرات کو وہ عموماً صبح ہی چلا جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آتا تھا۔ سہ پہر کو دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ باقی دنوں میں دفتر سے واپسی کا وقت شام کے پانچ بجے تھا۔ البتہ جن دنوں کام زیادہ ہوتا تو اُسے گھر پہونچتے پہونچتے چھ بج جایا کرتے تھے۔ میں پھر آکر پلنگ پر لیٹ گئی۔ نیند تو ہب کیا آتی رات بھر ہی کروٹیں بدلتی رہی۔ ایڈی کے رات کے بیدردانہ سلوک کا خیال آتا تو دل اُلٹنے لگتا۔ کہتی تھی ہائے یہ کیا ہو گیا۔ دوہی دن میں ایڈی کیسا بدل گیا۔ کیسی آنکھیں پھیرلیں۔ کل تک میری صورت دیکھکر جیتا تھا۔ آج میرے سایہ سے نفرت کرتا ہے۔ آخر میری خطا، میرا قصور، کس جُرم کی پاداش میں یہ سزا مجھے دی گئی۔ مجھے اسی طرح بستر پر پڑے پڑے دس بج گئے۔ آج میں نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا اور بھوک بھی نہ تھی۔ بہرحال اُٹھی۔ مُنہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے ڈرائنگ روم میں آئی تو ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ میں اپنا وایولن اُٹھاکر بجانے لگی۔ اتنے میں دروازہ پر کسی نے کھٹکا کیا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ ایڈی ہوگا پھر خیال آیا کہ ایڈی کھٹکا کیوں کرتا اُس کے پاس تو خود دروازہ کی کُنجی موجود ہے بہرحال دروازہ کھولا تو آنے والے کو دیکھکر میں کچھ گھبرا سی گئی۔ آپ سمجھے یہ کون تھا؟" مسنر براؤن نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں"

"یہ پرسی تھا"

"پرسی!"

"ہاں پرسی۔ اُسے دیکھکر ایک مبہم سا خوف مجھ پر طاری ہوگیا اگرچہ ڈرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ مختصر رسمی گفتگو کے بعد اُس نے کہا :۔

"کلیرا۔ مجھے لندن آئے آج چار دن ہوئے اور میں صرف تم سے ملنے ہی کے لئے لندن آیا ہوں۔ پرسوں شام کے ۵ بجے میں اس طرف آیا۔ لیکن گلی کے موڑ تک آکر میرا ارادہ بدل گیا اور میں تم سے بغیر ملے واپس چلا گیا۔ سڑک پر میں نے ایڈی کو گھر آتے دیکھا۔ غالباً اُس نے بھی مجھے دیکھا ہوگا۔ مگر پہچانا نہیں۔ کل دوپہر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہو میں تم سے ایک بار ضرور ملوں۔ چنانچہ اسی ارادہ سے اس طرف آیا۔ اس وقت چار بجے تھے میں قصداً اُس وقت آیا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایڈی چھ بجے گھر آتا ہے مگر پرسوں معلوم ہوا کہ پانچ ہی بجے واپس آجاتا ہے میں بالکل تنہائی میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ کوچہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ میرے پیچھے ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک شخص کی سائیکل پھسل گئی تھی اور گر پڑا تھا اُسی وقت دُور سے مجھے ایڈی بھی سڑک پر آتا دکھائی دیا جیسا میں نے ابھی کہا میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی موجودگی میں تم سے ملوں اس لئے میں اُلٹے پیروں واپس ہوا۔ میرا خیال ہے کہ گلی سے نکلتے کل بھی اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ بہرحال میں واپس چلا گیا۔ صبح پھر خیال آیا کہ آخر جانے سے فائدہ کیا مگر یہ کمبخت دل نہ مانا، اور اس وقت یہ بھی اطمینان تھا کہ تم بالکل اکیلی ہوگی۔ کلیرا۔ سچ کہنا، اس چھ مہینے کی مدت میں کبھی تمہیں بھی میرا خیال آیا؟"

جس وقت پرسی یہ واقعات بیان کر رہا تھا میں اپنی ہی اُدھیڑبن میں لگی ہوئی تھی۔ ایڈی کی مجنونانہ برہمی کا سبب

میری سمجھ میں آگیا۔ اُس نے دو مرتبہ جیتی کو ہماری گلی سے نکلتے دیکھا تھا۔ غالباً اُس نے یہ سمجھا کہ پرسی پوشیدہ طور پر مجھ سے ملنے آتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ روئی میں آگ لگ گئی۔ اُس کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم بلکہ گناہ تھا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا تھا اور جس کی کم سے کم سزا دائمی جُدائی تھی۔ افسوس اُس کی تنگی اور رشکین طبیعت نے واقعات کو جانچنے کی اجازت نہ دی اور مجھے صفائی کا موقع دئے بغیر خود ہی جو سمجھ میں آیا فیصلہ کرلیا۔ میں اپنی خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ پرسی نے مجھ سے کیا سوال کیا۔"

"کلیرا۔ تم نے میری بات کا کچھ جواب نہ دیا" اُس نے اپنی کرسی میرے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔

"جواب؟ کس بات کا" میں نے چونک کر پوچھا۔

"خوب" پرسی نے طنز آمیز لہجہ میں کہا "کلیرا۔ تم نے میری زندگی کی ساری خوشیاں مجھ سے چھین کر ایڈی کے حوالہ کردیں۔ خیر۔ اچھا کیا۔ مگر یاد رکھو ایڈی کی مسرتیں بھی شفق کی روشنی اور دھنک کی رنگینی سے زیادہ پائدار ثابت نہ ہونگی۔ وہ میرا دوست تھا۔ اُس نے دوست کے ساتھ دغا کی۔ مجھے لوٹ لیا۔ میری زندگی مجھ سے چھین لی۔ مگر مکافات عمل سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔ یہ قدرت کا قانون ہے جو کبھی نہیں ٹلتا۔ ایڈی کو بھی دوست کشی کا ثمرہ ضرور ملیگا اور جلد ملیگا"

پرسی کو اِس وقت طیش آگیا تھا وہ بڑے جوش کے ساتھ تقریر کررہا تھا۔ اُس کی یہ دہشتناک پیشینگوئی سُنکر میرا دل لرز گیا۔ رات کے واقعات میرے سامنے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔ ایڈی کے وحشیانہ سلوک کے باوجود میرے دل کا کوئی گوشہ ابھی تک اُس کی محبت سے خالی نہیں ہوا تھا۔ اور میں یہ کسی طرح گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ میرے سامنے کوئی ایڈی کو کچھ کہے۔

"بس پرسی بس۔ میں اِس قسم کی باتوں کی روادار نہیں۔ اب اگر تم نے ایڈی کا نام بھی لیا تو میں اُٹھ کر چلی جاؤنگی" میں نے جھلا کر کہا۔

"یہی تمہارا انصاف ہے۔ غدار کو غدار نہ کہوں۔ کیا اُس نے دوستی کے پردہ میں مجھ سے دغا نہیں کی" پرسی نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

اب میرے لئے اِس کمرہ میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ میں جانے کے ارادہ سے اٹھی اور دروازہ کا رُخ کیا۔ پرسی نے دوڑ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اُس کا غصہ یکایک دھیما پڑگیا اور اُس نے بڑی درد بھری آواز سے کہا۔

"کلیرا پیاری۔ مرنے والے سے اِس طرح نہیں روٹھتے۔ میں فوج میں بھرتی ہوگیا ہوں۔ پیر کے دن ہماری پلٹن فرانس چلی جائیگی۔ اِس وقت جنگ اور موت کے ایک ہی معنی ہیں۔ زندہ بچکر آنے کی کوئی اُمید نہیں اور زندہ رہنے کی اب تمنا بھی نہیں۔ اسی لئے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ دل نے مجبور کیا کہ موت کے آغوش میں جانے سے پہلے ایک بار تمہیں اور دیکھ لوں۔ پھر کوئی حسرت نہ رہیگی۔ آرام سے جان نکلے گی۔ بات میں بات نکل آئی۔ ورنہ میں تو صرف آخری دیدار کیلئے آیا تھا۔ معاف کردے کلیرا پیاری۔ مجھ سے قصور ہوا" یہ کہکر پرسی میرے قدموں میں گر پڑا زانو

ہو گیا۔ وہ اس وقت سراپا حسرت بنا ہوا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اور وہ الفاظ سن کر میرا بھی جی دکھ گیا۔

"ڈین، ایڈی یہ کیا کر رہے ہو بے حس" میں یہ کہتی ہوئی اُسے اُٹھانے کے لئے جھکی۔ اتنے میں کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایڈی اندر آیا۔ ہمیں اس حال میں دیکھ کر ایڈی نے کہا:

"معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہ تھا" یہ کہہ کر وہ فوراً کمرہ سے باہر نکل گیا۔ میں بالکل ہکا بکا رہ گئی۔ ڈین بھی خاموشی کے ساتھ "خدا حافظ" کہہ کر کمرے کے باہر نکل گیا۔ میری یہ حالت تھی جیسے مجھ پر بجلی گر پڑی۔ حواس بالکل معطل ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کہاں ہوں۔ پھر یکایک کچھ خیال آیا اور میں دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی برابر والے کمرے میں گئی۔ ایڈی وہاں موجود نہ تھا پھر چھت پر پہنچی۔ بیڈروم بھی خالی تھا۔ اس کے بعد ایک ایک کمرہ اور گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا، مگر ایڈی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گھر سے باہر نکل کر آئی۔ گلی کے موڑ پر اخبار والے کی دُکان تھی اس سے پوچھا کہ تم نے تو ایڈی کو نہیں دیکھا۔ اُس نے کہا "ہاں تھوڑی دیر ہوئی میں نے ایڈی کو ٹرام پر سوار ہوتے دیکھا تھا" اب میرے لئے اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ گھر واپس جاؤں اور ایڈی کی واپسی کا انتظار کروں، دوپہر سے شام اور شام سے رات ہوگئی مگر ایڈی واپس نہ آیا۔ وہ رات اور اسکے بعد آنے والی بہت سی راتیں جس بیکلی اور اذیت کے ساتھ بسر ہوئیں خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہو گئے مگر ایڈی نہ آیا نہ اُس کی کوئی خبر ملی۔ اسی طرح دن گذرتے چلے گئے۔ ایڈی کی گمشدگی کے چھ ماہ بعد ایوا کی ولادت ہوئی۔ ایوا کی شکل اپنے باپ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ خصوصاً آنکھیں تو بالکل ایڈی ہی کی سی ہیں۔ میری زندگی کے ویرانے میں یہ ننھا سا دلربا پھول قسمت نے شاید اس لئے کھلایا تھا کہ اس کی مسکراہٹوں سے پیدا ہونے والی معصوم مسرتیں میرے نہ بھولنے والے غموں پر چھا جائیں اور میرے دل کا ناسور رستا بند ہو جائے۔ اٹھارہ برس گذرنے کے بعد بھی ایڈی کی نہ بھولنے والی یاد اور زندہ رہنے والی محبت تو آج بھی اسی طرح میری زندگی کا سہارا ہے جس طرح ایڈی کی موجودگی میں تھی اور دل کا کوئی زخم بھی مندمل نہیں ہوا مگر ایوا کی ولادت سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ وہ میرے لئے گمشدہ ایڈی کی زندہ یادگار اور میری بھٹکتی پھرنے والی محبت کا ٹھکانا بن گئی۔ وہ میرے لئے ایوا بھی ہے اور ایڈی بھی.......... میں ایڈی کو اپنی زندگی کہا کرتی تھی، اب ایوا میری زندگی ہے۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ "ایوا" "زندگی" کو کہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کا نام "ایوا" رکھا ہے"

"تو کیا گمشدگی کے بعد پھر کبھی آپکو ایڈی کی کوئی خیر خبر نہ ملی؟" میں نے ناشپاتی چھیلتے ہوئے پوچھا۔

"ملی کیوں نہیں۔ مگر اس کا حاصل اسکے سوا اور کچھ نہ ہوا کہ سینہ میں چند داغ اور دل میں چند زخم اور بڑھ گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب افریقہ سے ہماری فوجیں واپس آئیں تو میری ایک سہیلی کے بھائی ڈاکٹر نے بیان کیا اس نے ایڈی کو دارالسلام میں دیکھا تھا۔ جرمنی افریقہ فتح ہونے سے پہلے ایڈی وہاں برطانوی جاسوس کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنا نام ڈکسن رکھ لیا تھا اور وہ ڈاکٹر کے سوا وہاں کوئی اس کا اصل نام

[illegible] معلوم کہ موت ہوئی کہ مِس سے اپنے ایک افسر سے بگاڑ ہوگیا اور ایڈی نے اُسے قتل کر ڈالا جس دن واقعہ [illegible] ہوئے لندن کے لئے روانہ ہوئی اُس دن ایڈی کو فوجی عدالت سے سزائے موت کا حکم سُنایا گیا تھا۔ جب میں نے یہ خبر سُنی میری حالت ہی تباہ ہوگئی۔ ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں یہ کیفیت رہی کہ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو جو دو چار مرتبہ دل نہ بھر آتا ہو۔ روتے روتے آنکھیں بے نُور ہوگئیں۔ پھر وہ زمانہ بھی گذر گیا۔ ناز و نعمت کے گہواروں میں عورت بہت کمزور مخلوق معلوم ہوتی ہے مگر جب مصیبت آکر پڑتی ہے تو بڑی بڑی کڑیاں جھیل جاتی ہے۔ واقعہ کی چشم دید شہادت کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ میں ایڈی کو مُردہ نہ سمجھتی مگر خدا جانے کیوں میرا دل کبھی اِس پر آمادہ نہیں ہوا کہ میں اُسے مُردہ تصور کروں۔ اور آج بھی وہی کیفیت ہے امید کا کوئی پہلو باقی نہیں مگر مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایڈی ایک دن ضرور واپس آئے گا اور میری زندگی میں آئیگا۔ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اُس کا مُسکراتا ہوا چہرہ اور جادو گر آنکھیں مجھے پہلی مُلاقات کی طرح مسحور کر دینگی۔"

یہاں تک کہنے کے بعد مسز براؤن یکایک خاموش ہوگئیں اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں آدھی بند کر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہیں۔ نہایت شیریں خواب۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک دلنواز مُسکراہٹ اور چہرہ پر قلبی سُرور کی ایک نہ بیان ہوسکنے والی کیفیت نمایاں تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا ہوا اُنکی اس کیفیت کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ پھر اُنھوں نے ایک لمبی سانس لی اور سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"لیجئے کھائیے" میں نے چھلی ہوئی ناشپاتیوں کی طشتری اُنکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ"

"سب واقعات سُن کر بھی یہ معمہ اب تک حل نہ ہوا کہ آپکو اور ایوا کو ایران اور فارسی زبان سے اِس قدر دلچسپی کیوں ہے؟"

"یہ معمہ بھی ابھی حل ہوجائیگا۔ ہاں تو میں کہاں تک پہونچی تھی؟"

"یہاں تک کہ آپکو مسٹر براؤن کے واپس آنے کی آج تک اُمید ہے۔"

"جی ہاں۔ صورت یہ ہے کہ میری ایک رشتہ کی بھانجی ہے "آئی لین"۔ جس زمانہ میں میری شادی ہوئی وہ اپنے والدین کے ساتھ ریڈنگ میں رہتی تھی اِسیلئے اُس نے ایڈی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب اُس کی شادی ہوگئی اور وہ لندن آگئی تو اکثر میرے یہاں آیا جایا کرتی تھی اور ایوا سے بہت محبت کرتی تھی۔ اُسی زمانہ میں ایڈی کے مفصل حالات۔ سرگذشت اور افریقہ کا سارا قصہ میں نے اُسے سُنایا تھا اور ایڈی کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ ۱۹۲۷ء میں لندن کی ایک فرم نے اُس کے شوہر ولسن کو تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں ایران بھیجا۔ آئی لین بھی ساتھ گئی اور یہ لوگ کوئی تین برس وہاں رہے۔ آئی لین جب لندن واپس آئی اور مجھ سے ملی تو اُس نے عجیب و غریب واقعات بیان کئے۔ ایران میں کوئی شہر ہے مشہد۔ جب آئی لین وہاں تھی تو ایک امریکن موٹر کمپنی کا ایجنٹ موسیو بوندون کاروباری سلسلہ میں ولسن سے ملنے آیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات دوستی کی حد تک پہونچ گئے۔ ایک دن ولسن کہیں باہر گیا

ہوا تھا۔ آئی لین بھی گھر پر موجود نہ تھی۔ موسیو بوندوں آیا۔ ملازم نے ڈرائنگ روم میں لیجا کر بٹھادیا اور وہ بیٹھ کر آئی لین کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاق سے آئی لین اسی وقت گھر واپس آئی اور ڈرائنگ روم میں گئی تو کیا دیکھا کہ موسیو بوندوں ایک تصویر پر سر جھکائے بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ آئی لین کو آتا دیکھکر وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ مگر آئی لین کو اُس وقت کچھ خیال بھی نہ ہوا۔ آئندہ ملاقاتوں کے دوران میں آئی لین کو اسبات کا یقین ہوگیا کہ موسیو بوندوں کو اُس تصویر سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔ کیونکہ جب تک وہ بیٹھا رہتا۔ بیسیوں مرتبہ اُس طرف دیکھتا اور اُس سے متاثر ہوتا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ آئی لین یا ولسن کو اس کے تصویر کی طرف دیکھنے کا پتہ نہ چلنے پائے۔ ولسن کی ایسی جزئیات پر نظر نہیں جاتی۔ مگر آئی لین تو بلا کی تیز ہے وہ فوراً تاڑ گئی کہ اس میں کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ نسوانی فطرت کی تجسس آپ جانتے ہیں۔ چنانچہ آئی لین کو اب یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح اس راز کو معلوم کرنا چاہیئے۔ ایک دن جبکہ موسیو بوندوں اس کی نظر بچا کر تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا، اُس نے کہا:۔

"موسیو بوندوں۔ غالباً یہ تصویر آپکو بہت پسند ہے" آئی لین کے اس اچانک استفسار سے موسیو بوندوں کچھ گھبرا سا گیا جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا جاتے مگر پھر خود کو سنبھال کر اُس نے جواب دیا "کون ایسی تصویر کو پسند نہ کرے گا"

"اور وہ تصویر تھی کس کی؟" میں نے مسٹر براؤن کا قطع کلام کرتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ میری ہی ایک پرانی تصویر تھی جو میں نے آئی لین کو ایران جاتے وقت دی تھی"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

پھر یہ ہوا کہ موسیو بوندوں کے استفسار پر آئی لین نے اُسے بتایا کہ یہ تصویر کس کی تھی اور ضمناً میری ساری رام کہانی اور ایڈی کی داستان بھی سُنادی۔ موسیو بوندوں تمام واقعات سُنکر بے حد متاثر ہوا اُس کے چہرہ پر رنج و ملال کے ساتھ ندامت و انفعال کے آثار بھی نمودار ہوگئے۔ اُس دن کے بعد آئی لین نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یکایک مشہد سے غائب ہوگیا۔ ولسن نے اُسے تلاش بھی کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آئی لین کا بیان ہے کہ موسیو بوندوں میں بہت سی باتیں ایڈی کی سی تھیں۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔ وہی شکل و صورت۔ وہی دل موہ لینے والی باتیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپکو فرانسیسی کہتا تھا۔ ڈاڑھی بھی اس کی فرانسیسی قطع کی تھی مگر انگریزی ایسی بولتا تھا کہ صرف ایک انگریز ہی بول سکتا ہے اور آئی لین کو بارہا یہ شُبہ ہوتا تھا کہ ضرور وہ انگریز ہے۔ آئی لین نے جب یہ واقعات بیان کئے تو میرا دل بول اُٹھا کہ ضرور وہ ایڈی ہی تھا"

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی" میں نے پھر مسٹر براؤن کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "آئی لین کو موسیو بوندوں کے انگریز ہونے کا اِس لئے شُبہ ہوا کہ وہ انگریزی ایک انگریز کی طرح بولتا تھا مگر آئی لین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرنچ بھی یقیناً ایک فرانسیسی کی طرح بولتا تھا۔ اسے کیا کہیئے گا؟"

"ہاں اسی بات سے تو میرے خیال کو اور تقویت ہوئی۔ دراصل ایڈی کی والدہ فرنچ تھیں۔ اس لئے فرانسیسی

مُلک [illegible] اور وہ خود آدھا فرانسیسی۔"

"آپ کا قیاس بے بنیاد نہیں۔" میں نے مسنر براؤن کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" مسنر براؤن نے جواب دیا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ ایڈی تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ سلامت ایران کے کسی شہر میں موجود ہے اور ایکدن ضرور ہم سے آ ملیگا۔ ایوا نے ایڈی کو نہیں دیکھا کیونکہ وہ اُس کی گمشدگی کے [illegible] پیدا ہوئی تھی۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ اُسے ایڈی سے نادیدہ محبت ہے۔ باپ کے سایۂ شفقت میں ناز و نعمت سے پلنے والی لڑکیوں کو بھی شاید باپ کی اتنی چاہت نہیں ہوتی۔ ایڈی کے ذکر سے اُس کی رُوح تازہ ہوتی ہے۔ جب سے آئی لین نے یہ قصّہ بیان کیا ہے اُسے ایران جانے کی دُھن سمائی ہے۔ کہتی ہے اُس ملک کا ایک ایک گوشہ چھانونگی اور اپنے باپ کو ڈھونڈھکر لاؤنگی اور اگر قانونی مجبوریاں اُس کے آنے میں سدِّراہ ہونگی تو پھر ہم لوگ بھی اُس کے پاس وہیں چلے جائینگے۔ مجھ سے زیادہ اُسے اس امر کا یقین ہے کہ ایڈی زندہ ہے اور ایران میں موجود ہے۔ کہتی ہے میرا دِل گواہی دیتا ہے اور میں اپنے دِل کی گواہی پر یقین رکھتی ہوں۔" بڑی دشواریوں سے یہ ایک برس گذرا ہے۔ ایکدن میں نے کہا کیوں ایوا۔ بوڑھی ماں کو بے سہارے چھوڑکر چلی جاؤگی؟" تو بولی "امّاں بے سہارے تو ہم اب ہیں۔ میں سہارا ڈھونڈھکر لاؤنگی۔" میں نے اُسے یہ بہلاوے دے دے کر روکا ہے کہ ابھی تم بہت کمسن ہو۔ ابھی کم از کم دو تین سال اور توقف کرو۔ اس دوران میں اُس ملک کی زبان بھی اچھی طرح سیکھ لو تاکہ اپنی کہہ سکو دوسرے کی سمجھ سکو۔ اور کیا عجب ہے کہ اسی اثناء میں ہمیں ایڈی کی کچھ خیر خبر مل جائے یا وہ خود واپس آجائے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ غالبًا اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ مجھے اور ایوا کو ایران اور فارسی زبان سے اِس قدر دلچسپی کیوں ہے۔"

"ہاں۔ اب یہ معمہ حل ہوگیا۔" میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایوا اور فریدی ٹینس کھیل کر واپس آگئے اور دس منٹ کے اندر اندر ہم چاروں سینما دیکھنے چلے گئے۔

ایوا اور فریدی کے مراسم روز بروز زیادہ ہوتے جارہے تھے اور اب فریدی سنیچر کے دِن دوپہر کا کھانا لازمی طور پر مسنر براؤن ہی کے یہاں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی شریک ہوتا تھا۔ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کی ساتویں تاریخ۔ سنیچر کا دن۔ غالبًا مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔ کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ ہم لوگوں کو کھانے سے فارغ ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ فریدی اپنا سگرٹ سُلگا رہے تھے۔ ایوا ریڈیو سیٹ سے ملا رہی تھیں اور مسنر براؤن ایک "کراس ورڈ پزل" حل کر رہی تھیں کہ اتنے میں دروازہ پر کسی نے کھٹکا کیا۔ ایوا ریڈیو چھوڑ دوڑتی ہوئی گئی اور یہ خبر لائی کہ مسٹر ویگھارن مسنر براؤن سے ملنے آئے ہیں۔ مسنر براؤن کے یہاں آنے جانے والے گنتی کے لوگ تھے اور اُن سبکو میں جانتا تھا۔ مسٹر ویگھارن کو نہ کبھی دیکھا تھا نہ اُن کا نام سُنا تھا اِس لئے میں نے ذرا تعجب سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ مسنر براؤن نے جواب دیا کہ میں خود نہیں جانتی۔ فریدی نے کہا پھر یہیں بلا لو۔ مسنر براؤن نے کہا نہیں میں برابر والے کمرے میں بات چیت کرلونگی تم لوگ اپنا شغل جاری رکھو۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں اور ہم سب بدستور اپنے اپنے شغل

میں مصروف ہو گئے۔ مشکل سے تین چار منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک دھماکے کی سی آواز ہوئی جیسے کوئی [illegible] ساتھ ہی مسٹر ویگہارٹن کی آواز سنائی دی کہ جلد آیئے ہم بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچے جہاں ایو تھی اس نے ایک چیخ ماری۔ ہم دونوں بھی ڈر گئے۔ مسز براؤن فرش پر بیہوش پڑی تھیں اور مسٹر ویگہارٹن انہیں زمین سے اٹھا کر صوفے پر لٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا پانی لایئے۔ فریدی پانی لینے کو دوڑے میں بھی آگے بڑھا کہ مسز براؤن کے لٹانے میں مسٹر ویگہارٹن کی مدد کروں۔ اب تک میں نے مسٹر ویگہارٹن کی شکل نہیں دیکھی تھی کیونکہ دروازہ کی طرف اُن کی پیٹھ تھی۔ جیسے ہی میری نظر اُن کے چہرہ پر پڑی اور اُنھوں نے مجھے دیکھا ایک ساتھ بیساختہ ہماری زبان سے نکلا۔ "موسیو فرلین!"

"مسٹر پریم!"

ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیران تھا۔ ایو انے حیرت سے ایکبار موسیو فرلین کو دیکھا۔ فریدی بھی اس معمہ کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ مسز براؤن کو صوفے پر لٹانے کے بعد اُن کے چہرہ پر پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ ایو ا اُن کے بکھرے ہوئے بال درست کرنے لگی۔ دو تین منٹ کے بعد مسز براؤن نے آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں کہا۔

"ایڈی۔ میرے پیارے" موسیو فرلین آگے بڑھکر مسز براؤن پر جھک گئے اور مسز براؤن نے اُن کے گلے میں باہیں ڈال کر اُنکا سر اپنے سینہ سے لگالیا۔ ایو ا اپنی ماں کی زبان سے ایڈی کا نام سنتے ہی اُچھل پڑی۔ اُسنے حیرت اور انتہائے مسرت سے ایک چیخ ماری اور "پیارے ابا" کہہ کر موسیو فرلین سے چمٹ گئی۔ میری اور فریدی کی زبان سے بیک وقت نکلا "مسٹر براؤن!"

(مسٹر براؤن کی حیرت انگیز سرگذشت اور ایو اور فریدی کی محبت کا حسرتناک انجام جو بجائے خود مستقل افسانے ہیں علیحدہ علیحدہ قارئین ساقی کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے۔)

"پریم پجاری"

نرگس جمال۔ جناب شاہد احمد دہلوی بی۔اے (آنرز) مُدیر ساقی کی تالیف ہے اور بلجیم کے مشہور مصنف میٹرلنک کے ڈرامہ کا [illegible] ترجمہ ہے۔ میٹرلنک کو دنیائے ادب میں جو ممتاز درجہ حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کی کتابیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دُنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ اُس کی شہرت کا راز اُس کی تحریر کی ہمہ گیری ہے اور وہ اُن روحانی و معاشری مسائل کی عقدہ کشائی کرتا ہے جن پر نوعِ انسانی کی بہتری کا انحصار ہے۔ اسکا موضوع خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس کے پیش نظر ہمیشہ یا تو خدا کی ذات ہوتی ہے یا اس کی بہترین مخلوق انسان۔ وہ خدا کو دُنیا میں محبت اور خاکساری کی راہ اختیار کرکے ڈھونڈتا ہے [illegible] میں وہ انسان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ انسان کی مٹی گدڑی میں خدائی نور جلوہ ریز ہے [illegible] وہی ہے جس پر ایشیا کے اخلاقی رہنماؤں کو بجا طور پر ناز ہے۔ اس لئے اس پر ایک لحاظ سے مشرق کا حق تھا [illegible] سے وصول ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے یہ فرض کچھ اس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے کہ [illegible] کیلئے شکایت کی وجہ نہیں [illegible] قیمت [illegible]

حُسن کی ہلاکت پسندی!

کوکب!

تم سے دُوری اس پہلو سے تو میرے لئے ایک لذت نہیں نہ جانے کتنی لذت رکھتی ہے کہ وہ میرے دل کی لگی کو ہوا کی تیز تر کرتی ہے، تمہاری طلب خود ہی ایک نعمت ہے پھر اس طلب اور اس نعمت کی افزونی کا کیا کہنا، تم مجھ سے کھچتے ہو، میں تمہاری طرف دوڑتی ہوں۔ تم تغافل برتنا چاہتے ہو، میں جان فدا کرنے کیلئے مرتی ہوں۔ اپنے اس انداز اور اپنی ان اداؤں کے لحاظ سے تو تمہارا یہ گریز بھی ایک دُنیائے حسن و جمال ہے۔ لیکن میں تم سے کہتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یاس مجھ پر غالب آ جائے اور پھر...... پھر.......... اے وہ بُرے دن تو کبھی نہ آنا۔ یہ دولتِ عظمیٰ یہ نعمت کُبریٰ، یہ رعنائیوں کی رعنائی، یہ زیبائیوں کی زیبائی، یہ طلب کی لذت کہیں مجھ سے چھن جائے، ابھی تو یہ طلب ہے جس میں شوق اور درد بھی ہے درماں بھی، تلخی بھی خمار بھی ہے۔ شیرینی کیف بھی لیکن تب، میں کانپتی ہوں لرزتی ہوں اس "تب" کے اندیشے سے۔ تب کیا ہوگا، درد صرف درد رہ جائیگا، اور خمار محض خمار۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں، صرف اپنی لذاتِ طلب کی حیات و پرورش کیخاطر کہ مجھ سے اتنا گریز نہ کرو۔ کہ میں مایوس ہو جاؤں۔ اُس ہستی کا واسطہ جس کو تم خدا کہتے ہو، پر خود جس خوف کے باعث تم مجھ سے بھاگتے ہو مجھ پہ رحم کرو۔ تم نے ایک لمحۂ لطیف کے کیفِ کمزوری میں مجھ سے کہا تھا کہ وہی ذات جسکا حکم اسوقت میرے تمہارے درمیان حائل ہے یہ قدرت بھی رکھتی ہے کہ مجھے تم سے ملا دے۔ میں تمہیں اسی کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو، مجھے دیکھو، مجھے سمجھو مجھے بصارت سے دیکھو اور بصیرت سے سمجھو اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کیا عیوب ہیں مجھ میں جنکی بدولت تم مجھ سے مُتنفر ہو۔ میں تم سے نہیں کہتی کہ تم سعیدہ یا سعیدہ کی چاہت کو میرے لئے ترک کر دو، مگر ہاں مجھے ترک نہ کرو۔

دیکھو کوکب! تمہیں معلوم ہے میرے لئے شیداؤں کی کمی نہیں، میری زلفوں کے اسیر اتنے ہیں کہ مجھے ان کی گنتی بھی نہیں معلوم کتنے ہیں جو میری ایک "نگاہِ غلط انداز" پر متاعِ حیات نثار کرنے کو مضطر ہیں، کتنے ہیں جو میرے ایک مُوذ دہنِ تبسم کی امید پر زندگی کی تلخیوں سے شربت کے گھونٹ کیطرح نشاط اندوز ہوتے ہیں، کتنے ہیں میرے نام کی رٹ لگانے کے لئے دُنیا میں سب کچھ تج دیں، اور کتنے ہیں جو میری محبت کی پرورش اپنے اعماقِ قلوب میں اس طرح کرتے ہیں جیسے جانِ عزیز کی نگہداشت اور لطف یہ ہے کہ ان دیوانوں کو نہ اتنا ہوش نہ اتنی فکر کہ اپنا افسانۂ محبت سُنانا کیا معنے ظاہر کرنے کی بھی کوشش کریں، مگر ایک تم ہو کہ تمہیں نہ میری پروا ہے، نہ میرے جذبات کی، نہ میرا اقبال ہے نہ میرے شباب و رعنائی کا، اور ستم بالائے ستم یہ کہ میری محبت سے بے نیازی برت رہے ہو اور اظہارِ محبت پر چیں بجبیں ہوتے ہو، ہاں میں اب بھی سچ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا۔ جاؤ اب میں تم سے محبت کرنا چھوڑتی ہوں...... نہیں نہیں کبھی نہیں کوکب محبت کرنا نہیں چھوڑتی، اظہارِ محبت چھوڑتی ہوں مگر.......... ہائے یہ بھی نہیں ممکن...... اچھا سنو۔

مجھے یوں سمجھو کہ مجھے ایک محبوب کی طلب ہے میرے حسن و جمال میرے شباب و رعنائی کی تکمیل تشنہ ہے لذت حرص و محبت کی یکرنگ عشق تو عشق ہو سکتا ہے یا حسن کے گرجوش، اور مجھے احساس ہے کہ میں حسن ہوں حسن ہو سکتا ہی نہیں جب تک وہ اپنی رنگینیوں میں عشق کی نکہتیں شامل کرے، میں تمہاری پرستش کرتی ہوں تاکہ اپنے کو مکمل طور قابل پرستش بنا سکوں۔ کوکب میرے کوکب مجھے جواب دو، اور جلد جواب دو اور کسی طرح میرے تشنہ کام و دہن کو تر کر دو۔

حریص تشنہ
فیروزہ

فیروزہ۔

اپنی نظروں میں تمہاری کس وقت کیا "آن" ہے یہ میں کیا جانوں، مگر میرے احساسات موجودہ کے لحاظ سے تم اپنے لئے ساز ہو اور میرے لئے نغمہ، اپنے واسطے شراب ہو، اور میرے واسطے کیف۔ تمہارے نغموں کی "ہمہ گیری" اور تمہارے کیفوں کی "ہمہ داری" کے شہود و حصار میں مجھے اپنے "میں" اور تمہارے "تم" ہونے کا امتیاز رہتا ہے، یہی کیا کم قابل حیرت ہو مگر مجھ سے اس عالم میں اسکی توقع کیسے ہو سکتی ہو کہ میرے احساس بے خبری کو تمہارے "پیام" کے سمجھنے اور اسکی پذیرائی کرنے کی اہلیت کا بھی ہوش ہو۔

رفتۂ شوق کو کیا تلخی انکار سے بحث ۔ اُس کو بھولی نہیں شیرینیٔ پیغام ابھی

مجھے اسکے سوا ہوش بس بات کا ہے کہ تم کہ تمہارے برملا کی بارش سے مجھ پر ستم ہائے پنہاں توڑ رہی ہو، تم جانتی ہو، تمہاری طلب میرے دل میں خود آئی اور سعیدہ کی طلب میں نے پیدا کی۔ تمہاری یاد آئی اور میں ہوش و احساس سے بے خبر ہو گیا۔ برخلاف اسکے سعیدہ کی یاد سے یہ ہوش بھی رہتا ہے کہ میں کس کی یاد سے لذت اندوز ہو رہا ہوں، تم میرے لئے سبب اضطرار اور سعیدہ میرے حق میں حاصل اختیار، تم مجھے مست و بیخود کر دیتی ہو۔ سعیدہ مجھے ہوش میں لاتی ہو، مجھے تمہارے حسن اور غرور حسن پر فدا ہونے میں کبھی تامل نہ تھا، اگر سعیدہ کی ہستی بہ حقیقت بہ آئینہ کردنی کہ اپنی ہستی کی نذر تمہارے سامنے پیش کروں تو سعیدہ کو بھی تمہارے غرور حسن پر قربان کر دینا پڑیگا، جو تم چاہتی ہو نہ میں، پھر تم ہی بتاؤ۔

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

میں تم سے گریز کرتا ہوں، اپنے لئے نہیں سعیدہ کیلئے، سعیدہ کو سمجھنا آسان نہیں، وہ بظاہر نیاز ہے اور بباطن ناز، اپنی طرف سے وہ میری ہے، اور میری طرف سے میں اُس کا۔ اپنی طرف سے محب ہے، اور میری طرف سے محبوب، اپنی نظر میں پروانہ اور میری نگاہوں میں شمع، اپنے احساسات کی روشنی میں عشق ہے، اور میرے جذبات کے پرتو میں حسن، تم جانتی ہو کہ تم عشق کی طرف نزول کرتی ہو، اپنے عروج حسن کو بڑھانے کیلئے، دل نظر کرتی ہو اپنی دلربائی کی آن بڑھانے کیلئے یہ سعیدہ کا دیا ہوا ہوش ہے جسکی بدولت مجھے تم دونوں میں امتیاز کی تمیز ابھی باقی ہے۔ ورنہ تمہاری جاذبیت [illegible]
دیکھو آنے آنے مجھے اچھا خاصہ ہوش آ گیا اب میں تم سے وہ سب کچھ کہہ سکتا ہوں جو کہنا چاہتا تھا، تم [illegible]

مجھے اس میں کچھ عذر نہیں کہ میں تمہیں انتساب کروں، مگر اس طرح اختیار کروں جس طرح اس نے اجازت دی ہے جسنے ان بنایا ہے یا "تم" کیا ہے۔ فیروزہ تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ اگر تم خود بخود تم ہو گئی ہو تو تم، تم کیوں ہو اور سعیدہ سعیدہ ہے۔ تمہارے حسن کی تکمیل کیوں محتاج ہے، تم میں میرے طلب کے کیف کی رنگینی، حسن وجمال کیف وبہار کے اتنے نظارے ہیں مگر ان کی آنیں الگ الگ اور شانیں جُدا جُدا ہیں تو کیوں؟ ذرہ ذرہ کے اجزائے ترکیبی میں ہر ایک مستقلاً ایک مختلف اور باہمدگر ممتاز ومتباین ہیں تو خود بخود یوں نہیں ہو سکتے اور اگر نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو پھر ان کے دھلنے یا ہوجانیکا امکان کہاں؟ یہ تمہارے غرور اور نہ مردوں کے غرور میں فرق کیوں ہے؟

"آن" مان لو کہ اصلاً ایک ہے مگر اس آن کی اثر آفرینی اور اسکا حاصل کیوں ایک نہیں۔ تم اپنے ہی ناز اور نیاز کر دیکھنا پر غور کرو حقیقت تم پر خود بخود آئینہ ہو کے رہیگی اور تم جو یہ ریب وشک اور بے اطمینانی وبے کیفی کی تلخیاں محسوس کرتی ہو آزاد ہو جاؤ گی۔ فیروزہ تمہیں میری طلب نہیں سکون کی طلب ہو، تمہارا غرور تشنہ ہے لذتِ سرور کا اور یہ تمہیں جب ہی حاصل ہے تمہیں یہ یقین آجائے کہ سرور اور سکون طمانیت اور راحت کا دینے والا کوئی اور ہی ہے۔ تم اُس سے لو لگاؤ جس نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر شاید تمہیں میری ضرورت نہ رہے اور میری طلب میں اب جو بے صبری تم ظاہر کر رہی ہو، تب وہی میری میرا حصہ ہو جائے۔ اگر تمہارا خود پرست وخود پرور دل بہ اخلاص اس حقیقت کو قبول کرنے میں پس وپیش کرے نہیں، تمہاری اور اپنی دونوں کی بہتری کے خیال سے بہ صلاح دونگا کہ تم میرے کہنے سے اس مختار کی مختاری اور پھر مان لینے پر بہت دن نہ گذرنے پائیں گے کہ تم خود ہی یقین کے بلند ترین درجات پر فائز ہو جاؤ گی اور پھر ...... میں نہیں جانتا کہ وہ کیا حجابات ہوں گے جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو سکیں گے۔

کوکب

میرے کوکب!

میں نہیں مان سکتی کہ میں خودبیں ہوں ہاں، خودگرفتار ہوں اور شاید یہی خودگرفتاری میری زندگی کی جان ہو۔ ہر طلب، میری ہر حرص میرے تمام ارمان، اور میری ساری تمنائیں اس لئے اور صرف اس لئے ہیں کہ میری تشنہ کامی دو کم ضرور ہو جائے، میری "آن" اپنی بہار کے شباب پر نہ پہونچے ہی، مگر کم سے کم اسکی بہاریں محسوس انداز کیساتھ بڑھتی رہیں، میری شان، اوجِ کمال پر فوراً نہ پہنچ جائے، تو بھی کم ازکم اُسکی طرف سبقت تو کرتی رہے، خودگرفتاری نے مجھے اس پر غور کرنیکی فرصت ہی نہیں دی کہ جس حد تک میں خودگرفتار ہوں کوئی اور بھی ہے یا نہیں۔ دیکھو میں اپنا احساس تمہارے سامنے بے حجابانہ اور عین جامۂ فطرت میں پیش کرتی ہوں۔ مجھے کوئی نظر نہیں آتا جو میرا حجاب ہو، نہ اپنے میں کمی محسوس ہوتی ہے، بجز اس ایک کمی کے جسکا نام کوکب کی طلبِ ناکام ہے، ورنہ میری کوئی آرزو نہیں جس کی تکمیل معلوم نہ ہو، میری کوئی طلب نہیں جو مطلوب سے محروم ہو، میری نظر کے تیر خطا ہونیکے نقص وعیب سے پاک ہیں، میری زلف کا شکار پابلبستہ گرفتار نہیں، جو گرفتار نہ ہوا ہو میری اداؤں کا وار کبھی اوچھے نہیں، جو مجروح یا مقتول نہ ہوا ہو، میں نے جو چاہا وہ کیا، جو ڈھونڈا سو پایا...... لیکن

فائحیت کی ہوس ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے کامرانی کی پیاس ہے کہ تیز تر ہوتی جاتی ہے .... اللہ رے میری بے چارگی .... کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے خود اپنی قید سے رہائی مانگنی پڑے۔

ہاں میں نے غور کیا اگر ایک محورِ خودی ہے اسے اسکا امکان ہے، میں نے سوچا اگر جس حال میں ہوں سوچا جا سکتا ہے۔ میں نے تم سے بار بار کہا، ابھی ابھی کہہ چکی، اور پھر کہتی ہوں کہ اپنی سمجھ میں تمہاری ہی ہوں اور میں سب کچھ ہوں، مگر پھر میری یہ تشنہ کامی کیسی، یہ تمنائیں کہاں سے آگئیں، یہ حرصِ طلب ظالم، دل میں کیسے جاگزیں ہو گئی۔ تو پھر کیا میری خودی اور میرا خود گیر احساسِ خودی محض فریب، سراسر سراب، یکقلم دھوکا، اور کلیتاً خلاقی داہمہ کا حاصل ہے ..... ہائے اگر ایسا ہو (خدا نہ کرے خدا نہ کرے) تو وائے برمن و بے چارگی من ..... کوکب! دیکھو کہ میری بے چارگی مجھے کہاں گرا رہی ہے، سمجھو کہ میری بے بسی مجھے کس پستی میں پہنچا رہی ہے .... ہائے میری ہستی میرے لئے کیوں معمہ ہو گئی، مجھے حیرت ہے کہ تم مجھے سمجھ سکتے ہو، اور میں اپنے کو نہیں سمجھ سکتی .... میں تھک گئی تنگ آگئی ..... اچھا فرض کرتی ہوں ..... دیکھو فرض کرتی ہوں اور بس ...... کہ میری ہستی مع اپنی تمام صفات کے مرہونِ منت ہے کسی اور کی مشاطگی اور جمال آرائی کی تو پھر نتیجہ .... ؟ اس ہستی ہی کا راز کیا آسانی سے مجھ پر عیاں ہو جائیگا .... کوکب اس گفتگو کا حاصل کچھ نہیں ..... اسے چھوڑ دو، اور اور ..... مجھ سے دوری اختیار نہ کرو، مجھ سے گریز ترک کرو۔ اور دیکھو کہ پھر ہمارے لئے وہ چیز جسے تم جنت کہتے ہو یہیں ظہور میں آجاتی ہے یا نہیں۔

خودگرفتار

فیروزہ

فیروزہ

تمہاری مسحور کن احساس اس درجہ کیف گستر ہے کہ تمہاری نگارشِ گلبار کے زیر اثر آتے ہی پھر مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا بالکل یہ حال ہوتا ہے کہ؎

نہادم سر بہ بر روئے گل از خویشتن رفتم

میں سوچتا ہوں کہ خامۂ رنگین سے یہ شرابیں برساتے وقت تمہاری سرجوشیٔ احساس کا کیا عالم ہوتا ہوگا، کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میرے احساس و تخیل نے تمہارے اس وقت کے طوفانِ فائحیت کے بے پناہ ہونیکا کیا تصور کر رکھا ہے ہائے میں تمہیں کیا بتاؤں اور کیونکر بتاؤں جو نکتہ ناگفتنی ہے وہ ناگفتنی ہی رہیگا ——————

فیروزہ میں شاد ہوں مسرور ہوں کہ پیدا کرنے والے نے تم میں میری طلب پیدا کر دی آہ! خدانا کردہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم شمع کیطرح خود ہی اپنی شعلہ سامانی کی نذر ہو جاتیں۔ واقعی ہر عقدہ کو کھولنے والی ہر معمہ کو حل کرنے والی اور ہر راز کو افشاں کر لینے والی اگر کوئی چیز ہے تو یہی تشنگی اور یہی طلب جو تم میں ہے جسکی ذات پُر اسرار کیا معنی آفرینندۂ اسرار ہے اسکے اسرار اور اُسکے رموز کوئی کیا سمجھ سکتا ہے تمہیں طلب دیگئی، کس کی، میری، اور مطلوبِ اصلی کون ہے وہ بخشندۂ طلب اور لطف یہ کہ تمہیں اس بھید کا پتہ بھی نہیں، چاہتی ہو مجھے اور پاؤگی اُسے۔ اللہ اللہ! کتنے حجابات چاک ہو گئے جو تم سے

پر جوکرنا شروع کیا اپنی طبیعت کے معیار کی طرف رجعت اختیار کی اور پھر ؎

چوں دلشت نہاں درد زمردم لیکن ۔۔۔ زردیٔ رنگ رُخ و خشکیٔ لب چہ علاج

اپنی اس بے اختیاری پہ اس اضطرار پہ تو نظر ڈالو تم فرض کرتی ہو اور پکار پکار کے کہتی بھی ہو کہ "فرض کرتی ہوں کہ ہستی کسی اور ستائی اور جمال آرائی کی مرہون منت ہو" فیروزہ! یہ فرض کرنا ہی تو اصل حقیقت ہو ؎

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب ۔۔۔ اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان من ہست

تم نے جو فرض کرنا چاہیئے تھا فرض کرلیا، اب اس فرض کر لینے کو قائم رکھو پھر یہی مفروضیت متبدل بہ واقعیت و حقیقت ہوگی حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ میخیزد! تم سے باتیں کرنیکا موقع ملا نہیں کہ مجھے پھر اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا مگر اسوقت مجھا تھا تمہیں ایک "پیام" پیشکش کرنے، بہتر ہی معلوم ہوتا ہو کہ اس "سترِ دلبراں" کو جیوں کا تیوں تم تک پہنچادوں، میرے تمہارے درمیان جو اسرار ہیں تمہیں معلوم ہے کہ وہ سعیدہ کیلئے اسرار نہیں ہیں اور یہی کیا میرا کوئی راز سعیدہ سے مخفی اور پنہاں نہیں ہے، سعیدہ آجکل یہاں نہیں ہیں، تمہارے خطوط انہیں بھیجدیے گئے تھے، انہوں نے جو گوہر ریزیاں کی ہیں وہ بھی دیکھو۔

"میرے پیارے کوکب ۔ میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں تمہارے اس خلوص اور تمہاری اس آئینہ قلبی کا وہ باتیں جو رسمی اور عرفی طریق پر مجھ سے پوشیدہ رکھی جانیوالی سمجھی جائیں گی، بے کم و کاست اور بغیر اندیشۂ غلط فہمی و بدگمانی مجھ سے ظاہر کردیتے ہو خدا کا شکر ہو اور بے حد و بے نہایت اور بے عدد و بے شمار شکر کہ باوجود اسکے کہ فیروزہ کا وجود میرے تمہارے درمیان میں ایک حجاب متعل ہو میرے دل میں غیریت کا خیال بھی نہیں آتا خوب سمجھ لو میں رقابت جیسے میں پست ترین جذبہ انسانی سمجھتی ہوں، نہیں کہتی، میں خود تو کچھ نہیں، میں کیا میری ہستی کیا، مگر الحمدللہ کہ میرے خدا نے میرے لئے اس خطر رقابت کو بے معنی کردیا ہے) میں ہر اُس بات میں راضی اور ہر اُس عمل اور طرز عمل سے خوش ہوں جس سے تمہیں راحت اور مسرت حاصل ہو، تمہیں اگر فیروزہ سے محبت ہو، تمہیں اگر فیروزہ کی محبت سے مسرت حاصل ہوسکتی ہے، تم اگر فیروزہ کے ہو سکتے ہو تو مجھے بھی فیروزہ سے محبت ہو۔ مجھے بھی فیروزہ کی محبت سے مسرت حاصل ہوسکتی ہو، اور میں بھی فیروزہ کی ہوسکتی ہوں، میرے پیارے کوکب مجھے خود بھی اپنے اس ساری دُنیا سے الگ اور انوکھے جذبے پر حیرت معلوم ہوتی ہو کہ تمہاری محبت کے طفیل مجھ کو ہر چیز مطلوب و محبوب معلوم ہوتی ہو جسے تم مطلوب و محبوب سمجھتے ہو، میں ایک طرف تو یہ محسوس کرتی ہوں کہ تمہاری نظروں میں پیدا و پنہاں فیروزہ کے لئے محبت کے پیام جلوہ آرا ہیں، پھر اگر میں اپنے دل میں تمہاری محبت کے جذبات عالیہ کی پرورش کرتی ہوں تو میرے جذبات محکوم و مغلوب کیوں نہ ہوں تمہارے جذبات کے اور میں کیا کہوں فیروزہ کیلئے........ میرے دل میں تو خود اُسکے لئے ناقابل بیان جذبات نغمہ زنی کر رہے ہیں، اور کیوں نہ میرے جذبات اسکی طرف سبقت کریں جب دونوں کے دل ایک جنس مشترک یعنی کوکب کی محبت کے جذبات سے معمور ہیں۔ میں تو برملا کہتی ہوں ؎

مسحور کرچکا ہے دُنیا کو شوق میں ۔۔۔ جسنے بھی اُسکو دیکھا دیکھا میری نظر سے

اللہ رے میری نظر..............!

بہر صورت اب حال تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ فیروزہ کی مسرت بھی میری مسرت ہوگئی۔

میں محبت کا معاوضہ نہیں چاہتی میرے مذہب میں تو ؎

کیا شکوۂ مجبوری کیسا گلۂ دوری
الفت کی اجازت بھی کیا کوئی کم احساں ہے

پھر "الفت کی اجازت" تو انعام مزید ہے ورنہ ع احساس محبت ہی انعام محبت ہے، مرحبا یہ خوش طالعی کہ میرا دل "اعتبار محبت" سے گوشۂ جنت ہو رہا ہے ؎

یاد اُس گل رعنا کی دلمیں چمن آرا ہے
آغوش تمنا میں معشوقِ تمنا ہے

میں راضی میرا خدا راضی۔ میں خوش میرا خدا خوش، تم فیروزہ کے ہو جاؤ اور فیروزہ تمہاری ہو جائے مگر۔۔۔۔۔ معاف کوئی معاف کرو۔۔۔۔۔ اس طور اور اس دستور کے مطابق جو اشرف المخلوقات انسان کا طور اور دستور ہے۔۔۔۔۔۔

میرے کوکب خوب سمجھ لو کہ کسی اور طریقے پر چلنے میں تمہیں مسرت اور طمانیت نہیں حاصل ہو سکتی کاغذ کے پھول لمس اور مشام دونوں کی بلندیوں تک پہنچا کیا معنی نگاہ کو بھی دیر تک اپنے فریب میں گرفتار نہیں رکھ سکتے، تم نے قانون کی مخالفت اور دستور سے علیحدہ روی اختیار کی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شراب تمہارے کام و دہن میں شیریں نہیں رہ سکتی اور جلد از جلد تمہیں اسکی ناگوار تلخیاں محسوس ہونے لگیں گی، برخلاف اسکے قانون کی پابندی اور دستور کی موافقت سے وہ گھونٹ میسر آئیں گے جنکی ابتدا شہد ہوگی، اور انتہا قند۔

کوکب تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ عقل شرعی جس چیز کو معصیت سے تعبیر کرتی ہے سلامتی فطرت کا احساس بھی اُسے اُسی احساس میں محسوس کرتا ہے، فرق صرف نام کا ہے، ہر حیوانی اور رذیل حرکت کے بعد ایک بے کیفی محسوس ہوتی ہے جو عارفانِ جذبات کی اصطلاح میں خجالت کہلاتی ہے، یہ بے کیفی اور خجالت خود ال اور شاہد ہے اس حقیقت پر کہ وہ حیوانی اور رذیل حرکت انسانیت اور انسانیت کے بلند مدارج کے منافی اور فطرت سلیمہ کیخلاف ہے اور یقیناً اس کا حاصل رنج والم اور بے کیفی و بدمزگی ہے پس مجھے اسمیں جانے شکایت نہ ہونا کیا معنی ہے میرے لئے، ایک پہلو سے، یہ عین باعث مسرت ہوگا اگر تم اور فیروزہ "حدود الٰہیہ" کے دائرہ کے اندر رہ کر اپنے لمحاتِ حیات کو مسرتوں سے معمور کرو۔ رہ گئی میں۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے جسے میری محبت کا احساس ہے ع

میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

مجھے دولتِ انتساب ہی بہت ہے ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بس است، میری زیادہ نگاری معاف کرو احساس محبت کیلئے تمہاری یاد کسی عنوان سے بھی ہو "جنت" ہے"

سعیدہ

فیروزہ تم نے دیکھا سعیدہ غالبًا اپنے پہلو میں عام انسانوں سے جدا اور ممتاز دل رکھتی ہے جو گوشت کا مثلث ٹکڑا نہیں بلکہ گلاب کی وہ کلی ہے جو نور اور خالص نور سے مرکب ہے۔ اللہ اللہ!

سعیدہ کے مکتوب مسعود نے نہ جانے مجھے کس عالم میں پہنچا دیا۔ فیروزہ کیا دُنیا اس اخلاص اس پاکیزگی اس نورانیت

کی مشغول خوش کر سکتی ہے .... کیا کہوں فیروزہ مجھ پر ایک کیف بیہوشی طاری ہے، مجھے اپنی ہستی گم نظر آتی ہے..... اسوقت نہ میں کچھ سوچ سکتا ہوں، نہ کچھ سمجھ سکتا ہوں، تم ہی کچھ سوچو، اور تمہیں کچھ بتاؤ۔

کوکب

کوکب!

سعیدہ اللہ ہی اللہ ہیں نار، سعیدہ وہ پھول ہے جسکے رنگ کی نظر افروزی اور جسکی نکہت کی مشام نوازی حواس روحی کو مسحور کر دینے والی ہے، سعیدہ وہ روشنی ہے جسکا ظہور ظلمت کو کافور کر دینے والا ہے، کسی کی طاقتِ لسانی اور کسی قسم کی عذب البیانی مجھے شکست نہ دیسکی کبھی واقعے نے میری آنکھیں نہ کھولیں کوئی تدبر و تفکر اگر تدبر و تفکر کا مجھے امکان تھا میرے لئے حلالِ مشکلات نہ ثابت ہوا مگر اس پیکرِ نور اس مجسمۂ پاکیزگی، اس آئینۂ اخلاص، اس مختصرِ ایثار نے میرے لئے تمام عقدے حل کر دئے، ہر راز افشا کر دیا، سب حجابات چاک کر دئے حقیقت آئینہ ہو گئی، معلوم کئے جانیوالا بھید معلوم ہو گیا..........

کوکب میں محسوس کرتی ہوں کہ میری کوئی قربانی معاوضہ ایکطرف اعتراف بھی نہیں ہو سکتی، سعیدہ کی اولوالعزمی کا۔ سعیدہ کا میرے ساتھ یہی احسان کافی ہے کہ اس نے بیک وقت دستور اور صاحب دستور دونوں سے مجھے واقف کر دیا، سعیدہ کی ہستی خود ہی شاہد ہے اُس ہستی پر جس نے سعیدہ کو یہ شان اور یہ آن عطا فرمائی ہے مجھے حیرت ہے اس اعجاز پر کہ ایک ادا میں یہ قیامتیں برپا کر دیں .... کوکب کیا فیروزہ .... اس نئی فیروزہ کی غیرت اس کا نو بیدار جذبۂ اخلاص اسکو گوارا کر سکتا ہے کہ آفتاب ابر کے دامن میں پوشیدہ ہو جائے، اور سعیدہ فیروزہ کی ہوس کاریوں کی بھینٹ چڑھ جائے نہیں ہرگز نہیں۔ سعیدہ کو خدا سدا سعیدہ رکھے، اس نے میری خود پرستی کی تاریکی کو اپنی خدا پرستی کی ضیا پاشی سے منور کر دیا، میں ناز کرتی ہوں، ناز اس جذبے پر کہ میرا دل بھی مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ ع

توخود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز

میرے لئے تمہارے لئے اور اور .... سعیدہ کیلئے سب کیلئے مسرتیں یونہی حاصل ہونگی کہ میں اپنے کو تمہارے اور سعیدہ کے درمیان حجاب نہ رکھوں، یہ جذبہ میرے لئے حامل ہے ایک نئے انداز کے کیف و سرور کا اور میرے لئے سب کچھ ہوگا اگر اسی کیف و سرور کے عالم میں تمہارے اور سعیدہ کیلئے مسرتوں اور راحتوں کا گلدستہ نذر کر کے میں ہمیشہ کیلئے تم سے مستور ہو جاؤں

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

کوکب میں خوش ہوں اور بے انتہا خوش کہ آخر میری ہستی کسی کام تو آئی بس ایک آخری پیام اور سُن لو اسکے بعد سلام اور آخری سلام ...... وہ پیام یہ ہے کہ سعیدہ سے کہو کہ میری نذرِ محبت کو شرفِ قبولیت سے ممتاز فرمائے،

فیروزہ

ا-ن

قرض

چٹک کے وقت سے ننھی سی اک کلی نے کہا
ذرا چمن میں طلسمِ بہار رہنے دے

ابھی تو آنکھ کھلی ہے مری، ابھی کچھ دیر
فضائے باغ کو طلعت نگار رہنے دے

مری رگوں میں مچلنے دے موجِ صہبا کو
مرے خیال کو شاداب کار رہنے دے

لباس قوسِ قزح کا جو میں نے پہنا ہے
مرے بدن سے اسے مست آثار رہنے دے

صباحتیں ہیں اگرچہ بہت عجیب و غریب
صباحتیں ہیں یہ ناپائدار رہنے دے

لطافتیں ہیں اگرچہ شمار سے باہر
لطافتیں ہیں یہ سب مستعار رہنے دے

ہجومِ رنگ فروغِ جمال و بارشِ کیف
عجیب چیز ہے دورِ بہار رہنے دے

تجھے بہار کے لیل و نہار کی سوگند
ذرا بہار کے لیل و نہار رہنے دے

کہا، کلی نے، بصد منت و نیاز کہا
مرا سہاگ، مری یہ بہار رہنے دے

مگر وہ گھائل اندازِ التجا نہ ہوا
کلی کو توڑ کے ہنستا ہوا روانہ ہوا

اُردو کی افسانہ نگاری

اُردو کی صحافتی دُنیا میں "افسانہ نگار" کا لقب اُس شخص کو دیا جاتا ہے جو غیر زبانوں سے ترجمے کیا کرے۔ مئی ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں حمود رابی صاحب کا ایک مضمون "عہدِ حاضرہ کے افسانہ نگار" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے یہ واضح ہوگا کہ حمود رابی صاحب نے "افسانہ نگار" کی کیا تعریف کی ہے:۔

سجاد حیدر یلدرم: "آپ اپنے ترکی افسانوں کے لحاظ سے دُنیائے افسانہ میں ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ طبعزاد افسانے بھی آپ لکھتے ہیں"

اعظم کُریوی: "۔۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ آپ ایک خاص نوعیت کے افسانے لکھتے ہیں جن میں بیشتر ترجمے اور بہت کم طبعزاد ہوتے ہیں"

حامد اللہ افسر میرٹھی: "۔۔۔۔۔ آپ کے افسانے عموماً ماخوذ اور ترجمہ ہوتے ہیں"

لطیف الدین احمد (ل۔ احمد): "۔۔۔۔۔۔ آپ کے افسانے بیشتر ترجمہ ہوتے ہیں اور کمتر طبعزاد"

حمود رابی صاحب کے خیال میں کسی افسانے کا ترجمہ، مترجم کی ملکیت ہوتی ہے۔ یعنی مترجم ہی اُس افسانے کا "لکھنے والا" یا مصنّف ہوتا ہے۔ گویا افسانہ نگار وہ شخص ہے جو افسانوں کا ترجمہ کیا کرے۔ مترجم صرف افسانہ یا کسی مضمون کا ترجمہ کرتا ہے۔ خیالات تو اصل مصنّف کے ہوتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ افسانہ کے مترجم کو افسانہ نگار کہا جائے۔ جبکہ پلاٹ اُس نے نہیں مرتب کیا، کرداروں کو اُس نے نہیں پیش کیا اور واقعات کو اُس نے نہیں قلم بند کیا۔؟

میں نہیں سمجھ سکا کہ ترکی افسانے یلدرم صاحب کے "اپنے" کیسے ہو گئے! افسانے تو اُن مصنّفین کے ہوئے جنہوں نے ترکی زبان میں اُن کو لکھا۔ یلدرم صاحب نے تو صرف ترجمہ کیا۔ جناب حمود رابی ہر مترجم کے بارے میں لکھتے ہیں "آپ کے افسانے بیشتر ترجمہ ہوتے ہیں" مجھے حیرت ہے کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ "مترجم" کسی مضمون کا ترجمہ کرتا ہے، "لکھتا" نہیں۔ "لکھنے والا" تو وہ شخص ہے جس کی جدتِ طبع کا نتیجہ وہ مضمون ہے۔ "افسانہ نگار" وہ شخص ہے جس نے پلاٹ مرتب کر کے واقعات کو افسانے کی صورت میں پیش کر دیا۔ اب اگر کوئی شخص اس افسانہ کا ترجمہ کرے تو وہ افسانے کا مصنّف نہیں بن سکتا۔ مترجم کی حیثیت محض مترجم کی ہے۔ خواہ وہ افسانے کا ترجمہ کرے، خواہ کسی علمی، ادبی، یا سیاسی مضمون کا۔ وہ اُس فن کا ماہر ہرگز نہیں کہلائیگا جس فن سے متعلق کسی مضمون کا اُس نے ترجمہ کیا ہو۔

۔۔۔ افسانوں سے دلچسپی رکھنے والوں نے غیر زبانوں کے بہتیرے افسانے پڑھے ہوں گے۔ اُن کو زیادہ تر انگریزی کی وساطت سے افسانوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہوگا۔ کیونکہ اُردو داں طبقہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو فرانسیسی، روسی جرمنی یا دوسری یورپی زبانوں سے واقف ہوں۔ وکٹر ہیوگو اور الیگزینڈر ڈوماز" کے ناولوں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن کیا ان ناولوں کے انگریزی تراجم کو ہم اُن کے مترجمین کی تصانیف تصور کرتے ہیں؟ مٹرلنک کے ڈرامے مٹرلنک ہی کے ڈرامے ہیں اگرچہ انگریزی میں ان ڈراموں کے ترجمے فرانسیسی زبان سے کئے گئے ہیں۔ حال میں ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد صاحب

نے میٹرلنک کے ایک ڈرامے "جائزل" ([illegible]) کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کے سرورق پر "مصنفہ مارس میٹرلنک" پہلے درج ہے، اُس کے بعد "مترجمہ شاہد احمد" لکھا ہوا ہے۔ بیسکی حمورابی صاحب کے نظریئے کے مطابق غالباً "جائزل" کا ترجمہ، شاہد احمد صاحب کا ڈرامہ ہے۔ اور شاہد صاحب ڈرامہ نگار ہیں۔"

مندرجہ بالا بحث سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ترجمہ کرنا کوئی ذلیل کام ہے بلکہ صرف یہ کہ مترجم کی حیثیت محض مترجم کی حیثیت ہے۔ اُس کو ترجمہ کئے ہوئے مضمون کا مصنف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ترجمہ کرنا بعض مواقع پر طبعزاد مضمون لکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ غیر زبانوں کے مفید مضامین کے ترجمے اپنی زبان میں پیش کرنا بھی زبان اور ادب کی خدمت میں داخل ہے لیکن مترجمہ مضمون پر غاصبانہ قبضہ کر کے اُسکو اپنی تصنیف ظاہر کرنا ادبی جرم ہے۔

اُردو میں افسانہ نگاری نے ابھی تک خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے۔ ہمارے ادبا قوتِ متخیلہ سے کام نہیں لیتے ہیں اور نہ غور و خوض کے عادی بنتے ہیں۔ اکثر حضرات کی عادت یہ ہے کہ وہ کسی غیر زبان کے افسانے کے پلاٹ کو درہم و برہم کر کے اپنا بنا لیتے ہیں اور کسی ادبی رسالے میں شائع کرا دیتے ہیں۔ افسانہ اس طرح شائع ہوتا ہے کہ گویا اُن کا طبع زاد افسانہ ہو، یعنی افسانے کے ساتھ یہ اعلان نہیں کیا جاتا کہ یہ افسانہ فلاں افسانے کا ترجمہ ہے۔ لیکن اندازِ بیان اور الفاظ کی بندش سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ افسانہ کسی غیر زبان کے افسانے کا خاکہ ہے۔

اُردو میں طبعزاد افسانے لکھنے والوں کی کمی ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کے افسانوں میں "افسانویت" کا فقدان ہوتا ہے۔ اُردو کے افسانوں کا فرسودہ موضوع "محبت" ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان محبت، جس کا لازمی نتیجہ شادی ہے۔ جو لوگ اخلاقی یا اصلاحی افسانے لکھنا چاہتے ہیں، وہ بھی زیادہ تر ناکام رہتے ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانے محض اخلاقی یا معاشرتی مضامین ہیں، کیونکہ وہ واقعات میں دلکشی اور تسلسل نہیں قائم رکھ سکتے۔ البتہ ہندوؤں کی خانگی زندگی اور ان کی طرزِ معاشرت کو انہوں نے بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ اُردو کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ افسانہ کا ابتدائی حصہ پڑھنے سے ہی "پلاٹ" واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ افسانہ میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ ناظرین کشمکش و پیچ میں رہیں اور اُن کو فوراً معلوم نہ ہو جائے کہ واقعات کی گتھی کس طرح سلجھے گی۔

موضوع کے اعتبار سے اُردو کے افسانے (یعنی طبعزاد افسانے) بہت فرسودہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والے غور و خوض نہیں کرتے۔ اگر جدتِ طبع سے کام لیا جائے تو کسی فرسودہ موضوع کو بھی نئے رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

افسانے کی متعدد قسمیں ہیں جن میں سے عام طور پر مختصر افسانہ بہت مقبول ہے۔ ہر افسانے کا کوئی خاص موضوع ہوتا ہے۔ واقعات کی وہ عمارت جسے افسانہ کہتے ہیں، اسی موضوع پر قائم کی جاتی ہے۔ اگرچہ ناول کا بھی کوئی موضوع ضرور ہوتا ہے، لیکن ناول میں اِس موضوع سے گریز کر کے زندگی کے ہر مسئلہ سے بحث کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم کسی ناول کی تشریح کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں متعدد مختصر افسانے موجود ہیں۔ ان افسانوں میں ایسا باہمی تعلق ہے کہ انہوں نے طول و طویل قصہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مختصر افسانے کا میدانِ عمل ناول کے مقابلے میں بہت محدود ہے۔ مگر مختصر افسانے میں چونکہ موضوعِ افسانہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی

ہے، اس لئے اثر زیادہ ہوتا ہے "کشش" یا "جاذبیت" مختصر افسانہ میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ "جاذبیت" کا دارومدار پلاٹ، انداز بیان، اور سلاست زبان پر ہوتا ہے، جس طرح مصوّر تصویر میں رنگ بھر کر اس کے صحیح خدوخال کو واضح کرتا ہے اسی طرح افسانہ نگار افسانہ میں دُنیاوی زندگی اور انسانوی فطرت کے ہر پہلو کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ افسانہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فلسفہ، تہذیب، تمدن، علم و ادب، سیاسیات، غرض کہ ہر موضوع پر افسانے لکھے جا سکتے ہیں۔ "رامیں رولاں" نے اپنے ناول جان کرالستوفر میں آئندہ نسل کو کسی بہت بڑے خطرے سے آگاہ کیا تھا جو مستقبل قریب میں آنے والا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد جب ہم اس افسانے کو پڑھتے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رولاں ایک بلند پایہ مدبر اور مفکر ہے، جس نے افسانے کے پیرائے میں دُنیا کو بیسویں صدی عیسوی کے تمدنی اور سیاسی انقلابات سے آگاہ کیا ہے۔

افسانے کی تلاش کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد کے واقعات کا مطالعہ کرنے کی۔ اگر ہم روزمرہ کی زندگی پر ہی غور کریں تو سینکڑوں افسانے لکھ سکتے ہیں۔ کسی شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں سے گذرتے ہوئے، ہم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ راہگیروں میں کیسے کیسے لوگ ہیں؟ اُن کے خیالات اس وقت کیا ہیں؟ وہ کس دھندے میں مبتلا ہیں؟ اُن میں سے بعض ایسے ہوں گے جن کو دُنیا میں ہر قسم کا آرام نصیب ہوگا اور وہ بالکل آزاد و بے پرواہ ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو ہمیشہ ناکامیوں سے ہی مقابلہ کرتے رہتے ہوں گے۔ اگر کسی شخص نے حساس طبیعت پائی ہے، غور و خوض کرنے کا عادی ہے اور انسانی فطرت کا نفسیاتی مطالعہ کر سکتا ہے تو وہ بہترین افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ ایسے افسانے زیادہ مؤثر اور دلکش ہوتے ہیں، جن کے پلاٹ، ہم واقعات کے مطالعہ کے بعد بنائیں۔ کسی دوسرے افسانے کے پلاٹ میں تغیر و تبدل کر کے اس کو اپنا بنا لینا ادبی ڈکیتی کے برابر ہے۔

ادب میں افسانہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کا مرتبہ شاعری سے کم نہیں۔ زبان اور ادب کو ترقی دینے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ افسانہ تخلیقی ادب (Creative Literature) کی رُوح رواں ہے۔ اردو میں تخلیقی ادب کی بہت کمی ہے، اس لئے ادیبوں کو لازم ہے کہ افسانوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم ہندوستانی اور ایشیائی تہذیب و تمدن کو اپنے افسانوں کا موضوع بنائیں۔ اگر بعض ادیبوں کی یہ خواہش ہو کہ اُن کے افسانے ہر مُلک اور ہر قوم کیلئے مشعلِ ہدایت ہوں تو وہ انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ اور بین الاقوامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع مقرر کر سکتے ہیں۔

اس سال ساقی کے "افسانہ نمبر" میں جناب شاہد احمد صاحب نے اپنی جدت طبع کا ثبوت دیا ہے۔ "افسانہ نمبر" میں ایک ہی پلاٹ پر بارہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے دو یا تین افسانے اچھے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر شاہد صاحب ہر ماہ کوئی پلاٹ مقرر کر دیتے، جس پر افسانہ نگاروں کو طبع آزمائی کا موقع ملتا۔ جتنے افسانے موصول ہوتے اُن میں سے ہر ماہ صرف دو یا تین افسانے شائع ہوتے۔ اگر ساقی یہ طریقہ اختیار کرے تو اُردو میں افسانہ نگاری کو ترقی دینے کا یہ بہترین ذریعہ ہوگا۔ ہر ماہ کا پلاٹ مختلف النوع ہو اور مختلف اشخاص پلاٹ کو مرتب کریں تو یقیناً ہر مہینہ کے افسانے میں کوئی نہ کوئی جدت ضرور ہوگی۔ کسی مقررہ پلاٹ پر طبع آزمائی کرنے سے نومشق ادیبوں کو بھی افسانہ لکھنے کی مہارت ہو جائے گی۔

—— آرزو جلیلی

ہندوستان

مُفلس، غریب، فاقہ کش و زار و مستہام جاہل، جمود پرور، ناشاد و خستہ کام
برباد و بے وقار، زوال آشنا، غلام وہ سرزمیں جس کا ہے "ہندوستان" نام

پامالِ روزگار ہے، ذرّہ کہیں جسے
لُوٹی ہوئی لُٹی ہوئی دُنیا کہیں جسے

سرمایہ دار کھا گئے مزدور کا دماغ انداز کہہ رہے ہیں کہ حاصل نہیں فراغ
پڑتا تھا روئے ماہ سے شمعوں پہ پہلو داغ اب اُنکے جھونپڑوں میں بھی جلتا نہیں چراغ

غنچے ہیں پھول ہیں نہ بہاریں نہ باغ ہیں
سینے میں اک چمک سی ہے اور دل میں داغ ہیں

ہر باغ کی بہار میں رنگِ خزاں ہے اب موجِ روانِ بحر بھی ریگِ رواں ہے اب
پہلی سی وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب ہندوستان! وہ تیری عظمت کہاں ہے اب!

پُرامن دَیر ہے نہ سکونِ کنشت ہے
دوزخ بھلی ہے تجھ سے اگر تو بہشت ہے

"ہندوستان" نام میں جسکے یہ شان ہے باقی اب اس میں کوئی ادا ہے نہ آن ہے
صحرا میں زندگی ہے نہ باغوں میں جان ہے میں پوچھتا ہوں کیا یہی جنت نشان ہے؟

مُردے جو اک صدی کے اُٹھیں امتحان کو
شاید کریں شناخت نہ "ہندوستان" کو

قسمت کا شکوہ اور فلک کا گلہ فضول ہے ہر شکایتِ ستمِ ناروا فضول

فریاد اور نالہ و شور و بکا فضول — ہیجانِ انقلاب و غمِ ابتلا فضول

ہندوستان اپنی بلا کا شکار ہے
اپنی مصیبتوں کا یہ خود ذمہ دار ہے

"ہندوستان" پریم کا مندر، وفا پناہ — وہ سربلندِ عشق و محبت کی جلوہ گاہ
اپنی ہی خودسری و خودی سے ہوا تباہ — ورنہ یہاں سلام کو جھکتے تھے مہر و ماہ

ہر رنگ تھا جوان وہ عہدِ شباب تھا
ہر ذرہ اس کی خاک کا اک آفتاب تھا

ہندوستان جس میں نہ غیرت ہے اب نہ جوش — یہ برہمن تو برہمن بتکدہ فروش
یا پیرِ خانقاہ، متاعِ حرم بدوش — غفلت کے ماسوا نہیں اب اسکو کوئی ہوش

سویا ہوا ہے اپنی ہی تقدیر کی طرح
بھٹکا ہوا ہے خواب کی تعبیر کی طرح

"ہندوستان" اب بھی نہ چونکا جو خواب سے — بھر جائے گی تمام فضا اضطراب سے
نکلیں گی آفتیں ابھی صدہا حجاب سے — ہو جائیگا ہلاک غمِ انقلاب سے

پھر غفلتوں میں چین سے سویا نہ جائیگا
تجھ سے خود اپنے حال پہ رویا نہ جائیگا

کچھ شرم ہے تو پھر ہوسِ انقلاب کر — ناکام ہے تو سعی کوئی کامیاب کر
ہمت سے کچھ علاجِ غم و اضطراب کر — ورنہ فنا کی گود میں سامانِ خواب کر

کیوں میرے نشتروں سے ترا دل فگار ہے
سالارِ ارتقا کا یہ اچھا سا وار ہے

تشنہ صحتی

روداد دل

یا

ریاضؔ کا ایک فراموش شدہ شاہکار

برادر عزیزم جناب شاہد احمد صاحب نے مجھ سے خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ میں جناب مولوی سید رئیس احمد صاحب جعفری ندوی مُدیر خلافت سے ان کے نانا حضرت ریاضؔ مرحوم کے حالات لکھوا کر شاہد صاحب کی خدمت میں بھیجدوں چنانچہ خط ملتے ہی میں رئیس صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُنھوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ حضرت ریاضؔ کے حالات "ساقی" کے لئے لکھدینگے۔ میں نے اُن سے وعدہ لیکر وہیں ایک اور عزیز دوست سے کارڈ لیا اور اطلاعاً شاہد صاحب کو لکھا اور انہی دوست کو ڈاک میں ڈالنے کیلئے دیدیا۔ اب میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ جناب شاہد صاحب کے خط کا جواب ہو چکا ہے اور وقت پر رئیس صاحب سے مضمون کا تقاضہ کرونگا۔ لیکن جب حسب وعدہ مضمون کے لئے انکی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ دوست جنکو خط دیا گیا تھا۔ خط بجائے ڈاک خانہ میں ڈالنے کے اپنی جیب ہی میں لئے پھرتے رہے۔ ادھر جناب رئیس کے وعدے نے بھی دوسری صورت اختیار کرلی یعنی ان کے اُستاد حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ۔ مدیر معارف نے براہ راست ان کو لکھا کہ وہ اپنے نانا کے حالات معارف میں شائع کرائیں۔

ظاہر ہے کہ اُستاد کی خواہش کے مقابلہ میں دوستوں سے وعدے کا ایفا ذرا مشکل ہوتا ہی۔ اسلئے میں نے بھی ان کو ان کے وعدے دیروز سے آزاد کر دیا جسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالات تو لکھے ہی جائیں گے چاہے وہ ساقی کی بجائے معارف ہی میں شائع ہوں۔

اب ہمارے عزیز شاہد صاحب سمجھ گئے ہونگے کہ میں ان کے خط کے جواب میں خاموش کیوں رہا۔ خیر لیکن یہاں مجھے اتنی فریاد کی اجازت دیجیے۔ کہ ہمارے نیازؔ اور علمائے کرام کی جنگ نے دنیائے ادب کے علاوہ اور چیزوں کے ریاضؔ کی آپ بیتی سے محروم کر دیا۔ نہ علمائے کرام اور مولانا نیاز میں جنگ ہوتی نہ ریاضؔ کی آپ بیتی جو نگار میں بعنوان "ریاضؔ آپ اپنے آئینہ میں" شائع ہوا کرتی تھی۔ یوں بے لکھی رہ جاتی۔

سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کو اس مذہبی جنگ سے فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر یہ نقصان ضرور ہوا کہ ریاضؔ کا وہ مضمون ادھورا رہ گیا اور اب جب ریاضؔ ہی نہ رہا تو ریاضؔ کی آپ بیتی کون سُنائیگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہاں مولانا نیاز حضرت ریاضؔ کے دوست تھے، کاش وہ اپنے نوٹ کو پھیلا کر پھر شائع کریں۔ جو آپ نے حضرت ریاضؔ کے اس سلسلۂ مضامین کی ابتدا میں لکھا تھا۔ اور اگر ہوسکے تو ریاضؔ کے کلام نظم و نثر کے نمونے بھی اپنے مضمون میں شامل کر دیں۔

ریاض کے وارث اب صاحب ثروت ہوں یا نہوں۔ مگر بحمد اللہ اہل علم بھی ہیں اور اہل ذوق بھی۔ اگر وہ چاہیں تو ریاض کا باقی ادب اجڑنے سے محفوظ رہ سکتا ہے پس ان کا کام یہ ہو کہ بہر ممکن طریقہ سے ریاض کی تاریخ۔ ریاض کے تراجم۔ ریاض کی طبع زاد نثر۔ ریاض کے مکاتیب اور سب سے بڑھکر مرحوم ریاض کی شاعری کے دفتر کو مرتب و منظم کر کے شائع کرنے میں امروز فردا سے کام نہ لیں۔

مولوی شمس احمد صاحب سے حضرت ریاض کی خبر سن کر جو سکتہ کا عالم مجھ پر طاری ہوا تھا اسکی کیفیت سے وہ واقف ہیں مگر نہیں وہ تو خود بیہوش تھے۔ کاش میں اس بزرگ کے حالات لکھ سکتا۔ اگرچہ اس صدمے نے مضمون نویسی کا جوش ضرور پیدا کر دیا تھا مگر جسکے پاس سوا دنہ ہو۔ وہ لکھیگا کیا۔ تاہم میں نے اپنے دل کے زخم اور باذاق دوستوں کے علاوہ مولنا محمود اسرائیلی کو بھی دکھائے، ریاض کی موت ایسی نہتھی جس سے شعر و شاعری کا مذاق رکھنے والے متاثر نہ ہوتے۔۔۔ چنانچہ آپ بھی متاثر ہوئے اور فرمایا کہ بچپن کے زمانہ میں ابھی جبکہ آپ سکول ہی میں پڑھا کرتے تھے، ریاض کا "فتنہ" شباب پر تھا۔ اسی فتنہ میں ایک قطعہ شائع ہوا تھا۔ جو آپ کو سارے کا سارا یاد ہو۔ بجز ایک آدہ شعر کے۔ آپ کا بیان ہے کہ اگر غلطی ہو تو اسکی ذمہ داری نہیں۔ مگر یہ کلام آپ کے حافظہ نے ریاض ہی کا سمجھ کر محفوظ رکھا ہو۔ جو اب ناظرین ساقی کی خدمت میں جناب محمود سے لیکر پیش کیا جاتا ہو۔ جن لوگوں کے پاس "فتنہ" کے فائل ہوں، وہ دیکھ سکتے ہیں، اور اس قطعہ میں جو کمی ہو اسکو پورا کر سکتے ہیں۔ حضرت محمود کا حافظہ خیال اور میرا ذوق کہتے ہیں کہ یہ اشعار ریاض کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر ریاض کے نہ ہوں تو فتنہ کے ضرور ہیں اور یہ بات بجائے خود فتنہ کی ادبیت اور ریاض کے مذاقِ زبان و شعر کی آئینہ دار ہوگی۔

بہر حال اشعار حسب ذیل ہیں۔ حضرت محمود نے جس طرح لکھوائے ہیں۔ میں اسیطرح ذیل میں نقل کر دیتا ہوں۔ اور جو شعر آپ کو پورا یاد نہ تھا۔ میں نے اسکا وہ حصہ چھوڑ کر باقی حصہ لکھدیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرینِ "ساقی" اس قطعہ کو ایک گرانمایہ ادبی تحفہ اور باکمال استاد کا ایک شاہکار پائیں گے۔

قطعۂ ریاض

دیا کب اس لئے دل تھا کہ لطفِ وصل حاصل ہو
دیا دل اس لئے کب تھا کہ فرقت مجھکو تڑپائے

دیا تو اس لئے دل تھا کہ عادت ظلم کی چھوٹے
دیا تو اس لئے دل تھا کہ ظالم کچھ تو شرمائے

یہ سب کچھ چپکے چپکے کہہ رہا تھا میں کہ اتنے میں
وہ آئے اور آکر سب سنا اور سن کے جھنجلائے

کہا کیا بس اسی برتے پہ تھا دعوئے محبت کا
ذرا سے دل کو دیکر خیر سے آپ ایسا اترائے

کہ ہر دم دل کے دینے کا وظیفہ لب پہ جاری ہو
غرض اس اوچھے پن سے غالباً یہ ہو کہ بل جائے

اگر یہ ہے تو لو چولھے میں ڈالو، بھاڑ میں جھونکو
یہ ہم سے اپنا دل لو، ہم تو ایسے دل سے باز آئے

ذرا سے گوشت کا اک لوتھڑا اور خیر سے وہ بھی
کہیں سے داغ بھی کھائے کہیں سے زخم بھی کھائے

اور اس پر یہ کہ ہم نے اسلئے دل کو دیا کب تھا
اور اس پر یہ کہ کوئی دل کو کیوں آزار پہنچائے

یہ سن کر دم بخود میں ہوگیا اور ہٹ کے چپکے سے
کہا یہ میں نہیں تہا کہہ رہے تھے میرے ہمسائے

تمہیں دھوکا ہوا عاشق سے ایسی بات ناممکن
.... کہ آوازِ حسن آئی
اُدھر آوازِ حسن آئی، اِدھر الفت پکار اٹھی

تمہیں دھوکا ہوا تم ہو خفا بے سمجھے بوجھے
کہ ہم ایسے نہیں جن کی طبیعت مل جاتی ہے
کہ ہیں ہیں خیر تو ہے آج کیوں آپس میں لڑتے

لڑائی ہو چکی یہ کہہ کے قصہ مختصر کر دو
سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

میرے ایک محترم دوست حضرت آر۔ ایس صاحب نے حضرت ریاضؔ کی وفات کا ہمشکل مادۂ تاریخ نکالا ہے یعنی بدحیف ریاضؔ مرد۔

عمر محمد خاں شہاب ملیر کوٹلوی

رات سے....

اے رات کی روح!
اُفقِ مغرب پر تیز خرام ہو
اپنے اُس مشرقی دھندلے غار سے برآمد ہو۔
جہاں تو دن کی طویل و تنہا روشنی میں بیٹھی ——
مسرت و خوف کے ایسے خواب بُنا کرتی ہے ——
جو تجھے محبوب و بھیانک بنا دیتے ہیں —
اپنی سُبک پروازی دکھا!!
اپنے جسم کو ستاروں سے جھلملاتی خاکستری ردا میں لپیٹ لے۔
دن کی آنکھوں کو اپنے عنبریں گیسوؤں سے اندھا کر دے
اُس پر اتنے بوسے ثبت کر کہ وہ تھک جائے
پھر صحرا، سمندر اور شہر پر گامزن ہو جا۔
ان سب کو اپنے خواب آور عصا سے چھو کر نیند کا متوالا بنا دے۔
آ — اے محبوبِ دیرینہ!
جب میں بیدار ہوا اور صبح کے مدہم نور کو دیکھا۔ تو
میرے دل سے تیرے لئے ایک آہ نکل گئی۔
جب نور کا دور دورہ تھا اور شبنم غائب ہو چکی تھی....
دُھوپ شجر و گل کی جھیڑ ہو چکی تھی۔ اور

تھکا ماندہ دن ایک ناخواندہ مہمان کی طرح
آرام کرنے کے لئے ڈھل چکا تھا.....
میرے دل سے تیرے لئے ایک آہ نکل گئی
تیری بہن موت آئی اور مجھ سے کہا۔
کیا تو مجھے چاہتا ہے؟
تیری ننھی بچی مخمور آنکھوں والی نیند آئی۔ اور
دوپہر میں بھنبھنانے والی مکس کی طرح نرمی سے بولی
"کیا میں تیرے پہلو میں آسودہ ہو جاؤں؟ کیا تو مجھے چاہتا ہے؟"
اور میں نے کہا "نہیں"! — "تجھے نہیں!!"

موت اُس وقت آئیگی جب تو فنا ہو چکیگی
اور جلد ہی — بہت جلد!
نیند اُس وقت آئیگی جب تو جا چکے گی
میں ان دونوں میں سے کسی کا منت پذیر نہیں ہونا چاہتا
میں تو صرف تیری ہی آرزو رکھتا ہوں — اے دلنواز رات!
جلد آ —— جلدی!!

(شیلے) انصار ناصری

یہ ہے محبّت!

محبت کے دعوے بڑے رنگین اور پیمان وفا بے حد مضبوط ہوتے ہیں، دعویٰ عشق میں ایک غوطہ زن کیطرح جو بازی لگا کر اپنے آپکو خطرے میں ڈال دیتا ہو، سنگدل، بے حیا، اور مطلب پرست لوگ بھولی بھالی عورتوں کی زندگی برباد کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی "زندگی" پیش کرتے ہیں کہ "اے میرے محبوب! یہ جان تیرے قدموں پر نثار ہونے کی منتظر ہے" مگر جب آزمائش شرط ہوتی ہے تو۔ ع وقت پہ یوں گئے بات اُٹھائی گئی :

صبیح نوجوان تھا اور خوبصورت، تندرست تھا اور توانا۔ ذکی الفہم تھا اور وجیہہ۔ جوانی اسکی چیری اور دولت اسکی لونڈی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر دل ——— ؟ ——— ہر ہر تھا عشق سے لیکن کیسا عشق؟ یہ راز ایک مغربی مصنف اپنی ایک کہانی میں افشا کرتا ہے۔

جوانی کی ایک، اور پہلی ہی نگاہ حسن پر پڑتے ہی گویا برق کا شکار ہوتی ہے اور بدبخت دل یہ سمجھ کر کہ وہ اپنے محبوب کا دیوانہ ہے، ہر ممکن کوشش سے اُسے حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن محبوب کا اس طرح حاصل کرنا کہ اسکی ساری زندگی اجیرن اور ناشاد ہو جائے اور یہ نام نہاد محبت جس کی قطعاً بھی پرواہ نہ کرے، کیا یہ خواہشات کی تکمیل نہیں، اور فطرت کیا اسکو محبت جیسے پاک جذبے سے تعبیر کر سکتی ہے ؟

یہ مانا کہ صبیح میں دُنیا کی تمام خوبیاں موجود تھیں مگر دُنیا کی نظروں میں یقیناً وہ بدترین ہستی متصور ہوگا کہ اُسنے ایک معصوم عورت کو دھوکا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ساحرہ اُسکی محبوبہ ہے، اور جانتا تھا کہ اغفل جیسے خوفناک شخص کی بیوی ہے، صبیح نے اُسے اپنی محبت کا نشانہ بنا کر اُسے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی لیکن وہ خود ہی اُس جال میں پھنس گیا یقیناً یہ محبت نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی ترکیب، اور یہ نام نہاد عشق، عشق مجازی تھا، اپنی زندگی خطرے میں دیکھ کر ایک مجبور و لاچار عورت کو مجرم اور مورد الزام ٹھیرانا، لاریب شرافت سے بعید ہے۔

۱

نزشح کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی خنکی تھی۔ فضائیں خاموش ہو چلی تھیں اور تاریکی دم بدم بڑھ رہی تھی یہانتک کہ گہرے اور کالے کالے بادل چاروں طرف سے گھر گھر کر یکجا جمع ہو گئے۔ خاموشی اندھیرے سے گلے مل رہی تھی اور رات بڑی خوفناک تھی اور ڈراؤنی۔

ساحرہ کے مکان کے آگے ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت موٹر آہستہ آہستہ فضا کو چیرتی ہوئی آکھڑی ہوئی۔ موٹر میں سے ایک نوجوان، لمبا تڑنگا، برساتی اوڑھے، چپکے سے دبے پاؤں برآمدے میں داخل ہوا۔ وہ دلمیں سوچ رہا تھا بس آج بیڑا پار ہے۔ بھلا ایسے وقت میں وہ مجھے سوائے اسکے کہ میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور کس لئے بلا سکتی ہے بلاشبہ وہ مجھ سے بیحد محبت کرتی ہے اور میں بھی ——— وہ بھی ——— اس کا پرستار ہوں "کچھ توقف کے بعد

اُس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

نوکر نے چٹخنی کھولی اور پوچھا "اس قدر خوفناک رات کو کون یہاں آنے کی جرأت کر سکتا ہے؟"

صبیح نے ہونٹوں میں مگر درشتی سے اپنا نام بتایا۔ ملازم سر ہلا کر بولا "اچھا! معاف کیجئے گا جناب میں بھول گیا تھا، بیگم صاحبہ نے آپکو یاد فرمایا تھا۔ برابر کے کمرے میں تشریف رکھیئے۔"

صبیح کمرے میں داخل ہوا جہاں صرف ایک موم بتی لمبی لمبی سلاخوں والی کھڑکی میں روشن تھی اور جس کی مدھم روشنی میں کمرے کی ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی۔

کسیقدر انتظار کے بعد اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا کہ دفعتاً اسکی نگاہیں ایک کرسی پر پڑیں جس پر ریشمی ساڑھی کا دامن لٹک رہا تھا۔ وہ اُسیطرف "میری محبوبہ! پیاری ساحرہ!" کہہ کر لپکا اور کرسی پر جھکا ——————

ایک لمحہ پیشتر جو دل بہت سی اُمیدیں لئے خیالات کی دُنیا میں یکہ و تنہا کشتی کیطرح ڈانواں ڈول پھر رہا تھا اب خوف کے مارے دُھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ صبیح کے مُنہ سے مارے ڈر کے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس کے قلب پر کچھ ایسی دہشت بیٹھی کہ وہ بالکل ساکت سا رہ گیا اور آنکھیں کھولے منہ پھاڑے سامنے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ——————

بجائے ساحرہ کے اسکی آنکھیں اغفل کو انتہائی غضب اور طیش کی حالت میں دیکھ رہی تھیں۔

۲

"آہا! آپ ہیں صبیح؟" اغفل نے تنفر آمیز طنزیہ لہجہ میں کہا۔

کاٹو تو لہو نہیں، صبیح سکتے کے عالم میں تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا اچھی محبت کی جو یہ مصیبت گلے پڑی اور بظاہر تو اس سے چھٹکارا معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے موت میرے سر پر منڈلا ہی ہو۔ ندامت، حیرت اور پھر خوف نے اسکے چھکے چھڑا دیئے۔ اسکی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں، اور اوسان خطا ہو چکے تھے کہ کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔

صبیح چونک کر اُٹھا اور اس طرف بڑھا "ایں؟" باہر قفل لگانے کی صاف آواز سُنائی دے رہی تھی۔

اُس نے دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی اور سہما ہوا بولا "کیا دروازہ کسی نے مقفل کر دیا؟" ——————

اغفل نے ایک پُرانی میز کا طواف کیا اور پھر دراز گھسیٹ کر ایک چھوٹا بکس نکالا اور اُسکو میز پر رکھ کر اطمینان سے بولا۔ "کچھ نہیں یہ میرا نہایت قدیم نوکر اور رازداں ہے۔ پچھلی جنگ میں وہ میرا نائب جرنیل تھا۔ خون بہانے کا بڑا شوقین ہے اور میرے ایک اشارے میں خواہ کیسا ہی شخص ہو موت کے گھاٹ اُتارنے میں قطعاً دریغ نہیں کرتا —————— صبیح! بدمعاش! بیوقوف! کمبخت! گدھے! پاجی!" اُسنے نہ معلوم کتنی ہی ایسی گالیاں سُنائیں اور بولا "نابکار لڑکے! تجھے میری بیوی سے محبت ہے ہے نا؟ ——————"

صبیح کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔

وہ پھر بولا "ہاں تو میری بیوی کو تجھ جیسے فریبی کے دھوکے میں آگئی اور مجھے ایک خط لکھا ہے" میرے پیارے دوست [illegible] محبت [illegible] اور مصیبت کا کام ہے شاید تم اسکا اندازہ نہ کر سکو کاش تم اسکے لئے تھوڑا سا وقت اور دیتے [illegible]

بیچ کیا ہیں نے تمہارے لئے اپنے شوہر کو چھوڑ دونگی ——" یہی لکھا تھا نا؟ یہ خط بلاٹنگ سے خشک کیا گیا اور اسکا عکس بلاٹنگ کے صفحہ پر پڑ رہا تھا جسکو میں نے اتفاقاً اسکے کمرے میں دیکھ لیا —— دوسرا پرچہ جو تمہیں بلاکہ آج رات کو ساڑھے بارہ بجے اگر مجھے اپنے ہمراہ لے جاؤ" میں" نے لکھا تھا اور میں نے ہی اسکے بدلے دستخط کئے جسے تو پہچان بھی نہ سکا...

اب تو ساحرہ سے عشق کرتا ہے صرف تھوڑی ہی دیر میں تجھے معلوم ہو جائیگا کہ یہ رات تیری قسمت کا کیا فیصلہ کرنے والی ہے"

صبیح پر سناٹا چھا گیا، وہ گھبرا کر لڑکھڑاتا ہوا بولا" اغفل! اغفل! خدارا مجھے معاف کر دو تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں قطعاً لاعلم تھا کہ تمہیں ساحرہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، اور اسی نے مجھ سے اپنے ساتھ لیجانے کو کہا تھا —— اغفل یقین کرو کہ میں نے کبھی —— سوائے ایک یا دو مرتبہ کے اسے سینے سے بھی نہیں لگایا...... اغفل! سارا قصور تمہاری بیوی کا ہے..."

"اچھا یہاں ہیں آپ —— ؟ گویا آپ حقیقت سے ناآشنا اور محبت سے بیخبر ہیں۔ ہوں! چوری اور پھر سینہ زوری، یہ آپ ہی سے سنا! خواہشات نفسانی کے کتے! جب جان جاتی دیکھی تو ذمہ داری اس پر تھوپی —— سب کا مزا ابھی چکھ لوگے ——"

۳

اغفل کھنکارا اور صبیح کی جان پر بن آئی، قہقہے کی ایک آواز جس سے منافرت اور تحقیر ٹپکتی تھی، خاموش دیواروں میں گونجی اس نے وہ بکس کھولا اور دو ریوالور نکالے، ان کو دونوں ہاتھوں میں لیکر نالی اس کی طرف کر کے مخاطب ہوا —— صبیح تمہارا کیا معلوم ہوتا تھا ——"

"ہم میں سے ہر ایک اپنے ہاتھ سے الگ پرچوں پر تحریر کریگا کہ" میں خودکشی کر رہا ہوں اور میرا کوئی قاتل نہیں" اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے پر فائر کرینگے۔ جو زندہ بچ گیا وہ اپنی تحریر پھاڑ کر اور دوسرا پرچہ مقتول کے پاس رکھ کر چلا جائیگا ——"

یہ سنتے ہی صبیح کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ کانپتے ہوئے لبوں سے بولا" کیا؟ قتل؟ نہیں نہیں، اغفل میں بے گناہ ہوں...... اچھا میں ہی قصوروار سہی لیکن مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں یہاں پھر کبھی نہ آؤنگا اور محبت کا خیال میرے دل میں پھر کبھی بھول کر بھی نہ آئیگا۔ اغفل خدا کیواسطے مجھ پر رحم کھاؤ۔ تم جس قدر روپیہ مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔ میری جان بخش دو۔ میں یہاں سے تو کیا اس شہر ہی سے نکل جاؤنگا۔" وہ سنبھل کر پھر بولا" تمہیں معلوم ہے کہ قتل کا کیا انجام ہوتا ہے...... تم مجھے قتل نہیں کر سکتے ——"

ریوالور کی نالی اسکی طرف کر کے اغفل جھلا کر بولا" کیا کہا، میں تمہیں قتل نہیں کر سکتا ——"

صبیح سہما کا سہما رہ گیا ——

"میں یہ میری تحریر ہو اور اسکی نقل کر کے اپنے دستخط ثبت کر دو" وہ گرج کر بولا۔

موت کو اپنے سامنے کھیلتا ہوا دیکھ کر سہما ہوا دل ہاتھ سے کام کرنے لگا ——

گھنٹے نے ایک بجایا جسکی دھیمی آواز کمرے میں گونجی اور خوفزدہ کانوں میں بیٹھ گئی۔

صبیح ایک لمحے کیلئے رکا مگر اغفل نے ریوالور کو زور سے میز پر مارا اور چیخ کر بولا" جلدی! "

تحریریں تیار ہونے کے بعد دونوں ریوالور میز پر رکھ دیئے گئے اور اعغل بولا " تین قدم پیچھے ہٹ جاؤ اور جس وقت میں
منہ سے " تین " سنو تو فوراً ان میں سے ایک ریوالور اُٹھا لو اور فائر کردو "

صبیح میں اتنی بھی طاقت نہ رہی تھی کہ ہل جل سکتا۔ اعغل نے پکڑ کر دیوار کے سہارے اُسے کھڑا کردیا اور خود تین قدم پیچھے ہٹ کر اسکے مقابل ڈٹ گیا اور بولا " ہوشیار! ایک ....."

صبیح کو تاریک کرہ چکر کھاتا ہوا معلوم ہورہا تھا۔

" دو " اعغل کڑک کر بولا۔

صبیح کے تمام جسم میں رعشہ پیدا ہوگیا۔

" تین ......" اور پیشتر اسکے کہ ریوالور اپنا کام کرتا صبیح گر کر فرش پر بے ہوش ہوگیا۔

کسی نے پیچھے سے دروازہ کھولا اور اعغل کے نوکر سابق نائب کرنیل نے جھانک کر کہا " آقا! کیا ...."

۴

دونوں آقا و ملازم نے صبیح کو جو بیہوش ہوکر بدحواس پڑا ہوا تھا، موٹر میں لے جاکر ڈال دیا۔ اعغل نے سرد پانی کے چند چھینٹے دیئے، اور ایک طرف چھپ گیا چند لمحات بعد اُسے ہوش آیا وہ چاروں طرف نظر دوڑانے لگا اُسے ہر چیز سُن معلوم ہوتی تھی، اس طرح نجات کا ایک رستہ دیکھ کر اس نے جلدی سے موٹر سنبھالی اور آناً فاناً میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

" سستے چھوٹے۔ محبت کس قدر زہریلی ناگن ہے۔ لاحول ولا میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں دنیا میں ہر جگہ ساحرہ جیسی عورت پیدا ہوسکتی ہے، وہ دلمیں کہہ رہا تھا اور محبت کو آگ کے شعلوں سے تشبیہ دیتا ہوا اُسے کوس رہا تھا۔

اُدس پڑی ہوئی تھی، تاریک فضا کو چیرتی ہوئی جب زرد روشنی سامنے بالکل غائب ہوگئی تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اعغل نے اپنے ملازم کا ہاتھ دبایا اور کہا " دیکھا! یہی محبت ہے، کہنے لگا اب محبت کا بھول کر بھی نام نہ لونگا اور اس شہر سے فوراً اپنا منہ غارت کرلونگا...... وہ صرف اپنی زندگی چاہتا تھا اور پھر کہتا تھا کہ اسکی زندگی ساحرہ ہے ———— آہا ہا! مجھے معلوم تھا کہ وہ ریوالور چلانے کے قابل نہیں اور موت کے نام سے تو اسکا رُواں رُواں تھرا اُٹھا تھا ———— اور جو کہیں وہ ریوالور کھول کر دیکھ لیتا ———— ؟ معلوم ہے ———— وہ خالی تھے! "

صادق الخیری؛ دہلوی

دلچسپ غلط فہمی

(ایک کشادہ کمرے میں، جس کے فرش پر قیمتی اور حسین و جمیل نقش و نگار سے مزین غالیچے بچھے ہوئے ہیں، جمیلہ کرسی پر بیٹھی ہوئی رومال وغیرہ کاڑھ رہی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک انگیٹھی رکھی ہوئی ہے، جمیلہ کے سامنے دیوار پر کلاک ٹک ٹک کرکے فضا میں مستقل ارتعاش پیدا کر رہا ہے، ایک دروازہ جمیلہ کی پشت کیجانب ہے اور دوسرا اسکی دائیں طرف، پردہ اُٹھنے کے بعد وہ ایک منٹ تک اپنے کام میں منہمک رہتی ہے، یکایک دائیں طرف سے کسی کے پاؤں کی آہٹ آتی ہے، اور ساتھ ہی گیارہ کا گھنٹہ بجتا ہے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کلاک کو دیکھتی ہے، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوجاتی ہے۔ راشد، مسکراتا ہوا دبے پاؤں آکر شرارتاً جمیلہ کی آنکھوں پر نرمی کیساتھ، ہاتھ رکھدیتا ہے۔)

جمیلہ:۔ (آنکھوں سے راشد کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے خفگی آمیز لہجے میں) مجھے چھوڑ دو، میں باز آئی ایسے چہلوں سے (جلدی سے اُٹھ کر راشد کی طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، دروازے سے نکلکر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے اور اس سے پیشتر کہ راشد اس کے پاس پہنچے، وہ بعجلت دروازہ بند کردیتی ہے۔ راشد گھبرا کر متحیرانہ دروازہ کو دیکھتا ہے، اور زور سے دستک دیتا ہے، مگر کوئی آواز نہیں آتی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر اخبار کے مطالعہ میں غرق ہوجاتا ہے۔ جمیلہ بڑبڑاتی ہوئی، دروازہ کھول کر آتی ہے۔)

جمیلہ:۔ (راشد کے سامنے کر) کیا تم سمجھتے ہو، ہمارے تعلقات اس طرح رہیں گے؟

راشد:۔ (اخبار سے نظر ہٹا کر عالم حیرت میں جمیلہ کو دیکھتا ہے۔)

جمیلہ:۔ تمہارا خیال ہے کہ شام سے لیکر اب تک تمہارا انتظار کرنے کے بعد اب میں تمہیں اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے نہایت دلچسپی سے دیکھونگی؟ کیوں نہیں ——— میں ایک ادنےٰ خادمہ جو ہوئی ——— ایک معمولی سی، ادنےٰ خادمہ!

راشد:۔ (اخبار پھینک کر اُٹھنا چاہتا ہے)

جمیلہ:۔ (طنزاً) نہیں جناب تشریف رکھیے، اتنی دیر پھرتے پھرتے یقیناً آپ بہت تھک گئے ہونگے۔ اسلئے اب آرام کی ضرورت ہوگی ——— ہے نا"

راشد:۔ (مضطرب ہوکر بولنا چاہتا ہے)

جمیلہ:۔ غضب خدا کا شام کے سات بجے سے لیکر اب تک تمہارا انتظار کرتی رہی ——— کتنے گھنٹے ہوئے، ایک۔ دو۔ تین، چار ——— اف میرے اللہ!

راشد:۔ (کلاک کی جانب دیکھتا ہے)

جمیلہ:۔ کہدو کلاک دو گھنٹے ——— مکمل دو گھنٹے آگے ہے، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

راشد:۔ (جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھتا ہے)

جمیلہ:۔ وقت دیکھنے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے ہو، میں ہر وقت تمہارا انتظار کرنے کیلئے موجود ہوں،

راشد:۔ (جھنجلا کر اخبار پھینک دیتا ہے)

جمیلہ:۔ مجھے منتظر دیکھکر تم بہت خوش ہوتے ہو ———

(دردناک لہجے میں) آہ آج میری بیسویں سالگرہ ہے لیکن تمہیں اس سے کیا؟ جناب کو تو اس کی خبر بھی نہ ہوگی،

راشد :۔ (اثبات میں سر ہلاتا ہے)

جمیلہ :۔ مجھے دھوکا دیتے ہو؟

راشد :۔ (مسکراتا ہے)

جمیلہ :۔ مسکراؤ، خوب مسکراؤ،

راشد :۔ (پہلے سے زیادہ مسکراتا ہے)

جمیلہ :۔ اتنا عرصہ آخر تم رہے کہاں ——— اپنے دوستوں کے پاس،

راشد :۔ (بدستور مسکراتا ہے)

جمیلہ :۔ اور پھر کسی عالیشان ہوٹل میں گئے؟

راشد :۔ (استفہام انگیز نظروں سے اسے دیکھتا ہے)

جمیلہ :۔ کوئی بات نہیں۔ آخر ہوٹل بنے کس کام کیلئے ہیں۔ اگر تم اپنی بیوی کو، اسکی بیسویں سالگرہ پر تحفہ دینے کی بجائے ہوٹل میں اپنے دوستوں کی دعوت نہ کرو، تو کون کرے؟

راشد :۔ (بولنے کیلئے منہ کھولتا ہے)

جمیلہ :۔ خفا نہ ہونا، خدا لگتی کڑوی ہی معلوم ہوتی ہے!

راشد :۔ (میز پر زور سے مکا مارتا ہے)

جمیلہ :۔ میز بے چاری نے کیا گناہ کیا؟

راشد :۔ (کرسی سے اٹھتا ہے)

جمیلہ :۔ میں تمہاری ایک حقیر خادمہ ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے اور کوئی حق حاصل نہیں!

راشد :۔ (جمیلہ کی جانب قہر انگیز نظروں سے دیکھتا ہے)

جمیلہ :۔ میں پوچھتی ہوں اتنا عرصہ رہے کہاں اور ———

راشد :۔ (ہاتھ کے اشارے سے جمیلہ کو چپ رہنے کیلئے کہتا ہے)

جمیلہ :۔ دوستوں کی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے بہت تھکے ہوئے ہو ——— کافی سے زیادہ تھکے ہوئے ہو ——— آہ! تمہیں معلوم نہیں، تمہارے انتظار میں اتنا طویل عرصہ میں نے کس اضطراب، کس بے چینی سے کاٹا ہے۔ اور تم سے معلوم نہیں اپنے دوستوں کیساتھ کہاں کہاں گھومتے اڑاتے رہے!

راشد :۔ (خاموش رہتا ہے)

جمیلہ :۔ ذرا شکل دیکھو نا! چہرے سے کیسی شرافت ٹپک رہی ہے خدا نظر بد سے بچائے۔

راشد :۔ (باوجود کوشش کے مسکراتا ہے)

جمیلہ :۔ ہر ایک شخص اپنی بیوی کے حقوق بطرز احسن سرانجام دیتا ہے۔ مگر ایک تم ہو جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ آج بیوی کی سالگرہ ہے۔ اور ہو کیوں جب کہ وہ ———

راشد :۔ (لفظ "وہ" پر گھبرا جاتا ہے)

جمیلہ :۔ کیا ہوا، "وہ" سے میری مراد تمہارے باوفا دوست ہیں جنکی صحبت میں تمہیں دنیا کی تمام مسرتیں حاصل ہیں۔

راشد :۔ (حیرت زدہ ہو جاتا ہے)

جمیلہ :۔ حیران کیوں ہوتے ہو، تمہارے دوست ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ گیارہ بجے آؤ، بارہ بجے آؤ، کوئی پوچھنے والا نہیں!

راشد :۔ ———

جمیلہ :۔ باقی تمام عورتیں اپنے خاوندوں کیساتھ خوش ہیں۔ میں ہی بدنصیب ———

راشد :۔ (بولنے کیلئے منہ کھولتا ہے)

جمیلہ :۔ نہیں ایک لفظ بھی نہیں ——— (دروازے کی طرف جاتی ہے پھر واپس آجاتی ہے) (راشد جھک کر بیٹھ جاتا ہے حیرت سے کرسی پر بیٹھے ہی گریبان کے خیال میں

جمیلہ :- کیوں نہیں ——— میں پوچھتی ہوں آخر اس کا مطلب کیا ہے؟!!

راشد :- ———

جمیلہ :- جواب دو نا!

راشد :- ———

جمیلہ :- سنتے ہو میں کیا کہتی ہوں، کیا کان بہرے ہیں

راشد :- (جمیلہ کو سرد مہری سے دیکھ کر اخبار اٹھانے کیلئے فرش پر جھکتا ہے)

جمیلہ :- جواب نہیں دوگے؟ (راشد کے شانوں کو ہلاتی ہو مگر وہ نظر اخبار سے نہیں ہٹاتا) آہ ہم عورتیں کس قدر بدنصیب ہیں!

راشد :- (برابر مطالعہ میں مصروف ہے)

جمیلہ :- (اخبار پکڑ کر) میں تم سے صرف یہی پوچھتی ہوں اتنے وقت کہاں رہے؟

راشد :- ———

جمیلہ :- آدھی رات کو آنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا دوستوں سے اکتا گئے؟

راشد :- ———

جمیلہ :- نہیں دوست تم سے اکتا گئے تھے۔

راشد :- ———

جمیلہ :- یہی بات ہے جبھی تو "چپ دین" بنے ہو،

راشد :- (اخبار کا ورق الٹتا ہے)

جمیلہ :- خوب پڑھو اخبار تمہیں میری کیا پروا؟

راشد :- (اخبار سے نظریں ہٹا کر جمیلہ کو دیکھتا ہے)

جمیلہ :- میری کیا پروا ——— کیا پروا (روتے لگتی ہے۔ اور خود کو ارادتاً فرش پر گرا دیتی ہے۔ راشد جلدی سے اٹھ کر اسے پکڑ کر اٹھاتا ہے)

جمیلہ :- (روتے ہوئے) آہ اماں جان! آج تجھے کیا خبر کہ تیری بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے (راشد سے) چھوڑ دو مجھے میں تمہاری جھوٹی ہمدردی اور دکھاوے کی محبت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہاری انہی عادات سے اماں جان تمہیں برا بھلا کہتی تھیں!

راشد :- (دفورِ خفگی سے مضطرب ہو جاتا ہے)

جمیلہ :- خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

راشد :- (اخبار کو جو ابتک اسکے ہاتھ میں تھا زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے)

جمیلہ :- (مسکرا کر) خوب یہ جواب دینے کا مہذب طریقہ ہے — ؟

راشد :- (میز پر سے گلاس اٹھاتا ہے۔ اور پانی پیتا ہے)

جمیلہ :- (راشد کے شانوں پر ہاتھ رکھکر) میری سالگرہ کیلئے تم لائے کیا ——— کچھ بھی نہیں۔

راشد :- (مسکراتا ہے)

جمیلہ :- مسکرانا پھر، پہلے جواب دو۔

راشد :- (جیب سے ایک بیش قیمت ہار نکال کر جمیلہ کے گلے میں ڈال دیتا ہے)

جمیلہ :- آہاہا ——— میرے پیارے ——— میرے اچھے خاوند!

راشد :- (مسکراتا ہے)

جمیلہ :- تم کتنے اچھے ہو (تاسف آمیز لہجے میں) میں یونہی وہم و گمان کا شکار رہی (راشد سے لپٹ جاتی ہے)

(پردہ)

(پلاٹ ماخوذ)

مرزا ادیب

شاعر!

تو سریرِ مملکت کا ہو جہاں میں تاجدار
لوگ کہتے ہیں تجھے روحِ سخن جانِ سخن
لفظ ہر موتی ہر اک ڈورا نظر کا تار ہے
تیرا ہر نکتہ ہے معنی سنجِ اربابِ سخن
پڑ گئی نقطہ پہ گر تیری نگاہِ انتخاب
قوتِ تخئیل کو تو آزماتا ہے کبھی
گفتگو کرتا ہے شب کو بے زباں تاروں سے تو
سر کو اپنے آسماں سے گاہ ٹکراتا ہے تو
رنگ بھرتا ہے کبھی معشوق کی تصویر میں
سیر کرتا ہے فلک کی تو عجب انداز سے
قوتِ پرواز کا تیری ٹھکانا ہے کہیں
پوچھتا ہے حالِ دل فرقت کے بیماروں سے تو
آسماں سے لیکے تارے پھول لیکر باغ سے
دردِ عاشق سے لیا معشوق سے عشوہ گری
تو نے اپنی ایک نئی دنیا بسائی اس طرح
نظم کرکے داستانوں کو بنایا مختصر

تیرے دم سے آئی باغِ نظم میں تازہ بہار
ہے سخن تیری رعایا تو ہے سلطانِ سخن
تیرا ہر مصرع مکمل موتیوں کا ہار ہو
تیرا ہر مطلب ہو گویا انجمن در انجمن
رفتہ رفتہ بن گیا وہ مستقلاً ایک کتاب
رکھ کے ذرہ سامنے دنیا بناتا ہے کبھی
کھیلتا رہتا ہے مثلِ طفل انگاروں سے تو
جا کے گردوں سے کبھی رنگِ شفق لاتا ہے تو
ڈالتا ہے پیچ گہ عشاق کی تقدیر میں
طائروں کے ہوش اڑتے ہیں تری پرواز سے
تو کبھی بالائے گردوں ہے کبھی زیرِ زمیں
درسِ عبرت لے رہا ہے ڈوبتے تاروں سے تو
چاند سے تنویر لیکر اور صفحہ داغ سے
حسن سے صبر و تحمل عشق سے دردِ سری
تو نے ملکِ نظم میں کی ہے خدائی اس طرح
اسلئے شاعر تجھے کہتے ہیں اربابِ نظر

مان لی دنیا نے محسن کارفرمائی تری
ہے سبق آموزِ عالم خامہ فرسائی تری

محسن اعظم گڈھی

کوتاہ بینی

جمیلہ اپنی عمر کی چودہ منازل طے کرکے اس زندگی میں قدم رکھ چکی تھی جسکو عام اصطلاح میں ''ازدواجی زندگی'' کہتے ہیں۔ قدرت نے نہ صرف اس کے ظاہری محاسن میں اپنی تمامتر صناعیوں کو ختم کردیا تھا، بلکہ باطنی محاسن میں بھی وہ بے بدیل و بے مثیل تھی۔ والدین کی روشن خیالی کی بدولت اس کو تمام مشرقی علوم میں کافی دسترس حاصل ہوچکی تھی، اور نیک نہاد شوہر کی صحبت نے اُسے انگریزی کے غوامض سمجھنے کے قابل بنادیا تھا۔ بہت سی اخلاقی کتب، و ناول اسکے گوہر جیسے قلب سے صفحۂ قرطاس پر چکے تھے۔ اب وہ کسی ناول کی تیاریوں میں منہمک رہا کرتی تھی۔ شوہر سے اسے بیحد محبت تھی، ایک دن وہ اُسکے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر گذار رہی تھی۔ اور ہر ایک رہرو پر آصف کا گمان کرتی تھی۔ اور سیڑھیوں پر ذرا سی آہٹ بھی اسکی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی۔ مگر وہ بے نیل و مرام ہوکر واپس آجاتی تھی۔

''الٰہی! خیر ہو۔ آج اُنہوں نے اتنی دیر کہاں لگادی؟'' جمیلہ نے دہڑکتے ہوئے دل اور محبت بھری آواز سے کہا اور جونہی کہ اس نے یہ فقرہ کہا، آصف فرحاں و شاداں سامنے آکھڑا ہوا۔ جمیلہ کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اسکا پژمردہ چہرہ کھل گیا۔ آصف آتے ہی معافی کا خواستگار ہوا۔

جمیلہ:- ''آپ کو معلوم نہیں، کہ کوئی آپ کے لئے کس طرح اپنی جان کو ہلکان کیا کرتا ہے۔ پہروں آپ کا انتظار کرتی رہی۔ آپ نے اتنی دیر کہاں لگادی؟''

آصف:- ''جمیلہ پیاری۔ چاندنی چوک سے گذر رہا تھا۔ یہ کنگن مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے کہا چلو جمیلہ کے لئے ہی لیچلو۔ بس سودا چکاتے چکاتے دیر ہوگئی۔ دیکھو! کیسا اچھا تحفہ تمہارے لئے لایا ہوں!!''

جمیلہ:- (ہاتھ میں کنگن پہنتے ہوئے) ''تحفہ تو بہت اچھا ہے مگر اس درجہ گھبراہٹ اور پریشانی کے بعد ملا۔ مجھے تو فکر ہو رہا تھا کہ کہیں دشمنوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگئی ہو......!''

آصف:- ''اچھا جی۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ جمیلہ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ وہ انسان کس درجہ خوش نصیب ہے جسکو تم جیسی وفا شعار بیوی مل جائے۔ آدمی چاہے جتنی دولت میں کھیل رہا ہو، اگر اسکی بیوی وفادار نہ ہو تو اسکی زندگی بڑی تلخ گذرتی ہے۔ اور جو وفا شعار بیوی اپنے شوہر کیساتھ ایک جھونپڑی میں گذارہ کرتی ہو تو وہ جھونپڑی ہی اُسے شاہی محل سے ہزار درجہ بہتر اور آرام دہ ہے۔ خدا نے میری بڑی مدد کی اور قسمت نے میری بیحد یاوری کی جو تم میرے انتخاب میں آگئیں۔''

جمیلہ:- ''اب لیکچر کو ختم کیجئے۔ اور کھانا تناول فرمایئے۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

جمیلہ کھانا لے آئی۔ اور محبت کے دعویداروں نے بیٹھ کھانا شروع کیا۔ آصف ہرچند یہ چاہتا تھا کہ جمیلہ کو کھانا تیار کرنے کی تکلیف خود نہ اُٹھانی پڑے۔ مگر جمیلہ اس بات کو ہرگز پسند نہ کرتی تھی۔ اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر اپنے پیارے شوہر کو کھلاتی تھی۔

غرض محبت کے یہ پرستار اپنی زندگی نہایت فرحت و شادمانی سے گذار رہے تھے، ان کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات تھی۔

چند دنوں کے بعد نجیب آباد سے جمیلہ کی والدہ نے اُسے خط بھیجا کہ بیٹی سکینہ اپنی چچی زاد بہن کو دیکھنے کی بے انتہا خواہش رکھتی ہے۔ اس فرحت افزا خبر نے جمیلہ کے دل کو سخت مضطرب کر دیا، کیونکہ وہ آصف کے پہلو سے ایک لمحہ کیلئے بھی جدا ہونا گوارا نہ کرتی تھی، اُس نے شوہر کی رضامندی حاصل کر کے نجیب آباد خط لکھدیا "بڑی بہن کو چند روز کیلئے ہمارے یہاں بھیجدیجئے، تاکہ ان سے شرفِ ملاقات حاصل کر سکوں" یہ خط دو روز میں ہی نجیب آباد پہنچ گیا۔ اور سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ چوتھے روز آ پہنچی، آصف کو بذریعہ تار پہلے ہی سے تاریخِ آمد کے متعلق مطلع کر دیا گیا تھا۔ وہ ان کے استقبال کو اسٹیشن پہنچ گیا تھا کمال تپاک سے سکینہ اور اُسکے شوہر سے ملاقات ہوئی، وہ گھر پہنچے۔ اور سکینہ دوڑ کر اپنی بہن جمیلہ سے بغلگیر ہوئی۔ فرطِ اشتیاق سے دونوں کے آنسو نکل پڑے۔

کچھ دنوں کی خاطر و مدارات سے لطف اندوز ہونے کے بعد سکینہ کا شوہر اُسے وہیں چھوڑ کر خود دفتر چلا گیا۔ اس عرصہ میں جمیلہ نے اپنی بہن کو کئی ناول اور مسودے دکھائے۔

ایکدن آصف وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی دفتر سے آیا۔ بیچاری جمیلہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، پہروں انتظار کرنیکے بعد اضطراب کو کم کرنیکے لئے وہ اپنے کمرے میں جا کر کچھ لکھنے میں مشغول ہو گئی۔ اتنے میں آصف بھی آگیا اور جمیلہ کو باہر نہ پا کر سیدھا اسکے کمرے میں گیا۔ جمیلہ لکھنے میں اس قدر منہمک تھی کہ اس کو آصف کی موجودگی کی خبر تک نہ ہوئی۔ آصف نے فرطِ محبت سے جمیلہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"جمیلہ! کیا لکھ رہی ہو؟"

جمیلہ نے آصف کو دیکھتے ہی کاغذ الٹ دیا۔ اور بولی:۔

"افسوس سے کہتی ہوں کہ میں لکھنے میں اس قدر مستغرق تھی کہ آپکی آمد کی خبر تک نہ ہوئی"

آصف "یہ کیا لکھ رہی تھیں؟"

جمیلہ "کچھ نہیں ......"

آصف "کیا میں اسے نہیں دیکھ سکتا؟"

جمیلہ "آپ اُسے دیکھکر کیا کریں گے؟"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ آصف نے جمیلہ کے منہ سے ایسا صاف جواب سُنا۔ اس نے سمجھا کہ اپ یا کسی سہیلی کو خط لکھ رہی ہوگی جو مجھ سے پرائیویٹ رکھنا چاہتی ہے۔ اُس نے یہ سمجھکر دل کو تسلی تو دیدی مگر دل کی بے چینی دور نہ ہوئی۔

اتفاق کی بات جمیلہ اور سکینہ دونوں کو اگلے روز کسی قرابت دار کے ہاں جانا پڑا۔ آصف کے دفتر کی چھٹی تھی، اس نے جمیلہ کی کتابوں والی الماری کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک کتاب کے شروع ہی میں وہی کاغذ مل گیا خط پر نظر پڑتے ہی اسکے چہرے کا رنگ اڑ گیا خط کا آغاز ذیل کے الفاظ سے کیا گیا تھا:۔

"پیاری جمیلہ! افسوس کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا۔ یہاں میں سخت اضطراب میں ہوں۔ اگرچہ میرا شوہر مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ مگر میری نظر میں تم ہی تم ہر وقت بستے ہو۔ تمہارا تصور ہر لحظہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر مجبور ہوں۔ یہ بات میرے بس کی نہیں"۔

یہ الفاظ پڑھتے ہی آصف پر نیم غشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا۔ تمام دنیا اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ جمیلہ سے بے انتہا محبت کیا کرتا تھا، اور اُسے یقین تھا کہ جمیلہ بھی حقیقی محبت کی دعویدار ہے، اور جس میں بناوٹ اور تصنع کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ لیکن ان ہوشربا سطور نے اسکے تمام الفت آمیز جذبات کو ناپید کر دیا۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور جمیلہ کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔

جب سورج چھپ چکا تو جمیلہ نے گھر میں قدم رکھا۔ شام کے جھٹپٹے میں قمقمے کی خیرہ کن روشنی کے سامنے اسکا حسن نہایت ہی دلکش دکھائی دیتا تھا۔ آصف کو جو اس نازک حالت میں دیکھا تو اُسکے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دوڑی دوڑی اُسکے پاس پہنچی اور بولی:-

"میرے سرتاج! کیا دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے؟ آج کیوں سرِ شام ہی لیٹ گئے؟"

آصف: "چل مردار کہیں کی۔ یہ مکر و فریب میرے ساتھ۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا"۔

جمیلہ کا نازک دل ان دلخراش الفاظ کا، جو اُس نے پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے منہ سے سنے تھے، متحمل نہ ہو سکا۔ اسکے حواس جاتے رہے اور اس نے ساتھ ہی ایک چارپائی پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ آصف اگرچہ جمیلہ کی آہیں، جو بیہوشی کے عالم میں اُس کے دل سے نکل رہی تھیں، سنتا رہا۔ مگر اس کا دل اس قدر سخت اور بیزار ہو چکا تھا کہ اُس نے ایک دفعہ بھی اسکا حال پوچھنا گوارا نہ کیا۔

آخر چند گھنٹوں کے بعد جمیلہ کی آہ و کرب بند ہو گئی۔ آصف سے اب نہ رہا گیا۔ وہ اُٹھا اور جمیلہ کی چارپائی کے قریب گیا .... مگر آہ جمیلہ مہر و وفا کی پُتلی ہمیشہ کیلئے اُس کو خیرباد کہہ کر اس دُنیا سے رخصت ہو چکی تھی!!

اتنے میں سکینہ بھی آ گئی۔ اور اپنی مُردہ بہن سے لپٹ گئی۔ آصف بھی سخت بیتاب ہو رہا تھا، اسکی اشک آلود آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا۔ آنسو پونچھنے کو جو رومال نکالا۔ تو وہی خط جیب سے گر پڑا۔ سکینہ نے کاغذ زمین پر سے اُٹھا لیا اور آصف سے پوچھا:-

"بھائی جان! آپ نے یہ کاغذ کہاں سے لیا ہے؟"

آصف: "سکینہ۔ یہ ایک خط ہے ...."

سکینہ: "بھائی جان۔ آپکو معلوم نہیں جمیلہ ایک ناول لکھ رہی تھی لیکن افسوس موت نے اُسے مہلت نہ دی کہ اسکی تکمیل کر سکتی۔ یہ خط اسی ناول کے صفحہ ۲۴ کا مسودہ ہے۔ جو اس نے مجھے دکھایا تھا"۔

آصف نے یہ الفاظ سنتے ہی اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا اور بولا "سکینہ میں ہی تیری بہن کا قاتل ہوں" اور ایک ہی لمحہ میں اپنے آپ کو اُسی عالم میں پہنچا دیا۔ جہاں اسکی وفاشعار محبوبہ اسکا انتظار کر رہی تھی ——— !

طاہر قریشی

پتھر کا دل

ایکدفعہ کسی سنگتراش نے برہنہ عورت کا ایک مجسمہ بنایا، مجسمہ اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ صبح و شام نہایت باقاعدگی سے اپنی عبودیت کے پھول اس پر چڑھایا کرتا، اور پاؤں میں پڑا گھنٹوں اُسے دیکھا کرتا، اسکی دعا تھی کہ دیوتا اسمیں جان ڈال دے وہ کہا کرتا تھا کہ اگر اُس میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے تو وہ فانی انسانوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا۔

اُس نے مجسمے کے گرد بیشمار آئینے لگائے تاکہ اُسے ایک ہی وقت پر مختلف زاویوں سے دیکھ سکے، ہر روز وہ جنگل سے تازہ پھول لاتا اور ایک خوبصورت تاج بنا کر اُسے پہنا دیتا، اُس نے بیش قیمت جواہرات اکھٹے کئے اور ان کو سونے کی چوڑیوں میں جڑ کر مجسمے کی کلائیوں میں پہنائیں، مگر زندگی کی حرارت جسکا وہ متلاشی تھا اُسے کب پیدا ہو سکتی تھی۔ اُسے اپنی دعاؤں کے بے اثر ہونے کا یقین ہو چلا تھا، شاید اسکی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اپنے خواب کی تعبیر جسے اُس نے خود متشکل کیا تھا، صرف دور سے دیکھا کرے اور اگر اُسے چھوئے تو وہ برف کے مانند ٹھنڈی اور فولاد کیطرح سخت ہو۔

اُدھر دیوتا پریشان تھے کہ سنگتراش کی شبانہ روز دعاؤں کو شرف قبولیت بخشیں یا نہ، اسکی تمنا اس قدر معصوم تھی کہ آخر دیوتاؤں کو رحم آگیا، لیکن اُنہیں یاد تھا کہ اس سے بہت بہت پہلے ایسے ہی موقع پر ایک انسان کو جمالیاتی نفس کی تسکین کیلئے اُسکی دعا کا قبول کر لینا خود اُسکے لئے اور دیوتاؤں کے لئے کس قدر مصیبت کا موجب ہوا تھا، اس امر کے پیش نظر دیوتاؤں کے خداوند نے فیصلہ کیا کہ اسکی دعا منظور کرنے سے قبل مجسمے کی رائے لینا مناسب ہوگا، اگر مجسمہ جان ڈالی جانے پر رضامندی کا اظہار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، ایک دیوتا نے اسکے خلاف آواز اُٹھائی، اور کہا "ہمیں زیادہ ہوشمندی سے کام لینا چاہیئے اور اس تلخ تجربہ کو دُہرانا نہیں چاہیئے" مگر اب فیصلہ ہو چکا تھا۔

اگلی صبح جب سنگتراش اپنے عجز و نیاز کے پھول چڑھانے کے بعد مجسمے کے پاؤں میں بیخود پڑا ہوا تھا، دیوتا چھت کے روشندان سے کمرے میں داخل ہوئے اور مجسمے کا جس نے سنگتراش کے دل میں ایک طوفان جذبات برپا کر رکھا تھا، بغور معائنہ کیا، انکی رائے میں وہ صنعت کا کوئی نادر نمونہ نہیں تھا لیکن دیوتاؤں کے خداوند نے کہا "ہمیں جلد بازی سے احتراز لازم ہے، ہم اس چیز کو ہمیں انسانوں کی نظر سے دیکھنا چاہیئے، شاید زندگی اُسے کیا سے کیا بنا دے" اور اپنی انگلی سے اسکی آنکھوں کو چھوا، آنکھوں میں روشنی آگئی، اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی چپکلی پتھر کی دیوار پر شکار کی تاک میں بیٹھی جھانک رہی ہے، اُسی دیوتا نے جو شروع سے اس بات کے خلاف تھا پھر کہا "ہمیں اب بھی اس حرکت سے باز رہنا چاہیئے، اگر میں غلطی نہیں کرتا، تو اس عورت میں حیوانیت غالب ہے، اسکا مزاج آسمانوں کی ملکہ جونو کا سا ہے..........

اب ہم زمین پر ہیں، شاید یہاں تو ہماری گفتگو پر کوئی پابندی نہیں ہے" لیکن دیوتاؤں کے خداوند نے اسکی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسکے کانوں اور ہونٹوں کو چھوا اور کہا "مجسمے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم ہی سب چیزوں کے پیدا کرنیوالے ہیں، اور سب ذی روحوں میں ہم ہی نے جان ڈالی ہے، اگرچہ تمہارا بنانیوالا یہ شخص جو بیہوش تمہارے پاؤں میں پڑا ہوا ہے، اسے تم سے بہت محبت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تم میں جان ڈال دیجائے، تاکہ اپنی زندگی کے چند لمحے تمہاری صحبت میں مسرت اور شادمانی سے گذار سکے کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں

زندگی بخش دیجاتی ہے"

مجسمے نے ایک نگاہ آئینوں پر ڈالی اور اپنے مختلف عکس دیکھے، پھر اُس نے پاس کھڑے ننگے دیوی دیوتاؤں کے حسین و جمیل مجسموں پر ایک نظر ڈالی اور آخر میں اپنے بنانیوالے کو جو سنگتراش کے مختلف اوزاروں کے درمیان زمین پر پڑا ہوا تھا دیکھتے ہوئے سوچ سوچ کر کہا: "ہاں خداوند اعظم مجھے زندگی دیجیئے"۔

دیوتاؤں کے خدا نے اپنے ہاتھ پھیلا کر مجسمے پر پھیرے اور مجھیں اپنے سانس سے زندگی اور حرارت پھونک دی۔ مجسمے میں سر سے پاؤں تک زندگی اور حرارت کی لہر دوڑ گئی، اب دیوتا سنگتراش کو جگانے کیلئے مڑا تاکہ وہ اُٹھ کر اپنی رُوح کی آرزو پوری ہوتے دیکھے لیکن بجلی کی سرعت سے وہ عورت اپنے چبوترے پر سے لپکی اور دیوتا کا ہاتھ پکڑ لیا "اسے ابھی مت جگا" دیوتاؤں کا خداوند پیچھے ہٹ گیا: "شاید یہ اپنے شکار کو عالم خواب میں ہی پکڑنا چاہتی ہے"۔

آن واحد میں اُس نے ایک چھینی اور ہتوڑا فرش پر بکھرے ہوئے اوزاروں میں سے اُٹھالیا اور سوتے ہوئے سنگتراش کی پیشانی پر چھینی رکھ کر ایک ایسی ضرب لگائی کہ چھینی دماغ سے گذر کر فرش میں کھب گئی، دیوتا حیرت زدہ کھڑے دیکھتے تھے۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ وہ اسکی ضرب سے جانبر نہیں ہوسکیگا۔ اس نے چھینی کھینچ کر نکال لی اور ایک قہقہہ لگا کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ دیوتاؤں کے خدا نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "او ناشکر گذار ملعون عورت تو نے اپنے بنانیوالے کو کیوں مار ڈالا"

"اس کا یہی انجام ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے میری ناک اس قدر لمبی۔ ٹانگیں اتنی چھوٹی اور ایک آنکھ دوسری سے بڑی کیوں بنائی تھی۔ تمہیں چاہیئے کہ اس سے بہتر سنگتراش پیدا کیا کرو اصل میں تمہارا بھی یہی حشر ہونا چاہیئے جو اس بدنصیب کا ہوا ہے"

اس گستاخانہ جواب پر دیوتاؤں کے خدا نے اُسے پھر چبوترے پر کھڑا کر کے پتھر میں تبدیل کر دیا لیکن اُسکی فتح ابدی صورت اختیار کر چکی تھی، وہ ایک ہاتھ میں ہتوڑا اور دوسرے میں چھینی لئے ہوئے فاتحانہ انداز سے کھڑی تھی۔

شام کو جب خادم کمرہ صاف کرنیکے لئے اندر داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ سنگتراش خون کے تالاب میں مردہ پڑا ہوا اور مجسمہ خون آلود چھینی اور ہتوڑا اپنے پھیلائے ہاتھوں میں لئے کھڑا مسکرا رہا ہے۔

(ہاوتھمین) چودھری محمد اقبال بی۔ اے (علیگ) لاہور

خمستان

ماہِ نو

زندگی کی کلی

میری بچی! کس نے تمہارے فراک کو رنگ کر، تمہارے
پیارے جسم کو اس سُرخ لباس میں لپیٹ دیا ہے؟
صبح کو تم صحن میں کھیلنے آئی ہو! دوڑتے میں تمہارے
پیر لغزش کر جاتے ہیں! .....
لیکن تمہارا فراک کس نے رنگا ہے؟ میری بچی!...
تم ہنستی کیوں ہو؟ اے زندگی کی ننھی کلی!
اماں دہلیز پر کھڑی تمہیں دیکھ کر مسکرا رہی ہیں!..
وہ تالی بجاتی ہیں، اُن کی چوڑیاں جھنجھنا اُٹھتی
ہیں.......
اور تم بانس کی چھڑی لئے ننھے گڈرے کی طرح
ناچنے لگتی ہو!
لیکن تم ہنستی کیوں ہو؟ اے زندگی کی کلی!........
اے بھکارن! اماں کے گلے میں ننھی ننھی باہیں ڈالے
کیا مانگ رہی ہے؟
اے حریص! کیا میں دُنیا کو پھل کی طرح آسمان کے
باغ سے توڑ کر تیری گلابی ہتھیلیوں پر رکھ دوں؟...

اے بھکارن! تو کیا مانگ رہی ہے؟...
ہوا، ناچتی ہوئی، تمہارے گھنگھروؤں کی جھنکار
لے جاتی ہے؟
آفتاب مُسکراتا ہوا تمہارا سنگھار دیکھتا ہے!
جب تم اماں کی گود میں سوئی ہوئی ہو، آسمان تمہاری
حفاظت کرتا ہے!
اور صبح دبے پاؤں تمہارے بستر کے قریب آ کر
تمہاری آنکھوں کو چومتی ہے!
ہوا اپنی مستانہ خوشی میں تمہارے گھنگھروؤں کی جھنکار
لے جاتی ہے۔
خوابوں کی پری، شام کے دھندلکے میں اُڑتی ہوتی
ہوئی تمہاری طرف آ رہی ہے!
وہ، جو اپنے ننھے ستاروں کو سُنایا کرتا ہے تمہاری
کھڑکی کے نیچے بانسری لئے کھڑا ہے!
اور خوابوں کی پری۔ شام کے دھندلے اُفق سے اُڑتی
ہوئی تمہاری طرف آ رہی ہے!

چمپا کا پھول

اگر میں چمپا کا پھول ہو جاؤں — کھیل سے — اور
ایک اونچی شاخ پر بیٹھا خوشی کے مارے ہوا میں جھوموں
اور نئی نئی پتیوں پر ناچوں، تو تم مجھے جان لوگی؟ اماں!...
تم مجھ کو پکارو گی: "ننھے! کہاں ہو؟" اور میں دل ہی دل

میں ہنسوں گا اور ایک دم چُپ چاپ رہوں گا!
میں دھیرے سے اپنی پنکھڑیاں کھول لوں گا اور تمہیں کام
کرتے دیکھوں گا!
نہا کر جب تم اپنے بھیگے بال کاندھے پر پھیلائے

چمپا کے درخت کے نیچے سے چبوترے کی طرف جاؤ گی جہاں تم
پوجا کرتی ہو، تو پھول کی مہک تم سے لپٹ جائیگی! لیکن تم نہ جانوگی
کہ یہ میری خوشبو ہے!۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جب تم کھڑکی پر بیٹھی رامائن
پڑھتی رہو گی اور چمپا کے درخت کا سایہ تمہارے بالوں پر اور
تمہاری گود میں پڑے گا۔ میں اپنا ننھا مُنا سا سایہ کتاب کے
صفحہ پر ڈالوں گا ــــ جہاں پر تم پڑھ رہی ہو گی!... لیکن کیا تم
سمجھ سکو گی کہ یہ سایہ تمہارے ننھے کا ہے؟....

شام کو جب تم چراغ لئے گئوشالہ کی طرف جاؤ گی
میں جلدی سے زمین پر گر پڑوں گا اور ــــ
پھر تمہارا ننھا بن جاؤں گا اور تمہیں قصّہ کہنے
کو کہوں گا!۔

تم دلارسے کہو گی: "شریر ننھے! کہاں تھا؟"
میں کہوں گا: "تمہیں نہیں بتاؤں گا، اماں!"

ننھے کی دُنیا

کاش ننھے کی دُنیا کا ایک پُرسکون گوشہ مجھے
مل سکتا!۔

میں جانتا ہوں کہ اُس میں ستارے ہیں جو بولتے
ہیں اور ایک عجیب آسمان جو اپنی بیوقوف بدلیوں اور قوسِ قزح کو
لئے ہوئے اُسے خوش کرنے کو اسکے نزدیک آجاتا ہے!....

وہ، جو بے زبان ہونے کا بہانہ کرتے ہیں اور ایسا
دکھاتے ہیں جیسے اُن میں حرکت نہیں، وہ بھی اس کی
کھڑکی کے پاس قصّہ کہنے کو آتے ہیں اور طشت میں کھلونے
لاتے ہیں!....

کاش میں اُس سڑک پر چل سکتا جو ننھے کے خیال
میں ہے! جو لامحدود دُنیاؤں میں جاتی ہے۔
اُن دُنیاؤں میں جہاں پیغامبر بغیر کسی مقصد کے
پیغام لے جاتے ہیں، اُن بادشاہوں کی سلطنت میں جنہیں
تواریخ سے کوئی واسطہ نہیں!.... جہاں "عقل" نے "قوانین"
کی تنگیاں بنا کر اُڑتی ہے۔ اور "حقیقت" "واقعات" کو زنجیروں
سے آزاد کر دیتی ہے!....

(رابندر ناتھ) ــــ تمنائی

مزارِ محبت

سرو کے سایہ میں میں نے ایک ننھی سی قبر کھودی۔
جسکو ایک ننھی سی پری کی قبر کہا جا سکتا ہے ــــ
اور تمہارے محبت کے کل عہد و پیمان جو کہ اب تک
تمہاری جھوٹی محبت نے کئے تھے اس میں دفن کر دیئے۔
ــــ مٹی کے نیچے چھپا دیئے۔
اس کے اوپر ایک پتھر رکھ دیا ــــ اور ایک
مُرجھاتے ہوئے گلاب کا ہار پتھر سے لپیٹ دیا ــــ
ــــ محبت کے اس مزار کے اوپر!
تمہاری محبت کی طرح بے بُنیاد یہ پھول شام کو آفتاب
غروب ہونے بھی نہ پایا تھا کہ پژمردہ ہو گئے۔
مگر سالہا سال گذر جائیں گے اور سرو کا یہ درخت
ــــ میرے غم کی طرح ناقابلِ تغیر ــــ سرسبز و شاداب
کھڑا رہے گا۔

(پیکوک) ع۔ نظیر

لینن کا خط

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

عزیز اے۔ یم

عوام کو اس حقیقت کا علم کسی طرح نہ ہو کہ مجھے جلا وطن کر دیا گیا ہے۔ ورنہ وہ مایوس ہو کر ہمت ہار دیں گے۔ اور لازمی طور پر سرمایہ دار جماعت کو کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ تم مجھے سائبیریا میں مت سمجھو، یہاں میرا صرف جسم ہے۔ اور میری رُوح کی تخیلی معاونت کے لئے ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے۔ "انگارہ" (لینن کا اخبار) کی آئندہ اشاعت میں میری علالت کا اعلان کر دو تاکہ لوگوں کو کسی قسم کا شُبہ نہ ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ حسبِ دستور ایڈیٹوریل کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیج دوں۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو تم خود میرے نام سے شائع کر دیا کرنا۔ یہاں بہت پابندیاں عائد ہیں۔ اور نہایت سختی سے نگہداشت کی جاتی ہے اسی لئے میں یہ خط پیاز کے عرق سے لکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سادہ کاغذ دیکھ کر تم ضرور اسے آگ پر رکھو گے تاکہ غیر مرئی سیاہی نمودار ہو جائے۔ تم بھی خط اسی طرح لکھنا۔ "انگارہ" کی اشاعت میں غیر معمولی اضافہ کر دو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا ایک پرچہ بلاقیمت ہر دیہاتی کے ہاتھ میں پہونچ جایا کرے۔ شہریوں سے زیادہ ہمیں ان پر اثر ڈالنا ضروری ہے۔ کیونکہ انکی اکثریت ہے۔ اور قانون سے ناواقف ہونے کے باعث خوف کا مادّہ ان میں نہیں ہوتا۔ ممکن ہو سکے تو اخبار کو فوج کے سپاہیوں میں بھی تقسیم کرا دیا کرنا۔ اگر وہ ہماری مٹھی میں ہو جائیں تو بیڑا پار ہے۔ میں ارادتاً سائبیریا میں چند ماہ رہوں گا۔ کیونکہ خود ہی عارضی سکونت کا متمنی تھا۔ یہاں کی آب و ہوا میری صحت کے لئے سود مند ثابت ہوگی۔ اس کے بعد کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر پیرس پہونچ جاؤں گا کیونکہ چند فرانسیسی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کرنا اشد ضروری ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔ لیکن ایک نئے روپ میں۔ لمبی ڈاڑھی ہوگی اور لباس بالکل کاشتکاروں جیسا۔ تم مجھے پہچان نہیں سکو گے۔ میرا نام بھی دوسرا ہوگا۔

کروپسکائیہ (لینن کی بیوی) بہت قوی دل اور کبھی نہ گھبرانے والی عورت ہے۔ مگر پھر بھی عورت ہے اس لئے اس کا خیال رکھنا۔ وہ پریشان اور رنجیدہ نہ ہونے پائے۔ وہ حقیقی معنوں میں میری بہترین شریکِ حیات ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کی زندگی کو کسی قسم کا نقصان پہونچ گیا تو ارضِ روس میں کوئی دوسری خاتون اس کا نعم البدل نہیں بن سکے گی۔ اور معاشرتی زندگی میں تم میرے لبوں پر کبھی تبسم کی جھلک بھی نہیں دیکھو گے۔ اچھا خدا حافظ۔

لینن

ایک ادبی صحیفے کا معیارِ تنقید!

حسنزہ کے قلم سے

محترمی شاہد صاحب! تسلیم

سالنامہ نیرنگِ خیال کے حصۂ نظم پر کسی "ناقدِ ادب" کی تنقید اور کسی "پنجابی لندھور" کیطرف سے اسکا جواب میری نگاہ سے گذرا۔ دونوں چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے بطورِ مختصر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور آپکے پاس بغرضِ اشاعت روانہ کر رہا ہوں۔ تازہ نمبر میں شریکِ اشاعت فرماکر ممنون فرمائیے۔ چونکہ میں "ساقی" کو ایک بلند پایہ اور ادبِ اردو کا کامیاب ترین رسالہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے میری عین آرزو ہے کہ میری رائے اُسی میں شائع ہو۔

خاکسار

"حسنزہ"

آج سے دو برس پہلے "نیرنگِ خیال" پنجاب کے معتدد اور کامیاب رسائل میں شمار کیا جاتا تھا لیکن بہت جلد آسمانِ ادب کا یہ آفتاب ستارۂ صبح ثابت ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ میری اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ "نیرنگِ خیال" اب شائع نہیں ہوتا۔ شائع ضرور ہوتا ہے مگر اب اس میں وہ درخشانیاں نہیں پائی جاتیں جو ادبِ اُردو کی ترقی و ترویج کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکی موجودہ زندگی کا انحصار ہی گذشتہ شہرت اور قبولیت پر ہے ورنہ یہ کبھی کا بند ہو چکا ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ ایک عرصے سے میں اس کا مطالعہ پہلے شوق و انہماک سے نہیں کرتا۔

ایکروز ریلوے بک اسٹال پر میں نئے رسائل وجرائد دیکھ رہا تھا کہ اُن میں "نیرنگِ خیال" کا اگست نمبر بھی نظر آیا۔ میری عادت ہے کہ سب سے پہلے فہرستِ مضامین دیکھتا ہوں۔ "شذرات" کے فوراً بعد جس چیز پر میری نگاہ جم گئی وہ عنوان "عہدِ حاضر کے شعرا کی خامیاں" تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غیر ملکی زبانوں اور خصوصاً انگریزی نے ایک بڑی حد تک ترقی کی ہے تو وہ صرف بہترین نقادوں کی بدولت، اردو میں ابھی تک تنقید کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا گیا۔ ہاں تقلیدِ مغرب میں چند صاحب فن حضرات ایسے بھی نکل آئے ہیں جنہوں نے اس شدید ضرورت کو محسوس کر کے عملی طور پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ چیز باعثِ مسرت تو ضرور ہے مگر ایک بات سے مجھے بہت رنج ہوتا ہے کہ ہمارے نقاد صرف تنقیص کر نیکو تنقید سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات تو اپنی تحریروں میں ذاتیات کو بھی روا رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ دونوں چیزیں بھی دور ہو جائینگی اور پھر ادبِ اردو کی ترقی کا راستہ قطعی صاف اور ہموار ہو جائیگا۔

"نیرنگِ خیال" میں عہدِ حاضر کے شعرا کی خامیوں کے مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کسی "ناقدِ ادب" نے "نیرنگِ خیال" کے سالنامے کی نظموں کی کمزوریوں کیطرف حکیم صاحب کو متوجہ کیا ہے۔ اپنی جگہ یہ بہت اچھی چیز تھی اور ایک اُولوالعزمانہ اقدام تھا اور میرے خیال میں اس وقت "نیرنگِ خیال" کیلئے زیادہ سے زیادہ ضروری بھی ہے، ضروری میں نے اس لئے کہا کہ ناقدِ ادب کی تنقید کے مطالعہ سے قبل میری ذاتی رائے بھی یہی تھی کہ ایک زمانے سے "نیرنگِ خیال" کا حصۂ نظم بالکل غیر معیاری اور

پست ہوتا جارہا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں منیجر صاحب کے پرجوش نوٹ نے مجھے مجبور کردیا کہ میں "نیرنگ خیال" کا تبصرہ ... معلوم کروں کہ وہ "ناقد ادب" کے معقول اعتراضات کا دنداں شکن جواب کیا اور کیونکر دیتے ہیں۔

یہاں میں یہ کہدینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نہ میں "ناقد ادب" کو جانتا ہوں نہ "لندھور" سے واقف ہوں بلکہ تنقید کو اُردو کا جزو اعظم جانتے ہوئے چاہتا ہوں کہ اس کا استعمال صحیح معنوں میں کیا جائے اور ہماری رائے کے اظہار سے یہی میرا مقصد ہے۔

کسی ادبی تنقید کا جواب بھی ادبی حیثیت ہی سے دیا جاسکتا ہے لیکن "لندھور" آخر لندھور ہے اُسکو ادب سے کیا تعلق۔ ... کس درجہ رنج دہ ہے کہ جواب میں اول سے لیکر آخر تک "لندھور" نے وہ تمام گالیاں "ناقد ادب" سے منسوب کردی ہیں جو اُس نے لاہور کے شرابخانوں میں سنیں اور اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں۔ کوئی صاحب عقل اس کو دنداں شکن جواب نہیں کہہ سکتا حکیم صاحب نے نہایت سنجیدگی سے اس مضمون کو شائع کرکے ثابت کردیا ہے کہ وہ ادبی زوال کی آخری گہرائی میں پہنچ چکے ہیں۔ ضرورت تھی کہ سنجیدہ اعتراضات کا جواب بھی نہایت سنجیدگی سے دیا جاتا لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ "لندھور" نے کوشش کی ہے کہ "نیرنگ خیال" پڑھنے والوں کو بغیر دلائل و براہین کے یقین دلادے کہ "ناقد ادب" کی تنقید کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ درست ہے تو حکیم صاحب نے "ناقد ادب" کے مضمون کو قابل اشاعت کیوں سمجھا؟ صرف اس لئے کہ اس طریقے سے وہ اپنے سادہ لوح ناظرین کو ناجائز طور پر مرعوب کرسکیں لیکن ادبی اور تجارتی دونوں حیثیتوں سے حکیم صاحب کا یہ اقدام نہایت غلط ہے اور اسکا اثر یقیناً "نیرنگ خیال" کی اشاعت پر اچھا نہیں پڑ...

اب رہے "ناقد ادب" کے اعتراضات اور ان کے غیر مکمل جوابات تو اُس کے متعلق اس وقت مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے کیونکہ نہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ خامیوں کا اظہار کرکے خوبیوں کو چھپا لیا جائے اور نہ اسکا کہ جواب نہ سوجھنے پر گالیوں اور تہذیب... الفاظ کی آڑ لے لیکر پنجاب کی خدمت ادب پر ضرب کاری لگاکر اسے بدنام کیا جائے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ بعض جگہ ناقد... نے اپنی تنقید میں تجاوز بیجا سے کام لیا ہے اور شاید یہ ضرورت اُسے اس لئے محسوس ہوئی کہ حکیم صاحب پر انکی معمولی سے معمولی غلطی واضح ہوجائے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ "لندھور" نے نہایت غلط راستہ اختیار کرکے "ناقد ادب" کی ان کمزوریوں کو تو نظر انداز کردیا ہے اور ایسی باتوں کو صحیح ثابت کرنیکی ناکام کوشش کی ہے جن کو ایک معمولی طالب علم بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ "ناقد ادب" اور "لندھور" کی تنقیدوں کا تفصیل کیساتھ ذکر کروں لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی اور "لندھور" ادب اردو کے ... پر تنقید کی چھری اسی طریقے سے چلاتا رہا تو یقیناً مجھے ان باتوں کو طشت از بام کرنا پڑیگا جنکو میں اس وقت بصیغۂ راز رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ لکھنے میں بھی باک نہیں کہ "ناقد ادب" نے جس سنجیدگی اور تہذیب کیساتھ اپنی تنقید کو مکمل کیا ہے وہ اُسکے مہذب اور ناقد ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور "لندھور" نے جس پھکڑ بازی اور ذاتیات کو اپنی تنقید میں روا رکھا ہے وہ ان کے ارذل، غیر سنجیدہ، بے علم اور دُنیائے ادب سے بیگانہ ہونے کی کامیاب ترین مثال ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ میری طرح ملک کے دوسرے ادیب و شعراء بھی جنہوں نے "ناقد ادب" کی تنقید اور "لندھور" کے جواب کو پڑھا ہو اپنی گرامی رائے کسی اخبار یا رسالے کے ذریعے ضرور پیش کریں۔ تاکہ حق و باطل کا خاطر خواہ فیصلہ ہوجائے۔

کارامروز

ہندوستان کے موجودہ دور میں ادب اور سیاست کو جو امتیاز حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، شاعر اور سیاست انی ہماری سوسائٹی کے دو علم بردار رکن ہیں، ایک طرف اقبال اور ٹیگور اپنے نغموں سے ہندوستان کو سکون روح کا پیغام دیتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے کان مہاتما گاندھی کے ارشادات کی طرف لگے رہتے ہیں، اس حالت میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ہندوستان کی نجات سیاست میں ہے یا ادب میں، اس نکتے پر غور کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیاست اور ادب دونوں کی اہمیت کا تجزیہ کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور ادب دونوں ہماری ضروریات کی یکجائی کے سے وجود میں آئے ہیں اور یہ دونوں موضوعات زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس لئے یہ بھی ہوتا ہے کہ اخبارات میں جہاں ٹیگور کے روحانی نغمات گونجتے ہیں وہاں موجودہ سیاست پر ٹیگور کا تبصرہ بھی شریک ہوتا ہے، مہاتما گاندھی بھی اپنے لیکچروں میں اکثر انسانی جذبات سے کھیلتے ہیں، معلوم ہوا کہ شاعری اور سیاست آپس میں مشترک ہیں، اور ایک کی کامیابی کا انحصار دوسرے پر ہے،

اس مختصر تمہید کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اگر کار امروز (مجموعہ نظمیات مولانا سیماب اکبرآبادی)، پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کار امروز ایک معیاری ادب کا حامل ہے وہاں اس میں سیاسی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں جہاں شاعر چراغ ساحل اور برق سرہ گذار کے مناظر سے اثر گیر ہوتا ہے وہاں بساط سیاست، آزادی اور کانگریس بھی اس کی نگاہ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں، اگر ایک طرف صبح صادق، شاعر کی تربت اور فطرت کی جوگن وغیرہ شاعر کے جذبات کو ابھارتی ہیں تو دوسری طرف وہ سرمایہ داری کی رعونت کو انسانیت کے زوال سے تعبیر کرتا ہے جہاں ایک شاعر کا قلم حسب ذیل کا فرمنظر کی نقاشی کر سکتا ہے۔

عروج شب ماہ کا ہے ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروس شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے

چمک رہا ہے اجلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں فضا کی خنکی بتا رہی ہے

فلک بھی روشن زمیں بھی روشن مکاں بھی روشن مکیں بھی روشن
جہاں ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

سکوت دنیا پہ حکمراں ہے نہ داستاں گو نہ داستاں ہے
عجیب منظر عجب سماں ہے نگاہ اترائی جا رہی ہے

وہاں وہ مزدور کی حسرت ناک زندگی سے بھی اسی طرح متاثر ہوتا ہے:

گرد چہرے پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی

پیٹھ پر ناقابل برداشت ایک بار گراں
ضعف سے لرزی ہوئی ساری بدن کی جھریاں

ہڈیوں میں تیرے چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح تخنے کی صدا

اور سرمایہ دار سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں
قصۂ مزدور سننا بھی ہے تجھ کو ناگوارا

تو کہ سرمائے کی مستی میں ہے سرخوش صبح شام
تجھ کو کیا معلوم رفتار مدار روزگار

اور پیش گوئی کرتا ہے۔

دیکھ وہ اک روشنی پھیلی افق سے ہوشیار — اب تو غافل امتیاز نور و ظلمت چاہیے
نالۂ مظلوم بہر انتقام آنے کو ہے — اشتراکیت کا اک طوفان عام آنے کو ہے

کارامروز کے سرسری مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ شاعرانہ ذہنیت ہماری زندگی کی دشواریوں کا حل دریافت کرنے میں دوسرے موضوعات سے زیادہ کامیاب ہے اور اگر ہم اپنی اور اپنے ملک کی اصلاح چاہتے ہیں تو ہمکو اپنی سوسائٹی کی باگ ایک مرتبہ شعراء کے ہاتھ میں دیدینی چاہیے جو نہ صرف ہماری شوشل مشکلات کو دور کرنے میں معاون ہونگے بلکہ روحانی طور پر بھی ہمیں سکون اور اطمینان دے سکیں گے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ گذشتہ چوتھائی صدی میں شعراء نے سیاست دانوں سے زیادہ ہمارے مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، ادب اردو میں بانگ درا کی اشاعت کے بعد کارامروز کی اشاعت نے ہمارے جذبات میں پھر ایک مرتبہ ہیجان پیدا کردیا ہے اور ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر ایسی ہی دو چار کتابیں اور شائع ہوجائیں تو ہم اپنی منزل تک بہت جلد اور بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے جو اثرات ایک مستقل تصنیف سے مرتب ہوتے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے بہم نہیں پہنچائے جاسکتے۔ ایک لیکچر اور ایک تقریر کا اثر جلسہ کی فضا تک ہی محدود ہوکر رہجاتا ہے لیکن ایک اچھی تصنیف صدیوں تک سوسائٹی کی تبدریج اصلاح کرتی رہتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو کارامروز کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کردیتی ہے،

مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات نے جس طرح ہندوستان کی فضا کو آجکل مسموم کر رکھا ہے اُسکے مضر اثرات اپنا اثر دکھا رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم کی صف میں ہم اب تک کوئی خاص درجہ حاصل نہیں کرسکے۔ مقام شکر ہے کہ کارامروز کا مصنف ان مسموم جذبات سے اثرانداز نہیں ہوا، ورنہ یہ تصنیف بھی کسی خاص فرقہ سے متعلق ہوکر رہجاتی، آج کل ہندوستان میں جو متحدہ قومیت کی تحریک ہو رہی ہے، فرقہ وارانہ اہمیت نے اسکو ایک حد تک کمزور کردیا ہے اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہم حقیقی قومی تحریک کے متعلق کچھ سنتے ہیں، کارامروز اس تحریک کی اعانت کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اور میرا یقین ہے کہ آج سے پچاس سال بعد ہندوستان میں جو متحدہ قومیت مرتب ہوگا اسکی بنیادمیں کارامروز ایک بہت بڑا اور مستحکم ستون ہوگا۔

صحیح قومیت نہ مسلمانوں سے متعلق ہے نہ ہندوؤں سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک کا نام ہے، اور یہی وہ درس ہے جو کارامروز لپکار لپکار کر دے رہا ہے، وہ ہندو ہندوستان یا مسلمان ہندوستان سے مخاطب نہیں ہوتا بلکہ نوجوان ہندوستان سے جسمیں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے نوجوان شامل ہیں اور جن پر آئندہ قومیت کی تعمیر کا انحصار ہے۔ اسکا اعلان ہے کہ۔

قدیم دور حدیث چمن تمام ہوا — طویل قصۂ سرو و سمن تمام ہوا
سجاؤ ایک نئی بزم شام سے پہلے — سحر ہوئی اثر انجمن تمام ہوا
جو میکدے میں تھا ہنگامہ آفریں کل تک — وہ آج شور سبو زور شکن تمام ہوا
نئے سبو نئے پیمانے بار یاب کرو — تمام پایۂ یاران فن تمام ہوا
حریم نو سے مغنی نو کو دو آواز — شکستہ نغمۂ ساز کہن تمام ہوا

ابھی ہے جوش پہ گرمیٔ محفلِ منصور — کہاں فسانۂ دار و رسن تمام ہوا
نشاطِ کار تو باقی ہے ہم نہیں نہ سہی — غلط خیال ہے کارِ وطن تمام ہوا

حیات تازہ ہے انجام ہر حیات کے بعد
طلوعِ صبحِ دگر لازمی ہے رات کے بعد

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہندو یا مسلمان اپنی اپنی روایات کو خیرباد کہہ دیں، کارِ امروز دونوں قوموں کو ان کی قدیم تاریخ یاد دلاتا ہے، اور اسکی تہ میں مقصد یہ ہے کہ دونوں قومیں اپنی اپنی روایات سے متاثر ہو کر متحدہ قومیت کی تعمیر میں حصہ گیر ہوں، کارِ امروز میں جہاں آنحضرت صلعم کی قدوسیت اور انکی متبرک زندگی پر اظہارِ خیال ہے وہاں سری کرشن بھی اپنے سریلے نغموں سے شاعر کے جذبات پر اثر کرتا ہے۔

جہاں کی نظر میں منصب پیغمبری یہ ہے — حریم پاک تیرا اک بلند ایوان حقیقت کا
جہاں جبریل بھی ہے مختصر سا ایک پروانہ
فروغ آفرینش قوتوں پر تیری قائم ہے — کہیں تو شمع محفل ہو کہیں تو نور کاشانہ
مجھے معلوم ہے رازِ غلامی اہلِ عالم کا — ہے آدابِ سیاست سے تیری ذہن ان کا بیگانہ
اگر پیرو تیرا پھر عالم ایجاد ہو جائے
تو انسان کیا یہ ساری کائنات آزاد ہو جائے

وہاں وہ برج کے سانورے کے وجود کو بھی نشاطِ عقیدت سمجھتا ہے۔

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لے کر — سرور آنکھوں میں نظروں میں زندگی لیکر
گذشتہ صبح محبت کو ڈھونڈنے نکلا — اک آفتاب محبت کی روشنی لے کر
خودی کے ہوش اڑانے بصد نیاز آیا — نئے پیالوں میں صہبائے بے خودی لیکر
فضائے دہر میں گاتا پھرا وہ پریت کے گیت — نشاط خیز و سکوں ریز بانسری لے کر
رہا جمال سے انوار یار مدت تک — جبال و دشت میں فطرت کی چاندنی لیکر
جہاں قلب سراپا گداز بن ہی گیا
ہر ایک ذرہ محبت کا ساز بن ہی گیا

ان تمام باتوں کے علاوہ انسان و انسانیت، حقائق و معارف، محبت، حسن اور عشق اپنی پوری رعنائیت کے ساتھ کارِ امروز میں موجود ہیں جن سے شاعر کی اکملیت پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک شاعر نہ صرف قومیات کی تعلیم دے سکتا ہے، بلکہ دنیا کی دوسری چیزیں بھی اسکی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتیں شاعر ایک مکمل انسان ہے اور کارِ امروز انسانیت پر ایک مکمل تبصرہ اس لئے ہم اپنی زندگی کے کسی شعبے میں کارِ امروز کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

(محمد صادق ضیا)

نقد و تبصرہ

مہدی - میاں اسلم کی سب سے موٹی، لمبی اور تازہ ترین کتاب (وہمٹ پرونٹ کا ترجمہ) "مہدی" کے نام سے ہاشمی لاہور نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ مہدی ایک طویل ناول ہے جس کو پانچ حصوں یعنی ہلال و صلیب، ظلم طلوعِ صبح، فردوسِ امید (سنسر شدہ) اور نور سحر میں منقسم کیا گیا ہے۔ تمام داستان جنگ و جدال کی معرکہ آرائیوں اور حسن و عشـ کے کرشموں سے پُر ہے۔ پانچ تصاویر بھی اس میں شامل ہیں جو اگرچہ مطبوعہ ہیں مگر برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ کتاب کی ظاہری شان و شو بہت زیادہ ہے اور ٹائیٹل پیج، جو غالباً نیرنگِ خیال کے عید نمبر کی تصویر ہے، نہایت خوشنما ہے۔

کتاب کے شروع میں، مہدی کی طباعت سے پہلے جو جو واقعات رونما ہوئے اُن کے ذکر کے علاوہ مصنف نے لکھنو وال سے شکوہ شکایت کی ہے اور "لکھنوی اُردو" کو بے جا طور پر کھلم کھلا "پنجابی اُردو" سے گرانے کی کوشش کی ہے۔

زبان کا مسئلہ ٹیڑھی کھیر ہے اور سمجھدار پڑھے لکھے حضرات، خواہ وہ ملک کے کسی حصے سے تعلق رکھتے ہوں، اُرد میں دلی اور لکھنو والوں کو افضل و اعلیٰ سمجھ کر ان کی پیروی کرتے ہیں مگر اسلم صاحب نے اپنی خوش مذاقی سے لکھنو والوں کو دبا ہے، اسکے علاوہ نے پنجاب کی خدمات کو بے موقع سراہ کر وسیع النظری کا ثبوت نہیں دیا، اس میں شک نہیں کہ پنجاب نے زبان اُردو احیا کے لئے کافی خدمت کی مگر اپنے منہ میاں مٹھو بننا عام طور سے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اسلم صاحب بہت اچھے لکھنے وا ہیں اس لئے انہیں صحیح اُردو کی مخالفت زیب نہیں دیتی۔

مہدی بڑے سائز کے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ قیمت للعہ ساقی بک ڈپو سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ "ص"

دردِ زندگی - کتابت طباعت، کاغذ وغیرہ اچھا۔ قیمت علعہ
حال ہی میں جناب احسان بن دانش کاندھلوی کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا مجموعہ قریشان بلڈپو مزنگ لا سے شائع ہوا ہے، جس میں انتساب، معذرت، مصنف کے حالاتِ زندگی اور غلط نامہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

جناب احسان ملک کے اُن نوجوان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے قلیل عرصے میں خاصی شہرت حاصل کرلی ہے۔ اور چونکہ بچپ سے اُن کا میلان شاعری کی طرف تھا اس لئے متواتر مشق نے اُنکو ایک اچھا شاعر بنا دیا۔ اس مجموعے میں بہت سی غزلیں اور نظمیں م کسی کی یاد، مغنیہ، ہولی کی ساحرہ، فقدان معاش وغیرہ خاصی اچھی ہیں اور بعض یاد کر لینے کے قابل۔

احسان صاحب نے مقدمے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسکے بعض حصے سے ہم کو اتفاق نہیں، وہ لکھتے ہیں "...... کی پہلی اشاعت پر مقدمہ ادبی رشوت سے کم نہیں ......" اسکے جواب میں ہم پروفیسر مرزا محمد سعید کا صرف ایک فقرہ لکھنے پر اکتفا کر "مقدمہ نویسی کے جواز کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ مقدمہ کسی کتاب کے مضامین کو سمجھنے میں مدد دے یا اُسکے مصنف اور نا درمیان تعارف پیدا کرنے کا وسیلہ بن جائے۔"

اسکے علاوہ یہ بات معلوم کر کے ہمیں بے حد حیرت ہوئی کہ آپ اپنی ادبی کاوشوں کو کمال لاپروائی سے ایک تکیے میں ٹھ

...اسد جو کچھ شائع ہوتا ہے وہ عزیزوں کی وجہ سے ہے ـــــ واللہ اعلم!

"ص"

قانونِ مباشرت

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ۔ ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

علم نوعی یا قانونِ تعلقاتِ جنسی ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ ہر ملک ہر زبان میں اس پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور چونکہ اس نوع کے لٹریچر کی مارکیٹ میں کافی مانگ ہے اس لئے اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں تیار ہو گئی ہیں۔ مگر ان میں زیادہ تر فحش، مخرب اخلاق، غیر ذمہ دارانہ اور لغو ہیں۔ ایسی کتابوں کا وجود ملک اور زبان کے ذوق پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس امر سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ علم مباشرت ایک نہایت کارآمد اور نہایت وسیع علم ہے۔ صحت کو حدِ اعتدال پر برقرار اور شباب و کیفیاتِ شباب کو ایک عرصے تک قائم رکھنے اور تندرست اولاد پیدا کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اسی اہم مقصد کو مدِ نظر رکھ کر سیرا لطبا ڈاکٹر نفضل مبین صاحب دہلوی نے ایک کتاب "قانونِ مباشرت" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ جسے حکیم صاحب نے طبی نقطۂ نگاہ سے تالیف کیا ہے اور بازاری و اشتہاری باتوں اور ادویات سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو نہایت دلچسپ اور کارآمد بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے چنانچہ حکیم صاحب نے (GRAYS ANATOMY) میں سے چند مشہور تصاویر منتخب کر کے اپنی کتاب میں شامل کر دی ہیں۔ جن سے اس موضوع کے حل کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں جو نسخے درج ہیں اُن کے صحیح یا غلط ہونے کا حال تو ایک حکیم کو ہی معلوم ہو سکتا ہے یا تجربہ کی کسوٹی پر اُن کا امتحان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر قابلِ افسوس ہے کہ حکیم صاحب نے بغیر ذاتی تجربے کے (جس کا خود انہوں نے اعتراف کیا ہے) چند بازاری اور مخرب الاخلاق نسخے بھی شامل کر لئے ہیں۔ اگر حکیم صاحب پوری احتیاط سے کام لیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہ کتاب بحیثیت مجموعی لائق مطالعہ ہے صحت اور اصول وظیفۂ ازدواج کے متلاشی نوجوان اس سے بہت کچھ مفید مطلب باتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب چار روپے میں دفترِ معارفِ طبیہ رود گراں دہلی سے مل سکتی ہے۔ یا ساقی بک ڈپو سے طلب کی جا سکتی ہے۔

"م"

ترغیباتِ جنسی

حضرت نیاز فتحپوری ان جدت پسند لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ ادب میں ایک نئی چیز پیش کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ جنسیات کے موضوع پر زبانِ اردو میں اب تک اس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں کہ انکا شمار مشکل ہے لیکن جہاں تک فائدہ مند ہونے کا تعلق ہے اُن میں سے ایک بھی کسی لائق نہیں۔ کیونکہ اُنکے مطالعہ سے اخلاق پر بالکل اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ اس میں تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے فحاشی کے ہر پہلو پر نہایت مبسوط طریقہ پر بحث کی گئی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے زمانۂ حال تک مختلف ممالک و اقوام میں مذہبی اور معاشرتی رسوم کے مطابق میلانِ جنسی کے جن طریقوں کو جائز سمجھا گیا اُن کا مفصل ذکر ہے۔ اسکے مطالعہ سے ایسی عجیب و غریب باتیں معلوم ہوتی ہیں جو عہدِ حاضرہ میں انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج جن افعال کو مذموم سمجھا جاتا ہے وہی ایک زمانے میں فرائضِ مذہبی میں شامل تھے۔ اور انکا ارتکاب عبادتگاہوں میں ہوتا تھا۔ کون باور کر سکتا ہے کہ عصمت فروشی بھی ایک زمانے میں مقدس سمجھی گئی ہے بعض سرسری مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسکو مرتب کرنے میں موصوف نے کسقدر کاوش کی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے پسند نہ کریں کیونکہ اس میں نہ کوکشاستروں کی طرح مخرب الاخلاق تصاویر ہیں اور نہ بہشتی زیور کی طرح لذتِ مباشرت کیلئے ادویات کے نسخے اور تعویذ۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسی رطب و یابس سے معرا ہونے کے باعث یہ کتاب اور بھی زیادہ لائق قدر ہے ـــــ قیمت مجلد ۳ غیر مجلد ۲ ۔ نگار بک ایجنسی۔ لکھنؤ

"ف"

قرآن شریف

دہلی کی آسان اور شیریں زبان میں مترجم

قطع خورد لمبائی ۶ انچ چوڑائی ۴½ انچ۔ یہ قرآن شریف [illegible] مقبول عام مولوی علامہ حافظ نذیر احمد صاحب کا مترجم اور محشی ہے۔ [illegible] محصول ڈاک ۱۲ کل ۱۲ یہ رعایت نہ تو اجتک [illegible]

بڑا قرآن شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب [illegible] ۲۹×۲۲ در صفحہ ضخامت [illegible] سطور کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین [illegible] الفاظ اردو ہدیہ مجلد بارہ روپے ۱۲ محصولڈاک [illegible] کل [illegible] قیمت چوتھائی رقم پیشگی بھیجنی لازمی ہے۔

جامع المصاحف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب [illegible] کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو تقطیع ۲۲×۲۹-۸ ہدیہ مجلد [illegible] چھ روپے چار آنہ ۶ غیر مجلد چھ سات روپے [illegible] محصولڈاک [illegible]

غرائب القرآن

ترجمہ حاشیہ پر حل لغات عربی کا [illegible] صفحات ۱۱۲۸ تقطیع ۲۲×۲۹-۸ ہدیہ مجلد پانچ روپے [illegible] بغیر مجلد [illegible] محصولڈاک [illegible]

معجز نما متوسط قرآن شریف بد ترجمہ زیر متن

اول ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب [illegible] ترجمہ دوم مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حاشیہ پر کامل تفسیر اور [illegible] تمام پیغمبروں کی سوانحعمری و عملیات وغیرہ درج ہیں کاغذ اول نمبر ولایتی گلیز چکنا [illegible] ہدیہ مجلد چھ روپے [illegible] دوم معمولی کاغذ تین روپے آٹھ آنہ [illegible] محصولڈاک ایک روپیہ تین آنہ [illegible]

کلام مجید مترجم

مرزا حیرت۔ بہت بڑا سائز ہدیہ بارہ روپے [illegible] محصولڈاک [illegible] کل سترہ روپیہ [illegible]

قرآن شریف کلاں مع تفسیر حسینی اردو

قدیم طرز۔ پاکیزہ لکھائی چھپائی ہدیہ مجلد آٹھ روپیہ [illegible] محصولڈاک ایک روپیہ چھ آنہ [illegible]

قرآن شریف بد ترجمہ کلاں

منشی ممتاز علی صاحب [illegible] کی مرحوم [illegible] منشی محمد عبدالغنی صاحب کی جگرکاری اور دیدہ ریزی کی آخری یادگار رشیع مصطفائی کا مطبوعہ ہے۔ اس میں دو ترجمہ نہایت مستند عالم باعمل کے لکھے ہوئے ہیں بین السطور میں ترجمہ اردو تحت الفظ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب [illegible] ترجمہ فارسی برحاشیہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نیز حاشیہ پر مولانا [illegible] عبدالقادر صاحب کے فوائد موضح القرآن درج ہیں تقطیع ۲۲×۲۹-۴ حنا شدہ ہدیہ مجلد پانچ روپے [illegible]

معجز نما حمائل مترجم

زیر متن ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب [illegible] پر کامل تفسیر شروع میں سوانحعمری وغیرہ کاغذ اول نمبر ولایتی حنا شدہ ہدیہ مجلد چار روپے [illegible] قسم دوم دیسی کاغذ [illegible] محصولڈاک [illegible]

حمائل شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو سفر و حضر میں ساتھ رکھنے کے قابل۔ ہدیہ مجلد چار روپیہ آٹھ آنہ [illegible] علاوہ تین روپے آٹھ آنہ [illegible] محصولڈاک [illegible] یہ حمائل شریف [illegible] جیب کی ہے۔

بلا ترجمہ نورانی قرآن مجید

بچوں کے لئے کتابت کی لحاظ سے اس سے بہتر قرآن شریف قریب قریب آج تک نہیں [illegible] اس حجم اور تقطیع پر اس سے زیادہ صاف چھپا ہوا کوئی قرآن شریف نہیں۔ نہایت صحیح ہے ہر پارہ [illegible] ہو سکتا ہے تاکہ مساجد میں ابلدیہ [illegible] ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ [illegible] غیر مجلد ایک روپیہ دس آنہ محصول [illegible]

بارہ مہری قرآن شریف مصری

یہ تمام ہندوستان میں مقبولیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور ہندوستان کے ہر مکتب میں پڑھایا جانے لگا ہے لکھائی چھپائی نہایت خوش نما ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ [illegible] محصولڈاک بارہ آنہ [illegible]

سترہ مہری قرآن مجید مصری

یہ قرآن مجید بہت صحت کے ساتھ آٹھویں بار طبع ہوا ہے ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ [illegible] محصولڈاک بارہ آنہ ۱۲

خوشنما جیبی حمائل کارڈ سائز

غیر مترجم بہترین لکھائی چھپائی ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ [illegible] ایضاً مجلد پارچہ حنا شدہ ایک روپیہ سات آنہ مجلد چرمی ایک روپیہ گیارہ آنہ [illegible] بغیر جلد ایک روپیہ تین آنہ [illegible] محصول ۶

معجز نما پنجسورہ

بلا دہ سورہ دلجموعہ وظائف مع مکمل اور دہشت مترجم باتفسیر ہدیہ دس آنہ (۱۰) مجلد ۱۲ محصولڈاک ۵

مجموعہ دلائل الخیرات

وحزب البحر و قصیدہ بردہ مترجم حنا شدہ مع کامل تفسیر و حالات مصنفین قلمی قلم۔ ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ [illegible] مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ [illegible] محصول ۶

رکن دین

اس کتاب کے اندر تمام مسائل دینی و دنیاوی جمع کر دیئے ہیں ہر گھر میں اس کتاب کا ہونا نہایت ضروری ہے یہ کتاب عورتوں کے مطالعہ میں بھی رہنی چاہئے ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت صرف دس آنہ (۱۰) محصول پانچ آنہ ۵

قصص الانبیاء

دنیائے اسلام کی نہایت ضروری کتاب از ابتدائے پیدائش حضرت آدم تا رسول کریم تمام پیغمبروں کی سوانحعمریاں تقطیع ۲۰×۲۶ ½ قیمت صرف ایک روپیہ محصول [illegible]

عقائد الاسلام

مصنفہ مولانا محمد عبدالحق صاحب دہلوی جس میں [illegible] عقائد کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور کتب فن کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور زمانہ کی ضرورتوں کا لحاظ رکھکر مخالفین کے شبہات کا محققانہ جواب دیا ہے۔
قیمت علاوہ محصول ڈاک ایک روپیہ۔

فالنامہ ناصری

ہر کام شروع کرنے سے پہلے احسن طریقہ یہ ہے کہ استخارہ کر لیا کریں۔ تاکہ اس کا انجام اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے اس میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب استخارہ قرآنیہ کا ترجمہ ہے اور اس کے علاوہ قرعۃ الانبیا، فالنامہ پیغمبران، فالنامہ اولیائے کرام، فالنامہ غوث الاعظم، فالنامہ دیوان حافظ، فالنامہ مثنوی شریف شامل کر دیا ہے یہ فالنامہ بہت ہی مقبول ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصول ڈاک ۴؍

تذکرۃ الاولیا اردو

حضرت شیخ عطار کی بہترین فارسی تصنیف کا ترجمہ تمام اولیائے کرام کی زندگی کے حالات صفحات تقریباً ۵۰۰ قیمت صرف دو روپیہ ۲؍ محصول ڈاک گیارہ آنہ (۱۱؍)

تاریخ الامت کامل

لکھائی چھپائی بہترین مصنفہ مولانا اسلم جیراجپوری ایڈیٹر "جامعہ" (۱) سیرت رسول ۱۲ (۲) خلافت راشدہ ۱۲ (۳) خلافت بنی امیہ ۱۲ (۴) خلافت عباسیہ ۱۲ (۵) خلافت عباسیہ بغداد ۱۲ (۶) خلافت عباسیہ مصری ۱۲ (۷) خلافت [illegible] ۱۲ کل سیٹ ۸؍ روپیہ محصول ڈاک ۱۲

آجکل کے مسلمان اپنے مذہب سے بالکل ناواقف ہیں

چونکہ اول تو مسلمانوں کو علوم عربیہ حاصل کر [redacted] وقت ملتا ہو جس سے مذہبی مسائل اور نکات سے واقف ہو سکے، دوسرے [redacted] الیسا ذریعہ بھی میسر نہ تھا جو اس کمی کو کماحقہ پورا اس غرض سے [redacted] کتابیں تالیف کی گئی ہیں تاکہ مسلمان اپنے مذہب کے نکات اور ارکان [redacted] م مسائل سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکیں۔

تفسیر حقانی اردو کی [redacted] جلد

مصنفہ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی ابو محمد عبد [redacted] حقانی محدث دہلوی۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں [illegible] ہوئی ہے جس [redacted] ت اور عالم آخرت کے اسرار اور قرآن شریف کی مصطلحات [redacted] بحث کی گئی ہے۔ یہ تفسیر مع اصل متن و مستند و معرکۃ الآرا مشہور تفسیر ہے جو چالیس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خلائق ہے۔ اس تفسیر کی مختصر خوبیاں یہ ہیں کہ مخالفین اسلام کے جملہ اعتراضوں کا محققانہ مدلل پیرایہ میں جواب دیا [illegible] اس تفسیر سے معمولی اردو داں سے لیکر متبحر عالم تک مستفید ہوتے اور بچے بوڑھے جوان مرد و عورت سب لوگ پڑھ سکتے ہیں، طلبا اور علما کے لئے اس تفسیر میں علمی مباحث کے وہ دریا بہائے گئے ہیں جن کی شناوری ہر مباحث و [illegible] کے لئے ضروری ہے علم تصوف اور مسائل روحانیہ کو ایسا کشف فرمایا [illegible] ذوق سلیم رکھنے والا صوفی منش انسان بیتاب ہو جاتا ہے اصل کا اصلی متن [illegible] صحیح تفسیر جو عام فہم نہایت سلیس با محاورہ روزمرہ صحیح ربط آیا [illegible] شان نزول مع قصص و واقعات جملہ مسائل وغیرہ سب باتیں اس تفسیر میں درج ہیں اگر آپ واقعی عالم، واعظ، محقق، مناظر، صوفی بننا چاہتے ہیں تو تفسیر حقانی ملاحظہ فرمائیے جس کی مجموعی قیمت پچیس روپیہ علاوہ محصول ہے اور ہر جلد کی علیحدہ قیمت یہ ہے۔ پہلی جلد دو روپیہ باقی دوسے آٹھ جلد تک فی جلد چار روپے علاوہ محصول ڈاک کے۔ اگر ڈاک کے ذریعہ منگاتے ہیں تو علاوہ محصول ڈاک خرچ ہوتا ہے اس لئے ریل کے ذریعہ منگائیے۔ پانچ روپیہ پیشگی آنے پر روانہ کی جائے گی۔

معلومات نماز

نئی تشریحات کے ساتھ بالکل نئے انداز میں نماز کو بہترین عبادت ثابت کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں نماز پڑھی جائے تو وہ انسان کو بہترین انسان بنا دیتی ہے عنوان چند یہ ہیں۔ مذہب اسلام، عبادت حکمت احکام عبادت کے منافع، ثمرات عبادت، ثمرات دنیا [illegible] تارک نماز، فضیلت نماز، نماز کے طبی فوائد، امتیازی عبادت، تعداد نماز نفلی عبادت، نماز کے روحانی کا قرآن سے ثبوت، نمازیوں کی کہانیاں، نماز قرآن میں [illegible] تمام نمازوں کا بیان [illegible] صرف ۸؍ علاوہ محصول

تجلیات ربانی [illegible]

در طریق اوراد و وظائف و طریق فاتحہ و ایصال ثواب [illegible] قیمت ۸؍ محصول ڈاک ۴؍

نوید جاوید

زبان اردو اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء سے لیکر آج تک اور آج سے قیامت تک قرآن شریف پر باطل پرستوں نے جسقدر اعتراض کئے ہیں یا کریں گے ان سب کا اس میں جواب ہے اور تمام مذاہب کی دلائل سے تردید ہے آج سے ۵۳ برس قبل کی تصنیف نا پید تھی اب نہایت صحت کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنہ (۸؍۳) محصول ۱۲؍

الحقوق والفرائض

از مولوی نذیر احمد دہلوی۔
مذہب اسلام کے سارے مسائل کا مجموعہ قرآن شریف کی آیات اور احادیث کے ترجمہ کے ساتھ ہر مسلمان کے گھر میں جو مذہب کی واقفیت رکھنا چاہتا ہو اس کتاب کا ہونا لازمی ہے۔ صفحات ۷۰۰ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنہ (۸؍۵) محصول ڈاک ۱۲

اجتہاد

اسلام کی حقانیت کے دلائل و براہین قاطعہ سے اثبات۔ جو مسلمان اپنے عقیدے میں پکا ہونا چاہتے وہ اس کتاب کو ضرور دیکھے۔ از مولوی نذیر احمد ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنہ محصول ۴؍

عملیات

اس کتاب میں پانچسو سے زیادہ ایسے مستند اعمال، اشغال و عملیات ہیں جو اولیا اور بزرگان دین کے زیر عمل رہے ہیں اس میں فن کی حیثیت سے عمل پڑھنا، نقش لکھنا اور تمام اعمال کے متعلق ضروری [illegible]

دلچسپ ادبی کتابیں

بزم خیال

یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی کتاب ہے جو مسلم الثبوت استادوں کی اصلاحیں لیکر تیار ہوئی ہے نہایت ہونہار شاگرد رشید وقت حسین جنکی بدولت وہ ملک شاعری کی دنیا میں آفتاب بے مثال بنکر چمکے قیمت صرف ایک روپیہ محصول ۸/

شمیم

ہر دو جلد مکمل، زمانہ حال کی اعلٰی فسانہ نگاری میں ایک سرکۃ الآرا تصنیف فن ناول نویسی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنیوالا مصلح اخلاق، سبق آموز، عبرت خیز، بے انتہا دلچسپ ناول جیس میں جذبات شعری کی عکاسی، معاشرت حاضرہ کی مصوری نفسیات وحیات انسانی کی نقاشی بدرجہ اتم پائی جاتی ہو زبان کی حلاوت انداز بیان کی لطافت، پلاٹ کی خوبصورتی کیرکٹر کی آراستگی تحریر کی شوخی آمیز سنجیدگی اور خیالات کی دلآویز ندرت کے لحاظ سے یہ ناول اپنی نظیر آپ ہی، انگریزی، اردو، ہندی کے اخبارات اور رسائل نے بہت شاندار ریویو لکھے ہیں ضخامت تقریباً ... صفحات یہ ناول سہ رنگی تصاویر سے مزین ہے۔ قیمت مجلد صرف چار روپے علاوہ محصول گیارہ آنہ (۱۱/)

مکمل شرح دیوان غالب

ہندوستان میں اس سے بہتر شرح آجتک شائع نہیں ہوئی از عبدالباری آسی قیمت تین روپے محصول ۸/

مکمل شرح کلام غالب

غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی بہترین شرح

از عبدالباری آسی قیمت تین روپے محصول آٹھ آنہ۔

شرح رباعیات عمر خیام

منظوم قیمت دو روپیہ چار آنہ محصول کچھ آٹھ آنہ

شرح رباعیات عمر خیام منثور

قیمت دو روپیہ محصول سات آنہ۔

شرح رباعیات سرمد شہید

قیمت کو دو روپیہ ۶/ محصول ۸/

قصائد عزیز

از مولنا مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بہترین لکھائی چھپائی بہترین مجلد قیمت تین روپے آٹھ آنہ محصول

تلاش حق

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی، گاندھی جی نے اس میں اپنے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی تجربات اپنے آپ تحریر فرمائے ہیں

کاغذ، کتابت، طباعت بہترین صفحات تقریباً ۵۰۰ قیمت صرف ۱۲/ محصول ۵/

شہاب کی سرگذشت

دنیائے ادب کا پہلا افسانہ جسکی نفسیاتی سیرت نگاری، رنگینی خیال اور بلندی انشاء کے لحاظ سے علمائے حقیقت کہتی ہے جو اردو ادبی زندگی کی حقیقت پر جا پہنچنے کے نازک مسائل پر ایک محیر العقول کارنامہ ہے از مولانا نیاز فتحپوری قیمت ایک روپیہ ۸/ محصول ۵/

فغان آرزو

حضرت آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان لکھائی چھپائی کاغذ بہترین صفحات تقریباً ۳۰۰ قیمت ۶/ محصول ۸/

دلگداز افسانے

نہایت دلآویز اور دلگداز افسانوں کا مجموعہ از کوغر

اصلاح و معاشرت پر ایک معرکۃ الآرا تصنیف از راشد تہانوی قیمت محصول

مرقع ادب

ہندوستان کے انشا پردازوں اور محققین اساتذہ سخن کے نہایت دلچسپ اور پر از معلومات خطوط کا نایاب مجموعہ قیمت ہر دو حصہ ہے محصول ۸/

جاسوسی فسانے

مشہور و معروف جاسوس خیز لکھے ہوئے عجیب غریب محیر العقول جاسوسی افسانے قیمت ۶/ محصول ۸/

گہوارۂ تمدن

اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ عورت نے از منہ قدیمہ میں تہذیب و ارتقائے عالم کا کس قدر ساتھ دیا اور دنیا کی شائستگی اور مدنیت عورت کی کس درجہ ممنون ہے۔ از مولانا نیاز فتحپوری قیمت ۶/ محصول ۸/

نگارستان

مولنا نیاز فتحپوری کے چند مخصوص ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ جنہوں نے انشاء بدیع کی دنیا میں ہلچل ڈالدی ہے اور اختراعات ناد، جدت اسلوب اور نوائے ترکیب کے لحاظ سے دنیائے ادب کیلئے ایک نئی چیز ہیں قیمت ۶/ محصول ۸/

چاندپوری قیمت ۸/ محصول ۵/

عالم خیال

ایک بے اضافت اور بے بدل نظم مع چار سہ رنگی تصاویر از شوکت قدوائی لکھنوی مرحوم ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت ۸/ محصول ۵/

تذکرہ خندۂ گل

اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انتخاب کلام از عبدالباری آسی ضخامت ۴۸۰ صفحات قیمت ۶/ محصول ۸/

عیار فقیر

ہندوستان کی گداگری پر ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بحث عبدالباری آسی قیمت ۸/ صفحات ۱۵۰ محصول ۵/

اجتماع ضدین

فسانہ کی صورت میں

مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی برلن قیمت ہر دو حصہ دو روپے ۶/ محصول ڈاک آٹھ آنہ ۸/

سیرت محمد علی

رئیس الاحرار شہید ملت مولنا محمد علی مرحوم کے مفصل حالات جس میں مولنا کے فوٹو بھی شامل ہیں از رئیس جعفری ندوی ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت صرف تین روپیہ محصول ۱۲/

موتی

دنیا بھر کے حکما، علما، اور ادبا کے گرانقدر زرین اقوال کا مجموعہ بصیرت افروز ملفوظات کا خزانہ، حکمت و فلسفہ، پند و موعظت شعریت و رومان، ادب و انشاء، ادبیات نثر میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف، علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے تبصرے نے اور چار چاند لگا دیئے ہیں

حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ

نوشتہ مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن قیمت ۱۲/ علاوہ محصول

سی پارۂ دل

خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا دلکش مجموعہ جو اعلٰی جماعتوں کے سرکاری نصاب میں داخل ہے قیمت ۶/ علاوہ محصول

پیام جاوید

از مرزا عسکری علی خاں مجازی لکھنوی قیمت ۸/ محصول ۵/

کھرپا بہادر

چغتائی صاحب کے مخصوص طرز تحریر کا

تازہ ترین شاہکار

نہایت ہی پرمذاق اور ظرافت آمیز ناول ہے جو مصنف اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ ساتھ لیکن عظم کے ناول سے جدیگانے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و خطرناک سازشوں کے ہولناک و قہقہہ خیز سین دکھائے گا یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور جدت پر نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا ہوا ہے کھرپا بہادر کو پڑھکر آپ خرگوش کے ۔ بار حر لیور ۔ بھول جائینگے بہترین لکھائی چھپائی و فوٹو بلاک کا رنگین سرورق اور قیمت ان تمام خوبیوں کے مقابل بالکل مفت یعنی صرف ایک روپیہ ۱۰ عہ محصول ۵ ر

ملنے کا پتہ :۔ کتبخانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

کوتار اس کے بعض حصے ہنسانے والے اور یقینی ہنسلانے والے اور بعض پر اسرار ہیں قیمت ۸ ر

ومپائر ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب و غریب دردانگیز و مضحکہ خیز قصہ قیمت ۸ ر

شریر بیوی ایک شوخ لڑکی کی داستان جسکو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے قیمت ۱۲ ر

فلرٹ حسن و عشق کا بیحد دلچسپ مختصہ ناول جذبات و تاثرات کا دل آویز مرقع قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

روح ظرافت صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ عہ

مرزا جنگی لکھنؤ کی پرانی تہذیب اس ولولہ و ڈرامہ میں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں ۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲)

دیکھا جائیگا شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے قیمت خوبصورت جلدی ایک روپیہ عہ

روح لطافت لطیف کی روح ہے ۔ آٹھ بیحد دلچسپ عبرت انگیز افسانے قیمت ۱۲ عہ

جنت کا بھوت یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے قیمت ۱۲ ر

تفویض ایک کریجویٹ خاتون کی شادی ایک مسجد کے ملا سے ہو جاتی ہے اس کے عجیب و غریب نتائج قیمت پانچ آنہ ۵ ر

قرآن و ریزہ آیات قرآنی سے حوالہ

چندرہ موہنی مصنفہ انصار نگی صاحب ناصری حسن و عشق کی داستان مگر پاک محبت کے لطیف جذبات حسرتناک انجام قیمت ایک روپیہ عہ بتایا گیا ہے صحیح پتہ کیا ہے اور رنگین پردہ کیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

دلی کا آخری دیدار مصنفہ سید وزیر حسن دہلوی کتاب کا مضمون کتاب کے نام سے ظاہر ہے قیمت بارہ آنہ ۱۲ محصول ۵ ر کردینے پر کیسے مجبور ہو جاتی ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ محصول ۵ ر

اخوان الشیاطین مصنفہ محترم

نرگس جمال مترجمہ شاہد احمد بی اے قیمت عہ

سیلاب تبسم حضرت شوکت تھانوی کی تازہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اس کتاب کو پڑھکر خود ہنسئے اور احباب کو ہنسانے کے لئے اس کتاب کو اپنے پاس رکھئے قیمت مجلد دو روپیہ (عہ) محصول ۶ ر

بحر تبسم ۱۸ بہترین مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ از شوکت تھانوی قیمت عہ محصول ۶ ر

طوفان تبسم ۱۰ مزاحیہ افسانوں کا لاجواب مجموعہ از شوکت تھانوی قیمت دو روپیہ عہ محصول ۶ ر

لاٹھی اور بھینس از ملا رموزی قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ محصول ۶ ر

شفاخانہ از ملا رموزی قیمت عہ محصول ۵ ر

دیوان ملا رموزی قیمت چار آنہ ۴ ر

شادی از ملا رموزی قیمت عہ محصول ۶ ر

صبح لطافت از ملا رموزی قیمت دو روپیہ عہ محصول ۶ ر

مضامین فرحت (حصہ سوم) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے بہترین ۱۵ مضامین کا مجموعہ قیمت عہ محصول ۔

لطائف عجیبہ ہر سہ حصہ از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت دو روپیہ دو آنہ عہ محصول ۸ ر

حکایات لطیفہ ہر سہ حصہ از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت عہ محصول ڈاک ۸ ر

نرگس حضرت ایم اسلم کا تازہ ترین شاہکار قیمت دو روپیہ عہ محصول ۵ ر

کمزوری مرزا عظیم بیگ صاحب نے ایک ایسا دلچسپ ناول لکھا ہے جو ان کی تمام موجودہ تصانیف سے بڑھ چڑھکر ہے قیمت دو روپیہ (عہ) محصول پانچ آنہ ۵ ر

گناہ کی راتیں علامہ مضحکہ نفضل حسین صاحب چشتی سات سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ بیحد دلکش مجموعہ آپ کے مطالعہ کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ سات دل ہلا دینے والے افسانے جو افسانہ میں دکھایا گیا ہے کہ عورت اپنے گوہر عصمت ضائع

مصنف کتاب چھوڑ کر ۔ جنسی ۔ تصاویر ۔ ۱۲۶

شریف بیگمات کے مطالعہ کی کتابیں

اتالیق نسواں
بعد ترمیم

۔۔۔ صفحوں میں چھپ گئی ہے اس پر عمل کرنے سے بیٹیوں کو سگھڑ اور بہوؤں کو سلیقہ شعاری آتی ہے۔ اس کتاب میں عملی کاموں کے مشق کیلئے پورے (۱۰۳) صفحوں میں بارہ رنگ کلیں دی ہیں ہندوستانی اور یورپین طرز معاشرت کو موقعہ بموقعہ مقابلہ کرکے دکھایا ہے دسوں جلد والی مکمل کی قیمت چار روپے آٹھ آنہ للعہ محصول بارہ آنہ ۱۲؍

بیوی کے فرائض
اگر گھر کو جنت کا نمونہ بنانا ہے تو یہ کتاب بیوی کو منگا کر دیجئے اس کتاب سے آپ کو روحانی کیف بھی حاصل ہوگا۔ قیمت ۸؍ محصول ۴؍

موتیوں کا کام
اس دستکاری کی مفید کتاب کو ۲۷ ماہر عورتوں نے تیار کیا ہے اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی مفید کتاب ہندوستان میں کہیں نہیں چھپی قیمت ۱۲؍ محصول ۶؍

میاں بیوی کے حقوق و فرائض
آپ کا گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے اگر آپ اس کتاب کے عامل بن جائیں قیمت آٹھ آنہ ۸؍ محصول ۵؍

گلدستہ کشیدہ
کشیدہ کاری کی اسقدر خوبصورت، اور اتنی کارآمد کتاب آج تک نہیں شائع ہوئی جس کی تیاری میں ۲۰ دستکار بہنوں نے حصہ لیا اس فن کی مشہور ماہر محترمہ عزیز فاطمہ صاحبہ نے نہایت محنت اور قابلیت سے کتاب کو مرتب کیا ہے ترکیبیں اسقدر آسان ہیں کہ چھوٹی بچیاں بھی سمجھ سکتی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱۸؍ محصول ۹؍

عصمتی کشیدہ
اس کتاب کو ہندوستان کی نامور خواتین کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جس میں کشیدہ کاری کیلئے تقریباً ڈیڑھ سو خوبصورت نمونے ہیں جو لڑکیوں کے لئے کشیدہ کاری کی مکمل تعلیم ہے قیمت ایک روپیہ ۱؍ محصول چھ آنہ ۶؍

خواتین کی دستکاریاں
جو عورتیں مالی دقتوں سے پریشان ہیں جنہیں آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ان کے لئے کارآمد بیش بہا مشورے اور بہت سے کام جن سے وہ بغیر کسی کا احسان اٹھائے مالی پریشانیوں کو دور کر سکتی ہیں قیمت ۸؍ محصول ۵؍

عصمتی کروشیا
کروشیا کی شوقین بہنوں کے لئے نہایت کارآمد تحفہ جس کی تیاری میں ہندوستان کی ۲۵ نامور خواتین نے جو کروشیا میں ماہر مانی جاتی ہیں، حصہ لیا ہے۔ قیمت ۱۲؍ محصول ۸؍

بیوی کی تعلیم
حضرت خواجہ حسن نظامی اور خواجہ بانو کی لکھی ہوئی کتاب جس میں ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن کا بیویوں کو جاننا ضروری ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱۴؍ محصول ۶؍

بیوی کی تربیت
بیوی کی تعلیم کا دوسرا حصہ نامور خواتین کے مضامین قیمت ایک روپیہ ۱؍ محصول ۵؍

اولاد کی شادی
بیوی کی تعلیم کا تیسرا حصہ اولاد کی شادی کے متعلق ضروری نصیحت نامہ قیمت ایک روپیہ ۱؍ محصول پانچ آنہ ۵؍

مخدرات تیموریہ
سب سے عجب خاندان شاہی کی مستورات کا حال، اس سلسلہ کی کتاب میں تقریباً کیسو چودہ بیگمات کے حالات درج ہیں از مولوی عبدالحلیم شرر قیمت ۱؍ محصول آٹھ آنہ ۸؍

ازواج النبی
جناب سرور کائنات کی ازواج مطہرات کے پورے حالات و سوانح عمریاں قیمت ایک روپیہ ۱؍ محصول ۶؍

مخدرات مشاہیر عالم
دو حصہ جلد کامل، اس کتاب میں قریب قریب تمام دنیا کی مشہور عورتوں کے حالات درج ہیں از مولوی عبدالحلیم شرر قیمت تین روپے ۳؍ محصول دس آنہ (۱۰؍)

دہلی کا باورچی خانہ
اس کتاب میں قدیم امرا اور شرفائے دہلی کے تمام لذیذ اور نت نئے کھانے اور ان کے پکانے کے نہایت سہل طریقے درج ہیں قیمت ۸؍ محصول ۵؍

بنات النعش
لڑکیوں کے تمدن و معاشرت کی اصلاح از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت ۱۲؍ محصول ۶؍

توبۃ النصوح
لڑکیوں کو اخلاق و نیک کرداری کی تعلیم از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت ۱؍ ایضاً قسم دوم پتلا کاغذ ۸؍ محصول ۶؍

مراۃ العروس
لڑکیوں کو امور خانہ داری کی تعلیم دینے والی کتاب از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت ایک روپیہ ۱؍ ایضاً قسم دوم ۱۰؍ محصول ۶؍

اقبال دلہن
شرفائے دہلی کی روزمرہ کی زندگی کے دلچسپ حالات از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱۸؍ محصول ۷؍

حسن معاشرت
پھوہڑ اور سلیقہ مند بیویوں کے حالات کا اخلاقی ناول قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱۴؍ محصول ۶؍

اصلاح معیشت
اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عورتیں بھی مرد کو کما کر کھلا سکتی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱۸؍ محصول ۹؍

بچیوں سے دو دو باتیں
لڑکیوں کے لئے مفید معلومات اور ہدایات کا مجموعہ قیمت ۱؍ محصول ۵؍

انشائے بشیر
عورتوں کے لئے سوا سو خطوط کا مجموعہ قیمت ۱۲؍ محصول ۸؍

ناشتہ
مشرقی اور مغربی ناشتہ تیار کرنے کی بہترین کتاب جو نئی روشنی کی بہنوں کے لئے کارآمد چیز ہے اس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مختلف قسم کے ناشتوں کی کئی کئی ترکیبیں ہیں قیمت ۱۰؍ محصول ۵؍

اگر کوئی کتاب آرڈر کے وقت موجود نہ ہوگی، تو مہیا ہونے پر مطلع کر دیا جائیگا۔

جوانی اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنی ہوں

تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیے ان کتابوں میں جوانی اور شادی کی مسرتیں ہی ہیں عورتوں کے دلوں کو مسخر کرنے کی تدابیر بھی ہیں اور اس کے علاوہ صحت اور تندرستی کے تمام اصول بھی ہیں جس کے پاس یہ کتابیں ہوں گی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا

دلہن کی ڈائری

ایک شوخ طرار دلہن کی آپ بیتی، شب زفاف کا پرکیف سماں، کچھ خوف، کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ دولہا میاں کی ہیبت، بابا عشرت کی گلچینی بے صبری کے جذبات جیالی کے مظاہرے، پوشیدہ حالات کا انکشاف غرضکہ دلچسپیوں کا لاجواب مرقع ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ عہ

لذت النکاح

زن و شوہر کے تعلقات پر

نہایت دلچسپ کتاب ہے جس کو جوانی او اس کے جذبات کا مکمل کورس کہنا چاہیے اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دلہن کو کیا کرنا چاہیے اور اپنے ازدواجی تعلقات کا سلسلہ کیونکر بڑھایا جائے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی شبہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہوکر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتے ہوئے اصلاح رسوم کا بیڑہ اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حقوق نسواں پر زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگزشت ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

بہار عروس

یہ وہ کتاب ہے جس کو بھیلہ دلہن نے اپنی سہیلی اختر دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگذشت لکھ کر بھیجی تو جو غضب ڈھاتی ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے پوشیدہ دلچسپ واقعات ہیں

بڑی ہی پرلطف و مزیدار کتاب ہے ایسی کتابیں کم ہوں گی قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دولہا دولہن

یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو اپنی بیوی سے حقیقی لذت حاصل کرنا سکھائیگی، اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں ان سے بچائیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مواصلت میں غیر معمولی لذت پیدا ہوجائیگی اس کتاب کی مجربات اور عملی تدابیر معلوم ہونے کے بعد تمام عمر ممسک اور طلاء اور دوسری فضول دواؤں کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اردو میں لاجواب کتاب ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

عیش و نشاط

اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کے لئے وہ تجارب ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد عیش و لطف، کیف تندرستی، تندرست اولاد، عورت کی محبت اور شادی کی لذتیں چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کی جاسکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ علاوہ محصول

زن و شوہر

یہ طلسمی کتاب شادی شدہ نوجوانوں کی زندگی کو راحتوں سے لبریز کردیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد عورت کی فطرت سے اس قدر آگاہ ہوجاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو ہمیشہ کانٹا رکھ کر بھی خوش رکھ سکتے ہیں قیمت ایک روپیہ عہ

مرد و عورت

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آخر عمر تک زوجین تندرست رہیں گے، اور انہیں وہ تجربے معلوم ہوں گے جن سے شاید اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں قیمت عہ

میاں بیوی

یہ کتاب اصل بے تکلف احباب کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے لوگ بیوقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں قیمت عہ

لطف شباب

عربی کی ایک مشہور کتاب

کا ترجمہ جو سلطان سلیم خاں کے لئے لکھی گئی تھی صدیوں سے ناپید تھی اس کا مطالعہ کمزوروں کیلئے اکسیر اور بے اولادوں کیلئے مژدہ اولاد ہے اور مقوی باہ مجرب نسخوں اور طلسوں کا نادر و نایاب مجموعہ ہے قیمت عہ

مرقع حسن و شباب

یہ لطف شباب کا دوسرا حصہ ہے جس میں عورتوں کے اقسام و حالات اور ان کے حسن و شباب کو دوبالا کرنیوالی دوائیں اور طریقے درج ہیں قیمت ایک روپیہ عہ

زندگی کی بہار

مصنفہ جناب حکیم محمود خاں صاحب دہلوی جس میں کل کیفیت عیش و عشرت مرد و عورت کے جملہ امراض کے حالات معہ علامات درج ہیں۔ شوقین مزاجوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ علاوہ محصول ڈاک۔

صلح کار

عورت مرد کے تعلقات

یہ نہایت مفید علمی کتاب جس میں عشق و محبت کی حقیقت اور جوانی کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

نفیس شباب

ایک ذی رتبہ ڈاکٹر ... کی بے مثل تصنیف ... جرمن زبان سے اردو ترجمہ ... کی نفسی سیرت ان کی عملی زندگی عشق تصور کائنات اور اخلاقی نشوونما اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ... کی پہلی اور مقبول عام کتاب ہے قیمت محصول ڈاک آٹھ آنہ ۸

ایرانی کوک شاستر

جادوانی کی خواہش ہو تو ایرانی کوک شاستر کو مطالعہ میں رکھیے جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جوانی کو آپ کس طرح ہمیشہ قائم رکھ سکتے ہیں بیوی سے کس طرح لطف اندوز ہونا چاہیے اور اس کے جذبات و تاثرات کیا ہیں شباب کس طرح و قصہ زوال ہوتا ... رونگی ہوئی جوانی کی واپسی کس طرح ممکن ہو۔ حاذق حکماء کے سینہ بہ سینہ اصول صدری مجرب نسخے قیمت عہ محصول ۲

تصویر حسن

اس کتاب میں قابل مصنف نے حسن و خوبصورتی پیدا کرنے اور اس کو قائم رکھنے کے اصول پر بحث کی ہے۔ علاوہ تمام نسخے اور طریقے درج کردیے ہیں جن سے ایک بدصورت و بدشکل بھی نہ صرف حسین بن سکتا ہے بلکہ حسن و خوبصورتی کو آخر عمر تک قائم رکھ کر روزافزوں ترقی کرسکتا ہے قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۶

قانون ازدواج

دنیائے کیف و نشاط کا خاموش رہنما ... کے نام سے کتاب کے کام کا اندازہ لگائیو جوانی اور شادی کی مسرتیں عورتوں کو مسخر کرنیکی تدبیریں تندرستی قائم رکھنے کے اصول ضعیفی کو جوانی سے بدلنے والے قوانین اور تقریباً دو درجن تصاویر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ محصول ۶

ہمارا ہندوستان اور بیرونجات کے تمام کتب خانوں سے مستقل معاملہ ہے

[redacted]

عورت بالتصویر

جس میں حسن کی حقانی کیفیت ... عورت کی زندگی کا مکمل ... پوشیدہ ... عورت کی فطرت، عورت کی تربیت ... حسن کی خوش چینی ... عورت کی زندگی کے متعلق کوئی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔ اس کتاب میں ... فوٹو بلاک اور قلمی تصویریں ہیں ... مقبول کتاب ہے ... قیمت دو روپے ... محصول ۸

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد شب عروسی کی ... معلوم ہو جائیں گی۔ شادی کے وقت عزیز دوستوں کو کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کو کسی موقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو شب عروسی کتاب دیجئے۔ شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائے گا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ برقرار رہیگی۔ قیمت ... محصول ۵

کیف مواصلت

دنیائے لطف و مسرت اور لذت و کیف میں انسانی ... ایک مرد اور جوان مرد کیلئے عورت ہی مواصلت ... وہ کیف اور اسرار ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے ... قدرت کی ... دنیا میں ... آبادی میں اضافہ کرتے ... چل بستے ہیں لیکن یہ زندگی ... کیف ... شعبہ حیات میں اس درجہ ... کیا جائے ... حیات عالم سے ممتاز ہو ... کتاب ... اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ قیمت ... محصول

بہار شباب

صنفی کتابوں میں جس سلوب بیان کا امتیاز ... جذبات کی ... یہ چیز مطالعہ کیلئے ... فائدہ ... جس کے ماتحت ... انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھکر ... قائم ... بہار شباب میں ... کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کیلئے ... طریقے ... ہدایات ... ہزاروں باتیں اور عورتوں کی ... کیفیات کو مردوں پر آئینہ کر دیا ... متعدد ... فوٹو بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ... محصول

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے ... اس کتاب میں ... لذت کے ... عورت کو ... ایک جوان آدمی کے ذہن میں ... مفتش نے عورت کی ... لذت ... اور اسی طرح مرد کی قوت ... نسخے ... علاج کے سلسلہ میں ... قیمت ... محصول

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آور بن لذت ہی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اسکے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو۔ اولاد کی کثرت ... حسن کے باغ جمال پر خزاں چھا جاتی ہے ... والدین کیلئے ... ذوق و لذت ... برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جسکو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت ... اولاد کو پیدائش تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی۔ قیمت ... محصول

لذت شباب

شباب جوانی کی ... لذت شباب ... کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپکو معلوم ہوگا کہ شباب کو ... کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں ... کس طرح ... شباب ... کس طرح ... عورت ... اور مرد ... خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لذت شباب ... سرستان شباب کو لذت تازہ ... فوٹو بلاک ... قیمت ... محصول

شب عروسی کے افسانے

وہ مدید کتاب ... جو شب عروسی کے تمام ... یکجا جمع کرنے میں کامیاب ... یہ کتاب ... جذبات کی ... شب عروسی کے ... دلہن بنکر سامنے آجاتے ہیں ... زندگی کا ... کامیاب زندگی کا ... قیمت ایک روپیہ ... محصول

قانون مواصلت

عیش و نشاط کی زندگی کا رہبر۔ اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آپکی قوت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھا سکیں گے۔ اس میں مواصلت کی بابت تمام ضروری باتیں درج ہیں۔ قیمت ...

شباب نوجوانوں کی رہبر کامل ... حیات قوت رفتہ کی ... کی تدبیر ... قیمت ...

تاج العروس

یہ کتاب صدہا قیمتی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس میں صنف نازک کے ہر پہلو اور امور خانہ داری کے ہر نکات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب صدہا ... فارسی اور ہندی معلومات کا بہترین نچوڑ ہے۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

ثمرۂ وصال

عیش ... منازل کے ساتھ اولاد پرورش اطفال پر بہترین کتاب۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کو دلمیں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی ... شادی کے بعد ... حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے ... کی پرکیف زندگی ... دوشیزہ کی ڈائری میں ... فوٹو بلاک ... تصویروں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا۔ قیمت

افشائے راز نہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ... اس موضوع پر شاید کوئی کتاب ... نہ ہوگی ... اور ... عورتوں کی نفسانی خواہشات ... خود ان کے قلم سے لکھے ہوئے ... امریکہ کی ایک ... عورت نے یکجا کرکے کتابی صورت میں پیش کئے ... اس کا ترجمہ بھی ... خدا جانے ... لوگوں کے مطالعہ میں جاسکے ہر وقت اس کے بند ہونیکا خطرہ ہے اسلئے جلدی منگائیے۔ قیمت ... محصول

آپکے فائدے کی بات - مختلف مقامات سے مختلف کتابیں طلب کرنے ...

کلید مراد

دعائیں مانگنے اور مرادیں حاصل کرنے کے طریقے، کلام اللہ اور احادیث سے اخذ کرکے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸/

فن تسخیر

دلوں کو مسخر کرنے والے اخلاق و آداب سکھانے والی کتاب۔ قیمت آٹھ آنہ ۸/

فن تقریر

تقریر اور گفتگو کرنے کے مفید اصول ۸/

آپکی دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

اس لئے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے اور آداب سے ناواقف ہیں، اگر آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے واقف ہوجائیں تو آپ کی دعا قبول ہوگی اور ضرور ہوگی اس کتاب کو پڑھئے اور عمل کیجئے بہت سے صاحب اولاد بن جاتے ہیں غریبوں کو افلاس سے نجات مل جاتی ہے، مقروض قرضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں ہدیہ آٹھ آنہ ۸/

آپ کون بننا چاہتے ہیں؟

کون منظور ہے نہیں، مثلاً آپ اپنا مطیع اپنا فریفتہ اپنا دلدادہ بنانا چاہتے ہیں خواہ کوئی عورت ہو یا مرد کوئی بزرگ ہو یا کوئی آقا ہو کوئی حاکم ہو آپ کا مطیع و مسخر ہوسکتا ہے، اگر آپ اس عجیب و غریب طلسمی کتاب عمل تسخیر کو ملاحظہ کریں اور اس کی ہدایتوں پر عمل فرمائیں اس عمل کی ترکیب نہایت آسان ہے قیمت آٹھ آنہ ۸/

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آتا ہے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے اس میں صرف تین چھوٹے چھوٹے لفظ تجویز کر دیئے ہیں جس سے بڑی بڑی تقطیع کر لیں اگر آپ شاعر بننا چاہیں تو فن شاعری منگا لیجئے قیمت ۸/

تصانیف مولانا شبلی نعمانی

الفاروق

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رض کی نہایت معتبر مستند اور مبسوط و مکمل سوانحعمری قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/ معمولی ایڈیشن ۳/

الغزالی

حجۃ الاسلام امام غزالی کی سوانحعمری اور ان کا فلسفہ علم کلام، اخلاق اور تصوف میں ان کے مجتہدانہ کارنامے قیمت ۱/

سیرۃ النعمان

سراج الامہ حضرت امام ابوحنیفہ رح کی سوانحعمری اور انکے اجتہادات اور مسائل فقہ حنفی کی تاریخ اور اسلامی قانون پر تبصرہ قیمت اعلیٰ ایڈیشن دو روپیہ، معمولی ایڈیشن ۱/

سوانح مولانا روم

اسلام کے مشہور صوفی متکلم حضرت مولانا روم کی مفصل سوانحعمری انکا سرالتصوف، علم کلام اور مثنوی پر تبصرہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸

المامون

امام دار رشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات، دولت عباسیہ عروج و زوال کا دلکش مرقع قیمت اعلیٰ ایڈیشن دو روپیہ معمولی ۱/

رسائل شبلی

اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تمدن وغیرہ سے متعلق مولانا کے قابل دید رسالوں و مضامین کا مجموعہ قیمت ۱/

مقالات شبلی

علامہ ابن تیمیہ ابن حزم قاضی ابن رشد اور دیگر علما اسلام اور مغلیہ تمدن کے متعلق متفرق مضامین کا مجموعہ قیمت جلد اول ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸ دوم ۱۲/

مکاتیب شبلی

مولانا کے ان پرائیوٹ خطوط کا مجموعہ جن میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی تعلیمی اور ادبی نکات ہیں قیمت جلد اول ۲/ دوم ۱/

اسکول ماسٹر

پرائیوٹ طلبا اور عربی مدارس کے جو طالب علم انگریزی بغیر استاد کی مدد کے سیکھنا چاہتے ہیں دونوں کے لئے اسکول ماسٹر کا مطالعہ از بس مفید ہوگا، نیز جو تجارت پیشہ حضرات انگریزی میں خط وکتابت نہیں کرسکتے ان کو بھی اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے اس کتاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ اخبارات کے ترجمہ میں بھی آسانی ہو ضخامت دو سو صفحات بہترین لکھائی چھپائی قیمت بارہ آنہ ۱۲/ علاوہ محصول۔

اتالیق فارسی

مؤلفہ جناب رشید طلعت صاحب منشی فاضل، ہیڈ مولوی اینگلو سنسکرت ہائی اسکول دہلی۔

یہ کتاب ہائی اسکول اور کالج کے طلبا کو خاص طور پر ترجمہ سکھانے کے لئے لکھی گئی ہے قیمت صرف ۱۲/ علاوہ محصول

بغیر استاد کے فارسی سکھانے والی کتاب

فارسی بول چال

جس کی مدد سے آپ چند ہی دن میں فارسی زبان کی پوری مہارت اور لیاقت پیدا کرسکیں گے ہر قسم کی بول چال کے فقرے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور کاروباری درخواست کے نمونے گفتگو کے طریقے ہزاروں اور نایاب ایسے الفاظ جو پرانی فارسی میں غیر زبانوں سے شامل ہوگئے ہیں اور سب کی تشریح اور ساتھ ہی ایک فرہنگ غرضکہ فارسی خواں طلبا کے لئے بہتر اور عمدہ کتاب ہے قیمت صرف ۱/ محصول ڈاک ۲/ کل ۱/

اتالیق عربی

مصر، حجاز، شام اور ہندوستان کے روشن خیال علما کے مشورہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کتاب کا یہ کمال ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد ایک مہینہ میں عربی لکھنا اور عربی بولنا آجاتا ہے قیمت ۱/

ترجمہ قرآن شریف انگریزی

(مرزا حیرت)

یہ وہ قرآن شریف ہے جس کا ترجمہ بہت ہوا کہ مرزا حیرت دہلوی نے انگریزی میں کتاب کیساتھ شائع کیا تھا اور دنیا کے ہر گوشہ میں مقبولیت کی نظروں سے دیکھا گیا تھا۔ لیکن یکایک کچھ ایسا نایاب ہوا کہ لوگ ڈھونڈتے رہ گئے لیکن اب اتفاقاً ہمیں چند ہی جلدیں ایک جگہ سے دستیاب ہوگئی ہیں چنانچہ فائدہ کی غرض سے پہلی قیمت ۔۔۔ کم کرکے صرف آٹھ روپے ہیں جلد نہایت خوبصورت چرمی جلد کا ہدیہ ۔۔۔ روپے ہیں بہت تھوڑی جلدیں باقی ہیں جلد طلب کیجئے۔

مولانا شبلی کے تاریخی مضامین

یہ مولانا موصوف کے بعض ان علمی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو زبان کا مایہ ناز سرمایہ کہلانے کے مستحق ہیں ان سے آپکی معلومات میں اضافہ ہوگا اور خیالات میں وسعت پیدا ہوگی۔ قیمت مجلد صرف ۸/

مولوی نذیر احمد کے علمی مضامین

اسمیں مولانا موصوف کے بعض علمی اور مذہبی مضامین جو دہلی کی ٹکسالی زبان میں ہیں ایک جگہ جمع کردیئے گئے ہیں مذہب اور زبان کی رہبری کے لئے یہ کتاب ضرور طلب کیجئے قیمت مجلد صرف آٹھ آنہ ۸/

مضامین حالی۔ مولانا موصوف کے چیدہ مضامین قیمت مجلد ۶/

[illegible] کے پہلے چھپے ہیں
[illegible] سالانہ چندہ [illegible]
[illegible] ششماہی [illegible]

جرعات

ہر سال ساقی کے چار خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے
انکی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۱۰ | ساقی دھلی بابت دسمبر ۱۹۳۴ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

الحمد للہ کہ اس پرچے کے ساتھ ساقی اپنی زندگی کے پانچ سال پورے کر رہا ہے۔ جنوری کا پرچہ اس کا سالگرہ نمبر ہوگا۔ نئے سال کی ابتدا میں ہر رسالہ اپنی بساط بھر کوشش کر کے اپنا خاص نمبر شائع کرتا ہے۔ ہم نے بھی ساقی کے سالنامے کو ہر لحاظ سے کامیاب بنانے کیلئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ عمدہ مضامین کی فراہمی کے لئے صرف ادارہ ساقی ہی نے کوشش نہیں کی ہے بلکہ اہلِ قلم حضرات کی ایک پوری جماعت نے سالنامہ کے لئے مضامین جمع کئے ہیں۔ ان مضامین کی ایک مختصر فہرست زیرِ نظر اشاعت کے صفحہ ۷ پر شائع کی گئی ہے۔ تصویروں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ملک کے مشہور آرٹسٹ مسٹر سوبھا سنگھ نے سالنامے کا سرورق بنایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ سالنامہ ساقی اپنی بوقلموں صفات کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔

ساقی کے مستقل خریداروں سے سالنامہ کی قیمت نہیں لی جاتی۔ دفتر ساقی سے اور پرچوں کی طرح سالنامہ بھی بذریعہ ڈاک بھیجا جائے گا۔ ڈاک میں اکثر پرچے کھوئے جاتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکخانہ ذمہ دار ہونے کے باوجود معمولی ڈاک کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے جو حضرات چاہتے ہیں کہ سالنامہ اُنہیں یقین کے ساتھ پہونچ جائے تین آنے کے ٹکٹ بغرض رجسٹری بھیج دیں۔ دفتر ساقی کے لئے یہ قطعی ناممکن ہوگا کہ جن حضرات کو سالنامہ نہ پہونچے اُن کی خدمت میں سالنامہ بھی معمولی پرچوں کی طرح مکرر بھیجا جائے۔ ناظرینِ ساقی اس مجبوری کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔

جناب منظور حسین ماہر القادری کا مضمون "افلاطون کا نظریہ سیاست" اور جناب سید مرتضیٰ حسین رضوی کا تنقیدی مقالہ "حکیم قاآنی کے مذہب و اخلاق پر ایک نظر" دونوں بہت قابلِ قدر ہیں۔ "شباب و شعر" ادبی شوخیوں کا نمونہ ہے۔ اسے مذہب و اخلاق کی کسوٹی پر نہ جانچا جائے تو بہتر ہے۔ "شعاعِ ماہتاب" اور "اندھی لڑکی کے خطوط" عمدہ افسانے ہیں۔ "دریا کا گیت" اور "سمندر" جناب اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے۔ کے دو مختصر مضمون ہیں جنہیں ادب لطیف کے صحیح نمونے کہا جا سکتا ہے۔ جناب صادق الخیری نے "سرگذشتِ سگ" دلچسپ لکھی اور "پریم پجاری" نے بھی کہانی دلکش سُنائی ہے۔

"شاھد"

اطلاع۔ جن حضرات کا سالانہ چندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے اگر وہ آئندہ سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں تو اُنہیں چار آنے کی کفایت رہے گی۔ وی۔ پی کی صورت میں چار آنے زیادہ خرچ ہوں گے۔

مہتمم ساقی

دریا کا گیت

از شاعرِ انقلاب قاضی نذر الاسلام

معلوم نہیں میں کس منزل کی طرف جا رہا ہوں۔

اس بحرِ بیکراں میں خوشی اور غم کی موجیں تھپیڑے مار رہی ہیں، اور میری کشتیِ زندگی انہیں موجوں میں ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ آفرینش کی سوت سے نکل کر آپ اپنی روانی میں بہا جا رہا ہوں اور یہ راہ بے منزل کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں شب و روز صحرانوردی میں مشغول ہوں کہ ازلی غریب الوطن ہوں۔ دنیا میں آتے ہی مسافر بنا اور دشت و جبل کی خاک چھانتا پھرا، حتیٰ کہ کبھی وطن کی خاکِ پاک کو بوسہ نہ دے سکا۔

میں آسمان کے آغوش سے مثلِ برقِ بلا ابل کر نکل آیا۔ کبھی یہاں تڑپا کبھی وہاں چمکا۔

بانسری کی لے سُنکر ننھا سا ہرن اپنی ماں کی ممتا بھلا کر جس راہ پر چل نکلتا ہے۔

جھرنے کے دائمی ترانے سُننے کو خرگوش جس سمت بھاگ نکلتا ہے۔

بُلبل جس نوا کو سُنکر دیوانہ وار اپنے نازک پر تولنے لگتا ہے۔

بادل جس پکار کو سُنکر سمندر کی اُلفت کو فراموش کر دیتا اور آسمان کی طرف لپکتا ہے۔

بس، اُسی پکار کو سُنکر اُسی رستہ پر میں بھی چلا جا رہا ہوں، جنگل، پہاڑ، آبادی اور ویرانے پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر میں اپنی منزلِ ناتمام کی طرف بھاگ چلتا ہوں۔

میں بھی گویا شہابِ ثاقب ہوں، ستاروں کی محفل تک پہونچنے کا زینہ ہوں۔ نہ معلوم کہاں بہا جا رہا ہوں! انسان میرے ساحل پر اپنے آشیانے بناتا اور سمجھتا ہے کہ یہ تنکے میری موجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

دوشیزاؤں کے گروہ میرا پانی صُراحیوں میں بھر کر لے جاتے اور میرے سینے کے اندر چتونوں کی کمند ڈال کر میرے جذبات کی لہروں میں ہیجان برپا کر دیتے ہیں۔ انہوں نے صرف میرے پانی کی شیرینی کو چکھا ہے، یہ نہیں دیکھا کہ میرے ساحل کے دونوں طرف مرگھٹ کی آگ سُلگ رہی ہے، جس میں ارمانوں کے لاشے خاک سیاہ ہو رہے ہیں۔

مجھ بدنصیب کو اب تک نہ معلوم تھا کہ زندگی کا جوہر اسی روانی میں پوشیدہ ہے۔

میرے کنارے کے ہر گھاٹ پر گھنگھرو کی جھنکار سُنائی دیتی ہے اور حسینوں کا خرامِ ناز لہروں کے گیت سے گیت ملا کر فضا کو مترنم کر دیتا ہے۔

گڈریا ساحل کے پاس ایک درخت کے سائے میں بیٹھا بانسری کی تان اُڑا رہا ہے۔ چاند آسمان پر جلوہ افروز ہو کر میرے سینے کی آرسی میں اپنا مُنہ دیکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں — خوب سمجھتا ہوں کہ میرے دونوں کناروں پر فریبِ حُسن کا جال بچھا کر وہ

میرے دلِ بے قرار کو مسحور کر لینا چاہتا ہے۔ اُدھر دیہات کی کچھ کافر اداؤں کا اصرار ہے "ملے ذری ٹھہر جاؤ! ہم ایک نہر کاٹ رہے ہیں" جا رہا ہوں —— عدم کی طرف یا دوام کی طرف؟ کیا معلوم! بس اتنا دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں حسینوں کے غول میرے ساحل پر جمع ہو کر دلنشیں نغمے چھیڑ دیتے ہیں۔ کہیں کوئی حُسن کی دیوی بناؤ سنگار کئے ناؤ پہ سہمی سہمی بیٹھی ہے جس کی پتوار سے مجھے ایسے ٹہوکے دئے جاتے ہیں کہ لہروں کا سینہ پھٹ جاتا ہے۔

ان نادان لہروں کو دیکھو، کس ایمانِ راسخ سے میرے قدموں کو چُوم رہی ہیں۔ افسوس میری گردشِ رفتار اور انتشارِ قلب کا احساس اُنہیں نہیں ہے۔

آدھی رات کے وقت عشق کے دیوتا کی پُجارن سب کی آنکھیں بچا کر میرے ساحل پر پناہ گزیں ہوتی ہے۔ میری لہریں ایک دوسرے کو کُہنی مار کر کِھلکِھلا کر کہتی ہیں "ہم پہچان گئے! اری جوگن! تو گھر بار چھوڑ کر ندی کی عمیق گہرائیوں میں سُکون ڈھونڈنے آئی ہے!"

دُنیا سے مُنہ موڑ کر اُس بے وفا کی تلاش میں وہ میرے پاس آئی تھی —— اور وہ دیکھو میں اُسے اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہوں اور پھر اپنی راہ پر روانہ ہو جاتا ہوں۔ ماضی کا افسانہ ریت پر لکھا جاتا ہے جسے مستقبل آنِ واحد میں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔

جانے وہ کون سی کشش ہے جو مدّعا اور مقصود سے بے نیاز بنا کر مجھے یوں کھینچے لئے جاتی ہے اور راہ جتنی طے ہوتی جاتی ہے، منزل بھی اتنی ہی دُور تر ہوتی جاتی ہے۔ تاہم میں پیچھے پھر کر نہیں دیکھتا اور یہ مقناطیسی کشش مجھے کھینچے لئے جاتی ہے اور موجوں کا ترنّم اُن سے ہم آہنگ ہو کر کہتا ہے "چل چل، چل چل!"

شام کو گنبے کے سب لوگ واپس ہو جاتے ہیں اور اپنی یاد دلانے کے لئے مرگھٹ میں کچھ مُرجھائے ہوئے پھول چھوڑ جاتے ہیں۔ اور آہ! میں اپنے ساحل پر جلنے والی لاش کی خبر گیری کے لئے تنِ تنہا رہ جاتا ہوں۔ ہوا جو چٹکیاں لیتا ہے تو سینہ سے بے اختیار شیون کی صدا بلند ہوتی ہے مگر اس خموش فریاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اے نادان! چل، جلدی چل! ابھی تک تُو نہ سمجھا تھا کہ تجھ میں جو کیچڑ اور گندگی حلول کر گئی ہے، وہی تجھے مضطرب کئے ہوئے ہے۔ آنسوؤں کی بوندیں اُسے پاک کر دیتیں۔ اے مُسافر! چل وہ دیکھ سمندر تیرا منتظر ہے جسے آنسوؤں کی نمکین بوندوں نے ایسی وُسعت بخشی ہے کہ وہ آسمانوں سے ہم آغوش ہے۔

—— اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے

بادۂ سرجوش

اوہام و یقین میں فرق کر دے ساقی!
انساں کو بیدار کر دے ساقی!
آزادیٔ ذہن از رسم و آداب و اللہ
اس وسوسے کو اٹھا کے ان میں غرق کر دے ساقی!

دیکھا ہے کسی نے پیر دوراں کا شباب ساقی!
اس دور میں آیا ہے اس کا باب اے ساقی!
... عقل ... کی ہیں
دنیا کیا شے ہے اور فصل شراب اے ساقی!

باغوں پہ وہ چھا گئی جوانی ساقی!
سنکی وہ ہوا سے زندگانی ساقی!
ہاں جلد انڈیل جلد بہتی ہوئی آگ
آیا وہ برستا ہوا پانی ساقی!

میداں میں ہیں چھینٹے پڑ رہے بادل ساقی!
پیتے ہے رعد کی چھاگل ساقی!
بجنے ہی پیالے زریں میں شراب
بھر دے مرے پیمانۂ تعمیل اسکی کر ابھر جل تھل ساقی!

جوش ملیح آبادی

افلاطون کا نظریۂ سیاست

افلاطون کا شمار دُنیا کے اُن خوش قسمت افراد میں ہے جن کی شہرت کو قدرت نے بقائے دوام کی نعمت سے نوازا ہے۔ یونان کی خاک نے جن جواہر کو اُگلا ہے، اُن میں افلاطون ایک ایسا لعلِ تابناک اور گوہرِ شب چراغ ہے، جس کی ضوفشانیاں غیر فانی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک صفحۂ کائنات پر "عدل و خیر" کا کوئی دُھندلا سا نقش بھی باقی ہے، افلاطون کو دُنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ ہومر کو دُنیا بھول جائے، فیثاغورث کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے، اُقلیدس کی شہرت کے خطوط مٹ جائیں۔ لیکن افلاطون کی شہرت کے نقوش لوحِ کائنات سے محو نہیں ہو سکتے۔ افلاطون کی اس عالمگیر ہر دلعزیزی اور پائیدار شہرت کا باعث اس کے محض اعلیٰ ترین فلسفیانہ خیالات نہیں ہیں، بلکہ اس کے ضمیر کی پاکیزگی اور اس کے خیالات کی صفائی ہے۔ وہ ~~تعقل و تدبر کے بل بوتے پر اسرارِ کائنات کو بے نقاب کرنے کی سعی نامشکور میں مصروف نظر نہیں آتا، اجرامِ سماوی اور طبقات الارض کی تحقیقات اس کا مطمحِ نظر نہیں، حرکت و نمو کے اصول کی تدوین اس کا کام نہیں، اس کے نزدیک یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔~~ کیونکہ اس کے خیالات و محسوسات کا محور "انسانیت" اور صرف "انسانیت" ہے۔ افلاطون عدل و خیر سے دُنیا کو بھر دینا چاہتا ہے۔ اس کا ہر خیال انسانیت سے اپیل کرتا ہے، اور اس کے فلسفہ کی ہر تان "اخلاق" پر آکر ٹوٹتی ہے۔ افلاطون کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اس کے شرف و مجد کی ضامن اور اس کی لازوال شہرت کی ذمہ دار ہے۔

دُنیوی اکتشافات اور مادی تحقیقات غیر مستحسن افعال نہیں ہیں لیکن ایک ریسرچ (research) کے ماہر سے اُس شخص کا درجہ بہت بلند ہے جو فلسفۂ اخلاق کا معلم ہے۔ اکتشافات اور تحقیق خارجی طور پر انسانی آبادی کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں، لیکن چہرۂ انسانیت ان غازوں سے جِلا نہیں پا سکتا۔ دلدل اور گرمی، ٹھنڈک اور موسموں کے اختلافات کا وقوف، چاند کی نامعلوم دُنیا کی سیر، ثوابت و سیارگان کی جسامت و حرکت کا علم، یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر یقیناً قابلِ قدر ہیں مگر اخلاقی اُصول کی تدوین کا درجہ ان سے بہت بلند ہے، بات یہ ہے کہ اخلاق، انسانیت کو سنوارتے ہیں، انسان کی زندگی اُن کے ذریعے مکمل ہوتی ہے، مگر مادی تحقیقات و اکتشافات سے تکمیلِ انسانیت میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ ایک شخص زمین کے طبقۂ آخر کا پتہ لگا چکا ہے، ہواؤں کے اہتزاز، سمندر کے تموج، چاند کی کشش اور بھاپ کی طاقت کی تمام جزئیات اُس پر منکشف ہو چکی ہیں، لیکن اُس کے اخلاق اچھے نہیں ہیں، تو یقین جانیئے کہ اُسکے تدبر و تعقل کی تمام قوتیں بیکار گئیں اور ایک صاحبِ عقل کی نظر میں اُس کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کا اوّلین فریضہ انسانیت کی تکمیل ہے، اس فرض کو پورا کرنے کے بعد وہ خارجی اشیاء کی تحقیقات کے میدان میں سرگرمِ عمل ہو سکتا ہے، مگر تکمیلِ انسانیت جیسے عظیم الشان اور اہم ترین کام کو چھوڑ کر خارجی سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا، انسانی پستی اور روحانی کمزوری کی دلیل ہے۔

قوم افراد سے عبارت ہے، جس قوم کا اخلاقی نظام بہتر اور مفید ہو گا، اُس قوم کے افراد میں بھی کسی نہ کسی حد تک انسانی محاسن کی جھلک پائی جائے گی، اور انسانی نقطۂ نگاہ سے ایسی قوم کو "ترقی یافتہ" کہا جائے گا۔ قوم و ملک کو سیاسی طور پر ایک

نظام میں منسلک کرنے کے لئے ایک ایسے ہمہ گیر قانون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو افراد کے حقوق و مفاد کی صیانت کر سکے، اور ان کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے۔ جس ملک کا سیاسی نظام بہترین اخلاقی اصول کے تحت مدون ہوگا، اس ملک میں خوشحالی اور اطمینان و آسائش کی بہتات ہوگی، زندگیاں امن و راحت سے بسر ہوں گی، مفیان و فساد کے مواقع کم ہوں گے، غیر آئینی کارروائیاں بہت کم ظہور پذیر ہوں گی، سیاسی اصطلاح میں ایسے ملک کو "خوشحال ملک" اور اس کے باشندوں کو "امن پسند" کہا جائے گا ۔۔۔۔ پس جس ملک میں بے چینی اور اضطراب کے آثار پائے جائیں، سمجھ لینا چاہیے کہ اس ملک کا سیاسی نظام بہتر اصول کے تحت مرتب نہیں کیا گیا، افراد کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں، جماعتوں سے مناسب طریقے پر حکومت نہیں ہوتی اور اعلیٰ طاقت اپنے ذاتی مفاد کو ملک کے مفاد پر ترجیح دیتی ہے۔ افلاطون نے ملک و قوم کی اسی شدید ضرورت اور سیاسی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے "ریاست" کا ایک ایسا خاکہ مرتب کیا جو عدل و اطمینان کا مرکز و منبع ہے۔

افلاطون نے اپنے ریاستی نظام کو تین دفعات پر تقسیم کیا ہے، اور وہ دفعات یہ ہیں (۱) عدل (۲) تعلیم (۳) معیشت۔ ہم ان دفعات پر قدرے تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ افلاطون کے "ریاستی نظام" کا ایک دھندلا خاکہ آپ کا تصور مرتب کر سکے۔

افلاطون، عدل کو ریاست کا جزو لاینفک سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل کے بغیر کوئی ریاستی نظام مکمل نہیں ہو سکتا۔ اُسکے خیال میں روح، عدل سے محروم ہو کر حقیقی مسرت حاصل کر ہی نہیں سکتی۔ عام طریقے پر لوگوں کا خیال ہے کہ ظالم اور جابر شخص، وقتی طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ عادل شخص کے مقابلہ میں زیادہ عاقل ہوتا ہے، مگر افلاطون کے زاویۂ نگاہ سے اگر ظالم و عادل کا مقابلہ کیا جائے تو ظالم اپنے تمام طاغوتی قوتوں کے باوجود ناکام اور غیر دانشمند نظر آئے گا۔ عوام کا خیال ہے کہ عدل کوئی خارجی چیز ہے، مگر افلاطون نے اس چیز کو ثابت کر دیا ہے کہ عدل روح کی ایک "داخلی صفت" ہے۔ عدل کو روح کی داخلی صفت بنانے کے بعد وہ "عدل" کو کُل کا جزو ثابت کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں افلاطون محافظ یا حکمران کی قابلیت کا تعین کرتا ہے کہ اُسے "عدل و خیر" کی تمام باریکیوں اور خصوصیتوں سے کماحقہٗ واقف ہونا چاہیے۔ اس کے خیال میں جو شخص "خیر" سے ناواقف ہے وہ حسن و عدل کا محافظ برائے نام ہے۔ ریاست کے محافظ یا حکمران کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "فلسفی ہی حقیقتِ ابدی کو پا سکتے ہیں، اور وہ فلسفی جو ہمارے قوانین و تنسیقات کی بہتر حفاظت کر سکے بس اسی کو ہم اپنا محافظ بنائیں"۔

ہمارے مدبر فلسفی کے خیالات کا محور صرف "عرفان و خوبی" ہے، وہ دنیا کی تمام نعمتوں کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہے۔ اُسکے خیال میں دنیوی مال و زر ٹھیکریوں سے زیادہ بے قیمت ہے۔ حقیقی دولت "عرفان و خوبی" کی دولت ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اُس کا خیال یہ ہے:۔

"دولت مند لوگوں کو حکومت کے فرائض سپرد کر دینے چاہئیں۔ لیکن دولت مندوں سے مراد "سیم و زر" کے مالک نہیں، بلکہ وہ جو "خوبی و عرفان" کی دولت سے مالا مال ہیں، کہ یہی زندگی کی سچی تحسین ہے"۔

حکومت کے محافظین کی خصوصیات

افلاطون نے اگرچہ بادشاہ کا لفظ محافظ و نگرانِ ریاست کے لئے استعمال کیا ہے، مگر فی نفسہٖ وہ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ریاست کی باگ ڈور دینا نہیں چاہتا، وہ ایک ایسی جمہوریت کا طالب ہے، جس کا ہر فرد اپنی جگہ پر عدل و خوبی کے ساتھ اپنے مفوضہ کام کو انجام دیتا ہو اور دوسرے کے کام میں دخل اندازنہ ہوتا ہو، عام طور پر وہ حکومتیں، جن کی عنان جابر بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہاں دُنیوی اعزاز و شکوہ کے۔ "کھ رکھاؤ" کی خاطر، تحفظِ امن کے نام پر، نہایت آزادی کے ساتھ عدل کا خون کر دیا جاتا ہے، ملک و شہر کی تنظیم میں ایسے حکمران افراد کے مفاد سے زیادہ اپنے مفاد کا خیال رکھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام مضطرب ہو جاتے ہیں اور ملک کے طول و عرض میں بے چینی کی ہولناک لہر پیدا ہو جاتی ہے، ریاست اور اس کے محافظین کی اس صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے افلاطون ایک بڑا ہی مفید و کامیاب نظریہ پیش کرتا ہے۔

"ریاست میں حقیقی فلسفی بادشاہ پیدا ہوں، اور ایک یا کئی ایسے بادشاہ جو موجودہ دُنیا کے اعزازوں کو ذلیل اور بے وقعت جانکر ٹھکرا دیں۔ حق اور حق سے پیدا ہونے والی عزت کو سب سے بالاتر سمجھیں، اور عدل کو سب سے اعلیٰ اور سب سے ضروری چیز خیال کریں، اسی کے کارگزار ہوں اور اپنے شہر کو منظم کرنے میں اسی کے اصولوں کو بلند کریں"

افلاطون، اتحاد و یک جہتی کو ریاست کے بقا کے لئے اہم ترین عنصر سمجھتے ہوئے سرمایہ داروں کا دشمن ہے، کیونکہ جب لوگ کسی شخص کی محض اس کے تمول کے سبب عزت کریں گے تو عزت و احترام کے خرمن کا ایک خوشہ بھی ان لوگوں کے حصہ میں نہ آئیگا جو دولتمند نہیں ہیں۔ مگر نیک اور شریف ہیں، اس صورت میں شرافت و خوبی کی توہین ہوگی اور ذلیل سرمایہ داروں کو عروج حاصل ہوگا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام، شرافتِ نفس اور عزتِ ضمیر سے بے اعتنائی برتنے لگیں گے اور حصولِ زر کے لئے اپنی تمام کوششوں کو صرف کر دیں گے۔ پس ایسی صورت میں شرافت اور نیکی جیسی نعمتوں سے لوگ خود کو محروم کر لیں گے اور ملک میں عام ابتری پیدا ہو جائے گی۔ حکمران قوت کے سیاسی استحکام اور سرمایہ داری کی خرابیوں کی ان نوعیتوں پر بحث کرتے ہوئے، افلاطون کہتا ہے۔

"سیاسی تبدیلیاں واقعی حکمران قوت میں مناقشہ سے پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ جو حکومت متحد ہے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، اُسے کوئی ہلا نہیں سکتا۔ جس نسبت سے دولت اور دولتمند لوگوں کی ریاست میں عزت ہوگی، اُسی نسبت سے نیکوں کی بے عزتی ہوگی"

اعتدال کی خوبی

دُنیا کا کوئی نظام اُس وقت تک باقی نہیں رہ سکتا، جب تک کہ اُس میں اعتدال کا عنصر موجود نہ ہو، اعتدال، وجود کے بقا کا ضامن ہے، جب کبھی کسی نظام میں ابتری دیکھو تو فوراً سمجھ لو کہ اُس نظام کی داخلی و خارجی حالت حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گئی۔ بارش، کھیتوں کے حق میں "امرت" ہے، مگر جب کبھی وہ اعتدال سے گذر جاتی ہے تو یہی "امرت" "زہر" بن جاتا ہے۔

زمین کے اندرونی طبقات کے بخارات جب غیر معتدل ہو جاتے ہیں تو زمین کی طنابیں کپکپا اُٹھتی ہیں۔ غرض دُنیا میں جتنی تباہیاں آتی ہیں اُن کے اسباب "حدود اعتدال سے تجاوز" ہوتے ہیں۔ پس ریاستی نظام میں بھی اعتدال کا ہونا از بس ضروری ہے۔ اسی چیز کو افلاطون اس طرح بیان کرتا ہے۔

"ہر چیز کی حد سے زیادتی اکثر بالکل مخالف سمت میں ایک ردِّ عمل پیدا کرتی ہے، اور یہ بات صرف موسم یا نباتی و حیوانی زندگی تک ہی محدود نہیں، بلکہ سب سے زیادہ یہ اقسام حکومت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔"

جمہوریت کا وجود

وہ دو اشخاص جن کے مفاد ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں، اس نظریہ کے تحت ایک سرمایہ دار، ایک غریب شخص کا۔ اور ایک ظالم بادشاہ، مظلوم رعایا کا دشمن ہے۔ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ایک دشمن دوسرے دشمن پر غلبہ پانا چاہتا ہے، اور ہمیشہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ مخالف کے عزائم کو خاک میں ملا دے، اسی طرح غریب لوگ، سرمایہ داروں اور ظالم حکمرانوں کے خلاف ہمیشہ سازشیں کرتے رہتے ہیں، بادشاہ کا مقصد اپنی "شخصی سطوت" کا تحفظ اور رعایا کا مدعا عمومی طور پر مُلک کے مفاد کی صیانت و نگہداشت ہوتی ہے، یہ دونوں مقاصد ایک دوسرے سے مختلف و مغائر ہیں۔ پس رعایا اور بادشاہ میں جنگ ہوتی ہے، اگر بادشاہ غالب آ جاتا ہے تو رعایا کی غلامانہ زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اگر رعایا کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو فرمانروا کی مطلق العنانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور شخصی حکومت کے بجائے "جمہوریت" یا "رائے عامہ" کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ جمہوریت کی بہت سی اقسام ہیں۔ افلاطون نے صرف عمومی طور پر یہ بتایا ہے کہ جمہوریت کس طرح وجود میں آتی ہے۔

"جب غریب لوگ اپنے مخالفوں پر فتحیاب ہو جاتے ہیں، کچھ کو قتل اور کچھ کو جلا وطن کر چکتے ہیں اور بقیہ کو آزادی اور اقتدار کا مساوی حصہ دیتے ہیں تو اُس وقت جمہوریت وجود میں آتی ہے۔ یہ حکومت کی وہ قسم ہے جس میں حکام اور عہدہ دار قرعہ اندازی (سفیربعزم) سے منتخب کئے جاتے ہیں۔"

نظامِ تعلیم

کسی چیز کے جاننے کو "علم" کہتے ہیں، ایک شخص پودوں کی ماہیتوں سے واقف ہے، تو اُس کو "نباتات کا عالم" کہا جائیگا۔ علم کا مقصد خواص اشیاء کی ادراک و معرفت ہے، جو شخص جس شے کی ماہیت کا جتنا زیادہ علم رکھتا ہے، اُسی قدر وہ اُس چیز کا زیادہ عالم کہلائے گا۔ عالم اور جاہل میں "جاننے" اور "نہ جاننے" کا فرق ہے۔ عالم کو جاہل کے مقابلے میں اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ جس چیز کے خواص کا علم رکھتا ہے، اُن سے مستفید بھی ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص "زعفران" کی ماہیت سے ناواقف ہے، اب اگر اُس کو "زعفران" کی پتیاں کہیں مل جائیں تو وہ اُن کو گھاس پھونس سمجھ کر پھینک دیگا۔ لیکن دوسرا آدمی جو "زعفران" کے خواص سے باخبر ہے، اُن پتیوں کی قدر کرے گا اور اُن سے فائدہ اُٹھائے گا۔ یہ تو مادی اشیا کا حال ہے۔ اخلاقی

دُنیا میں بھی یہی قانون جاری و ساری ہے۔ یعنی جس شخص کو "خیر و صداقت" کا زیادہ علم ہوگا، وہ اُتنا ہی اپنی ذات اور عام انسانوں کے لئے مُفید ثابت ہوگا۔ لہذا افلاطون کے نزدیک علم کا مقصد "عین خیر" تک پہونچنا ہے، پس وہ فلسفی اور محافظ جو "عین خیر" تک پہونچ چکا ہو، اُس کے ہاتھوں "ریاست" کا نظام بہترین حالت میں رہ سکتا ہے۔

افلاطون چاہتا ہے کہ بچے کی تربیت آغوشِ مادر ہی سے بہتر حالت میں کی جائے۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں یا انائیں، بچوں کو ایسے قصے کبھی نہ سُنائیں، جو مُبالغہ آمیز ہوں۔ کیونکہ ایسی باتیں سُنتے سُنتے بچوں کو مُبالغہ اور جھوٹ کی عادت ہوجائے گی نیز بھوت پریتوں کی کہانیاں بھی بچوں کو نہ سُنائی جائیں، کہ اُن کو سُنکر نازک دلوں پر خوف و رُعب طاری ہوجائیگا اور فطری مردانگی کا جذبہ اپنی پوری قوت کیساتھ نہ اُبھر سکے گا۔

افلاطون ذہنی اور دماغی قوتوں کی نشو و نُما کے ساتھ ساتھ جسمانی قوا کی نگہداشت کو بھی ضروری سمجھتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ طلبار کو محض خشک فلسفی اور اکھڑ سپاہی بنانا چاہتا ہے، اس خشکی اور خشونت کو دُور کرنے کے لئے "موسیقی" کو بھی اُس نے تعلیم کا ایک جزو قرار دیا ہے، تاکہ سیرتِ انسانی کا ہر جُز و پایۂ تکمیل کو پہونچ سکے۔ افسوس ہے کہ "شاعری" کو اس نے اپنے نظامِ تعلیم میں کوئی خاص درجہ نہیں دیا۔ اور اس خصوص میں افلاطون سے فی الواقعی لغزش ہوئی ہے، جس پر ہم ایک مضمون میں کافی بحث کر چکے ہیں۔

افلاطون کا نظامِ تعلیم جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لئے ہے۔ جنگ آزماؤں کے لئے بچپن اور شباب کا زمانہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اور حکمرانوں کے لئے جوانی سے لیکر بُڑھاپے تک کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ جنگ آزماؤں کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ریاست کی حفاظت کے لئے شہری، بطور سپاہی کے تیار ہوجائیں اور دوسری شق کا منشا یہ ہے کہ شہریوں میں سے ہی چند لوگ "کامل محافظت" یا حکمرانی کے اہل بن جائیں۔ افلاطون، تعلیم کے لئے بہترین وقت "شباب" سمجھتا ہے کہ اس عہد میں انسانی قوا، اپنی پوری طاقت پر ہوتے ہیں، اور اُن کو حرکت میں لانے کا یہی زمانہ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے:۔

"سولن، مُبتلائے توہم تھا جب اُس نے کہا کہ آدمی بوڑھا ہوکر بہت سی چیزیں سیکھ جاتا ہے، حالانکہ جس طرح وہ بوڑھا ہوکر زیادہ دوڑ نہیں سکتا، ویسے ہی زیادہ سیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہر غیر معمولی محنت کا وقت شباب ہی ہے۔ لہذا شمار و ہندسہ اور تمام وہ دیگر عناصر تدریس جو منطق کی بُنیادیں ہیں، یہ سب بچپن ہی میں دماغ کو پیش کر دینے چاہئیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے نظامِ تعلیم کو بجبر عائد کرنے کا خیال نہ پیدا ہو"

علم الحساب کی اہمیت

شعرار کی طرح افلاطون نے خطابت اور خطیبوں کو بھی اپنے نظامِ تعلیم سے باہر کر دیا ہے۔ اُس کا نظام پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔ (۱) علم الحساب۔ (۲) علم الاشکال۔ (۳) ہیئت۔ (۴) موسیقی۔ (۵) فلسفہ۔ افلاطون کے خیال میں سپاہیوں کو بھی علم الحساب کا جاننا ضروری ہے۔ اس ضمن میں اُسکے ارشادات یہ ہیں:۔

"محافظین ریاست یعنی سپاہیوں کو علم الحساب بھی جاننا چاہیئے۔ لیکن علم الحساب محض شوقیہ مُبتدیوں کی طرح

دیکھیں، بلکہ اس وقت تک اس کا مطالعہ جاری رکھیں جب تک صرف ذہن سے وہ ماہیتِ اعداد کو نہ دیکھ لیں۔"

افلاطون کی اس تصریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "ماہیت و حقیقت" کا کس قدر دلدادہ ہے، اور ہر مضمون و علم کے ذریعے "حقیقت و ماہیت" تک پہونچنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے :۔

"علم الحساب نہایت عظیم الشان اور رفعت بخش اثر رکھتا ہے، یہ روح کو مجرد اعداد کے متعلق توجیہ و تعقل پر مجبور کرتا ہے، اور جہاں کہیں دلیل میں مرئی یا محسوس چیزیں داخل ہوئیں بگڑ بیٹھتا ہے۔ علم الحساب کا ماہر، وحدت کو وحدت رکھنا چاہتا ہے، اور وحدتِ مطلقہ کو تقسیم کرنے کی جو کوشش کرتا ہے تو اس کی ماہرین علم الحساب ہنسی اڑاتے ہیں۔"

سپہ سالار کی خصوصیات

ایک سپہ سالار کے لئے محض بہادر اور تنومند ہونا ہی کافی نہیں، بلکہ فلسفۂ جنگ اس سے زیادہ کچھ اور اوصاف کا اس سے مطالبہ کرتا ہے، یعنی اس کو فوجی پڑاؤ کے لئے زمین کی موزونیت اور عدم موزونیت سے واقف ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ صفوں کی درستی اور یکرنگی پر بھی اس کی نظر ہونی چاہیئے۔ ساتھ ہی اس کو موسموں کے حالات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ کوئی سپہ سالار خواہ کسی قدر بہادر کیوں نہ ہو، اگر اس کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہے تو وہ فوجوں کو کامیاب طریقے پر نہیں لڑا سکتا۔ بہادری اور طاقت کا مصرف اگر ٹھیک طور پر نہ کیا جائے تو کامیابی نہیں ہو سکتی جیسے محمد تغلق نے چین فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کر دی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ قریب قریب ساری فوج پہاڑوں اور برفستان کی سختیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ تغلق کے سپاہی بہت بہادر اور جانباز تھے، مگر ان کی بہادری آخر پہاڑوں کی مہیب چٹانوں، راستہ کی سختیوں اور موسم کی شدتوں سے کیسے ٹکر لے سکتی تھی۔ سپہ سالار کی اسی خصوصیت کو افلاطون اس طرح بیان کرتا ہے :۔

"پڑاؤ ڈالنے، موقع اختیار کرنے، فوج کی صفوں کو مجتمع کرنے، یا وسعت دینے، کسی دوسری فوجی حرکت میں، خواہ اصلی معرکۂ جنگ میں ہو، یا فوجی نقل و حرکت میں، بہت بڑا فرق پڑیگا۔ کہ آیا سپہ سالار مہندس ہے یا نہیں!

سپہ سالار کے لئے ہیئت داں ہونا بھی ضروری ہے، کہ وہ موسموں اور ماہ و سال کا مشاہدہ کرے۔ جس قدر کسان اور جہاز ران کیلئے اس علم سے واقف ہونا ضروری ہے، اتنا ہی سپہ سالار کیلئے۔ اس علم کا وقوف ضروری اور لابد ہے۔"

ایک عجیب نظریہ!

قانون سازی اور اس کا نفاذ، قیامِ عدالت اور پولس کا رکھنا، ریاست کے اہم کاموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر افلاطون اپنے تعلیمی نتائج کو اس قدر مکمل اور صحیح سمجھتا ہے کہ ان کاموں کی ریاست کے لئے ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ افلاطون ریاست کو "خیر مطلق" سے بھر دینا چاہتا ہے کہ برائی اور گناہ کا کوئی نقش بھی باقی نہ رہے اور افراد کسی برائی کا تصور بھی نہ کر سکیں، جب برائی کا وجود نہ ہوگا تو احتسابی محکموں کی ضرورت خود بخود مٹ جائے گی، اور ریاست کا بہت بڑا کام کم ہو جائیگا۔ افلاطون کچھ اس درجہ "خیر و عدل" کے نشہ میں چور تھا کہ وہ اپنے نظامِ ریاست کے نفاذ کے بعد جرائم و معاصی کے ارتکاب کو ناممکن سمجھتا ہے۔

حالانکہ دُنیا کی تاریخ کسی ایسے عہد کو پیش نہیں کرسکتی کہ کسی انسانی آبادی پر "خیر و عدل" نے اس قدر اپنا اثر ڈالا ہو کہ جرائم پر احتساب کی ضرورت ہی داعی نہ ہوئی ہو — کوئی مُفید اور بہتر نظام، بُرائیوں کو کم تو کرسکتا ہے، لیکن اس کو مٹا نہیں سکتا۔

نظامِ معیشت

افلاطون نے جو معیشت کا اشتراکی نظام پیش کیا ہے وہ حکمرانوں اور سپاہیوں تک محدود ہے۔ یعنی وہ طبقہ جو محنت و مشقت کے ذریعے دولت پیدا کرتا ہے، اُس کو چاہیئے کہ وہ اپنی کمائی اور پیداوار کا اتنا حصّہ حکمرانوں اور جنگ آزماؤں کے حوالے کرے کہ اُن کی ناگزیر ضرورتیں پوری ہوجائیں۔ افلاطون یہ نہیں چاہتا کہ دولت آفریں طبقہ حکمرانوں اور جنگ آزماؤں کو روپے پیسے کی شکل میں تنخواہ دیا کریں، بلکہ اُس کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگ مل جُل کر ایک طرح کا کھانا کھائیں اور یکساں کپڑا پہنیں۔

افلاطون کے اشتراکی نظام کا جو ایک اجمالی خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے، اُس سے ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ داری (Capitalism) کا شدید ترین مخالف ہے، اور نہ صرف سرمایہ داری کا بلکہ صرفِ دولت میں بھی عمومیت اور اجتماعی شان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یعنی دولت کا مصرف کسی خاص شخص کے مفاد تک محدود نہ ہو۔ بلکہ دولت کو عام مفاد پر صرف کیا جائے، اور اس "صرف" کی صورت اجتماعی ہونی چاہیئے۔

اشتراکِ املاک کے ساتھ افلاطون "اشتراکِ ازدواج" کا بھی زبردست حامی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد، عورتوں کو یکجا کر دیا جائے اور اُن کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو، اُس کو اپنے ماں باپ کا علم ہی نہ ہو۔ پھر ریاست ان بچّوں کو خود پرورش کرے، تاکہ ہر نئی نسل، پُرانی نسل کو والدین سمجھے، اور کسی شخص کی محبّت و عطوفت کا مرکز کوئی خاص بچہ نہ ہو۔ اس طور پر ملک میں محبت و ہمدردی کا ایک عام جذبہ پیدا ہوگا۔

زبردست غلطی

روس میں بھی ان دنوں افلاطون کی اس تجویز پر ایک حد تک غور کیا جارہا ہے، ازدواجی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور انفرادی ازدواج کو اشتراکی شکل دیدی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ افلاطون جیسے "خیر و صداقت" کے پرستار کو اس منزل میں پہونچکر زبردست ٹھوکر لگی، اور افرادِ "ریاست" کے مفادِ عمومی کی بے پناہ محبّت نے اُس کے ہاتھوں سے اعتدال کا دامن چھڑا دیا۔ افلاطون "جذبۂ محبت" میں ایک خاص عمومیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہونا منشائے قدرت کے خلاف ہے، پھر جو طریقہ کہ افلاطون نے پیش کیا ہے، اس صورت میں حکومت کا کام بہت کچھ بڑھ جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین کے سامنے ایک ایسا نظامِ تربیت پیش کیا جائے کہ وہ بہترین طور پر بچوں کی تربیت کریں تاکہ بچے "ریاست" کے لئے مُفید ثابت ہوں، اس کے ماسوا فرداً فرداً والدین اپنے بچوں کی "ریاست" کے "مجموعی نظام" کے مقابلے میں بہتر طریقے سے پرورش کرسکتے ہیں۔ اشتراکی ازدواج سے "اخلاق" کی جس قدر تخریب ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں عام محبت کا جذبہ

قوی ہوجائے، لیکن انسانوں کی ایسی جماعت اور کتوں کی ٹکڑی میں آخر کیا فرق باقی رہیگا؟۔

جدید اشتراک اور فلاطونی نظامِ معیشت کا فرق!

افلاطون کی ریاست میں سب سے بڑا درجہ نظامِ عدل وتعلیم کا ہے۔ نظامِ اشتراک کی حیثیت تو محض فرعی ہے، وہ خاندان اور املاک کے اشتراک کو اصولی حیثیت دینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ سب سے پہلا درجہ عدل وغیرہ کی نشرواشاعت اور محافظین اور جنگ آزماؤں کی تربیت ہے۔

آج کل معاشی زندگی میں اشتراک کو بہت کچھ اہمیت دی جاتی ہے مگر موجودہ اشتراکی نظام کو افلاطون کے نظامِ معیشت سے کوئی نسبت نہیں۔ افلاطون کا اشتراک صرف ایک ریاست کے لئے مخصوص ہے اور جدید نظامِ اشتراک پوری ہیئت اجتماعی کو اپنے گھیرے میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک، دولت اکٹھا کرنے کا سارا کام ریاست کو سونپ دینا چاہتا ہے، مگر افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی کا تعلق افرادی سے ہے۔ جدید اشتراک ہرفرد سے دولت آفرینی کا کام لیکر، دولت بڑھانا اور پھر اسکو سب پر مساوی طور پر تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ فلاطون کے نظام میں وہ طبقہ جس کے لئے اس نظام کی بنا ڈالی گئی ہے دولت آفرینی میں شریک ہی نہیں ہوسکتا۔ جدید اشتراک کی بنیاد صرف ایک معاشی مسئلہ ہے اور فلاطون کا مطمحِ نظر ایک اخلاقی مہم ہے، جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے اور افلاطون کا اشتراک، ترکِ دولت کا اشتراک ہے!۔

(ماخوذ از تحقیقِ عدل)　　منظور حسین ماہر القادری

تخیلات

وہ کیونکر جستجوئے سجدہ گاہِ دوجہاں رکھے
کہ جو اپنی نظر میں ایک تیرا آستاں رکھے

نمایاں خوب ہوجائیں یہ محفل سازیاں تیری
جو تو تصویر اپنی بھی سرِ بزمِ جہاں رکھے

کرشمے آپ خود دکھلائیے الطاف کے اپنے
نظر اپنی کہاں تک کوئی سوئے آسماں رکھے

یہ رشتہ ٹوٹنے والا ہے اک دن ٹوٹ جائیگا
کہاں تک کوئی فکرِ ارتباطِ جسم وجاں رکھے

حقیقت میں خموشی قابلِ افسوس ہے اُس کی
زباں ہوتے ہوئے جسکو محبت بے زباں رکھے

ارے صیاد گلشن میں نشیمن ہی نہ ہو جس کا
وہ کیونکر دل میں کچھ اندیشۂ برقِ تپاں رکھے

تری اُلفت ہمیشہ کاوشِ پیہم کا ساماں ہو
ترا سودا الٰہی زندگی بھر سرگراں رکھے

یہ کہکر زندگانی سے گذر جاتا ہوں اے حاجی!
کہانتک کوئی اب اُمیدِ مرگِ ناگہاں رکھے

حاجی سرحدی

حکیم قاآنی کے مذہب اور اخلاق پر ایک نظر

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ شاعر کا شعر اُس کے وارداتِ قلبی اور جذباتِ باطنی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میرا روئے سخن اِس وقت شعر و سخن کی اُن باکمال ہستیوں کی طرف ہے جن کا دل خلقتاً بادۂ الہام کا ساغر اور فطرتاً جذباتِ رُوحانی کا مّواج دریا ہے۔ حکماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ تخیل شعری وہی جذبۂ بے اختیاری ہے جس کا دوسرا نام الہام ہے اگرچہ یہ وہ الہام نہیں جس نے دُنیا کی اکثر برگزیدہ ہستیوں کے سر پر تاجِ نبوت یا امامت رکھدیا۔ یہاں الہام سے وہ فطری کیف مُراد ہے جو تاثراتِ قلبی سے لہر کی طرح اُٹھکر کبھی آنکھوں سے اشک بنکر برس پڑتا ہے اور کبھی زبان سے آہ بنکر گونج اُٹھتا ہے۔

وارداتِ قلبی خواہ شاعر کے ذاتی جذبات ہوں یا خارجی تاثرات۔ کوئی پھانس دل میں کھٹکتی ہے، کوئی ٹیس جگر میں ہوتی ہے، کوئی خیال دل میں چٹکیاں لیتا ہے، کوئی شوق پہلو کو گُدگُداتا ہے۔ کوئی ولولہ جسم کی رگوں میں خون بنکر دوڑتا ہے۔ غرضکہ کوئی نہ کوئی تلاطم دل کی دُنیا میں برپا ہوتا ہے اور ایک شعلہ دل سے بھڑک کر لب پر آتا ہے۔ یہی شعلہ جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شمع شعر و سخن بنکر بزمِ ادب کے پروانوں کو جلا ڈالتا ہے۔ شاعر نمائش گاہِ ہستی کے ہر ذرے سے کچھ سُنتا ہے، ہر ذرے سے کچھ کہتا ہے۔ اُسکا دل مثل سطحِ آب کے ہے جس میں ہوا کا ہر جھونکا، فضا کی ہر تحریک کوئی نہ کوئی لہر پیدا کر دیتی ہے اور وہ اُس اُٹھتی ہوئی لہر کو متلاطم کر کے سفینۂ ادب کے لئے ساحل رسی کا وسیلہ بنا دیتا ہے۔ وہ ایک آئینۂ مصفا ہے جس میں کائنات کی ہر شے کا عکس پڑتا ہے اور وہ ان انعکاسات کو شاعر کی ذاتی کائنات یا اُس کے فطری اختیارات کہہ سکے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو آئینہ کو عکس اور پانی کو لہر کہہ سکتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ شاعر کا ہر شعر اُسکے ذاتی اخلاق کا آئینہ ہے، صریح کم فہمی ہے۔ اُس کی فطرت ایک بیتاب جُستجو، ایک مضطرب تلاش ہے۔ وہ آسمانوں کی بلندیوں میں، دُنیا کی وسعت میں، خاک کے ذروں میں، پانی کے قطروں میں اور آسمانوں کے تاروں میں کچھ نہ کچھ ڈھونڈتا پھرتا ہے اور جو کچھ پاتا ہے دُنیائے ادب کی نظروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ وہ حقیقتاً پیغامبر ہے جو بجائے وحی کے ادبی جواہر پارے خریداروں کی ذوقِ نظر کی آزمائش کیلئے بازار میں لاتا ہے۔ اب میں اپنے فاضل ناظرین کی توجہ اُس شمعِ سخن کی طرف مبذول کرتا ہوں جسکی ہر چھوٹ نے خاک کے ذروں کو پروانہ بنا دیا۔

حکیم قاآنی دُنیائے شعر و سخن کی وہ بے نظیر ہستی ہے جس کی مثال سرزمینِ ایران آج تک نہ پیش کر سکا۔ وہ فطری شاعر تھا، محقق تھا، حکیم تھا، عارف تھا اور فنِ نجوم اور علم ہیئت میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی عربی اور ترکی زبانوں میں ماہر ہونیکے علاوہ فرانسیسی زبان میں بھی وہ پوری قُدرت رکھتا تھا۔ حیرت سے حیرت ہے کہ ایسی باکمال ہستی پر مسٹر براؤن مصنف لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے ایسے محقق کو لامذہبی اور بداخلاقی کا دھوکا ہوا۔ چنانچہ اسی تصنیف میں وہ رقمطراز ہیں :۔

"ندرتِ بیان اور جدتِ تخیل کے لحاظ سے حکیم قاآنی ایران کے شُعرائے متاخرین کا سرتاج ہے مگر بداخلاقی اور لامذہبی نے اُسکے مرتبہ کو ایسا گرا دیا جس کی کوئی حد نہیں۔ کوئی ایران کا شاعر اس درجہ بداخلاق اور لامذہب نظر نہیں آتا ہے"

حقیقتاً یہ دھوکا مسٹر براؤن کو شاعر کی فطرت کے مطالعہ میں ہوا۔ میں اپنی تمہید میں لکھ چکا ہوں کہ شاعر کا ہر شعر اُسکی

ذاتی اخلاق اور مذہب کی تصویر نہیں ہاں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ اُسکے اشعار اُس کے تاثرات قلبی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ تاثرات ماحول اور فضا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ تصویر میں حقیقت کا پورا رنگ بھر دے کہ مجاز اور حقیقت میں سرِ مو فرق نہ باقی رہے۔ تصویر کی نوعیت سے اُس کی ذات پر کوئی الزام وارد نہیں ہوتا۔ ہاں تصویر کے حُسن و قبح کا وہ ضرور ذمہ دار ہے۔ دُنیائے تنقید کو اس قدر حق حاصل ہے کہ اُس نے تخیل کی مکمل تصویر کشی نہیں کی۔ کوئی صاحبِ فہم یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ تصویر اُس کے اخلاق اور ایمان کا نمونہ ہے۔ اس قدر لکھنے کے بعد میں محقق مذکور مسٹر براؤن صاحب موصوف کے مذکورۂ بالا اعتراض کے ہر پہلو پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالتا ہوں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ حکیم قاآنی ایک لامذہب شخص ہے۔ تعجب ہے جس شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ، جس کی اکثر غزلیات، جس کے متعدد قصائد۔ حقانیت، نعت اور منقبت سے مالا مال ہیں اسکو لامذہب کہا جاتا ہے۔ حالانکہ چشمِ بصیرت شاہد ہے کہ اُسکے کلام میں جابجا "لامعبود الا اللہ" اور ایزد یکتا کے ایسے الماس پارے جابجا چمک رہے ہیں اور اپنی زبانِ بے زبانی سے اُسکے موحد اور عارفِ باللہ ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

زدہ در وحشت لا خر گہہ کہ لا معبود الا اللہ ‌ ‌ ‌ ‌ زکاخ نفی جستہ رہ بخلوت گاہِ استثنا

زمیں گو نیست در پیش فلک نیرے است در دستش ‌ ‌ ‌ ‌ دوتا چوں آسماں پشتش بہ پیشِ ایزد یکتا

اسلام کے فخرِ عالم پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ کی نعت اور ان کی عترت طاہرین کی منقبت میں جس جوش اور خلوص کا اظہار کیا وہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکیم موصوف پیغمبر اسلام اور ان کی عزت کا سچا پیرو اور حقیقی مرتبہ شناس تھا۔

دوسرا اعتراض اور بھی حیرت ناک ہے، وہ یہ کہ حکیم موصوف ایران کے شعرا میں سب سے زیادہ بداخلاق تھا۔ یہ دھوکا سادہ لوح محقق کو اپنی غلط فہمی سے ہوا۔ اس نے ان اشعار کو جو بادہ و جام کے ذکر سے چھلک رہے تھے، جو مے و میخانہ اور جذباتِ رندانہ سے لبریز تھے، اسکی میخواری کی دلیل سمجھ لیا۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام صفحہ ۱۰۸۵ میں حکیم موصوف کے بارے میں صرف اسقدر نظر آتا ہے: "وہ افیون کا عادی تھا مگر اُس کا دامنِ عصمت داغِ عیاشی سے پاک و صاف تھا" اسکے علاوہ مقدمہ کلیاتِ قاآنی جو بی۔ اے آنرز کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے صفحہ ۲ میں یوں لکھا ہے: "علاوہ بریں مقتضائے زمانے و کسانے کہ حکیم در آں بود ہمعصر آنہا گردیدہ و مذاق آنہا را بنداشتہ جز آں چارہ نبود کہ گاہے ازیں گونہ مطائبات را ہم بر رشتۂ نظم در آرد"

اس قدر اسنادِ معتبرہ کے بعد کوئی بافہم ذی ہوش انسان کہہ سکتا ہے کہ حکیم موصوف کا دامنِ اخلاق گردِ معاصی سے آلودہ تھا۔

یہ تقاضائے عصر اور ضرورت ماحول تھی جس نے اُسے مجبور کیا کہ وہ اس صنفِ سخن میں اپنے کمالات کو دکھائے اور اس میدان میں بھی یکہ تازِ سخن اور شہسوار معرکۂ ادب بنکر نکلے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی فردوس نظر بہار وہاں کے گلہائے نورس کا دلآویز جمال، وہاں کے عنادل کے نغمۂ بے مثال، وہ پُرکیف سماں، وہ پُر لطف فضا اسکی متقاضی تھی کہ اگر میری تصویر کشی کی جائے تو چمن کے گوشے گوشے میں بادۂ گلفام کا چرچا ہو۔ عمر خیام اور حافظ شیرازی کی ایسی پاکیزہ ہستیاں جو تصوف کا ستونِ محکم تھیں، وہ بھی بادۂ ناب کی دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ بلکہ تمام شعرائے ایران تو ہدفِ ملامت نہوں مگر بیچارہ قاآنی نشانۂ الزام قرار پا جائے۔ عمر خیام کی رباعی ملاحظہ ہو۔

گویند کہ ماہِ روزہ نزدیک رسید ‌ ‌ ‌ ‌ من بعد بگرد بادہ نتواں گردید

در آخرِ شعبان بجزم چنداں مے　　　　کہ اندر رمضاں مست بخسپم تا عید

علاوہ بریں حکیم موصوف خود اس الزام کو یوں دفع کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

گر ز لفظ زشت افتد معنی زیبا بدست　　　　ننگ گوہر نیست گر جوید کسے از پارگیں

ہزل طیبت طینت افسردہ را آرد بوجد　　　　آنچناں کز تلخ میخوش خوش بوجد آید حزیں

از سرین گفتن مرا در دل ہوائے دیگر است　　　　فہم معنی گر توانی جستن دارم متیں

قہوہ من تلخست کش نوشند مردم صبح و شام　　　　لیک بس شیریں شود چوں گشت باشکر عجیں

یہی سبب ہے کہ ایران کے تمام شعرا اس پُر کیف مذاق کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ بلکہ دنیائے شعر و سخن میں بزبان مسٹر توپ جو انگلستان کا ایک ممتاز شاعر اور فلسفی تھا پکار رہا ہے "جہاں بربط سامعہ نوازی کر رہا ہو۔ جہاں بنفشہ و گل کی مہک دنیائے جذبات میں تلاطم برپا کر رہی ہو جہاں بادۂ تند کا چمن چمن چھڑکاؤ ہو رہا ہو، سمجھ لو وہی شاعر کی دنیا ہے" بھلا شاعر کے تخیلات کا کوئی ٹھکانا ہے۔ دنیا کے تاثرات اسکو ہر آن ایک نیا جامہ پہنا کر نکالتے ہیں۔ وہ کبھی ایسے زاہد کی شکل بنکر نکلتا ہے جو دنیا پر چار تکبیر کہہ چکا ہو اور کبھی ایسا رند مشرب ہو کر ظاہر ہوتا ہے جو عالم شوق و تمنا کے ہر ذرے پر سجدہ کر رہا ہو۔ فلاسفر بنتا ہے تو ایک ایک ذرے کو دنیا بنا کر دکھاتا ہے اور جب مزاح پر تل جاتا ہے تو ایسے مضحک انداز اختیار کر لیتا ہے کہ غم روزگار بھی اگر ایک نظر دیکھے تو شادیٔ مرگ ہو جائے۔ ممکن ہے کہ اسی قسم کے مزاحیہ مضامین پر دھوکا کھا کر محقق موصوف نے حکیم مذکور کو بداخلاق کہہ دیا ہو۔ مثلاً اُسکے کلام میں اکثر مقامات پر میان دسُرین یا امرد پرستی کا ذکر ہے۔ اگرچہ محقق موصوف خود اس بات کے قائل ہو گئے کہ یہ صرف مزاح تھا جیساکہ وہ اپنی تصنیف "ایک سال درمیان اہل فارس" صفحہ ۱۳۰ میں لکھتے ہیں "حکیم قاآنی خصوصیت کیساتھ مزاح پسند تھا" اسکی تائید پروفیسر کے۔ ایم۔ مترا اپنی تالیف "قصائد قاآنی" صفحہ ۶ میں یوں کرتے ہیں "حکیم قاآنی کے مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایکدفعہ ایک دوست نے کہا حبیب فلاں شاعر جب کسی کی مدح کرتا ہے تو ساتھ ہی ایک مصری کا تھال لیجاتا ہے" قاآنی نے جوابدیا "تا شعرش شیریں نماید"۔

لطف تو یہ ہے ایران کی فضا اسد رجہ ولولہ اور اُمنگ سے لبریز تھی کہ فردوسی، مولانا روم، جامی، نظامی عموماً اور خصوصاً سعدی کا سا زاہد مصلح عالم، روحِ اخلاق، جانِ نصائح، حکیم انوری کا ایسا عارف و فلسفی اپنی ہزلیات سے ملزم نہ قرار پائیں۔ مگر غریب قاآنی پر ہر شخص تلوار کھینچنے کو تیار ہو جائے۔ ملاحظہ ہو باب پنجم گلستاں۔ تحفۃ الاسرار باب سیزدہم۔ سکندر نامہ۔ مکالمہ کنیزک خاتون۔ یوسف زلیخا اور جشن نوشابہ۔ حکیم انوری کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

انوری راست دخترے و پسر　　　　ہر یکے برخلاف اہل دُعا

واں یکے دست خود نہد بر ہر　　　　واں دگر پائے خود دہد بہ ہوا

حکیم قاآنی کا شعر ملاحظہ ہو۔　در ظاہرم جنابت و در باطن است حیض　　　　آں بہ کہ غسل ہر دو بہ یکجا برادرم

مجھے افسوس ہے کہ مسٹر براؤن کے ایسے محقق نے حکیم قاآنی کے سمجھنے میں ایسی لغزش کی جو انکی باکمال ہستی کیلئے معیوب ہے۔ مبصر کیلئے لازم ہے کہ تصویر کے دونوں رخ دیکھے۔ حُسن و قبح پر روشنی ڈالے۔ محقق کی شان یہ ہے کہ نگاہِ بصیرت سے زمین کے ذرّے ذرّے کو، فلک کے تارے تارے کو، پانی کے قطرے قطرے کو دیکھے۔ حکیم قاآنی زندہ نہیں ہے اُسکا کلام زندہ ہے۔ منصفانہ تحسین یہ ہے کہ اُسکے کلام کو اُسکی حقیقی روشنی میں دیکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے خاص نقطۂ نظر اور اپنے ذاتی اندازۂ خیالات کی تاریکیوں میں رہ کر اُسکے حقیقی مجسمہ کو دیکھ ہی نہ سکے۔ اسکو لازم ہے کہ غیر جانبدارانہ طریقہ اور ہر قسم کی عصبیت سے محفوظ رہے خواہ وہ عصبیت ذاتی مذاق کی ہو یا کسی خاص تعلیم کی تخلیق یا خاص مذہب ملت و مشرب یا قوم یا قبیلہ کے تاثرات کا نتیجہ ہو تب اسکو معلوم ہوگا کہ دنیائے علم و ادب ...

شباب و شعر

بھائی ـــــــ خوش رہو۔

شرمسار ہوں کہ کافی مدت گذر جانے کے بعد آج خط لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بار بار ارادہ کیا مگر واقعات مانع ہوتے گئے۔ تاہم مجھے ...ت ہے کہ تم اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوگئے کہ اگر کسی کی یاد کانوں میں تازہ رہنا اور کسی کی یاد لوحِ ...سد کی شکل میں ظاہر کر دینا، مختلف ...یات کے زیر اثر ہیں۔ تو یقیناً اول الذکر افضل ہے۔ کیونکہ اس کو موضوعِ شعر بنایا جا سکتا ہے۔ درانحالیکہ ثانی الذکر صرف مضمونِ ...ارن کر رہ جاتی ہے۔ جس کو رومانیت کی فضا سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے تم کو فراموش نہیں کیا اور یہ کسی طرح ممکن بھی نہیں تھا۔ جبکہ ...ماہ کے پہلے ہفتہ میں ـــــ کا تازہ پرچہ پہونچ کر مجھے مجبور کر دیتا ہے کہ تمہیں یاد کر لیا کروں۔ رسالہ بڑے انہماک سے پڑھتا ہوں ...رف اسی لئے نہیں کہ اس کے مضامین دلچسپ اور پُرلطف ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس کے ہر افسانے میں خود اپنی زندگی ...مطالعہ کرتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلشن میں تمہارے ہی مضمون اور قمر لوں کی طرح ان کو بھی میرے حالات کا علم ہوگیا ہے۔ ...ردہ صرف میری ہی سوانحِ حیات قلمبند کر رہے ہیں۔ تم کہوگے غلط ہے، محض وہم ہوگیا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

اس ایک سال کے قلیل عرصے میں جو روح فرسا واقعات رونما ہوئے احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ میری ہی ہمت تھی کہ ان ...ام حیات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اُف تک نہ کی۔ میں اپنی درد بھری کہانی کسی سے نہیں کہتا۔ بلکہ بظاہر خوش رہتا ہوں ...ر کسی گوشہ کا موقع نہ ملے۔ مگر تم سے کیوں چھپاؤں۔ اپنی زبان سے بیان نہ کیا تو ویسے بھی تم سمجھ ہی جاؤ گے۔ اسے خود محسوس کر لوگے، ...ں سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ مختصراً کل روئداد یہ ہے کہ جس ہستی کو میں اپنا شریکِ حیات بنا لینے کا آرزومند تھا وہ مستقبلِ قریب میں ...ی اور کے لئے زینتِ آغوش بن جائے گی۔ یقین مانو ان جذبات کو جو گذشتہ تین سال سے قلبِ مضطر میں نشوونما پا رہے تھے۔ ...ایک ایسی ٹھیس پہونچی ہے کہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید دماغی توازن قائم نہ رہتا۔ کاش! میں شاعر ہوتا تو اپنی آرزوؤں کی پامالی کو ...نظم کر کے خوب خون کے آنسو بہاتا۔ خود بھی روتا۔ دوسروں کو بھی رُلاتا۔ افسانہ لکھ سکتا ہوں لیکن لکھوں گا نہیں۔ کیونکہ یہ ...یقت کی دُنیا پر نہیں چھا سکتا۔ حقیقت بھی رومانیت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے دُنیائے شعر میں ہر مصرع خواہ ...ن کو حقیقت سے کتنا ہی بُعد ہو حقائق بردوش معلوم ہوتا ہے۔ میں حُسن کی ظاہری کیفیات پر مرمٹا تھا۔ تم مجھے سمجھاتے تھے کہ یہ سراب ہے۔ ...ں سے بچو۔ میں تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور تسلیم بھی کس طرح کرتا۔ عمر کا اقتضا یہی تھا کہ کسی کی بات نہ مانوں۔ لہذا جوانی کی ترنگ میں جبکہ ...ی کے شبابِ نوخیز کی نشیلی اٹکھیلیوں نے مجھ جیسے حُسن پرست کی رگوں میں ایک کیفِ سُکر بھر کر ایک ناقابلِ تفہیم نوع کا تلذذ ...یدا کر دیا تھا میں بھی جمال و رعنائی کے اس سُنہرے گرداب میں پھنس جانا ہی زندگی کا اصل مقصد قرار دیتا رہا۔ لیکن اب حضرتِ ...جگر کا یہ شعر زبان پر رہتا ہے ؎

حُسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر　　لُطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے کئے پر پچھتاتا ہوں کیونکہ اس قدر بے خودی اور اضطراب کے باوجود مجھے اُس ہستی سے محبت

نہیں ہے۔ البتہ مجھے شکایت ہے اس قسامِ ازل سے کہ اُس نے مجھے وہ دل نہ دیا جو اُن کو دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں بھی اُن کے پلٹ جانے کی طرح پلٹ جاتا۔ اور جس طرح وہ وعدہ خلافی کرکے میرے جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں میں بھی اُن کی آرزوؤں کو پامال کر دیتا۔ انتقام کی غرض سے نہیں بلکہ اس کوشش میں کہ شاید اسی صورت سے پھر یگانگت پیدا ہو جائے۔ اُف اُدنیا میں بعض جزئیات بھی اس قدر اہمیت حاصل کر لیتے ہیں گویا بذاتِ خود کل ہیں۔ اُنہوں نے مجھے صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ خود ہیں یعنی جس ہستی کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کر دینا اُن کے مسلک میں روا ہے میرے جذبۂ پندار میں اس کو پذیرائی حاصل نہیں ہرچند مجھے چاہیئے کہ ان عارضی اور غیر وقیع رسوم و قیود کو توڑ کر وہ بن جاؤں جو اس وقت وہ خود ہیں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں اُنکی شانِ عشوہ پردازی رنگِ تضاد پیدا کرنے کے لئے وہ بن جانا گوارا نہ کرے جو اس وقت میں خود ہوں۔ میں کافر بنوں اور وہ کافر مسلمات ہو جائے تو ایسی صورت میں نہ خدا ملے گا نہ صنم۔ درانحالیکہ آرزو یہ ہے کہ رِند رہوں اور ہاتھ سے جنّت بھی نہ جائے۔ لہذا مصلحت اسی میں ہے کہ میں وہی رہوں جو اس وقت ہوں اور کوشش کروں کہ ان کو بھی وہی بنا لوں جو اس وقت میں خود ہوں۔ لیکن غالباً میری یہ مصلحت ——— صاحب کے فلسفہ کی طرح اسی نوع کی ہے جو کبھی دائرۂ عمل میں نہیں آتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کوئی تدبیر پیش کرو۔

پیر صاحب کا اب کیا حال ہے؟ ——— بھابی صاحبہ کی خیریت سے مطلع کرنا۔

نیاز کیش ....

میرے عزیز دوست!

خدا خدا کر کے تمہارا خط آیا۔ رسالوں میں آئے دن تمہارے مضمون پڑھتا رہتا ہوں ماشاءاللہ خوب لکھتے ہو۔ مگر خطوں کی بے تکلف جنبشِ قلم مضامین میں کہاں! یہ چیز تو صرف تمہارے دوستوں ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ اسی لئے میں تم سے خط لکھنے کا اصرار کرتا ہوں۔ میری طبیعت تمہارے خطوں کے لئے حریص ہے۔ ذرا اس "حرص" کو دیکھنا کہ میں اس پر ناز کر رہا ہوں۔ خط دیکھ کر مدّت کی دبی ہوئی چوٹ اُبھر آئی۔ اس "درد" کو دیکھو کہ میں اس کا آرزو مند ہوں۔ ایسے ازلی دیوانے بھی تم نے کم دیکھے ہونگے۔

میں جانتا تھا کہ تم نے مجھے فراموش نہ کیا ہوگا۔ مگر تمہاری طویل خاموشی میری وحشت کا سبب بن جاتی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ میرا دوست بھی جوانی میں مُبتلا ہو گیا تھا۔ جوان تو تم بہت عرصے سے ہو مگر صحیح معنوں میں شباب کا احساس تمہیں اب ہوا ہے۔ شباب کے دوش بدوش اگر محبت نہ ہو تو اس زندہ لاش کا کیا مصرف؟ اور اگر محبت کے ساتھ ساتھ گناہ کی لطیف رنگینیاں نہ ہوں تو یہ خوبصورت مُردہ کس کام کا؟ بھئی! یہ تو تمہیں اب تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ جوانی بے محبت کے نبھ نہیں سکتی۔ اور محبت بغیر آمیزشِ گناہ کے اور کچھ ہو تو ہو مگر، محبّت نہیں ہو سکتی۔ تم نے ایک ہستی کو دیکھا اور تمہارا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ہستی تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہو گئی تو تم نے خیالی پرستش کی ٹھیرا دی۔ وہ تمہیں حاصل ہو یا نہ ہو۔ مگر تم ہو کہ اپنے اس معبودِ خیال کے لئے ایک نئی دُنیا تعمیر کرتے ہو۔ اور اُسے اپنے دل کے تاروں کی ہم آہنگی میں عبودیت کے نغمے سُناتے ہو۔ خود جھُومتے ہو، مگر وہ ایک سنگین بُت کی طرح ساکت و بے حس رہتا ہے۔ اپنا سر دُھنتے ہو مگر اس کے جسم میں محبت کی کوئی تھرتھری پیدا نہیں ہوتی۔

اگر یہی محبت ہے ع

"تو استغفار با حسرت و یاس"

عزیز دوست! یہ تو (IDEALISM) کے خوشنما گورکھ دھندے ہیں۔ مجھے تمہاری جوانی کے اس حصہ پر ترس آتا ہے جو اس میں ضائع ہوا۔ اوّل تو جوانی کی گھڑیاں ہی کتنی ہوتی ہیں۔ پھر ان میں بھی اگر نفسیاتی توہمات ہو تو ولے بر حالِ ما۔ محبت کی چند گھڑیوں ہی کا نام تو جوانی ہے۔ جہاں محبت کا مفہوم ہی سرے سے غلط ہو، میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا شخص جیتے جی مُردہ ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تم رومان کے سُنہرے دھندلکے میں زیادہ عرصے تک بھٹکتے نہیں رہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تمہارے جذبات ٹھکرائے جا رہے ہیں، تمہاری آرزوئیں پامال کی جا رہی ہیں۔ جانتے ہو کیوں! محض اس لئے کہ تم پارسا ہو۔ محبت کو اُلوہیت کا مترادف سمجھتے ہو۔ جوانی کو اُس کے جائز حق سے محروم رکھتے ہو۔ سوائے ایک عورت کے تمہیں سب سے نفرت ہے۔ مگر میرے دوست! عورت کا حُسن دُنیا میں کم نہیں ہے۔ پھول کے کھلنے میں، آبشار کی روانی میں، غزال کی سبک رفتاری میں، قوسِ قزح کے رنگ میں، تاروں کی چمک میں، غرض دُنیا کے ہر خوبصورت منظر میں عورت کے حُسن کی جھلک دیکھ لو۔ اس سے بچ کر کوئی کہاں جائیگا۔ عرصہ ہوا تمہاری طرح مجھ پر بھی یہی دور گذرا تھا۔ اور میں نے بھی تمہاری طرح دھوکا کھایا تھا۔ اس کی تفصیل پھر کبھی سُنانا۔ جب ہی سے میرے خیالات میں یہ انقلاب ہوا۔ اسی تجربہ کی بنا پر تو میں تمہارے خیالات کی تردید کیا کرتا تھا۔ تم میری ہنسی اُڑاتے تھے، اور میں ہنس کر چپکا ہو رہتا تھا۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دیتا ہوں کہ کسی اور کے ہو جاؤ۔ دُنیا میں حسین پیکروں کی کمی نہیں۔ ورنہ پھر یہ جوانی کہاں۔ اسے کسی کی یاد میں کہاں تک برباد کروگے؟ تمہارا زخم تازہ ہے اس لئے شدت سے اسکی تکلیف کو محسوس کرتے ہو۔ دل کے زخم دل لگانے ہی سے اچھے ہو سکتے ہیں۔ اس میں تمہیں تاخیر نہیں کرنی چاہئیے۔

مسلمان کافروں کی اس قدر افراط ہے کہ اگر یہی ترقی رفتار رہی تو بیس سال بعد مولائے زمانہ ساز مولویوں کے سبب کافر مُسلمان ہو جائیں گے ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا — اور کافر یہ سمجھتا ہے مُسلماں ہوں میں

اللہ بخشے پیر صاحب کبھی کبھی آ کر اپنی غم انگیز باتوں سے ہنسا جاتے ہیں۔ منہ بنا کر بسورتے وقت اُن کی حالت اس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ میں ان کے چہرے کے مضمحل نقوش کو "خندۂ گل" ٹھیرا کر ہنس لیتا ہوں۔ کبھی کبھی میرے اس طنز پر وہ بھی غضبناک قہقہہ لگانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کو "اللہ بخشے" میں نے اس لئے کہا کہ وہ اپنا شمار، شیطان کے کان بہرے، زندوں سے زیادہ مُردوں میں کرتے ہیں۔

تمہاری بھابی اب پہلے سے بہتر ہیں۔

تمہارا ہمیشہ ......

بھائی ــــ خوش رہو۔

بلا تعویق جواب سے سرفراز کیا۔ ممنون ہوں۔ تم میرے مضامین کی تعریف کرتے ہوئے ذرہ نوازی کہہ کر اظہارِ تشکر

کروں تو فرسودہ رسمی بات ہوگی لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ تعریفی الفاظ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ میں اُن کا اہل ہی نہیں ہوں، اور جس طرح حضرتِ جگر خدا کے متعلق فرماتے ہیں کہ ؎

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

بعینہٖ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ کسی کے پرتوِ رُخ نے میرے تخیلات پر چھا کر کے میرے دل کو ایسی تجلیوں سے معمور کر دیا تھا کہ میرے قلم کی ہر جنبشِ حُسن کاری کے بہترین نقوش قرطاس پر ثبت کرتی چلی جاتی تھی۔ پھر بتاؤ کہ لائقِ تحسین وہ ہستی ہوئی یا میں۔ یہ مانا کہ ؎

حُسن کے ہر جمال میں پنہاں تیری رعنائیِ خیال بھی ہے

لیکن اگر حُسن نہ ہو تو صرف خیال بیکار ہے۔ انسان کا تخیل محتاج ہوتا ہے اشیائے ظاہری کے وجود کا۔ اور جو چیز خود محتاج ہو اُس کی قدر معلوم ——— کیا کروں، بیان کے لئے الفاظ ہی نہیں ملے ورنہ انتہائے ضبط کی تاب نہ لا کر میرے تاثرات اس درجہ کمال کو پہونچ گئے تھے جس کے بعد قدرت کی دو متضاد کیفیات زندگی کے صرف دو اہم آہنگ مظاہر پیش کرتی ہیں۔ یعنی اگر فضا میں سکون ہوتا تو میں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ حُسن ہے۔ ورنہ اس کے برعکس ہر چیز مجھے نغمہ معلوم ہوتی تھی ——— "معلوم ہوتی تھی" اس لئے کہ جوانی کی ترنگ میں سرشار ہو جانے کے باعث میری محبت کی رنگینیاں زیادہ بیش بہا گوہر بننے کیلئے عارضی طور پر صدف میں آسودۂ خواب ہو گئی ہیں۔ اسی لئے آئندہ میرے مضامین میں ایک نیا رنگ دیکھوگے۔

تم نے شباب کے دوش بدوش محبت اور محبت کے ساتھ گُناہ کو لازم و ملزوم ٹھیرا کر ایک حد تک میرے خیال کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اختلاف ہے۔ خدا کیلئے خواہشاتِ نفس کو محبت سے تعبیر مت کرو بلکہ میری طرح محبت کو الوہیت کے مترادف تصور کرو۔ رُوح اور شباب کو ایک ہی چیز کے دو نام سمجھنے میں میری کج فہمی ہے یا تمام دُنیا غلطی میں مُبتلا ہے۔ میری دانست میں رُوح دراصل شباب سے ایک جُداگانہ چیز ہے جس کے ذریعے ہم خوب و زِشت میں، نیک و بد میں، یزدان و اہرمن میں اور ثواب و عذاب میں تمیز کر سکتے ہیں۔ یہ رُوح ہی ہے جو دو ہستیوں کے درمیان رابطۂ عشق و محبت پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا عشق و محبت کا (میرا معیارِ محبت ملحوظ رہے) تعلق صرف رُوح سے ہے نہ کہ شباب سے۔ اور اس جذبے کو حُسن سے بھی کوئی سروکار نہیں ع۔

عشق رنگِ حسن سے ہے بے نیاز

تخلیق کی ساعتوں سے جوانی کے آغاز تک رُوح کی کارفرمائی رہتی ہے۔ پھر شباب کا عرصۂ حیات آتا ہے۔ اور جذبات کے تھک جانے یعنی شباب کے گُذر جانے کے بعد دوبارہ رُوح کا تسلط ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کی زندگی کے تین دور ہوگئے۔ اولین و آخریں کو محبت یا اُلوہیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور درمیانی درجہ دراصل وہ عرصۂ حیات ہے جبکہ انسان حقیقی معنوں میں "صرف" انسان ہوتا ہے۔ مجھے محبت ہوئی ابتدائی دور میں (جو شاید اس وقت بھی ہوگی درانحالیکہ میں محسوس نہیں کرتا) لیکن تمہارے قول کے مطابق شباب میں مُبتلا ہو جانے کے باعث وہ سلسلہ عارضی طور پر مُنقطع ہو گیا ہے۔ آخری دور میں دوبارہ اس جذبہ کے بیدار ہو جانے کی اُمید ہے۔ لہٰذا فی الحال جوانی کی نیرنگیوں سے لُطف اندوز ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ثواب و عذاب اور جزا و سزا کے خیالِ خام کو لوحِ قلب سے اس حد تک دور کر دیا ہے کہ "لا شرابِ کُہنہ ساقی" کہہ کر دل کی پریشانیاں دور کرتا ہوں

اور جب اس شغلِ لطیف سے فرصت ملتی ہے تو پھر مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں "کو مدِ نظر رکھ کر کچھ کارِ خیر بھی کر لیتا ہوں — "کارِ خیر" پر تم ضرور چونکو گے لیکن یقین دلاتا ہوں کہ اب میرے پندار میں بھی یہ گناہ کا ارتکاب جائز قرار پا گیا ہے۔ اور وہ بھی اس قدر قوی اعتقاد کے ساتھ کہ کبھی گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا جس طرح شباب کا بہترین طریقۂ تحفظ یہ ہے کہ اسے خوب بے اعتدالی کے ساتھ صرف کیا جائے۔ اسی طرح گناہ سے بچنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ دل کھول کر گناہوں کا ارتکاب کیا جائے۔ کسی سابقہ خط میں لکھے ہوئے تمہارے یہ الفاظ مجھے رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ "گناہ بھی محترم ہے"۔ اس وقت میں نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ شباب کی منزل میں پائے استقامت نہیں رکھا تھا۔ اب مانتا ہوں اور قدر کرتا ہے۔ زہد و اتقا میں کیا رکھا ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کے لئے موزوں ہو تو ہو۔ جوانی کے بوجھ سے دبی ہوئی ہستیوں کے لئے لائق اعتنا نہیں۔ کل یہ شعر مطالعہ میں آیا ؎

گنہگاری کی دنیا میں کھلا وہ رازِ سربستہ — تقدس نے جسے اب تک چھپایا تھا نگاہوں سے

کتنا حسین تخیل ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جب اسی شاعر کا اسی دیوان میں یہ شعر پڑھا تو دیوان اٹھا کر

دلِ گمراہ کو لے کاش یہ معلوم ہو جاتا — گناہ اس وقت تک دلچسپ ہے جب تک نہیں ہوتا

تم مجھے مشورہ دیتے ہو کہ "کسی اور کے ہو جاؤ"۔ میں اس پر عمل کرنے سے مجبور ہوں کم از کم اس عرصۂ حیات میں — جوانی میں اپنی دست درازیوں کو محدود کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر تمہارے قول کے مطابق کائنات کے ہر ذرّے میں عورت کا حسن پنہاں ہے تو میں گلچینی کرنے میں اپنے دامن کو کس لئے تنگ رکھوں۔ اپنی ہوسناکی سے اب تو میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر اس شے کو اپنا بنا لوں جس میں ذرا سی بھی نسائیت ہو لیکن خود کسی کا نہ بنوں۔ اسی میں لطف ہے کہ انسان ہمیشہ "شادی شدہ کنوارا" بنا رہے۔ کیونکہ میں اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند ہوں۔ جس طرح میں ایک ہی ہستی کو قابلِ پرستش سمجھ کر اس سے محبت کرتا رہا باوصف اس کے کہ اس نے کبھی میری طرف نظرِ التفات نہیں کی۔ اسی طرح اس دوسری ہستی کو جسے رشتۂ ازدواج کے لئے منتخب کیا تھا ہمیشہ اپنا ہی تصور کرتا رہونگا خواہ وہ کسی اور کے لئے زینتِ آغوش بن جائے۔ خواب کی نگری میں صرف وہ میرے لئے ہوگی اور عالمِ بیداری میں میں دوسروں کے لئے۔ دیکھو جان بوجھ کر اپنے آپ کو سراب میں مبتلا کر لیا ہے۔ اور اس پر ناز کرتا ہوں اب سمجھنے لگا ہوں کہ عورت کی شباب آفریں لذت سے لطف اندوز ہونا اور اس کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے دنیا کی صرف ایک عورت کے سوا سب سے نفرت ہے۔ ہرگز نہیں میں دنیا کی ہر نسائیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں سوائے اس ہستی کے جس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔

عرصۂ دراز کے بعد کل پیر صاحب کا خط آیا۔ انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ یار دوستوں کی چھیڑ چھاڑ ان کی بیماری کا باعث ہے۔ سب سے زیادہ تمہاری ہی شکایت لکھی کہ —— صاحب تو ہر بات پر بناتے ہیں۔ کل انہیں بھی خط لکھونگا۔

جواب جلد دینا مجھے انتظار رہے گا۔ نیاز کیش ....

میرے عزیز دوست

شکرگذار ہوں کہ تم نے جواب جلدی دیدیا۔ اس خط میں تمہاری جوان نگارش کا بے پناہ زور ہے۔ خط کئی بار پڑھا اور ہر بار

ایک نیا لطف اُٹھایا حُسن و عشق پر تم نے پھر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ فلسفہ سمجھنے میں مجھے ہمیشہ اُلجھن ہوتی ہے۔ بہرحال جو کچھ تم نے لکھا ہے اُسے میں نے سمجھنے کی کوشش ضرور کی۔ دبی زبان سے اتنا اور کہوں گا کہ محبت کو فلسفہ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ فلسفہ کے لئے دماغ اور محبت کے لئے دل کی ضرورت ہے۔ دل کے معاملوں کو اگر دل ہی سے سمجھا جائے تو بہتر ہے۔ عشق رُوح کی ایک دلکش ترنگ ہے۔ جس کو قوت سے عمل میں لانے کے لئے حُسن کا وجود ضروری ہے۔ بے شمع کے پروانہ کو تڑپتے آج تک نہیں دیکھا۔ شباب و محبت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کہولت کے ساتھ ساتھ رُوح بھی مضمحل ہوتی جاتی ہے۔ بڑھاپے میں انسان کو محبت سے زیادہ ہوس ہوتی ہے۔ ظلم کرتے ہو کہ محبت کو شباب و حُسن دونوں سے بے نیاز قرار دیتے ہو۔ کبھی یہ نہ سُنا ہوگا کہ فلاں بوڑھا فلاں بڑھیا پر دم دیتا ہے۔ کیسی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اونچا سُننے کی وجہ سے محبت کی اس بے معنی سرگوشی کا لطف کہاں جس میں ہزاروں معنی پنہاں ہوتے ہیں؟ کمزوریِ نظر کے سبب اس ایک نگاہ کا کیا ذکر جو اپنی غلط اندازی کے باوجود سب کچھ کہہ جاتی ہے؟۔ اس عمر میں جبکہ کھلکھلا کے ہنستے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ٹوٹے ہوئے دانت کہیں اُجاڑ قبرستان کا منظر پیش نہ کر دیں، بھلا اظہارِ عشق کس منہ سے کیا جائے؟ محبت کا پہلا پیام (جسے عرفِ عام میں بوسہ کہا جاتا ہے) پوپلے مُنہ کو زیب نہیں دیتا۔ جوانی لاے آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ مجنون نے کسی ایسی لیلیٰ کے لئے صحرا کی خاک نہیں چھانی جس کے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ اور نہ فرہاد نے اپنی نانی جیسی بوڑھی عورت کیلئے اپنی جانِ شیریں گنوائی۔ تمہارا جی چاہے تو اب بھی صغرا، کبرا اور نتیجہ کی گتھیوں میں اُلجھ کر ان مسائل کو سُلجھانے کی کوشش کرتے رہو۔ میں تو "بوڑھے مُنہ مہاسے" کا قائل قیامت تک نہ ہو سکوں گا۔

محبت میں مایوسی ہر انسانی زندگی کا سانحہ عظیم ہوتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں شاید ہی کوئی ایسا دل ہو جس پر اس کا داغ نہ ہو۔ جو روحی صعوبت تم اب محسوس کر رہے ہو، مجھ پر اب سے بہت پہلے بیت چکی ہے۔ جی چاہتا ہے پھر اس پُرانے زخم کو کُریدوں اور اس درد کی لذت اُٹھاؤں۔

آؤ، آج میں تمہیں محبت کی ایک سچی کہانی سُناؤں۔ جس کا ایک ایک لفظ خون سے لکھا گیا ہے۔ جیتے جیتے خون سے۔

مَیں تمہیں اس لڑکی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ یہ وہ خوبصورت راز ہے جو میرے دل کا درد بن گیا ہے۔ فرض کر لو اس کا نام صوفیہ تھا۔ وہ خوبصورت تھی۔ ہر جوان عورت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس لئے صوفیہ کو صرف خوبصورت کہنا اُس کے حُسن کی توہین ہے۔ دُنیا کی حسین رنگینیوں کا مرکز، عناصر کی خوبصورت ترتیب، مجھ سے پوچھو تو میں کہوں شباب کی جُملہ صفات اس میں سمٹ آئی تھیں، اسکے اعضا میں ڈھل گئی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ میرا حُسنِ نظر ہو کیونکہ حُسن میں ہم اُن اجزائے ترکیبی کو تلاش کرتے ہیں جو ہمارے نقطۂ نظر سے حسین ہوتے ہیں۔ مگر میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ صوفیہ اس حُسن کی مالک تھی جسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد ناممکن تھا کہ پہلو میں کوئی شے تڑپے اور تڑپ کر نکل نہ جائے۔ میں نے صوفیہ کو پہلی دفعہ ـــــ کی شادی میں دیکھا۔ رُوح میں کھلبلی سی پڑ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے دل دبایا۔ میری موجودگی سے لاعلم وہ کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ ایک شاندار مجسمہ کی طرح، مغرور نازسے۔ کنول جیسی آنکھوں میں دوشیزگی کی بے پناہ چمک جو بڑی بڑی سیاہ پلکوں کے سائے کا اس طرح پیچھا کر رہی تھی جس طرح صبح کی پہلی شعاع سیاہیِ شب کا تعاقب کرتی ہے۔ خدا جانے کس بات پر وہ دفعتاً ہنس پڑی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بیشمار نقرئی گھنٹیوں کو یکلخت چھیڑ دیا۔ یہ تھا میرا پہلا معطر پھول جو میرے دل کے صحرا میں کھلا اور مجھے اپنی تند و تیز خوشبو سے بے ہوش کر گیا۔

محبت کی ہنسی اُڑانے والا اب خود اسیرِ محبت تھا۔ جو شخص لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد اور وامق و عذرا کی داستانوں کو انسان کے بہلانے کے لئے بزرگوں کی من گھڑت کہانیاں تصور کرتا تھا آج ایک بے کس تنکے کی طرح محبت کے لا انتہا سمندر میں بہا چلا جا رہا تھا۔ محبت نے اس سے اپنی اہانت کا انتقام لیا ـــــ سخت ترین انتقام۔

میں حیران تھا کہ میرے دل کی دُنیا میں ایک دم سے یہ انقلاب کیسے ہو گیا!ــــ اپنی حالت پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا کہ شریر کیوپڈ کا زہرین تیر میرے دل میں بھی پیوست ہو گیا۔ کوشش کی اسے کھینچ کر پھینک دوں۔ مگر ایسا کرنے میں زندگی کی عظیم ترین مسرت سے محروم ہوا جاتا تھا۔ دل نے کہا "آؤ ہم زندگی کو دھوکہ دیں۔ آؤ ہم محبت کریں" یہ تجویز اچھی تھی۔ پسند آگئی صوفیہ چھت پر اکیلی تھی۔ میں اس کے قریب گیا۔ اس کے گرد کی فضا میں شراب کی سی مستی تھی۔ میں بے پئے مخمور ہو رہا تھا۔ مینائے حسن میں شرابِ جوانی تڑپ رہی تھی۔ یہ غیر ممکن تھا کہ کوئی اُس کے قریب جائے اور مستوں کی طرح لڑکھڑا نہ جائے۔ میں پہونچنے کو تو اس کے قریب پہونچ گیا۔ مگر اب سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دل نے کہا "اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کرو ــــ اپنے آنسوؤں کی وساطت سے، اپنی جوانی کی اعانت سے"

اس روداد کو کہاں تک بیان کروں۔ اس کے ذرے ذرے میں نشتر کھٹکنے لگتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھو کہ اس ڈرامہ کا پردہ گرنے سے پہلے صوفیہ کی نظریں مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ محبت کا زہرین تیر اس کے دل میں بھی اُتر چکا ہے۔ محبت اس کے قلب کی دھڑکنوں کا راز بن چکی تھی۔ چہرے کی سُرخی اس خونیں معاہدۂ محبت کی گواہ تھی۔ پھر کیا ہوا؟ اب نہیں لکھا جاتا۔ دل کی بیقراری ہاتھ میں آگئی۔ اس سُہانے خواب کی بھیانک تعبیر تم چاہو گے تو آئندہ خط میں بیان کر دونگا۔

مضمون کی طرح اس خط کو بھی "باقی آیندہ" پر ختم کرتا ہوں۔ تمہارا خط آئے تو میں اسے مکمل کر دوں۔ تم دلی کب آ رہے ہو؟ ــــ موسم بہت اچھا ہے۔

تمہارا ہمیشہ ....

بھائی ــــ خوش رہو۔

خدا شاہد ہے کہ اس دفعہ تمہارے خط کے ابتدائی حصے کو پڑھکر اس قدر اُلجھن ہوئی کہ فوراً اُسے بند کر دیا اور سوچا کہ بقیہ حصہ نہیں پڑھوں گا۔ لیکن دوست کا خط پھر دوست کا خط ہے۔ دل نہ مانا۔ "کھولا" اور "پڑھا" پھر ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ اگر آخری حصہ قابلِ توجہ اور جاذبِ نظر نہ ہوتا تو شاید جواب کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن اب سب کام چھوڑ کر قلم اُٹھالیا ہے۔ خدا ہی جانے کیا کیا لکھوں گا۔

ہماری تمہاری دوستی کو آج ایک زمانہ گذر گیا۔ اور اس دوران میں مجھے زیادہ عرصہ باہر رہنے کا اتفاق ہوا اور اس لئے طویل سلسلۂ خط و کتابت کا جاری رہنا ظاہر ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ حُسن اور محبت کی کرشمہ سازیاں ہمارے اوپر کچھ اس درجہ مسلط ہیں کہ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکرِ خیر ہو جاتا ہے۔ بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ پُرانے خط اُٹھا کر دیکھ لو، ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے مرکز سے نہیں ہٹا۔ رُوح ہمیشہ یکساں رہتی ہے، صرف الفاظ کا ڈھانچ بدلتا رہتا ہے۔ لہذا اس

تحصیلِ حاصل سے کیا حاصل۔ آئندہ اس ضمن میں کوئی موشگافی نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ برسبیل انقطاع میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مختلف معیار کے علاوہ تم اس امر کو بھی نہیں سمجھے ہو کہ میں کس ہستی سے شادی کرنے کا متمنّی تھا۔ تم اسے اور میری محبوب ہستی کو ایک ہی سمجھ بیٹھے ہو۔ اور بس یہی غلط ہے۔ خیر! اس موضوع پر زبانی گفتگو ہوگی۔ کیونکہ عنقریب میں دلی آنے والا ہوں۔

تم نے اس خط میں اپنی محبت کی رنگین لیکن المناک داستان قلمبند کرکے گویا میری دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی اپنی مسرتوں میں نوحہ خوانی کروں۔ جوانی کی ترنگ میں مدہوش ہو جانے کے باعث میں عارضی طور پر اپنی محبت کو محبوب ہی کے آغوش میں سُلا چُکا تھا مگر تم نے جھنجھوڑ کر اُسے دوبارہ بیدار کر دیا۔ اور اس طرح میرے دل میں عہدِ رفتہ کی یاد از سرِ نو تازہ ہوگئی۔ ان واردات کا ابھی تک اس لئے ذکر نہیں کیا تھا کہ زبان میں قوتِ بیان ہی نہیں تھی۔ اب تحریر کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہاری طرح بیتابی ہاتھوں میں آکر قلم میں رعشہ پیدا نہ کر دے۔ ویسے بھی مجھ میں ہمت نہیں کہ پوری الف لیلا بہ سکونِ قلب ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ بھلا وہ باتیں کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہیں جو دل پر بیتی ہوں ؎

کیوں حسن کا افسانہ محدود ہو لفظوں میں　　　آنکھیں ہی کہیں اس کو آنکھوں نے جو دیکھا ہے

تم یقین نہیں کرو گے، اس لئے میں بھی یہ بیان کرنے سے احتراز کروں گا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اس کو ننگے سر ننگے پاؤں کس قدر بدحواسی کے عالم میں دیکھا۔ میری دستک پر وہ دوڑ کر دروازہ کھولنے آئی، اس یقین کے ساتھ کہ کواڑ کھٹکھٹانے والا خود اس کا بھائی ہے۔ لیکن خلافِ توقع مجھ کو دہلیز پر دیکھ کر استعجاب اور حیا کے درمیان کی ایک نامعلوم کیفیت اس پر طاری ہوگئی جو انسان کی قوتِ عمل کو کچھ دیر کے لئے ماؤف کر دیتی ہے۔ وہ مجھے بنظرِ غائر دیکھ رہی تھی، اور میں اُسے گھور رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ہنسی آگئی۔ ہاں ہنسی، کیونکہ دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں تھا۔ اور اُس نے بھی شرما کر بازوؤں کی اوٹ کو نقاب بنا لیا۔ میں اس گھر سے جس کتاب کو عارضی طور پر لینے گیا تھا آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ بطور یادگار۔ ایک ایسی کتاب جسے بازار میں فروخت کیا جائے تو لوگ مفت خریدنا بھی نقصان کے مترادف سمجھیں گے۔ لیکن میری نگاہ میں اُسکی وقعت؟ اللہ اکبر۔

دوسری بار میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں بلکہ........ اس کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ ساچق کی رسوم ادا ہو رہی تھیں کہ میں نے آنکھ بچا کر اس کے مُنہ پر بٹنا مل دیا۔ وہ نہ شرمائی نہ خفا ہوئی۔ بلکہ سہم کر الگ کھڑی ہوگئی۔ فوراً میں بھی اصل مطلب کی تہ کو پہونچ گیا اور گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کسی کی دزدیدہ نگاہوں نے میری اس جسارت کا جائزہ تو نہیں لیا۔ تم جانتے ہو کہ ہندوستانی معاشرت میں اتنی آزادی کہاں؟

بظاہر یہ محض مذاق تھا لائقِ فراموش۔ لیکن نہیں معلوم کیوں دل میں خلش پیدا ہوئی اور تصوّرات کی نگری میں ایک جدید تعمیر کا اضافہ ہونے لگا۔

تیسری بار میں نے اُسے دیکھا نہیں لیکن...... میں اس کے بھائی کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور یار دوست بھی موجود تھے کہ نرم و نازک قدموں کی چاپ سُنائی دی اور صرف میری متجسّس آنکھوں نے زرکار پردے کے پیچھے دو آنکھوں کی جھلک دیکھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "بھائی"! اور وہ اُٹھکر اندر چلا گیا۔ میں نے بڑے بڑے مغنیوں اور مطربوں سے مشورہ لیا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ صرف لفظ "بھائی" موسیقی کے اُصول کے مطابق کسی ساز کے ذریعے ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں

ترنم نہیں ہے۔ ہائے ان کمبختوں کو کیا معلوم کہ دنیا میں ایک ذی حیات رباب ایسا موجود ہے، جس پر میں اسی لفظ کو اپنے کانوں سے سُن چکا ہوں، صرف دوبارہ سننے کی آرزو ہے۔

اس کے بعد اکثر آمنا سامنا ہوا لیکن اس طرح کہ نگاہ ملتے ہی نظریں نیچی ہو گئیں۔ گفتگو کرنی تو درکنار محض اس کے احتمال ہی سے دونوں جانب لبوں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ جھکے ہوئے پپوٹے کپکپانے لگتے ہیں۔ تنفس میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے۔ ضربات نبض میں سُرعت ہونے لگتی ہے۔ اور اگر اس مدہوشی کے عالم میں کبھی زیادہ وقت گذر گیا تو یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ اُسے اپنے آنسوؤں کو دوپٹے کے آنچل میں لینا پڑا اور مجھے افشائے راز کے خوف سے ڈر کر درد دل کے اس پیام کو جو قطرات اشک کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، ضبط سے کام لیکر اندر ہی اندر جذب کر لینا پڑا۔ وہ بس۔ تم سمجھو گے کہ یہ کس نوع کی محبت ہے۔ اور میں کہونگا کہ محبت صرف ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔

خدا کے لئے تم اس کے جمالیاتی پہلو کے متعلق سوال نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ میرے لئے جواب دینا دوبھر ہو جائیگا۔ اگر تم نے اصرار کیا تو مجبوراً میں تم کو اس دنیائے آب و گل سے نکالکر ماہ و انجم کی فضا میں لے جاؤں گا کیونکہ یہاں کی کسی شے سے اُسکے حُسن کی تشبیہ مکمل نہیں ہو سکتی۔ تم ضرور اس کو شاعرانہ تعلی سمجھو گے لیکن ہے یہ حقیقت۔

اچھا اس موضوع سے بالکل الگ ایک دلچسپ بات سُناؤں، بہت دلچسپ۔ کسی قدر مضحکہ خیز۔ آج کل ایک بیگم "صاحب" سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ "صاحب" اس لئے لکھا کہ وہ "مرد خاتون" ہے۔ ایک مرد جسے عورت بن جانے کی تمنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے بیوقوف بنانے کی ناکام کوشش ہے۔ اور میں ارادتاً بیوقوف بن رہا ہوں محض اس لئے کہ اُن کا ذوق نسائیت پورا ہو جائے اور متمنی ہوں کہ وہ میرے اس سمجھ جانے کو عرصے تک نہ سمجھیں۔ دوست کی خاطر سب کچھ کیا جاتا ہے وہ میرے رفیق دیرینہ ہیں۔ تم بھی واقف ہو۔ تعارف نہیں کراتا، مبادا تم سے ملاقات نہ ہو اور یہ راز قبل از وقت فاش ہو جائے۔

نیاز کیش ....

نرگس جمال جناب شاہد احمد دہلوی بی۔ اے (آنرز) مدیر ساقی کی تالیف ہے اور بلجیم کے مشہور مصنف میٹرلنک کے ڈرامہ "جائزل" کا ترجمہ ہے۔ میٹرلنک کو دنیائے ادب میں جو ممتاز درجہ حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کی کتابیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ اُس کی شہرت کا راز اُسکی تحریر کی ہمہ گیری ہے اور وہ اُن روحانی و معاشری مسائل کی عقدہ کشائی کرتا ہے جن پر نوع انسانی کی بہتری کا انحصار ہے۔ اس کا موضوع خواہ کچھ ہی ہو لیکن اس کے پیش نظر ہمیشہ یا تو خدا کی ذات ہوتی ہے یا اس کی بہترین مخلوق انسان۔ وہ خدا کو دنیا میں محبت اور خاکساری کی راہ اختیار کرکے ڈھونڈتا ہے، خدا کی جستجو میں وہ انسان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ انسان کی پھٹی گدڑی میں خدائی نور جلوہ دیتا ہے۔ میٹرلنک کا ادبی سرمایہ بھی وہی ہے جس پر ایشیا کے اخلاقی رہنماؤں کو بجا طور پر ناز ہے۔ اس لئے اس پر ایک لحاظ سے مشرق کا حق تھا، جو شاہد احمد صاحب کے ترجمے سے وصول ہو گیا ہے، انہوں نے یہ فرض کچھ اس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے کہ میٹرلنک کے لئے شکایت کی وجہ نہیں چھوڑی۔ قیمت مجلد عہ (ادبی دُنیا)

قطعات

سوز و ساز

آہ کس کو پتہ ہے یہ درد و جاں سوزی
ایسے تو دل کا کوک اٹھتی ہے
جیسے کسی غم زدہ سے سوز و نوا ہوتی ہیں
جیسے پپیہے کی ہوک اٹھتی ہے

جبر لطافت

نغمہ جبر لطافت سے ہیں بے صدا ہم
جب ہم ہیں چھیڑتے ساز تو نغمے ہیں
کیسا اٹھتی ہے اک کسک عجیب سی ہم میں
بہ آن سوز و گداز ہوتے ہیں

نغمہ

رات کے پچھلے پہر سوتے ہوئے سنسان میں
کوئی بیٹھا ہے دل میں گاتا ہے
کوئی آئے تسلی کی تپش
دور سے دیکھے وہ تغافل کیش
ایک چپکے سے مجھ کو بلاتا ہے

شام غم

شام غم کی اداس تنہائی
جب کبھی مجھ کو یاد آتی ہے
دل کی گہرائیوں میں ایسے ہیں
ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

بشیر نیازی

ہسپانیہ کی بہترین خوفناک کہانیاں

شعلِ ماہتاب

میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ آیا تاریخی واقعہ ہے۔ جس کے ڈانڈے فسانے سے جا ملتے ہیں۔ یا ایک فسانہ ہے جو تاریخ کی حدود میں داخل ہے۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہے یہ ایک حقیقت —— ایک تلخ اور غم اندوز حقیقت —— چونکہ میرا تصور و تخیل ایک خاص نہج پہ مُرتب ہوا ہے اور میری طبیعت کی اُفتاد ایک نوعِ مخصوص پر ہوئی ہے۔ اس لئے میں اس واقعہ سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ دوسرے لوگ اس موضوع پر اس واقعہ کی مدد سے وجدانی فلسفہ کی ضخیم کتابیں مُرتب کر سکتے تھے۔ مگر میں اس مواد سے صرف ایک قصہ ترتیب دے سکا ہوں۔ اگر یہ قصہ درسِ عبرت نہ بن سکا۔ تو مجھے قوی اُمید ہے کہ کم از کم تفریحِ طبع کا سامان ضرور مہیا کرے گا۔

وہ عالی نسب تھا۔ اور اگرچہ اسکی تعلیم و تربیت آلاتِ حرب کے آغوش میں ہوئی تھی۔ مگر جس وقت کسی قدیم دستاویز پر جھکا ہوا اسلاف کی کسی نظم کا مُطالعہ کرتا، تو اس وقت کرخت ترین باجِ دُہل بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف مُنعطف کرنے میں کامیاب نہ ہوتی۔ اگر کوئی اس سے مُلاقات کے لئے آتا تو اُسے اپنے قلعہ کے وسیع صحن میں نہ پاتا۔ جہاں سائیس بچھڑوں کی تربیت میں مشغول، غلام بازِ نعل کو سدھانے میں مصروف اور سپاہی خالی اوقات میں تلواروں پر آب دینے میں منہمک نظر آتے۔

”تمہارے آقا مانریق کہاں ہیں؟“ اسکی ماں نوکروں سے سوال کرتی۔

”محترمہ! ہمیں کیا علم ہو سکتا ہے“ نوکر جواب دیتے ہیں ”ممکن ہے اس بوسیدہ خانقاہ کے کسی حُجرے میں پڑے ہوں۔ یا کسی شکستہ مقبرے میں مُردوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ پُل پر بیٹھے دھندوں میں پانی کی روانی کا نظارہ کر رہے ہوں، یا پھر کسی چٹان کے خلا میں لیٹے اختر شماری کر رہے ہونگے۔ آپ اُنہیں ہر اس جگہ پا سکتی ہیں جہاں دوسروں کا گُذر نہ ہوتا ہو“

حقیقتاً مانریق تنہائی پسند تھا۔ وہ اس حد تک عزلت گزیں واقع ہوا تھا کہ بعض اوقات تو اپنے سائے کی موجودگی سے بھی بیزار ہو جاتا کہ کاش یہ میرا تعاقب کرنے کے لئے پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ عزلت نشینی اس لئے مرغوبِ خاطر تھی کہ اس میں وہ اپنے تصور کو مطلق العنان کر دیتا تھا۔ اور اپنے واہمے سے ایک نئی دُنیا تخلیق کر لیا کرتا۔ جس میں اس کے شاعرانہ تاثرات کے نقوش ایک دوسرے سے مل کر عجیب و غریب ہستیاں پیدا کر دیتے۔ مانریق شاعر تھا —— ایک ایسا شاعر جو اُن اسالیبِ بیان سے کبھی مطمئن نہ ہوا جن میں وہ اپنے تاثرات کے نقوش کو پیش کرتا تھا۔ اور اسی لئے اُس نے اپنے اشعار کو حیطۂ تحریر میں لانا گوارا نہ کیا۔

اُسے یقین تھا کہ انگیٹھی سے اُٹھتے ہوئے شعلوں میں ہو قلموں پریاں رہتی ہیں۔ جو دہکتے ہوئے کُندوں پہ دوڑتی پھرتی ہیں

یا روشن چنگاریوں کے آتشیں حلقے میں، شعلوں کے سروں پر، زریں جگنوؤں کی طرح، رقص کرتی رہتی ہیں۔ گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا۔

اُسے اس خیال سے مسرت ہوتی کہ دریا کی موجوں کے نیچے، چشمے کے جھاگوں کے درمیان، اور جھیل سے اٹھتی ہوئی لہروں کے اندر پُراسرار مجسمے، جل پریاں یا بنات البحر رہتی ہیں، جو کبھی آہ و نالہ کرتی ہیں کبھی روح نواز نغمہ الاپتی ہیں اور کبھی دریا کی موجوں کے ساتھ قہقہہ بار ہوتی ہیں۔ وہ اُن کی زبان سمجھنے کے لئے بے چین رہتا۔

اُسے سائے سے نظر آئے ——— سحابِ رنگیں میں، نسیم صبح گاہی میں، لہلہاتے سبزہ زاروں میں، پہاڑ کے شگافوں میں۔ ——— دلکش آوازیں سُنائی دیتیں۔ مافوق الفطرت ہستیوں کے لطیف جسم آنکھوں کے سامنے رقص کرتے معلوم ہوتے۔ سرگوشیوں کی آواز سُنائی دیتی۔ جسے اُس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔

مُحبّت! وہ تخلیق ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ محبت کے خواب دیکھا کرے۔ مگر اُسے محسوس نہ کرے۔ وہ جس خاتون کو دیکھتا۔ اس سے محبت ہو جاتی۔ کسی کے سُنہرے بالوں پر جان دیتا۔ کسی کے لبوں کی سُرخی پر مرمٹتا۔ کسی کی کبک رفتاری پر غش ہوتا۔

بعض اوقات حالتِ محویت میں، ساری ساری رات دودھیالے بادلوں میں سے تیرتے ہوئے چاند کو تکا کرتا۔ کبھی تمام شب ہیرے کی طرح رنگ بدلنے والے دمکتے ستاروں کو گھورتے گذر جاتی۔ ان طویل شاعرانہ شب بیداریوں میں کبھی یوں چیخ اٹھتا۔

"اگر بقول تقدس مآب پادری یہ صحیح ہے کہ یہ نقطہ ہائے نور دنیائیں ہیں۔ یہ چاند جو بادلوں سے اوپر گردش کر رہا ہے انسانوں کی بستی ہے اور ان بقعہ ہائے نور میں بسنے والی عورتیں ایسے حُسن کی مالک ہیں جو بعید الفہم ہے۔ اور یہ کہ میں انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان سے محبت نہیں کر سکتا۔ تو اے خدا اُن کا حُسن کس نوعیت کا ہے۔ ان کی محبت کس قسم کی ہے؟"

مازیق ابھی اتنا پاگل تو نہ ہوا تھا کہ لڑکے بازاروں میں اس کا تعاقب کرتے۔ مگر اپنے آپ بُڑبُڑانا اور طرح طرح کی عجیب و غریب صورتیں بنانا اسکی عادت میں ضرور داخل ہو گیا تھا۔ یہ جنون نہ سہی مگر جنون کی جانب پہلا قدم ضرور تھا۔

(۲)

دریائے ڈومیسرا پر ایک پُل تعمیر ہے جہاں سے محافظینِ حجاج کی ایک قدیم خانقاہ کو راستہ جاتا ہے۔ اس خانقاہ کی متعلقہ اراضی دریائے ڈومیسرا کے ساحل پر دور تک چلی گئی ہے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت تک یہ محافظین اپنے تاریخی قلعہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے تھے مگر قلعہ میں برجوں کے کھنڈر اور دیگر آثار صنادید ابھی تک باقی تھے۔ وزنی محرابوں سے لدی ہوئی خود رو بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور گرد کے بلند و بالا درختوں میں سے گذرتی ہوئی ہوا قلعہ کی صحنچیوں میں نوحہ کرتی سُنائی دیتی تھی۔

باغ میں جس کی روشیں سالہا سال سے "ہلاکِ حسرت پابوس" تھیں، خود رو پودے اور بیلیں فراوانی سے اُگ آئی تھیں جن کی مشاطگی انسان کے سلیقہ مند ہاتھوں نے عرصے سے نہ کی تھی۔ درختوں کے پُرانے تنوں پر عشق پیچاں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اُن کی شاخیں ایک دوسرے سے ملکر اس طرح گتھ گئی تھیں۔ کہ ایک نباتاتی سقف کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ پُرانی دیواروں کے کھنڈروں پر سُرخ پتیوں کی جنبش ایسی معلوم ہوتی تھی کہ بہادر سپاہیوں کے خودوں کی کلغی دھوپ میں جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ ہر شے پر ویرانی کا تسلط تھا۔

... ماہتاب کا وقت تھا ——— کیا ہی خوشگوار رات، عطر بیز ہوا سے بسی ہوئی، خوش الحانیوں کی حامل، بالکشانِ محبت کے درد کا مداوا ——— چاند اپنی تمام ضو فشانیوں کے ساتھ قندیل کی طرح شفاف اور نیلگوں آسمان میں لٹک رہا تھا۔

مانزیق جس کا دماغ شاعرانہ تخئیل کے بارے گردش کر رہا تھا، پل کے قریب آیا۔ کچھ دیر تک وہاں کھڑے ہو کر افق پر قائم شدہ سنہلی بادلوں کے پس منظر میں بستی کے دھندلے اور مٹے مٹے نقوش سے چند لمحوں کے لئے متاثر ہوا۔ اور پھر پل عبور کر کے خانقاہ کا راستہ لیا۔

آدھی رات کا گھڑیال بجا۔ چاند گردش کرتا پورے عروج پر آگیا۔ مانزیق ایک تنگ و تاریک خیاباں کے سرے پر پہنچا جہاں سے ساحلِ دریا کو راستہ جاتا تھا۔ مانزیق نے اس مقام پر ایک دلدوز چیخ ماری ——— ایسی چیخ جس میں بیک وقت تعجب، خوف اور شادمانی کی متضاد کیفیات شامل تھیں۔

اس خیاباں کے دوسرے سرے پر اس نے کسی سفید پوش کو گذرتے دیکھا۔ یہ حسین و جمیل پیکر چشم زدن میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر تاریکی میں جذب ہو گیا۔ اس نے صاف طور پر کسی عورت کے سفید پلے کو زمین پر عجلت سے گھسٹتے دیکھا۔ مانزیق کو ——— ناممکنات و واہمات کا خواب دیکھنے والے مانزیق کو ——— باغ میں داخل ہوتے دیکھکر وہ عورت درختوں کے پتوں میں جا چھپی۔

"ایک نامعلوم عورت! اس مقام پر اور ایسے وقت! یہ وہی عورت ہے جس کی میں تلاش میں تھا" مانزیق چلایا اور تیر کی طرح اس کے پیچھے دوڑا۔

۲

مانزیق ان جھاڑیوں کے نزدیک پہونچا جہاں وہ پُراسرار خاتون غائب ہو گئی! کس طرف؟ دوران درختوں کے تنوں میں جنگی شاخیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔ اُسے کوئی نازک سی چیز دکھائی دی ——— سفید اور متحرک پیکر۔

"وہ رہی وہ غارتگرِ ہوش و خرد، وہ ہے۔ کس قدر سُبک رفتار۔ آہ "چال جیسے کڑی کمان کا تیر" ——— سایہ کی طرح گریزاں" یہ کہتا ہوا مانزیق اُسکے پیچھے جھپٹا۔ دونوں ہاتھوں سے بیلوں اور ٹہنیوں کو نوچتا جاتا تھا اور بھاگتا جاتا تھا۔

اسی طرح والہانہ طور پر بھاگتا ہوا ایک کھلے میدان میں آیا۔ جو چاند کی صاف و شفاف روشنی سے منور ہو رہا تھا۔

کوئی بھی نہیں۔

"آہ وہ اسی راستہ سے گئی تھی۔ اسی راستہ سے" وہ چلایا "ہاں میں سن رہا ہوں وہ پتوں کو روندتی ہوئی جا رہی ہے۔ دیکھو وہ پلّہ کی سرسراہٹ سنائی دی" وہ پاگلوں کی طرح کبھی اس طرف بھاگتا کبھی اس طرف، مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔

"مگر مجھے اسکے نازک قدموں کی چاپ تو آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کی آواز بھی سن رہا ہوں۔ ہوا کے سناٹے اور شاخوں کی کھڑکھڑانے مجھے سننے ہی نہیں دیا۔ کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ مگر بلا شک و شبہ جب وہ یہاں سے گذری تھی تو اُس نے کچھ کہا ضرور تھا۔ مگر کس زبان میں؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید کوئی غیر زبان تھی"

مانزیق اس کا تعاقب کرتا رہا۔ کبھی وہ اسکی آواز سننے لگتا اور اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ کبھی ان متحرک شاخوں کو

محبت تھی وہ جیسے یکایک غائب ہو گیا تھا۔ کبھی اُسے خیال ہوتا کہ وہ اُسکے نقشِ قدم دیکھ رہا ہے۔ کبھی آہٹ گماں ہوتی جو جھاڑیوں کے عقب سے آ رہی ہو
گئے ہوتے تھے اس کے پکے رنگ دبوکے نقش تحریر کا دھوکا ہوتا۔ اسی طرح الجھتا ہوا بھول بھلیاں میں اس کی تلاش میں سرگرداں رہا ——— مگر سب بیسود۔

کئی گھنٹے مسلسل پریشان و سرگرداں پھر کر تھک کر چور ہو گیا۔ مگر پھر بھی جوشِ جستجو میں آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ شہزادہ خود وہ سبزہ پوش پیش اسی خوبصورت جسمے کے تعاقب میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محبوب کی تلاش کے لیے بے چین و بے تاب ہو رہا ہو۔

اسی طرح بادیہ پیمائی کرتا ساحل دریا کے اس مقام پر پہونچا جہاں ایک چٹان پر ایک بلند سی گھاٹی ہے۔

ممکن ہے اس بلندی سے مجھے اُسکے نقشِ قدم کا پتہ چل سکے اس نے زور سے بڑبڑاتے ہوئے کہا

آخرکار وہ چٹان کی چوٹی پر جا پہونچا جہاں سے دُور فاصلہ پر شہر نظر آ رہا تھا اور اس کے قدموں میں دریائے موتیرا کی تند و تیز موجیں چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ ماتریق نے وسعتِ نظر تک اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ پھر یکایک وہ چونکا۔ اس نے ایک کشتی میں روشنی کی ایک کرن دیکھی۔ وہ کشتی مقابل کے ساحل کی طرف رواں تھی۔

اس سفینہ میں ماتریق نے ایک سفید پوش پیکرِ حُسن کو جلوہ افروز دیکھا ——— ایک سرو قد نازک اندام پیکرِ نسائیت ——— ایک عورت۔ بلاشبہ وہی عورت جسے اس نے چمنستان میں دیکھا تھا۔ وہی عورت جو عرصے سے اس کے خیالوں میں بسی تھی جو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز تھی۔ یہ منظر دیکھتے ہی ماتریق ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا شہر کی جانب روانہ ہوا۔ ٹوپی ایک طرف پھینکی، لبادہ دوسری طرف ڈالا اور بجلی کی سی تیز رفتاری سے افتاں و خیزاں پل پر سے گزرتا ہوا اس اُمید میں جانبِ شہر چلا کہ اس کشتی سے پہلے شہر پہونچ جائے۔

اُمید موہوم!

جس وقت ماتریق ہانپتا کانپتا شہر کے دروازے پر پہونچا۔ کشتی کے مسافر پہلے ہی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

۴

گو ماتریق کشتی کے مسافروں سے ملنے کی تمام اُمیدیں منقطع کر چکا تھا۔ مگر ان کی جائے اقامت کی تلاش سے مایوس نہ ہوا تھا۔ اس اُمید کو دل میں لئے ہوئے شہر میں داخل ہوا۔ اور شہر کے خاموش گلی کوچوں میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ شہر میں چاروں طرف سکوت و خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جو صرف کتوں کے بھونکنے، دروازوں کے بند ہونے یا گھوڑوں کے ہنہنانے سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتی تھی۔ شبِ تار کی ان مختلف آوازوں کو سنتا ہوا ماتریق آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسی اثنا میں اُسے خیال ہوا کہ ایک ویران کوچے سے قدموں کی آہٹ آ رہی ہے۔

اسی طرح رات کا بیشتر حصہ کوچہ نوردی میں گزر گیا۔

آخرکار وہ ایک عالیشان مکان کے سامنے رُکا جس کی دیواریں زمانے کے ہاتھوں سیاہ ہو چکی تھیں۔ اس محل کے سامنے پہونچ کر ماتریق کی آنکھیں ایک ناقابلِ بیان جذبۂ مسرت سے چمک اٹھیں۔ اس عالیشان مکان کی ایک بلند کھڑکی سے روشنی کی ایک شعاع گلابی رنگ کے ہلکے ریشمیں پردوں میں سے چھن کر مقابل کی ایک عمارت کی پرانی دیوار پر پڑ رہی تھی۔

"وہ شب بھر یہیں رہتی ہے؟" مانریق نے کھڑکی پر غور سے نگاہ ڈالتے ہوئے سرگوشی کی آواز میں کہا۔ "وہ یہیں رہتی ہے، پُشت کے سے یہ داخل ہوتی تھی۔ اس محل میں داخل ہونے کا یہی راستہ ہے۔ اس محل کے کسی کمرے میں کوئی شخص رہتا ہے۔ جو خود شب میں نگرانی کا فرض سرانجام دیتا ہے۔ یہ کون شخص ہے۔ بجز اس کے کون ہو سکتا ہے جو آتی رات گئے شب گردی کر کے واپس ہوتی ہے یقیناً وہ یہیں رہتی ہے۔"

اس طرف سے قطعی مطمئن ہو کر اور اپنے والہانہ تصور کی جولانیوں کو مطلق العنان کر کے مانریق طلوع صبح کا انتظار کرنے لگا۔

تمام شب روشنی اسی طرح کھڑکی سے آتی رہی۔ اور جس پر سے اس نے ایک لمحہ کیلئے بھی نظر نہیں ہٹائی۔

صبح صادق کے وقت محل کے وزنی دروازے آہستہ آہستہ ایک کرخت آواز کے ساتھ کھلنے شروع ہوئے۔ محل کے اندر صاحب خانہ کے چمکدار اور خیرہ کن زرہ بکتر دیواروں پر سجے نظر آرہے تھے۔ ایک خادم کنجیوں کا گچھا لئے ہوئے دروازے پر نمودار ہوا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے ایک جمائی لی۔ جس نے اُسکے دہن میں ایک ایسی حسین بتیسی کی نمائش کی جس پر نہنگ کو بھی رشک آئے۔

مانریق اس خادم کو دیکھ کر چشم زدن میں اسکے قریب جا پہونچا۔ "اس مکان میں کون رہتا ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ وہ رات کو کہاں سے آتی ہے؟ اس شہر میں رہنے سے اس کا کیا مقصد ہے؟ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟ جواب دے۔"

مانریق نے خادم پر سوالات کی اس بُری طرح بوچھاڑ کی اور اُسے اس خوفناک طریقے پر جھنجوڑا کہ غریب مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور شکستہ جملوں میں بولا "یہ مکان شہنشاہِ عالم پناہ کے امیر شکار کا ہے جو "مورز" کے خلاف جنگ میں زخمی ہو کر یہاں آرام کی غرض سے مقیم ہیں۔"

"اور اُس کی دختر یا اُس کی ہمشیرہ یا اُس کی شریکِ حیات غرض کوئی بھی ——— اور وہ؟" مانریق نے بے چینی سے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"محل میں کوئی عورت نہیں رہتی۔"

"کوئی عورت نہیں! تو پھر اس کمرے میں کون رہتا ہے جس میں رات بھر روشنی ہوتی رہی؟"

"وہ میرے آقا کا کمرہ ہے ——— وہ بیمار ہونے کی وجہ سے تمام شب شمع جلائے رکھتے ہیں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی مانریق کچھ اس درجہ بدحواس ہوا کہ اگر آسمان سے بجلی بھی گر پڑتی تو وہ اتنا متاثر نہ ہوتا۔

۵

"میں پھر اُسے تلاش کروں گا۔ میں اُس کی جستجو میں سرگرداں رہوں گا۔ اور میں اس تلاش میں کامیاب ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ میں اُسے پہچان لوں گا۔"

"مگر کیسے؟"

"میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میں اُسے پہچان ضرور لونگا۔ اُس کے پاؤں کی چاپ، اس کی گفتگو کا لہجہ، اُسکے دوپٹے کا پلو ——— یہی میرے لئے کافی ہونگے۔ شب و روز میں نے اُس کے لباس کی سرسراہٹ، اسکے الفاظ کی اُڑتی سی بھنک سنی ہے۔ وہ کیا کہا کرتی تھی، آہ کاش میں معلوم کر سکتا۔ یقیناً میں اُسے پہچان جاؤں گا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے۔ اور دل کبھی دھوکا نہیں دیتا۔

اگرچہ یہ مبہم سے کہ میں نے شوریا کا چپہ چپہ چھان مارا اور اُسکی جستجو میں اپنی راتیں کالی کردیں، خادموں اور اصیلوں کی لب کشائی کے
لئے، روپیہ پانی کر ڈالا، انہیں سے بہت سی منتیں اور مُرادیں بھی مانیں — مگر نتیجہ — نتیجہ — نتیجہ معلوم۔ ایک رات نماز کے بعد ایک
احمق دیوانے کی طرح اسقف اعظم کے عقب میں دُور تک چلا گیا۔ صرف اس لئے کہ اُسکے لبادہ کی سنجاف میرے نادیدہ محبوب کے حسین
لباس سے مُشابہ تھی۔ مگر کچھ پروا نہیں میں اُسے تلاش کرلوں گا۔ اُس مجسمۂ حُسن و رعنائی کا حصول اس جستجوئے پیہم کی کلفتوں کو آن کی آن
میں دُور کردے گا۔"

"اُس کی چشم نیم باز کا رنگ کیسا ہے! یقیناً وہ نیلگوں ہوگی۔ نیلگوں — شام کے آسمان کی طرح۔ مجھے نیلگوں آنکھوں سے
عشق ہے۔ وہ جذبات سے کس قدر معمور ہوتی ہیں — اور بہار۔ لیکن اگر — نہیں نہیں! اس کی آنکھیں یقیناً نیلگوں ہیں۔ اُسکے
گیسو سیاہ، شب تار کی طرح، اور دراز شب ہجر کی طرح، اُسکے شانوں پر پریشان رہتے ہیں۔

"اور اُسکی آواز! ہاں ہاں میرے کان اُسکی آواز سے آشنا ہیں۔ اُسکی آواز ایسی شیریں ہے جیسے باد بہاری کا نغمہ۔ اُس کے
قدموں کی چاپ ایسی ہی تلی جیسے موسیقی کا زیروبم۔"

"اور یہ جمیل پیکر نسائیت جسے میری جوانی کے حسین ترین خوابوں پر سبقت حاصل ہے۔ جس کا تفکر میرا تفکر ہے،
جس کی محبت میری محبت ہے اور جو میری رُوح کا تکملہ ہے۔ کیا وہ مجھے دیکھکر اپنے پہلو میں دھڑکن نہ محسوس کرے گی۔ کیا وہ مجھسے
محبت نہ کرے گی جس طرح میں اس سے محبت کروں گا۔ اور جس طرح میں پہلے ہی اس سے محبت کرتا ہوں۔ اپنی زندگی کی تمام
قوتوں کے ساتھ اپنی رُوح کی تمام ودیعات کے ساتھ۔"

"چلو۔ چلو۔ وہیں! اسی جگہ جہاں میں نے اُسے پہلی بار صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ کون جانتا ہے کہ وہ جو میری ہی طرح متلون
مزاج ہے اور جو خوابوں کی نگری میں بسنے والی روحوں کی طرح تنہائی پسند اور پُراسرار ہے۔ ممکن ہے خاموش راتوں میں ویرانوں کے
سناٹے میں گشت کرنا اُسکے لئے باعثِ مسرت ہوتا ہو۔"

اسی طرح دو ماہ گذر گئے۔ اور مانزیلق ہوائی قلعے بناتا رہا مگر ایسے قلعے جن کے لئے بادِ صرصر کے ہر جھونکے پر معدوم
ہو جانا قسمت کیا گیا تھا۔ نادیدہ محبوب کی جستجوئے لاحاصل میں پورے سات دن گذر گئے۔ مگر اس کا جوشِ تجسس تیز سے تیز تر ہوتا
گیا۔ ایک شام کو خیالات میں مستغرق، وہ ایسے مقام پر پہونچا جہاں سے خانقاہ کو راستہ جاتا تھا۔ وہاں سے چمنستان کا رُخ کیا۔ تاکہ
ایک دفعہ اور درختوں کی پتیوں میں اس پیکر جمیل کی تلاش کرے۔

— ۶ —

پُرسکون اور حسین رات تھی۔ چاند اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ نظام شمسی کے بلند ترین نقطہ سے چمک رہا تھا۔ ہوا چمنستان
کے درختوں کی پتیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

مانزیلق خانقاہ کے حجرے کے قریب پہونچا، اور محرابوں کے وزنی ستونوں کے درمیان، وسعتِ نظر تک دیکھا۔ تمام
خانقاہ ویران پڑی تھی۔ وہ واپس ہوا اور اس تنگ و تاریک غلام گردش کی طرف رُخ کیا۔ جہاں سے دریائے ڈوئیرا کو راستہ جاتا تھا۔
اس غلام گردش میں ابھی مشکل ہی سے داخل ہوا تھا کہ اسکے مُنہ سے مسرت کی ایک چیخ نکل گئی۔

ایک لمحہ کے لئے مانزیق نے اُس سفید لباس کی جھلک دیکھی۔ وہ سفید لباس جو اُس کی تمناؤں کا مرکز تھا اور وہ لباس جس سے زیب و زینت تھی اس جمیل ہستی کی جو مانزیق کی معبودِ خیال تھی۔ اور جس کی وہ اپنی تباہی کی حد تک پرستش کرتا تھا۔

وہ اُس کے عقب میں چلا۔ اس جگہ پہونچا جہاں اُس نے اس مہ جبین کو پوشیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ ساکن و خاموش ماہتاب پر اپنی پریشان آنکھیں جما کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔ جس نے بڑھتے بڑھتے لرزہ کی صورت اختیار کر لی اور آخر کار اُس نے ایک سخت قہقہہ لگایا۔ بلند، طویل اور خوفناک۔

اس ہلکی، رواں، اور سفید شے نے مانزیق کی نظر کو تھوڑی دیر کے لئے خیرہ کر دیا۔ محض چند لمحوں کیلئے۔

وہ صرف شعاعِ ماہتاب تھی۔ جس کی چمک کچھ کچھ وقفہ کے بعد درختوں کی گھنی پتیوں میں سے جب ہوا انہیں جُدا کر دیتی تھی نظر آجاتی تھی۔

چند سال گذر گئے۔ مانزیق اپنے محل میں آتش دان کے قریب ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھا ہوا ہے۔ آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بھیانک چمک ہے۔ نگاہ بلا مقصد اِدھر اُدھر جگہ لگا رہی ہے۔ اور ایک دیوانے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ مادرِ مہربان کی شفقتوں اور خادموں کی مدارات سے بالکل بے خبر بیٹھا ہے۔

"تم خوبصورت، وجیہہ اور نوجوان ہو۔ تنہا کیوں رہتے ہو؟ کیوں کسی خاتون کو تلاش نہیں کر لیتے۔ جس سے تم محبت کر سکو اور جو تمہاری محبت کا جواب دے سکے" اُسکی ماں نے کہا۔

"محبت؟ محبت تو ایک شعاعِ ماہتاب ہے" نوجوان نے جواب دیا۔

"حضور اپنی اس خواب آلودگی کو دُور کیوں نہیں کرتے؟ زرہ بکتر زیبِ تن کیجئے۔ اسلاحِ جنگ جسم پر آراستہ کیجئے اپنے نشان کا پھریرا ہوا میں اُڑائیے۔ اور جنگ میں شرکت کیجئے۔ یہ صرف جنگ ہی تو ہے جو انسان کو رفیع الشان بنا دیتی ہے" محافظ نے کہا۔

"شان! شان تو ایک شعاعِ ماہتاب ہے"

"اگر پسندِ خاطر ہو تو کوئی راگ سُناؤں؟"

"نہیں، نہیں" مانزیق چلایا "میں کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں صرف —— تنہائی چاہتا ہوں، نغمہ، محبت، رفعت، مسرت —— سب ہمارے تصور کے تخلیق کردہ لایعنی پیکر، جنہیں ہمارا واہمہ پرورش کرتا رہتا ہے۔ واہمہ جو ہماری رہبری کرتا ہے۔ کہاں؟ کس مقصد کی طرف؟ محض ایک شعاعِ ماہتاب کے حصول کی طرف!"

(ترجمہ) —— ممتاز حسین۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی

جانِ بلاغت

گردشِ قسمت بنا پندارِ مستانہ ترا
آ گیا چکّر میں ساقی آج پیمانہ ترا

بزمِ دُنیا میں انہی دو نونکے دم کی ہی بہار
شمع ہے مونس مری، دلسوز پروانہ ترا

تیری رسم و راہ کے اللہ رے رنگِ فریب
دوستی ہی شیخ سی کافر سے یارانہ ترا

دامنِ تر سے بھی اپنا تو نہ نکلا کوئی کام
کیا خبر کس کے تصرّف میں ہی میخانہ ترا

نیند کا کیا ذکر اپنے تو اُڑے جاتے ہیں ہوش
فتنۂ خاموش ہی کہنے کو افسانہ ترا

رونقِ گورِ غریباں بڑھ رہی ہی صبح و شام
ہو رہا ہی رات دن آباد ویرانہ ترا

پھر گیا آنکھوں میں نقشہ عالمِ تصویر کا
دیکھ کر اندازِ دُنیا سے جُدا گانہ ترا

اپنے گیسو کی بلائیں غیر کو لینے نہ دے
پھر نہ سنبھلے گا بگڑ بیٹھا جو دیوانہ ترا

میں ہوں تیری خاطرِ برہم کا دیوانہ تپش
مجھکو ہی دل سی پسند اندازِ مستانہ ترا

بسمل

لمعات

چھپتا ہی کب چھپائے سے وہ حسنِ بے پناہ
گہ مہرِ نیمروز ہے گہ ماہِ نیم ماہ

ہوتی ہے ہر قدم پہ سوا وسعتِ نگاہ
سُرمہ سے کم نہیں ہے مرے حق میں گردِ راہ

دُنیا مری نگاہ میں کیونکر نہ ہو عزیز
دل جسکو ڈھونڈتا ہے یہ ہے اُس کی جلوہ گاہ

اس کا جواب اس کا مقابل کوئی نہیں
اپنی نظیر آپ ہے وہ بُت خُدا گواہ

ہر وقت سامنے ہے کوئی شوخِ بے حجاب
جس دن سے درمیاں نہ رہا پردۂ نگاہ

کیا کہہ رہا ہے واعظِ خوش گو زباں روک
ذکرِ عذاب سے نہ بڑھا قیمتِ گناہ

عمرِ عزیز ایک روش پر ہے گامزن
دل وقفِ پیچ و تاب ہے آنکھیں ہیں فرشِ راہ

اے دل دُھواں سا کچھ نظر آتا ہے ہر طرف
یہ ہے سوادِ منزلِ آخر کہ دودِ آہ

کیا پوچھتے ہو کوکبِ حسرت نصیب کو
آنکھوں میں دم ہے اور لبوں پر ہجومِ آہ

حسرت [illegible]

سمندر

(ساحلِ اپالو کے ایک نظارہ سے متاثر ہو کر)

میرے سامنے آنسوؤں کی لاتعداد بوندیں تھرک رہی ہیں، اور ہر بوند میں یاس و فراق کی بوندیں سسک رہی ہیں۔

مجھے ان خاموش پہاڑیوں کی صدائے بازگشت میں، بادلوں کی معنی خیز جنبش میں، ہوا کے جھونکوں کی پیہم ٹکراہٹ میں ـــ اور سمندر کی بلاخیز ہنگامہ آرائیوں میں فغان و فریاد کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ـــ معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز جتنی لازوال ہے، اُسے اتنا ہی کم سکون و قرار ودیعت ہوا ہے۔

یہ کشتی میرے دل کی طرح مضطرب ہے۔ یہ ستارے میرے جذبات کی مانند لرزاں ہیں، یہ چاند میرے مستقبل کی طرح دھندلا ہے۔ سمندر کی وسعت کو ساحل قید میں رکھنا چاہتا ہے، کہر چاند کی ضیا کا رہزن بن گیا ہے۔ اور میں آپ اپنی بےچارگی کا اسیر بن رہا ہوں۔

آخر اس ناپیدا کنار لامحدود سمندر کو آرام کیوں نہیں، کسی کی جدائی اُسے ہمیشہ پریشان رکھتی ہے۔ روزِ ازل سے وہ مصروفِ سینہ کاوی ہے۔ جیسے ساحل نے اُس کے محبوب کو چھپا رکھا ہو اور لہروں کے لشکر اس سے نبرد آزمائی کے لئے آتے ہوں، ٹکرا کر پیچھے بھاگتے اور پھر لپکتے ہوں۔

نیلگوں آسمان اور نیلگوں سمندر ـــ جن کے بیچوں بیچ سورج خون کی ایک بوند بن کر تھرا رہا ہے۔ آسمان اپنی امانت سمندر کے سپرد کر رہا ہے، جو مغرب کے اُفق پر انقلاب کے سرخ پرچم کی طرح لہرا رہا ہے۔ اب وہ دیکھو بید او گرماہِ تاباں ہزار آرائش مسندِ نیلوفری پر جلوہ افروز ہوا اور سمندر کے بیتاب آغوش کو اپنی آرسی بنانے لگا۔ اتنا وسیع اور پُرشوکت سمندر، طوفان و تلاطم، معبود ـــ اس عشوہ گری سے مسحور و مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ سرابِ صحرا کی طرح عکسِ رُخِ یار اُسکی آنکھوں کے آگے پھر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے دلنشیں کرلے۔ کتنی مدت سے وہ یہ ناکام جدوجہد کر رہا ہے، مگر قریب ہوتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور حدِ فاصل ہے۔ سمندر کبھی بادلوں کو اڑاتا اور اُسکے رُخِ روشن پر نقاب ڈال دیتا ہے۔ لیکن اُسے چھیڑنے کیلئے ہوا انہیں فوراً منتشر کر دیتی ہے ـــ اور کسی کے نقشِ پا کی تلاش میں وہ ریگ کے تودوں کو چومتا اور آہ بھرتا ہوا دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

قدرت کی بےحسی اور زمانہ کی سردمہری کے خلاف میں ہر چیز کی زبان سے شورِ احتجاج سنتا ہوں۔ پھول کا مرجھانا شباب کی بےثباتی کے خلاف اظہارِ ناراضگی ہے، اور حسن کا بجلی کی طرح تڑپ کر بجھ جانا، قدرت اور اُسکے جبروت کے خلاف اعلانِ بغاوت! آنسو اس غم و غصہ کی تفسیر ہے ـــ اور سمندر آنسوؤں کا آماجگاہ ہے۔

شب کی سیاہی میری بدبختی کی طرح گہری ہوتی جاتی ہے، زندگی کے سونے پن کی مانند خاموشی پھیلتی جاتی ہے، میرے ہولِ دل کی طرح سمندر کی بیتابی بڑھتی جاتی ہے۔ زبانِ حال سے وہ ساحل سے کچھ کہتا اور پھر بروگ کے گیت گاتا ہوا بھٹکنے لگتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سفید کشتیاں آسمان کے تاروں کی طرح رقص کر رہی ہیں۔ حدِ نظر پر اُمید کی کرنوں کی طرح لائٹ ہاؤس کے چراغ روشن ہیں۔ آسمان و

سمندر نے گویا انسانیت کے مزار پر تاریکی کا گنبد کھڑا کر دیا ہے۔ ہوا کی خنکی و تری میں وہ لطف پنہاں ہے جو تصورِ جاناں کے سوا کہیں نصیب نہیں۔
تاروں کی پھیکی روشنی میں سیاہ چٹانیں یوں نمایاں ہیں جیسے انسان کے گناہ باطل کے چھیانے۔

فضا کی اس خاموش موسیقیت میں جہاز کی سیٹی یوں مخل انداز ہوتی ہے جیسے محفلِ رقص و سرود میں صوفی کا حال و قال یا کوئی پرندہ جاتے پناہ کی تلاش سے تھک کر دردناک آواز میں یوں چیخ اٹھتا ہے کہ مجھے شک ہوتا ہے کہ میں تنہائی سے تھک کر میں خود رو رہا ہوں۔

دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹ کر فضائے آسمان کو چیرتا ہوا اپنی نورپاشیوں کے ساتھ نیچے گرتا اور سطحِ آب تک پہنچتے پہنچتے یوں ٹھنڈا ہو جاتا ہے جیسے شمعِ روشن کو کسی نے یکبارگی گل کر دیا ہو۔ گھڑی بھر پہلے یہ جہاں نصیب رنگینیوں کی دنیا میں محوِ خواب تھا اور اب تحت الثریٰ میں ہمیشہ کے لئے یوں پھینک دیا گیا جیسے کوئی فرشتہ بارگاہِ ایزدی سے مردود قرار پائے۔ پانی کے کچھ بلبلے اُٹھ قبر میں لٹا کر لہروں سے کچھ سرگوشی کرتے اور خود بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

میری نظر اور سمندر کے درمیان کہاسے نے یوں پردہ ڈال دیا ہے گویا حقیقت اور تخئیل کے بیچ مبالغہ حائل ہو جائے۔ جس طرح پیری اور موت کے درمیان شباب کی کیف آور یاد ایک گھونگٹ ڈال دے، جسے اصلیت کا ہلکا سا مس اسی طرح ہٹا دیتا ہے جیسے ایک ذرا سی جنبش اُسے مرتعش کر دے۔ بس ویسے ہی یہ کہاسہ سمندر کی ساری مہیب کاریوں کو چھپا کر میری نظر کے آگے لئے بڑی نزاکت سے سنوار رہا ہو جیسے موت کے بعید از فہم ۔۔۔ اور زندگی کی محتاجی کے بیچ راز سربستہ کی ایک چادر سی پڑی ہوتی ہے۔ ویسے ہی اس بحر الم اور میری غمناکی کے بیچ فریبِ نظر اپنی جولانیاں دکھلا رہا ہے۔

جوار کی وجہ سے سمندر کا پانی یوں اوپر چڑھ رہا ہے جیسے جذبات کا ہیجان خون میں گرمی پیدا کرے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ جوشِ الفت کی طرح اتر جائیگا۔ یاد دلانے کیلئے زمین پر گیلاپن اور دل میں ایک کسک رہ جائے گی۔

سمندر کے پانی کو میں نے چھو کر دیکھا ۔۔۔ وہ اتنا سرد نہیں جتنے میرے سرد ہاتھ! یہ روز بروز زیادہ سرد ہوتے جاتے ہیں، دل کا جو خون چلتا ہے، وہ نبض تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتا ہے۔ گویا موت اپنی سرد انگلیاں اُن میں ڈالکر مجھ سے معانقہ کرنا چاہتی ہے۔

صبح ہوگی اور سمندر کو قرار آنے لگے گا۔ شفق کے تمدے بارلبِ لعل اس کی تشنگی کو مٹا دیں گے۔ سورج اسکی گہرائیوں کو منور کر دے گا۔ پُرسکون ہوائیں اُس کے تلاطم خیز جذبات کو تھپک کر سلا دینگی - ایک دلِ دیوانہ کے سوا دُنیا کی ہر چیز کو قرار آسکتا ہے۔

تاریکی اور تنہائی ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک قبر میں لیٹا ہوں جس پر آتشیں لاوے کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا نے مجھے کسی برفستان میں پھینک دیا ہے۔ زندگی کا احساس دلانے کے لئے کوئی میرے سرد ہاتھوں میں بجلی رکھدیتا ہے۔

سمندر! صرف تیرا وجود خدا کے آگے انسان کو سربسجود کرنے کے لئے کافی تھا۔

دلِ بیقرار! تیرا مستقبل اضطراب خدا کے خلاف دعوتِ جہاد ہے!

بمبئی یکم نومبر

اختر حسین رائے پوری

نخلِ ماتم

نوٹ: پیاری اسابیلا، بنتِ اطالیہ میناکی لیلیٰ، کیوپڈ کی پجاری، ایک امیر کبیر کی بیٹی ہے۔ باپ داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ زر پرست بھائی نوجوان بہن کی شادی بخیال تقاسمۂ املاک نہیں کرتے۔ مجبور فطرت بیکس، خوبصورت لورینزو کے ہاتھ نقد دل ہار بیٹھتی ہے۔ جو گھر کا مصدی، پیشکار، خانساماں، کُل کلان ہے۔ دونوں کا راز طشت از بام ہونے پر لورینزو بھائیوں کے وحشیانہ انتقام کا شکار ہوتا ہے۔ جس کی خبر بہن کو نہیں ہونے پاتی۔ لیکن دو عشق بھرے دلوں میں باہم دگر راہ ہے۔ اسابیلا عالم منام میں اُس کی مجبوری اور بیکسی کی موت سے مطلع ہو کر اس کا سر لے آتی ہے اور اُس کو ایک گملے میں رکھکر تلسی یا بنفشہ کا پودا اس میں لگا دیتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں اس ٹریجڈی پر ایک برڈن سانگ (Burden Song) لکھا جاتا ہے۔ یہ ہے مختصر تشریح ہماری نظم "نخلِ ماتم" کی۔

بیدل

اے نہالِ یاس و حرماں اے محبت کے شجر
باغِ عالم میں رہے سرسبز تو شام و سحر
کشت زارِ غم میں ہو بالیدگی حاصل تجھے
تجھ کو میری چشمِ گریاں قلبِ سوزاں کی قسم
تجھ کو میری بیکسیِ شامِ ہجراں کی قسم
تیرے قرباں پھول پھل لا شاخ و برگ و بار لا
تجھ کو میرے عاشقِ برگشتہ قسمت کی قسم
تجھ کو میرے کشتۂ شمشیرِ حسرت کی قسم
تو ثمرِ جاودانِ عیش و عشرت بن کے پھل
کیوں نہ سینچوں تجھکو آبِ اشک سے میں سوگوار
تیرے نظارے سے پاتا ہے دلِ مضطر قرار
یادگارِ عیشِ رفتہ حبذا اے نخلِ غم
سرِ پنہاں تیرا سر ہے عاشقِ جانباز کا
تو ہے قامت میں نمونہ سرو قدِ ناز کا
اس قتیلِ جور کے میں بھی عزاداروں میں ہوں

اے متاعِ نامرادی مثمرِ دردِ جگر
ہو یہ نہیں بے ساز و برگی میری تجھ سے بارور
تجھ سے میری نامرادی پھولتی پھلتی رہے
تجھ کو میرے حسرت و اندوہ و حرماں کی قسم
موبمو تجھکو مرے حالِ پریشاں کی قسم
تجھ سے پاتی ہیں مری محرومیاں نشو و نما
تجھ کو میرے بادیہ پیمائے غربت کی قسم
تجھ کو میرے فدیۂ عشق و محبت کی قسم
تو بہارِ بےخزانِ عیش و عشرت بن کے پھل
اک مُوئی مٹی کی ہے عالم میں تو بھی یادگار
نامرادی کے چمن کی تجھ سے تازہ ہے بہار
مونسِ غمگیں دلاں صد مرحبا اے نخلِ غم
تجھ سے قائم ہے نشاں پامالِ سرافراز کا
یعنی تو نخلِ عزا ہے عاشقِ ممتاز کا
تو اگر ہے نخلِ ماتم میں ہوا داروں میں ہوں

اُس کے فرقِ ناز کا اے آہ گہوارا ہے تُو
تُو ہے مرہم میرے دل کا آنکھ کا تارا ہے تُو
دیکھ لیتی ہوں تجھے جب مضطرب پاتی ہوں دل
اُس کی بوئے زلف سے تیرا معطر ہے مشام
اُس کی چشمِ شوخ کی ہیں تو خیاں تجھ میں تمام
بھینی بھینی تجھ سے آجاتی ہے مجھکو بوئے دوست
عارضِ جاناں کی سب تب تجھ میں جلوہ ریز ہاں
تیری شاخوں میں تمام ابرو کی دل آویزیاں
تو سراپا آئینہ دارِ جمالِ یار ہے
تو رہا ہے بادہ پیمائے وصالِ ہمنشیں
ذات میں ساری ہیں تیرے سب کمالِ ہمنشیں
اے شجر تو ہی بتا کیسے نہ تو محبوب ہو
تجھ سے وابستہ نہ کیوں ہو میری ترتیبِ دماغ
تیرے نظارے سے حاصل کیوں نہ ہو غم سے فراغ
اے کہ از تو دلکشِ وادیٔ ایمن منزلم
تجھ سے مُلکِ عشق میں رائج ہے آئینِ وفا
ہے نظر افروز تجھ سے حسنِ تمکینِ وفا
تو دبستانِ محبت کا ادب آموز ہے
بھر رہا ہے ٹھنڈی سانسیں کس لئے تو دمبدم
پردہ داری اب نہ رکھ مجھ سے مرے سر کی قسم
کیوں مثالِ ماہِ نو ہر وقت کاہیدہ ہے تو
چھا گئے ہیں کون سے دل پر ترے حزن و ملال
تیرے قرباں کس لئے ہے اس قدر آشفتہ حال
سچ بتا دے اے شجر کیوں رنگ تیرا زرد ہے
ہر گھڑی تجھ پر خزاں رہتی ہے کیوں آئی ہوئی
گل ہیں کیوں پژمردہ کلیاں کیوں ہیں مرجھائی ہوئی
کیا جہاں میں تو بھی دل ہے عاشقِ ناشاد کا

کیوں نہ تجھ پہ پیار آئے پیارے کا پیارا ہے تُو
اب مرا دلدار تو ہے میرا دل آرا ہے تُو
اب فقط تیرے سہارے اپنا بہلاتی ہوں دل
اُس کے لعلِ لب سے ہے لبریز تیرے گل کا جام
قائم اس کے آب و گل ہی سے ہے تیرا سب قوام
دل لُٹی جاتی ہے تیری بو سے سوئے دوست
تجھ میں دو نہ نکہت کی نشہ بیزیاں
پتیاں ہیں خلق کی سب تجھ میں عنبر بیزیاں
تو بہارِ دولتِ حسنِ نادر کار ہے
تو رہا ہے محرمِ صد حال و قالِ ہمنشیں
سے اڑا ہے اللہ اللہ تو جمالِ ہمنشیں
خوبیاں اس کی ہیں تجھ میں تو نہ کیسے خوب ہو
دیکھ کر تجھ کو دلِ محزوں نہ ہو کیوں باغ باغ
تجھ سے روشن ہے شبستانِ محبت کا چراغ
نخلِ شمع ہستی ہے یا طور سینا ات دلم
غلغلہ افگن ہے تجھ سے شورِ تحسینِ وفا
تو ہے تزئینِ وفا تجھ سے ہے تزئینِ وفا
تو فنا تعلیم درسِ عشقِ عالم سوز ہے
سر بسر کیوں تجھ پہ مستولی ہوئے ہیں درد و غم
ہمدمِ دیرینہ تیری ہوں تو میں بھی ہے الم
کیوں مثالِ شاخِ غم آخر خزاں دیدہ ہے تو
کیوں ہے آخر زار و مضطر ہر گھڑی تو ماہ و سال
خیر تو ہے کیوں ہے اس درجہ پریشانی مآل
ایسی کیا تجھ پر بنی ہے کیوں سراپا درد ہے
پتے افسردہ ہیں شاخیں کیوں ہیں کمُلائی ہوئی
سچ بتا کیوں ہے اُداسی اس قدر چھائی ہوئی
یا کہ سایہ پڑ گیا مجھ خانماں برباد کا

غنچۂ دل ناشگفتہ جیسے میرا رہ گیا
وقفِ مایوسی ہوں بیکسی میں جہاں میں برملا
جیسے ہر دم بیکسی میرے گلے کا ہار ہے
ہے نسیمِ صبحدم تیری مری آہِ سحر
ہے خزاں پہ تیری میری زرد روئی سربسر
داغ بر دل، تو اگر ہے گردشِ ایام سے
اے شجر گو درد میرا ہو چکا ہے لاعلاج
گو ہوں مرگِ عاشقِ بیکس سے آشفتہ مزاج
صحنِ گلشن فرح بخش و صحبتِ یاراں خوش است
ہے تقاضہ اور ہی اب تو جنونِ عشق کا
باندھ کر بیٹھی ہوں اب تو تجھ سے پیمانِ وفا
سچ تو یہ ہے اب فقط تیرے لئے جیتی ہوں میں
گل کھلائے گا نیا کچھ جورِ اخواں ہو نہ ہو
کچھ نہ کچھ تازہ تباہی کے ہیں ساماں ہو نہ ہو
بر سرِ مژگاں ہجومِ اشکِ گلگونِ من است
ہائے مقتولِ جفایوں عاشقِ دلگیر ہو
نالہ جو ہو بے اثر ہو آہ بے تاثیر ہو
در رہِ ہجرِ عاشقِ جانبازمی باید کشید
عاشقِ بیدل ہوں جائے گی نہ میری بیدلی
ہے یہ آزارِ محبت جائے گا کیا جیتے جی
شعلہ ایم اما ز دودِ دل سیہ پوشیم ما

یہ صلہ بجز ناکامی و حرماں تجھے بھی کیا ملا
تیرے پتے بھی کفِ افسوس ملتے ہیں سدا
ہر زماں وقفِ الم تو بھی بحالِ زار ہے
ارتقا تیرا ہے، مری شدتِ دردِ جگر
ہے ترا رنگِ شقائق میرا خونِ چشمِ تر
سینہ بریاں میں ہوں ہجرِ عاشقِ ناکام ہے
گو کہ چرخِ کینہ پرور نے مرا لوٹا ہے راج
ہے سکونِ دل کی خاطر پھر بھی تیری احتیاج
آئے آئے طبیب انفاسِ ہواداراں خوش است
ہیچ ہے اب تو نظر میں یہ بقائے بے بقا
اب تو بیٹھی ہوں ترے سودے میں ہونے کو فنا
یادِ روئے لالہ رخ میں خونِ دل پیتی ہوں میں
رنگ کچھ بدلے گا تازہ چرخِ گرداں ہو نہ ہو
پیش بندی کر رہا ہے دردِ حرماں ہو نہ ہو
گریہ را ہنگامہ گرم از گرمیِ خونِ من است
اپنے مرنے کی مگر مجھ سے نہ کچھ تدبیر ہو
نوج اس عالم میں ایسی بھی بری تقدیر ہو
بخت بد بیں کز اجل ہم نازمی باید کشید
دل لگانا آفتِ جاں ہے نہیں کچھ دل لگی
بعد مردن بھی صدا تربت سے آئے گی یہی
چوں چراغِ لالہ می سوزیم خاموشیم ما

بیدل بدایونی

سچی کہانی

مسٹر براؤن کی سرگذشت

تھوڑی دیر کے بعد پھر ہم سب ڈرائنگ روم میں تھے۔ ایک طرف مسٹر براؤن ایک طرف ایوا۔ درمیان میں مسٹر براؤن یہ تینوں ایک صوفے پر اور میں اور فریدی ان کے مقابل کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

"مسٹر براؤن! مسٹر ویگیاران، مسٹر ڈکنس اور موسیو فیرلین یہ سب آپ ہی کے نام ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے مسٹر براؤن سے دریافت کیا۔

"جی ہاں" مسٹر براؤن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اور موسیو بوندوں؟" ایوا نے پوچھا۔

"موسیو باندوں بھی" مسٹر براؤن نے ایوا کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

اپنے اپنے تعلق کے مطابق ہم سب لوگوں کو اس وقت جو خوشی تھی اس کا صرف ایک دھندلا سا نقشہ کھینچا جا سکتا ہے بیان تو ممکن ہی نہیں۔ فریدی البتہ ذرا کھسیانا سا تھا کہ ایوا کے ساتھ ان کا آج شام کا پروگرام گاؤخورد ہو گیا۔ خوشی کا جوش جب ذرا کم ہوا تو خیال آیا کہ ارے اب تک مسٹر براؤن سے فریدی کا تعارف تو ہوا ہی نہیں، خیر یہ رسم بھی ادا کی گئی۔ اس کے بعد سب نے مسٹر براؤن سے خواہش کی کہ آپ اپنی روداد تو سنائیے اور یہ بتائیے کہ اس طرح لندن چلے آنے میں آپ کے لیے کوئی خطرہ تو نہیں۔

"میں بالکل محفوظ ہوں" مسٹر براؤن نے جواب دیا۔ "والٹر نے افریقہ سے آکر جو کچھ بیان کیا وہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ صحیح اس لیے کہ والٹر نے خود کوئی غلط بیانی نہیں کی اور غلط اس طرح کہ حقیقت واقعہ اس بیان کے خلاف ہے۔ میرا آفیسر قتل ضرور ہوا مگر میرے ہاتھ سے نہیں، دوسرے کے ہاتھ سے جس نے اپنا الزام میرے سر منڈھ دیا۔ مجھے سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا اور اگلا دن اس حکم کی تعمیل کیلئے مقرر ہوا۔ اسی رات کچھ حبشی قیدیوں نے بغاوت کی، جیل خانہ توڑ ڈالا اور اکثر محافظوں کو قتل کر کے صاف نکل گئے۔ یہی ہنگامہ میری رہائی اور نجات کا باعث ہوا۔ دیس دیس کی خاک چھانتا، رنگا رنگ کے مصائب جھیلتا، مصر، شام، ٹرکی اور عراق ہوتا ہوا ایران کے پایہ تخت طہران پہنچا۔ یہاں ایک امریکن مشنری ڈاکٹر ڈے وس سے دوستی ہو گئی۔ میں نے بنی نوع کے ایسے ہمدرد اور نیک نفس انسان زندگی میں نہیں دیکھے۔ طہران میں دول یورپ کے اکثر سفیروں، ممالک خارجہ کی بڑی بڑی کمپنیوں کے مالکوں اور خود ایران کے بہت سے اعیان و اکابر سے ان کے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ان کی وساطت سے مجھے مشہد کی ایک امریکن موٹر فرم کی ایجنسی مل گئی۔ مشہد میں آئی ٹین سے ملنے اور تمام حالات سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ قصور اگر تھا تو میری فہم کا۔ کلیرا کا دامن مقدس مریم کی طرح آلودگی سے پاک ہے۔ اس انکشاف کے بعد ایران میں ایک لمحہ کا قیام میرے لیے سوہان روح تھا۔ اپنی غلطی پر احساس ندامت اور کلیرا کو رنج پہنچانے کا ملال مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اس وقت لندن آنا میرے لیے ایسا ہی خطرناک تھا جیسے پٹرول کے حوض میں کھڑے ہو کر اس میں آگ لگا دینا لیکن نتائج کیطرف سے آنکھ بند کر کے میں نے فوراً انگلستان آنے کا تہیہ کر لیا۔ کمپنی کے صدر دفتر میں حسابات سمجھانے اور کاغذات حوالہ کرنے کیلئے میں طہران گیا۔ خدا حافظی کیلئے اپنے محسن ڈاکٹر ڈے وس سے ملنا بھی ضروری تھا۔ ڈاکٹر ڈے وس میرے رازدار تھے۔ انھیں جب میرے ارادوں کا علم ہوا تو

بڑی شدت سے مخالفت کی پہلے بہت سمجھایا جب میں نے نہ مانا تو ڈرایا جب اس سے بھی کام نہ چلا تو یہ لالچ دلایا کہ آئندہ سال ایران کا نیا سفیر لندن جائے گا میں کوشش کر کے تمھیں ایک رکن سفارت کی حیثیت سے اس کے ہمراہ بھجوا دوں گا اور اس طرح تم بہت سے خطرات سے محفوظ رہو گے بہت سے نشیب و فراز سوچ کر میں نے ان کے اس وعدہ کے بھروسہ پر ایک سال کے لیے اپنا آنا ملتوی کر دیا۔ مشہد سے میرا جی اچاٹ ہو گیا تھا اور اب میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے ڈاکٹر ڈے وس نے مجھے امریکن کالج میں انگریزی کا پروفیسر مقرر کرا دیا اور اپنا مستقل مہمان بنا لیا۔ ایک سال گذر گیا دوسرا شروع ہو گیا مگر حکومت کی مصلحتوں نے نئے سفیر کو انگلستان بھیجنے کی اجازت نہ دی آج کل، آج کل میں ایک سال اور نکل گیا اب میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا تھا، کلیرا کی جدائی کے مقابلہ میں اب مجھے پھانسی کا پھندا کہیں زیادہ پسند تھا چنانچہ ایک دن میں نے ڈاکٹر ڈے وس سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آپ مجھے خوشی سے جانے کی اجازت نہ دیں گے تو چھپ کر نکل جاؤں گا انجام چاہے کچھ بھی ہو۔ ڈاکٹر ڈے وس میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے، انھیں یقین تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہی کروں گا

انھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا صرف ایک مہینہ اور ٹھیر جاؤ شاید خدا کوئی صورت پیدا کر دے، اس کے بعد تمھیں اختیار ہے، چار و ناچار مجھے ماننا پڑا۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں" اس اٹھارہ برس کی جہاں نوردی میں ایسے واقعات مجھے بارہا پیش آئے اور اب جو بات میں بیان کرنے والا ہوں وہ خود اسی قسم کی ہے، ڈاکٹر ڈے وس اور مسز ڈے وس دونوں امریکن تھے مسز ڈے وس کے ایک بڑے بھائی مسٹر گلبرٹ جنگ عظیم سے قبل سیاحت کے سلسلہ میں لندن آئے تھے یہاں انھیں کلیرا جیسی کوئی موہنی صورت مل گئی اور وہ یہیں کے ہو رہے۔ ڈاکٹر ڈے وس سے جس دن مذکورہ بالا گفتگو ہوئی اس کے اگلے دن شام کو دونوں میاں بیوی میرے کمرہ میں آئے اور مجھ سے کہا کہ آپ بخوشی لندن تشریف لیجا سکتے ہیں میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ ان کا مطلب کیا ہے دونوں مسرور معلوم ہوتے تھے۔ خوشی کے مارے ان کے چہرے دمک رہے تھے، مجھے حیران دیکھ کر ڈاکٹر ڈے وس نے ایک خط اپنی جیب سے نکال کر میرے سامنے ڈال دیا اور کہا اسے پڑھو، یہ خط مسز ڈے وس کے نام تھا، لندن سے ان کے بھائی مسٹر گلبرٹ نے بھیجا تھا، لکھا تھا کہ "میں ان دنوں کچھ ایسے ترددات میں مبتلا رہا کہ تمھیں خط نہ لکھ سکا۔ ایک مہینہ ہوا جیک کا انتقال ہو گیا، گریس (مسز گلبرٹ) کی صحت تو نہ تو پہلے اچھی نہیں ہے، اب بھائی کی موت کے صدمے نے اور بھی حالت خراب کر دی ہے، جیک نے مرتے وقت ایک عجیب و غریب راز کا انکشاف کیا، اس نے ہم سب کے سامنے پادری سے اقرار کیا کہ سیکرٹ سروس کے آفیسر مسٹر جیکسن کو میں نے قتل کیا تھا، اور الزام اس کے ایک ماتحت مسٹر رچی پر لگا دیا تھا۔"

"آپ سمجھے یہ مسٹر رچی کون تھا" مسٹر براؤن نے ہم لوگوں سے سوال کیا۔

"نہیں" ہم سب نے ایک ساتھ سر ہلا کر کہا

"مسٹر رچی کو آپ سب لوگ جانتے ہیں" مسٹر براؤن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کم از کم میں تو نہیں جانتا" میں نے جواب دیا

"مسٹر رچی آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ سے باتیں کر رہا ہے" مسٹر براؤن نے مسکرا کر کہا ہم سب حیرت اور مسرت کی تصویر بن گئے

"خوب تو مسٹر رچی بھی آپ کا نام ہے" میں نے کہا

"آخر آپ کے کتنے نام ہیں؟" ایوا نے الزبتھ بن سے پوچھا۔

"اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں" مسٹر براؤن نے جواب دیا، "دراصل سیکرٹ سروس میں داخل ہونے کے بعد مجھے وقتاً فوقتاً

کئی نام بدلنے پڑے:

"ٹھیک ہے اسلئے کہ والٹر نے آپ کا نام ڈکنس بتایا تھا" میں نے کہا "مگر یہ تو کہئے، ایران میں آپ کو دو فرانسیسی ناموں کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔"

"میں امریکہ اور فرانس کے بعض اخبارات میں ایران کے متعلق مضامین لکھا کرتا تھا، اور بغرض احتیاط موسیو فیرلین کے فرضی نام سے شائع کرایا کرتا تھا پھر جب حالات بدل گئے اور کچھ اندیشہ نہ رہا تو میں نے ظاہر کر دیا کہ موسیو فیرلین اور موسیو بوندوں ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اس وقت سے اکثر لوگ مجھے موسیو فیرلین ہی کہنے لگے۔"

"لان ٹینس کو لوگ سو شکلوں والا آدمی کہا کرتے تھے، ایڈی کو سو ناموں والا آدمی کہنا چاہیئے" مسز براؤن نے مسٹر براؤن کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

اگلے ہفتہ پھر ہم سب لوگ مسز براؤن کے یہاں جمع ہوئے فریدی کو ایوا کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی لہذا وہ کھانا کھا کر اور کوئی گھنٹہ بھر ہم لوگوں کے ساتھ برج کھیلنے کے بعد ایوا کو ساتھ لے ٹینس کھیلنے چلے گئے۔ مسز براؤن کو آج اپنے بال ترشوانے کیلئے جانا تھا لہذا وہ بھی گھنٹہ بھر میں واپس آنیکا وعدہ کر کے رخصت ہوئیں میں اور مسٹر براؤن کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اس کے بعد میری خواہش پر انھوں نے اپنی سرگذشت اس طرح بیان کرنی شروع کی:۔

"دیوانگی کی حدیں متعین کرنا ناممکن ہے۔ شاعر و حواس کا اختلال صرف اسی شخص میں نہیں پایا جاتا جسے ہم عرف عام میں دیوانہ کہتے ہیں بلکہ ہر انسان کبھی کبھی حوادث کے طمانچوں اور مصائب کی ٹھوکروں سے چکنا چور ہو کر کچھ مدت کے لیے اسی سطح پر آ جاتا ہے جو خود ساختہ داناؤں نے دیوانوں کے لیے مقرر کی ہے۔ مدت جنون کی کمی بیشی سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ہم سب کے سب یکساں طور پر دیوانے ہیں اور ہمارے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ ہیں وہ خیالات جن کا میں ایک مدت سے قائل ہوں اور جنھوں نے مجھے بارہا خطرناک یا باصطلاح قانون "مجرمانہ" اقدامات سے باز رکھا اور آج آپ مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جذبات کے طوفان میں استوار عقیدے اور مسلّم نظریئے کمزور تنکوں کی طرح بہ جاتے ہیں لیکن ہنگامی جوش فرو ہو جانے کے بعد پھر ایک بار انسان حقیقت پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ ابھی جوان ہیں اس لیے بوڑھوں سے زیادہ اس بات کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں کہ محبت کے معاملات میں ادنیٰ سی تحریک سے رشک و رقابت کے جذبات کا بھڑک اٹھنا اور بدگمانی سے عقل کا مغلوب ہو جانا بالکل ایک قدرتی بات ہے۔ میں نے دو مرتبہ پرسی کو چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پرسی اور کلیرا مدتوں ایک دوسرے کے دوست رہے تھے۔ پرسی کلیرا پر جان دیتا تھا اور کلیرا کو بھی اس کا پاس خاطر مد نظر تھا اور اگر میں یکایک ان کے درمیان میں حائل نہ ہو گیا ہوتا تو غالباً پرسی کلیرا کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ پھر انسانی فطرت اور خصوصاً نسوانی فطرت کا تلون ایک ایسا معمہ ہے جو کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہر کلیہ یہاں ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر ناممکن بات ممکن ہو جاتی ہے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا۔ بیگانوں میں تعارف ہوا کسی کی صورت نے جذب کیا کسی کی سیرت نے کھینچا، دلچسپی بڑھی ارتباط قائم ہوا طرفین نے درمیانی فاصلہ کو سرعت کے ساتھ طے کرنا شروع کیا قریب ہوتے ہوتے ہو گئے، انس محبت میں تبدیل ہو گیا آخر اس طرح مل گئے جیسے سمندر کے کنارے آسمان سے اور ازدواج کی بظاہر نہ ٹوٹنے والی زنجیر نے ہمیشہ کے لیے انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔ کہو اب انھیں

کون جدا کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں، مگر انسانی فطرت کا تلون ابھی چار دن نہ گذرے تھے کہ ایک نے یا دوسرے نے برسوں کی کمائی بلکہ تمام زندگی کی کمائی خون سردی کے ساتھ ضائع کر دیا اور خوشی خوشی پھول کو کانٹے سے اور ہیرے کو ٹھیکری سے بدل لیا، پھر یہ بھی دیکھا کہ برسوں انتہائے لطف کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد یکایک شوہر نے یا بیوی نے یا دونوں نے ایک دوسرے کیساتھ خیانت شروع کر دی جس کا نتیجہ دائمی جدائی ہوا۔

بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ مدتوں ایک دوسرے کی پرستاری کے بعد جب پیمانِ محبت کی تکمیل کا وقت قریب آیا، اور منزلِ مقصود (ازدواج) بالکل سامنے نظر آنے لگی تو یکایک ایک بیگانہ کے ظہور نے تمام نظام کو درہم برہم کر دیا یا شکست خوردہ حریف کی ان تھک کوششوں نے ہاری ہوئی بازی جیت لی میرا ذاتی عقیدہ اور تجربہ بھی یہی ہے کہ عورت خواہ کسی مزاج اور کسی طبقہ کی کیوں نہ ہو، اگر تم اسے یہ یقین دلا دو کہ تم اسے چاہتے ہو اور پھر اس کی بے اعتنائی بلکہ بدسلوکی کے باوجود اس کا "تعاقب" کئے جاؤ تو وہ آخر تمہاری محبت کا جواب محبت سے دینے کیلئے سوسائٹی اور مذہب کے ہر قانون کو پامال کرنے پر آمادہ ہو جائیگی ممکن ہے کہ بعض اوقات ایک دوشیزہ پر یہ جادو نہ چلے مگر ایک شادی شدہ عورت کیلئے یہ عمل ایک بے پناہ حربہ ہے۔ ہاں اس تک رسائی اور اظہارِ خیالات، جذبات کا موقع ملنا ضروری ہے۔

یہ تمام خیالات بلکہ واقعات نظر کے سامنے تھے۔ پرسی کے مشتبہ طرزِ عمل نے میرے رگ و پے میں آگ بھر دی تھی اور ساعت بساعت دیوانگی کے قریب ہوتا جا رہا تھا، خدارا مجھ سے انصاف کرو کہ ان حالات میں جب میں نے پرسی کو کلیرا کے قدموں میں دوزانو، اور کلیرا کو اس پر جھکے ہوئے دیکھا تو مجھ پر کیا گذری ہوگی۔ مسٹر پریم میں اسی لمحہ دیوانہ ہوگیا تھا۔ میری بینائی کم ہوگئی تھی۔ مجھے کوئی چیز صاف نہ دکھائی دیتی تھی، میرے جسم کی طاقت سرعت کے ساتھ زائل ہو رہی تھی، اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ میں اس وقت ان لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر کس ارادہ سے باہر چلا گیا تھا تو مجھے خود بھی معلوم نہیں، ایک اضطراری حرکت تھی جو بلا ارادہ عمل میں آئی سڑک پر پہنچا تو ٹرام کھڑی تھی، بغیر کچھ سوچے مجھے اس میں سوار ہوگیا۔

اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ٹرام کہاں جا رہی ہے کئی مرتبہ دو، دو، تین تین پینی کا ٹکٹ خریدا، آخر ٹرام اپنے ٹرمنس پر پہنچکر خالی ہوگئی میں نے دیکھا کہ اب کوئی مسافر نہیں، میں ہی اکیلا بیٹھا ہوں، آخر میں بھی اتر پڑا یہ علاقہ بہت سنسان تھا قریب کے ایک پارک میں ایک درخت کے نیچے بینچ پر جا بیٹھا اس تمام مدت میں ایک بےحسی کی سی کیفیت مجھ پر طاری رہی تھی، آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر دیکھ نہ سکتی تھیں، کان بند نہ تھے مگر شنوائی معطل ہوگئی تھی، دل جذبات سے اور دماغ خیالات سے یکسر خالی تھا کبھی اذیت کا بھی احساس نہ تھا رات ہو چکی تھی یکایک میرے حاسوں میں بیداری پیدا ہوئی دماغ نے کام کرنا شروع کیا، پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے کلیرا سے مجھے جتنی محبت ہے اس سے زیادہ شاید کبھی کسی کو کسی سے ہوئی ہو کلیرا کے بغیر میری زندگی بالکل بے سود تھی، پھر یاس ناموس الگ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان تمام ننگین اور جاں گداز مناظر کو موت کی سیاہ چادر سے ڈھانک دینا چاہیئے مرنے کا مصمم ارادہ کرکے اٹھا کوئی قاتل حربہ میرے پاس موجود نہ تھا اس لیے ٹیمس کے ایک سنسان کنارہ کی طرف چلا تاکہ دریا کی خاموش گہرائیوں میں دنیا کے خرخشوں سے بے نیاز ہو کر ابدی نیند سو جاؤں، دریا قریب نہ تھا مجھے پانچ چھ میل پیدل چلنا پڑا میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ آبادی سے جتنا دور ہو جاؤں اچھا ہے سرد ہوا تیزی سے چل رہی تھی رات آدھی آ چکی تھی، دریا اب سامنے تھا اور چاند کی غم آلود روشنی میں خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا، دریا کا یہ کنارہ بالکل سنسان تھا آبادی یہاں سے بہت دور تھی نہ جانے کیا خیال آیا میں نے پلٹ کر لندن پر پھر ایک آخری نگاہ ڈالی اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "آہ کلیرا!"

اب میں دریا سے بالکل قریب تھا اس وقت یہاں کسی انسان کی موجودگی کا مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس جگہ کنارہ پانی کی سطح سے بہت اونچا اور ناہموار تھا کنارے کے قریب کے نشیب سے یکایک مجھے ایک شخص نہایت آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جاتا دکھا دیا میری

نہ اس کی منزل تھی میں وہیں ٹھٹھک گیا جب اونچی جگہ پہنچکر وہ ٹھیر گیا اور کوئی دو منٹ تک خاموش کھڑا رہا یکایک ایک دھماکے کی آواز ہوئی ابدنصیب نے خود کو موجوں کی نذر کر دیا میں سب کچھ بھول گیا اور بے اختیار اس کی طرف دوڑا مگر وہ تہ آب ہو چکا تھا حیرت ہوئی اس کی نعش بھی ہری کا نہ معلوم کون بدنصیب تھا جسے حیات کی تلخیوں سے آغوش مرگ کے سوا اور کہیں پناہ نہ ملی نہ جانے کیا خیال مجھے اس نشیب کی طرف کھینچ لیا جدھر سے یہ شخص نمودار ہوا تھا تھوڑے فاصلہ پر کاغذ کے چند چھوٹے چھوٹے پرزے پڑے نظر آئے میں نے بڑھ کر انھیں اٹھا لیا ان میں کچھ سادہ تھے اور بعض پر پنسل سے کچھ لکھا ہوا تھا جو پڑھا نہ گیا غالباً مرنے والے نے کسی کے نام آخری پیغام لکھا تھا مگر پھر شاید یہ سوچ کر کہ اسے کون پائیگا یا یہ سمجھ کر کہ بعد از مرگ من کن فیکوں شد شدہ باشد جب ہم ہی نہیں تو پھر کچھ بھی ہوا کرے کیسا نامہ اور کس کا پیغام اسے چاک کر ڈالا میں ان ہی امور پر غور کر رہا تھا کہ قریب ہی ایک سفید چیز پر میری نظر جا پڑی جو چاندنی کی روشنی میں تیزی سے چمک رہی تھی میں نے اسے اٹھا لیا یہ چاندی کی ایک پنسل تھی جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے اس پر "ان ٹس ٹری اس" درخشاں لکھا ہوا ہے میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا کیونکہ جہاں ان کا نام نہیں ہوتا۔

اس حادثہ نے تھوڑی دیر کیلیے میری توجہ کو تمامتر اپنی طرف جذب کر لیا تھا مگر اب میرے خیالات پھر ایک نقطہ پر جمع ہوئے اور سب منٹ کے بعد میں اسی بلند جگہ پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے دریا میں کود کر ایک نامراد نے ابھی ابھی اپنی جان دی تھی میں نے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" مرنے والے اے ایک اور المنصیب تیری رفاقت کے لیے حاضر ہے یہ کہکر میں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی سنسان فضا میں نہ وہ چاندنی صد درجہ الم انگیز تھی یکایک میری آنکھیں چاند کی طرف اٹھ گئیں اور نہ جانے کیوں وہی دوپہر کا منظر مجسم ہو کر سامنے آ گیا یہ لیلی کلیر کے قدموں پر دو زانو کلیر اس پر جھکی ہوئی مسٹر پر کم کیا بتاؤں یہ معلوم ہوا کہ میرے رگ و پے میں کسی نے آگ بھر دی جوش غضب نے میرے سینہ کو بھٹی بنا دیا آنکھیں جلنے لگیں جسم تھرتھر کانپ رہا تھا خیالات نے پلٹا کھایا اب بس وہ جذبہ مجھ پر مسلط تھا میرے ایک ایک رونگٹے سے انتقام کی آواز آرہی تھی میں نے اپنے جی میں کہا" اوہ کیسی نادانی! اس آسانی سے حریف کے لیے میدان چھوڑ دیا نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا موت کا سرد ہاتھ مجھسے پہلے پرسی کے ناپاک وجود سے دنیا کو خالی کر دیگا میرا تمام بدن آتش انتقام سے پھنک رہا تھا اب پھر شہر کی طرف چلا آبادی ابھی دور تھی گہرے بادل آسمان پر چھا گئے چاند چھپ گیا تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگی قیامت کی سردی تھی میں بالکل تر ہو گیا تھا سرد ہوا آندھی کی طرح چل رہی تھی آخر آبادی آ گئی مگر اب کہاں جاؤں کس جگہ پناہ لوں بارش تھمتی نہیں تھمتی اندھیرا سردی آندھی بارش بھیگے ہوئے کپڑے تھکا ہوا جسم اور خون شدہ دل اپنی اس وقت کی حالت کن الفاظ میں بیان کروں آخر سڑک پر ایک پل نظر پڑا جس قدر جلد ممکن ہوا اس کے سایہ میں پناہ لی دیوار سے کمر لگا کر زمین پر بیٹھ گیا اور پرسی کو جلد سے جلد نابود کرنے کی تدابیر سوچنے لگا سوچتے سوچتے دماغ بھی تھک گیا اور آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ رات کے آخری حصہ میں نیند نے مجھ پر غلبہ پایا اور تھوڑی دیر کے لیے تمام جسمانی اور روحانی اذیتوں سے مجھے آزاد کر دیا جس وقت آنکھ کھلی مجھے خوب بخار چڑھا ہوا تھا رات ابھی کچھ باقی تھی لوگ کہتے ہیں مصیبت میں خدا یاد آتا ہے میں کہتا ہوں مصیبت میں سچا دوست یاد آتا ہے اگرچہ سچا دوست خود ایک بڑی حد تک خدا کی طرح اسم بے مسمیٰ ہے تاہم معدوم محض نہیں" اور میرے نزدیک اس کا وجود انسان کیلیے خدا سے کہیں زیادہ مفید ہے میرا بھی لندن میں ایک دوست تھا سچا اور حقیقی دوست مخلص اور صمیمی دوست مرحوم کا نام ڈیوڈ تھا۔

"اچھا، تو ان کا انتقال ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ڈیوڈ نے وطن اور قوم کیلئے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ وہ فارن ڈیپارٹمنٹ میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھا۔ مگر جنگ عظیم میں اس نے خود ہی محاذ جنگ پر مردانگی کے جوہر دکھا کر وطن کے سچے پرستاروں کی طرح لڑتے لڑتے جان دیدی۔ بہرحال اس وقت مجھے ڈیوڈ یاد آیا۔ شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ڈیوڈ کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ ملازمت کے سلسلہ میں اکثر اسے ممالک خارجہ میں رہنا پڑتا تھا اس لیے انتہائی یگانگت کے باوجود مدتوں مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کا آخری خط فرانس سے آیا تھا اور اس بات کو ایک مہینے سے زیادہ مدت گذر چکی تھی۔ اس کے لندن میں موجود ہونے کا مجھے یقین نہ تھا تاہم اس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا ہوا تھا۔ ڈیوڈ کی غیر موجودگی میں گھر کی حفاظت کے لیے اس کے باپ کے وقت کا ایک بوڑھا ملازم آسلر رہتا تھا۔ آسلر مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور میرے اور ڈیوڈ کے تعلقات سے بھی واقف تھا۔ بہرحال میں ڈیوڈ سے ملنے کی امید میں اور بہرصورت اس کے مکان پر عارضی قیام کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے ڈیوڈ گھر پر موجود تھا مگر ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میری اور آسلر کی باتوں کی آواز سے یا پیروں کی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے میری آواز پہچان لی اور خلاف امید لیے نا وقت میرے آنے سے گھبرا کر بستر سے نکل آیا۔ میری حالت دیکھی۔ تمام کپڑے پانی میں شرابور جا بجا خاک اور مٹی لگی ہوئی۔ آنکھیں سرخ۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی۔ ڈیوڈ کے منہ سے بیساختہ نکلا "اوہ خدا! ایڈی یہ کیا؟" اور بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرا تمام جسم بخار کی حرارت سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ ڈیوڈ سخت پریشان ہوا۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں، سب خیریت ہے۔" ڈیوڈ نے مزید استفسار کے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ میرے بھیگے ہوئے کپڑے اتروائے اور اپنا ایک سلیپنگ سوٹ پہننے کیلئے دیا۔ اس کے بعد بیڈ روم میں آگ روشن کرائی اور مجھے اپنے بستر پر لٹا کر لحاف اڑھا دیا۔ میں انتہا سے زیادہ خستہ ہو رہا تھا۔ بخار نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ نرم اور گرم بستر پر لیٹتے ہی پھر نیند آگئی اور میں کئی گھنٹے سویا۔ اٹھا تو دیکھا کہ ڈیوڈ مجھ پر جھکا ہوا میری نبض دیکھ رہا ہے۔ پوچھا "کیا حال ہے؟" میں نے کہا "اچھا ہوں۔" کہا "ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ ابھی آتا ہوگا۔" میں نے کہا "ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔" کہا "خیر! کیا مضائقہ ہے۔" تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔ نبض دیکھی۔ حال پوچھا۔ نسخہ لکھا۔ اور بہت جلد تندرست ہوجانے کی امید دلا کر رخصت ہوا۔ دو روز تک مجھے بخار کی تکلیف رہی تیسرے دن طبیعت سنبھل گئی مگر کمزور ہوگیا۔ چار دن کے بعد ڈیوڈ نے پھر استفسار حال کیا اور میں نے بے کم و کاست تمام واقعات اسے سنا دئے اور اپنا ارادہ بھی بتا دیا کہ جب تک انتقام نہ لوں گا مجھے چین نہ آئے گا اور میری بربادی کی قیمت کسی کو اپنی جان سے ادا کرنی پڑے گی۔

ڈیوڈ نے میری حالت پر بہت افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد اپنے مخصوص متین انداز میں کہا۔

"ایڈی میں تمھیں تمہارے ارادوں سے باز رکھنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک خواہش ہے اگر پورا کرنے کا وعدہ کرو تو کہوں۔"

"وعدہ! خوب کیا وعدہ لیے بغیر تمہیں امید نہیں کہ میں تمہاری خواہش کو پورا کروں گا۔ ڈیوڈ کیا واقعی تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو؟"

میں نے متاسفانہ لہجہ میں کہا۔ "نہیں ایڈی۔ غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ میرا مقصد صرف تمہیں پورے طور پر متوجہ کرنا تھا۔ اچھا لو سنو! بات معمولی ہے۔ خواہش صرف یہ ہے کہ جو کچھ میں اس وقت تم سے کہنا چاہتا ہوں اسے پوری توجہ کے ساتھ سنو! اچھی طرح اس پر غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ فیصلہ میں عجلت خوب نہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ اس بارہ میں میرے ساتھ تبادلہ خیال کرو۔ اس کے بعد جس طرف تمہاری عقل سلیم رہنمائی کرے مختار ہو۔"

یہ کہہ کر ڈیوڈ خاموش ہوگیا۔ میں ڈیوڈ کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ہمیشہ سے قائل تھا۔ اس نے فلسفیانہ دماغ پایا تھا۔ اس کی اکثر باتیں عام مسلمات کے خلاف ہوتی تھیں مگر جس وقت وہ انھیں بیان کرتا تھا تو اس یقین و اذعان کے ساتھ، گویا حقیقت کو اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہا تھا مگر اس کی قوت استدلال اس قدر زبردست اور انداز بیان ایسا دلاویز تھا کہ سننے والے کو اس کی بات تسلیم کر لینے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ میں نے کہا "اچھا تو چپ کیوں ہوگئے جو کچھ کہنا ہے کہو۔"

"سنو!" اس نے پھر کہنا شروع کیا "محبت جبر سے نہیں ہوتی۔ جب کلیئر تمہاری طرف مائل ہوئی۔ پرسی کے برسوں کے تعلقات ان سے متاثر اور وابستہ ہو جانے سے نہ روک سکے اسی طرح اب اگر کسی وجہ سے اس کا جی تم سے سیر ہوگیا ہو اور پرسی نے اسے رام کر لیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کی محبت کو تمہاری طرف واپس نہیں لاسکتی۔ پہلے تم نے خود کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا وہ بھی سراسر غلط۔ جان دیتے ہو کس کیلئے؟ ایک خائن غدار عورت کیلئے جس کی محبت کچے رنگ کی طرح ناپائدار ثابت ہوئی جان دو اس کیلئے جو تم پر جان دیتا ہو جان دو اس کے لیے جو تمہاری قربانی کی قیمت کا اندازہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اب تم نے پرسی کی جان لینے کا فیصلہ کیا ہے یہ بھی سراسر غلط۔ دیکھو پرسی وہی پرسی ہے جسے چھوڑ کر کلیئر نے تمہارے ساتھ عقد محبت اور پیمان وفا باندھا آج پرسی بدل نہیں گیا۔ اس کی کامیابی اگر تم اسے کامیابی کہہ سکتے ہو تو خود اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں کلیئر کی نسوانی کمزوری اور فطری تلون اس کا ذمہ دار ہے پھر اگر میرا عقیدہ پوچھو تو میں کلیئر کو بھی کچھ ایسا مجرم نہیں سمجھتا۔ آخر انسان اپنی افتاد طبیعت کو کیا کرے؟ بادی النظر میں تمہیں یہ بات بعید از عقل معلوم ہوگی مگر حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے کسی فعل کا مختار نہیں۔ وہ مجبور ہے اور مجبور محض۔ خواہش ارادہ اور اختیار محض مغالطہ میں ڈالنے والے الفاظ ہیں ان کا مفہوم جو تم سمجھتے ہو وہ ہرگز نہیں۔ ذرا سوچو تو سہی، تمہاری خواہش اور ارادہ کا خالق کون ہے؟ جب تک کوئی خارجی تحریک نہ ہو جب تک بیرونی اسباب اپنا اثر نہ ڈالیں۔ تمہارا کوئی ارادہ وجود میں نہیں آسکتا جب یہ صورت ہے تو پھر اختیار کہاں رہا۔ اور جب اختیار باقی نہیں تو پھر کسی کو مجرم ٹھیرانا کہاں کا انصاف ہے بات باریک ہے مگر ناقابل فہم نہیں۔ غور کروگے تو میرے قول کی تائید کرنی پڑیگی اور تمہیں اپنے فیصلوں کی غلطی معلوم ہو جائے گی بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

آٹھ دن گذر گئے ڈیوڈ کی باتوں پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنی ہی وہ زیادہ صحیح معلوم ہوئیں۔ میری طبیعت میں اب وہ ہیجان نہ تھا مگر کلیئر کی یاد کسی طرح نہ بھولتی تھی ڈیوڈ کو یکایک پیرس جانا پڑا چار دن کے بعد واپس آیا۔ اس روز شام کی چاء ہم نے ساتھ پی۔ میری حالت پہلے سے بہتر تھی مگر ذہنی خلفشار سے نجات نہیں ملی تھی ایک ہی نظر میں ڈیوڈ نے میری اندرونی حالت کا مطالعہ کر لیا اس نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"بس اب اس بارہ میں سوچنا بند کردو۔ ایک بھیانک خواب تھا جو تمام ہوگیا اور اب پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں کچھ کام کرنا چاہیئے! ایسا کام جو تمہیں زندہ جاوید بنا دے۔ انفرادی خوشی کے سنہری جال میں پھنسے رہنا صرف پست ذہنیتوں کیلئے مخصوص ہے لیکن تمہاری سطح اس سے کہیں بلند ہے قوم پر آج وقت پڑا ہے ذاتی مسرتوں اور غموں کو فراموشی کی چادر میں لپیٹ کر قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کردو مادر وطن تمہیں مدد کیلئے پکار رہی ہے۔ اٹھو اور جواب دو۔ زبان سے نہیں عمل سے میں نے تمہارے لیے ایک راہ نکالی ہے اور وہی تمہارے درد کا واحد علاج ہے کسی طرح نہ بھولنے والے غم، کسی طرح نہ بھرنے والے دل کے زخم، اور کسی طرح نہ مٹنے والی خلش کا بہترین مداوا سفر ہے۔ ایسا سفر جو منشائے ملال سے بہت دور لیجائے ایسا سفر جس سے جلد واپسی کی امید نہ ہو۔ سیکرٹ سروس کے لیے ہمیں چند ایسے بلند حوصلہ اور قابل اعتماد سرفروشوں کی ضرورت ہے جو مادی معاوضہ کی خاطر نہیں بلکہ ملک و ملت کی آزادی و حریت کو برقرار رکھنے کیلئے جان کی بازی لگانا ایک کھیل سمجھتے ہیں اور موت کا ہلاکت بار چہرہ بھی انہیں اپنے مقدس مقصد کی تکمیل سے باز نہیں رکھ سکتا۔ کام نازک اور خطرناک

ہے مگر میں تمہیں ہر طرح اس کا اہل پاتا ہوں پھر تمہارے ذاتی مصالح بھی اس کے متقضی ہیں، اسی لیے میں نے تم سے استمزاج کئے بغیر اس خدمت کے لیے تمہارا نام انتخاب کرنے والی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگے"۔ یہ کہکر ڈیوڈ خاموش ہو گیا۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔ ڈیوڈ کی تقریر، صداقت، حب الوطنی، دوست پرستی اور شرافت کے جذبات سے اس درجہ لبریز اور اثر میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ ذرا سی دیر میں اس نے میرا زاویۂ نگاہ ہی بدل دیا۔ میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ خدمت وطن کا احساس جس سے میں آج تک بیگانہ تھا یکایک میری روح پر چھا گیا۔ میرے دل کے زخم ابھی سے بھرنے شروع ہو گئے، دل میں ایک ولولہ تھا۔ امنگ تھی، حوصلہ تھا۔ بالکل ایک نئی دنیا پیش نظر تھی میں نے ڈیوڈ کا ہاتھ کھینچکر اپنے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا اور کہا:-

"آہ! ڈیوڈ میں کس طرح تیری محبت کا شکریہ ادا کروں۔ تو نے مجھے زندہ کر دیا!"

دو ہی دن کے بعد میں اپنے عہدہ کا چارج لیکر مصر روانہ ہو گیا، کچھ مدت مصر میں قیام کے بعد مجھے جرمن ایسٹ افریقہ جانا پڑا، ایک مدت تک میں نے مخبر اور جاسوس کی خدمات کامیابی کیساتھ انجام دیں، بڑے بڑے خطرات کا سامنا ہوا اور غالباً میں اس لیے بچ بچ گیا کہ مجھے اپنی زندگی کی کچھ بہت زیادہ پروا نہ تھی، یہ سب کچھ تھا مگر کلیرا کی یاد پھر بھی فراموش نہ ہوئی، یہ زخم نہ بھرنا تھا نہ بھرا، جب کوئی دلفریب منظر دیکھتا کلیرا یاد آتی، پھول اور سبزہ ہمیشہ مجھے کلیرا کی یاد دلاتے، مستانہ خرام دریا، سر بفلک پہاڑ، سیمابی آبشار، تاروں بھری رات، سمندر میں ڈوبتا ہوا سورج، بادلوں میں چھپتا اور نکلتا ہوا چاند، شفق اور دھنک، حسین اور دلربا صورتیں غرض کون سی چیز تھی جس میں کلیرا کی تصویر مجھے نظر نہیں آتی تھی، خصوصاً چاندنی راتیں مجھے اکثر رلاتی تھیں اور میں آپ ہی اپنا راز دار تھا"۔

"مجھے اس وقت اپنا ایک شعر یاد آگیا جس میں ٹھیک اسی حالت کو بیان کیا گیا ہے"۔ میں نے کہا۔

"کیا؟" مسٹر براؤن نے پوچھا۔

"رلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات۔ یہی اک راز میری زندگی ہے"۔ میں نے یہ شعر پڑھا اور اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر براؤن کو سنایا۔

"خوب۔ تو آپ بھی اس کا ذائقہ چکھ چکے ہیں" مسٹر براؤن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"صرف تخیل میں"۔ میں نے ہنسکر جواب دیا۔

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مسز براؤن آگئیں اور آتے ہی کہا کہ چاے تیار ہے، میں نے کہا ریوا اور فریدی کا بھی تھوڑی دیر انتظار کرلیں، وہ لوگ بھی اب آتے ہی ہوں گے۔

مسز براؤن نے کہا "اچھا"۔ اس کے بعد میں نے پھر مسٹر براؤن سے کہا:-

"ہاں۔ آپ اپنی داستان جاری رکھیئے"۔

"خوب داستان ہو رہی ہے"۔ مسز براؤن نے آتشدان میں کوئلے ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں آپ ہی کا ذکر خیر تھا"۔ میں نے جواب دیا۔

"افریقہ پہنچنے کے بعد کا سب سے اہم واقعہ مختصر طور پر اس روز آپ کو سنا ہی چکا ہوں اور تمام حالات کی تفصیل کیلئے تو ایک عمر چاہیئے"۔ مسٹر براؤن نے بظاہر اس موضوع سے گریز کرتے ہوئے کہا، میں نے اندازہ کیا تھا کہ وہ مسز براؤن کی موجودگی میں اپنے واقعات کو بیان کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے، اس لیے میں نے بھی اس وقت اصرار نہیں کیا اور سوچا کہ پھر کبھی تنہائی میں باقی حالات سن لوں گا، بہرحال پہلے

ان سے کہا:۔

"اچھا وہ پنسل تو ذرا دکھائیے۔"

"ابھی لاتا ہوں" یہ کہہ کر مسز براؤن پنسل لینے کیلئے چھت پر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

"کیسی پنسل؟" مسٹر براؤن نے پوچھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں مسز براؤن کی بیان کی ہوئی روداد دہرا دی۔ اتنے میں مسز براؤن ایک چاندی کی پنسل ہاتھ میں لیے ہوئے آئے۔ پنسل واقعی بہت خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر مسٹر براؤن کے منہ سے بے اختیار "اوہ" نکل گیا۔ انھوں نے اور کچھ نہ کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک ان کے قلب کو ایک دھچکا پہنچا۔ وہ کوچ پر بیٹھ گئیں اور اپنے نیچے کے ہونٹ کا سرا دانت سے دبا کر ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ سردی کے باوجود ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ میں حیران تھا کہ پنسل کو دیکھ کر مسز براؤن اس درجہ کیوں متاثر ہوگئیں۔ مسٹر براؤن کو معلوم نہ تھا کہ میں مسز براؤن کو پنسل کا قصہ سنا چکا ہوں اور انھیں معلوم بھی ہوتا تو غالباً میری طرح وہ بھی کچھ نہ سمجھ سکتے۔ بہرحال وہ گھبرائے اور ایک اضطراب کے ساتھ انھوں نے مسز براؤن سے پوچھا:۔

"کیوں! خیر تو ہے؟"

"ہاں میں بالکل اچھی ہوں" مسز براؤن نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا۔ اس کے بعد پھر ایک بار آہ کی اور کہا "بدنصیب پرسی!"

اب میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ پنسل پرسی کی ہے اور اس روز شب کو خودکشی کرنیوالا یقیناً پرسی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

"پنسل کا قصہ میں ابھی ابھی مسز براؤن کو سنا چکا ہوں" میں نے مسٹر براؤن سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ پنسل پرسی کی ہے؟" مسٹر براؤن نے مسز براؤن سے پوچھا

مسز براؤن نے سر کی جنبش سے اشارۂ تصدیق کیا۔

"تم نے کیسے جانا؟" مسٹر براؤن نے مکرر سوال کیا۔

"میں نے ہی یہ پنسل اس نامراد کو دی تھی" مسز براؤن نے پنسل کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر مسٹر براؤن ایک سناٹے میں آگئے۔ میں نے پنسل کو اٹھا لیا اور مسز براؤن سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر "ال سٹری اس" (درخشاں) لکھا ہے جو نہ آپ کا نام ہے نہ پرسی کا"

"یہ مرنے والے کی جدت ہے۔ جس وقت میں نے اسے یہ پنسل دی رات کا وقت تھا۔ بجلی یکایک گل ہوگئی۔ میں اندھیرے سے گھبرائی اور میں نے پرسی سے کہا "مجھے اندھیرے سے بڑی الجھن ہوتی ہے" اس نے کہا "اندھیرے سے الجھن! مگر اندھیرا ہے کہاں؟ مجھے تو روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ کلیر! تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جہاں تم موجود ہو وہاں اندھیرا نہیں ہو سکتا۔ تم جانتی ہو "کلیر" کے کیا معنی ہیں؟" میں نے کہا "نہیں" تو وہ بولا "کلیر کے معنی ہیں "ال سٹری اس" (درخشاں) اور "برائٹ" (تاباں)" اتنے میں روشنی آگئی۔ اس نے کہا "اگر تم اجازت دو تو میں اس پنسل پر "درخشاں" کھدوا لوں، مجھے یہ لفظ اپنے روشن مستقبل کیلئے ایک مبارک فال معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا "تمہیں اختیار ہے" مسز براؤن یہیں تک کہنے پائی تھیں کہ ایوا اور فریڈی آگئے۔ دونوں کے چہروں سے کچھ رنج کچھ غصہ کے آثار نمودار تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں جنگ ہوئی ہے۔ فریڈی نے آتے ہی کہا "پریم جلدی چلو۔ مجھے ایک دوست سے ملنا ہے۔ پانچ بجے کا وعدہ ہے" مسز براؤن نے کہا "چائے تو پی لو۔ ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے" مگر فریڈی کے سر پر تو اس وقت غصہ کا بھوت سوار تھا۔ کسی کی سنتے نہ مانے اور مجھے بھی اٹھا لائے۔

(پریم پجاری)

سرگذشتِ سگ

سات سال تک پُرسکون زندگی گذارنیکے بعد برف کیطرح سفید اور گالوں کی مانند نرم و نازک بالوں والے حسین کتے کی زندگی میں ایک عجیب و غریب انقلاب رونما ہوا جسکا آغاز بالکل معمولی تھا۔

اخبار والا علی الصباح تمام شہر میں اخبار تقسیم کر آتا تھا۔ جولائی کی ایک صبح کو مالک اپنے سفید کتے کیساتھ، جسکو وہ پیار سے نیلم کہتا تھا، نیلی پہاڑی کی سیر کو چلا گیا اور جب واپس آیا تو نیلم نے ڈیوڑھی میں دو اخبارات ایک دھاگے سے لپٹے ہوئے دیکھے کسی وجہ سے جسکو وہی بہتر جانتا ہوگا، نیلم نے آہستہ سے اپنے لمبے لمبے چمکدار دانتوں کے درمیان اُن اخباروں کے بنڈل کو اُٹھایا اور چند قدم چلکر مالک کیطرف منہ کرکے اسکا چہرہ تکنے لگا۔ مالک اُس سے بہت خوش ہوا اور پیار سے اُسکے سر کو تھپکا۔ نیلم اپنے آقا کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلتا رہا اور کمرے میں پہنچ کر اپنی مالکہ کے قدموں میں اُن اخبارات کو ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر کہ اخباروں سے خواہ مخواہ نہیں کھیلا گیا۔ نیلم کو پھر پیار کیا گیا اور اسکی تعریف کیگئی ——— نیلم اپنے آپ کو خوش قسمت اور مسرور ہونیکے ساتھ ساتھ "مغرور" بھی سمجھنے لگا۔

دوسرے روز جب نیلم رات کی چند گھڑیاں نیند میں گذار کر علی الصباح بیدار ہوا تو حسب معمول اُس نے ڈیوڑھی میں چند اخبارات کا پلندا ڈورے سے لپٹا ہوا دیکھا، اُسے پچھلے دن کا پیار یاد آگیا اور اُس نے پلندے کو آہستہ سے منہ میں دبا کر پھر اپنے مالک کے قدموں میں ڈال دیا، یہ دیکھتے ہوئے کہ نیلم اب ایسی معمولی خدمات انجام دینے کے قابل ہوگیا ہے، اُس نے پھر اسکو تھپکا ——— اور یہی زبردست غلطی تھی جو اُس سے سرزد ہوئی۔

کوئی بڑا ایکٹر بھی اپنے تماشبینوں کی تعریف سے اس قدر مسرور نہ ہوا ہوگا جس قدر کہ نیلم اُن دو انسانوں کے پیار سے خوش ہوا جنکو وہ چاہتا تھا، مالک سے خراج تحسین حاصل کرکے اُس نے پلندے کو جھپٹ لیا اور خوش خوش سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا اپنی مالکہ کے کمرے میں پہنچ گیا، مالکہ سو رہی تھی لیکن اُس نے بغیر کچھ پروا کئے اسکے چہرے پر اگرچہ بھدّے پن مگر محبت سے اُس پلندے کو ڈال دیا۔ بجائے مالکہ کے اگر یہ مالک ہوتا جسکو نیند سے بُری طرح جھنجھوڑا گیا تھا تو یقیناً نیلم کو اپنے اس عمل کو بھول جانا پڑتا۔ مگر وہ مردوں سے مختلف تھی۔ وہ جانتی تھی ——— ہمیشہ سے سمجھدار تھی ——— اس لئے اُس نے اپنی نیند کو برباد کرنے والے کو پیار کیا، کیونکہ نیلم اسکے لئے صبح کا لطیف تحفۂ محبت سے لایا تھا۔

دوسرے روز بجائے دو اخبارات کے بیس کے قریب اخبارات کا انبار تھا اور دونوں میاں بیوی ایکدوسرے کیطرف نہایت حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"جناب! کیا آپکو بھی اخبار نہیں ملے؟" اخبار والے نے پوچھا

"کیوں نہیں؟ مل گئے" مالک نے جواب دیا" ——— ہمکو تو . . . . "

"شکر ہے ایک کو تو مل گئے"ــــــ اخبار والے نے کہا"ــــــ سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اخبار نہیں ملے۔ نہ جانے آپکے محلے میں ایسا کون مذاقیہ ہے؟"

"اوہو!" مالک کچھ سمجھتا ہوا بولا"ــــــ میں آپکو بتا سکتا ہوں کس مذاقیئے نے تمام محلے کے اخبار جمع کرکے میرے گھر میں ڈالدیئے"

میاں نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی "بیکی اور نیلم رات کو کھلے رہے۔۔۔۔"

اپنا نام سنتے ہی سنہری آنکھوں والا کتا جیکی ہوشیار ہوگیا اور اپنی مالکہ کے منہ سے اپنا نام پیار سے سنکر کان کھڑے کر دیئے۔ نیلم جو جیکی پر ذرا بھی نگاہ التفات دیکھکر حسد کرنے لگتا تھا سامنے آکھڑا ہوا اور لگا انگڑائی لینے۔

آقا اسکو دیکھکر کہنے لگا "تم سمجھیں بھی، یہ اسی کی کارستانی تھی؟ یہ دیکھکر کہ اخبار والا دوسرے گھروں پر بھی اخبار ڈالتا ہے اُسکے دل میں حقیقت معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوئی ہوگی اور یہ دیکھکر کہ دو اخبار ہمارے ہوتے ہیں اُس نے یقین کرلیا کہ باقی اخبارات بھی ہمارے ہیں، چنانچہ اُس نے انہیں جمع کرلیا"

"لیکن یہ آئندہ نہیں ہونا چاہیئے" مالکہ بولی "اسکو عادت پڑگئی ہے اسلئے جب تک یہ اسکو نہ بھولے، دن چڑھے تک اپنے کمرے میں بند رکھا کرو"

۲

دن نمودار ہوچکا تھا، پھر بھی نیلم بڑی مشکل سے رات کی تنہائی اور گھبراہٹ سے آزاد ہوا چھوٹتے ہی وہ باہر آیا مگر ڈیوڑھی پر اخبار نہ تھے۔ وہ دوسرے اور پھر تیسرے مکان پر گیا، مگر وہاں بھی کچھ نہ تھا جس سے اسکا دل بیٹھ سا گیا کہ آج وہ اپنے رحمدل مالکوں کے پاس صبح کا تحفہ نہ لیجا سکے گا۔ یہ سب کچھ تھا مگر اسکی حقیقت وجود پر مبنی تھی نہ کہ ایک افسانوی کردار پر اسلئے وہ اس چیز کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ جونہی ملازم وغیرہ جاگ اُٹھتے ہیں، اخبار دروازے میں سے اُٹھا لئے جاتے ہیں، ناکامی کے باوجود یہ اسکی فطرت سے بعید تھا کہ وہ بالکل مایوس ہوکر ہمت ہار بیٹھتا۔ کچھ سوچکر وہ پہاڑ کی مغربی جانب روانہ ہوگیا، جہاں ایک بنگلے میں سے وہ پہلے اخبار لا چکا تھا۔

ــــــ ایک لپٹا ہوا اخبار اب بھی وہاں پڑا ہوا تھا!

اسکے کان مسرت سے کھڑے ہوگئے اور اسکی برف جیسی دُم بل کھانے لگی۔ وہ خوش تھا کہ اسکی جستجو بیکار نہیں گئی اور اب وہ پیاری مالکہ سے محنت کی داد طلب کریگا۔ اُس نے اخبار دانتوں میں آہستہ سے دبایا اور واپس لوٹنے کیلئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ رُکا ــــــ بے چین و پریشان! اُس نے اپنے نتھنے پھلاکر گہرا سانس لیا اور کانوں کو جنبش دیکر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ہوا میں کثافت پیدا ہوگئی تھی اور دھوئیں سے ملفوف فضا اسکو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اسکے علاوہ ایک عجیب و غریب ــــــ میٹھی سی معصوم سی ــــــ آواز اُسے روک رہی تھی، طلسمی حواس کے ذریعے خصوصاً بُو اور آواز کا کتوں پر اس چیز سے زیادہ اثر ہوتا ہے جو اسکو بالکل ہی قریب نظر آئے۔

قوت سامعہ اور قوت شامہ کی فراوانی کی وجہ سے اُس نے جلدی ہی وہ مقام معلوم کرلیا جو ان دونوں کا منبع تھا

سامنے کھڑکی میں جس پر فرانسیسی جالی کا پردہ تنا تھا اُس نے دیکھا کہ ایک پلنگ پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت منہ کھولے زور زور سے خراٹے لیتی ہوئی سو رہی ہے" اور قریب ہی ایک پلنگڑی پر ایک بچی ——— جسکی ایک ڈیڑھ سال کی عمر ہوگی ——— ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ بچی بیدار ہو چکی تھی ——— ایسی دُنیا میں جہاں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور سورج کی پہلی کرنیں عالمِ بیخودی میں ناچ رہی تھیں وہ اکیلی تھی اور اس تنہائی میں اُس نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ اگر بچوں کے غیر پابندِ لے نغموں کو گانا کہا جا سکتا ہے

میٹھی آوازیں، شیریں اور سُریلے لہجے میں جو نوری نما تھا...... الفاظ اور معنی سے آزاد !!

——— یہی وہ نغمۂ موسیقی تھا جس نے نیلم کے دل پر اثر کیا۔

اور فوراً ہی اُس نے بُو کا پتہ بھی چلا لیا جو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔

بچی کی آیا شروع ہی سے شراب کی عادی تھی، مگر اُس کو قبیح اور مضر سمجھ کر چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس رات کو جب دل سے مجبور ہوگئی تو ایک بوتل لا کر میز پر رکھ دی جو پلنگ اور پلنگڑی کے درمیان رکھی تھی لیکن اس وقت ضبط کر کے سو گئی، رات ختم ہونے میں جب دو چار گھڑیاں رہ گئی ہونگی وہ پھر بیدار ہوگئی اور اپنے آپ کو تحمل کے ناقابل پا کر اُس نے بوتل کیطرف ہاتھ بڑھایا مگر تاریکی میں ہاتھ اُس تک نہ پہنچ سکا، تلاش کرنے کے لئے اُس نے موم بتی جلائی، لیکن شراب پی کر گُل کرنی بھول گئی۔ صبح تک موم بتی ختم ہوگئی اور اس کا آخری شعلہ پاس ہی پڑی ہوئی فلالین کی گڑیا میں سرایت کر گیا اور وہاں سے بچی کی پلنگڑی کے پردوں میں۔ پردے سلک کے ہونیکی وجہ سے آگ یکدم نہ بھڑکی، بلکہ آہستہ آہستہ چنگاریاں پردوں سے زمین پر گرتی شروع ہوگئیں، انہی پردوں اور گڑیا کی وجہ تھی کہ فضا مکدر ہوگئی تھی اور ہوا دھوئیں سے لبریز۔

نیلم فرانسیسی دریچے میں سے یہ سب کچھ دیکھنے میں منہمک تھا۔

۳

دریچہ تاروں کی جالی سے لیس تھا اور نیلم باہر سے بچی کی نغمہ سرائی کو بغور سُن رہا تھا۔ اسکو دیکھتے ہی بچی کا گیت اور بھی بلند ہوگیا۔ اُس نے اپنے موٹے تازے ہاتھ اسکی طرف بڑھا دئے اور اس حرکت کے ہوتے ہی سُلگتے ہوئے پردوں میں سے چند چنگاریاں اسکی گردن کے قریب گریں۔ ایک چنگاری اُسکے گال پر جھڑ گئی جس سے وہ بلبلا اُٹھی۔ یہ دیکھتے ہی نیلم کا جذبۂ ہمدردی بھڑک اُٹھا لیکن اسکے اور متحیر و خائف معصومہ کے درمیان تاروں کا پردہ تھا مگر یہ اسکی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ تار فولاد کی سلاخیں ہیں یا لکڑی کے جالے۔ وہ پیچھے ہٹا اور پوری طاقت سے جالی سے ٹکرایا عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے پورے دباؤ نے اُسے اندر دھکیل دیا، اور وہ بچی کے بالکل قریب پہنچ گیا جس طرح شکاری کتا تیتر اُٹھاتا ہے، نیلم نے نہایت نرمی سے اپنے بڑے بڑے جبڑوں سے بچی کا شانہ پکڑا اور اس طرف بڑھا جہاں اس نے آنیکا راستہ بنایا تھا۔ دانتوں کی گرفت اگرچہ معمولی تھی، پھر بھی رخساروں کی سوزش نے اُسے رُلا دیا تھا، وہ اس عجیب و غریب طریقۂ انتقالِ مقام پر بیحد متعجب تھی اور شوق سے اپنے حیوان دوست کو دیکھ رہی تھی۔

اپنے حملے سے کٹے ہوئے خلا کو دیکھ کر نیلم کو معلوم ہوگیا کہ وہ اس "زندہ بوجھ" کو جال میں سے نہیں لیجا سکتا۔ اس نے آہستہ سے بچی کو فرش پر لٹا دیا اور پوری طاقت سے خلا کے پاس جالی پر حملہ کیا اور ادھر سے پھر خوفناک حملے کیسا تھا اندر آیا۔ اس طرح کرنیسے کافی وسیع جگہ بنگئی تھی، اسکی ناک کان اور ایک پنجہ بُری طرح زخمی ہوگئے تھے لیکن اُس نے جالی کو توڑ دیا

تھا اُس نے کسی خوف سے پلنگڑی کیطرف دیکھا۔ آگ برابر پھیل رہی تھی مگر آیا ابھی تک خراٹے لے رہی تھی۔

اُس نے سنہری بالوں والی بچی کو پھر آہستہ اور نرمی سے اُٹھایا اور وہاں سے نکال کر ایک محفوظ جگہ بچا کر گھاس پر لٹا دیا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنیکا اسکے دماغ میں کوئی خیال نہیں تھا۔

بچی نیلم کو دیکھ کر معصومانہ دلربائی سے مسکرا رہی تھی۔ خون نیلم کے جسم سے بہہ رہا تھا مگر وہ اپنی دُم کو جنبش دیتا ہوا اسکے چہرے کو چاٹنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک دروازہ کھلا اور کوئی شخص آنکھیں ملتا ہوا سامنے کھڑا ہوا۔ اپنی لخت جگر کو سامنے پڑا ہوا اور ایک وحشی کتے کو خون سے لت پت اس پر جھکے ہوئے دیکھکر اسکی آنکھوں میں خوف اور غصے سے خون اتر آیا بجلی کیطرح اس نے بچی کو نیلم کی حفاظت سے چھڑا لیا اور پوری مردانہ قوت سے اسکے سینہ پر ایک لات ماری جس سے نیلم تڑپ کر رہ گیا ——

یہ ہے احسان کا بدلہ؟ محسن کش انسان!!

——— ::%:: ———

نیلم نے چوٹ کھائی ہوئی قوت کو جمع کیا اور آسمان کیطرف منہ اُٹھا کر ایک لرزہ خیز چیخ ماری۔ پھر اُس شخص پر حملہ آور ہوا جس نے احسان کے بدلے اس پر ظلم کیا تھا۔ نیلم معمولی کتا نہ تھا۔ اسکے بڑے جسم اور ڈراونے جبڑوں کا مقابلہ کرنے کیلئے فولاد کے جگر کی ضرورت تھی، اپنے بہتے ہوئے لہو کی پرواہ کئے بغیر خوفناک منہ کھول کر بچی کے باپ کو اس کا مزا چکھانے کیلئے وہ اس پر جھپٹا مگر ——— ہوا میں اچھل کر خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ اُس آدمی کے سینے سے بچی چمٹی ہوئی تھی۔ ..... اور نیلم جیسے شہ زور معصوم بچوں کیخاطر تو اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں، ان کو کوئی گزند پہنچانے کیلئے کیا حملہ آور ہونگے۔

راستے پر اپنے خون کے دھبے بناتا ہوا، نیلم مغموم و مجبور واپس ہوا۔

آگ پھیل رہی تھی اور دھوئیں نے بچی کی ماں کو بھی بیدار کر دیا وہ گھبرا کر فرانسیسی کھڑکی میں سے اندر کود گئی اور بلبلا کر پکارنے لگی "آیا آیا! بچی کہاں ہے؟"

آگ بجھاتے ہوئے، باپ نے کہا "بچی محفوظ ہے ——— دوسرے کمرے میں"

——— ۴ ———

نیلم اپنے مکان پہنچ گیا۔

دونوں میاں بیوی اس کے اس قدر لہو ضائع جانے پر تاسف کر رہے تھے اور ساتھ ہی خائف بھی تھے کہ کہیں اُس نے کچھ اور گل نہ کھلائے ہوں۔

"نیلم" مالکہ نے زخمی محبت سے مجبور ہو کر حیرت سے کہا۔

زخمی اور لاچار نیلم محبت سے اپنا نام لئے جانے پر بے قابو ہو گیا اور منہ لٹکائے اپنی مالکہ کے قدموں میں لوٹنے لگا اور اسکی سفید چکن کی ساڑھی خون سے تر کر دی۔

"ہشت! چل یہاں سے ....." مالک غصے سے بولا "نہ جانے بیگم! اس نے کیا کیا، کہیں ———؟"

اُن دو انسانی صورتوں سے جنکی نیلم پرستش کرتا تھا۔ جھڑکی کے الفاظ سُن کر نیلم کا دِل بیٹھ جاتا تھا۔ گھڑکی سُن کر

وہ دُم دبا کر ایک طرف نکل گیا۔

مالک خائف ہو کر آہستہ سے بولا"...... خیر! جسکو زخمی کیا ہوگا وہ خود ہی یہاں آئیگا ـــــــ بلا سنگین معلوم ہوتی ہی۔ ٹل جائے جب جانو"

وہ دونوں ابھی کسی پوشیدہ خوف سے ڈر ہی رہے تھے کہ ایک موٹر دروازے پر آکر رُکی۔ نیلم کا مالک بھی باہر آگیا۔ موٹر میں سے ایک مرد باہر نکلا اور اسکے بعد ایک عورت جسکی گود میں ایک سنہرے بالوں والی بچی تھی۔

"میرا نام ساداَن ہی...." مرد نے اپنے آپ کو متعارف کراتے ہوئے کہا"... اور یہ مسز ساداَن اور ہماری اکلوتی بچی.... ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ آپ کا وہ بڑا کتا...."

"اگر آپکو کوئی شکایت ہی....." مالک بات کاٹ کر بولا، اسکا سانس تیز ہوگیا اور وہ کوئی بڑا خدشہ محسوس کرنے لگا"... اگر آپ کو کوئی شکایت ہی تو میں ....." مالک نے اپنے دل میں کہا" شاید نیلم نے کسی کو زخمی کر دیا ہی..... یا مار ڈالا ہی..... اے میرے اللہ!"

ماں کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے ـــــــ اور نیلم کے آقا کا خوف یقین سے بدل گیا مگر ساداَن اپنی بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے بولا" نہیں ... ہماری آیا شراب کے نشے میں دُھت ہوگئی اور اسکی بدمستی نے آگ لگا دی اور بچی بند کمرے میں تھی۔ آپکے کتے نے فرانسیسی جالی توڑ کر بچے کو باہر کھینچا ـــــــ عین وقت میں..... ہم اسکا شکریہ زبان سے ادا نہیں کر سکتے"

بچی کے باپ کی زبان نے یارا نہیں دیا اور ماں پہلے ہی نمناک تھی لیکن بچی ایک طرف ہمکی، اور ماں نے اُسے فرش پر بٹھا دیا ـــــــ سامنے سے ایک کتا لپکا ہوا آرہا تھا...... بچی نے اپنے محسن نیلم کو دور تالاب ہی پر دیکھ لیا تھا پانی اور پھر دلدل میں لوٹنے سے اسکا خون تھم گیا تھا اور اسیطرح وہ جھڑکیاں اور گھُرکیاں بھی بھول گیا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر اُس نے پھریری لیکر پانی کی چھینٹیں اور مٹی جھاڑی گو وہ قریب قریب سب پر آکر پڑیں، وہ دوڑ کر معصوم لڑکی کے قریب پہنچا تاکہ اسکے رخساروں کو چاٹے۔ اسکو فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ جھڑکیوں کی بجائے غیر معمولی طور پر سب اسکی تعریف کر رہے ہیں۔

ساداَن وغیرہ جا چکے تھے، اور مالک نیلم کو نہلا کر اسکے زخم دھو رہی تھی۔

"لاؤ، میں دُھلاؤں ـــــــ" شوہر نے اپنی بیوی کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا" ـــــــ نیلم کس قدر محبت کے قابل ہی اور ساداَن بھی عجیب ضدی تھے، مجھے ایک گھنٹہ انہیں سمجھانے میں لگ گیا کہ جواہرات سے یہ مرصع پٹہ اسکے لئے بیکار ہے اسکو تو آدھ سیر گوشت زیادہ پسند ہی مگر وہ نہ مانے"

سیٹی بجاتے ہوئے اور پیار سے اُسکو تھپکتے ہوئے مالک نے پھر کہا" دیکھنا بیگم! اگر آج چارلی چیپلن ہلیٹ"

کاپارٹ اداکرے اور کل ایک جہاز کو تباہی سے بچالے تو لوگ اسکا کس قدر دلچسپی اور تعجب سے ذکر کریں گے اور ـــــــ یہی حال ہمارے نیلم کا ہے "

"اور تم تو اب اُسکو کمرے میں بند نہیں کروگے؟ وہ مقید ہونا پسند نہیں کرتا" بیوی نے نیلم کی حمایت لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں" مالک بولا "جب یہ کہانی تمام شہر میں پھیل جائیگی تو کوئی شخص بھی اسکے اخبار اُٹھالانے پر اعتراض نہ کریگا۔ اچھا ہوا میں نے اسکی اس بری عادت کا اُن لوگوں کے سامنے تذکرہ نہیں کیا ورنہ وہ تو پچاس اخباروں کا تمام زندگی کیلئے چندہ دیدیتے ـــــــ"

(ماخوذ) ـــــــ صادق الخیری۔ دہلوی

ثمراتِ تخیّل

رہیں دُنیا میں کیوں رنجِ قفس سے سرگراں ہوکر
اجل منظور لیکن آئے خوابِ آشیاں ہوکر

ہماری نیستی سے بھی نزاوش کرتی ہے ہستی
مٹے پر بھی رہے ہم شرحِ جورِ آسماں ہوکر

مجھے میرا تخیل دوسرے عالم میں رکھتا ہے
الگ ہوں میں جہاں سے شاملِ اہلِ جہاں ہوکر

کیا تھا جن کو میں نے آشنائے جلوۂ رنگیں
وہی آنکھیں مجھے کرتی ہیں رسوا خونفشاں ہوکر

وہ بیکس ہوں میسر لطفِ ایذا تک نہیں مجھکو
گذر جاتی ہے بجلی بھی قریبِ آشیاں ہوکر

نتائج نے مری غفلت کے دی تعلیم بیداری
مری آنکھیں کھلی ہیں مائلِ خوابِ گراں ہوکر

سمایا ہے یہ کس کا حسنِ عالم تاب آنکھوں میں
نظر ہر ذرہ کیوں آتا ہے مہرِ ضوفشاں ہوکر

تجلّی ہے یہی تو رہ چکا پاسِ حیا قائم
کھلی پڑتی ہے شوخی اور پردے میں نہاں ہوکر

نکالا گل کدے سے قسمتِ ناساز نے مجھ کو
میرے حق میں بہار آئی ہے تصویرِ خزاں ہوکر

کروں گا وقت پر اندازہ میں فیضانِ ساقی کا
پیوں گا جرعۂ صہبا فراغِ دو جہاں ہوکر

وطن سے کب ہو اُلفت رہروانِ ملکِ ہستی کو
عدم کو جارہے ہیں کارواں در کارواں ہوکر

یہاں ہے آرزوئے لب کشائی جرم میں داخل
جو آئے تیری محفل میں رہے وہ بے زباں ہوکر

نہالِ زارِ فکر ہوش ہے کس کو بہاراں میں
سراپا کیف ہوں محوِ جمالِ گلستاں ہوکر

نہال سیوہاروی

انیسِ حال

اِس عُنوان سے مَیں ایسے شُعرا کے حالات لکھا کرتا ہوں جو بفضلہ آج تک بقیدِ حیات ہیں اور جن سے مجھ سے کبھی ملاقات ہوئی اور اُن کا کلام میں نے سُنا ہے تاکہ میرے زمانے کے زندہ شعرا کا ایک تذکرہ مُرتّب ہو جائے۔

ان میں جناب مرزا ذاکر حسین قزلباش ثاقبؔ بھی ہیں جن کی عمرِ عزیز اِس وقت ۶۶ برس کی ہے اور ان کا دیوان بھی زیرِ طبع ہے۔ آپ نہایت پُر اخلاق شریف النفس آدمی ہیں مگر ایک بات کے قائل ہیں کہ شاعر کو ضرور مالیخولیا ہوتا ہے، وہ شاعر نہیں جسے مالیخولیا نہ ہو۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ شعر کا فن بہت مُشکل سے آتا ہے۔ اور کہتے ہیں شاعر کسی کا احسان برداشت نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت ہم فکرِ شعر میں ہوں ہم سے کوئی بات کرنے کی جُرأت نہیں کر سکتا۔

اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں ہماری عمر ۱۵ سال تھی ۱۸۸۸ء کا ذکر ہے، ہم آگرہ میں تھے، سُنا کہ نواب مرزا داغؔ دہلوی شہر میں تشریف لائے ہیں اور محلہ سیب بازار میں حکیم اشتیاق علی کے یہاں فروکش ہیں۔ مجھکو اُن سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ سہ پہر کو ٹہلتا ہوا سیب بازار گیا۔ اُس وقت حکیم صاحب نہیں تھے معلوم ہوا کہ داغؔ صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اسی مکان میں گیا۔ داغؔ صاحب مکان کے صحن میں پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور بہت ادب سے ایک مونڈھے پر اُنکے سامنے بیٹھ گیا۔ دس منٹ تک اُن کے پاس بیٹھا رہا اُنہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو۔ آخر میں نے عرض کیا کہ "میں نے آپ کے کلام کی بہت تعریف سُنی ہے اور اکثر کلام دیکھا بھی ہے مگر یہ تمنا ہے کہ آپ کا کلام آپ ہی کی زبان سے سُنکر فیض و لُطف اُٹھاؤں" فرمایا کہ "میرے دیوان چھپ چکے ہیں اُنہیں مول لیکر آپ دیکھ سکتے ہیں" یہ جواب سُنکر مجھکو بھی کچھ تاؤ آگیا اور میں نے کہا "میرے پاس اتنا فالتو روپیہ نہیں ہے کہ مہملات کے خریدنے میں صرف کروں" اُنہوں نے فرمایا "جب آپ میرے کلام کو مہمل سمجھتے ہیں تو اسکے سننے کی کیا ضرورت ہے" یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں حکیم اشتیاق علی صاحب بھی آگئے اس وقت میرا چہرہ غصے سے بہت سُرخ ہو رہا تھا۔

حکیم صاحب بزرگ آدمی تھے اور میرے والد کے ملنے والے تھے اور مجھکو اچھی طرح جانتے تھے، اُنہوں نے یہ تقریر سُنکر کہا "کیا جھک مارتے ہو" اور داغؔ صاحب سے کہا "یہ ایک شریف خاندان کے لڑکے ہیں اور عربی فارسی خوب جانتے ہیں۔ آجکل انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور شعر بھی بہت اچھا کہتے ہیں اور کلام کے پرکھنے میں اچھی لیاقت ہے"

اُنہوں نے پوچھا "آپ کس کے شاگرد ہیں" میں نے کہا "شعر کہنے میں تو کسی کا شاگرد نہیں ہوں نہ ضرورت ہے، ہاں علم عروض معانی و بیان میر مومن حسین صاحب صفیؔ سے حاصل کیا ہے۔ یہ صفیؔ صاحب امروہے کے رہنے والے ہیں" کہا "اچھا اپنا کچھ کلام سُناؤ" میں نے تین شعر سُنائے جس کا صرف ایک شعر یاد ہے ؎

کُھلا یہ مرکے نشیب و فراز اُلفت کا سر مزار وہ آئے تو مزار ہوں میں

یہ شعر سُن کے بہت تعریف کی اور دیر تک مزہ لیتے رہے۔ پھر آپ نے بھی تین شعر سُنائے۔ جس کا ایک شعر ہم کو یاد رہ گیا ؎

مقتضائے وقت کا پابند ہر حالت میں ہوں　　　میں زمیں پستی میں ہوں تو آسماں رفعت میں ہوں

پھر اُس کے بعد تو ایسی بے تکلفی ہو گئی کہ حیدرآباد سے اُن کے خطوط برابر ہمارے پاس آتے رہے۔
ہم نے پوچھا داغ کی صورت کیا تھی اور کلام کس طرح پڑھتے تھے؟
کہنے لگے ہم سے سنئے، دراز قد، بدشکل، سیاہ فام آدمی تھے، صورت شکل سے تو کوئی اُن کو شاعر نہیں کہہ سکتا مگر پڑھنے کا طرز شاعرانہ تھا، تحت اللفظ شعر پڑھتے تھے، گاتے نہیں تھے، مگر جس انداز سے پڑھتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

دوسرا واقعہ ۱۹۰۶ء کا ہے کہ ہمارے شباب کا زمانہ تھا تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے تھے، چوبیس پچیس برس کی عمر تھی شادی ہو چکی تھی اور ہم الہ آباد میں رہتے تھے جس طرح تمہاری دُکان پر شام کو اہلِ علم و شعرا کا مجمع رہتا ہے اسی طرح الہ آباد میں خان بہادر خواجہ غلام غوث صاحب بیخبر کا دولتکدہ تھا، بالالتزام اتوار کو دس بجے سے تین بجے تک شعر و شعرا، سرکاری ملازم اور اونچے اونچے عہدہ دار اہلِ علم تشریف لاتے تھے۔ شعرا بہت العجز سے کلام سُناتے تھے اور خوب خوب داد ملتی تھی۔ کم و بیش بیس پچیس ہزار شعر اُردو و فارسی شعرا کے ہم کو یاد تھے۔ ہم اُردو شعرا میں صرف غالب کے کلام پر شیفتہ تھے اور اسی رنگ میں خود بھی کہتے تھے اور اچھی داد ملتی تھی کیونکہ سب منتخب روزگار جمع ہوتے تھے، بہت نکھری ہوئی صحبت ہوتی تھی۔ ہم کو تحت اللفظ پڑھنے کی عادت تھی اور اسی رنگ میں شعر کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ شاعرانہ رنگ میں تحت اللفظ شعر کا ادا کرنا مشکل کام ہے اور وہی ہمارا حصّہ تھا۔ آواز بھی متناسب طرزِ ادا خوش گلوئی ان سب باتوں نے ملکر ہمیں ایسا فروغ دیا تھا کہ کسی گاسنے والے شاعر کا ہمارے سامنے ٹکنا مشکل ہے۔ الہ آباد بھر میں ہمارے پڑھنے کا چرچا تھا، اتوار کے جلسہ میں بہترین شاعر جمع ہوتے تھے۔ اس جلسہ میں ایک مولوی یحیٰی صاحب امین تھے جو ہمارے والد کے ملنے والے تھے۔ ہم اُن کی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے، وہ بھی ہماری شاعری کے دلدادہ تھے ایک روز ہم سے فرمائش کی کہ مصرع ذیل پر مصرع لگا دو۔ ؏

گھبرا نہ جاؤ پیار کرو پیار کی طرح

ہم نے بہت خوب کہہ کر ٹال دیا اور کہہ دیا کہ چلتے وقت لگا دیں گے۔ اس روز باتوں میں وہ بھول گئے اور ہم بھی بھول گئے پھر اتوار کو جانا ہوا تو مولوی صاحب نے کہا مصرع تو تم نے خوب لگایا آج ضرور لگا دو۔ ہم نے کہا بہت خوب بات رفت و گذشت ہو گئی۔ تیسرے اتوار کو آئے تو ہمارے پاس بیٹھے رہے اور چلتے وقت ہمارے ساتھ اُٹھے۔ فرمانے لگے۔ چلو الہ آباد کے ایک نامی شاعر سے تمکو ملوا دیں۔ ہم نے کہا۔ اب وقت نہیں رہا، تھکے تھکائے ہیں پھر کسی روز چلیئے گا۔ انہوں نے اصرار کیا دم بھر میں لوٹ آنا، راستہ میں تو مکان ہے۔ مجبوراً اُن کے ساتھ جانا پڑا۔

ایک عالیشان مکان میں ہم کو لے گئے جس میں پُرتکلف فرش چوکے پر بچھا ہوا تھا اور شہر کے نامی اُمرا گورنمنٹ عہدہ دار ہندو مسلمان بیٹھے ہوئے تھے، ہمارے والد کے ملنے والے عبدالقادر خاں ڈپٹی کلکٹر ان سب لوگوں کو ہم یکجا دیکھکر ہکا بکا ہو گئے۔ مولوی محمد یحیٰی صاحب ہم کو لیکر ایک جگہ بیٹھ گئے اور کسی کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں کیا دیکھا کہ ایک نازنین حسین طوائف بہ لباسِ فاخرہ آراستہ پیراستہ خندہ پیشانی کوئی بیس پچیس برس کا سن، گوری چٹی، ناک نقشہ سے دُرست، متناسب الاعضا، نہایت حسین چلی آتی ہے۔ صاحب سلامت مزاج پُرسی کے بعد ہمارے قریب بیٹھ گئی اور مولوی یحیٰی سے کہا آپ کی تعریف کیجئے۔ مولوی صاحب نے کہا

یہی شاعر مرزا ثاقب ہیں جن کا ذکر آپ کیا کرتی تھیں۔ یہ سُنکر بہت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا میں آپ کے دیکھنے کی مشتاق تھی آپکے بہت سے شعر مجھے یاد ہیں اب کچھ اپنا تازہ کلام سُنائیے۔ میں نے عذر کیا کہ کلام تو مجھے یاد نہیں، دیوان لیکر آؤں گا تو سُناؤں گا اُس نے کہا اس مصرع پر مصرع لگا دیجئے۔ ؎ گھبرا نہ جاؤ پیار کرو پیار کی طرح

میں نے کہا یہ مصرع تو کچھ وقیع نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاعر نے نظم کی دقت سے عاجز ہوکر محاورے کو خراب کر دیا۔ اصل میں "گھبرا سے نجاؤ" ہونا چاہئیے، اُس نے گھبرا نہ جاؤ کہدیا۔ یہ سُنکر اُس نے تعجب کیا۔ کیونکہ بہت شاعر اس پر اپنا مصرع لگا چکے تھے اور کسی نے نہیں کہا تھا کہ محاورہ غلط ہے، اسکے بعد بہت اصرار کیا کہ کچھ کلام سُناؤ۔ مگر میں نے معذرت کی کہ کوئی شعر یاد نہیں آتا۔ اسکے بعد ہم سے آپ سے بیتا بجّی ہو جائے۔ میں نے پوچھا بیتا بجّی کیا چیز ہے۔ کہا ایک شعر جو ہم کہیں اُسی مضمون کا دوسرا شعر کسی دوسرے شاعر کا آپ بھی سُنائیے اور اُسکے ساتھ شرط بھی ہو جائے۔ میں نے کہا شرط کیا بدی جائیگی کہنے لگی فی شعر دس روپے۔ میں نے کہا میرے پاس روپیہ کہاں۔ کہنے لگی جو آپ تجویز کریں۔ اب میں نے بزرگوں کا بھی لحاظ اُٹھا دیا۔ کہا فی شعر ایک بوسہ، اور وہ بھی جیتنے والا جسے کہے اُسے دیا جائے۔ فرض کیجئے ہم ہار گئے اور آپ کہیں ایک مہتر کو بوسہ دو تو ہمیں دینا پڑیگا۔ اُس نے کہا یہ شرط منظور نہیں ہے۔ ہم نے کہا منظور نہیں ہے تو القط کیجئے۔ پھر اُس نے کہا اچھا اس کا فیصلہ پھر ہو جائیگا

ہماری رائے کو ڈپٹی صاحب نے بہت پسند کیا اور کہا کیوں نہ ہو ہمارے دوست کے بیٹے ہو، کہاں تک ہمارا خیال پہونچا۔ دوسرے صاحب بولے "ہمارے بھی دوست کے بیٹے ہیں اسی لحاظ سے تو یہ شرط بدی"۔ سب اپنے اپنے دل میں خوش تھے کہ اگر جیتے گا تو پہلے ہمیں سے کہیگا کہ بوسہ لو، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سارا مجمع ہمارا طرفدار ہو گیا۔

اب ہم اس عورت کے حالات بھی بتادیں کہ آپ کی حیرت بھی دور ہو جائے، یہ نازنین خاندانی طوائف ہے نہایت تعلیمیافتہ اور پاکیزہ مذاق رکھنے والی مہذب، شاعری کا بہت شوق ہے اور شعر خوب پرکھتی ہے۔ مرزا غالب کی طرفدار ہے اور ہزاروں معرکہ کے شعر اُسے یاد ہیں۔ چونکہ علم موسیقی میں کامل ہے اس لئے گلا بھی تیار ہے۔ جس شعر کو پڑھتی ہے اُس میں جان بھی ڈالدیتی ہے۔

ہم سے اُس سے بیتا بجّی ہوئی۔ جس مضمون کا وہ شعر پڑھتی ہے، ہم سے اُسی مضمون کا شعر اُس سے بہتر سُنتی ہے، بہت وقت گذر گیا کوئی نہ ہارا۔ آخر اُس نے کہا اب ایک شعر پر خاتمہ ہے یا تو تم اسی مضمون کا اس سے بہتر شعر سُنا دو یا ہار مانو۔ یہ کہکر شعر پڑھا ؎

کسی نے یہ نہ کہا اُن سے میرے دفن کے وقت
کہ اِن پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے

ہاں ہم اتنا کہنا بھول گئے، اس حُسن کی دیوی کا نام امیر جان تھا اور میرٹھ کی رہنے والی تھی اور بڑے بڑے رئیس اسکی چاہت میں مُبتلا تھے۔ کئی سو روپے مُجرے کر لیتی تھی۔ الہ آباد بھر میں اسکی دھوم تھی۔

ہم نے کہا "بس اسی مضمون کا شعر سُنا دیں" اُس نے کہا "ہاں"۔ ہم نے شعر پڑھا۔

ہماری قبر کے تختوں کو یاد رکھیں دوست
کسی غریب کی کشتی اگر تباہ ملے

سب نے ایک زبان ہو کر کہا "یہ شعر بہت اچھا ہے" اور اُس نے بھی تعریف کی۔ رات ہو گئی تھی اس لئے ہم رخصت ہو کر

گے ہوئے گھر چلے ؟

اب مرزا ثاقب کا کچھ کلام بھی سُن لیجئے :-

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شبِ غم آگئی جلنے کا پھر پیغام آتا ہے
دیا ہے آتشیں پہنے چراغِ شام آتا ہے

خدا معلوم کتنی دُور میں بیٹھا ہوں ساقی سے
کہ میرے پاس جب آتا ہے خالی جام آتا ہے

دلِ ناداں کبھی ناکامیاں بھی کام آتی ہیں
جدھر سے کچھ نہیں ملتا اُدھر بھی اک صدا دینا

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

جفا اُٹھانے کی عادت جو ہو تو کیونکر جائے
ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

ملا کے دستِ دُعا ظرف اک بنایا تھا
سنے ہوں ہاتھ میں کاسہ خدا کرے بھر جائے

مثلِ سائل در پہ تیرے یہ دلِ رنجور ہے
میں نہیں کہتا کہ کچھ دیدو مگر دستور ہے

دیکھ میرے دل کو تو اے منکرِ اعجازِ عشق
گر نہیں سکتا ہے بادہ اور شیشہ چور ہے

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے
نظر صیاد کی چھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے

مرے چھوڑے ہوئے صحرا کی گرد ابتک نہیں بیٹھی
پکار اُٹھتا ہے ہر ذرہ کہ میں گذرا ہوں منزل سے

قفس کے پاس دل تھامے ہوئے صیاد بیٹھا ہے
اسیرِ غم خدا جانے تری آواز میں کیا ہے

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹے آواز نہیں آتی

برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ اُلفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

در سینکڑوں قفس میں ہیں پھر بھی اسیر ہوں
کیسا مکاں ملا ہے غریب الدیار کو

عشرت لکھنوی

اندھی لڑکی کے خطوط

پیارے بھائی۔ تمہاری استدعا ہے کہ میں تمہیں اپنے حالات سے بذریعہ خط مطلع کروں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم ایک نابینا لڑکی سے جو تاریکی میں ٹٹول ٹٹول کر چلتی ہے، خط کی کیونکر توقع رکھتے ہو۔ کیا میرا تاریکی میں لکھا ہوا تاریک خط تمہارے خیالات کو تاریک نہ کر دیگا؟ میرے ذہن میں ہر وقت مایوس کن اور اندوہگیں تفکرات کا اجتماع رہتا ہے کیا تم انہیں سننا پسند کرو گے؟

بھائی۔ تم خوش قسمت ہو، سب کچھ دیکھ سکتے ہو۔ تم اپنی آنکھوں سے دنیا، نیلگوں آسمان، پُرضیا آفتاب اور فطرت کے دلفریب مناظر دیکھ کر سرور حاصل کرتے ہو۔ آہ کبھی میں بھی فطرت کی ان فیاضیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوا کرتی تھی، اور حظ اُٹھایا کرتی تھی، لیکن میں ابھی پورے دس سال کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ قدرتِ کاملہ نے نہیں معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر مجھے بینائی سے محروم کر دیا چنانچہ آج میں متواتر پندرہ سال سے تاریکی اور ظلمت کے ناپید اکنار سمندر میں ڈبکیاں کھا رہی ہوں، دن کی روشنی اور رات کی تاریکی ان دونوں میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

میں اکثر کوشش کیا کرتی ہوں کہ فطرت کی فیاضیوں کو محسوس کر سکوں، مگر افسوس میرا آئینہ دل ان کا عکس لینے سے عاجز ہے فطرت کے جملہ رنگین مناظر کی یاد میرے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ چکی ہے، میں گلاب کے پھول کی دلفریب خوشبو محسوس کر سکتی ہوں، ہاتھ سے ٹٹول کر اس کی نزاکت اور بناوٹ کا اندازہ بھی لگا سکتی ہوں، لیکن اسکے قابل صد رشک سرمایہ کو یعنی رنگ جس کے ساتھ حسینان عالم کے حسن کو تشبیہ دیگئی ہے میں بالکل بھول چکی ہوں، الغرض میں کسی چیز کو دیکھنے اور دیکھکر لطف حاصل کرنے سے قطعاً معذور ہوں۔ میری بینائی سے محروم آنکھوں کے پردوں میں اکثر عجیب و غریب رنگ کی کرنیں رقصاں رہتی ہیں حکما کا خیال ہے کہ یہ دوران خون کی وجہ سے ہے، اور اسی سبب سے اُنہیں اُمید ہے کہ مکمل علاج سے میری بینائی درست ہو سکتی ہے، اور اسی اُمید کے سہارے میں ابتک بقید حیات ہوں، مگر افسوس وہ نور جسے میں پندرہ سال ہوئے کھو چکی ہوں، اور جس کا تصور تک بھی اب ذہن سے اتر گیا ہے، اب میں اُسے نہ پا سکونگی، اور اگر مل گیا تو یہ دنیا میرے لئے فردوس بریں سے ہرگز کم نہ ہوگی

آج مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ میں اپنے کمرہ میں ٹٹول ٹٹول کر چل رہی تھی کہ ناگہاں میرا ہاتھ ایک عجیب چیز پر پڑا۔۔۔ تم خیال بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کیا چیز تھی۔۔۔۔ سنو وہ ایک آئینہ تھا۔ اُسے میں نے اُٹھا لیا اور اندازے سے بالوں کو سنوار کر درست کیا۔ اس عمل سے میرا قلب بے حد مسرور ہوا۔ کاش! میں بچشم خود اپنا خوبصورت چہرہ دیکھ سکتی، اور اپنے ملائک فریب حسن کا اندازہ لگا سکتی، تاکہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا میرا جسم جسقدر ملائم ہے اسیقدر سڈول بھی ہے؟ کیا میرے نقش و نگار میں ساحرانہ قوت بھی ہے؟ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں معصوم بچی تھی تو میرے والدین اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی لڑکی دیر تک آئینہ دیکھے تو آئینہ میں شیطان آ جاتا ہے، اب اگر ان کا یہ قول درست ہے تو آج بھی ضرور شیطان نے میری خوب خوب نقلیں اتاری ہونگی۔

عزیزوں نے تمہارا محبت نامہ پڑھکر سنایا، تم نے دریافت کیا ہے کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ میرے والدین دفینہ ملجانیکی وجہ سے امیر کبیر بن گئے ہیں، اسکے متعلق میں کچھ بتانے سے معذور ہوں۔ کیونکہ میں خود اس امر میں تم سے زیادہ بے بہرہ

ہوں، لیکن اس پر بھی یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرے والدین دولتمند ضرور ہیں۔ کیونکہ مکان میں جہاں کہیں میں ہاتھ رکھتی ہوں مجھے مخمل یا ریشم کا کپڑا ہی پڑا ملتا ہے۔ مجھے پہننے کیلئے بیش قیمت لباس دیا جاتا ہے اور کھانے کے لئے عمدہ سے عمدہ اور لذیذ غذائیں، الغرض میرے آرام و آسائش کے کل سامان موجود ہیں، اور یہی میرے والدین کے امیر ہونے کی دلیل ہے۔

تمہاری نابینا بہن

دوسرا خط!

پیارے بھائی۔ آج میں جو راز افشا کر رہی ہوں وہ تمہارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا خط پڑھکر پہلے متعجب ہوگے پھر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاؤ گے اور یقین کر لو گے کہ آنکھوں کے ساتھ ہی میری عقل پر بھی پردہ پڑ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ تو سنو وہ راز یہ ہے کہ مجھے ایک عاشق مل گیا ہے۔

پیارے بھائی گو میں نابینا ہوں، لیکن اسکے باوجود بھی ایک آدمی میری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے، وہ میری بہت عزت کرتا ہے اور مجھے حاصل کرنیکی انتہائی کوشش میں مصروف ہے، تم تعجب کیا ہیں خود اس معمہ کو سمجھنے سے قاصر ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ اس فرشتہ خصلت اور نیک سیر انسان کی میرے والدین سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیوں ہمارے گھر آیا کرتا ہے۔ ایک دن جب میں کھانا کھانیکی میز پر جھکی ہوئی کھانے میں مصروف تھی، تو وہ میری داہنی جانب بیٹھا ہوا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، وہ میرے ساتھ محبت اور احترام سے باتیں کر رہا تھا اُس وقت میں نے کہا کہ "میں آپ سے گفتگو کر کے بہت خوش ہوئی۔ آپ ہمارے گھر غالباً آج پہلی مرتبہ ہی تشریف لائے ہیں؟"

"نہیں تمہارے والدین سے تو میرے دیرینہ تعلقات ہیں، لیکن تم سے باتیں آج ہی کی ہیں۔"

"اگر آپ میرے والدین کے قدیمی دوست ہیں تو اس لحاظ سے میرے لئے قابل تعظیم ہیں" میں نے جواب دیا

"میرے یہاں آنیکی اصل وجہ صرف تمہارے والدین کے ساتھ دوستی ہی نہیں ہے، بلکہ ایک اور کشش بھی ہے۔۔۔۔"

"اور وہ کشش کیا ہے؟" میں نے قطع کلام کر کے بے ساختہ دریافت کیا۔

"تم"

"میں! کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" میں نے انتہائی استعجاب سے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں!! تمہارے دام محبت میں دیوانہ وار گرفتار ہوں"

یہ سن کر شرم و حیا سے جو فطرتِ نسوانی کا ایک خاصہ ہے میری گردن جھک گئی، میں نے اپنے کندھے پر پڑی ہوئی چادر سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ نے غالباً اپنے الفاظ پر غور نہیں کیا ہے؟"

"نہیں! نہیں!! میں خوب غور و فکر کے بعد ہی کہہ رہا ہوں کہ میری رگ رگ میں تمہاری محبت کا جذبہ موجزن ہے"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں تو نابینا ہوں"

"تو پھر کیا ہوا مجھے اسکی مطلق پرواہ نہیں، میں بینائی پر محبت کو ترجیح دیتا ہوں ۔ ع دل کے آئینے ڈھنگ نرالے ہیں۔

"افسوس تمہیں معلوم نہیں کہ تم کس قدر خوبصورت ہو، تمہارا جسم ایسے خوشنما سانچے میں ڈھلا ہو کہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہو، حوروں کی طرح چھوٹے چھوٹے پاؤں ہیں۔ تمہارے چلنے کا طریقہ بھی عجیب دلکش ہو، تمہاری لمبی لمبی زلفیں ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار ہیں۔ تمہارے چہرہ کا رنگ تازگی اور خوبصورتی میں تازہ کشمیری سیب کو بھی شرماتا ہو، اور تمہارے ہاتھ گلاب کے پھول سے بھی زیادہ نرم اور نازک ہیں"

اتنا کہہ کر وہ تو خاموش ہو گیا مگر اسکی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اس نے میرے حسن اور میری دلفریبی کی کچھ اس انداز سے تعریف کی تھی کہ بے اختیار رلا ئیں لینے کو جی چاہا۔ ایک نابینا لڑکی کے حسن کی تعریف ایک پرستار محبت ہی کر سکتا ہو لیکن وہ میرے لئے اس سے بھی بڑھکر ہے، وہ ایک آئینہ ہو، اور اسکے الفاظ میری آنکھیں ہیں، جنکے وسیلے سے میں اپنے حسین چہرہ کو دیکھ سکتی اور اسکی قدر کر سکتی ہوں۔

"تو پھر آپکی کیا خواہش ہو؟" میں نے چند ساعت خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔

"میری بس یہی خواہش ہو کہ تم میرے ساتھ رشتۂ الفت میں بندھ جاؤ یعنی شادی کر لو"

لفظ "شادی" سنکر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، تاہم میں نے ضبط سے کام لیکر دریافت کیا۔

"کیا آپ درحقیقت یہی خواہش رکھتے ہیں کہ ایک کور چشم لڑکی کی آنکھوں والے کیساتھ ــــ رات کی دن کے ساتھ ــــ شادی ہو جائے؟ نہیں۔ نہیں! ایسا کبھی نہ ہوگا، میں اپنے قدردان اور پرستار کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتی، میرے والدین بفضل خدا میری پرورش کرنیکے اہل ہیں۔ اسلئے میں تہیہ کر چکی ہوں کہ تاحیات کنواری ہی رہونگی"

میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے ان کلمات کا اس نوجوان پر کیا اثر ہوا لیکن وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چلا گیا، لیکن جاتے وقت مجھ پر یہ ضرور ظاہر کر گیا کہ میں حسن و جمال کی دیوی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے تو سب آدمی مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس نوجوان کو مجھ ایسی اپاہج سے محبت کیوں ہو اور کس طرح ہو گئی۔

تمہاری نابینا بہن

تیسرا خط!

پیارے بھائی۔ اکثر خلاف توقع ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں، جو انسان کے دل و دماغ پر پریشان کن اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہو کہ غیر متعلقہ باتوں سے ہی رازہائے سربستہ کے حل کرنیکی کلید ملجاتی ہو اور بے نقاب ہو کر انسان کی کائنات ہی بدل دیتے ہیں، اسے رنج و الم کے ناپیدا کنار سمندر میں ڈبو کر اسکا صبر و قرار چھین لیتے ہیں، اور اسے بے چین و مضطرب اور حیران و پریشان کر دیتے ہیں بالکل ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہو جس نے مجھے اس منحوس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ جسکے

معلوم کرنیکی میں نے کبھی کوشش نہ کی تھی اور جسکا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا

ان واقعات کے جنکا میں اپنے سابقہ خط میں مفصل ذکر کرچکی ہوں، دو روز بعد میں اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے باغیچہ میں ٹہل رہی تھی کہ ناگہاں کسی نے میری ماں کو آواز دی، اسوقت مجھے خیال ہوا کہ غالباً ملازمہ کسی ضروری کام کے لئے بُلا رہی ہے۔

"اماں کون بلا رہا ہے؟"

غالباً کوئی ملنے آیا ہے، بیٹی ہماری حالت ایسی ہے کہ چارو ناچار آداب مجلس کی پیروی کرنی پڑتی ہے"

"اماں! تم جاؤ میں اسی جگہ انتظار کرتی رہونگی" ماں کے ہونٹ چومتے ہوئے میں نے کہا۔

میری ماں مجھے پیار کرکے اور اپنے سرد لبوں سے میری پیشانی چوم کر چلی گئی، اور میں اسی جگہ بیٹھ گئی، وہاں دور و نزدیک کوئی بھی نہ تھا، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، میں اس وقت ایک محفوظ مقام پر تھی، جیسے چاروں طرف رنگا رنگ کے پھول کھل رہے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں وہاں اپنے تصورات میں مصروف دنیا ومافیہا سے بےخبر بیٹھی ہوئی تھی کہ دفعتاً ایک عجیب آواز سنائی دی معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمی باتیں کررہے ہیں، انہیں غالباً میری اس جگہ کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ پیارے بھائی دیکھنے اور غور کرنیکی بات ہے کہ اگر قدرت کاملہ نے مجھے کو چشم کردیا ہے تو غالباً میری دلجوئی کیلئے میری دیگر قوتوں میں اضافہ کردیا ہے، تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ نابینا لوگوں کی قوت سامعہ نسبتاً زیادہ تیز ہوتی ہے، چنانچہ وہ لوگ بہت دھیمی آواز سے باتیں کررہے تھے، لیکن میں انکی گفتگو بآسانی سن رہی تھی، ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ "غریب لڑکی کی حالت سے متاثر ہوکر رو پڑا ہے"

"افسوس! لڑکی کو معلوم نہیں کہ اسکی بینائی درست کرانے کے لئے اسکے والدین اپنی حیثیت سے زیادہ کوشش کررہے ہیں"

دوسرے نے کہا "تم نے ابھی کہا تھا کہ "اسکے والدین اپنی حیثیت سے زیادہ کوشش کررہے ہیں" تو کیا ان کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہے؟"

"قابل اطمینان" انکی حالت بہت ہی زیادہ خراب ہے، مگر وہ ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ غریب لڑکی انکی تنگدستی اور خستہ حالی سے آگاہ نہ ہونے پائے...... وہ کھانا کھانیکی میز پر بیٹھ کر انواع واقسام کے لذیذ کھانے کھاتی ہے، مگر اسکے والدین سوکھی روٹی کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کررہے ہیں، اور ہر ممکن طریقہ سے یہی کوشش کرتے ہیں کہ انکی بیٹی کی زندگی کو زیادہ تلخ اور رنجیدہ نہونے دیں"

پیارے بھائی۔ یہ خلاف توقع باتیں سن کر جو مجھے جسقدر ذہنی اذیت پہنچی اسکے اظہار کی نہ مجھ میں تاب ہے اور نہ ضرورت۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے ماں باپ میرے آرام کیخاطر کس قدر قربانیاں کررہے ہیں، اور خاص کر اس حالت میں جب کہ وہ میری ضروریات مہیا کرنے سے قطعاً معذور ہیں، اور پھر یہ کہ ہر ممکن کوشش سے مجھے اپنی مفلسی اور تنگدستی سے بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ میری زندگی زیادہ تلخ نہ ہو، یہ اُن کی انتہائی محبت کی ایک ادنیٰ دلیل ہے، آہ کیا میں بھی انکی خدمت کرنیکی اہل ہوسکونگی،

تمہاری نابینا بہن

چوتھا خط

پیارے بھائی، یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے اپنے والدین کی خستہ حالی کا علم کسطرح ہوا لیکن میں نے کسی پر بھی یہ ظاہر

نہ ہونے دیا کہ میں حقیقت حال سے آگاہ ہو چکی ہوں اگر میری ماں کو معلوم ہو جاتا کہ گھر کی حالت چھپانے کی جو کوشش کی گئی تھی وہ کس قدر بے سود ثابت ہوئی تو اُسے یقیناً سخت رنج ہوتا، اسلئے میں نے اپنی حرکات و سکنات سے ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ مجھے اپنے والدین کی خوشحالی اور فارغ البالی کا پورا یقین ہے۔ لیکن میں نے اپنے گھر کی حالت سنوارنے کا عزم مصمم کر لیا ہے۔

آج پھر میرا نوجوان عاشق آیا، خدا مجھے معاف کرے کہ میں نے بالکل ایک ایکٹرس کیطرح اُسکے ساتھ گفتگو کی۔

"کیا مجھ پر ہمیشہ نظرِ عنایت رہیگی؟"

"پیاری تم مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ کاش تم اپنے ملائک فریب حسن اور فسوں ساز اداؤں کی رنگینیوں اور دلفریبیوں سے واقف ہوتیں...... تمہارا حسن سادگی اور پاکیزگی کی زندہ تصویر ہے، تم دیوی ہو۔ فردوس بریں کی حور ہو..."

"اور میرے جسم کی بناوٹ؟"

"انگور کے گچھے کیطرح ملائم، خوبصورت اور سحر آفریں...."

"اور میری پیشانی؟"

"ہاتھی کی پیشانی سے بھی زیادہ کشادہ، اور اسکے رنگ کے مقابلہ میں ہاتھی دانت بھی ہیچ ہے"

یہ سن کر میں بے اختیار ہنسنے لگی۔

"کیوں۔ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟"

"صرف یہی کہ ناگہاں میرے ذہن میں یہ سما گیا ہے کہ آپ میرے لئے ایک آئینہ کا کام دے سکتے ہیں۔ آپ کی باتوں کی مدد سے میں اپنی ذات کو پہچان سکتی ہوں"

"پیاری! تم مجھے ہمیشہ اپنا آئینہ جانتی رہو۔ میں بھی ایک آئینہ کیطرح تمہیں تمہارے حسن ظاہری و باطنی سے آگاہ کر دیا کروں گا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی۔ میں آرام پہنچانے میں ہرگز کوتاہی نہ کرونگا.... کہدو پیاری.........

...ہاں کہدو"

پیشتر اسکے کہ میں کوئی جواب دوں مجھے اپنے ماں باپ کی تنگدستی کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اپنے اس عاشق سے شادی کر لوں تو میرے والدین اپنے ایک اہم ترین فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے، لیکن اس حالت میں بھی میں نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دینا مناسب نہ جانا اس لئے کہا کہ:۔

"ایک مرتبہ پھر غور کر لیجئے کہ اس عجیب رشتہ سے آپکی عزت اور نام پر تو حرف نہ آئیگا۔ اور پھر میں تو آپ کو دیکھ بھی نہ سکونگی"

"تمہیں اسکی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس! میں ایک بات کہنی ہی بھول گیا...."

"تو پھر بتا دیجئے"

"وہ بات بس یہ ہے کہ قدرت کاملہ نے مجھے نہایت بدصورت اور کریہ منظر انسان پیدا کیا ہے۔ نہ تو میرا جسم ہی سڈول ہے اور نہ خوبصورت، اور میری چال ڈھال بھی بھدی ہے، پھر غضب یہ کہ چیچک کے داغوں نے میری صورت ڈراونی بنادی ہے۔ ان حالات تم خود خیال کر سکتی ہو کہ میں تم سے شادی کرنے کی درخواست کر کے تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنی خود غرضی کا

ثبوت دے رہا ہوں۔"

یہ سن کر میں نے بے اختیار اسکی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے اور نہیں معلوم کس پاک جذبہ سے متاثر ہو کر کہا "میں نہیں کہہ سکتی کہ آپ اپنے ساتھ کس قدر بے انصافی اور ظلم کر رہے ہیں۔ خدا کے واسطے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک حق پسند، اور صاف باطن انسان ہیں، قدرت کاملہ نے مجھے کور چشم کر دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اسکا خیال نہ کریں اور مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیں۔ آپکی ان باتوں سے میرے فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے، میری تاریک دنیا میں آپ کی محبت چاند کیطرح روشن ہے۔

پیارے بھائی! میرے اس فیصلہ کی صرف ایک ہی وجہ تھی یعنی اپنے ماں باپ کو ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرنا اور انہیں اطمینان کا سانس لینے دینا۔ اب عالم الغیب ہی خوب جانتا ہے کہ میرے اس فیصلہ کا طرفین کے حق میں کیا انجام ہوگا۔

تمہاری نابینا بہن

پانچواں خط!

پیارے بھائی! تمہارا خط ملا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے جسقدر میری تعریف کی ہے میں اسکی مستحق بھی ہوں۔ تمہاری محبت کی شکر گذار اور قدر شناس ہوں، تمہارے محبت نامہ سے حقیقی محبت اور ہمدردی کے جذبات ٹپکے پڑتے ہیں۔

میری شادی ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے شوہر کو مجھ سے انتہائی محبت ہے، میں اُن کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہوں، میرے ماں باپ بھی میرے ہی ساتھ ہیں، اور میری موجودہ حالت سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس عالم ہیولانی میں کوئی اور عورت مجھ سے زیادہ خوش نصیب نہ ہوگی، مجھے اس پر ناز ہے اور اپنے عاشق شوہر کی پاک اور قابل احترام محبت پر پورا اعتماد ہے، اور اسی وجہ سے کور چشم ہو جانیکی خلش میرے قلب سے ایک بڑی حد تک مٹ چکی ہے۔ میرے پرستار کی نگاہیں میری معاون و مددگار ہیں، وہ میرے لئے ایک آئینہ ہیں، میری آنکھیں ہیں، جب آفتاب عالمتاب دن بھر کی محنت کے بعد اپنے سنہری رتھ میں سوار ہو کر گوشۂ مغرب میں آرام کرنے چلا جاتا ہے، تو ہم دونوں باغیچہ میں ٹہلنے جاتے ہیں۔ پھولوں کے عطر سے بسی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور چڑیوں کی وجد آفریں نغمہ سرائی سے جو دماغ کو فرحت اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے اسکا اظہار الفاظ میں غیر ممکن ہے ہم دونوں کبھی کبھی تھیٹر دیکھنے بھی جاتے ہیں۔ گو میں بینائی سے محروم ہوں لیکن میرا شوہر تماشہ کو اس فصاحت سے بیان کرتا ہے کہ تمام منظر کا عکس میرے ذہن پر جم جاتا ہے، وہ کبھی کبھی دوران گفتگو میں کہا کرتے ہیں کہ وہ نہایت بدصورت ہیں لیکن مجھے اس سے کیا مطلب قدرت کاملہ نے مجھے اسکا اہل ہی نہیں کیا کہ حسن اور بدصورتی میں امتیاز کر سکوں، میں تو محض محبت، ہمدردی اور نیکی کا احساس کر سکتی ہوں اور مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے اس مختصر خط کو پڑھکر میری مسرت اور فرحت سے تم بھی ضرور مسرور ہو گے۔

تمہاری نابینا بہن

چھٹا خط !

پیارے بھائی - قدرت کاملہ نے میری گود بھری ہے۔ میں ایک پھول سے بھی زیادہ نازک بچہ کی ماں بن گئی ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ میرا بچہ اسقدر خوبصورت ہے کہ اُس پر سے نظر ہٹانیکو جی نہیں چاہتا، میرے شوہر کا قول ہے، کہ وہ میرا زندہ عکس ہے لیکن میں اس معاملہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تو دیکھنے سے معذور ہوں -

ماں کی مامتا اور محبت تو ضرب المثل ہے، مگر افسوس! میں کورچشم ہوں، دیکھنے سے معذور، فطرت کے دلفریب مناظر، نیلگوں آسماں پر درخشاں ستاروں کی بساط، پھولوں کی سحر طراز رنگت، دُنیا کی حسین صورتیں، عزیز از جان شوہر اور ماں باپ کی محبت بھری نگاہیں میرے لئے پردہ راز میں پنہاں ہیں۔ پیارے بھائی، میں پندرہ سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اسی حالت میں ہوں، اور اب اس کی عادی ہو چکی ہوں، مجھے اسکا افسوس نہیں، اور اگر ہے تو بہت ہی کم لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ جب میں یہ محسوس کرتی کہ میں اپنے بچے اپنے جگر کے ٹکڑے کو نہیں دیکھ سکتی ہوں تو اُس وقت میرے کلیجہ میں کس قدر چھریاں چلتی ہیں۔ آہ اگر ایک منٹ کیلئے — صرف ایک لحہ کیلئے ہی میری آنکھیں کھل جائیں، اور میں صرف ایک ہی مرتبہ اسکا چہرہ دیکھہ لوں ....“

پیارے بھائی۔ اس اہم ترین معاملہ میں میرا عزیز از جان شوہر بھی میری مدد کرنیسے عاجز ہے۔ وہ یہ ضرور بتاتے ہیں کہ میرے بچہ کے بال گھونگروالے اور ریشم کیطرح ملائم ہیں۔ اسکی آنکھیں آہو تمثال ہیں۔ اسکا رنگ گلاب کے پھول کے رنگ سے بھی زیادہ خوشنما اور دل فریب ہے، اُسکے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں خوبصورت اور نازک ہیں، اور اسکی مسکراہٹ میں ایک خاص قسم کی کشش اور دلفریبی ہے لیکن افسوس! ان باتوں سے میرا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا ہے .... جب میرا پیارا بچہ اپنے نازک اور خوبصورت بازو میری طرف پھیلاتا ہے، تو اُس وقت اس احساس سے کہ میں اُس کے دیکھنے سے معذور ہوں، میرے دل و دماغ کو جو اذیت پہنچتی ہے اُسے الفاظ میں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں -

تمہاری نابینا بہن

ساتواں خط !

پیارے بھائی! تمہارا محبت نامہ ملا تم نے میرے شوہر کے متعلق دریافت کیا ہے، میں حیران ہوں کہ کیا جواب دوں، وہ تو مجسم نیکی اور ہمدردی ہیں، دنیا کو معلوم نہیں کہ اُنہوں نے میری خاطر کتنی بڑی قربانی کی ہے اور معلوم بھی کس طرح ہوتا کہ جب آج سے قبل خود مجھے بھی اس کا علم نہ تہا، وہ میری بینائی درست کرنیکا عزم مصمم کر چکے ہیں۔ اور علاج بھی خود کرینگے اُنہیں جراحی سے نفرت ہے۔ لیکن اُنہوں نے صرف میری آنکھوں کا آپریشن کرنیکی غرض سے اسکام کو خاص توجہ سے سیکھا ہے، اور خوب مہارت حاصل کرلی ہے۔ آج صبح اُنھوں نے دوران گفتگو میں ناگہاں کہا:-

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں دو سال سے کیا کام سیکھ رہا ہوں، اور اب کیا کرنا چاہتا ہوں ؟“

"فرمایئے کیا ارادہ ہے؟"

"تمہاری آنکھوں کا آپریشن ..."

"آپ خود کرینگے؟"

"ہاں میں خود اپنے ہاتھ سے تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرونگا۔ میں نے یہ کام صرف اسی غرض سے خاص توجہ دیکر سیکھا ہے (میرے ہاتھ میں ایک بوتل دیتے ہوئے) تم یہ عرق استعمال کیا کرو اس سے تمہارے جسم کی کھال ملائم ہو جائیگی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں ضرور کامیابی ہوگی"

"تو کیا آپریشن کے بعد میں پھر دیکھنے لگونگی؟"

"ہاں ہاں! مجھے یقین واثق ہے"

"تمہارا ہاتھ تو نہیں کانپے گا؟"

"اگر میرا دل قوی ہے اور ہمیں تمہاری پاک محبت کا جذبہ موجزن ہے تو میرا ہاتھ ہرگز نہیں کانپے گا"

"پیارے" میں نے اُسکے لبوں کو چومتے ہوئے کہا "تم انسان نہیں! ہرگز نہیں!! تم تو مجسم نیکی ہو"

"پیاری! ایک مرتبہ اور میرے ہونٹوں کیساتھ اپنے شیریں لب ملا دو۔ صرف ایک مرتبہ اور پیار کر دو تاکہ میں کچھ عرصہ اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرلوں"

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"بس یہی کہ تم بہت جلد دیکھنے لگوگی اور اس وقت تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ میں کس قدر بدصورت اور بدہیئت انسان ہوں۔ میرا بیڈول جسم ....."

ان الفاظ نے میرے ذہن وقلب پر بس وہی اثر کیا جو تاریکی میں ناگہاں بجلی چمکنے سے ہوتا ہے۔ میں بے اختیار کھڑی ہوگئی اور کہا۔

"پیارے اگر آپ کو میری محبت کی استواری پر اعتماد نہیں ہے اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپکی بدصورتی اور بدہیئتی کو معلوم کرکے آپ سے پھر جاؤنگی تو خدا کیواسطے مجھے اسی تاریکی میں گھرے رہنے دیجئے"

اسکا اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

مذکورہ بالا گفتگو کے چند یوم بعد میری ماں نے مجھے مطلع کیا کہ "کل آپریشن ہوگا" یہ سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے عزیز از جان شوہر کے متعلق جو کچھ سُنا تھا وہ یاد آگیا۔ میری ماں کہا کرتی کہ اسکے چہرہ پر چیچک کے داغ ہیں، باپ نے کہا تھا کہ اسکے بال بہت باریک ہیں، اور خادمہ کا قول تھا کہ وہ بوڑھا ہے چہرہ پر چیچک کے داغ ہونا تو قدرت کاملہ کی مرضی تھی اور بالوں کا باریک ہونا عقلمندی کی نشانی ہے لیکن ان کا بوڑھا ہونا البتہ مجھے بُرا معلوم ہوتا تھا، خدانخواستہ اگر وہ مجھ سے پہلے ...

.... آہ! اس وقت میں گوناگوں مصائب میں گرفتار ہو جاؤنگی ..... بھائی میرے لئے خدا سے دعا کرو۔

(تمہاری نابینا بہن)

آٹھواں خط

پیارے بھائی، میری آنکھوں کا آپریشن ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ میں دو مرتبہ شدت درد سے چیخ اٹھی تھی۔ اسکے بعد میں نے محسوس کیا کہ سب کچھ دیکھنے لگی ہوں لیکن اس وقت میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے ایک دفعہ ظلمات میں دھکیل دیا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وقت تحمل اور مستقل مزاجی کا ہے لیکن بلا ارادہ اس قدر گھبرا گئی کہ برداشت نہ کر سکی۔ ہدایت کر دی گئی کہ آنکھوں پر پٹی باندھے پلنگ پر پڑی رہوں۔ لیکن ایکدن مجھ سے سخت غلطی ہو گئی، میں نے ڈاکٹر کی ہدایت کی خلاف ورزی کی، واقعہ یہ ہے کہ جب خادمہ میرے بچہ کو دودھ پلانے کیلئے میرے پاس لائی تو بچہ نے اپنی توتلی زبان میں کہا — "ماں"...

اس آواز میں نہیں معلوم کیا جادو تھا کہ میں بے اختیار ہو گئی، اور میں نے پٹی کھول کر پھینک دی،

"میرا بچہ...... ہا ہا..... یہ کیسا خوبصورت بچہ ہے..... میں تو اپنے بچہ کو دیکھ رہی ہوں...."

خادمہ نے فوراً میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ لیکن میں اب اس تاریک دُنیا میں تنہا نہ تھی، بلکہ ایک چاند سا مکھڑا میری نظروں میں سما چکا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے بچہ کی صورت یاد آنے لگی، اور میں تصورات کی دُنیا میں کھو گئی۔

اگرچہ میری یہ حرکت قابل گرفت تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سے کسیطرح کا نقصان نہیں پہنچا، اسکے دوسرے دن میری ماں مجھے کپڑے پہنانے آئی، وہ بہت دیر تک میرا بناؤ سنگار کرتی رہی۔ میں نے ریشمین کوٹ اور چکن کا کرتہ پہنا، بال بالکل نئے طرز سے باندھے، جب سنگار ختم ہو گیا تو میری ماں نے خود ہی پٹی کھول کر پھینک دی اس وقت کمرہ میں شام کی دُھندلی سی روشنی تھی، میں اپنے ماں باپ اور بچہ کو بآسانی دیکھ رہی تھی، میں نے انتہائی مسرت سے کہا:۔

"وہ کیوں چھُپے بیٹھے ہیں؟"

یہ کہتے ہی اُن کی بدوضع صورت۔ اور چیچک کے داغوں سے خراب شدہ چہرہ کا عکس ذہن پر طاری ہو گیا لیکن میں نے اُنکی محبت میں بیقرار ہو کر کہا:۔

"وہ میرے سامنے آنے سے کیوں شرماتے ہیں؟ وہ تو میری نگاہوں میں حضرت یوسف سے بھی زیادہ حسین ہیں"

"وہ ابھی آتے ہیں۔ پہلے تم اپنی صورت آئینہ میں دیکھ لو۔ تم اس قدر حسین ہو کہ اپنی صورت پر آپ ہی فریفتہ ہو جاؤ گی" میری ماں نے کہا۔

یہ سُن کر میں آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، مجھے اپنی صورت پر ایک طرح کا ناز تھا اور ساتھ ہی یہ ڈر بھی کہ کہیں میں خوبصورت ہونے کی بجائے بدصورت ثابت ہوؤں، اور کہیں عزیزوں نے مصلحتاً مجھے مغالطہ میں رکھا ہو، لیکن جب میں نے آئینہ دیکھا تو لاانتہائی مسرت سے میرے منہ سے چیخ نکل گئی، میں درحقیقت خوبصورت تھی، میرا چہرہ بیحد خوبصورت جسم سڈول ہاتھ پاؤں نازک، رنگ خوشنما۔ آنکھیں سرمہ آلودہ اور موٹی موٹی، اور گردن صراحی دار، میں بڑے آرام سے کھڑی آئینہ دیکھ رہی تھی آئینہ بھی آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا، گویا اس میں میرا عکس جوش مسرت سے رقصاں تہا۔ ناگہاں میں نے دیکھا

ایک نوجوان دبے پاؤں آکر میرے پیچھے کھڑا ہوگیا، اسکا جسم بہت ہی نازک اور خوبصورت تھا، اسکی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہی مائل تھیں، اسکے سینہ پر گلاب کا مصنوعی پھول تھا، میں ایک اجنبی کو اپنے اسقدر قریب دیکھ کر شرما گئی، اتنے میں میری ماں نے نووارد کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا۔

"تمہارا چہرہ اس قدر خوبصورت ہے، جیسے گلاب کا پھول" اور تمہارے ہاتھ کس قدر نازک ہیں" یہ کہتے کہتے اُس نے میری آستین الٹ دی

"اماں ایک اجنبی کے سامنے ......"

"اجنبی؟"

"ادہر دیکھو وہ نوجوان کھڑا ہے ......"

"بیوقوف اس سے شرماتی کیوں ہو تو تیرا شوہر ہے" میرے باپ نے کہا،

"پیارے" میں ان کی طرف کو مڑی، اُنہیں دیکھتے ہی میری طبیعت باغ باغ ہوگئی آہ! کیس قدر حسین ہیں، میں اُنہیں پاکر کسقدر خوش ہوئی ہوں، جب میں نابینا تھی تو اُنکی نیک سیرتی اور ہمدردی سے متاثر ہوکر ان سے محبت کرتی تھی، میں ان کی فرشتہ خصلت پر سو جان سے قربان تھی، اُنہوں نے محض میری دلجوئی کیلئے ہر ایک سے تاکید کردی تھی کہ ان کا ذکر میری موجودگی میں بطور ایک بدصورت انسان کے کیا جائے ......

(ترجمہ بہ تصرف) تمہاری بہن

سوز و ساز

یوں درِ میخانہ منظر، باز ہونا چاہیئے
چاند کو جامِ مے شیراز ہونا چاہیئے

ہر بلند و پست سے ممتاز ہونا چاہیئے
آدمی کو آدمیت ساز ہونا چاہیئے

سجدہ کیسا، سر کو پا انداز ہونا چاہیئے
احترامِ جلوہ گاہ ناز ہونا چاہیئے

مقصدِ تخلیق ہی یہ ہے کہ جلکر جان دے
فطرتاً پروانے کو جانباز ہونا چاہیئے

جستجو کا ہے یہی حاصل تمہیں ڈھونڈا کروں
دور تر مجھ سے حریم ناز ہونا چاہیئے

اے مغنی چھیڑ بھی دے نغمہ ہائے آتشیں
آج تو پایانِ سوز و ساز ہونا چاہیئے

ختم کردے موت یہ آہ و فغاں کی داستاں
سازِ دل کو سازِ بے آواز ہونا چاہیئے

ہو نیازِ عشق بھی مشکل کہ پہلے آنکھ کو
محرمِ پردہ سرائے ناز ہونا چاہیئے

منظر آزردہ سے یہ بے نیازی تابکے
اب کرم بھی اے نگاہِ ناز ہونا چاہیئے

منظر صدیقی

سالنامۂ ساقی سنہ ۳۵ء کی ایک جھلک

علمی مضامین

تاریخی مضامین

معاشرتی مضامین

ادبی مضامین

افسانے

(۳) آخری ...

ازجناب دیوانہ بریلوی

(۴) آج میرا بھولنے والا مجھے یاد آگیا۔

ازجناب سید وزیر حسن دہلوی۔

(۵) وعدہ شکن (جاپانی افسانہ)

ازجناب ظفر قریشی۔ بی۔ اے۔ دہلوی

(۶) منزلِ ناتمام۔

ازجناب اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے

(۷) ٹکڑے ہارا۔ ازحضرت۔ ایم۔ اسلم۔

(۸) تبرک۔ ازجناب طاہر قریشی

مزاحیہ

(۱) افسانہ نگاری۔

ازجناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی۔

(۲) آخری فتح۔

ازجناب قیسی رامپوری

(۳) پان کا رد۔

ازجناب ابو طاہر داؤد۔ بی۔ ایس سی۔ (ملک)

(۴) جھوٹ

ازمحترمہ طاہرہ دیوی شیرازی

(۵) افسانۂ عنوان طلب۔

ازجناب ناکارہ حیدرآبادی

ڈرامے

(۱) قدیم ہندی اسٹیج۔

ازجناب النعمان نصری۔ بی۔ اے۔ دہلوی

(۲) قدیم اردو ڈراموں کی چند خصوصیتیں۔

ازجناب سید بادشاہ حسن۔ بی۔ اے۔

(۳) بے بصر از موریس سٹرنک۔

مترجمہ شاہد احمد۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی

منظومات

بیخود دہلوی۔ سائل دہلوی۔ جوش ملیح آبادی۔ علی اختر عدم۔ کوکب شاہجہانپوری۔ روش صدیقی۔ تپش ثاقب کانپوری۔ منظر صدیقی۔ صادق ضیا۔ بشیر نیازی شرقی نگینوی۔ نہال سیوہاروی وغیرہ۔

سہ رنگی تصاویر

(۱) ساقی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانی آرٹ

(۲) ملکۂ شب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انگریزی آرٹ

(۳) میرے خوابوں کا مندر۔ ۔ ۔ انگریزی آرٹ

(۴) جاپانی رقاصہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاپانی آرٹ

انکے علاوہ متعدد سادہ تصاویر بھی شائع ہونگی

مستقل خریداروں سے سالنامہ کی کوئی قیمت نہیں لی جائیگی

نوٹ:۔ مستقل خریدار اگر ۳ر رجسٹری کے لئے بھیجدیں تو انہیں سالنامہ یقین کے ساتھ پہونچ جائے گا ورنہ ڈاک میں ضائع ہونیکا اندیشہ ہے

ہمایوں کا مقبرہ

دلِ یادِ رفتگاں میں تھا بیقرار و مضطر
لیلائے شب نے اپنا دامن بچھا لیا تھا
بارش سی ہو رہی تھی دیوار و در سے غم کی
سنسار سو رہا تھا، سنسان بستیاں تھیں
آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں
جاہ و حشم کی دنیا نظروں میں پھر رہی تھی

وحشت سی ہو رہی تھی اور کاٹتا تھا بستر
آنکھوں کے سامنے تھا ماضی کا اک سمندر
رنج و محن کی بدلی چھائی ہوئی تھی دل پر
مہتاب ہنس رہا تھا دنیا کی بے خودی پر
ڈوبا ہوا تھا بحرِ ماضی میں دل سراسر
ہر یاد چبھ رہی تھی بن بن کے دل میں نشتر

اے سرزمینِ دہلی پہلو میں تیرے کتنے
ذروں میں تیرے کتنے سورج ملے ہوئے ہیں
گرگانی و مغل کی آئینہ دارِ ثروت!
سویا نہیں ہے اب تک آغوش میں فنا کی

تیمور سو رہے ہیں، سوتے ہوئے ہیں اکبر
کتنے چھپے پڑے ہیں فرخ سیر سکندر
ہے مرقدِ ہمایوں تیری جبیں کا جھومر
قصرِ جناں کا ثانی وہ صحن سنگِ احمر

روکی بہت طبیعت دل کو بہت دبایا
لیکن کسی طرح سے دل کو نہ چین آیا
اُس مقبرے پہ پہونچا آخر کشاں کشاں میں
سرگشتۂ خیالِ اقبال و اقتدارے
اوکشتۂ شرارے کز نالہ اش بغیتد
نگریستن تواند در خار جلوۂ گل
در سنگہائے مرقد نگریست یک جہانے
چادر پڑی ہوئی تھی دنیا پہ چاندنی کی
ذرے بنے ہوئے تھے تمثالِ مہرِ رخشاں
پھولوں کی ڈالیوں میں جھولے پڑے ہوئے تھے
نہلا رہی تھی شبنم نازک بدن گلوں کو
پُر نور تھی فضا سب کلیاں چٹک رہی تھیں

چاہا بہت کہ سب کچھ میں بھول جاؤں یکسر
جنگل کو چل دیا میں بستر سے اپنے اٹھ کر
شاہنشہِ ہمایوں سوتا ہے جس کے اندر
محوِ تلاشِ بزم و ساقی و چنگ و ساغر
یک شورِ رستخیز و صد غوغہائے محشر
در قطرہ بہ بیند پنہائے بحرِ احمر
در جلوہ ہا پریشاں یک لالہ کار دفتر
تھا رات کا سہانا کیف آفریں وہ منظر
بکھرے ہوئے تھے موتی سبزے کی آستیں پر
گلہائے نوشگفتہ ہنستے تھے کھل کھلا کر
مہکا رہے تھا جس کی سارا چمن معطر
چاندی برس رہی تھی دنیا کی سرزمیں پر

تھا سامنے نظر کے اک قصرِ سر کشیدہ
عرشِ زمینِ دہلی، وہ مرقدِ منوّر

ظاہر میں جس کا جلوہ خالی ہے دلکشی سے
اوپر تلے پڑے ہیں ٹوٹے ہوئے سے پتھر

سُرخ و سپید سا ایک گنبد کھڑا ہوا ہے
تعمیر تھی پرانی۔ تصویر بھی مُکدّر

گنبد کے زیرِ سایہ کچھ آشیاں بنے ہیں
رہتے ہیں جن میں وحشی اور جنگلی کبوتر

مرقد کے پہلوؤں میں حجرے بنے ہوئے ہیں
انبار لگ رہے ہیں میلے کے جن میں اکثر

جالے تنے ہوتے ہیں ہر سمت مکڑیوں کے
محراب میں جو آئے رہ جائے ان میں پھنس کر

سنسان سی عمارت کہنہ سا ایک گنبد
تکلیف وہ نظارہ، عبرت فروز منظر

وحشی کبوتروں کے ہر سمت آشیانے
اُجڑا ہوا یہ گلشن، برباد ہے سراسر

لیکن میری نظر میں ہے اس کا دورِ ماضی
پتھر میں دیکھتا ہوں صد جلوہ ہائے گوہر

چوما نظر نے دیکھا جب آستانِ شہ کو
فرطِ ادب سے خود ہی سر جھک گیا زمیں پر

آگے بڑھا تو پایا کچھ اور ہی نظارہ
چشمِ الم نے دیکھا اک ہولناک منظر

ظلمت کی حکمرانی تربت کے چار سو تھی
روتی تھی بیکسی بھی میّت کی بیکسی پر

حسرت کھڑی ہوئی تھی وحشت برس رہی تھی
حرماں کا دیوتا بھی آیا تھا سر جھکا کر

مانندِ ابرِ بہمن دیوار و در تھے گریاں
خود غم بھی رو رہا تھا سر آستیں میں دے کر

جس شاہ کی قبا کو ذرّے نہ چوم سکتے
آلودہ خاک میں تھا اُس کا بدن سراسر

باغِ جناں نہ جس کی نظروں میں کچھ سماتا
آغوش میں لئے تھا اُس کو لحد کا پتھر

دیبا کے بستروں پر جس کو نہ چین آتا
خاکِ لحد پہ اُس کا اب بچھ رہا تھا بستر

تاجِ شہی ہمیشہ جس سر کو چومتا تھا
رکھا ہوا تھا وہ سر اب بالشِ زمیں پر

اُن کا کلوں میں مٹی بے طور بھر گئی تھی
عطرِ گلاب سے جو رہتے سدا معطّر

وابستہ جن لبوں سے عالم کے فیصلے تھے
مہرِ سکوت یکسر اب لگ چکی تھی اُن پر

سُرخ و سپید عارض و رجلوہ غیرتِ گُل
زانہا قضا رہو وہ آں رنگہا سراسر

یا چومتے تھے انجم آ آ کے آستاں کو
کُنجِ لحد میں یا اب ذرّے بنے وہ اختر

وہ آنکھ جس نے دیکھے جنت کے نقش گھر میں
نظارۂ چمن بھی بارِ گراں تھا جس پر

تاریک کوٹھڑی میں ظلمت کی آشنا تھی
ناواقفِ نظارہ نا آشنائے منظر

بُلبل کے چہچہوں سے جو کان آشنا تھے
ہیں زاغ و بُوم اُن کے مرقد پہ جلوہ گستر

چشمِ دروں نے مجھکو جلوے عجب دکھائے　　بھولا نہیں ہوں اب تک اندوہگیں وہ منظر

دُنیا کی انجمن ہے ایک پیکرِ تغیّر　　یکساں کسی کی حالت رہتی نہیں گھڑی بھر
جو حکمراں تھے کل تک محرومِ فاتحہ ہیں　　فرمانروا ہیں اب وہ کل تک جو تھے گداگر
اِس انجمن کا نقشہ ہر لمحہ مختلف ہے　　مسرور و شاد کوئی رہتا نہیں برابر
بھولے نہیں ہیں اب تک ہیں یاد وہ فسانے　　مغلوں نے سلطنت میں جو کچھ دکھائے جوہر
لوحِ زمیں ابھی تک رنگیں ہے داستاں سے　　سقفِ فلک ابھی تک بھولی نہیں وہ منظر
وہ جاہِ خسروانہ وہ سطوت و تجمّل　　اندازِ حکمرانی آئینِ فوج و لشکر
بانگِ دہل ابھی تک صحرا میں گونجتی ہے　　جس کا اثر ہے باقی دلّی کی سرزمین پر
محفوظ ہیں فضا میں ترکوں کے کارنامے　　تاریخِ رفتگاں کو دیکھے کوئی سُنے گر
اِس مملکت کے والی کیا کر گئے ہیں اس میں　　خاموش وادیوں سے پوچھے تو کوئی جا کر

دربار ہے یہ مرقدِ شاہنشہِ زمن کا
یا ایک باغ پائیں اُجڑے ہوئے چمن کا

—— مودود احمد صابری [illegible]

خمستان

...... سے

کبھی کبھی یوں سوچنے لگتا ہوں۔
کیا تم مجھے یاد کرتی ہوگی؟
کیا میری طرح۔ تمہیں خیال ہوگا۔؟—
— ہماری پہلی ملاقات کے وہ زریں لمحات!
— ہماری محبت کا وہ عجیب و غریب زمانہ!
— ہمارے جھگڑے!
— پھر ہمارا ملاپ!
— اور آخری ملاقات!...
کیا تم بھول نہ گئی ہوگی؟
اور اگر یاد کرتی ہوگی تو اسی طرح،
جیسے میں؟.....
کیا ماضی کی یاد تمہارے دل کی دھڑکن بھی تیز کر دیتی ہے؟
تمہاری نیند آنکھوں سے اڑ جاتی ہے؟
اور بے اختیارانہ پھر ملنے کی تمنا کرنے لگتی ہو،
مجھ سے؟—
آہ! کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں آتے ہیں!....
کیا تم اب بھی ویسی ہی ہو؟
جیسی ایک سال قبل؟...
— ایک سال! آہ! کتنا طویل زمانہ،
محبت کی زندگی میں!—
ویسی ہی پیاری! — بھولی بھالی! — معصوم!
محبت کرنے والی!....

کیا میرا خیال تمہیں آتا ہے؟ .....
آہ کتنا جی چاہتا ہے۔
تم سے ملنے کو! تمہیں دیکھنے کو!......

— تمنائی

کہاں گئے؟

وہ سویرے چلی گئی— اُس کی گود میں ایک بچہ تھا۔

جن راستوں سے وہ گذری تھی میں نے دریافت کیا— تمام دن تلاش کرتا پھرا— لیکن آہ! وہ نہ آئی۔

"کیا تم نے ایک حسینہ کو ایک بچہ کے ساتھ دیکھا ہے؟" میں نے مسافروں سے دریافت کیا۔

— لیکن کسی نے میری بات کی طرف دھیان نہ دیا— وہ بہت زیادہ مصروف تھے— اپنی راہ چلے گئے۔

سُست اور افسردہ میں دریا کے کنارے گیا— سمندر کی طرف جانیوالی موجوں کو دیکھتا رہا— "تم میں کون نغمہ زن ہے؟" میں نے دریا سے پوچھا۔

اُس نے کہا— "صرف ایک بچہ کی روح"

میں جنگل کو دوڑا— کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا— صنوبر کے درخت دیو کی طرح کھڑے تھے— اُنکے لاتعداد پتوں میں حرکت تھی۔ وہ غمگین تھے— حرکت بھی غمگین— اُنکا ہر پتہ صدائے درد تھا— اور ہر آواز ایک آہ— "درختو! قبل اسکے کہ میں تم سے جدا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم نے میری چیز لی ہے؟" "نہیں تمہاری کوئی چیز نہیں— صرف ایک عورت کا دل"

دونوں صبح کو رخصت ہو گئے— وہ بر و بحر میں نہیں ہیں۔ آہ! وہ بہت دور چلے گئے— جہاں فرشتے رہتے ہیں— اور— اور دونوں مجھے بھول گئے!۔ (اسٹوڈاڈ)

انعام الحق شیدائی

غریب کی آہ

شہر کے رئیس اعظم کا محل زیرِ تعمیر ہے۔ ہر شام تھیلیوں کے منہ کھول دیے جاتے ہیں۔ معمار اور مزدور سینکڑوں روپیہ روزانہ مزدوری پاتے۔ رئیس سمجھ رہے تھے بڑا کام کر رہا ہوں، سینکڑوں لوگ میرے سہارے پل رہے ہیں۔ بال بچوں کو پال رہے ہیں۔ ہر شام صحن میں تخت بچھوا آلتی پالتی مار بڑے غرور و رعونت سے مزدوری بانٹنے بیٹھ جاتے ایک ایک کا نام لیتے اور چاندی کے سکے یا نوٹ کے چند ٹکڑے اس کی طرف پھینک دیتے بالکل اسی طرح جیسے کسی اچھوت کو خیرات دے رہے ہوں۔۔۔۔

آہ ـــــ مزدور۔۔۔۔ امیر کا ملجا و ماوا ـــــ امیر کا ملجا و ماوا۔۔۔۔ امیر کی امارت کا وہ زبردست ستون جس پر اس کا قصر امارت ایستادہ ہے۔ مزدور وہ پارس جس کے چھونے سے لوہا سونا ہو جاتا ہے۔۔۔۔ مگر وہ خود وہی پتھر ہے اور کسی دوسرے رنگ کو نہ اختیار کرنے کے لئے مجبور۔۔۔۔ جس کے پسینے کا ہر قطرہ دُرِ شہوار پیدا کرتا ہے۔ مگر اسے غیر حاصل کرتے ہیں اور یہ بدبخت اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔۔۔۔ وہ کیمیاگر جو لاکھوں بیوقوفوں کی بوالہوسیوں کو حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ کس قدر بے حس ہے دن بھر خون پسینہ ایک کرنے کے بعد ان پیسوں کو جو اس کا جائز حق ہے۔۔۔۔ خیرات سے بھی گرے ہوئے انداز میں اٹھاتا اور امیر اس امیر کو جس کا رواں رواں اس مزدور کا احسانمند ہے۔ جس کے گھر کی دیواریں اسکے خون میں لتھڑی ہوئی مٹی لگا کر بنائی گئی ہیں۔۔۔ ۔۔۔ دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

ان مزدوروں میں ایک اٹھارہ سالہ جوان مزدور بھی تھا۔ رکھ رکھاؤ ہر چیز میں ایک شان امارت پائی جاتی تھی ـــــ دراصل وہ ایک لدار شخص کا لڑکا تھا سوتیلی ماں کے طعنوں سے "کہ جوان ہونے کو آیا کام کا نہ کاج کا ڈھائی سیر اناج کا" گھبرا کر دوسرے شہر میں بھاگ آیا تھا۔ لاکھ ملازمت تلاش کی، نہ ملی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی عادت نہ تھی مزدوری کو گذر اوقات کا ذریعہ بنا لیا ـــــ رئیس کے اس برتاؤ سے بہت کبیدہ خاطر ہوا تھا ـــــ پہلے دو تین دن تو اس نے اس توہین کو خاموشی سے برداشت کیا ـــــ مگر ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ جب رئیس نے مزدوری کے پیسے اس کی طرف پھینکے، بالکل اسی طرح جیسے کسی کتے کے سامنے چھوڑی ہوئی ہڈی ـــــ تو اس نے وہی پیسے اٹھا کر اس رئیس کے منہ پر دے مارے اور بولا "مزدوری چاہتا ہوں خیرات نہیں" رئیس جو صرف خوشامد اور دعاؤں کا عادی تھا، بہت برافروختہ ہوا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے مار مار کر اسکے احاطے سے نکالدیں۔ حکم کی دیر تھی خوشامدیوں کا ایک گروہ پل پڑا۔ اور یہاں تک مارا کہ وہ غریب جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ مرنے سے چند منٹ پہلے اُسکے منہ پر یہ لفظ تھے "خدا تجھے بھی نصیب نہ کرے" ـــــ اسی رات شہر میں خوفناک زلزلہ آیا۔ مگر شہر بھر میں صرف اس رئیس کا مکان اس قہر خداوندی کی نظر ہوا اور دوسرے صبح اس خاندان کا ایک فرد بھی اس دنیا پر باقی نہ تھا۔

سروپ رانی نگار

نقد و تبصرہ

(۱) میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان (۲) لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے

مصنفہ حجاب امتیاز علی

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ محترمہ موصوفہ صحافتی دنیا میں اپنے مخصوص طرز نگارش کے باعث عرصہ سے قبولیت خاص حاصل کر چکی ہیں اور مزید روشناسی کی محتاج نہیں۔ یہ دونوں کتابیں ان کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہیں۔ پہلی کتاب میں "میری ناتمام محبت" کے علاوہ "ماہرین فن"۔ "نادیدہ عاشق" اور "نارنگی کی کلیاں" افسانے شامل ہیں۔ یہ چاروں افسانے حسن و عشق، رومان و اسرار کی دلنواز آمیزش سے مالا مال ہیں۔ کردارنگاری جذبات کی ترجمانی اور فطرت و ماحول کی عکاسی میں لائق مصنفہ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ پلاٹ کی کشش کے ساتھ محاکات کی رنگین تصویریں پڑھنے والے کی دلچسپی کو دوچند کر دیتی ہیں۔ اس پر لائق مصنفہ کا لطیف پیرایۂ بیان، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں۔ چاروں قصے دلچسپ و رنگین ہیں۔ حسن و عشق کے پُرکیف تصادم نے ان کہانیوں کو از حد دلاویز بنا دیا ہے۔

دوسری کتاب میں "لاش" کے علاوہ "شیطان"۔ "مرنے کی چیخ"۔ "مُردے نے کیا کہا؟"۔ "شامت اعمال" اور "جشن"۔ پانچ افسانے شامل ہیں۔ یہ سارے قصے ہیبت و اسرار کے حامل ہیں۔ بعض حصص اس قدر خوفناک اور ہیبت آفریں ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باوجود اس کے تمام قصے اس درجہ دلچسپ ہیں کہ کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ مصنفہ کے مخصوص اندازِ تحریر کی تمام و کمال خوبیاں ان دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ بعض غیر مانوس و منافر الفاظ آ گئے ہیں مگر رکاکت پیدا نہیں ہوتی۔ بحیثیت ایک افسانہ نگار کے مصنفہ میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک داستان گو میں ہونی چاہئیں۔ ظاہری اعتبار سے بھی یہ دونوں کتابیں خوشنما ہیں۔ رنگین و مضبوط جلد اس پر عمدہ کاغذ چڑھا ہوا۔ ضخامت صفحات ۲۷۱ اور صفحات ۲۱۱۔ طباعت نہایت نفیس۔ یہ کتابیں ہر لحاظ سے عمدہ ہیں اور ہر صاحبِ ذوق کے پاس ان کا ہونا ضروری ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور (ا۔ ن)

بچوں کا تحفہ:۔ جناب شفیع الدین نیّر نے بچوں کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انگریزی میں اس قسم کی کتابوں کی کمی نہیں لیکن اردو میں یہ کتاب اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے جو علیحدہ علیحدہ شائع کئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ سات آٹھ برس کے بچوں کے لئے ہے۔ اور اس میں ان چیزوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں جو اس عمر کے بچوں کے لئے مناسب و موزوں ہیں۔ دوسرا حصہ آٹھ سے بارہ برس کے بچوں کے لئے ہے۔ اور اس میں ایسے عنوانات پر نظمیں لکھی گئی ہیں جن کا علم اس عمر کے بچوں کے لئے ضروری ہے۔ پہلے حصے کی زبان بہت آسان اور خیالات نہایت سادہ ہیں۔ دوسرے حصے کا معیار بلحاظ زبان و باعتبارِ خیال پہلے حصے سے بلند ہے۔ نظموں کی روانی دلکش اور ترنم دلنشیں ہے۔ یہ دونوں حصے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہوں گے۔ ان نظموں کے

مطالعہ سے بچے صحیح زبان سیکھ سکتے ہیں اور ان کی قوتِ مشاہدہ میں معتد بہ اضافہ ہوگا۔ مصنف ایک تجربہ کار شخص ہیں اور آپ نے کئی سال کے مسلسل غور و فکر کے بعد بچوں کے لئے یہ چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کی ہیں جن کو ایک اختصاصی کی بہترین دماغی کاوش کا نتیجہ کہنا چاہیئے۔ بچوں کے لئے اس سے بہتر نظموں کا مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ "بچوں کا تحفہ" اس لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے کہ اس کی نظموں میں کسی مذہب و ملت کی کوئی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ اسکولوں میں اگر یہ کتابیں نصاب میں داخل ہو جائیں تو بچے کم محنت اور کم وقت میں زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اگر نیر صاحب نے اس سلسلہ کی اور کتابیں بڑے بچوں کے لئے بھی لکھیں تو ان کے ہاتھوں تعلیم کی ایک ایسی خدمت انجام پائے گی جس کے لئے وہ عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں گے۔ ہر حصے کی ضخامت ۸۰ صفحے ہے۔ حصہ اول میں ۶ تصویریں اور حصہ دوم میں ۹ تصویریں بھی شامل ہیں۔ سرورق رنگین و خوشنما۔ قیمت فی حصہ ۸ ؍

ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔ یا ساقی بک ڈپو۔ دہلی

"ش"

جوہرِ نسواں کچھ اوپر ربع صدی سے دہلی کا مشہور زنانہ رسالہ "عصمت" بہت عمدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا اجرا اور نشو و نما علامہ راشد الخیری کے بابرکت ہاتھوں ہوا اور اب تقریباً دس سال سے ان کے لائق صاحبزادے جناب رازق الخیری کی ادارت میں یہ پرچہ شائع ہو رہا ہے۔ علامہ موصوف کے ادب پرور قلم کے سایہ میں یہ لائق قدر پرچہ پروان چڑھا اور جناب رازق الخیری نے اپنے مخالفین سے بھی عصمت کو اردو کا بہترین زنانہ رسالہ تسلیم کرا لیا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اسی ادارے سے بچیوں کے لئے "بنات" جاری ہوا تھا اور آج وہ بھی لڑکیوں اور بچیوں کے لئے بہت مفید رسالہ سمجھا جاتا ہے۔ علامہ محترم کو صحافتِ اردو کا کم و بیش پچاس سالہ تجربہ ہے اور موصوف کے صاحبزادے بھی دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ نسوانی فلاح و بہبودی کی نت نئی راہیں نکالیں۔ اس کے ثبوت میں عصمت و بنات کے گذشتہ پرچے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ اسی دارالاشاعت سے "جوہرِ نسواں" بھی جاری ہوا ہے جو اپنی طرز کا صحافتِ اردو میں پہلا زنانہ رسالہ ہے۔ عورتوں، لڑکیوں اور بچیوں کے لئے خالص زنانہ دستکاری کا کوئی ماہوار رسالہ اردو میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ جناب رازق کی مساعی سے یہ کمی پوری ہو گئی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے مسلسل مطالعہ سے لڑکیاں سگھڑ، سلیقہ شعار اور ہنرمند بن سکتی ہیں۔ اس پرچے کا مطالعہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ اس سے وہ مشرقی روایات زندہ ہو سکتی ہیں جو خواتینِ ہند کے لئے مایۂ ناز و افتخار سمجھی جاتی تھیں۔ تین لائق خواتین کی ادارت اور جناب رازق کی نگرانی میں "جوہرِ نسواں" کے اب تک تین پرچے شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ان اشاعتوں کے مستقل عنوانات درج کئے جاتے ہیں جن سے اس پرچے کی نوعیت کسی حد تک واضح ہو سکے گی۔

(۱) خیاطی (۲) کروشیا کا کام (۳) سلمہ ستارے کا کام (۴) کٹاؤ کا کام (۵) تارکشی (۶) کشیدہ کاری (۷) موتیوں کا کام (۸) سلائیوں کا کام (۹) ربن کا کام (۱۰) کراس اسٹیچ ورک (۱۱) کترنوں کا کام (۱۲) جالی کا کام۔ ان کے علاوہ چند اصلاحی افسانے اور نظمیں بھی ہر اشاعت میں شریک ہوتی ہیں۔ تصاویر اور بلاک کے متعدد نقشے اور تصاویر ہر پرچے میں شامل ہوتی ہیں۔ سرورق بیحد جاذبِ توجہ اور رنگین ہے۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ، کاغذ سفید اور چکنا۔ ضخامت ۴۸ صفحے۔ چندہ سالانہ

مدت کے موجودہ رسالہ کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کم ہے۔ دفتر "جوہر نسواں" دہلی سے طلب کیجئے۔ "ش"

پھول (جوبلی نمبر) بچوں کے مشہور ہفتہ وار اخبار پھول کی پچیسویں سالگرہ پر اس کا جوبلی نمبر شائع ہوا ہے۔ بچوں کے لئے سب سے پہلے جو اخبار شائع ہونا شروع ہوا وہ پھول ہی تھا۔ اس قسم کے رسائل و اخبار کو بہت کم پروان چڑھتے دیکھا۔ صرف پھول ہی ایک ایسا اخبار ہے جو گذشتہ چوتھائی صدی میں نہایت پابندیٔ اوقات سے شائع ہوتا رہا۔ پھول کی عنانِ ادارت چند ایسے ذی فہم حضرات کے ہاتھوں میں ہے جنہیں بچوں کے رجحات و قوائے عقلی کا ماہر کہنا چاہئے۔ اس لئے اس میں صرف اس نوع کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کا مطالعہ بچے شوق سے کرتے ہیں اور غیر محسوس طور پر بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس اخبار میں درستیٔ اخلاق کا مقصد بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ آٹھ برس کے بچوں سے لیکر سولہ برس کے لڑکوں تک کے لئے ہر پرچے میں مفید مطلب مضامین شائع ہوتے ہیں۔ زبان میں سلاست و صحت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ "پھول" کسی خاص فرقہ یا مذہب و ملت کا اخبار نہیں ہے بلکہ ہر اردو پڑھنے والے کا اخبار ہے۔ مذہبی مناقشوں سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ "جوبلی نمبر" بڑے آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ ٹائٹل تین رنگ کا ہے اور بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اخبار بچوں کا ہے۔ "جوبلی نمبر" بچوں کے لٹریچر کے ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ماں اور بچہ کی ایک سہ رنگی تصویر کے علاوہ اس میں بلاک کی کئی تصویریں اور متعدد نقشے بھی ہیں جن میں ہمیں یقین ہے کہ بچے بہت دلچسپی لیں گے۔ پھول کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے اور "جوبلی نمبر" کی علیحدہ قیمت ۸ ہے۔ مستقل خریداروں کو غالباً مفت دیا گیا ہے۔ دفتر اخبار پھول ریلوے روڈ لاہور سے طلب کیجئے۔ "ش"

ہندوکلی (دہلی) "الہلال" کے بعد "ہندوکلی" سے بہتر اخبار صحافتِ اردو میں جاری نہیں ہوا ——— اس میں سیاسیات کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ جناب عبدالرزاق ملیح آبادی ایک کہنہ مشق جرنلسٹ ہیں اور آپ کی ادارت میں جو چیز شائع ہوتی ہے وہ دوم درجہ کی نہیں ہوتی۔ "ہندوکلی" صحافتِ اردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اس میں تاریخی، تفریحی اور پُر از معلومات مضامین کے علاوہ مختلف زبانوں کے بہترین تراجم بھی شائع ہوتے ہیں۔ "ہندوکلی" کے اس شاندار اجرا پر ہم عبدالرزاق صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور متوقع ہیں کہ اردو ادب کے شائقین ہفتہ وار ہند کو اپنے مطالعہ میں شریک کر کے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیں گے۔ بلاک کی متعدد تصاویر بھی ہر اشاعت میں شامل ہوتی ہے۔ قیمت فی پرچہ ۲ر چندہ سالانہ ۵ر "ش"

جہانگیر (عثمان نمبر) رسالہ جہانگیر لاہور ہر سال اپنا "عثمان نمبر" شائع کرتا ہے۔ اس خاص نمبر میں حیدرآباد دکن اور خسرو دکن کے متعلق مضامین کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سال "عثمان نمبر" چھوٹے سائز ۱۷x۲۲ کے تقریباً ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ ہر قسم کے عمدہ مضامین اس نمبر کی زینت ہیں۔ حصۂ نظم بھی پاکیزہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ایک آدھ مضمون ایسا بھی شائع ہو گیا ہے جو "عثمان نمبر" کی شان کے شایاں نہ تھا۔ مثلاً "حجاب کا خط" گو کہ شاعرانہ لٹریچر ہے اگر ادبی رسائل کو بچایا جائے تو بہتر ہے۔ ادب عریاں کے نمونے کم دیکھنے میں نہیں آتے مگر اس نہج کی نگارش کیلئے سلیقہ درکار ہے۔ قسم اور بہاری میں امتیاز رکھنا ضروری ہے۔ یہ مضمون کسی نو مشق کا ہے اور غلطی عموماً نو مشقوں ہی سے ہوتی ہے۔ بہر حال اس

لغزش کلک کی وجہ سے عثمان نمبر کی خوبیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ یہ خاص نمبر اس لائق ہے کہ محفوظ کر لیا جائے
قیمت ایک روپیہ
"د۔ش"

فطرت (راجگیر) صوبہ بہار ہندوستان کا وہ مردم خیز خطہ ہے جو کسی لحاظ سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا از روئے علم و ادب اُسے جو فضیلت حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ہمیں یہ دیکھکر بہت مسرت ہوئی کہ "راجگیر" ضلع پٹنہ کے مشہور رسالہ فطرت نے اپنی زندگی کا ایک سال بحسن و خوبی پورا کیا اور اب دوسرے میں قدم رکھا جناب صبا رشیدی۔ بی۔ اے مُلک کے اُن چند تعلیمیافتہ نوجوانوں میں سے ہیں جو اپنے دل میں زبانِ اُردو کا درد رکھتے ہیں۔ خود اچھے شاعر اور اچھے ناثر ہیں۔ فطرت کی ترتیب و تہذیب سے اُن کا سلیقہ ظاہر ہے۔ راجگیر میں انہیں رسالہ کی کتابت و طباعت کی جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہوگا اُس کا صحیح اندازہ بھی ہمیں نہیں ہو سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اِس معیار کے پرچے کو اس قدر مستعدی سے شائع کرنا اُن کی اعلیٰ حوصلگی کی دلیل ہے۔ فطرت کی ظاہری خوبیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باہمت کارکن خدمتِ ادب کی دُھن میں کافی مالی نقصانات برداشت کر رہے ہیں۔ شائقین اُردو کو چاہیئے کہ فطرت کو بھی اُردو کے اور اچھے رسائل کے ساتھ اپنے مطالعہ میں شامل کرکے مُدیرِ فطرت کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔ ہر قسم کے عمدہ مضامین سے اِس کے صفحات مزین نظر آتے ہیں۔ کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید قسمِ اعلیٰ۔ سرورق رنگین و نظر فریب۔ ضخامت کم و بیش ۸۰ صفحات سالانہ چندہ ۳ روپے۔ ششماہی عـلـہ۔ فی پرچہ غالباً ۵ر
"د۔ش"

جمالستان۔ مصنفہ نیاز فتحپوری مُدیر رسالہ نگار لکھنو۔ صفحات ۵۰۵۔ قیمت مجلد للعہ۔ غیر مجلد للعہ
یہ نیاز صاحب کے اُن ۳۲ بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۲۳ سنہ ع سے ۳۲ سنہ ع تک نگار میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ طرزِ تحریر یا اسلوبِ بیان کے متعلق کچھ لکھنا تضیع اوقات ہے کیونکہ نیاز کا رنگ ادبِ اُردو میں وہ مثالی شان رکھتا ہے جس کی محض تقلید سے دورِ حاضرہ کے سینکڑوں ادیب مستفید ہو رہے ہیں۔ ان افسانوں میں بعض طنزیہ ہیں، بعض شاعرانہ، چند اصلاحی ہیں اور چند علم الاصنام سے متعلق۔ "دو گھنٹے جہنم میں" کے مطالعہ سے اگر فضا قہقہوں سے گونجتی ہے تو صرف "صمد ۔ شکست" خون کے آنسو رلا دینے کے لئے کافی ہے۔ "ازدواج مکرر" سے اچھا سبق حاصل کرنے کے بعد "زہرہ کا ایک پجاری" تخیلِ انسانی کو کسی دوسری فضا میں پہونچا دیتا ہے۔ چار افسانے انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ جن میں سے "داستانِ حسن و عشق کا ورقِ خونیں" اپنے اصل سے بڑھ گیا ہے۔ ممکن ہے بعض افسانوں کو پڑھکر کافر گر جماعت کا کوئی رکن برہم ہو جائے لیکن اُس کی برہمیِ مزاج ادب کی رنگینیوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔
"ف"

اخوان الشیاطین افضل حسین چشتی کے معرکۃ الآرا سنسنی خیز افسانوں کا مجموعہ۔ "اخوان الشیاطین" جیسا ہنگامہ خیز اور خون میں ڈوبا ہوا اسکرنیوالا طویل افسانہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔ "موتی کی آب"، "روح مبتلا"، "رجعت"، میں دیکھئے کہ موجودہ سائنس کی ایجادات ارتکاب جرائم میں کس بہیت کیساتھ استعمال کی جاتی ہیں اور اُنکے کیسے خوفناک و لرزہ خیز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سات نہایت جاذبِ توجہ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت صرف عـہ علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ: [illegible]۔ ساقی بک ڈپو دہلی

دلی کی آسان اور شیریں زبان میں مترجم

تقطیع خورد لمبائی ۸ انچ چوڑائی ۵ انچ۔ یہ قرآن شریف ۴۰ سال سے مقبول عام ہوا اور علامہ حافظ نذیر احمد صاحب کا ترجمہ اور محشی ہے۔ ہدیہ مجلد چھ روپے ۶ محصول ڈاک ۱۲ کل لعہ۔ یہ رعایت نہ تو آجتک ہوئی ہے نہ ہوگی۔

بڑا قرآن شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب، تقطیع ۲۲×۲۹ جز صفحہ ضخامت ۱۰۰۰ صفحات ترجمہ بین السطور کاغذ سفید چکنا ولائتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو ہدیہ مجلد بارہ روپے ، محصول ڈاک ۱۲ کل للعہ۔ فرمائش کیوقت چوتھائی رقم پیشگی بھیجنی لازمی ہے۔

جامع الصاحف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم، ترجمہ بین السطور کاغذ سفید چکنا ولائتی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو تقطیع ۲۲ + ۲۵ - ۸ ہدیہ مجلد پارچہ چھ روپے چار آنہ ، مجلد چرمی سات روپے ، محصول ڈاک ۱۲

غرائب القرآن

اسمیں ایک صفحہ پر متن کلام مجید ہے مقابل کے صفحہ پر ترجمہ حاشیہ پر حل لغات عربی کاغذ ولائتی صفحات ۱۱۲۸ تقطیع ۲۲ + ۲۹ - ۸ ہدیہ مجلد پارچہ لعہ مجلد چرمی لیعہ محصول ڈاک ۱۲

قرآن شریف

معجز نما متوسط قرآن شریف بدو ترجمہ زیر متن

اول ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی ترجمہ دوم مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حاشیہ پر کامل تفسیر اردو اور شروع میں تمام پیغمبروں کی سوانحعمری و عملیات وغیرہ درج ہیں کاغذ اول نمبر ولائتی گلیز چکنا سفید ربڑی عمدہ پالش ہدیہ مجلد چھ روپے آٹھ آنہ ، قسم دوم معمولی کاغذ تین روپے آٹھ آنہ ، محصول ڈاک ایک روپیہ تین آنہ ،

کلام مجید مترجم مرزا حیرت

بہت بڑا سائز ہدیہ بارہ روپے ، محصول ڈاک صہ کل سترہ روپیہ ،

قرآن شریف کلاں معہ تفسیر حسینی اردو

قدیم طرز۔ پاکیزہ لکھائی چھپائی ہدیہ مجلد آٹھ روپیہ ، محصول ڈاک ایک روپیہ چھ آنہ ،

قرآن شریف بدو ترجمہ کلاں

منشی ممتاز علی صاحب مہاجر مکی مرحوم کی دلی تمنا کے مطابق منشی محمد عبدالغنی صاحب کی جگرکاری اور دیدہ ریزی کی آخری یادگار مطبع مصطفائی کا مطبوعہ ہے۔ اسمیں دو ترجمہ نہایت مستند عالم باعمل کے لکھے گئے ہیں بین السطور ترجمہ اردو و تحت اللفظ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ۔ دوسرا ترجمہ فارسی حاشیہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نیز حاشیہ پر مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے فوائد موضح القرآن درج ہیں تقطیع ۲۲+۲۹-۴ حنا شدہ ہدیہ مجلد پارچہ ،

معجز نما حمائل مترجم

زیر متن ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب حاشیہ پر کامل تفسیر شروع میں سوانحعمری وغیرہ کاغذ اول نمبر ولائتی حنا شدہ ہدیہ مجلد چار روپے للعہ قسم دوم معمولی کاغذ، قیمت دو روپیہ ، محصول ڈاک گیارہ آنہ ۱۱

حمائل شریف

مترجم مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی۔ سطور پر حنائی رنگ مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو سفر و حضر میں ساتھ رکھنے کے قابل۔ ہدیہ مجلد چار روپیہ آٹھ آنہ ، علاوہ تین روپے آٹھ آنہ ، محصول ڈاک ۱۲ یہ حمائل شریف ۴ مرتبہ چھپ چکی ہے۔

بلا ترجمہ نورانی قرآن مجید

بچوں کے لئے کتابت کے لحاظ سے اس سے بہتر قرآن شریف قریب قریب دنیا بھر میں نہیں ہے۔ نہ آئندہ لکھا جا سکتا ہے اس حجم اور تقطیع پر اس سے زیادہ صاف چھپا ہوا اور کوئی قرآن شریف نہیں ہے۔ نہایت صحیح ہے۔ ہر پارہ علیحدہ ہو سکتا ہے۔ تاکہ مساجد میں جلدیں بنوا کر دیدیں۔ ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چھ آنہ ، مجلد چرمی ایک روپیہ دس آنہ محصول ۱۳

بارہ مہری قرآن شریف معری

یہ تمام ہندوستان میں مقبولیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور ہندوستان کے ہر مکتب میں پڑھایا جانے لگا ہے لکھائی چھپائی نہایت خوشنما ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ ، محصول ڈاک بارہ آنہ ۱۲

سترہ مہری قرآن مجید معری

یہ قرآن مجید بہت صحت کے ساتھ آٹھویں بار طبع ہوا ہے ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ ، محصول ڈاک بارہ آنہ ۱۲

خوشنما جیبی حمائل کارڈ سائز

غیر مترجم بہترین لکھائی چھپائی ہدیہ مجلد پارچہ ایک روپیہ چار آنہ ، ایضاً مجلد پارچہ حنا شدہ ایک روپیہ سات آنہ مجلد چرمی ایک روپیہ گیارہ آنہ ، بغیر جلد ایک روپیہ تین آنہ ، محصول ۶

معجز نما پنجسورہ

بلکہ دہ سورہ و مجموعہ وظائف مع مکمل اوراد چشتیہ مترجم با تفسیر ہدیہ دس آنہ (۱۰) ، مجلد ۱۲ ، محصول ڈاک ۵

مجموعہ دلائل الخیرات

و حزب البحر و قصیدہ بردہ مترجم حنا شدہ معہ کامل تفسیر و حالات مصنفین علیٰ قلم۔ ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ ، مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ ، محصول ۶

رکن دین

اس کتاب کے اندر تمام مسائل دینی و دنیاوی جمع کر دیئے ہیں ہر گھر میں اس کتاب کا ہونا نہایت ضروری ہے یہ کتاب عورتوں کے مطالعہ میں بھی رہنی چاہیئے ضخامت ۴۲۴ صفحات قیمت صرف دس آنہ (۱۰) ، محصول پانچ آنہ ۵

قصص الانبیاء

دنیائے اسلام کی نہایت ضروری کتاب ابتدائے پیدائش حضرت آدم تا رسول کریم تمام پیغمبروں کی سوانحعمریاں تقطیع ۲۰×۲۶ ۸/۱ قیمت صرف ایک روپیہ ، محصول ،

عقائد الاسلام

مصنفہ علامہ محمد عبدالحق صاحب محدث دہلوی جس میں مسلمانوں کے عقائد کتاب اللہ و سنت رسول اللہ اور اس فن کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور زمانہ حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر مخالفوں کے شبہات کا محققانہ جواب دیا ہے۔
قیمت علاوہ محصول ڈاک ایک روپیہ ۸؍

فالنامہ ناصری

ہر کام شروع کرنے سے پہلے احسن طریقہ یہ ہے کہ استخارہ کر لیا کریں۔ تاکہ اس کا انجام اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے۔ اس میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب استخارہ قرآنیہ کا ترجمہ ہے اور اس کے علاوہ قرأۃ الانبیا فالنامہ پیغمبران، فالنامہ اولیائے کرام، فالنامہ غوث الاعظم، فالنامہ دیوان حافظ، فالنامہ مثنوی شریف شامل کر دیا ہے یہ فالنامہ بہت ہی مقبول ہے قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍ محصول ڈاک ۳؍

تذکرۃ الاولیا اردو

حضرت شیخ عطار کی بہترین قابل تصنیف کا ترجمہ تمام اولیائے کرام کی زندگی کے حالات صفحات تقریباً ۵۰۰ قیمت صرف دو روپے (۲؍) محصول ڈاک گیارہ آنہ (۱۱؍)

تاریخ الامت کامل

لکھائی چھپائی بہترین مصنفہ مولانا اسلم جیراجپوری ایڈیٹر "جامعہ" (۱) سیرت رسول ۸؍ (۲) خلافت راشدہ ۸؍ (۳) خلافت بنی امیہ ۸؍ (۴) خلافت عباسیہ ۸؍ (۵) خلافت عباسیہ بغدادیہ ۸؍ (۶) خلافت عباسیہ مصری ۸؍ (۷) خلافت عثمانیہ ۸؍ کل سیٹ پانچ روپیہ محصول ڈاک ۱۲؍

آجکل کے مسلمان اپنے مذہب سے بالکل ناواقف ہیں

چونکہ اول تو مسلمانوں کو علوم عربیہ حاصل کرنے کا بہت کم موقعہ ملتا ہے جس سے مذہبی مسائل اور نکات سے واقف ہو سکے، دوم اب تک اردو میں ایسا مذہبی لٹریچر موجود نہ تھا جو اس کمی کو کما حقہ پورا اس غرض سے مندرجہ ذیل کتابیں تالیف کی گئی ہیں تاکہ مسلمان اپنے مذہب کے نکات اور ارکان اسلام کے تمام مسائل سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکیں۔

تفسیر حقانی اردو کامل آٹھ جلد

(مصنفہ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی محدث دہلوی)

یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں پوری ہوئی ہے جس میں مذاہب کے حالات اور عالم آخرت کے اسرار اور قرآن شریف کی مصطلحات کے متعلق محققانہ بحث کی گئی ہے یہ تفسیر مع اصل متن و مستند و معرکۃ الآرا مشہور تفسیر ہے جو پچاس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خلائق ہے۔ اس تفسیر کی مختصر خوبیاں یہ ہیں کہ مخالفین اسلام کے جملہ اعتراضوں کا محققانہ مدلل پیرایہ میں جواب دیا گیا ہے۔ اس تفسیر سے معمولی اردو داں سے لیکر منتہی عالم تک مستفید ہوتے اور بچے بوڑھے جوان مرد و عورت سب لوگ پڑھ سکتے ہیں، طلباء اور علماء کے لئے اس تفسیر میں علمی مباحث کے وہ دریا بہائے گئے ہیں جن کی شناوری ہر مباحث و مناظر کے لئے ضروری ہے علم تصوف اور مسائل روحانیت کو ایسا کشف فرمایا ہے کہ ذوق سلیم رکھنے والا صوفی منش انسان بیتاب ہو جاتا ہے اصل کا اصلی متن جلی قلم اعراب صحیح ترجمہ اردو عام فہم نہایت سلیس بامحاورہ روایات صحیح ربط آیات ترتیب شان نزول ساتھ ساتھ قصص و واقعات جملہ مسائل وغیرہ سب باتیں اس تفسیر میں درج ہیں اگر آپ واقعی عالم، واعظ، محقق، مناظر و صوفی بننا چاہتے ہیں تو تفسیر حقانی ملاحظہ فرمائیے جس کی مجموعی قیمت پچیس روپیہ علاوہ محصول ہے اور ہر جلد کی علیٰحدہ علیٰحدہ قیمت یہ ہے۔ پہلی جلد دو روپے باقی دوسرے، آٹھ جلد تک فی جلد چار روپے علاوہ محصولڈاک کے۔ اگر ڈاک کے ذریعہ منگاتے ہیں تو لامحالہ محصول ڈاک خرچ ہوتا ہے اس لئے ریل کے ذریعہ منگائیے۔ پانچ روپے پیشگی آنے پر روانہ کی جائے گی۔

معلومات نماز

کی تشریحات کے ساتھ بالکل نئے انداز میں نماز کو بہترین عبادت ثابت کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں نماز پڑھی جائے تو وہ انسان کو بہترین انسان بنا دیتی ہے عنوان چند یہ ہیں۔ مذہب اسلام، عبادت، حکمت احکام عبادت کے منافع، ثمرات عبادت، ثمرات دنیا، ثمرات آخرت، تارک نماز، فضیلت نماز، نماز کے طبی فائدے امتیازی عبادت، مقصد نماز، نفلی عبادت، نماز کے وقتوں کا قرآن سے ثبوت، بے نمازوں کی کہانیاں نماز قرآن میں اس کے بعد تمام نمازوں کا بیان ۱۲۰ صفحات قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصول

تجلیات ربانی و کمال حقانی

در طریق اوراد اور وظائف و طریق فاتحہ و ایصال ثواب از شیخ عبدالحق قیمت ۵؍ محصول ڈاک ۳؍

نوید جاوید

بزبان اردو اس کتاب میں شروع سے لیکر آج تک اور آج سے قیامت تک قرآن شریف پر باطل پرستوں نے جسقدر اعتراض کئے ہیں یا کریں گے ان سب کا اس میں جواب ہے اور تمام مذاہب کی دلائل سے تردید ہے آج سے ۵۳ برس قبل کی تصنیف ناپید تھی اب نہایت صحت کے ساتھ طبع ہوئی ہے ضخامت ۹۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنہ (۳؍۸) محصول ۱۲؍

الحقوق والفرائض

از مولوی نذیر احمد دہلوی۔

مذہب اسلام کے سارے مسائل کا مجموعہ قرآن شریف کی آیات اور احادیث کے ترجمہ کے ساتھ ہر مسلمان کے گھر میں جو مذہب سے واقفیت رکھنا چاہتا ہو تو اس کتاب کا ہونا لازمات میں سے ہے صفحات ۱۰۴۲ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنہ (۵؍۸) محصولڈاک ۱۲؍

اجتہاد

اسلام کی حقانیت کے دلائل و براہین قاطعہ سے اثبات جو مسلمان اپنے عقیدے میں پکا ہونا چاہئے وہ اس کتاب کو ضرور دیکھے از مولوی نذیر احمد ضخامت ۲۷۶ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنہ محصول ۶؍

عملیات

اس کتاب میں پچاس سے زیادہ ایسے مستند اعمال، اشغال و عملیات ہیں جو اولیا اور بزرگان دین کے زیر عمل رہے ہیں اس میں فن کی حیثیت سے عمل پڑھنا نقش لکھنا اور تمام اعمال کے متعلق ضروری

بزم خیال

یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے نیا

ادب پیش کرتی ہے جس میں مسلم الثبوت اور ماہرین فن اساتذہ کی وہ اصلاحیں درج کی گئی ہیں جو انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد رشید دل کو دی ہیں جنکی بدولت وہ آج شاعری کی دنیا میں آفتاب بنے ہوئے ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ محصول ۶

شمیم

ہر دو جلد مکمل، زمانہ حال کی اردو فسانہ نگاری میں ایک معرکۃ الآرا تصنیف فن ناول نویسی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنیوالا مصلح اخلاق، سبق آموز، عبرت خیز، بے انتہا دلچسپ ناول جسمیں جذبات فطری کی عکاسی، معاشرت حاضرہ کی مصورانہ نفسیات وحیات انسانی کی نقاشی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے زبان کی حلاوت انداز بیان کی لطافت، پلاٹ کی خوبصورتی کیرکٹر کی ارتقائی تحریر کی شوخی آمیز سنجیدگی اور خیالات کی دلآویز ندرت کے لحاظ سے یہ ناول اپنی نظیر آپ ہی، انگریزی اردو، ہندی کے اخبارات اور رسائل نے بہت شاندار ریویو لکھے ہیں ضخامت تقریباً ۸۰۰ صفحات یہ ناول سہ رنگی تصاویر سے مزین ہے۔ قیمت مجلد صرف چار روپے علاوہ محصول گیارہ آنہ

مکمل شرح دیوان غالب

ہندوستان میں اس سے بہتر شرح آجتک شائع نہیں ہوئی از عبدالباری آسی قیمت تین روپے محصول ۸

مکمل شرح کلام غالب

غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی بہترین شرح

از عبدالباری آسی قیمت تین روپے محصول آٹھ آنہ

شرح رباعیات عمر خیام

منظوم قیمت دو روپے چار آنہ محصول چھ آنہ

شرح رباعیات عمر خیام

منثور قیمت دو روپیہ محصول سات آنہ

شرح رباعیات سرمد شہید

قیمت دو روپیہ محصول

قصائد عزیز

از مولانا مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بہترین لکھائی چھپائی بہترین مجلد قیمت تین روپے آٹھ آنہ محصول

تلاش حق

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی، گاندھی جی نے اس میں اپنے اخلاقی، طبی اور سیاسی تجربات اپنے آپ تحریر فرمائے ہیں

کاغذ، کتابت، طباعت بہترین ضخامت تقریباً ۵۰۰ قیمت صرف ۱۲ محصول ۵

شہاب کی سرگذشت

دنیائے ادب کا پہلا افسانہ جو نفسیاتی سیرت نگاری، رنگین خیال اور بلندی انشاء کے لحاظ سے فسانہ حقیقت کہتی ہے جو ازدواجی زندگی کی حقیقت پر حالیات کے نازک مسائل پر ایک محیر العقول کارنامہ ہے از مولانا نیاز فتحپوری قیمت ایک روپیہ ۱۲ محصول ۵

فغان آرزو

حضرت آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان لکھائی چھپائی کاغذ بہترین صفحات تقریباً ۳۰۰ قیمت ۱۲ محصول

دلگداز افسانے

نہایت دلآویز اور دلگداز افسانوں کا مجموعہ از کوثر

اصلاح و معاشرت پر ایک معرکۃ الآرا تصنیف از راشد تہانوی قیمت محصول

مرقع ادب

ہندوستان کے انشاپردازوں اور محققین اساتذہ سخن کے نہایت عجیب اور پرُاز معلومات خطوط کا نایاب مجموعہ قیمت ہر دو حصہ محصول ۹

جاسوسی فسانے

مشہور و معروف جاسوس خوفناک ہولناک عجیب و غریب محیر العقول جاسوسی افسانہ قیمت محصول

گہوارۂ تمدن

اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ عورت نے ازمنہ قدیمہ میں تہذیب وارتقائے عالم کا کس قدر ساتھ دیا اور دنیا کی شائستگی اور مدنیت عورت کی کس درجہ ممنون ہے۔ از مولانا نیاز فتحپوری قیمت محصول

نگارستان

مولانا نیاز فتحپوری کے چند مخصوص ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ جنہوں نے انشاء بدیع کی دنیا میں ہلچل ڈالدی ہے اور اختراعات قائمہ جدت اسلوب اور لطافت ترکیب کے لحاظ سے دنیائے ادب کیلئے ایک نئی چیز ہیں قیمت محصول

دلچسپ ادبی کتابیں

مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی برلن قیمت ہر دو حصہ دو روپے محصول ڈاک آٹھ آنہ ۸

سیرت محمد علی

رئیس الاحرار شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم کے مفصل حالات جس میں مولانا کے فوٹو بھی شامل ہیں، از رئیس جعفری ندوی ضخامت ۵۵۰ صفحات قیمت صرف تین روپے محصول ۱۲

موتی

دنیا بھر کے حکماء، علماء اور ادباء کے گرانقدر زریں اقوال کا مجموعہ بصیرت افروز ملفوظات کا خزانہ، حکمت و فلسفہ، پند و موعظت شعریت و رومان، ادب و انشاء، ادبیات نثر میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف، علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے تبصرے اور چار چاند لگا دیئے ہیں

چاند پوری قیمت محصول ۵

عالم خیال

ایک بے اضافت اور بے بدل نظم دہرِ چپا رخ معہ چار سہ رنگی تصاویر از شوق قدوائی لکھنوی مرحوم ضخامت ۸۰ صفحات قیمت محصول ۵

تذکرہ خندۂ گل

اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انتخاب کلام از عبدالباری آسی ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت محصول ۸

عیار فقیر

ہندوستان کی گداگری پر ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں بحث عبدالباری آسی قیمت ۸ صفحات ۱۵۰ محصول ۵

اجتماع ضدین

فسانہ کی صورت میں

لکھنوی قیمت محصول ۵

پیام جاوید

از مرزا عسکری خاں مجاری

حکومت اورنگزیب کی اصلی تاریخ

نوشتہ مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن قیمت ۱۲ علاوہ محصول

سی پارۂ دل

خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا دلکش مجموعہ جو اعلیٰ جماعتوں کے سرکاری نصاب میں داخل ہے قیمت علاوہ محصول

کولتار

اس کے بعض حصے ہنسانے والے اور یقینی ہنسانے والے اور بعض پُر اسرار ہیں قیمت ۶ر

ومپائر

ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب وغریب درد انگیز و مضحکہ خیز قصہ قیمت (۶ر)

شریر بیوی

ایک شوخ لڑکی کی داستان جس کو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے قیمت عہ

فل لوٹ

حسن و عشق کا بیحد دلچسپ مختصر ناول جذبات و تاثرات کا دل آویز مرقع قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

روحِ ظرافت

صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

مرزا جنگی

لکھنؤ کی پرانی تہذیب اس دلاویز ڈرامہ میں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

دیکھا جائیگا

شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے قیمت خوبصورت جلد کی ایک روپیہ عہ

روحِ لطافت

جذبات لطیف کی روح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ و عبرت انگیز افسانے قیمت عہ

جنت کا بھوت

یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے قیمت ۱۲ر

تفویض

ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک مسجد کے ملّا سے ہو جاتی ہے اس کے عجیب و غریب نتائج قیمت پانچ آنہ ۵ر

قرآن در پردہ

آیات قرآنی کے حوالوں سے

تایا گیا ہے جو پڑھ کیا ہے اور رنگی پردہ کیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

چندر مونی

مصنفہ انصاری صاحب ناصری

حسن و عشق کی داستان مگر پاک محبت لطیف جذبات حسرتناک انجام قیمت ایک روپیہ عہ

اخوان الشیاطین

مصنفہ محترم

کر دینے پر کیسے مجبور ہو جاتی ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ محصول ۵ر

دلی کا آخری دیدار

مصنفہ سید وزیر حسن دہلوی کتاب کا مضمون کتاب کے نام سے ظاہر ہے قیمت بارہ آنہ ۱۲ر محصول ۵ر

نرگس جمال

مترجمہ شاہد احمد بی اے قیمت عہ

کھرپا بہادر

چغتائی صاحب کے مخصوص طرز تحریر کا

تازہ ترین شاہکار

نہایت ہی پُر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف اپنے شوخ اور مذاقیہ طرزِ بیان کے ساتھ ساتھ لنگران اعظم کے خلوں کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک اور شرمناک سازشوں کے ہولناک و قہقہہ خیز سین دکھائے گا یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرزِ بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے۔ کھرپا بہادر کو پڑھکر آپ شریر کے دربار حرامپور کو بھول جائیے بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق اور قیمت ان تمام خوبیوں کے بمقابل بالکل مفت یعنی صرف ایک روپیہ (عہ) محصول ۵ر

ملنے کا پتہ :- کتبخانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

نرگس

حضرت ایم اسلم کا تازہ ترین شاہکار قیمت دو روپیہ (۲ر) محصول ۵ر

کمزوری

مرزا عظیم بیگ صاحب نے ایک ایسا دلچسپ ناول لکھا ہے جو ان کی تمام موجودہ تصانیف سے بڑھ چڑھکر ہے قیمت دو روپیہ (۲ر) محصول پانچ آنہ ۵ر

علامہ مضحک فضل حسین صاحب چشتی سات سائنٹفک فسانوں کا مجموعہ بیحد دلکش مجموعہ۔ آپ کے مطالعہ کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

گناہ کی راتیں

سات دل ہلا دینے والے افسانے ہر افسانہ میں دکھایا گیا ہے کہ عورت اپنے گوہر عصمت ضائع

سیلاب تبسم

حضرت شوکت تھانوی کی تصنیف

تازہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اس کتاب کو پڑھکر خود ہنسئے اور احباب کو ہنسانے کے لئے اس کتاب کو اپنے پاس رکھئے قیمت مجلد دو روپیہ (۲ر) محصول ۶ر

بحر تبسم

۱۸ بہترین مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ از شوکت تھانوی قیمت ۲ر محصول ۶ر

طوفان تبسم

۱۷ مزاحیہ افسانوں کا لاجواب مجموعہ از شوکت تھانوی قیمت دو روپیہ ۲ر محصول ۶ر

لاٹھی اور بھینس

از ملا رموزی قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ محصول

شفا خانہ

از ملا رموزی قیمت عہ محصول ۵ر

دیوان ملا رموزی

قیمت چار آنہ ۴ر

شادی

از ملا رموزی قیمت عہ محصول ۶ر

صبح لطافت

از ملا رموزی قیمت دو روپیہ ۲ر محصول ۶ر

مضامین فرحت

(حصہ سوم) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے بہترین ۱۵ مضامین کا مجموعہ قیمت ۲ر معہ محصول۔

لطائف عجیبہ

ہر سہ حصہ از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت دو روپیہ (۲ر) آنہ ۲ر محصول ۸ر

حکایات لطیفہ

ہر سہ حصہ از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت ۲ر محصول ڈاک ۸ر

شریف بیگمات کے مطالعہ کی کتابیں

اتالیق نسواں
بعد ترمیم

سے بارہ دس حصوں میں چھپ گئی ہے جس پر عمل کرنے سے بیٹیوں کو سگھڑ اور بہو کو سلیقہ شعاری آتی ہے اس کتاب میں علمی کاموں کے متعلق کیلئے پورے ۱۳۰۰ صفحوں میں بارہ سو شکلیں دی ہیں ہندوستانی یورپین طرز معاشرت کا موقع بموقع مقابلہ کرکے دکھایا ہے دسوں جلدوں مکمل کی قیمت چار روپے آٹھ آنہ للعہ محصول بارہ آنہ ۱۲

بیوی کے فرائض
اگر گھر کو جنت کا نمونہ بنانا ہے تو یہ کتاب بیوی کو منگا کر دیجئے اس کتاب سے آپ کو روحانی کیف بھی حاصل ہوگا۔ قیمت ۸ محصول ۴

موتیوں کا کام
اس دستکاری کی مفید

کتاب کو ۲۷ ماہر عورتوں نے تیار کیا ہے اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی مفید کتاب ہندوستان میں کہیں نہیں چھپی قیمت ۶ محصول ۶

میاں بیوی کے حقوق و فرائض
آپکا گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے اگر آپ اس کتاب کے عامل بن جائیں قیمت آٹھ آنہ ۸ محصول ۵

گلدستہ کشیدہ
کشیدہ کاری کی اسقدر

خوبصورت اور اتنی کارآمد کتاب آج تک نہیں شائع ہوئی جس کی تیاری میں ۴۲ دستکار بہنوں نے حصہ لیا اس فن کی مشہور ماہر محترمہ عزیز فاطمہ صاحبہ نے نہایت محنت اور قابلیت سے کتاب کو مرتب کیا ہے ترکیبیں اسقدر آسان ہیں کہ چھوٹی

بچیاں بھی سمجھ سکتی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ محصول ۸

عصمتی کشیدہ
اس کتاب کو ہندوستان

کی نامور خواتین کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جس میں کشیدہ کاری کیلئے تقریباً ڈیڑھ سو خوبصورت نمونے ہیں جو لڑکیوں کے لئے کشیدہ کاری کی مکمل تعلیم ہے قیمت ایک روپیہ عہ محصول چھ آنہ ۶

خواتین کی دستکاریاں
جو عورتیں مالی دقتوں سے پریشان ہیں جنہیں آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ان کے لئے کارآمد بیش بہا مشورے اور بہت سے کام جن سے وہ بغیر کسی کا احسان اٹھائے مالی پریشانیوں

کو دور کر سکتی ہیں قیمت ۸ محصول ۵

عصمتی کروشیا
کروشیا کی شوقین بہنوں کے لئے نہایت کارآمد تحفہ جس کی تیاری میں ہندوستان کی ۵۲ نامور خواتین نے جو کروشیا میں ماہر مانی جاتی ہیں، حصہ لیا ہے۔ قیمت عہ محصول ۸

بیوی کی تعلیم
حضرت خواجہ حسن نظامی

اور خواجہ بانو کی لکھی ہوئی کتاب جس میں ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن کا بیویوں کو جاننا ضروری ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ محصول ۶

بیوی کی تربیت
بیوی کی

تعلیم کا دوسرا حصہ نامور خواتین کے

مضامین قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۶

اولاد کی شادی
بیوی کی تعلیم کا

تیسرا حصہ اور اولاد کی شادی کے متعلق ضروری نصیحت نامہ قیمت ایک روپیہ عہ محصول پانچ آنہ ۵

مخدرات تیموریہ
بے عیب خاندان شاہی کی مستورات کا عالیشان سلسلہ اس کتاب میں تقریباً ایکسو دو بیگمات کے حالات درج ہیں از مولوی عبد الحلیم شرر قیمت عہ محصول آٹھ آنہ ۸

ازواج النبی
جناب سرور کائنات کی ازواج مطہرات

کے پورے حالات و سوانح عمریاں قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۶

مخدرات مشاہیر عالم
ہر سہ جلد کامل، اس کتاب میں قریب قریب تمام دنیا کی مشہور عورتوں کے حالات درج ہیں از مولوی عبد الحلیم شرر قیمت تین روپے ۳، محصول دس آنے (۱۰)

دہلی کا باورچی خانہ
اس کتاب میں قدیم امرا اور شرفائے دہلی کے تمام لذیذ اور نت نئے کھانے اور انکے پکانے کے نہایت سہل طریقے درج ہیں قیمت ۸ محصول ۵

بنات النعش
لڑکیوں کے تمدن و

معاشرت کی اصلاح از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت ۱۲ محصول ۶

توبۃ النصوح
لڑکیوں کو اخلاق و نیک

کرداری کی تعلیم از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت عہ ایضاً قسم دوم پورا کاغذ ۸ محصول ۶

مراۃ العروس
لڑکیوں کو امور خانہ داری

کی تعلیم دینے والی کتاب از مولوی نذیر احمد دہلوی قیمت ایک روپیہ عہ ایضاً قسم دوم ۱۰ محصول ۶

اقبال دلہن
شرفائے دہلی کی روزمرہ کی

زندگی کے دلچسپ حالات از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ محصول ۷

حسن معاشرت
پھوہڑ اور سلیقہ مند بیویوں کے حالات کا اخلاقی ناول قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ محصول ۶

اصلاح معیشت
اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عورتیں ہی مردوں کو بگاڑتی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ محصول ۶

بچیوں سے دو دو باتیں
لڑکیوں کے لئے مفید معلومات اور ہدایات کا مجموعہ قیمت عہ محصول ۵

انشائے بشیر
عورتوں کے لئے سو کارآمد

خطوط کا مجموعہ قیمت عہ محصول ۸

ناشتہ
مشرقی اور مغربی ناشتہ تیار کرنیکی بہترین کتاب

جو نئی روشنی کی بہنوں کے لئے کارآمد چیز ہے اس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مختلف قسم کے ناشتوں کی کئی کئی ترکیبیں ہیں قیمت ۱۰ محصول ۵

ملنے کا پتہ [illegible]

جوانی اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنی ہوں

تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیے ان کتابوں میں جوانی اور شادی کی مسرتیں بھی ہیں عورتوں کے دلوں کو مسخر کرنے کی تدابیر بھی ہیں اور اس کے علاوہ صحت اور تندرستی کے قیام کے اصول بھی ہیں جس کسی پاس یہ کتابیں ہوں گی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا

دلہن کی ڈائری

ایک شریف گھرانے کی دلہن کی آپ بیتی، شب زفاف کا پر کیف سماں، کچھ خوف، کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ دولہا میاں کی ہیبت، اُنکا عشرت کی گل چینی، بے صبری کے جذبات، بیتابی کے مظاہرے، پوشیدہ حالات کا انکشاف غرضکہ دلچسپیوں کا لاجواب مرقع ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ عہ

لذت النکاح

زن و شوہر کے تعلقات پر نہایت دلچسپ کتاب ہے جس کو جوانی اور اس کے جذبات کا مکمل کورس کہنا چاہئے اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دلہن کو کیا کرنا چاہئے اور اپنے ازدواجی تعلقات کا سلسلہ کیونکر بڑھایا جائے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی نہایت خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتی ہوئے اصلاح رسوم کا بیڑہ اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حقوق نسواں پر زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگذشت ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

بہار عروس

یہ وہ کتاب ہے جس کو ہر ایک دلہن نے اپنی سہیلی اختر دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگذشت لکھ کر بیجھدی ہے جو بجنسہ چھاپ دی ہے اس میں بڑے بڑے پوشیدہ دلچسپ حالات ہیں

بڑی ہی پر لطف دلچسپ کتاب ہے ایسی کتابیں کم ہوں گی قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

دولہا دولہن

یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو بتاتی ہے کہ حقیقی لذت حاصل کرنا سکھاتی ہے، اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں ان سے بچاتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مواصلت میں غیر معمولی لذت پیدا ہو جاتی ہے اس کتاب کی جڑی بوٹیاں اور عملی تدابیر معلوم ہونے کے بعد تمام عمر ممسک اور مقوی دوا اور دوسری فضول دواؤں کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اردو میں لاجواب کتاب ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

عیش و نشاط

اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کے لئے وہ تجارب ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد عیش و لطف، کیف، تندرستی، تندرست اولاد، عورت کی محبت اور شادی کی لذتیں چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کی جا سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ علاوہ محصول

زن و شوہر

یہ طلسمی کتاب، شادی شدہ نوجوانوں کی زندگی کو راحتوں سے لبریز کر دیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد و عورت کی فطرت سے اس قدر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بھی ناشکا نہ رکھ کر بھی خوش رکھ سکتے ہیں قیمت ایک روپیہ عہ

مرد و عورت

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آخر عمر تک رنگین

تندرست رہیں گے، اور انہیں وہ تجربے معلوم ہوں گے جن سے شاید اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں قیمت عہ

میاں بیوی

یہ کتاب اصل میں بے تکلف احباب کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے لوگ بیوقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں قیمت عہ

لطف شباب

عربی کی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ جو سلطان سلیم خاں کے لئے لکھی گئی تھی صدیوں سے ناپید تھی اس کا مطالعہ کرو رمن کیلئے اکسیر اور بے اولادوں کیلئے مژدہ اولاد ہے اور مقوی باہ مجرب نسخوں اور طلسموں کا نادر و نایاب مجموعہ ہے قیمت عہ

مرقع حسن و شباب

یہ لطف شباب کا دوسرا حصہ ہے جس میں عورتوں کے اقسام و حالات اور ان کے حسن و شباب کو دوبالا کرنیوالی دوائیں اور طریقے درج ہیں قیمت ایک روپیہ عہ

زندگی کی بہار

مصنفہ جناب حکیم محمود خاں صاحب بلوی جس میں کل کیفیت ہمبستری کثرت مرد و عورت کے جملہ امراض کے حالات معہ علامات درج ہیں۔ شوقین مزاجوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

صلاح کار

عورت مرد کے تعلقات پر نہایت مفید علمی کتاب جس میں عشق و محبت کی حقیقت اور بدچلنی کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے قیمت عہ علاوہ محصول۔

نفسیات شباب

مترجمہ اکبر شاہ خاں صاحب ایم ۔ اے

ایچ ڈی برنس ایڈمنڈ اسپر لکر پروفیسر یونیورسٹی کی بے مثل تصنیف کو اصل جرمن زبان سے اردو ترجمہ نوجوانوں کی نفسی سیرت ان کی تخیلی زندگی اعلیٰ تصور کائنات اور اخلاقی نشو و نما پر اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں اپنی نوعیت کی پہلی اور مقبول عام کتاب ہے قیمت محصول ڈاک آٹھ آنہ ۸

ایرانی کوک شاستر

الحاج نور الدین

جادو اثر کی تلاش ہو تو ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ میں رکھئے جس سے آپکو معلوم ہوگا کہ جوانی کو آپ کس طرح ہمیشہ قائم رکھ سکتے ہیں بیوی سے کس طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اسکے جذبات و تاثرات کیا ہیں نیز شباب کس طرح وقف خزاں ہوتا . . . . . . رو ٹھی ہوئی جوانی کی دوبارہ کس طرح منتی ہے۔ حاذق حکما کے سہل الحصول صدری مجرب نسخے قیمت عہ محصول ۸

تصویر حسن

اس کتاب میں قابل مصنف نے حسن و خوبصورتی پیدا کرنے اور اس کو قائم رکھنے کے اصول پر بحث کی ہے۔ اور وہ تمام نسخے اور طریقے درج کر دیئے ہیں جن سے ایک بدصورت و بدشکل بھی نہ صرف حسین بن سکتا ہے بلکہ حسن و خوبصورتی کو آخر عمر تک قائم رکھکر روز افزوں ترقی کر سکتا ہے قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۸

قانون ازدواج

دنیائے کیف و نشاط کا خاموش رہنما کتاب کے نام سے کتاب کے کام کا اندازہ لگا لیجئے جوانی اور شادی کی مسرتیں۔ عورتوں کو مطیع کرنیکی تدبیریں۔ تندرستی قائم رکھنے کے اصول، ضعیفی کو جوانی سے بدلنے والے نسخے اور تقریباً دو درجن تصاویر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ محصول ۸

عورت بالتصویر

بھولی لڑکیوں پر حسن کی رعنائی دیکھ کر... اس کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ کتاب کا مطالعہ کریں جس میں نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو، عورت کے پوشیدہ اعضا تو جسم عورت کی فطرت عورت کی تربیت عورت کے باغ حسن کی خوشبو غرضیکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی پوشیدہ بات ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اس کتاب میں دو رنگین فوٹو بلاک اور قلمی تصویریں ہیں بہت مقبول کتاب ہے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے قیمت دو روپے ۲ محصول ۸

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد شب عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی، شادی کے وقت عزیز و دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے موقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو یہ کتاب دیجئے۔ شب عروسی اصل کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے جہاں تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے، اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائے گا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہو گا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی قیمت ۱۲ ہے جو اس کے منافع پر سو درجہ بہتر ہے محصول ۵

کیف مواصلت

دنیا سے لطف مسرت اور لذت و کیف میں نمایاں چیز ایک مرد اور جوان مرد کیلئے عورت کی مواصلت ہے اور یہی وہ کیف افزا اثر رکھتی ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے یوں تو فطرت کی بسیط دنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو فطری قانونی طریق پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے ہیں لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گذار رہے ہیں تو یہ ہے کہ اس کیف پرور شعبہ حیات میں اس درجہ تمتع حاصل کیا جائے جو دوسرے ذی حیات عالم سے ممتاز ہو ... کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے قیمت ۱۲ محصول ۸

بہار شباب

جنسی کتابوں میں جس اسلوب بیان کو امتیاز ہے وہ صفات کی یکجائی ہے یہ چیز مطالعہ کیلئے خواہ کتنی ہی دلچسپ ہو لیکن اصل فائدہ اس چیز کے ماتحت ہے جس کے ماتحت رکھ کر انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھکر چاہتا ہے کہ یہ لطف قائم رہے یہ بہار شباب میں ایسا ہی بتلایا ہے جوانی کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کیلئے بڑے بڑے تجربہ طریقے قاعدے بتلائے ہدایات غرضکہ ہزاروں باتیں اور عورتوں کی اندرونی کیفیات کو مردوں پر آئینہ کر دیا متعدد فوٹو بھی ہیں قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۸

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے لکھا گیا ہے عالم ہے اس کتاب میں حضرت الشیخ نے لذت کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ اثر جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں عورت کی ہے شاید اس کے پاس بھی نہ رہا ہو مصنف نے عورت کے ترتیب وغیرہ ہی لذت ہی لذت شامت کی ہے اور اسی طرح مرد کی قوت نہایت قوی طاقتور کرنے کے نسخے اور ہزاروں ترکیبات ہیں اور امراض کے علاج کے سلسلہ میں مجربات وغیرہ جو بیان ہوتی ہیں وہ ہزار آزمودہ نسخے مقوی ہیں قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱۸ محصول ۸

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب بہترین لذت ہی وقت حاصل کر سکتی ہے جبکہ اس کے حسن و جمال کے برقرار رکھنے کا راز سمجھ لو۔ اولاد کی کثرت ہی مضر ہے ... حسن کے باغ کا ناس ہو جاتا ہے ... والدین کیلئے اکثر پرورش سے ... دشواری ہوتی ہے اور انسان اس ذوق و لذت سے محروم رہ جاتا ہے برتھ کنٹرول ایک بہترین اکسیر طلسمی کتاب ہے ... زندگی کی ایک بڑی حقیقت سے نقاب ہٹاتی ہے یقین ہے کہ اولاد کو پیدائش تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی قیمت عہ محصول ۸

لذت شباب

شباب یادداشتی ہے ... لذت شباب جو ... کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے ... شباب کے حدود ... عورتوں کی ... حسن کی ... کس طرح لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے ... شباب کس طرح ... خزاں ہوتی ہے ... شباب کی ... اگر عورت ... اور مرد ... خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں لذت شباب میں ... شباب و لذت تازہ بخشنے کیلئے صد ہا مجربات ... ۱۸ فوٹو بلاک قیمت عہ محصول ۸

شب عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شب عروسی کے تمام لذت اندوز کیفیات کرنے میں کامیاب ہوئی ہے ... اس کتاب میں ... عروسی کے ... افسانے ... زندگی کی ... کامیاب زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہیں قیمت ایک روپیہ عہ محصول ۸

قانون مواصلت

عیش و نشاط کی زندگی کا رہبر اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے کبھی قوت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھاتے رہیں گے اس میں مواصلت کی بابت تمام ضروری باتیں درج ہیں قیمت عہ

تحفہ شباب نوجوانوں کی رہبر کامل نایاب تحفہ ... کیلئے اکسیر و آب حیات قوت رفتہ کی بحالی تمام امراض مخصوصہ کی دلچسپ و مدلل ... حالت پر نہیں ہیں بلکہ اس میں اضافہ کی ... گئی ہیں طبی ہدایات ... قیمت

تاج العروس

یہ کتاب صد ہا قیمتی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے اس میں صنف نازک کے ہر پہلو اور امور خانہ داری کے ہر نکات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھا گیا ہے درحقیقت یہ کتاب بہترین عربی فارسی اور ہندی معلومات کا بہترین مجموعہ ہے قیمت ۱۲ جلد دوم محصول

ثمرۂ وصال عیش و سرور کے منازل کے ساتھ اولاد پیدا کرنے کی ... بہترین کتاب قیمت ۱۲ علاوہ محصول۔

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ و نازنین کو دلہن کس قسم کے پوشیدہ حیالات پیدا ہوتے ہیں شادی کی خواہش کیا ہوتی ہے شادی کے بعد کیسے لوگوں کا ملاطفہ ... حسن شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے کنواری دوشیزہ کی پرکیف زندگی کس طرح ... نوبیاہتی جوان کو تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا ایک مست شباب دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا، ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی۔ فوٹو بلاک کی دو حسین و جمیل تصویریں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہے قیمت عہ

افشائے راز نہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب اور بیسی عجیب و غریب کہ اپنے انداز دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی اسپیڈ سیز ڈو ... اور سیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کو ... خود ان کے قلم سے لکھے گئے امریکہ کی ایک مس ... عورت نے یکجا کر کے ... پیش کئے اور امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے خدا جانے کتنے لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہو جانے کا خطرہ ہے اسلئے جلدی منگائیے قیمت ۱۸ محصول ۸